شافعی، مالک، احمد، امام حنیف
چار باغِ امامت پہ لاکھوں سلام

سیرت

ائمہ اربعہ

حیات اور علمی فقہی خدمات

https://t.me/tehqiqat

امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ

امام محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

تالیف
مولانا ڈاکٹر
مُحمّد عاصم اعظمی
ایم اے، ایم۔ ٹی۔ ایچ، پی۔ ایچ۔ ڈی

ناشر
اکبر بک سیلرز لاہور

خوشخبری

علماء اہلسنت کی کتب PDF میں
حاصل کرنے کیلئے
تحقیقات چینل ٹیلیگرام جوائن
کریں
https://t.me/tehqiqat
گوگل سے ڈاؤن لوڈ کرنے لئے
https://
@zohaibhasanattari

طالب دعا زوہیب حسن عطاری

شافعی، مالک، احمد، امام حنیف
چار باغِ امامت پہ لاکھوں سلام

سیرت
ائمہ اربعہ

حیات اور علمی، فقہی خدمات

- امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ
- امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ
- امام محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ
- امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

تالیف
مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی
ایم اے، ایم۔ ٹی۔ ایچ، پی۔ ایچ۔ ڈی

ناشر
اکبر بک سیلرز
زبیدہ سنٹر ۴۰ اردو بازار لاہور Ph: 37352022

﴿جملہ حقوق محفوظ ہیں﴾

کتاب : ائمہ اربعہ حیات اور علمی وفقہی خدمات
مولف : مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی
ایم۔ اے، ایم۔ ٹی۔ ایچ، پی۔ ایچ۔ ڈی
پروف ریڈنگ : مولوی نعیم الاسلام قادری شمسی، مولوی محمد عثمان شمسی
مولوی محمد حسان شمسی، مولوی محمد احسان شمسی
سن اشاعت : ۲۰۱۵ء
تعداد : ٦۰۰
صفحات : ٦۴۰
ناشر : محمد اکبر قادری
قیمت : 650/-

ناشر
اکبر بک سیلرز
زبیدہ سنٹر ۴۰ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شرفِ انتساب

صدر الشریعہ بدر الطریقہ فقیہ اعظم ہند
حضرت علامہ الحاج مفتی حکیم

محمد امجد علی اعظمی قادری

(متوفی ۲؍ ذی قعدہ ۱۳۶۷ھ)
مصنف بہار شریعت و فتاوی امجدیہ
و شرح شرح معانی الآثار
علیہ الرحمۃ والرضوان
کی علمی و فقہی بصیرتوں کے نام

محمد عاصم اعظمی

فہرست

شرف انتساب	۳
پیش لفظ	۱۵
مصنف مختصر تعارف	۱۶
❁ مقدمہ	۲۰
❁ اجتہاد و تقلید	۲۰
اجتہاد کی تعریف	۲۰
اجتہاد کی حقیقت	۲۲
اجتہاد کے شرائط	۲۲
قرآن و حدیث میں اجتہاد	۲۳
احادیث سے اجتہاد پر دلائل	۲۵
❁ اجتہاد کے ادوار	۲۸
عہد رسالت	۲۸
❁ دوسرا دور	۲۹
اجماع اور رائے کا اضافہ	۲۹
❁ تیسرا دور	۳۰
مدینہ کے فقہا	۳۱
مکہ	۳۱
کوفہ	۳۱
بصرہ	۳۲
شام	۳۲
مصر	۳۲
یمن	۳۲
❁ چوتھا دور	۳۲
اس دور کی امتیازی خصوصیات	۳۲
شہرت کے عمومی اسباب	۳۳
❁ تقلید	۳۳
تقلید کی دو صورتیں	۳۴
تقلید کی ہدایت قرآن میں	۳۴
تقلید کی ہدایت حدیث میں	۳۷
عہد صحابہ اور تقلید مطلق	۳۸
عہد صحابہ اور تقلید شخصی	۴۰
تقلید شخصی کی ضرورت	۴۲
تقلید شخصی کا انحصار مذاہب اربعہ میں	۴۵

امام اعظم ابوحنیفہ

❁ نقوش حیات	۴۷
نام و نسب	۴۷
ولادت	۴۸

خاندان اور آباواجداد	۴۸
وسیع تجارت	۵۰
مدینہ کا سفر	۵۳
منافع تجارت کا مصرف	۵۳
تحصیل علم کی تحریک	۵۴
علم کلام	۵۵
تحصیل فقہ	۵۶
اساتذہ	۵۸
❁ **کوفہ ایک اہم علمی مرکز**	۶۱
معلم امت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا دبستان فقہ	۶۳
دعائے رسول	۶۳
حلقہ درس	۶۴
فقہ	۶۶
خدمت حدیث	۶۷
فقیہ عراق علقمہ بن قیس رضی اللہ عنہ	۶۸
امام ابراہیم بن یزید رضی اللہ عنہ	۷۰
امام حماد بن ابوسلیمان کوفی رضی اللہ عنہ	۷۲
❁ **امام اعظم کا حلقہ درس**	۷۵
امام صاحب کی مقبولیت	۷۹
اہم تلامذہ	۷۹
❁ **سیاسی ہنگامہ آرائی اور امام اعظم کا کردار**	۸۱
زید بن علی کا خروج	۸۱
امام اعظم کا رویہ	۸۴
امام اعظم اور خوارج	۸۵
ابن ہبیرہ اور امام اعظم	۸۷
نگینہ	۸۸
امام اعظم کی مظلومیت پر امام احمد اور امام حماد کے تاثرات	۹۱
ابراہیم بن میمون اور امام اعظم	۹۲
امام اعظم اور ابوالعباس سفاح	۹۶
❁ **قیام حجاز**	۹۹
مکہ مکرمہ میں حلقہ درس	۱۰۰
امام باقر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں	۱۰۱
امام مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ	۱۰۲
امام اوزاعی سے ملاقات	۱۰۴
امام لیث بن سعد	۱۰۶
والی مکہ موسیٰ بن عیسیٰ کا وثیقہ	۱۰۶
توسیع حرم کا مسئلہ	۱۰۷
خلیفہ ابوجعفر منصور اور امام اعظم ابوحنیفہ	۱۰۷
بیع وشراء سے متعلق ایک کتاب	۱۰۸
چند اور واقعات	۱۰۹
حسن بن قحطبہ کی توبہ	۱۱۵
نفس ذکیہ کا خروج اور امام اعظم کی حمایت	۱۱۹
امام اعظم کی شرکت	۱۲۲
کوفہ کے عہدہ قضا کی پیش کش	۱۲۴
بغداد کے منصب قضا کی پیش کش اور اسیری	۱۲۵

❁ **وفات**	۱۳۰
تاریخ وفات	۱۳۰
غیبی ندا	۱۳۱
تاثرات	۱۳۲
❁ **محامد ومحاسن اور اخلاق**	۱۳۳
حلیہ ولباس	۱۳۳
ذاتی زندگی	۱۳۳
معمولات شب وروز	۱۳۴
جود وسخا	۱۳۵
امانت داری	۱۳۹
صبر وحلم	۱۴۱
عبادت وریاضت	۱۴۲
خشیت الٰہی	۱۴۵
زہد وتقویٰ	۱۴۷
کشف وفراست	۱۴۹
والدین سے حسن سلوک	۱۵۱
پڑوسیوں سے حسن سلوک	۱۵۲
اساتذہ کا ادب	۱۵۳
جامع مکارم اخلاق	۱۵۴
حق گوئی	۱۵۵
ائمہ وعلمائے کبار کے اقوال	۱۵۸
❁ **امام اعظم کی تابعیت**	۱۶۴
تابعی	۱۶۴
انس بن مالک کی زیارت	۱۶۷
عبداللہ بن حارث بن جزء کی زیارت اور ان سے روایت	۱۶۸
عبداللہ بن اوفیٰ کی زیارت	۱۶۸
صحابہ کرام سے روایت	۱۶۹
امام فضل بن دکین	۱۷۰
امام یحییٰ بن معین	۱۷۱
❁ **علم وفضل**	۱۷۳
امام اعظم اور علم کلام ومناظرہ	۱۷۷
❁ **فقہ اکبر اور مسلک اہل سنت کی وضاحت**	۱۸۵
مسئلہ خلافت	۱۸۵
صحابہ کرام	۱۸۵
ایمان	۱۸۶
گناہ کبیرہ	۱۸۶
گناہ گار مومن کا انجام	۱۸۷
الزام ارجاء	۱۸۸
❁ **امام اعظم اور علم حدیث**	۱۹۰
قبول حدیث کے معیار	۱۹۴
قلت روایات کے اسباب	۱۹۵
فہم حدیث	۱۹۵
تلامذہ حدیث	۱۹۸
امام اعظم اور عمل بالحدیث	۲۰۰
حدیث پر قیاس کو مقدم کرنے کا الزام	۲۰۱

❁ **فقہ واجتہاد** ۲۰۳
❁ **قانون اسلام کی تدوین** ۲۱۰
شرکائے تدوین فقہ ۲۱۶
مجلس تدوین فقہ کے اہم ارکان ۲۱۶
طریقہ تدوین ۲۱۸
امام صاحب کا تلامذہ سے خطاب ۲۲۱
نوح بن ابی مریم کو نصیحت ۲۲۲
❁ **آزاد عدلیہ کا قیام** ۲۲۴
قاضی ابو یوسف ۲۲۵
قاضی یحییٰ بن اکثم ۲۲۷
قاضی احمد بن بدیل ۲۲۸
❁ **فقہ حنفی کے اساسی اصول** ۲۲۹
کتاب اللہ ۲۳۳
سنت ۲۳۴
اقوال صحابہ ۲۳۵
اجماع ۲۳۶
قیاس ۲۳۸
استحسان ۲۳۹
تعامل وعرف ۲۴۱
❁ **فقہ حنفی کے ناقلین** ۲۴۲
(۱) قاضی ابو یوسف ۲۴۳
عہدہ قضا ۲۴۴
فقہ واجتہاد ۲۴۴
تصانیف ۲۴۵
کتاب الخراج ۲۴۶
(۲) امام محمد بن حسن شیبانی ۲۴۷
حلقہ درس ۲۴۸
خدمت حدیث ۲۴۸
فقہ واجتہاد ۲۴۸
تصنیفات ۲۴۹
ظاہر روایت ۲۴۹
مبسوط ۲۴۹
جامع صغیر ۲۵۰
جامع کبیر ۲۵۰
زیادات ۲۵۰
سیر صغیر ۲۵۰
سیر کبیر ۲۵۰
امام محمد اور عہدۂ قضا ۲۵۱
(۳) امام زفر ۲۵۱
حلقہ درس ۲۵۲
اجتہاد ۲۵۳
(۴) عافیہ بن یزید ۲۵۳
(۵) عبداللہ بن مبارک ۲۵۴
علم وفضل ۲۵۵
حدیث ۲۵۵
فقہ ۲۵۶

(۶) حسن بن زیاد	۲۵۶
(۷) امام حفص بن غیاث	۲۵۸
فقہ وقضا	۲۶۰
(۸) مسعر بن کدام	۲۶۰
(۹) وکیع بن الجراح	۲۶۱
حلقہ درس اور فضیلت علم	۲۶۲
فقہ	۲۶۳
تصانیف	۲۶۳
(۱۰) یزید بن ہارون	۲۶۴
فقہ	۲۶۵
علمی دبدبہ	۲۶۵
(۱۱) یحییٰ بن زکریا ابن زائدہ	۲۶۶
تصانیف	۲۶۷
فقہ	۲۶۷
(۱۲) حماد بن ابی حنیفہ	۲۶۸
❁ فقہ حنفی کا شیوع	۲۶۹
فقہ حنفی کا قبول عام	۲۷۴
❁ امام صاحب کی مصنفات اور ان کی اہمیت	۲۷۶
کتاب الآثار	۲۷۷
مسانید امام اعظم	۲۷۸
منقبت	۲۸۰

حضرت امام مالک

❁ نقوش حیات	۲۸۲
نام ونسب اور خاندان	۲۸۲
ولادت	۲۸۴
❁ تحصیل علم اور شیوخ	۲۸۶
حضرت ربیعہ رائی کی درسگاہ میں	۲۸۶
نافع مولیٰ ابن عمر کی خدمت میں	۲۸۷
عبدالرحمٰن بن ہرمز کے حلقہ درس میں	۲۸۸
حضرت صفوان بن سلیم	۲۸۸
امام ابن شہاب زہری	۲۸۹
انتخاب شیوخ میں احتیاط	۲۹۲
دور تحصیل علم کی تنگ دستی	۲۹۴
علمی مقام ومرتبہ	۲۹۴
❁ مسجد نبوی علوم اسلامی کی مرکزی درسگاہ	۲۹۷
تابعین عظام	۳۰۱
❁ امام مالک کا حلقہ درس وافتا	۳۰۴
طریقہ درس	۳۰۷
خلیفہ مہدی عباسی	۳۰۹
ایک عالم کے لیے تین حدیثوں کی روایت	۳۱۰
حلقہ درس کی عظمت وشان	۳۱۰
❁ تلامذہ	۳۱۲
❁ خلفا وامرا سے تعلقات اور ان کو ہدایات	۳۱۵

خلفا کے روبرو حق گوئی	۳۱۷
امام صاحب کی عزیمت اور کوڑوں کی سزا	۳۱۸
خلیفہ منصور کی معذرت	۳۱۹
خلیفہ منصور کی بے وقت طلبی	۳۲۰
محمد المہدی	۳۲۱
خلیفہ ہارون الرشید اور امام دار الہجرت	۳۲۱
منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم	۳۲۲
مؤطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کرنے کی تجویز	۳۲۳
خلفا کو نصائح	۳۲۳
❁ علم حدیث	۳۲۸
امام مالک کا انتخاب شیوخ	۳۲۸
قوت حفظ وضبط	۳۳۰
محدثانہ عظمت	۳۳۰
❁ مؤطا امام مالک	۳۳۳
اہمیت مؤطا	۳۳۸
مؤطا کے متداول نسخے	۳۴۱
امام یحییٰ بن یحییٰ مصمودی	۳۴۲
فضل وکمال	۳۴۲
حدیث	۳۴۳
شروح مؤطا	۳۴۵
مختصرات مؤطا	۳۴۷
فقہ واجتہاد	۳۴۸
فتویٰ دینے میں احتیاط	۳۵۰
نفاذ فقہ مالکی میں احتیاط	۳۵۲
❁ فقہ مالکی کے اصول استنباط	۳۵۴
کتاب	۳۵۵
سنت	۳۵۶
فتاوائے صحابہ	۳۵۷
اجماع	۳۵۹
عمل اہل مدینہ	۳۶۰
قیاس	۳۶۲
استحسان	۳۶۴
استصحاب	۳۶۵
مصالح مرسلہ	۳۶۶
سد ذرائع	۳۶۷
عادات وعرف	۳۶۸
❁ فقہ مالکی کے اہم ناشرین	۳۷۰
(۱) عبد اللہ بن وہب	۳۷۰
(۲) عبد الرحمٰن بن قاسم	۳۷۱
(۳) امام اشہب بن عبد العزیز	۳۷۳
(۴) امام اسد بن فرات بن سنان	۳۷۳
(۵) عبد العزیز بن ماجشون	۳۷۵
(۶) یحییٰ بن یحییٰ مصمودی	۳۷۵
❁ شمائل وخصائل	۳۷۶
حلیہ ولباس	۳۷۶
اخلاق وکردار	۳۷۶

ذوق عبادت وتلاوت	۳۷۷
عشق رسول	۳۷۷
حق گوئی وبے باکی	۳۷۸
اوصاف وعادات	۳۷۹
❁ **حکیمانہ اقوال**	۳۸۱
❁ **سفر آخرت**	۳۸۳
اولاد واحفاد	۳۸۴

امام شافعی

❁ **نقوش حیات**	۳۸۶
نام ونسب	۳۸۶
خاندان	۳۸۷
ولادت	۳۸۸
مکہ مکرمہ میں آمد	۳۸۸
تحصیل علم اور اس کے لیے اسفار	۳۸۹
مسلم بن خالد زنجی کی بارگاہ میں	۳۹۰
امام مالک کی خدمت میں	۳۹۱
مدینہ منورہ میں	۳۹۱
امام مالک کی درسگاہ میں مؤطا کا درس	۳۹۲
امام صاحب کی دقیقہ رسی	۳۹۵
بنی ہذیل میں آمد	۳۹۵
❁ **یمن کی امارت**	۳۹۶
❁ **ابتلاء وآزمائش**	۳۹۸
ورود بغداد اور امام محمد سے شرف تلمذ	۴۰۲
حجام کی بدسلوکی اور امیر کا احترام	۴۰۴
پھر امام مالک کی بارگاہ میں	۴۰۵
مراجعت وطن	۴۰۶
❁ **اہم شیوخ واساتذہ**	۴۰۸
(۱) مسلم بن خالد زنجی	۴۰۹
(۲) سفیان بن عیینہ	۴۰۹
(۳) اسماعیل بن علیہ	۴۰۰
(۴) امام عبداللہ بن نافع صائغ	۴۰۱
❁ **جامعیت فضل وکمال**	۴۰۲
❁ **حلقہ درس اور اشاعت علم**	۴۰۶
امام احمد حلقہ درس میں	۴۰۷
❁ **قیام مصر**	۴۲۰
مصر میں عبداللہ بن عبدالحکم سے تعلقات	۴۲۰
❁ **تلامذہ**	۴۲۲
❁ **علم وفضل**	۴۲۳
قرآن اور فہم قرآن	۴۲۳
ظلم سے کیا مراد ہے؟	۴۲۴
قرآن کی تفسیر میں امام شافعی کا درجہ	۴۲۴
حدیث	۴۲۵
فن مناظرہ	۴۲۸
فن ادب ولغت	۴۳۰
شاعری	۴۳۱

❁ فقہ واجتہاد ۴۳۵
اقوال قدیمہ وجدیدہ ۴۳۶
علم اصول فقہ ۴۳۶
❁ فقہ شافعی کے اصول استنباط ۴۳۷
کتاب وسنت ۴۳۸
قرآن وسنت کا ایک ہی درجہ کیوں؟ ۴۳۸
قرآن کے خاص وعام ۴۳۹
قرآن کا بیان ۴۴۰
حجیت حدیث ۴۴۱
اجماع ۴۴۲
اقوال صحابہ واختلاف صحابہ ۴۴۳
قیاس ۴۴۴
❁ ناشرین فقہ شافعی ۴۴۶
(۱) حسن بن محمد زعفرانی بغدادی ۴۴۶
(۲) ابو ثور ابراہیم بن خالد بغدادی ۴۴۷
(۳) حسین بن علی کرابیسی بغدادی ۴۴۹
(۴) یوسف بن یحییٰ بویطی ۴۴۹
(۵) ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی ۴۵۱
(۶) ربیع بن سلیمان مرادی ۴۵۳
(۷) حرملہ بن یحییٰ ۴۵۵
(۸) امام یونس بن عبد الاعلیٰ ۴۵۶
❁ شمائل وخصائل ۴۵۷
حلیہ ۴۵۷
فہم وفراست ۴۵۸
خلوص وللہیت ۴۶۰
توکل وقناعت ۴۶۱
سخاوت ۴۶۳
تواضع ۴۶۵
احترام اکابر ۴۶۶
عبادت وریاضت اور زہد وتقویٰ ۴۶۶
خوش خلقی اور بے تکلفی ۴۶۷
اتباع سنت ۴۶۸
❁ حکیمانہ وادیبانہ اقوال ۴۷۰
❁ تصانیف ۴۷۴
❁ مرض الموت اور وفات ۴۷۶
تجہیز وتدفین ۴۷۸
وفات کے بعد مبشرات ۴۷۹
مرثیے ۴۷۹
اولاد واحفاد ۴۸۱

امام احمد بن حنبل

❁ نقوش حیات ۴۸۳
خاندان ۴۸۳
نام ونسب ۴۸۵
ولادت ۴۸۵
یتیمی ۴۸۵

ابتدائی تعلیم	۴۸۶
طلب حدیث اور علمی اسفار	۴۸۷
سفرِ حج	۴۹۰
طلب علم کے دوران مصائب ومشکلات	۴۹۰
تحصیل علم کا بے کراں شوق	۴۹۲
شیوخ واساتذہ کا احترام	۴۹۳
امام شافعی کے ساتھ تعلق خاطر	۴۹۴
شیوخ واساتذہ کی نظر میں	۴۹۵
❁ **شیوخ واساتذہ**	۴۹۷
ہشیم بن بشیر	۴۹۹
امام محمد بن جعفر غندر	۵۰۱
امام یحییٰ بن سعید قطان	۵۰۲
حضرت امام عبدالرحمٰن بن مہدی	۵۰۵
امام ابوداؤد طیالسی	۵۰۸
حافظ عبدالرزاق	۵۰۹
مسند درس حدیث وافتا	۵۱۱
❁ **تلامذہ**	۵۱۶
❁ **فتنہ خلق قرآن اور دورِ ابتلا وآزمائش**	۵۱۷
عہد مامون رشید	۵۱۹
قاضی ابن ابی دواد	۵۱۹
شیخ عبدالعزیز کنانی کا جہاد	۵۲۰
مامون کا پہلا خط	۵۲۴
بغداد کے نائب حاکم اسحاق بن ابراہیم کے نام دوسرا خط	۵۲۷
مامون کا تیسرا خط	۵۳۴
امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح قید وبند میں	۵۳۸
معتصم باللہ کا دور	۵۳۹
محمد بن نوح کی وفات	۵۳۹
امام احمد معتصم کے دربار میں	۵۴۰
امام احمد پر کوڑوں کی برسات	۵۴۲
امام احمد کا ایک اور بیان	۵۴۴
رہائی	۵۴۸
واثق باللہ کا دور	۵۴۸
واثق کی توبہ	۵۵۰
متوکل علی اللہ کا دور اور امام احمد کا اعزاز	۵۵۰
خلیفہ متوکل کے نام امام احمد کا خط	۵۵۲
امام احمد بن حنبل کی عظمت	۵۵۸
تصویر کا دوسرا رخ	۵۶۰
❁ **مرض الموت اور وفات**	۵۶۲
مبشرات	۵۶۴
خراج عقیدت	۵۶۶
ازواج واولاد	۵۶۹
❁ **عظمت کردار**	۵۷۰
امام احمد کی معیشت	۵۷۰
خلفا کے ہدایا سے انکار	۵۷۳
صبر وتحمل	۵۷۶
توکل علی اللہ	۵۷۷

عفوودرگزر	۵۷۷
زہد وتقویٰ	۵۷۸
عہدہ قضا سے انکار	۵۸۰
ذوق عبادت	۵۸۰
عشق رسول	۵۸۱
غذا، لباس اور حلیہ	۵۸۲
خیر خواہی	۵۸۴
قبولیت دعا	۵۸۵
❁ **علم وفضل**	۵۸۷
قوت حفظ وضبط اور شعور	۵۸۹
❁ **علم حدیث**	۵۹۱
مسند امام احمد بن حنبل	۵۹۲
امام عبداللہ	۵۹۴
❁ **فقہ واجتہاد**	۵۹۷
فقہ حنبلی کا شیوع	۶۰۱
تصانیف	۶۰۲
❁ **فقہ حنبلی کے اصول استنباط**	۶۰۴
نصوص	۶۰۴
فتاوائے صحابہ	۶۰۴
اختلاف صحابہ کا فیصلہ	۶۰۴
حدیث مرسل اور حدیث ضعیف	۶۰۴
قیاس	۶۰۵
حدیث کا مرتبہ	۶۰۶
کتاب اور سنت میں تعارض ممکن نہیں	۶۰۷
امور سہ گانہ	۶۰۷
سنت	۶۰۸
قرآن وحدیث کا فرق	۶۰۹
امام احمد اور حدیث مرسل	۶۰۹
فتاوائے صحابہ کی حدیث ضعیف پر ترجیح	۶۱۰
صحابہ کے فتاویٰ اور مسلک ائمہ اربعہ	۶۱۰
دین کی اصل	۶۱۱
اقوال صحابہ میں ترجیح کا اصول	۶۱۱
ایک ادعا اور اسکی تردید	۶۱۱
کبار تابعین کا فتویٰ قابل قبول ہے	۶۱۲
اجماع	۶۱۲
امام احمد وجود اجماع کی مطلق نفی نہیں کرتے	۶۱۳
مسئلہ پر امر واقع کی حیثیت سے غور	۶۱۳
قیاس	۶۱۵
امام احمد کا مسلک قیاس کے بارے میں	۶۱۵
صحابہ کرام اور قیاس	۶۱۶
استصحاب	۶۱۷
استصحاب کی حقیقت	۶۱۷
استصحاب کی چند مثالیں	۶۱۹
ذبائح میں اصل تحریم ہے	۶۱۹
پانی طاہر اور مطہر ہے	۶۱۹
مصالح	۶۱۹

مصالح مرسلہ کی چند مثالیں	۶۱۹
قرآن کا مصحف کی صورت میں جمع کرنا	۶۲۰
شرابی کی حد	۶۲۰
کاریگر سے تاوان وصول کرنا مصلحت کے تابع ہے	۶۲۰
ذرائع	۶۲۰
ذرائع کی چند مثالیں	۶۲۱
❁ **فقہ احمد کے ناقلین**	۶۲۲
صالح بن احمد بن حنبل	۶۲۲
عبداللہ بن حنبل	۶۲۳
ابوبکر احمد بن محمد ہانی	۶۲۳
عبدالملک بن عبدالحمید المہر انی المیمونی	۶۲۴
احمد بن محمد بن الحجاج مروزی	۶۲۴
حرب بن اسمٰعیل حنظلی کرمانی	۶۲۵
ابراہیم بن اسحاق حربی	۶۲۵
احمد بن محمد بن ہارون ابوبکر خلال	۶۲۵
عمر بن حسین خرقی	۶۲۶
عبدالعزیز بن جعفر خلال	۶۲۸
❁ **حنبلیوں کی قلت کے اسباب**	۶۲۹
❁ **امام احمد بن حنبل اور عقائد اہل سنت کی وضاحت**	۶۳۳
امام احمد کا خط مسدد کے نام	۶۳۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

''تذکرہ خلفاے راشدین'' کی تالیف کے بعد ائمہ اربعہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حیات وخدمات پر کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا، ۱۹۹۹ء/۱۹۹۸ء میں کام شروع ہوا، تعطیل رمضان المبارک میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی سے متعلق پچاس ساٹھ صفحات لکھنے کے بعد دوسرے تحریری کاموں میں مصروف ہوگیا، نتیجتاً ائمہ اربعہ کی تالیف تقریباً آٹھ برس تک موقوف رہی۔ ''منتخب اللغات'' کے ترجمے سے فارغ ہوا، تو عزم بالجزم کے ساتھ قرطاس وقلم سنبھالا، رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ میں ازسرنو کام کا آغاز ہوا، بحمدہ تعالیٰ رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ میں ملت بیضا کے عظیم محسنوں کے حالات وخدمات پر مشتمل کتاب پایہ تکمیل کو پہنچی۔

شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ میں کمپوز شدہ کاپی کی پروف ریڈنگ کا جاں گسل مرحلہ بفضلہٖ تعالیٰ طے ہوا۔ اب طباعت کی فکر دامن گیر ہوئی کتاب ضخیم تھی، جس کی طباعت میری بساط سے باہر تھی، کسی معقول ناشر کی جستجو تھی، فروری ۲۰۱۴ء میں بہرائچ شریف حاضری ہوئی، حضرت سید سالار مسعود غازی رضی اللہ عنہ کی روحانیت اور فیضان سے یہ مشکل آسان ہوگئی۔ مسعود ملت حضرت علامہ مولانا محمد علی مسعودی صاحب بانی الثقافۃ الاسلامیہ (رسیا موڑ) ومسعودیہ رضویہ دارالتحقیق والتصنیف بہرائچ شریف نے بطیب خاطر کتاب کی طباعت واشاعت کا ذمہ لیا۔ یہ کتاب انہی کے زیر اہتمام طبع ہوکر شائع ہورہی ہے۔

موصوف کی اس پرخلوص دینی اعانت کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ دعا ہے کہ مولاے قدیر ان کے دینی جذبہ وجوش کو مزید تقویت بخشے اور ان کے اداروں کو ترقی عطا فرمائے۔ آمین

کتاب کی تالیف وتدوین سے لے کر اصلاح وتصحیح کے تمام مراحل میں عزیزان گرامی مولوی نعیم الاسلام قادری شمسی، مولوی محمد عثمان شمسی، مولوی محمد حسان شمسی، مولوی محمد احسان شمسی اور مولوی محمد شہباز مصباحی سلمہم اللہ تعالیٰ ناچیز کے بے لوث معاون رہے، مولا تعالیٰ انہیں جزاے خیر عطا فرمائے اور دارین کی سعادت وفلاح سے مالا مال فرمائے۔ آمین

محمد عاصم اعظمی

۱۱ رشوال المکرم ۱۴۳۴ھ/۱۹ راگست ۲۰۱۳ء بروز پیر

مصنف ـــــــ مختصر تعارف

از قلم: نعیم الاسلام قادری (یکے از تلامذۂ مصنف)

ولادت:۔ گہوارہ علم و ادب گھوسی مئو یوپی کے مردم خیز خطہ محلّہ کریم الدین پور میں ۲۹/محرم الحرام ۱۳۶۸ھ بروز جمعرات۔

خاندان:۔ دوہری گھاٹ سے مدھوبن جانے والی سڑک کے جنوبی کنارے پر ایک قدیم بستی قرولی باسی ہے، جو دوہری گھاٹ سے تقریباً پانچ کلومیٹر جانب مشرق واقع ہے، آپ کا خاندان صدیوں پہلے یہیں آباد تھا، برادران وطن کے ساتھ کسی مسئلہ میں تنازع کی وجہ سے آبادی کے دوسرے مسلمان خانوادوں کے ساتھ ترک وطن کر کے محلّہ کریم الدین پور گھوسی میں آباد ہو گیا، آپ کے اجداد سیدھے سادے راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھے، پارچہ بافی کی صنعت سے معاشی ضروریات پوری کرتے تھے، پردادا جناب محمد عباس مرحوم فن سپہ گری اور شمشیر زنی میں ماہر تھے، انھوں نے ۱۸۹۳ء میں آبادی پر حملہ آور بلوائیوں کا بڑی جاں بازی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا اور ان کے ہیرو کو مار کر ان کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، دادا جان محمد عمر مرحوم کم خواندہ مگر متدین اور سچے پکے مسلمان تھے، حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ ان کو احتراماً ”گروجی“ کہہ کر پکارتے تھے، ان کے چھ صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی تھیں۔

والد گرامی:۔ حضرت مصنف کے والد محترم حضرت مولانا محمد سالم صاحب قبلہ امجدی علیہ الرحمہ متدین عالم دین تھے، انھوں نے ابتدائی تعلیم گھوسی میں پائی، پھر جامعہ اشرفیہ مبارکپور میں داخل ہو کر متوسطات تک تعلیم حاصل کی، بعدہ مزید تعلیم کے لیے مرکزی دارالعلوم مظہر اسلام بریلی شریف میں داخلہ لیا اور وہیں سے ۱۳۶۴ھ میں سند فراغت حاصل کی، آپ حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ کے مرید خاص اور منظور نظر تھے، حضور صدر الشریعہ علیہ الرحمہ نے آپ کو خدمت دین کے لیے پالی مارواڑ راجستھان بھیجا، جہاں آپ نے ۱۹۴۶ء تا ۱۹۸۸ء مدرسہ امجدیہ مسجد چھیپان میں تقریباً ۴۲/سالوں تک ناقابل فراموش دینی و علمی کارنامے انجام دیے، اہلیان پالی ان کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، ۱۹۸۸ء کے بعد خرابی صحت کی وجہ سے مستقل طور پر وطن مالوف گھوسی ہی میں قیام پذیر رہے اور یہیں ۱۵/صفر ۱۴۲۴ھ/ ۱۸/اپریل ۲۰۰۳ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

تعلیم:۔ ۱۹۵۳/۵۴ء میں جب کہ سن شعور میں قدم رکھا جامعہ شمس العلوم گھوسی میں داخلہ ہوا، جہاں قاعدہ بغدادی تا بخاری شریف تعلیم حاصل کر کے ۱۹۶۹ء میں سند فراغت پائی۔

اساتذہ:۔ حضرت علامہ قمر الدین صاحب قمر اشرفی، حضرت مفتی وکیل احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ، حضرت مولانا محمد رمضان صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا سمیع اللہ صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا عبد السلام صاحب علیہ الرحمہ، حضرت مولانا شمس الدین صاحب علیہ الرحمہ، جناب مولوی محمد یوسف صاحب علیہ الرحمہ، جناب ماسٹر اعجاز احمد صاحب مرحوم، جناب حافظ قمر الحق صاحب مرحوم، جناب منشی شرف الدین صاحب، جناب ڈاکٹر محی الدین صاحب مرحوم۔

اسناد اور ڈگریاں:۔ ادیب ماہر، ادیب کامل، معلم اردو جامعہ اردو علی گڑھ
منشی، کامل، مولوی، عالم، فاضل دینیات، فاضل ادب، فاضل طب عربی فارسی بورڈ یوپی۔
بی۔ اے، ایم۔ اے گورکھپور یونیورسٹی۔
بی۔ ٹی۔ ایچ، ایم۔ ٹی۔ ایچ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
پی۔ ایچ۔ ڈی پٹنہ یونیورسٹی۔

تدریس:۔ جنوری ۱۹۷۰ء تا ڈیڑھ ماہ دار العلوم اسحاقیہ جودھپور
جنوری ۱۹۷۱ء تا ۱۴؍ جنوری ۱۹۷۲ء دار العلوم فیض الاسلام جامع مسجد گھوسی
۱۵؍ جنوری ۱۹۷۲ء تا حال (مسلسل ۴۲؍ سالوں سے) جامعہ شمس العلوم گھوسی مئو یوپی

تلامذہ:۔ تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، چند تلامذہ کا نام درج ذیل ہے:

(۱) مولانا عبد الرشید اعظمی صاحب مرحوم سابق نائب شیخ الحدیث جامعہ لطیفیہ سراج العلوم نہال گنج (۲) مولانا فروغ احمد اعظمی صاحب پرنسپل دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی (۳) مولانا امتیاز احمد صاحب اعظمی پرنسپل جامعہ غازیہ سید العلوم بہرائچ شریف (۴) مولانا فیض الحق صاحب اعظمی پرنسپل دار العلوم فیض العلوم محمد آباد گوہنہ (۵) مولانا فیضان المصطفیٰ قادری شیخ الحدیث جامعہ امجدیہ گھوسی (۶) مولانا اختر کمال صاحب استاذ جامعہ اشرفیہ مبارکپور (۷) مولانا ڈاکٹر شکیل احمد اعظمی صاحب پرنسپل مدرسہ حق الاسلام لال گنج بستی (۸) مولانا نعمان احمد صاحب ازہری پرنسپل جامعہ برکات علی گڑھ (۹) پروفیسر خواجہ اکرام صاحب جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی (۱۰) مولانا وصی احمد صاحب شمسی نائب شیخ الادب جامعہ شمس العلوم گھوسی (۱۱) مولانا مقصود اختر صاحب اشرفی گھوسی (۱۲) مفتی محمد اسلم منانی استاذ و مفتی دار العلوم غوثیہ تیغیہ سلطان پور (۱۳) مفتی جمال مصطفیٰ صاحب قادری پرنسپل جامعہ امجدیہ گھوسی (۱۴) مولانا علاء المصطفیٰ صاحب قادری ناظم اعلیٰ جامعہ امجدیہ گھوسی (۱۵) مولانا عرفان المصطفیٰ صاحب ازہری استاذ جامعہ امجدیہ گھوسی (۱۶) مولانا شہباز عالم صاحب پرنسپل دار العلوم امیر العلوم کچھوچھہ (۱۷) مولانا محمد حنیف مصباحی شیخ الحدیث دار العلوم مجاہد ملت دھام نگر اڑیسہ (۱۸) مفتی محمد عثمان صاحب شمسی استاذ و مفتی دار العلوم مجاہد ملت دھام نگر اڑیسہ (۱۸) مفتی محبوب عالم صاحب مرحوم سابق شیخ الحدیث الجامعۃ

الصابرہ گوپی گنج (۱۹) مولانا اسلم مینائی کلکتہ (مشہور خطیب) (۲۰) مولانا قاسم ضیا شیخ الادب دار العلوم حبیبیہ گوپی گنج (۲۱) مولانا اخلاق احمد صاحب استاذ دار العلوم فاروقیہ بنارس (۲۲) مولانا خورشید عالم صاحب شیخ الادب جامعہ عربیہ مدینۃ العلم بھدوہی (۲۳) مولانا نعیم الحق ازہری استاذ دار العلوم محبوب سبحانی کرلا ممبئی (۲۴) مولانا رجب القادری پرنسپل جامعہ رضویہ چھپرہ بہار (۲۵) مفتی منظر رضا صاحب پرنسپل دار العلوم گلشن مدینہ جوگیشوری بمبئی (۲۶) مولانا اشتیاق احمد صاحب مصباحی استاذ دار العلوم ضیاء العلوم گونٹھا (۲۷) مولانا نذیر احمد صاحب منانی استاذ دار العلوم ضیاء العلوم خیر آباد (۲۸) مولانا محمد ہارون صاحب پرنسپل ضیاء العلوم گونٹھا (۲۹) مولانا کمال اختر اشرفی (۳۰) مولانا امیر الدین شمسی (۳۱) مولانا امیر اعظم شمسی (۳۲) مولانا عبید الرحمٰن صاحب (۳۳) مولانا ریاض احمد صاحب گھوسی (۳۴) مولانا عبد القیوم صاحب گورکھپور (۳۵) مفتی معراج احمد شمسی گورکھپور (۳۶) مولانا سرفراز احمد شمسی استاذ دار العلوم شیخ احمد کھٹو احمد آباد (۳۷) مولانا ابوالفتح قادری صدر المدرسین دار العلوم اہل سنت سرکار شاہ میراں اون سورت گجرات (۳۸) مولانا ابوصالح شمسی شیخ المعقولات وناظم تعلیمات دار العلوم فیض اکبری لونی شریف (۳۹) مولانا حافظ ظفر حسین شمسی سہرسہ (۴۰) مولانا قمر حسین شمسی سہرسہ (۴۱) مولوی محمد احسان شمسی (۴۲) مولانا فاروق اعظم شمسی نائب پرنسپل وشیخ الحدیث دار العلوم شیخ کھٹو احمد آباد (۴۳) مولانا ساجد حسین شمسی مدرس دار العلوم شاہ عالم احمد آباد (۴۴) مولانا رفیق احمد شمسی شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ ٹنکاریہ بھروچ (۴۵) ڈاکٹر ملیح اصغر گھوسی (۴۶) ڈاکٹر قائم اعظمی مہراجگنج (۴۷) ڈاکٹر امتیاز احمد گھوسی (۴۸) ڈاکٹر انجم گھوسی (۴۹) ڈاکٹر کمال اصغر گھوسی (۵۰) ڈاکٹر کلیم احسن گھوسی (۵۱) ڈاکٹر زاہد مہراجگنج (۵۲) ڈاکٹر جاوید احمد گھوسی (۵۳) ڈاکٹر محمد وزیر علی گڑھ (۵۴) ڈاکٹر ندیم اشرف گھوسی وغیرہم۔

تصنیفات:۔ مطبوع:۔ (۱) حدیث نبوی چند مباحث ومسائل (۲) حدیث نبوی کے اردو تراجم (۳) داستان حرم (۴) خواجہ غریب نواز (۵) محبوب الٰہی (۶) تذکرہ خلفائے راشدین (۷) تفہیم الفرائض (۸) تذکرہ مشائخ عظام (۹) مشاہیر حدیث (۱۰) تاریخ داؤدی (۱۱) تذکرہ مولانا علیم اللہ شاہ (۱۲) محدثین عظام (۱۳) ترجمہ مونس الارواح (۱۴) داستان کربلا (۱۵) مفتی مجیب الاسلام۔ احوال وافکار (۱۶) ترجمہ مرآۃ مداری (۱۷) ترجمہ منتخب اللغات (۱۸) ترجمہ فتوحات فیروز شاہی (۱۹) نگارشات (مجموعہ مقالات) (۲۰) ائمہ اربعہ (۲۱) ترجمہ مناقب رزاقیہ

زیر طبع:۔ (۲۲) ترجمہ تذکرہ شورش

زیر ترتیب:۔ (۲۳) ترجمہ بحر زخار (۲۴) مولانا سید سلیمان اشرف بہاری

غیر مطبوع:۔ (۲۵) خلاصۃ القواعد (۲۶) تذکرہ دانشوران گھوسی (۲۷) فارسی ادب کی تاریخ (۲۸) تذکرہ شعرائے گھوسی

حج وزیارت:۔ آپ نے دو حج کیے۔ پہلی بار ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں والد محترم حضرت مولانا سالم امجدی علیہ الرحمہ کے ہمراہ حج وزیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے، حج وزیارت سے فراغت کے بعد عراق گئے، جہاں کربلا، نجف اشرف اور بغداد کے مقامات مقدسہ پر حاضری دی، کربلا میں حضرت امام حسین، حضرت عباس علمبردار اور دیگر شہدا حضرت حر،

حضرت عون ومحمد، رضوان اللہ علیہم اجمعین، نجف اشرف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، بغداد میں حضور غوث اعظم جیلانی، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، حضرت معروف کرخی، حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی اور حضرت بہلول دانا علیہم الرحمہ کے مزارات مبارکہ کی زیارت سے سرفراز ہوئے، کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل، حضرت ہانی اور جامع کوفہ کی زیارت کی، نیز حضرت یونس علیہ السلام کے مزار اور حضرت ایوب علیہ السلام کے مکان اور اس کنویں کی زیارت سے مشرف ہوئے جس کے پانی سے وہ شفایاب ہوئے تھے۔

١٤٣١ھ مطابق ٢٠١٠ء میں دوسری بار حج وزیارت حرمین کا شرف پایا۔

بیعت وارادت:۔ ١٩٨٠/٨١ء میں جامعہ حبیبیہ الٰہ آباد میں سید التارکین حضور مجاہد ملت حضرت علامہ شاہ حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کے دست مبارک پر سلسلہ عالیہ قادریہ میں شرف بیعت سے مشرف ہوئے، حضور مجاہد ملت نے کچھ اوراد ووظائف کی تلقین کی اور شجرہ مبارکہ عطا کیا۔

اجازت وخلافت:۔ دوسرے حج کے موقع پر حضور مفتی اعظم مہاراشٹر اشرف الفقہا خلیفہ حضور مفتی اعظم ہند مفتی محمد مجیب اشرف رضوی گھوسوی صاحب قبلہ مدظلہ بانی دارالعلوم امجدیہ ناگ پور نے بلا طلب سلسہ عالیہ قادریہ برکاتیہ رضویہ نوریہ کی اجازت وخلافت اور اجازت حدیث عطا کی۔

* * *

مقدمہ

اجتہاد وتقلید

اصولی اور بنیادی حیثیت سے قرآن وسنت کے ذریعہ ہدایت الٰہیہ کی تکمیل اور بہت سے جزئیات کی تشریح کردی گئی ہے، پیش آمدہ خطرات کے انسداد کے لیے تدبیریں بھی بتادی گئی ہیں، لیکن نئے پیش آمدہ مسائل کی تحقیق اور قوانین اسلامی کو حالات وضروریات کے مطابق وسعت دینے اور انسانی زندگی کے دائرہ کار کے لیے شرعی قوانین کی وضع کا عمل اجتہاد کے ذریعہ کیا جائے گا۔

یہی وہ سرچشمہ قانون ہے، جس کے مختلف دھاروں کے ذریعہ ہدایت الٰہیہ کی گہرائی میں پہنچ کر نئے نئے تغیرات اور نئی کروٹوں کو سمیٹنے اور منضبط کرنے میں آسانی ہوتی ہے، الٰہی ہدایات نے اجتہاد کی اجازت دے کر اہم مقاصد شریعت کی تکمیل فرمائی، یہ اجتہاد فقہ اسلامی میں ''روح'' اور ''سرچشمہ حیات'' کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے بے نیاز ہوکر کوئی فقہی مجموعہ اپنے فرائض سے سبک دوش ہوسکتا ہے اور نہ اسے زندہ جاوید قرار دیا جاسکتا ہے۔

اجتہاد کی تعریف

اجتہاد کے لغوی معنیٰ ''تحمل الجهد'' (مشقت برداشت کرنا) ہیں (توضیح تلویح)

ابوالحسن علی الآمری لکھتے ہیں:

الاجتهاد فهو في اللغة عبارة عن استفراغ الوسع في تحقيق امر من الامور مستلزم للكلفة والمشقة يقال اجتهد فلان في حمل حجر ولا يقال اجتهد في حمل خردلة ۔

لغت میں اجتہاد کا مفہوم یہ ہے، کہ کسی کام کے کرنے میں اپنی امکانی طاقت کو صرف کردینا اور اس میں کلفت اور مشقت برداشت کرنا اہل عرب یوں تو کہتے ہیں، کہ **اجتهد فلان في حمل حجر** کہ فلاں شخص نے بھاری پتھر اٹھانے میں کوشش کی، لیکن یہ کوئی نہیں کہتا، کہ **اجتهد فلان في حمل خردلة** کہ رائی کے دانے کو اٹھانے میں فلاں نے کوشش کی۔

گویا اہل لغت اجتہاد کا لفظ اس موقع پر استعمال کرتے ہیں، جب کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کوشش کی جائے اور اس کوشش میں دقت اور مشقت بھی ہو۔

اور فقہا کی اصطلاح میں یہ معنی منقول ہیں:

الاجتهاد هو استفراغ الجهد وبذل غاية الوسع اما في درك الاحكام الشرعية واما في تطبيقها ۔ (الموافقات ج۴ ص۸۹)

احکام شرعیہ کی دریافت میں یا ان کی تطبیق میں خالی الذہن ہو کر انتہائی جد وجہد صرف کرنا۔

دوسری تعریف یہ ہے:

استفراغ الجهد في ادراك الاحكام الشرعية الفرعية عن ادلتها التفصيلية الراجعة كلياتها في اربعة اقسام الكتاب والسنة والاجماع والقياس ۔ (عقد الجید ص۳)

احکام شرعیہ معلوم کرنے کے لیے پوری محنت اور جد وجہد صرف کرنا یہ معلومات تفصیلی دلائل سے حاصل ہوتے ہیں، جن کی کلیات کا مرجع کتاب وسنت، اجماع وقیاس ہیں۔

آمری اجتہاد کی یہ تعریف کرتے ہیں:

وفي الاصطلاح استفراغ الوسع في طلب الظن بشيء من الاحكام الشرعية على وجه يحس من النفس العجز عن المزيد فيه ۔ (احکام الاحکام ج۳ ۱ الآمری)

فقہا کی اصطلاح میں اجتہاد کا مفہوم یہ ہے، کہ احکام شرعیہ میں سے کسی حکم کے بارے میں غلبہ ظن حاصل کرنے کے لیے اپنی کوشش کی انتہا کر دینا، اس طرح کہ نفس اس سے زیادہ کوشش کرنے سے عاجز ہو۔

بزدوی لکھتے ہیں:

الاجتهاد اعم لان القياس يفتقر الى الاجتهاد وهو من مقدماته وليس الاجتهاد يفتقر الى القياس ۔

اجتہاد کا دائرہ کار قیاس سے زیادہ وسیع ہے، اس لیے کہ قیاس کرنے والے کو ذرائع اجتہاد سے مدد لینی پڑتی ہے اور مجتہد قیاس کا محتاج نہیں ہے۔

مقصد یہ ہے، کہ مسائل کا استنباط مجتہد کبھی قیاس کے ذریعہ کرتا ہے اور کبھی مصالح مرسلہ اور استصلاح وغیرہ کے ذریعہ کرتا ہے، پھر اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وحده هو بذل المجهود في طلب الحق بقياس وغيره ۔

حق بات کی طلب میں اپنی پوری کوشش صرف کرنا قیاس اور دوسرے ذرائع اجتہاد کے ذریعہ۔

(ایضاً: ج۳ ص۹۸۸)

علمائے اصول نے اجتہاد کی جو تعریفیں کی ہیں، ان میں معمولی تفاوت اور فرق ضرور ہے، لیکن مقصد اور مآل کے لحاظ سے

ان میں تضاد اور تعارض نہیں۔

اجتہاد کی حقیقت

اجتہاد میں جس قدر محنت اور جدوجہد درکار ہے، اس کی تشریح درج ذیل بیان سے ہوتی ہے:

بذل تمام الطاقة بحيث يحس من نفسه العجز عن المزيد عليه ۔ (تلویح ص۱۱۷)

اپنی طاقت بھر اس انداز سے محنت صرف کرنا کہ اس سے زیادہ میں اپنے آپ کو مجبور اور بے بس محسوس کرے۔

یہ طاقت بھر محنت وجدوجہد اسی کی قابل اعتبار ہوگی، جو اجتہاد کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہوگا، غیر فقیہ کی محنت وجدوجہد کا اعتبار نہ ہوگا، خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ ہو:

فخرج استفراغ غير الفقيه وسعه في معرفة حكم شرعي ۔

فقیہ کی قید سے غیر فقیہ کی وہ محنت وجدوجہد خارج ہوگئی، جو وہ شرعی حکم کی دریافت میں کرے۔

ان تصریحات سے اجتہاد کی یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئی، کہ فقیہ انتہائی جدوجہد اور پوری محنت سے اس طرح نئے مسائل کا حل دریافت کرے یا موجودہ مسائل میں موقع ومحل پر منطبق کرنے کی صورت نکالے، کہ ان کی بنیاد فقہی ماخذوں میں سے کسی پر قائم ہو جائے اور پھر وہ مسائل ایک رشتہ میں منسلک اور ایک لڑی میں پروے ہوئے نظر آئیں۔

مسائل شرعیہ میں اسی فقیہ ومجتہد کا اجتہاد قابل قبول ہوگا، جو اپنے اندر مقاصد شریعت سے واقفیت، موقع ومحل کے لحاظ سے استدلال واستنباط پر قدرت رکھتا ہو۔ علامہ ابو اسحاق شاطبی اپنی مشہور کتاب ''الموافقات'' میں فرماتے ہیں:

انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين احدهما فهم مقاصد الشريعة على كمالها والثاني التمكن من الاستنباط بناء على فهمه فيها ۔ (الموافقات ج۴ ص۹۰)

اجتہاد کا درجہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو ان دونوں صفتوں سے متصف ہو (۱) شریعت کے مقاصد کو مکمل طور سے سمجھتا ہو (۲) مقاصد شریعت کے سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس میں استنباط احکام کا بھی پورا پورا ملکہ ہو۔

اجتہاد کے شرائط

کسی فقیہ میں یہ استعداد کب پیدا ہوتی ہے اور استخراج احکام کا ملکہ اسے کب میسر آتا ہے، اس کے لیے علمائے اصول نے پانچ شرائط رقم کی ہیں:

(۱) ان يكون عالما بنصوص الكتاب والسنة فان قصر في احدهما لم يكن مجتهدا ولا يجوز له الاجتهاد ۔

یعنی وہ کتاب اور سنت کے نصوص کا عالم ہو، اگر ان دو میں سے کسی میں اس کا علم ناقص ہو تو وہ مجتہد نہیں ہوسکتا،

اورنہ اس کے لیے جائز ہے، کہ وہ اجتہاد کرے۔

لیکن کیا تمام آیات قرآنی اور تمام سنن نبوی کا جاننا مجتہد کے لیے شرط اول ہے، اس کے بارے میں علماے اصول نے تصریح کی ہے، کہ کم از کم ان آیات کا علم ضروری ہے، جن کا تعلق احکام سے ہے، اور علما کی تحقیق کے مطابق ان کی تعداد پانچ سو ہے، اسی طرح احادیث سے مراد بھی وہی احادیث ہیں، جن کا تعلق احکام شرعیہ سے ہے، اہل علم کے نزدیک ان کی تعداد بارہ سو ہے:

قال احمد رحمه الله الاصول التي يدور عليها العلم عن النبي صلى الله عليه وسلم ينبغي ان تكون الفا ومأتين ۔

امام احمد فرماتے ہیں، کہ وہ اصول جن پر اس علم کا دارومدار ہے، جو بارگاہ نبوی سے مستفاد ہوتے ہیں، ان کی تعداد بارہ سو ہے۔

عقل سلیم بھی اس کو تسلیم کرتی ہے، کہ اجتہاد کرنے کا حق صرف اس شخص کے لیے تسلیم کیا جائے، جو قرآن وسنت میں ماہرانہ دسترس رکھتا ہو، کیوں کہ یہ وہ دو چشمے ہیں، جن سے احکام شرعیہ کا استنباط کیا جاتا ہے، جس شخص کو ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک میں ماہرانہ دسترس نہ ہو اسے یہ حق نہیں پہنچتا، کہ وہ اجتہاد کی مسند پر متمکن ہونے کا خواب دیکھ سکے۔

(۲) ان يكون عارفا بمسائل الاجماع حتى لا يفتي بخلاف ما وقع الاجماع عليه ۔

مجتہد بننے کے لیے دوسری شرط یہ ہے، کہ کتاب وسنت کے علاوہ وہ ان مسائل سے بھی باخبر ہو، جن پر علما کا اجماع ہو چکا ہے، تاکہ وہ ایسا فتویٰ نہ دے، جو اس مسئلہ کے خلاف ہو جس پر پہلے اجماع متحقق ہو چکا ہے۔

(۳) ان يكون عالما بلسان العرب بحيث يمكنه تفسير ما ورد فى الكتاب والسنة من الغريب ونحوه ۔

تیسری شرط یہ ہے، کہ عربی زبان کا عالم ہو تاکہ جو مشکل اور غریب الفاظ قرآن کریم اور سنت نبویہ میں استعمال ہوئے ہیں، ان کی تشریح کر سکے۔

(۴) صرف ونحو، معانی اور بیان میں بھی مہارت رکھتا ہو تاکہ جملوں کی ترکیب کر سکے اور عبارت میں دیگر لطائف بلاغت جو پنہاں ہیں، ان پر آگاہی حاصل کر سکے۔

(۵) ان يكون عارفا بالناسخ والمنسوخ ۔

یعنی وہ آیات واحادیث میں سے ناسخ اور منسوخ کو جانتا ہو ایسا نہ ہو کہ عدم واقفیت کی وجہ سے ناسخ کے ہوتے ہوئے منسوخ پر عمل پیرا رہے۔ (مقالات، پیر کرم شاہ ازہری)

قرآن وحدیث میں اجتہاد

قرآن مجید میں اجتہاد کی مثال:

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (الانبیاء ۷۸، ۷۹)

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام جب اس کھیت کا فیصلہ کرنے لگے، جس کی فصل کو ایک قوم کی بکریوں نے رات میں روند ڈالا تھا، ان کا فیصلہ ہمارے سامنے تھا، تو ہم نے سلیمان کو اس کی فہم عطا کی اور ہم نے دونوں کو حکومت دی تھی اور علم عطا فرمایا تھا۔

مفسرین نے لکھا ہے، کہ داؤد علیہ السلام کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا، کہ ایک شخص کے کھیت میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں آگئیں اور کھیت کا نقصان کردیا، حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ دیکھ کر کہ بکریوں کی قیمت اس مالیت کے برابر ہے، جس کا کھیت والے نے نقصان اٹھایا تھا، یہ فیصلہ کیا، کہ بکریاں کھیت والے کو دے دی جائیں، حضرت سلیمان نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ کھیت والا اپنے پاس بکریاں رکھے اور ان سے فائدہ اٹھائے اور بکریوں والے کھیت کو دوبارہ اصل حالت پر لانے کے لیے کھیتی باڑی کریں، جب کھیت پہلی حالت پر واپس آجائے تو بکریاں ان کے مالکوں کو لوٹا دیں اور کھیت والے اپنا کھیت لے لیں، اس میں دونوں کا نقصان نہ ہوگا، حضرت داؤد نے یہ فیصلہ سن کر حضرت سلیمان کی تحسین فرمائی اور اپنی رائے سے رجوع کرلیا، فقہی اصطلاح میں حضرت داؤد نے حضرت سلیمان کے استحسان کے مقابلہ میں اپنے قیاس سے رجوع فرمالیا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی پیش آمدہ مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اصول شرع کے مطابق اپنی رائے دینا اجتہاد ہے اور کبھی ایک مسئلہ میں اجتہاد سے دو حل معلوم ہوتے ہیں، ایک حل ظاہر اور دوسرا حل خفی ہوتا ہے، ظاہر کو قیاس اور خفی کو استحسان کہتے ہیں:

حدیث شریف میں اجتہاد کی یہ مثال ہے:

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله عليه وسلم قال بينما امرأتان معهما ابنا هما جاء الذئب فذهب بابن احداهما فقالت هذه لصاحبتها انما ذهب بابنك انت وقالت الاخرى انما ذهب بابنك فتحاكمتا الى داؤد عليه الصلاة والسلام فقضى به للكبرى فخرجتا على سليمان بن داؤد عليهما الصلاة والسلام فاخبرتاه فقال ائتونى بالسكين اشقه بينكما فقالت الصغرى لا، يرحمك الله هو ابنها فقضىٰ به للصغرىٰ ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دو عورتیں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ جارہی تھیں، ان میں سے ایک کے بچہ کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا، ایک نے اپنے ساتھ والی سے کہا، کہ تیرے بچے کو بھیڑیا لے گیا ہے، دوسری نے کہا، نہیں! تیرے بچے کو لے گیا ہے، دونوں نے حضرت

داؤد علیہ السلام کے پاس مقدمہ پیش کیا، حضرت داؤد نے بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر دیا، پھر وہ دونوں حضرت سلیمان کے پاس گئیں انہوں نے فرمایا، چھری لاؤ میں اس کے دو ٹکڑے کر کے تم دونوں کو دے دوں، چھوٹی نے کہا، نہیں اللہ تم پر رحم کرے، وہ اسی کا بیٹا ہے، پھر حضرت سلیمان نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

حضرت داؤد نے غالباً بچہ کی مشابہت بڑی عورت کے ساتھ دیکھی تھی، یا بچہ کو بڑی عورت کی گود میں دیکھا، اس وجہ سے اجتہاد کر کے بڑی کے حق میں فیصلہ کر دیا، اس کے برخلاف حضرت سلیمان نے حیلہ سے کام لیا اور آزمائش کر کے امر باطنی کو معلوم کیا پھر چھوٹی کے حق میں فیصلہ کر دیا، بہر حال قرآن مجید اور حدیث صحیح کی ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے، کہ کسی پیش آمدہ مسئلہ میں قواعد شرعیہ کے مطابق غور و فکر کر کے کوئی حل بیان کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔

اجتہاد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۔ (حشر: ۲)

اے صاحبان عقل قیاس کرو!

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

اس آیت سے قیاس شرعی کی مشروعیت پر استدلال بہت مشہور ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اعتبار کرنے کا حکم دیا ہے، اور اعتبار کا معنی ہے، ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف منتقل ہونا اور یہ معنی قیاس میں بھی متحقق ہے، کیوں کہ قیاس میں اصل کے حکم کو فرع کی طرف منتقل کرتے ہیں، حضرت ابن عباس نے دانتوں کو انگلیوں پر قیاس کیا ہے، یعنی چوں کہ انگلیوں کی دیت مساوی ہے، اس لیے انہوں نے دانتوں کی دیت بھی مساوی قرار دی ہے۔ (روح المعانی ج ۲۸ ص ۴۱)

علامہ خفاجی نے لکھا ہے، کہ اس آیت میں ہمیں اعتبار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اعتبار کا معنی ہے، کسی چیز کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانا، بایں طور کہ اس شے پر اس کی نظیر کا حکم عائد کیا جائے اور یہ اعتبار نصیحت حاصل کرنے، قیاس شرعی اور قیاس لغوی کو شامل ہے، یہ آیت نصیحت حاصل کرنے پر عبارتاً اور قیاس پر اشارتاً دلالت کرتی ہے۔ (عنایۃ القاضی ج ۸ ص ۱۷۶)

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں، اس آیت سے قیاس کی حجیت پر استدلال کیا گیا ہے، کیوں کہ اس آیت میں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز کا حکم بیان کیا گیا ہے، اور دو چیزوں میں جو مشارکت ہے، اس کی وجہ سے ایک کا حکم دوسرے پر لاگو کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہی قیاس ہے۔ (انوار التنزیل علی حاشیۃ الشہاب ج ۸ ص ۷۷-۱۷۶)

علامہ ابو سعود نے لکھا ہے، کہ اس آیت سے قیاس کی حجیت پر استدلال کیا جاتا ہے۔ (تفسیر ابو سعود ج ۸ ص ۱۰۸)

احادیث سے اجتہاد پر دلائل

ان عمرو بن العاص اجنب فی لیلة باردة فتیمم وتلا ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما فذکر ذلك للنبی صلی اللہ علیه وسلم فلم یعنف ۔ (بخاری ج ۱ ص ۴۹)

ایک سرد رات میں حضرت عمرو بن عاص جنبی ہو گئے، انہوں نے تیمّم کیا اور یہ آیت تلاوت کی (اپنے آپ کو قتل مت کرو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرنے والا ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا گیا تو آپ نے ملامت نہیں کی۔

تیمّم کے بارے میں قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ۔ (النسآء: ۴۳، المائدہ: ٦)

اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے اپنی بیویوں سے عمل زوجیت کیا ہو اور پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمّم کرو۔

قرآن مجید نے سفر میں یا مرض کی حالت میں پانی پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے تیمّم کی اجازت دی ہے، حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سفر میں تھے نہ بیمار تھے، البتہ انہیں سرد رات میں غسل کرنے سے بیماری کا ظن غالب تھا، اس آیت میں بیماری کے خدشہ کی بنا پر تیمّم کی اجازت نہیں ہے، لیکن انہوں نے قرآن مجید کی دوسری آیت ''لا تقتلوا انفسکم'' سے یہ استنباط اور اجتہاد کیا، کہ سرد رات میں غسل کرنے سے بیمار پڑ جانے کا خدشہ اور خطرہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے منع کیا ہے، کہ وہ خود کو ہلاک کریں، اس لیے انہوں نے غسل کی بجائے تیمّم کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جب یہ خبر پہنچی، تو آپ نے حضرت عمرو بن عاص کے اجتہاد کو مقرر اور ثابت رکھا اور انہیں ملامت نہیں کی۔

علامہ عینی لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ملامت نہ کرنے اور ان کے نماز نہ دہرانے سے یہ مسئلہ معلوم ہوا، کہ ایسی صورت میں تیمّم کرنا جائز ہے اور یہ قاعدہ کلیہ معلوم ہو گیا، کہ جس شخص کو پانی استعمال کرنے سے ہلاکت یا مرض کا خطرہ ہو وہ تیمّم کر سکتا ہے، خواہ یہ خطرہ سردی کی وجہ سے ہو یا کوئی اور سبب ہو خواہ وہ سفر میں ہو یا مقیم ہو اور وہ شخص جنبی ہو یا بے وضو اور اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اجتہاد ہوتا تھا۔ (عمدۃ القاری ج٦ ص٢٦٥)

عن معاذ بن جبل ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث معاذا الی الیمن فقال کیف تقضی فقال اقضی بما فی کتاب اللہ قال فان لم یکن فی کتاب اللہ قال فبسنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فان لم یکن فی سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اجتهد برائی قال الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی به رسول اللہ ۔(مشکوٰۃ: ص ۳۲۴ باب العمل فی القضاء)

حضرت معاذ بیان کرتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا اور پوچھا، تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا، میں کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا، اگر کتاب

اللہ میں تصریح نہ ہو؟ انہوں نے کہا، پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فیصلہ کروں گا آپ نے فرمایا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تصریح نہ ہو؟ انہوں نے کہا، پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، آپ نے فرمایا، اللہ کی حمد ہے، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمائندہ کو اس کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔

جب مجتہد کسی پیش آمدہ مسئلہ میں اپنی تمام علمی صلاحیتوں کو صرف کر کے کوئی حکم مستنبط کرتا ہے، اور وہ حکم اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس پر دو اجر عطا فرماتا ہے اور اگر وہ حکم عند اللہ غلط ہوتا ہے تو مجتہد کو اپنے اجتہاد پر پھر بھی اجر ملتا ہے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذاحكم الحاكم فاجتهد فاصاب فله اجران واذا حكم فاخطأ فله اجر واحد ۔ (اتحاف المهرة لابن حجر ج۱۴ ص۵۲۷)

حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب حاکم اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے اور وہ صحیح ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور جب وہ فیصلہ کرنے میں خطا کرے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو ایک گرامی نامہ بھیجا، جس میں مقدمات کے فیصلہ کرنے کے اصول تحریر فرمائے، آپ نے لکھا:

اقض بما استبان لك من كتاب الله فان لم تعلم كل كتاب الله فاقض بما استبان لك من قضاء رسول الله صلى الله عليه وسلم فان لم تعلم كل اقضية رسول الله فاقض بما استبان لك عن الائمة المجتهدين فان لم تعلم كلها قضت به الائمة المجتهدون فاجتهد رايك واستشر اهل العلم والصلاح ۔ (ازالة الخفاء ج۲، ص۸۵)

جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو تو کتاب اللہ کے مطابق اس کا فیصلہ کرو اگر تم کتاب اللہ سے نہ معلوم کر سکو، تو حضور کے فیصلہ کے مطابق اور اگر تمہیں اس بارے میں حضور کے فیصلہ کا علم نہ ہو تو ائمہ مجتہدین کے فیصلہ کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر ائمہ مجتہدین سے بھی پتہ نہ چلے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور اہل علم وصلاح سے مشورہ کرو۔

اس طرح کی کثیر التعداد آیات واحادیث اور آثار خلفائے راشدین موجود ہیں، جن سے اجتہاد کے جواز کا ہی پتہ نہیں چلتا بلکہ اجتہاد کرنے کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔

جس وقت ہم یہ کہتے ہیں، کہ اسلام میں استدلال واستنباط اور فقہ واجتہاد کی گنجائش اور لچک موجود ہے، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں، کہ اسلام کا پیش کردہ نظام فکر اپنے اندر دلالت وتعلیل اور قیاس ورائے کی وافر مقدار رکھتا ہے اور اس میں وہ تمام پہلو

اورطرق استنباط واستخراج مسائل پائے جاتے ہیں، جو کسی منظم مذہب کا خاصہ ٹھہرائے جاسکتے ہیں، چنانچہ ادنی تامل سے معلوم ہوجاتا ہے، کہ قرآن وحدیث اسی قسم کے استدلالات کا حامل ہے، اس کے تین پہلو ہیں، ایک وہ جو براہ راست کتاب وسنت کے الفاظ سے متعلق ہے، دوسرا وہ جو کچھ داخلی دلائل سے لگاؤ رکھتا ہے اور تیسرا وہ جس کو دلائل سے تعبیر کرسکتے ہیں، یہ تینوں پہلو مل کر فقہ واجتہاد کا مکمل ڈھانچا تیار کرتے ہیں۔

اجتہاد کے ادوار

عہد رسالت

عہد رسالت میں ہدایات ربانیہ کا نزول ہورہا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ہدایات الہیہ کو صحابہ تک پہنچانے اور ان کی تعبیر وتفہیم کا فریضہ انجام دے رہے تھے، نئے پیش آمدہ مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی کے منتظر رہتے، حکم الٰہی آجاتا تو اجتہاد کی ضرورت نہ ہوتی، بصورت دیگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی حکمت عملی اور مزاج کی رعایت سے اور ان ہی بنیادی اصولوں کی روشنی میں پیش آمدہ مسئلہ کا حکم صادر فرمادیتے اور اس حکم کو الٰہی شریعت میں قانونی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

البتہ اگر یہ حکم عارضی مصلحت پر مبنی ہونے یا کسی خاص امر کی رعایت کی وجہ سے وقتی اور عارضی ہوتا تو اس مصلحت کے ختم ہونے کے بعد وہ حکم بھی ختم ہوتا یا ملتوی کردیا جاتا، ورنہ اس کی حیثیت دائمی ہوتی اور بعد کے لیے بھی اس پر عمل درآمد باقی رہتا تھا، خواہ قالب اور روح دونوں کی شکل میں یا صرف روح اور مقصد کی صورت میں۔

غرض اجتہاد چوں کہ ہدایت الٰہی کی تکمیل کا ایک اہم باب تھا، اس بناپر رسول اللہ نے بہ نفس نفیس اس کا دروازہ کھولا اور دین کی تکمیل فرماکر آپ تشریف لے گئے۔

نبی اس بات پر بھی مامور ہوتا ہے، کہ وہ ایک ایسی جماعت تیار کرے جو اس کے بعد ہر حیثیت سے الٰہی تعلیمات کی محافظ اور مقاصد کو بروئے کار لانے والی ہو چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غرض کی تکمیل کے لیے صحابہ کرام کی جماعت تیار فرمادی تھی، جس نے آپ کے بعد مزاج شناس نبوت بن کر اجتہاد کے کام کو آگے بڑھایا۔

اس جماعت کے سامنے ہدایت الٰہی (کتاب اللہ) کا مجموعہ موجود اور تشریحات نبوی (سنت) کا ذخیرہ سینوں میں محفوظ تھا، نیز اس نے رسول اللہ سے براہ راست تعلیم وتربیت حاصل کرکے دونوں کے موقع ومحل اور نوک پلک سے بخوبی واقفیت حاصل کرلی تھی۔

جماعت میں کچھ حضرات ایسے بھی تھے، جو قانونی معاملہ میں خصوصیت سے ممتاز تھے اور اس سلسلہ میں ان کے لیے رسول اللہ کی زبان مبارک سے شہادت موجود تھی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حالات ومقتضیات کی مناسبت سے بعض ایسے مسائل پیش آئے جن کے بارے میں کوئی صراحت نہ تھی، تو لامحالہ ان حضرات کو اجتہاد سے کام لینا پڑا، کہ اس کے بغیر مقاصد نبوت کے بروئے کار آنے کی کوئی اور صورت نہ تھی۔

اجتہاد کے اصول وقواعد بعد میں منضبط ہوئے ہیں ان حضرات کا اجتہاد مقاصد شریعت اور اصول دین پر مبنی تھا، جس کی دو صورتیں تھیں۔

(۱) جو احکام قرآن وسنت میں موجود تھے، ان کے الفاظ ومعانی اور موقع ومحل میں غور کیا جاتا، اگر ان کی عمومیت اس قابل ہوتی کہ نئے پیش آمدہ مسائل کو اس میں شامل کیا جا سکتا تو زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہ تھی، موجودہ احکام اور ان کے موقع ومحل میں غور وفکر کر کے نئے مسائل کا حل تلاش کر لیا جاتا تھا۔

(۲) اور اگر یہ صورت نہ بن سکتی یعنی الفاظ ومعانی اور موقع ومحل میں غور وفکر سے کام نہ چلتا تو موجودہ احکام کی مزید گہرائی میں جا کر نئے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا، یعنی عمومی مفہوم اور کلی اصول کے پیش نظر ان کا دامن وسیع کر کے نئے مسائل کو ان کے ساتھ شامل کیا جاتا اور مقصد میں یکسانیت کی صورت میں وہی حکم نئے پیش آمدہ مسائل میں بھی جاری کر دیا جاتا۔

دوسرا دور

فتوحات کی کثرت اور مختلف تمدنی زندگی سے سابقہ کی وجہ سے اس دور میں نئے نئے سیاسی واجتماعی مسائل ابھر آئے، حالات وزمانہ کے تقاضوں کی نئی نئی کروٹوں نے اجتماعی مسائل حل کرنے کے لیے نئے نئے زاویہ نگاہ پیدا کر دیے، لازمی طور سے پہلے دور کا جو مجموعہ موجود اور سینوں میں محفوظ تھا، اس کو اس حد تک وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، کہ موجودہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کسی اور روشنی سے استفادے کی ضرورت نہ باقی رہے۔

اجماع اور رائے کا اضافہ

چنانچہ اس دور میں مذکورہ ضرورت کے پیش نظر مسائل حل کرنے کے لیے دو چیزوں کا اضافہ ہوا (۱) اجماع (۲) رائے کا استعمال۔ ان دونوں سے کام لینے کی ترغیب قرآن وسنت میں موجود تھی، چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد موجودہ دور کے حضرات ہی دین اسلام کے اصل محافظ اور امین تھے اور رہتی دنیا تک ان کے عمل سے استفادہ نبوت کے نقشہ میں داخل تھا، اس بنا پر ان حضرات نے اپنی ذمے داری محسوس کرتے ہوئے فقہ کو وسیع کرنے کی راہیں کھولیں اور بعد والوں کے لیے بہت کچھ سرمایہ جمع کر دیا۔

اس دور میں اجماع کو منظم شکل دی گئی، صورت یہ ہوئی، کہ صاحب صلاحیت لوگوں پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، جو بات قرآن وسنت میں موجود نہ ہونے کی صورت میں باہمی رائے اور مشورے سے طے پاتی وہ قانون کا درجہ حاصل کرتی تھی۔

رائے کے استعمال کے لیے فقہی قواعد واصول بعد میں منضبط ہوئے ہیں، اس دور میں رائے کا استعمال مقاصد شریعت اور اصول دین کے تحت ہوتا تھا، اور جو رائے آزادانہ استعمال کی جاتی، یا اس کی وجہ سے اصول کلیہ پر ضرب پڑتی تو اس پر سخت نکیر کی جاتی تھی۔

مذکورہ دونوں ماخذ کے اضافے کے باوجود اس دور میں بھی فقہ عملی اور واقعاتی رہی، جو ضرورت پیش آتی یا جو مسئلہ حل طلب ہوتا، بس اسی کو طے فرمالیتے، نظری مسائل اور بعد میں پیش آنے والے واقعات ومسائل کی طرف توجہ کرنے کی انہیں فرصت ہی نہ تھی، گوناگوں مصلحتوں کے لحاظ سے اسلامی ضرورتیں اس قدر وسیع ہوگئی تھیں، کہ ان پر قابو پالینا ہی اہم کارنامہ تھا۔

تیسرا دور

یہ دور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت ۴۱ھ سے شروع ہوکر دوسری صدی ہجری کی ابتدا تک رہتا ہے، فقہ کی ترتیب وتدوین کا پورا مواد اسی دور میں تیار ہوا تھا، اس بنا پر اس کو ترتیب وتدوین کا تاسیسی دور کہنا زیادہ مناسب ہے۔

اس دور کی یہ خصوصیات فقہ پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔

(۱) مسلمانوں کی باہمی فرقہ بندیاں، فرقوں کے رجحانات ومیلانات ایک حد تک باہم مختلف ہونے کی وجہ سے اپنے اپنے فرقے کے آدمیوں کو ترجیح دیتے تھے۔

(۲) مرکز میں پہلی جیسی جاذبیت نہ باقی رہنے کی وجہ سے اور اسلامی کاز کو آگے بڑھانے کی غرض سے علما وفقہا مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیل گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کرلی تھی، ان حضرات کی تعلیم وتربیت سے تابعین کی ایک جماعت تیار ہوئی، جو صحابہ کے بعد صحیح معنوں میں ان کی جانشین ثابت ہوئی، ان میں سے بعض تابعی ایسے بھی تھے، جو بجا طور پر علم میں صحابہ کے ہم پلہ تھے۔

(۳) اس دور میں احادیث کی روایت کا سلسلہ جاری ہوا اور حدیث کا عام رواج ہوا، صحابہ کے زمانے میں ایک حد تک اس پر پابندی تھی، لوگوں کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل موجود تھا، اس بنا پر زیادہ ضرورت بھی نہ تھی، اب نظام تشریعی کی نوک پلک درست رکھنے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور آپ کی وہ زندگی جو صحابہ نے اپنے اندر سرایت کی تھی، تعلیم وتربیت کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ عام کی جائے۔

(۴) غیر عرب لوگوں کی تعلیم وتربیت سے آراستہ ایک بڑی جماعت تیار ہوئی اور اس نے تمام اسلامی شہروں میں تعلیم وتربیت کے مرکز قائم کیے، یہ حضرات اپنی صلاحیت کے لحاظ سے عرب کے مقابلہ میں کم نہ تھے، بلکہ بعض مورخین کا خیال ہے، کہ فقہ اور حدیث میں عجم کا حصہ عرب سے زیادہ ہے، اس طرح غیر عربی ممالک کے لوگوں کو نظام تشریعی سمجھنے، اس کا تجزیہ کرنے اور نئے انداز سے سوچنے کے کافی مواقع فراہم ہوئے۔

(۵) رائے اور حدیث کو استعمال کرنے کی حد میں اختلاف ہوا، جس کی بنا پر دو مختلف گروہ بن گئے، ایک گروہ انہیں

حدیثوں کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیتا جو موجود تھیں، اور اس کو مل سکتی تھیں، اس بنا پر اس کا دائرہ نسبتاً تنگ اور محدود تھا، دوسرا گروہ شریعت کو عقلی اور اصولی معیار سے دیکھتا اور حدیث نہ ملنے کی صورت میں رائے کا استعمال کرتا تھا، اس بنا پر اس کا دائرہ نسبتاً وسیع تھا، اہل حجاز کا رجحان اول کی طرف تھا اور مرکز مدینہ تھا اور اہل عراق کا دوسرے کی طرف تھا جس کا مرکز کوفہ تھا۔ ظاہر ہے کہ حجازیوں کو حدیث حاصل کرنے میں جتنی سہولتیں تھیں، عراقیوں کو اتنی میسر نہ تھیں، اس وقت ملکوں اور شہروں میں ایسے روابط نہ تھے، کہ جن کی بنا پر حدیثی مسائل کی باہمی شیرازہ بندی کی جاسکتی بخلاف رائے سے کام لینے والے گروہ کے جو علل واسباب کا سراغ لگا کر اصول کے تحت بڑی حد تک احکام و مسائل کی شیرازہ بندی کرسکتا تھا، اس کے علاوہ پہلے کے مقابلہ میں اس گروہ کو تمدنی زندگی اور گوناگوں احوال و مسائل سے زیادہ سابقہ تھا، بیرونی اثرات یہاں کافی تھے، مختلف تمدن اور مختلف مکاتب فکر کے لوگ موجود تھے، اس بنا پر لازمی طور سے دونوں کے نقطہ نظر میں بڑا فرق اور فتاوی و فیصلہ میں اختلاف ہوگا۔

اس دور میں ''قیاس''، ''استحسان''، ''استصلاح'' وغیرہ کا استعمال کثرت سے ہونے لگا تھا، فقہا پر نئے نئے مسائل کا دباؤ ایسا پڑا، کہ انہیں مذکورہ اصولوں کے بغیر چارہ نہ تھا۔

اس دور کے مشہور فقہا و مفتیان درج ذیل ہیں:

مدینہ کے فقہا

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوہریرہ، حضرت سعید بن مسیب مخزومی، حضرت عروہ بن زبیر بن عوام، حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن، حضرت علی بن حسین، حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود، حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، حضرت سلیمان بن یسار، حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر، حضرت نافع، حضرت ابن شہاب زہری، حضرت ابوجعفر محمد بن علی بن حسین، حضرت ابوالزناد، حضرت عبداللہ بن ذکوان، حضرت یحییٰ بن سعید انصاری، حضرت ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہم۔

مکہ

حضرت [illegible] بن [illegible]، حضرت مجاہد بن جبیر، حضرت عکرمہ، حضرت عطا بن ابی رباح، حضرت ابوزبیر، محمد بن مسلم رضی اللہ عنہم۔

کوفہ

حضرت علقمہ بن قیس نخعی، حضرت مسروق بن اجدع، حضرت عبیدہ بن عمر سلمانی، حضرت اسود بن یزید نخعی، حضرت شریح بن حارث کندی، حضرت ابراہیم بن یزید نخعی، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عامر بن شرجبیل رضی اللہ عنہم۔

بصرہ

حضرت انس بن مالک انصاری خادم رسول، حضرت ابوالعالیہ، حضرت ابوالشعشا جابر بن زید، حضرت محمد بن سیرین، حضرت حسن بن ابی الحسن یسار، حضرت قتادہ بن دعامہ رضی اللہ عنہم۔

شام

حضرت عبدالرحمٰن بن غنم اشعری، حضرت ابوادریس خولانی، حضرت قبیصہ بن ذویب، حضرت مکحول بن ابومسلم، حضرت رجاء بن حیوۃ الکندی، حضرت عمر بن عبدالعزیز بن مروان رضی اللہ عنہم۔

مصر

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت ابوالخیر مرثد بن عبداللہ، حضرت یزید بن ابی حبیب رضی اللہ عنہم۔

یمن

حضرت طاؤس بن کیسان جندی، حضرت وہب بن منبہ، حضرت یحییٰ بن ابی کثیر رضی اللہ عنہم۔

چوتھا دور

چوتھے دور کی بنیاد تیسرے دور میں پڑ چکی تھی، اور فقہ کی باقاعدہ تدوین اس دور میں ہوئی، جلیل القدر امام اور پیشوا جن کے مقلدین اطراف عالم میں پھیلے ہوئے اپنے اپنے امام کی طرف منسوب فقہ پر عمل پیرا ہیں، وہ اسی دور کے ہیں۔

اس دور کی امتیازی خصوصیات

اس دور کی خصوصیات فقہ پر کافی اثر انداز ہوئیں۔

(۱) تمدن کی وسعت، جس کی وجہ سے نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں اور غور وفکر کے لیے نئے نئے میدان سامنے آئے۔

(۲) عمومی حیثیت سے علمی حرکت ہوئی، یونانی علوم وفنون کی ترویج ہوئی اور ایک دوسرے سے استفادہ کے مواقع فراہم ہوئے۔

اس دور کے مشہور فقہا و مجتہدین مندرجہ ذیل ہیں:

امام اعظم ابوحنیفہ، سفیان بن سعید ثوری، شریک بن عبداللہ نخعی، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ۔

امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں درج ذیل کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری، محمد بن حسن بن فرقد شیبانی، زفر بن ہذیل بن قیس کوفی، حسن بن زیاد لولوی کوفی۔

امام مالک بن انس بن ابی عامر: محدثین وفقہا دونوں گروہ میں ان کے شاگرد ہیں، کیوں کہ ان میں محدث اور فقیہ دونوں کے وصف موجود تھے، اصول مصالح مرسلہ سے امام مالک نے فقہ کو کافی وسیع بنایا۔

امام محمد بن ادریس شافعی جو امام شافعی کے نام سے مشہور ہیں ان کے شاگرد مصر اور عراق دونوں جگہ کافی تعداد میں موجود تھے۔

امام احمد بن حنبل بن ہلال ان کے بھی محدثین و فقہا دونوں گروہ میں کافی شاگرد ہیں۔

ابو عبد الرحمٰن محمد بن محمد اوزاعی، ابو سلیمان داؤد ظاہری، ابو جعفر محمد جریر طبری، امام اسحاق بن راہویہ، امام لیث بن سعد۔

شہرت کے عمومی اسباب

یہ چاروں امام وہ ہیں، جن کے مسلک نے شہرت حاصل کی، ان کی فقہ مدون کی گئی، اور باقی رہی۔ شہرت کے عمومی اسباب یہ تھے:

(۱) ان حضرات کی تمام رائیں جمع کر لی گئی تھیں، پہلے دور کے لوگوں کو یہ بات نہ حاصل تھی، اس بنا پر مستقل رائے کی حیثیت سے ان کے مقابلہ میں ان کو شہرت حاصل نہ ہوئی۔

(۲) ان کے شاگردوں کو سوسائٹی میں اونچا درجہ حاصل ہوا، پھر جب انہوں نے اپنے استاذوں کی رائیں نقل کیں تو وہ نہایت وقعت کی نظر سے دیکھی گئیں۔

(۳) شاگردوں نے ان کی رائے کی اشاعت و حمایت میں کافی زور لگایا۔

(۴) بعض مسالک اپنی وسعت اور ان میں ضرورتوں کے زیادہ پورا ہونے کی وجہ سے حکومت کے قانون بن گئے تھے۔

فقہ کے بعض مذاہب اور بھی ہیں، جن کے حوالے موجود تھے، اور ایک زمانہ تک ان کی پابندی کی جاتی رہی لیکن بعد میں دوسرے مذاہب غالب آ گئے اور وہ گم شدگی کا شکار ہو گئے۔

تقلید

کسی شخص کا کسی کے علم اور تقویٰ پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے قول پر عمل کرنا، اس مجتہد کے بیان کردہ حکم کو تسلیم کرنا اور طلب دلیل تک عمل کو موخر نہ کرنا تقلید ہے۔

علامہ ابن ملک اور علامہ ابن العینی فرماتے ہیں:

وهو عبارة عن اتباعه فی قوله او فعله للحقية من غير تامل فی الدليل ۔ (شرح مناوی مصری ص ۲۵۲)

یعنی تقلید حسن عقیدت کے ساتھ کسی کے قول یا فعل کے اتباع کرنے کو کہتے ہیں، بغیر دلیل کی فکر میں پڑے ہوئے۔

نامی شرح حسامی میں ہے:

التقليد اتباع الغير على ظن انه محق بلا نظر فی الدليل ۔ (ص ۱۹۰)

یعنی دوسرے کو اہل حق خیال کرتے ہوئے اس کی دلیل کی فکر میں پڑے بغیر اس کی تابعداری کر لینا تقلید ہے۔

ان تعریفات کا حاصل یہ ہے، کہ مقلد مجتہد کے قول و فعل کو دریافت کر کے محض حسن عقیدت اور حسن ظن کی بنا پر عمل کرے اور اپنے اس تسلیم و عمل کے لیے مجتہد کے اجتہاد میں دلیل کی فکر نہ کرے اگر بعد میں مقلد کو مجتہد کی دلیل کا علم ہو گیا یا اپنے ذاتی علم، مطالعہ، اور تجسس و تفحص سے اس مسئلہ کے متعلق بہت سے دلائل دریافت ہو گئے تو یہ امر تقلید کے منافی نہیں ہے۔

تقلید کی دو صورتیں

پھر اس تقلید کی بھی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ تقلید کے لیے کسی خاص امام و مجتہد کو معین نہ کیا جائے، بلکہ اگر ایک مسئلہ میں ایک عالم کا مسلک اختیار کیا گیا ہے، تو دوسرے مسئلہ میں کسی دوسرے عالم کی رائے قبول کر لی جائے، اس کو تقلید مطلق یا تقلید عام یا تقلید غیر شخصی کہتے ہیں، اور دوسری صورت یہ ہے، کہ تقلید کے لیے کسی ایک مجتہد عالم کو اختیار کیا جائے اور ہر ایک مسئلہ میں اسی کا قول اختیار کیا جائے اسے تقلید شخصی کہا جاتا ہے۔

تقلید کی ان دونوں قسموں کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے، کہ ایک شخص براہ راست قرآن و سنت سے احکام مستنبط کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، تو وہ جس مجتہد کو قرآن و سنت کے علوم کا ماہر سمجھتا ہے، اس کی فہم و بصیرت اور اس کے تفقہ پر اعتماد کر کے اس کی تشریحات کے مطابق عمل کرتا ہے اور یہ وہ چیز ہے، جس کا جواز بلکہ وجوب قرآن و سنت کے بہت سے دلائل سے ثابت ہے۔

تقلید کی ہدایت قرآن میں

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔ (نساء: ۴/ ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے آپ میں سے اولوالامر کی اطاعت کرو۔

”اولوالامر“ کی تفسیر میں بعض حضرات نے تو یہ فرمایا، کہ اس سے مراد مسلمان حکام ہیں، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے فقہا مراد ہیں، یہ دوسری تفسیر حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت مجاہد، حضرت عطا بن ابی رباح، حضرت عطا بن السائب، حضرت حسن بصری، حضرت ابوالعالیہ اور دوسرے بہت سے مفسرین سے منقول ہے اور امام رازی نے اسی تفسیر کو متعدد دلائل کے ذریعہ ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے:

اس آیت میں لفظ اولوالامر سے علما مراد لینا اولیٰ ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۳۴)

اور امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں، کہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں، بلکہ دونوں مراد ہیں اور مطلب یہ ہے، کہ حکام کی اطاعت سیاسی معاملات میں کی جائے اور علما فقہا کی مسائل شریعت کے باب میں۔

(احکام القرآن للجصاص ج ۲ ص ۲۵۶)

بہر حال اس تفسیر کے مطابق آیت میں مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے، کہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں اور ان علما وفقہا کی اطاعت کریں، جو اللہ اور رسول کے کلام کے شارح ہیں، اور اسی اطاعت کا اصطلاحی نام تقلید ہے۔

رہا اسی آیت کا اگلا جملہ جس میں ارشاد ہے، کہ:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔

(النساء:۴/۵۹)

پس اگر کسی معاملے میں تمہارا باہم اختلاف ہو جائے تو اس معاملے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو اگر اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ اس تفسیر کے مطابق مستقل جملہ ہے، جس میں مجتہدین کو خطاب کیا گیا ہے، چنانچہ امام ابوبکر جصاص اولوالامر کی تفسیر علما سے کرنے کی تائید میں لکھتے ہیں:

وقوله تعالیٰ عقيب ذلك فان تنازعتم فی شیٔ فردوه الی الله والرسول يدل علی ان اولی الامر هم الفقهاء لانه امر سائر الناس بطاعتهم ثم قال فان تنازعتم الخ فامر اولی الامر برد المتنازع فيه الی كتاب الله وسنة نبيه صلی الله عليه وسلم اذ كانت العامة ومن ليس من اهل العلم ليست هذه منزلتهم لانهم لايعرفون كيفية الرد الی كتاب الله والسنة ووجوه دلائلهما علی احكام الحوادث فثبت انه خطاب للعلماء ۔

اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دینے کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان اختلاف ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، اس بات کی دلیل ہے، کہ اولوالامر سے مراد فقہا ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو ان کی اطاعت کا حکم دیا، پھر فان تنازعتم الخ فرما کر اولوالامر کو حکم دیا، کہ جس معاملے میں ان کے درمیان اختلاف ہوا سے اللہ کی کتاب اور نبی کریم کی سنت کی طرف لوٹا دو، یہ حکم فقہا ہی کو ہو سکتا ہے، کیوں کہ عوام الناس اور غیر اہل علم کا یہ مقام نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتے، کہ اللہ کی کتاب اور سنت کی طرف کسی معاملے کو لوٹانے کا کیا طریقہ ہے اور نہ انہیں نت نئے مسائل مستنبط کرنے کے لیے دلائل کے طریقوں کا علم ہوتا ہے، لہٰذا ثابت ہو گیا، کہ خطاب علما سے ہے۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ۲۷۵)

(۲) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۔ (النساء:۴/۸۳)

اور جب ان (عوام الناس) کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے تو یہ اس کی اشاعت کر دیتے ہیں اور اگر یہ اس معاملے کو رسول کی طرف یا اپنے اولوالامر کی طرف لوٹا دیتے تو ان میں سے جو لوگ اس کے استنباط کے اہل ہیں، وہ اس کی حقیقت کو خوب معلوم کر لیتے۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص معاملے میں نازل ہوئی ہے، لیکن جیسا کہ اصول تفسیر اور اصول فقہ کا مسلم قاعدہ ہے، آیات سے احکام و مسائل مستنبط کرنے کے لیے شان نزول کے خصوصی حالات کے بجائے آیت کے عمومی الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے، اس لیے اس آیت سے یہ اصولی ہدایت مل رہی ہے، کہ جو لوگ تحقیق و نظر کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کو اہل استنباط کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور وہ اپنی اجتہادی بصیرت کو کام میں لا کر جو راہ عمل متعین کریں اس پر عمل کرنا چاہیے، اسی کا نام تقلید ہے، چنانچہ امام رازی اس آیت کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

فثبت ان الاستنباط حجة والقياس اما استنباط او داخل فيه فوجب ان يكون حجة اذا ثبت هذا فنقول الآية دالة على امور احدها ان في احكام الحوادث مالا يعرف بالنص بل بالاستنباط وثانيها ان الاستنباط حجة وثالثها ان العامي يجب عليه تقليد العلماء في احكام الحوادث ۔

پس ثابت ہوا، کہ استنباط حجت ہے اور قیاس یا تو بذات خود استنباط ہوتا ہے یا اس میں داخل ہوتا ہے، لہٰذا وہ بھی حجت ہوا جب یہ بات طے ہوگئی تو اب ہم کہتے ہیں، کہ یہ آیت چند امور کی دلیل ہے ایک یہ کہ نت نئے پیش آنے والے مسائل میں بعض امور ایسے ہوتے ہیں، جو نص سے (صراحتاً) معلوم نہیں ہوتے، بلکہ ان کا حکم معلوم کرنے کے لیے استنباط کی ضرورت پڑتی ہے، دوسرے یہ کہ استنباط حجت ہے اور تیسرے یہ کہ عام آدمی پر واجب ہے کہ وہ پیش آنے والے مسائل و احکام کے بارے میں علما کی تقلید کرے۔

(تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۷۲)

(۳) قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ (النحل: ۱۶/۴۳، الانبیاء ۲۱/۷)

اگر تمہیں علم نہ ہو تو اہل ذکر سے پوچھ لو۔

اس آیت میں یہ اصولی ہدایت دے دی گئی ہے، کہ جو لوگ کسی علم و فن کے ماہر نہ ہوں، انہیں چاہیے کہ وہ اس علم و فن کے ماہرین سے پوچھ پوچھ کر عمل کیا کریں اور یہی چیز تقلید کہلاتی ہے، چنانچہ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

واستدل بها ايضا على وجوب المراجعة للعلماء فيما لايعلم وفي الاكليل للجلال السيوطي انه استدل بها على جواز تقليد العامي في الفروع ۔ (روح المعانی ج ۱۴ ص ۱۴۸)

اور اس آیت سے اس بات پر بھی استدلال کیا گیا ہے، کہ جس چیز کا علم خود نہ ہو اس میں علما سے رجوع کرنا واجب ہے اور علامہ جلال الدین سیوطی اکلیل میں لکھتے ہیں، کہ اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے، کہ عام آدمیوں کے لیے فروعی مسائل میں تقلید جائز ہے۔

تقلید کی ہدایت حدیث میں

قرآن کریم کی طرح بہت سی احادیث و آثار سے بھی تقلید کا جواز ثابت ہوتا ہے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) عن حذیفة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انى لا ادرى ما بقائى فيكم فاقتدوا بالذين من بعدى ابى بكر وعمر ۔ (رواہ الترمذی حدیث: ۳۶۶۲ وابن ماجہ واحمد)

حضرت حذیفہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ مجھے معلوم نہیں میں کتنا عرصہ تمہارے درمیان رہوں گا، پس تم میرے بعد دو شخصوں کی اقتدا کرنا، ایک ابوبکر، دوسرے عمر۔

یہاں یہ بات بطور خاص قابل غور ہے، کہ حدیث میں لفظ ''اقتدا'' استعمال کیا گیا ہے، جو انتظامی امور میں کسی کی اطاعت کے لیے نہیں، بلکہ دینی امور میں کسی کی پیروی کے لیے استعمال ہوتا ہے، عربی لغت کے مشہور عالم ابن منظور لکھتے ہیں:

القُدوة والقِدوة ماتسنّنتَ به ۔

یعنی قُدوہ اور قِدوہ اس شخص کو کہتے ہیں، جس کی سنت پر تم عمل کرو۔

آگے لکھتے ہیں:

القدوہ الاسوة ۔

قدوہ کے معنی اسوہ (نمونہ) ہیں۔

قرآن کریم میں بھی یہ لفظ دینی امور میں انبیا علیہم السلام اور صلحا کی پیروی کے لیے استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام: ۶/۹۰)

یہی لوگ ہیں، جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے، پس تم ان کی ہدایت کی اقتدا کرو۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس شخص میں دو خصلتیں ہوں گی، اللہ تعالیٰ اسے شاکر و صابر لکھے گا۔ وہ خصلتیں یہ ہیں:

من نظر فی دینه الی من هو فوقه فاقتدی به ونظر فی دنیاه الی من هو دونه فحمد الله ۔

جو شخص دین کے معاملے میں اپنے سے بلند مرتبہ شخص کو دیکھے اور اس کی اقتدا کرے اور دنیا کے معاملے میں نیچے کے شخص کو دیکھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے (کہ اس نے مجھے اس سے اچھی حالت میں رکھا)۔

(ترمذی مع شرح ابن العربی ج۹ ص ۳۱۷)

عہد صحابہ اور تقلید مطلق

عہد صحابہ میں بکثرت تقلید پر عمل ہوتا رہا ہے، یعنی جو حضرات صحابہ تحصیل علم میں زیادہ وقت صرف نہیں کر سکتے تھے، یا کسی خاص مسئلے میں اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے، وہ دوسرے فقہاے صحابہ سے پوچھ پوچھ کر عمل کیا کرتے تھے اور ان حضرات میں تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں صورتوں کا ذکر ملتا ہے، خاص طور سے تقلید مطلق کی مثالیں تو بکثرت پائی جاتی ہیں:

(۴) عن ابن عباس قال خطب عمر بن الخطاب الناس بالجابية وقال يا ايها الناس من اراد ان يسال عن القرآن فليات ابى بن كعب ومن اراد ان يسال عن الفرائض فليات زيد بن ثابت ومن اراد ان يسال عن الفقه فليات معاذ بن جبل ومن اراد ان يسأل عن المال فلياتنى فان الله جعلنىٰ له واليا وقاسما (رواہ الطبرانی فی الاوسط، مجمع الزوائد ج۱ص۱۳۵)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، کہ حضرت عمر نے جابیہ کے مقام پر خطبہ دیا اور فرمایا، اے لوگو! جو شخص قرآن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہو، وہ ابی بن کعب کے پاس جائے، جو میراث کے احکام کے بارے میں پوچھنا چاہے وہ زید بن ثابت کے پاس جائے، جو شخص فقہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے، وہ معاذ بن جبل کے پاس جائے اور جو شخص مال کے بارے میں سوال کرنا چاہتا ہے، وہ میرے پاس آجائے اس لیے کہ اللہ نے مجھے اس کا والی اور تقسیم کنندہ بنایا ہے۔

اس خطبے میں حضرت عمر نے لوگوں کو عام طور پر یہ ہدایت فرمائی ہے، کہ تفسیر، فرائض، اور فقہ کے معاملات میں ان ممتاز علما سے رجوع کر کے ان سے معلومات کیا کریں اور ظاہر ہے، کہ ہر شخص دلائل سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا، اس لیے یہ حکم دونوں صورتوں کو شامل ہے، کہ جو لوگ اہل ہوں وہ ان علما سے دلائل بھی سیکھیں اور جو اہل نہ ہوں وہ محض ان کے اقوال پر اعتماد کر کے ان کے بتائے ہوئے مسائل پر عمل کریں، جس کا نام تقلید ہے، چنانچہ صحابہ کرام میں سے جو حضرات اپنے آپ کو اہل استنباط و اجتہاد نہیں سمجھتے تھے، وہ فقہاے صحابہ سے رجوع کرتے وقت ان سے دلائل کی تحقیق نہیں فرماتے تھے، بلکہ ان کے بتائے ہوئے مسائل پر اعتماد کر کے عمل فرما لیتے۔

عن عمر بن الخطاب راى على طلحة بن عبيدالله ثوبا مصبوغا وهو محرم فقال عمر ماهذا الثوب المصبوغ يا طلحة ؟ فقال طلحة بن عبيدالله يا اميرالمومنين انما هو مدر فقال عمر انكم ايها الرهط ائمة يقتدى بكم الناس فلو ان جاهلا راى هذا الثوب لقال ان طلحة بن عبيدالله قد كان يلبس الثياب المصبغة فى الاحرام فلا تلبسوا ايها الرهط شيئا من هذه الثياب المصبغة ۔ (مسند احمد ج۱ص۱۹۲)

حضرت عمر بن خطاب نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ کو دیکھا، کہ انہوں نے احرام کی حالت میں رنگا ہوا کپڑا پہن

رکھا ہے، حضرت عمر نے ان سے کہا طلحہ! یہ رنگا ہوا کپڑا کیسا؟ حضرت طلحہ نے جواب دیا، امیر المومنین! یہ تو گیرو ہے، (جس میں خوشبو نہیں ہوتی اور بغیر خوشبو کے رنگین کپڑا پہننا جائز ہے) حضرت عمر نے فرمایا آپ حضرات امام و مقتدا ہیں لوگ آپ کی اقتدا کرتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی ناواقف آدمی (آپ کے جسم پر) یہ کپڑا دیکھے گا تو وہ یہ کہے گا، کہ طلحہ بن عبید اللہ احرام کی حالت میں رنگے ہوئے کپڑے پہنا کرتے تھے، (لہٰذا ہر قسم کے رنگین کپڑے پہننا جائز ہے، چنانچہ وہ خوشبو والے رنگین کپڑے بھی پہننے لگیں گے) لہٰذا آپ حضرات اس قسم کے رنگے ہوئے کپڑے نہ پہنا کریں۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو (خاص قسم کے) موزے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

عزمت عليك الانزعتهما فانى اخاف ان ينظر الناس اليك فيقتدون بك ۔ (الاستیعاب ج۲ ص۳۱۵)

میں تمہیں قسم دیتا ہوں، کہ ان کو اتار دو، اس لیے کہ مجھے خوف ہے، کہ لوگ تمہیں دیکھیں گے تو تمہاری اقتدا کریں گے۔

مذکورہ بالا تینوں واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں، کہ صحابہ کرام میں سے جو حضرات علم و فقہ میں امتیازی مقام رکھتے تھے، ان کے صرف اقوال اور فتووں کی نہیں بلکہ ان کے افعال کی بھی تقلید اور اتباع کی جاتی تھی۔

حضرت عمر نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ بھیجا، اور اہل کوفہ کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:

انى قد بعثت اليكم بعمار بن ياسر اميرا وعبدالله بن مسعود معلما ووزيرا وهما من النجباء من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم من اهل بدر فاقتدوا بهما واسمعوا من قولهما ۔ (اعلام الموقعین فصل ۸۶، ص ۲۱۸)

میں نے تمہارے پاس عمار بن یاسر کو امیر بنا کر اور عبداللہ بن مسعود کو معلم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے، اور یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نجبا صحابہ میں سے ہیں، اور اہل بدر میں سے ہیں، پس تم ان کی اقتدا کرو اور ان کی بات سنو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود قضا کے اصول بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

فمن عرض له منكم قضاء بعداليوم فليقض بما فى كتاب الله فان جاءه امر ليس فى كتاب الله فليقض بما قضى به نبيه صلى الله عليه وسلم فان جاءه امر ليس فى كتاب الله ولاقضى به نبيه صلى الله عليه وسلم فليقض بما قضى به الصالحون فان جاءه امر ليس فى كتاب الله ولاقضى به نبيه صلى الله عليه وسلم ولا قضى به الصالحون فليجتهد رايه ۔

(سنن نسائی ج۲ ص۳۰۵)

آج کے بعد جس شخص کو قضا کا معاملہ پیش آئے، اسے چاہیے کہ وہ کتاب اللہ سے فیصلہ کرے، پھر اگر اس کے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، پھر اگر کوئی ایسا معاملہ آجائے جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ ہو تو صالحین نے جو فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے اور اگر ایسا معاملہ پیش آجائے، جو نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہو اور نہ صالحین نے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے۔

عہد صحابہ اور تقلید شخصی

اسی طرح تقلید شخصی کی بھی متعدد مثالیں ذخیرہ احادیث میں ملتی ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

صحیح بخاری میں حضرت عکرمہ سے روایت ہے:

ان اهل المدينة سالوا ابن عباس رضي الله عنهما عن امرأة طافت ثم حاضت قال لهم تنفر قالوا لاناخذ بقولك وندع قول زيد ۔ (صحيح بخارى كتاب الحج باب اذا حاضت المرأة بعد ما افاضت)

بعض اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس سے اس عورت کے بارے میں سوال کیا، جو طواف فرض کے بعد حائضہ ہوگئی ہو (کہ وہ طواف وداع کے لیے پاک ہونے تک انتظار کرے یا طواف وداع اس سے ساقط ہوجائے گا اور بغیر طواف کے واپس آنا جائز ہوگا) ابن عباس نے فرمایا، کہ وہ (طواف وداع کے بغیر) جاسکتی ہے، اہل مدینہ نے کہا، کہ ہم زید بن ثابت کے قول کو چھوڑ کر آپ کے قول پر عمل نہیں کریں گے۔

اور یہی روایت معجم اسماعیلی میں عبدالوہاب الثقفی کے طریق سے مروی ہے، اس میں اہل مدینہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

لانبالي افتيتنا اولم تفتنا زيد بن ثابت يقول لا تنفر ۔ (فتح الباری ج۳ ص۴۶۸)

ہمیں پرواہ نہیں کہ آپ فتویٰ دیں یا نہ دیں زید بن ثابت کا قول یہ ہے، کہ وہ (طواف وداع کے بغیر) نہیں جاسکتی۔

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ہذیل بن شرحبیل سے ایک واقعہ مروی ہے، کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے کچھ لوگوں نے ایک مسئلہ پوچھا، انہوں نے جواب تو دے دیا، مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی پوچھ لو، چنانچہ لوگ حضرت ابن مسعود کے پاس گئے اور ان سے بھی وہ مسئلہ پوچھا اور ساتھ ہی حضرت ابوموسیٰ اشعری کی رائے بھی ذکر کردی، حضرت عبداللہ بن مسعود نے جو فتویٰ دیا، وہ حضرت ابوموسیٰ کے فتوے کے خلاف تھا، لوگوں نے حضرت ابوموسیٰ سے حضرت ابن مسعود کے فتویٰ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا:

لاتسالوني مادام هذاالحبر فيكم ۔ (صحیح بخاری ج۲، ۹۹۷)

جب تک یہ تبحر عالم (یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود) تمہارے درمیان موجود ہیں، اس وقت تک مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو۔

یہاں حضرت ابوموسیٰ اشعری اس بات کا مشورہ دے رہے ہیں، کہ جب تک حضرت عبداللہ بن مسعود زندہ ہیں، اس وقت تک تمام مسائل انہی سے پوچھا کرو اور اسی کا نام تقلید شخصی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کا وہ واقعہ جو اس سے پہلے مذکور ہوا، کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا والی و معلم بنا کر بھیجتے وقت دریافت کیا تھا جب کوئی قضیہ تمہارے سامنے پیش آئے گا تو کس طرح فیصلہ کرو گے، عرض کیا کہ کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا، فرمایا، اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ ہو؟ تو عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے فیصلہ کروں گا، آپ نے فرمایا، کہ اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں میں نہ ملے تو؟ عرض کیا، اس وقت اپنی رائے سے اجتہاد و استنباط کروں گا اور حق تک پہنچنے کی کوشش میں کوتاہی نہ کروں گا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (فرط مسرت سے) حضرت معاذ کے سینے پر اپنا دست مبارک مارا اور فرمایا، کہ اللہ کا شکر ہے، اس نے اللہ کے رسول کے اس قاصد کو اس بات کی توفیق دی، جس پر اللہ کا رسول راضی ہے۔

یہ واقعہ تقلید و اجتہاد کے مسئلہ میں ایک ایسی شمع ہدایت ہے، کہ اس پر جتنا غور کیا جائے، اس مسئلہ کی گتھیاں سلجھتی چلی جاتی ہیں، یہاں ہمیں اس واقعہ کے صرف ایک پہلو پر توجہ دلانا مقصود ہے، اور وہ یہ کہ آپ نے اہل یمن کے لیے اپنے فقہاے صحابہ میں سے صرف ایک جلیل القدر صحابی کو بھیجا اور انہیں حاکم و قاضی اور معلم و مجتہد بنا کر اہل یمن پر لازم کر دیا کہ وہ ان کی اتباع کریں، انہیں صرف قرآن و سنت ہی نہیں بلکہ قیاس و اجتہاد کے مطابق فتویٰ صادر کرنے کی اجازت عطا فرمائی، اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے، کہ آپ نے اہل یمن کو ان کی تقلید شخصی کی اجازت دی، بلکہ اس کو ان کے لیے لازم فرما دیا۔

حضرت معاذ صرف ایک مستند حکمران بن کر یمن تشریف نہیں لے گئے تھے، بلکہ ایک معلم اور مفتی کی حیثیت سے بھی تشریف لے گئے تھے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے:

عن الاسود بن یزید قال اتانا معاذ بن جبل بالیمن معلما و امیرا فسالناه عن رجل توفی وترك ابنته واخته فاعطى الابنة النصف والاخت النصف ۔ (ایضا)

حضرت اسود بن یزید کہتے ہیں، کہ حضرت معاذ بن جبل ہمارے پاس یمن آئے وہ ہمارے امیر بھی تھے اور معلم بھی تھے، ہم نے ان سے یہ مسئلہ پوچھا، کہ ایک شخص نے وفات کے بعد اپنی بیٹی اور بہن چھوڑی ہے، (ان کو کیا میراث ملے گی؟) تو حضرت معاذ نے بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف میراث دی۔

یہاں حضرت معاذ نے بحیثیت مفتی ایک فتویٰ دیا اور اس کی دلیل بھی بیان نہ فرمائی۔

حضرت معاذ بن جبل وہ صحابی ہیں، جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ”اعلمهم بالحلال والحرام“ (صحابہ کرام میں

حلال وحرام کا سب سے بڑا عالم) قرار دیا، اور جن کے بارے میں ارشاد فرمایا:

انه يحشر يوم القيامة بين يدى العلماء نبذة۔ (الفتح الربانی ج۲۱ ص۳۵۲)

ان کو قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا، کہ یہ علما کی قیادت کرتے ہوئے ان سے اتنے آگے ہوں گے جتنی دور تک ایک تیر جاتا ہے۔

چنانچہ صرف اہل یمن ہی نہیں، بلکہ دوسرے صحابہ بھی ان کی تقلید کرتے تھے:

عن ابی مسلم الخولانی قال اتيت مسجد اهل دمشق فاذا حلقة فيها كهول من اصحاب النبی صلی الله عليه وسلم (وفی رواية كثير بن هشام فاذا فيه نحو ثلاثين كهلا من اصحاب النبی صلی الله عليه وسلم) واذا شاب فيهم اكحل العينين براق الثنايا كلما اختلفوا فی شئ ردوه الی الفتی فتی شاب قال قلت لجليس لی من هذا؟ قال هذا معاذ بن جبل۔ (مسند احمد ج۵ ص۲۳۶)

ابو مسلم خولانی کہتے ہیں، کہ میں اہل دمشق کی مسجد میں آیا، تو دیکھا، کہ وہاں ایک حلقہ ہے، جس میں ادھیڑ عمر کے صحابہ کرام موجود ہیں، (کثیر بن ہشام کی روایت میں ہے، کہ صحابہ کی تعداد تیس کے لگ بھگ تھی) انہیں میں میں نے دیکھا، کہ ایک نوجوان ہے، جس کی آنکھیں سرگیں اور سامنے کے دانت چمکدار ہیں، جب ان صحابہ کے درمیان کسی مسئلہ میں اختلاف رائے ہوتا تو وہ اس کا فیصلہ اسی نوجوان سے کراتے، میں نے اپنے ایک ہم نشیں سے پوچھا، کہ یہ کون ہیں؟ اس نے جواب دیا، یہ معاذ بن جبل ہیں۔

ملاحظہ فرمایئے، تیس کے قریب صحابہ کرام اختلافی مسائل میں حضرت معاذ بن جبل کی پیروی کرتے تھے۔

تقلید شخصی کی ضرورت

لہٰذا تقلید پر عمل کرنے کے لیے تقلید مطلق یا تقلید شخصی میں سے جس صورت پر بھی عمل کرلیا جائے اصلاً جائز ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ رحمتیں نازل فرمائے ہمارے بعد کے فقہا پر جو اپنے اپنے زمانے کے نبض شناس تھے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات پر نگاہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، انہوں نے بعد میں ایک زبردست انتظامی مصلحت کے تحت تقلید کی مذکورہ دونوں قسموں میں سے صرف تقلید شخصی کو عمل کے لیے اختیار فرمالیا اور یہ فتویٰ دے دیا، کہ اب لوگوں کو صرف تقلید شخصی پر عمل کرنا چاہیے۔

فقہائے کرام نے محسوس فرمایا، کہ لوگوں میں دیانت کا معیار روز بروز گھٹ رہا ہے، احتیاط اور تقویٰ اٹھتے جارہے ہیں، ایسی صورت میں اگر تقلید مطلق کا دروازہ کھلا رہا، تو بہت سے لوگ جان بوجھ کر اور بہت سے غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہوجائیں گے، مثلاً ایک شخص کو سردی کے موسم میں خون نکل آیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا اور امام

شافعی کے نزدیک نہیں ٹوٹا، وہ اپنی تن آسانی کی وجہ سے اس وقت امام شافعی کی تقلید کر کے بلا وضو نماز پڑھ لے گا، پھر اس کے تھوڑی دیر بعد اگر اس نے کسی عورت کو چھو لیا تو امام شافعی کے نزدیک اس کا وضو جاتا رہا اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک برقرار ہے، اس کی تن آسانی اس موقع پر اسے امام ابوحنیفہ کی تقلید کا سبق دے گی اور پھر وہ بلا وضو نماز کے لیے کھڑا ہو جائے گا، غرض جس امام کے قول میں اسے آرام و فائدہ نظر آئے گا، اسے اختیار کر لے گا اور جس قول میں کوئی مضرت نظر آئے یا خواہشات کی قربانی دینی پڑے اسے چھوڑ دے گا اور ایسا بھی ہوگا، کہ اس کا نفس اسی قول کی صحت کی دلیل سمجھائے گا، جو اس کے لیے زیادہ آسان ہے، اور وہ بالکل غیر شعوری طور پر خواہش پرستی میں مبتلا ہوگا۔

ظاہر ہے، کہ اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ نکلے گا، کہ احکام شرعیہ نفسانی خواہشات کا ایک کھلونا بن کر رہ جائیں گے اور یہ وہ چیز ہے، جس کے حرام قطعی ہونے میں آج تک کسی مسلمان کا اختلاف نہیں ہوا۔

شارح مسلم امام نووی تقلید شخصی کے وجوب کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ووجهه انه لوجاز اتباع اى مذهب شاء لافضى الى ان يلتقط رخص المذاهب متبعا هواه ويتخير بين التحليل والتحريم والوجوب والجواز وذلك يودى الى انحلال ربقة التكليف بخلاف العصر الاول فانه لم تكن المذاهب الوافية باحكام الحوادث مهذبة وعرفت فعلى هذا يلزمه ان يجتهد فى اختيار مذهب يقلده على التعيين .

(المجموع شرح المہذب ج ۱ ص ۹۱)

اس (تقلید شخصی کے لازم ہونے) کی وجہ یہ ہے، کہ اگر اس بات کی اجازت ہو کہ انسان جس فقہی مذہب کی چاہے پیروی کر لیا کرے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، کہ لوگ ہر مذہب سے آسانیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی خواہشات نفس کے مطابق ان پر عمل کیا کریں گے، حلال و حرام اور واجب و جائز کے احکام کا سارا اختیار خود لوگوں کو مل جائے گا، اور بالآخر شرعی احکام کی پابندیاں بالکل کھل کر رہ جائیں گی، البتہ پہلے زمانہ میں تقلید شخصی اس لیے ممکن نہ تھی، کہ فقہی مذاہب مکمل طور سے مدون اور معروف و مشہور نہ تھے، (لیکن اب جب کہ مذاہب فقہیہ مدون اور مشہور ہو چکے) ہر شخص پر لازم ہے، کہ کوشش کر کے کوئی ایک مذہب چن لے اور پھر معین طور سے اسی کی تقلید کرے۔

علامہ ابن خلدون تقلید شخصی کے رواج اور مذاہب اربعہ میں تقلید شخصی کے انحصار کے اسباب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ووقف التقليد فى الامصار عند هؤلاء الاربعة ودرس المقلدون لمن سواهم وسد الناس باب الخلاف وطرقه لما كثر تشعب الاصطلاحات فى العلوم ولما عاق عن الوصول الى

رتبة الاجتهاد ولما خشی من اسناد ذلك الی غیر اهله ومن لا یوثق برایه ولا بدینه فصرحوا بالعجز والاعواز وردوا الناس الی تقلید هؤلاء کل من اختص به من المقلدین وحظروا ان یتداول تقلیدهم لما فیه من التلاعب ۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۸)

اور تمام شہروں میں تقلید ان ائمہ اربعہ میں محصور ہوگئی، دوسرے ائمہ کے مقلدین ختم ہو گئے اور لوگوں نے (ان ائمہ سے) اختلاف کا دروازہ بند کردیا، جس کی ایک وجہ تو یہ تھی، کہ علوم کی اصطلاحات پیچیدہ ہوکر پھیل گئی تھیں اور اس کی وجہ سے اجتہاد کے مرتبے تک پہنچنا سخت مشکل ہوگیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی، کہ اس بات کا اندیشہ تھا، کہ اجتہاد نااہلوں کے قبضہ میں نہ چلا جائے اور ایسے لوگ اسے استعمال نہ کرنے لگیں، جن کی رائے اور دین پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا علمانے اجتہاد سے عجز اور اس کی نایابی کا اعلان کردیا اور لوگوں کو ان ائمہ اربعہ کی تقلید شخصی کی طرف لوٹا دیا اور اس بات کو ممنوع کردیا، کہ ان ائمہ کی بدل بدل کر تقلید کی جائے (یعنی کبھی ایک امام کی اور کبھی دوسرے امام کی) کیوں کہ یہ طریقہ دین کے کھلونا بن جانے کا سبب ہوجاتا۔

علامہ ابن خلدون مزید لکھتے ہیں:

اس لیے اس طرح کی تقلید کرنے سے علما لوگوں کو منع کرنے لگے اور ایک ہی امام کی تقلید کرنے پر زور دینے لگے اس طرح صرف نقل مذہب باقی رہ گیا اور بعد تصحیح اصول واتصال سند بالروایہ ہر مقلد اپنے اپنے امام مجتہد کی تقلید کرنے لگا اور فقہ سے آج بجز اس امر کے اور کچھ مطلب نہیں ہے، اور فی زمانا مدعی اجتہاد مردود اور اس کی تقلید مہجور اور متروک ہے اور اہل اسلام ان ہی ائمہ اربعہ کی تقلید پر مستقیم ہوگئے ہیں۔ (ایضا)

خلاصہ یہ ہے، کہ صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں دیانت عام تھی، جس پر اعتماد کیا جاسکتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے ان کی نفسیات اس قدر مغلوب تھیں، کہ خاص طور سے شریعت کے احکام میں انہیں خواہشات کی پیروی کا خطرہ نہیں تھا، اس لیے ان حضرات کے دور میں تقلید مطلق اور تقلید شخصی دونوں پر عمل ہوتا رہا، بعد میں جب یہ زبردست خطرہ سامنے آیا تو تقلید کو تقلید شخصی میں محصور کردیا گیا اور حقیقت یہ ہے، کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو احکام شریعت کے معاملہ میں جو افراتفری برپا ہوتی اس کا تصور ہم مشکل ہی سے کرسکتے ہیں۔

اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

اعلم ان الاخذ بهٰذه المذاهب الاربعة مصلحة عظیمة وفی الاعراض عنها کلها مفسدة کبیرة ۔ (ایضاً بحوالہ عقد الجید ص ۳۱)

یعنی مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں عظیم فائدہ ہے اور ان کے ترک کرنے میں بہت بڑا فساد ہے۔

تقلید شخصی کا انحصار مذاہب اربعہ میں

چوتھی صدی ہجری میں جب کہ مذاہب اربعہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کی کتب فقہ مدون ہوکر اقطار عالم میں پھیل گئیں اوران مذاہب اربعہ میں سے کسی نہ کسی مذہب پر ہرجگہ اور ہر شخص کے لیے عمل کرنا سہل اورآسان ہوگیا اور بتقدیر الٰہی ان چار ائمہ مجتہدین، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اورامام احمد بن حنبل کے مذاہب کے سواباقی تمام مذاہب جو چوتھی صدی ہجری سے قبل کچھ نہ کچھ پائے جاتے تھے، اسباب حفاظت کی کمی یااور کسی وجہ سے ختم ہوگئے، بلکہ کہنا چاہیے کہ مشیت ایزدی اسی طرح تھی، کہ جس کا باقی رہنا مقصود تھا، باقی رہا ورنہ اٹھ گیا، اوراہل سنت و جماعت میں ان چار مذاہب کے سوااور کوئی مذہب مروج اور معمول بہ نہ رہااور بوجہ عدم ضرورت اجتہاد میں بھی کمی آگئی، تب چوتھی صدی ہجری میں ان چاروں ائمہ کے مذاہب میں تقلید شخصی کا انحصار ہوگیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

بجز مذاہب اربعہ کے دوسرے تمام مذاہب تقریباً معدوم ہوگئے، تب ان ہی چاروں کا اتباع سواد اعظم کا اتباع قرار پایا اوران سے باہر ہونا سواد اعظم سے نکلنا ہوا۔

علامہ سید احمد طحطاوی فرماتے ہیں:

ھٰذہ الطائفة الناجیة قد اجتمعت الیوم فی مذاھب اربعة وھم الحنفیون والمالکیون والشافعیونَ والحنبلیون رحمھم اللّٰہ تعالیٰ ومن کان خارجاً عن ھذہ الاربعة فی ھٰذاالزمان فھو من اھل النار والبدعة(الفضل الموھبی ص ۲۳)

یعنی اہلسنّت کا ناجی گروہ اس وقت چار مذہبوں میں مجتمع ہے(حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی) اللہ تعالیٰ ان مذاہب والوں پر رحم فرمائے، اس زمانے میں جو شخص ان مذہبوں سے باہر ہے، وہ بدعتی اور جہنمی ہے۔

اس سے ائمہ اربعہ کی جلالت شان کا پتہ چلتا ہے، کہ نہ وہ صرف خود حق پر تھے، بلکہ ان کا پیرو ہونا اہل حق کی علامت قرار پایا۔

* * *

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نقوش حیات

نام ونسب

اسم گرامی نعمان، کنیت ابوحنیفہ اور لقب امام اعظم اور سراج الامہ۔

صاحب حدائق الحنفیہ نے نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:

نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان بن ثابت بن قیس بن یزدگرد بن شہریار بن پرویز بن نوشیرواں۔ (حدائق الحنفیہ ص ۳۲)

لیکن جمہور ائمہ اور مورخین کے نزدیک متفق علیہ سلسلۂ نسب یہ ہے:

نعمان بن ثابت بن زوطی (نعمان) بن ماہ (مرزبان) (وفیات الاعیان ج ۵ ص ۴۰۵)

اسم گرامی نعمان کے لغوی معنی بیان کرتے ہوئے علامہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں:

اتفقوا على انه النعمان وفيه سر لطيف اذ اصل النعمان الدم الذى به قوام البدن ومن ثمه ذهب بعضهم الى انه الروح فابوحنيفة رحمه الله به قوام الفقه ومنه منشأ مداركه وعويصاته او نبت احمر طيب الروح الشقيق او الارجوان بضم الهمزة فابوحنيفة رحمه الله طابت خلاله وبلغ الغاية كماله او فعلان من النعمة فابوحنيفة نعمة الله على خلقه .

(الخیرات الحسان ص ۴۱)

ائمہ اس پر متفق ہیں، کہ آپ کا نام نعمان ہے اور اس میں ایک لطیف راز ہے، نعمان کی اصل ایسا خون ہے، جس سے بدن (کا ڈھانچہ) قائم ہوتا ہے، اسی وجہ سے بعض نے کہا، کہ نعمان کا معنی روح ہے، پس امام ابوحنیفہ کی وجہ سے فقہ اسلامی کا ڈھانچہ قائم ہے اور آپ ہی فقہ یعنی تمام اسلامی احکام کے دلائل اور مشکلات کے حل کی بنیاد ہیں یا نعمان کا معنی سرخ خوشبودار گھاس ہے یا ارغوان کے رنگ کو نعمان کہتے ہیں، اس معنی کی رو سے امام ابوحنیفہ کی عادات مبارکہ اچھی ہوئیں اور آپ کا کمال انتہا کو پہنچا یا نعمان کا لفظ نعمت سے فعلان کے وزن پر ہے پس امام ابوحنیفہ مخلوق پر اللہ کی نعمت ہیں۔

آپ کی شخصیت اسم بامسمیٰ تھی۔

کنیت ابوحنیفہ کسی صاحبزادی کی وجہ سے نہیں تھی، کیوں کہ آپ کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادے حماد ہیں۔ یہ کنیت معنی وصفی کے لحاظ سے ہے۔ خداوند تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔(آل عمران: ۳/۹۵)

فرمادو! اللہ نے سچ کہا، تم ابراہیم کے دین کی پیروی کرو، جو ہر باطل سے منہ موڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کے ہوگئے تھے۔

علامہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں:

وعلیٰ ان کنیته ابو حنیفة مؤنث حنیف وهو الناسك او المسلم لان الحنف المیل والمسلم مائل الی الدین الحق ۔(الخیرات الحسان ص ۴۱)

آپ کی کنیت ابوحنیفہ ہونے پر اتفاق ہے، جو حنیف کا مونث ہے۔ حنیف کا معنی ناسک (عبادت گزار) یا مسلم ہے کیوں کہ حنف کا معنی مائل ہونا ہے اور مسلم دین حق کی طرف مائل ہوتا ہے۔

ولادت

امام اعظم کی ولادت کے بارے میں تین اقوال ہیں۔ (۱) ۸۰ھ (۲) ۷۰ھ (۳) ۶۱ھ جمہور ائمہ کے نزدیک قول مقبول ومعروف ومختار ۸۰ھ ہے، جس کے قائل اسماعیل بن حماد بن ابوحنیفہ نعمان، ابونعیم، ابراہیم بن علی شیرازی، محمد بن طاہر قیسرانی، امام ابن جوزی، امام ذہبی عبدالقاہر بن ابی الوفاء قرشی، ابن حجر مکی اور احمد بن محمد ہیں۔ ۷۰ھ کا قول کرنے والے امام ابن حبان، ابوالقاسم سمنانی، امام سمعانی، بذرالدین عینی ہیں۔ ۶۱ھ کا قول کرنے والے امام مزاحم ہیں۔

ابن خلکان نے اول کو اصح بتایا ہے۔ (وفیات ابن خلکان: ۵/۴۱۴)

خاندان اور آبا واجداد

امام اعظم کے آبا واجداد فارسی الاصل تھے۔ ان کے وطن کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں، انبار کے رہنے والے تھے اور بعض بابل کا باشندہ قرار دیتے ہیں، یہی زیادہ صحیح ہے۔ امام عبدالرحمٰن مقری فرماتے ہیں:

کان ابو حنیفة من اهل بابل ۔(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۵)

ابوحنیفہ اہل بابل سے ہیں۔

خطیب کی ایک روایت میں جو عمر بن حماد سے ہے زوطی کا وطن کابل قرار دیا گیا ہے:

فاما زوطیٰ فانه من اهل کابل ۔(ایضًا)

قاضی بہلول الحسان التنوخی کا قول ہے:

ثابت والد ابی حنیفة من اهل الانبار ۔(تهذیب الاسماء واللغات ج۲ ص ۵۰۲)

آبائی وطن کے سلسلے میں مختلف روایات کی تطبیق اس طرح بھی ہوسکتی ہے، کہ امام صاحب کے اجداد نے مختلف مقامات پر قیام کیا ہو، آخر میں بابل کو وطن بنایا، جہاں سے زوطی قبول اسلام کے بعد کوفہ منتقل ہو گئے۔

آپ کے دادا زوطی نے اسلام قبول کیا، جن کا اسلامی نام نعمان رکھا گیا، نعمان نے قبول اسلام کے بعد کوفہ میں سکونت اختیار کی جو اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا دارالخلافہ تھا اور وہ کبھی کبھی بارگاہ امیر المومنین میں عقیدت وارادت کے ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے۔

ایک بار نوروز کے موقع پر جو ایرانیوں کی عید کا دن ہے، فالودہ بطور نذر پیش کیا، حضرت علی نے ارشاد فرمایا:

نوروزنا کل یوم ۔(تاریخ بغداد ج۱۳ ص ۳۲۶)

ہمارے یہاں ہر روز نوروز ہے۔

جب امام صاحب کے والد ثابت کی ولادت ہوئی، تو نعمان ان کو حضرت علی کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے آپ نے ثابت اور ان کی اولاد کے لیے دعائے خیر فرمائی۔ مدینۃ العلم حضرت علی کی دعا ہی کا اثر ہے، کہ ثابت کے گھر دنیائے اسلام کے عظیم مجتہد، جلیل القدر فقیہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا بیان ہے:

انا اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان من ابناء فارس الاحرار والله ماوقع علینا رق قط ولد جدی فی سنة ثمانین وذهب ثابت الی علی بن ابی طالب وهو صغیر ودعاله بالبرکة وفی ذریته ونحن نرجو من الله ذلك ان یکون قد استجاب الله ذلك لعلی بن ابی طالب فینا ۔(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۶)

میں اسماعیل بن حماد بن نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان از اولاد فرس احرار ہوں، اللہ کی قسم ہم پر کبھی غلامی نہیں آئی ہے، میرے دادا (حضرت ابوحنیفہ) کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی۔ (ان کے والد) ثابت چھوٹی عمر میں حضرت علی بن ابی طالب کے پاس گئے، حضرت علی نے ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے برکت کی دعا کی اور ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کی دعا ہمارے حق میں قبول فرمائی۔

امام صاحب کے معاندین نے تنقیص شان کی غرض سے یہ روایت بیان کی کہ آپ کے والد بنی تیم اللہ کے آزاد کردہ غلام ہیں، ستم ظریفی یہ ہے کہ اس روایت نے خوب شہرت پائی، حالاں کہ اس قسم کی غلامی ثابت بھی ہو تو کسر شان کی بات نہیں، اسلام کے نظام مساوات نے تو آقائی غلامی کی تمیز مٹا دی اور صدر اسلام ہی میں ایسے مقتدر اصحاب علم غلاموں کی بڑی جماعت نظر آتی ہے، جو اپنی علمی و دینی وجاہت کے سبب بڑے بڑے احرار پر فوقیت رکھتے تھے۔ حضرت حسن بصری، ابن سیرین،

طاؤس، نافع، عکرمہ، مکحول جو اپنے عہد کے مقتدائے عالم تھے وہ خود یا ان کے باپ دادا غلام رہ چکے تھے، اس لیے زوطیٰ کا غلام ہونا ثابت بھی ہو جائے تو کچھ عار نہیں، لیکن تمام قوی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔

زوطیٰ اول اول مسلمان ہو کر اسلامی معاشرہ میں شامل ہوئے ہوں گے تو معاشرتی ضرورتوں نے زوطیٰ کو مجبور کیا ہوگا، کہ وہاں کے رہنے والوں سے دوستانہ تعلق پیدا کریں، یہ طریقہ عرب میں عام طور پر جاری تھا اور اس قسم کے تعلق کو ولاء کہتے ہیں جس کا مشتق مولیٰ ہے، مولیٰ غلام کو کہتے ہیں اس طرح لفظی مشارکت سے بعضوں نے زوطیٰ کو غلام سمجھ لیا اور رفتہ رفتہ یہ خیال روایت کی شکل اختیار کر کے کسی قدر عام ہو گیا، جس کی وجہ سے اسماعیل کو واضح کرنا پڑا کہ ”واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کی غلامی میں نہیں آیا“۔

سچ تو یہ ہے، کہ زوطیٰ نے قبول اسلام کے بعد کوفہ کے مشہور عرب خاندان قبیلہ بنی تیم اللہ ثعلبہ سے تعلقات اور مراسم قائم کیے اس خاندان کے افراد نجابت و شرافت کی وجہ سے ”مصابیح الظلم“ یعنی ظلمتوں کے چراغ کہلاتے تھے، زوطیٰ نے ان سے تیمناً نسبت ولاء قائم کر لی اور اسی سے مشہور ہوئے۔

امام اعظم کے شاگردوں میں ابوعبداللہ بن عبداللہ بن یزید مقری مکی مولیٰ آل عمر متوفی رجب ۲۱۲ھ ہیں ان کا واقعہ امام طحاوی نے انہیں کی زبان میں بیان کیا ہے، کہ میں جب امام ابوحنیفہ کی خدمت میں گیا، تو انہوں نے کہا، کہ تم کون ہو؟ میں نے کہا، میں ایسا شخص ہوں، جس پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق دے کر احسان کیا۔ اس پر امام صاحب نے کہا:

لاتقل هكذا ولكن والِ بعض هولاء الاحياء ثم انتم اليهم فانی كنت كذالك ۔

(مشکل الآثار ج ۴ ص ۵۴)

تم ایسا نہ کہو، بلکہ تم ان قبائل میں سے کسی کی ولاء میں آجاؤ پھر ان کی طرف اپنی نسبت کرو میں بھی ایسی ہی نسبت رکھتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا، کہ امام اعظم کا خاندان بنی تیم اللہ کا مملوک اور غلام نہیں تھا، نہ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا، بلکہ عجم کے دیگر مسلم خاندانوں کی طرح یہ خاندان بھی ایک شریف قبیلے سے رشتہ ولاء قائم کر کے اس طرف منسوب ہوا اور یہ روایت بے اصل ہے، کہ امام صاحب کے والد کابل سے گرفتار کر کے کوفہ لائے گئے جہاں قبیلہ تیم اللہ کی ایک عورت نے ان کو خرید کر آزاد کیا، یا ان کے دادا اس قبیلے کے غلام تھے، اسی طرح یہ قول بھی بے اصل ہے، کہ امام صاحب خالص عربی النسل تھے، غالباً یہ بات امام صاحب کو عجمی غلام کہنے والوں کے جواب میں کہی گئی ہے۔

کوفہ کے مشرقی علاقہ میں یمنی قبائل آباد تھے، امام صاحب کے دادا نے اسی علاقے میں بود و باش اختیار کی تھی۔

وسیع تجارت

امام اعظم نے مرکز علم کوفہ میں آنکھ کھولی تھی، آپ کے والد صاحب حیثیت شرفا میں تھے، اس لیے آپ نے شعور کی

منزل میں قدم رکھنے کے بعد کوچہ علم کی طرف رخ کیا، تذکرہ نگاروں نے ابتدائی تعلیم کے بارے میں کوئی صراحت نہیں کی ہے، لیکن یہ بعید از قیاس ہے، کہ وہ اوائل جوانی میں علم سے بے بہرہ رہے ہوں، آپ نے مروجہ علوم وفنون کی درسگاہوں سے کسب فیض کیا، ہاں آپ کی معاشی اور تجارتی مصروفیات نے ابتدائی تعلیم کے بعد مزید تعلیم کے لیے موقع نہ دیا، تجارتی امور میں دینی وشرعی اصول کے مطابق عمل پیرا ہونا صاف طور پر ظاہر کرتا ہے، کہ آپ نے امور تجارت اور معاملات کو شرعی نہج پر انجام دینے کی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔

امام صاحب نے کسب معاش کے لیے ریشمی کپڑوں کا کاروبار شروع کیا، ان کے یہاں خزبافی کا ایک کارخانہ تھا۔ خطیب بغدادی کا بیان ہے:

کان ابو حنیفة خزازا و دکانه معروف فی دار عمرو بن حریث ۔(ج۱۳ص۳۲۵)

ابو حنیفہ خز کپڑے کے تاجر تھے، ان کی دوکان عمرو بن حریث کی کوٹھی میں عام طور پر مشہور ومعروف تھی۔

دار عمرو بن حریث کوئی چھوٹا سا مکان نہیں تھا، بلکہ ایک بڑا کمپاؤنڈ تھا، جس میں متعدد عمارتیں تھیں اور انہیں عمارتوں میں خزبافی کے کارخانے تھے، کام کرنے والے بھی اسی احاطے میں قیام کرتے تھے، یا یہ بھی ممکن ہے، کہ خزبافوں کی جماعت انفرادی طور پر یہ کام کرتی تھی اور تیار شدہ خز کے تھان امام اعظم کے ہاتھوں فروخت کرتی تھی، امام صاحب اپنے کارخانے کے تیار شدہ مال کے علاوہ دوسرے شہروں کے تیار شدہ کپڑے بھی خرید کیا کرتے تھے، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ایک شخص سے آٹھ آٹھ ہزار درہم کے کپڑے خریدے جاتے۔ (موفق ج۱ص۲۲)

امام صاحب کی تجارتی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگانا آسان ہوگا، کہ کوفہ سے سیکڑوں میل دور شہروں میں بھی آپ کی تجارتی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں، بصرہ، مرو، نیشاپور اور بغداد میں آپ کے تجارتی نمائندے ہوتے جہاں امام صاحب کا مال جاتا اور ان جگہوں سے بھی آپ کے پاس مال تجارت آتا۔

حسن بن ربیع کہتے ہیں:

کان قیس ابن الربیع یحدثنی عن ابی حنیفة انه کان یبعث بالبضائع الی بغداد فیشتری بها الامتعة ویحملها الی الکوفة (تاریخ بغداد ج۱۳ص۳۶۰)

قیس بن ربیع ہم سے ابوحنیفہ کے متعلق روایت بیان کرتے تھے کہ ابوحنیفہ بغداد سرمایہ تجارت بھیجتے تھے اور وہاں کی چیز اس سرمایہ سے خریدی جاتی تھی وہی کوفہ لاد کر روانہ کی جاتی تھی۔

معجم المصنفین میں تبییض الصحیفہ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

قد تواتر عنه رحمه الله انه کان یتجر فی الخز مسعودا ماهرا فیه وله دکان فی الکوفة وشرکائه یسافرون له فی شراء ذلك وبیعه ۔(ج۲ص۱۷۵)

امام ابوحنیفہ کے متعلق بتواتر یہ بات منقول ہے، کہ وہ خز کے ایک بڑے کامیاب تاجر تھے اور اس میں ان کو خاص مہارت حاصل تھی، کوفہ میں ان کی دکان تھی اور تجارتی کاروبار میں ان کے بہت سے شرکا تھے جو خز کی خرید وفرخت کے لیے سفر کرتے تھے۔

آپ کے شرکائے تجارت میں حفص بن غیاث کا نام بہت مشہور ہے جو تیس سال تک آپ کے شریک تجارت رہے خود حفص کا بیان ہے:

كنت شريك ابی حنيفة ثلاثين سنة (موفق ج۱ ص۲۲)

میں تیس سال تک ابوحنیفہ کے ساتھ شریک رہا۔

امام اعظم تجارت میں حد درجہ دیانت دار اور صادق القول واقع ہوئے تھے، آپ چار ایسی صفات سے متصف تھے، جن کا تعلق معاملات سے ہے، ان اوصاف کی بنا پر آپ ایک کامل اور ماہر تاجر بنے۔ (۱) آپ کا نفس غنی تھا لالچ کا اثر کسی وقت بھی آپ پر ظاہر نہیں ہوا حالاں کہ لالچ کا اثر اکثر نفوس پر غالب آجاتا ہے۔ (۲) نہایت درجہ امانت دار تھے۔ (۳) عفو ودرگزر آپ کی خصلت تھی، نفس کی دنائت سے اللہ نے آپ کو محفوظ فرمایا تھا۔ (۴) آپ بڑے دیندار شریعت کے احکام پر سختی سے عمل پیرا، دن کو روزہ رکھتے تھے اور رات کو عبادت کرتے تھے۔

ان اوصاف عالیہ کا اجتماعی طور پر جو اثر تجارتی معاملات پر مرتب ہوا، اس کی وجہ سے تاجروں کے طبقے میں آپ کو انفرادی مقام حاصل ہوا، بیشتر افراد نے آپ کی تجارت کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تجارت سے تشبیہ دی ہے۔

خرید وفروخت کے وقت امانت داری کے طریقے پر عامل ہوتے تھے۔ امام صاحب بیچنے والے کی غفلت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے، بلکہ صحیح کیفیت کی ہدایت فرماتے تھے۔

ایک عورت آپ کے پاس ریشمی کپڑا بیچنے کے واسطے لائی، آپ نے اس سے دام پوچھے، اس نے ایک سو بتایا، آپ نے فرمایا، کہ یہ زیادہ کا ہے، تم کیا کہتی ہو، اس نے ایک سو بڑھائے اور اسی طریقے پر چار سو تک پہنچی، آپ نے فرمایا کہ یہ چار سو سے زیادہ کا ہے، وہ بولی تم مجھ سے مذاق کرتے ہو آپ نے فرمایا کسی شخص کو لاؤ کہ وہ اس کے دام لگائے چنانچہ وہ ایک شخص کو لائی اور اس نے پانچ سو دام لگایا، امام صاحب نے اسے خرید لیا۔ (الخیرات الحسان ص ۸۷)

اگر مال میں کوئی عیب ہوتا، تو اسے خریدار کو دکھا کر فروخت کرتے۔ خطیب بغدادی بیان کرتے ہیں:

ایک کپڑے میں کچھ عیب تھا، آپ نے اپنے شریک حفص بن عبدالرحمٰن کو وہ عیب دکھایا اور ان سے کہا، اس کپڑے کو فروخت کرتے وقت یہ عیب گاہک کو دکھا دینا، حفص مال لے گئے اور اس کو بیچ کر روپیہ لے آئے، لیکن اس عیب دار کپڑے کا عیب گاہک کو بتانا بھول گئے، جب امام ابوحنیفہ کو اس کا علم ہوا، آپ نے ساری رقم صدقہ کر دی۔ (تاریخ بغداد ج۱۳ ص ۳۵۸)

اسی صدق وامانت نے آپ کی تجارت کو خوب فروغ دیا۔

مدینہ کا سفر

ایک دن امام صاحب دکان پر نہ تھے، کسی کارندے نے ایک خریدار کو مقررہ قیمت سے زیادہ پر کپڑا فروخت کر دیا، امام صاحب نے آ کر جب حساب دیکھا، تو معلوم ہوا، کہ قیمت زیادہ لی گئی ہے، فروخت کرنے والے کو آپ نے غصہ سے دیکھا اور فرمایا:

تغر الناس وانت معی فی دکانی ۔

تم لوگوں کو دھوکہ دیتے ہو حالاں کہ تم دکان میں میرے ساتھ رہتے ہو۔

بیان کیا جاتا ہے، کہ خریدار مدینہ منورہ کا رہنے والا تھا، کپڑا لے کر وہ مدینہ روانہ ہو چکا تھا، امام صاحب کے لیے یہ خیال اذیت ناک تھا، کہ دھوکے سے زیادہ قیمت لے لی گئی، امام صاحب نے صرف خریدار کو زائد قیمت لوٹانے کے لیے مدینہ منورہ کا سفر کیا، مشکل یہ تھی، کہ خریدار کو پہچانتے نہ تھے، ایک دن مسجد میں بیٹھے، تو ایک شخص کو نماز کی حالت میں دیکھا، جو آپ کی دکان کا کپڑا پہنے ہوئے تھا، جب وہ نماز سے فارغ ہوا، تو امام صاحب نے اس سے کہا:

هذا الثوب الذی علیك هو ثوبی ۔

یہ کپڑا جو تم نے پہن رکھا ہے میرا ہے۔

اس شخص نے کہا، آپ یہ بات کیسے کہتے ہیں، میں نے تو اسے کوفہ میں ابوحنیفہ کی دکان سے ایک ہزار درہم میں خریدا ہے، تو امام صاحب نے کہا، تم ابوحنیفہ کو دیکھو گے، تو پہچان لو گے؟ اس نے کہا، ہاں! امام صاحب نے کہا، میں ابوحنیفہ ہوں، تم نے یہ کپڑا مجھی سے خریدا ہے، اس نے جواب دیا نہیں، امام صاحب نے کہا کہ تم اس کی قیمت لے لو کپڑا مجھے واپس کر دو اس شخص نے کہا میں اسے چند بار پہن چکا ہوں، مناسب نہیں سمجھتا کہ واپس کروں، اگر آپ چاہیں مزید قیمت ادا کر دوں، امام صاحب نے فرمایا، میں قیمت میں اضافہ نہیں چاہتا یہ کپڑا تو چار سو درہم کا ہے اگر تم چاہو تو چھ سو درہم میں لوٹا دوں اور کپڑا تم پہنو یا اپنے ہزار درہم لے لو اور کپڑا واپس کر دو تم نے جو اسے بار بار پہنا ہے یہ تمہارے لیے حلال ہے، تو اس آدمی نے کپڑا نہیں لوٹایا اور ایک ہزار درہم قیمت ہی پر راضی ہو گیا ابوحنیفہ نے انکار کیا تو اس شخص نے کہا اگر ایسا ہے تو آپ مجھے چھ سو درہم واپس کر دیجیے آپ نے چھ سو درہم واپس کر دیے اور کوفہ لوٹ آئے۔ (موفق ج ۱ ص ۱۹۹)

امام صاحب نے تقاضائے دیانت پورا کرنے کے لیے کوفہ سے مدینہ منورہ کا سفر کیا اور زائد قیمت لوٹانے کے بعد انہیں سکون نصیب ہوا۔

منافع تجارت کا مصرف

امام صاحب کا وسیع وعریض کاروبار تجارت جائز ذریعہ معاش اور اس فارغ البالی کی بنا پر ائمہ وامرا کے تحفوں سے خود کو محفوظ کرتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ منافع تجارت سے علما، فقہا، ضرورت مند تلامذہ اور دوسرے مفلوک الحال حاجت مندوں کی امداد

اور حاجت روائی تھا، یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام صاحب نے بڑے پیمانے پر جو تجارت کی، اس کا مقصد جلب منفعت اور ذخیرہ اندوزی تھا، انہوں نے تجارت کی منفعتوں کو کبھی محفوظ نہیں رکھا، بلکہ اسے اہل حاجت پر سال بسال خرچ کرتے رہے، علما کی مدد معاش کے لیے وہ تجارت کا ایک حصہ خاص کر دیتے اور اس کی کل آمدنی ان کی نذر کر دیتے تا کہ علمائے حق پوری فراغت اور دلجمعی کے ساتھ علم دین کی خدمت انجام دیتے رہیں، ہدیوں کا یہ سلسلہ پورے سال جاری رہتا، آخر میں جو رقم بچ جاتی، وہ اساتذہ محدثین اور فقہا کی ضروریات پر خرچ کرتے اور فرماتے میں نے اپنے مال سے کچھ نہیں دیا ہے، یہ سب اللہ کا مال ہے اس نے اپنے فضل و کرم سے تمہارے واسطے مجھے دیا ہے، جو میں پیش کرتا ہوں۔

انفقوا في حوائجكم ولاتحمدوا الا الله فاني لا اعطيكم من مالي شيئا ولكن من فضل الله علي فيكم وهذه ارباح بضائعكم فانه هو والله مما يجريه الله لكم علي يدي فمافي رزق الله حول لغيره ۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۶۰)

تم لوگ اسے اپنی ضروریات میں خرچ کرو اور صرف اللہ کا شکر ادا کرو، کیوں کہ میں نے تم کو اپنے مال سے کچھ نہیں دیا ہے بلکہ یہ میرے اوپر اللہ کا فضل ہے تمہاری بابت اور یہ تمہارے سامان کے منافع ہیں خدا کی قسم اللہ تمہارے لیے اس کو میرے ہاتھ سے جاری فرماتا ہے، اللہ کے مال میں غیر کی گنجائش نہیں۔

امام صاحب آخر دور تک علمی مصروفیات اور مشاغل کے باوجود کسب معاش کے لیے تجارت سے وابستہ رہے، جس کی بنا پر آپ نے خود اعتمادی، بے لوث خدمت اور حق کے لیے جرأت و بے باکی کا ملکہ پیدا کیا اور امرا و خلفا کے تحائف اور نذرانوں کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔

تحصیل علم کی تحریک

امام اعظم کا وطن کوفہ علم و فن کا مرکز تھا اور اس شہر کی علمی فضا کو معلم امت حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور مدینۃ العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر صحابہ و تابعین کی سرپرستی کا شرف حاصل تھا، جامع کوفہ کی ہر محراب کسی نہ کسی شیخ کی درسگاہ تھی، سیاسی لحاظ سے حضرت امام اعظم کی ابتدائی زندگی کا زمانہ فتنہ و فساد کا زمانہ تھا، مختار ثقفی اور عبد اللہ بن زبیر کی بساط سلطنت الٹ چکی تھی اور اموی اقتدار اپنے بال و پر پھیلا رہا تھا، شخصی حکومت کے استحکام کی راہ میں سخت دشواریاں تھیں، چنانچہ ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے ظالم و جابر عمال و امرا شہروں اور صوبوں میں مقرر کیے جا رہے تھے، چنانچہ عبد الملک بن مروان کی طرف سے حجاج بن یوسف عراق کا والی تھا، جس کے شدائد و مظالم کا نشانہ زیادہ تر خیار امت اور علمائے ملت تھے جو علم و فضل کے لحاظ سے مقتدائے عالم تھے، حجاج کی سفاکیوں کے بارے میں حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا:

> ”اگر تمام پیغمبروں کی امتیں مل کر اپنے اپنے زمانہ کے ظالموں کو پیش کریں اور ہم صرف حجاج کو مقابلہ میں لائیں، تو واللہ ہمارا پلہ بھاری رہے گا۔“

ولید اور حجاج کے زمانے تک تو امام صاحب باقاعدہ تحصیل علم کی طرف توجہ نہ کر سکے، ضرورت کے مطابق کچھ پڑھنے لکھنے کے بعد اپنے آبائی پیشہ خزبافی سے منسلک ہو گئے اور خزبافی کا ایک کارخانہ کھول لیا اپنی تجارت کو خوب چمکایا مگر قدرت کو آپ سے فروغ علم اور تدوین فقہ کا مہتم بالشان کام لینا تھا، اس لیے فطری طور پر تحصیل علم کا ذوق بیدار ہونا لازمی بات تھی، بغرض خرید و فروخت بازار آنا ہر روز کا معمول تھا، راستے میں کوفہ کے مشہور امام حدیث عامر شعبی کا مکان تھا، وہ ان کو ادھر سے آتے جاتے دیکھا کرتے تھے، ایک دن طالب علم سمجھ کر پوچھا: ''تم کہاں جا رہے ہو؟'' امام صاحب کا بیان ہے، میں نے کہا بازار فلاں کے پاس جاتا ہوں اور میں نے اس کا نام بتایا انہوں نے کہا میرے پوچھنے کا مقصد بازار کا جانا نہ تھا، بلکہ علما کے پاس جانے کا تھا، میں نے کہا علما کے پاس میرا جانا کم ہے انہوں نے کہا:

لاتغفل وعلیك بالنظر فی العلم ومجالسة العلماء فانی اریٰ فیك یقظة وحرکة ۔

(عقود الجمان ص ۱۶۰)

تم غفلت میں نہ پڑو، علم میں اپنے کو لگاؤ، علما کی مجلسوں میں جایا کرو، میں تم میں بیدار مغزی اور کھوج لگانے کا مادہ پاتا ہوں۔

آپ نے یہ فرما کر کہا:

فوقع فی قلبی من قوله ترکت الاختلاف الی السوق واخذت فی العلم فنفعنی الله تعالیٰ ۔ (ایضا)

شعبی کی بات کا میرے دل پر اثر ہوا میں نے بازار جانا چھوڑ دیا اور کسب علم کی راہ اختیار کی تو اللہ نے مجھ کو فائدہ پہنچایا۔

علم کلام

امام شعبی کی تحریک پر امام صاحب نے ادب ولغت کے ساتھ علم کلام کی طرف خاص توجہ دی وجہ یہ تھی، کہ اس دور میں باطل فرقے سر اٹھا رہے تھے اور اسلام کے بنیادی عقائد میں ناروا موشگافیوں کے ذریعہ باطل افکار و آرا کو فروغ دے رہے تھے۔

قرآن حکیم میں خدا کی ذات وصفات، مبدأ و معاد وغیرہ کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے، عرب والوں نے اسے اجمالی نگاہ سے دیکھا اور خلوص واعتقاد کے لیے اتنا ہی کافی تھا، مگر جب اسلام فارس اور شام میں داخل ہوا اور وہاں کی متمدن قوموں نے اسلام قبول کیا تو ان لوگوں نے اعتقادی مسائل کو فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا، چنانچہ استعارہ وتشبیہ، صفات الٰہی کی عینیت وغیریت، حدوث وقدم غرض اس قسم کے بہت سارے مضامین عقلا وعلما کی تحقیق وجستجو کا موضوع بن گئے، جن کو بحث وتدقیق کی وسعت نے مستقل فن بنا دیا اور اعتقادی مسائل میں موشگافیوں کا آغاز ہوا، پھر مختلف اعتقادی فرقے وجود میں

آنے لگے، جو قدری، مرجی، معتزلی، جہمی، خارجی، رافضی کہلائے، وہ فتنہ اس قدر عام ہوا، کہ اہل حق متکلمین کے باطل افکار وآرا کی تردید کے لیے اس طرف متوجہ ہوئے اور علم کلام وجود میں آیا۔

امام صاحب نے جس شہر میں آنکھ کھولی تھی، وہ عرب وعجم کے مختلف قبائل اور متعدد رنگ ونسل رکھنے والوں کا مسکن تھا، جہاں اعتقادی مسائل ہمیشہ زیر بحث آیا کرتے تھے، چونکہ آپ کی طبیعت میں جولانی تھی، مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت تھی، اس لیے انہوں نے علم کلام کے کوچہ میں قدم رکھا اور جلد ہی اس فن میں ایسا کمال پیدا کیا، کہ بڑے بڑے اساطین فن آپ کے ساتھ بحث کرنے سے جی چرانے لگے۔ بغرض تجارت اکثر بصرہ جایا کرتے، جو تمام جدید فرقوں کا مرکز تھا، اباضیہ، صفریہ، حشویہ، معتزلہ وغیرہ سے اکثر بحثیں کیں اور ہمیشہ ان پر غالب آئے۔

ابن حجر مکی لکھتے ہیں:

> **اخذ فی علم الکلام وبلغ فیه مبلغا یشار الیه فیه بالاصابع واعطی فیه جدلا فمضی علیه زمن بـه یخاصم وعنه یناضل حتی دخل البصرة نیفا وعشرین مرة یقیم فی بعض المرات سنة او اکثر ینازع اولئك الفرق** ۔(الخیرات الحسان ص ٥٥)

امام اعظم ابوحنیفہ نے علم کلام حاصل کیا اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا، کہ آپ کی طرف لوگ انگلیوں سے اشارہ کرتے تھے اور آپ ایک زمانہ تک اس میں مناظرہ کرتے اور اس فن سے اعتراضات دفع کرتے یہاں تک کہ آپ اس غرض سے بصرہ تقریباً بیس مرتبہ گئے (کیوں کہ وہ باطل فرقوں کی آماجگاہ تھا) بعض مرتبہ آپ وہاں سال سال بھر یا اس سے زیادہ اقامت اختیار کرتے اور ان فرقوں سے مناظرہ فرمایا کرتے تھے۔

تحصیل فقہ

امام اعظم نے ابتدا میں مروجہ علوم وفنون کے مبادیات پر اکتفا کیا اور علم الکلام کو اپنی فکری جولانگاہ قرار دیا اس دور کے فلسفیانہ اور منطقی مباحث اور اختلاف مذاہب کے متعلق بھی کافی واقفیت حاصل کی، جو علم میں مہارت کے لیے ناگزیر تھی، فقہ کی طرف متوجہ ہونے کے بعد مسائل شرعیہ کی تخریج واستنباط میں منطقی استدلال کا جو کمال دکھایا وہ اسی نظری وفکری تربیت کا اثر تھا۔

ایک زمانے تک بحث ومناظرہ اور جدل ومناقشہ میں منہمک رہنے کے بعد دل کلامی جھگڑوں سے اچاٹ ہوگیا اور انہوں نے تحصیل فقہ اسلامی کی طرف توجہ کی۔

یحیٰ بن شیبان روایت کرتے ہیں، کہ امام ابوحنیفہ نے فرمایا، مجھے جدل ومناظرہ سے خصوصی لگاؤ تھا، میں کافی عرصہ تک اس میں لگا رہا، علم الکلام کے اسلحہ سے لڑتا اور انہی سے مدافعت کرتا، ان دنوں بصرہ جدل ومناظرہ کا اکھاڑہ تھا، میں بیس سے زائد مرتبہ بصرہ گیا، کبھی ایک سال قیام کرتا اور کبھی کم وبیش، خوارج کے فرقہ اباضیہ وصفریہ سے کئی مرتبہ جھڑپیں ہوچکی تھیں، علم الکلام میرے نزدیک افضل العلوم تھا، میں کہا کرتا تھا، کہ علم الکلام کا تعلق اصول دین سے ہے، طویل غور وفکر اور کافی عمر گزرنے

کے بعد میرے اس نظریہ میں تبدیلی رونما ہوئی، میں نے کہا، متقدمین صحابہ اور تابعین سے کوئی ایسی بات نہیں رہ گئی تھی، جسے ہم نے نہ پالیا ہو، وہ شرعی امور پر زیادہ قادر، ان سے زیادہ واقف اور ان کے حقائق سے بخوبی آگاہ تھے۔ مگر بایں ہمہ انہوں نے جدل و مناظرہ کا بازار گرم نہیں کیا اور نہ غور و خوض کی ضرورت سمجھی، خود اس سے اجتناب کیا اور دوسروں کو سخت پرہیز کی تلقین کی، وہ صرف شرائع و احکام اور فقہی مسائل میں غور و تامل کے عادی تھے، وہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور اسی کی طرف لوگوں کو رغبت دلاتے، وہ لوگوں کو پڑھاتے اور تحصیل علم کی ترغیب دیتے تھے، پھر تابعین نے اسی کی پیروی کی، اس بات کے واضح ہونے پر ہم نے جدل و مناظرہ اور علم الکلام کو خیر باد کہہ کر اس سرسری جان پہچان کو کافی سمجھا اور اپنا رخ طریق سلف صالحین کی طرف موڑ دیا، اب ہم جادہ اسلاف پر گامزن ہوئے، انہی کے اعمال و افعال کو اپنانا شروع کیا اور اس راہ کے واقف کار لوگوں کی ہم نشینی کا شیوہ اختیار کیا، میں بھانپ گیا کہ متکلمین اور اصحاب اصول کا چہرہ مہرہ متقدین کا سا نہیں اور سلف صالحین کے جادہ مستقیم سے بھی انہیں کوئی سروکار نہیں، یہ دل کے سخت، کتاب و سنت کے مخالف، سلف صالحین سے منحرف اور ورع و تقویٰ سے بے بہرہ ہیں۔

تحصیل فقہ کے داعیہ کے لیے یہ روایت بھی مشہور ہے، جس کے راوی آپ کے تلمیذ زفر بن ہذیل ہیں، وہ کہتے ہیں میں نے امام ابوحنیفہ سے سنا فرماتے تھے میں علم الکلام پڑھتا پڑھاتا تھا، یہاں تک کہ اس میں خاصی شہرت حاصل کر لی، ہماری نشست گاہ حماد بن ابی سلیمان کے حلقہ سے زیادہ دور نہ تھی ایک روز کسی عورت نے آکر پوچھا، ایک شخص نے ایک لونڈی سے نکاح کر رکھا ہے اور وہ اسے طلاق سنت دینا چاہتا ہے وہ کتنی طلاق دے، میں نے کہا، حماد سے پوچھیے اور جو جواب دیں اس سے آگاہ کیجیے، سائلہ نے حماد سے پوچھا، انہوں نے جواب دیا، حیض و جماع سے طہارت کی حالت میں اسے طلاق دے، جب دو حیض آنے کے بعد وہ غسل طہارت کرے، تو دوسرے ازواج کے لے حلال ہو جائے گی، اس نے یہ فتویٰ مجھے بتایا، میں نے کہا، مجھے علم الکلام کی کوئی ضرورت نہیں اپنی جوتیاں پہنیں اور سیدھا حماد کے حلقہ درس میں شامل ہوا، میں آپ کے مسائل سنتا اور انہیں یاد رکھتا، اگلی صبح جب اعادہ کرتے تو مجھے تو وہ مسائل جوں کے توں از بر ہوتے مگر ان کے دوسرے تلامذہ غلطیاں کر جاتے چنانچہ آپ نے یہاں تک فرما دیا، کہ ”صدر حلقہ میں میرے روبرو ابوحنیفہ کے سوا کوئی نہ بیٹھے“۔

اس سلسلے کی مزید روایت یہ بھی ہے، ایک رات خواب دیکھا، کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھود رہے ہیں، تعبیر خواب کے زبردست عالم امام محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ سے اس خواب کی تعبیر دریافت کی، تو انہوں نے یہ تعبیر بیان کی، کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنن سے ایسے مسائل کا استخراج اور ایسے امور کی عقدہ کشائی کریں گے، جو آپ سے قبل کسی نے نہیں کی ہوگی، اس تعبیر کو اشارہ غیبی قرار دے کر امام اعظم نے پوری توجہ اور استغراق سے علم فقہ کی تحصیل شروع کی۔

(مناقب امام اعظم ج ا ص ۶۷)

فقہ کی تحصیل کے لیے امام صاحب نے حضرت حماد کی درسگاہ کا انتخاب کیا، ابتدا میں امام صاحب حلقہ درس کی بائیں صف میں بیٹھتے رہے، مگر چند روز کے بعد جب حضرت حماد کو تجربہ سے معلوم ہوا، کہ پورے حلقہ درس میں کوئی تلمیذ حافظہ اور

ذہانت میں آپ کا ہم سر نہیں ہے، تو حکم دیا کہ ابوحنیفہ سب سے آگے بیٹھا کریں، حضرت حماد کی درسگاہ میں فقہ کی تحصیل کے ساتھ کوفہ کے دوسرے شیوخ سے حدیث وسنن کا درس بھی لیتے رہے۔

حصول علم کے لیے رحلت وسفر ناگزیر ہے، چنانچہ امام صاحب نے ذوق علم کی تسکین کے لیے بصرہ، مکہ، مدینہ کے متعدد سفر کیے، حرمین شریفین میں کافی دنوں تک قیام کیا، جو علما ومشائخ کے گہوارے اور حدیث وفقہ کے عظیم مرکز تھے، ایام حج میں تمام بلاد وامصار اسلام کے مشائخ اور ماہرین علوم کا یہاں اجتماع ہوتا تھا، امام صاحب نے پچپن حج کیے اور انہوں نے ائمہ حدیث وفقہ سے خوب خوب استفادہ کیا، چنانچہ خود بیان فرماتے ہیں:

میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے اصحاب وتلامذہ کی فقہ حاصل کر چکا ہوں۔ (حیات امام ابوحنیفہ ص ۶۷)

اساتذہ

امام صاحب کے مشائخ واساتذہ کی تعداد چار ہزار بتائی جاتی ہے، علامہ موفق نے لکھا ہے:

امام احمد بن حفص معروف بہ ابوحفص کبیر شاگرد امام محمد بن حسن شیبانی کے صاحبزادے ابوحفص صغیر ابوعبداللہ محمد بن احمد کے زمانے میں شافعیہ اور حنفیہ میں معارضہ ہوا، کہ ابوحنیفہ اور شافعی میں افضل کون ہے؟ ابوحفص صغیر نے کہا، دونوں حضرات کے مشائخ کا شمار کرلیا جائے، جس کے مشائخ زیادہ ہوں وہ افضل ہے، امام شافعی کے اسی مشائخ شمار میں آئے اور ابو حنیفہ کے چار ہزار۔ (مناقب ج ۱ ص ۳۸)

محمد بن یوسف صالحی نے امام صاحب کے مشائخ کے اسمائے گرامی لکھے ہیں، جو کہ ۳۲۴ ہیں اور حضرت امام سے روایت کرنے والوں کے نام لکھے ہیں، جو کہ ۹۳۴ ہیں۔

خطیب بغدادی آپ کے اہم شیوخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

رأى انس بن مالك وسمع عطابن ابى رباح وابااسحق السبيعى ومحارب بن دثار وحماد بن ابى سليمان والهيثم بن حبيب صواف وقيس بن مسلم ومحمد بن منكدر ونافع مولىٰ ابن عمر وهشام بن عروه ويزيد الفقير وسماك بن حرب وعلقمه بن مرثد وعطية العوفى وعبدالعزيز بن رفيع وعبد الكريم ابا امية وغيرهم (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۱۴)

امام اعظم نے انس بن مالک کو دیکھا اور عطابن ابی رباح، ابواسحٰق سبیعی، محارب بن دثار، حماد بن ابی سلیمان، ہیثم بن حبیب صواف، قیس بن مسلم، محمد بن منکدر، نافع مولیٰ ابن عمر، ہشام بن عروہ، یزید الفقیر، سماک بن حرب، علقمہ بن مرثد، عطیۃ العوفی، عبدالعزیز بن رفیع، عبدالکریم ابوامیۃ وغیرہم سے سماع حدیث کیا۔

صاحب حدائق الحنفیہ نے شیوخ واساتذہ کے ناموں کی یہ فہرست درج کی ہے:

ابراہیم بن عبدالرحمٰن سکسکی، ابراہیم بن محمد بن منتشر الاجدع الہمدانی الکوفی، ابراہیم بن مسلم العبدی الہجری، ابراہیم بن مہاجر بن مہاجر بن جابر البجلی الکوفی، ابراہیم بن یزید الخوری المکی، اہان بن ابی عیاش فیروز البصری، ابوعبیدہ بن المعتب الصینی، ابویعفور، ابوالسوار قال ابومحمد البخاری الصواب، ابوالمالیہ، ابوخویطر بن طریق، ابی ماجد، آدم بن علی البکری، اسحٰق بن ثابت بن عبیدۃ الانصاری، اسقیل بن بہلول بن عمرو الصیرفی المعروف بالجون، اسمعیل بن عبدالملک، اسمعیل بن ابی خالد الاحمصی، اسمعیل ابن عیاش الحمصی، اسمعیل بن امیہ، اسمعیل بن مسلم المکی، ایوب بن عائذ کوفی، ایوب بن تمیمہ، کیسان السختیانی، بشر بن قرہ کوفی، بشیر بن سلمان الکوفی، بلال بن مرداس الفزائی، بیان بن بشر الکوفی تمیم بن سلمہ کوفی ثابت بن اسلم البنانی، جابر بن یزید الجوفی، جامع بن ابی راشد کوفی، جامع بن شداد المحاربی الکوفی، جبلہ بن سحیم الکوفی، جریر بن سعد الکوفی، امام جعفر صادق بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب، حاتم بن دردان بصری، حارث بن عبدالرحمٰن الہمدانی الکوفی، حبیب بن ابی ثابت بن قیس، حبیب بن ابی عمرہ الکوفی، حجاج بن ارطاۃ الکوفی، حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب، حسن بن الحر بن الحکم الکوفی، حسن بن سعد الکوفی مولیٰ امام حسن بن عبداللہ الکوفی، حسن بن عبیداللہ الکوفی، حصین بن عبدالرحمٰن الکوفی، حکم بن عتیبہ الکوفی، حکیم بن جبیر الکوفی، حماد بن ابراہیم، حماد بن ابی سلیمان الکوفی، حمید بن ابی حمید الطویل البصری، حمید بن قیس الاعرج المکی، خالد بن عبدالاعلیٰ، خالد بن علقمہ، خالد بن سعید الشعبی المدنی، خارجہ بن عبداللہ الانصاری، خیثم بن عراک بن مالک مدنی، خثیم بن عبدالرحمٰن، خلف بن یاسین، خوات بن عبداللہ بن التیمی، داؤد بن عبدالرحمٰن مکی مدنی، وز بن عبداللہ المرہبی، ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن الرائی، زبید بن الحارث الکوفی، زیاد بن ابی زیاد مدنی، زیاد بن علاقہ کوفی، زیاد بن کلیب الکوفی، زید بن اسلم العدی المدنی، زید بن ابی انیسہ، زید بن عبدالحمید بن عبدالرحمٰن المدنی، زید بن علی بن حسین بن ابی طالب، زید بن الولید، سالم بن عجلان، الافطس الدموی، سالم بن عبداللہ بن عمر بن الخطاب، سعد بن طارق الکوفی، سعید بن مسروق الثوری، سعید بن یسار، سعید بن مرزبان مولیٰ حذیفہ بن الیمان العبسی، البقال الکوفی، سعید بن ابی سعید بن مرزبان نعار، سفیان بن سعید الثوری، سلمہ بن نبیط الکوفی، سلمہ بن کہیل الکوفی، سلیمان بن سلیمان الکوفی، سلیم شیبانی، سلیمان بن یسار الہلالی، سلیمان بن مہران الاعمش الکوفی، سلیمان بن مغیرہ القیسی، سماک بن حرب الکوفی، سہیل بن ابی صالح، سیار بن سلامۃ الریاحی، شداد بن عبدالرحمٰن، شرحبیل بن مسلم، شعبہ بن دینار الکوفی، شیبان بن عبدالملک، شیبہ بن مسافر بصری، صالح بن حیان القرشی الکوفی، صلت بن بہرم، طاؤس بن کیسان الیمانی، طریف بن شہاب، طلحہ بن نافع، طلحہ بن مطرف الیامی الکوفی، عاصم بن ابی النجود الکوفی، عاصم بن کلیب، عامر بن السمط الکوفی، عاصم بن الاحوص حکیم، عامر بن شرحبیل الشعبی، عامر بن ابی موسیٰ، عبداللہ بن قیس الاشعری، عبداللہ بن ابی زیاد القطوانی الکوفی عبداللہ بن دینار العدوی، عبداللہ بن خیثمہ، عبداللہ بن مواہب القرشی الشامی، عبداللہ بن ابی حبیبہ المدنی، عبداللہ بن عمر العمری المدنی، عبداللہ بن میسرۃ الکوفی، عبداللہ بن ابی الجہم العدوی، عبداللہ بن سعید بن ابی سعید المقبری، عبداللہ بن حمید بن عبید الانصاری الکوفی، عبداللہ بن داؤد الہمدانی الکوفی، عبداللہ بن عثمان بن خثیم، عبیداللہ بن عمر بن حفص المدنی، عبدالرحمٰن بن حزام یعنی عبدالرحمٰن بن حسان بن ثابت بن منذر بن عمرو بن حزام الانصاری، عبدالرحمٰن بن ہرمز اعرج

المدنی، عبدالرحمٰن بن شرحبیل، عبد الرحمٰن بن عمرو الاوزاعی، عبد الملک بن ایاس الشیبانی الکوفی، عبد الملک بن عمیر الکوفی، عبدالرحمٰن بن عمرو بن قیس الانصاری، عبدالملک بن میسرہ الھلالی الکوفی، عبدالکریم بن ابی معقل، عبدالکریم المخارق، عبدالاعلیٰ بن عامر ثعلبی کوفی، عبدالعزیز بن رفیع المکی نزیل کوفہ، عبدالعزیز بن ابی رواد، عتبہ بن عبداللہ الکوفی، عثمان بن راشد، عثمان بن عبداللہ بن موہب التیمی، عثمان بن عاصم الکوفی، عدی بن ثابت الانصاری الکوفی، عدی بن سعد، عطا بن ابی رباح، عطا بن یسار الہلالی، عطا بن العجلان البصری، عطا بن السائب الکوفی، عطیہ العوفی، عطیہ بن الحارث الکوفی، عکرمہ بن عبداللہ مولیٰ بن عباس، علقمہ بن مرثد الکوفی، علی بن اقمر الکوفی، علی بن الحسن الراد المدنی، علی بن ہذیمہ، علاء بن زہیر بن عبداللہ الکوفی، عمرو بن عبداللہ الہمدانی، عمرو بن مرہ بن عبداللہ الکوفی، عمرو بن شعیب بن عبداللہ، عمرو بن ذر الہمدانی الکوفی، فراس بن یحی الہمدانی الکوفی، فرات بن ابی عبدالرحمٰن الکوفی، فلان بن داؤد، قابوس بن ابی ظبیان الکوفی، قتادہ بن دعامہ البصری، قیس بن مسلم الجدلی الکوفی، قیس بن مسلم المدحجی، کثیر الرماح الاصم الکوفی، کدام بن عبدالرحمٰن الاسلمی، لاحق بن غیزار الیمانی، لیث بن ابی سلیمان الاموی الکوفی، سارک بن فضالہ البصری، مجالد بن ابی سعید بن عمیر الہمدانی الکوفی، محارب بن دثار الکوفی، محمد بن عبدالرحمٰن بن سعد زرارہ، محمد بن بشر الکوفی، محمد بن السائب الکلبی الکوفی، محمد بن مسلم بن تدرس المکی، محمد بن مسلم بن شہاب الزہری، محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب، محمد بن یزید الحنفی الکوفی العطار، محمد بن عبیداللہ بن سلیمان الکوفی، محمد بن عمرو بن الحسن بن علی بن ابی طالب، محمد بن المنکدر، محمد بن مالک بن المنتصر الہمدانی، محمد بن عبداللہ الثقفی، محمد بن قیس بن مخرمۃ الہمدانی، محمد بن الزبیر الحنظلی، محمد بن سوقۃ الکوفی، مخول بن راشد الکوفی، مزروق التیمی الکوفی، مزاحم بن زفر بن الحارث الکوفی، مسعر بن حبیب الجرمی البصری، مسلم بن سالم الکوفی، مسلم بن صبیح الہمدانی الکوفی، مسلم بن کیسان الضبی الکوفی، مسلم بن عمران البطین الکوفی، معاویہ بن اسحٰق بن طلحہ، معن بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود الکوفی، مقسم مولی ابن عباس، مکحول الشامی، منصور بن المعتمر الکوفی، منصور بن زاذان، منذر بن عبداللہ المنذر، منصور بن دینار، منہال بن الجراح الشامی الزہری، منہال بن عمرو الکوفی، منہال بن خلیفہ الکوفی، موسی بن ابی کثیر الانصاری، موسی بن ابی عائشہ الہمدانی الکوفی، موسیٰ بن مسلم الکوفی، موسیٰ بن طلحہ بن عبیداللہ التیمی، میمون الاعور، میمون بن سیاہ البصری، ناصح بن عجلان، ناصح بن محمد، نافذ مولی بن عباس، نمیر بن حکیم بن معاویہ، نوبۃ بن عبداللہ، وائل بن داؤد التیمی الکوفی، واصل بن حبان الاسدی، الکوفی، ولید بن سریع الکوفی، ولید بن عبداللہ بن جمیع الزہری المکی، ولید بن سریع مولیٰ عمر بن الخطاب، ہاشم بن ہاشم بن عتبہ، ہثیم بن حبیب الصیرفی الکوفی، ہثیم الصراف، ہثیم بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود، ہشام بن عروہ بن زبیر، ہشام بن عائذ بن نصیر الاسدی الکوفی، یزید بن صہیب الفقیر الکوفی، یزید بن ابی یزید الرشک البصری، یزید بن عبدالرحمٰن بن ابی مالک الہمدانی، یزید بن ابی ربیعہ، یزید بن عبید الاسلمی، یعلی بن عطار الطائفی، یونس بن محمد بن مسلم البغدادی، یونس بن زہران، یونس عبیداللہ بن ابی فروہ، یحی بن عمرو بن سلمہ، یحی بن سعید بن عبداللہ قیس الانصاری، یحی بن عبداللہ جابر الکوفی، یحیٰ بن عبدالحمید الکوفی، یحیٰ بن عامر الکوفی الحمیری، یحیٰ بن حبیب بن ثابت الاسدی الکاہلی الکوفی، یحیٰ بن ابی حیہ، یحیٰ بن عبداللہ بن معاویۃ المعروف باجلح ابی حجیہ۔ (حدائق الحنفیہ ص ۴۴ تا ۴۶)

کوفہ ایک اہم علمی مرکز

اسلامی لشکر نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی زیر قیادت جنگ قادسیہ ۱۷ھ میں فتح پائی، اس کے بعد ایرانی دار السلطنت مدائن اور جلولہ، حلوان، تکریت زیر نگیں کر لیے، ان شہروں میں مسلمان آباد ہونے لگے، مگر یہاں کی آب و ہوا مسلمانوں کو راس نہ آئی اور ان کی صحت پر منفی اثر پڑنے لگا، جسے مد نظر رکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سعد بن ابی وقاص کو حکم دیا، عربوں کو وہی آب و ہوا راس آئے گی جو ان کے اونٹوں کو آئے گی، لہٰذا کوئی ایسا خطہ تلاش کرو، جسے خشکی اور تری سے یکساں تعلق ہو اور میرے اور اس کے درمیان کوئی دریا حائل نہ ہو، حضرت سعد نے حضرت سلمان فارسی اور حضرت حذیفہ بن یمان کو کسی مناسب مقام کی تجویز کا حکم دیا، چنانچہ ان دونوں حضرات نے حیرہ کے قریب دریائے فرات سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک سرسبز و شاداب مقام منتخب کیا، جسے حضرت عمر نے پسند فرمایا، حضرت سعد نے ۱۷ھ میں وہاں ایک شاندار مسجد تعمیر فرمائی اس کے قریب بازار قائم کیا اور پھر عرب قبائل نے اپنی اپنی پسند کے مطابق محلے آباد کیے، مسجد سے قریب ہی ایک محل تعمیر کیا گیا، جو بیت المال بھی تھا اور امیر کوفہ کی اقامت گاہ بھی، کوفہ کی آب و ہوا عربوں کو راس آئی، کچھ ہی دنوں بعد کوفہ ایک بڑا مرکزی شہر بن گیا اور حیرہ و مدائن کی ساری عظمتیں خاک میں مل گئیں۔

حضرت عمر نے یمن کے بارہ ہزار افراد اور نزار کے آٹھ ہزار افراد کو کوفہ بھیجا، ان سب کے واسطے آپ نے روزینہ مقرر کیا، کوفہ کی آبادی میں بہت سرعت سے اضافہ ہوا، وہاں تین سو افراد بیعت رضوان والے اور ستر افراد غزوہ بدر والے وارد ہوئے، ایک ہزار سے زیادہ اصحاب رسول نے اسے اپنا وطن بنایا اور حضرت عمر نے حضرت عمار بن یاسر کو امیر کوفہ اور معلم امت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا قاضی اور بیت المال کا منتظم بنا کر بھیجا، کوفہ والوں کو لکھا:

انی بعثت الیکم عمار بن یاسر امیرا وابن مسعود معلما ووزیرا وقد جعلت ابن مسعود علی بیت مالکم وانھما لمن النجباء من اصحاب محمد من اھل بدر فاسمعوا لھما واطیعوھما۔ (اعلام الموقعین فصل ٨٦ ص ٢١٨)

بیشک میں نے عمار بن یاسر کو تمہارا امیر اور عبداللہ بن مسعود کو استاذ و وزیر بنا کر بھیجا ہے اور بیت المال کی ذمے داری بھی عبداللہ بن مسعود کے سپرد کی ہے، یہ دونوں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بدری صحابہ میں خاص

عظمت وشرف کے حامل ہیں، ان کی سنو اور مانو!

اس کے بعد نہایت اہم ارشاد ہے:

قد آثرتکم بابن ام عبد علیٰ نفسی ۔ (ایضا)

ابن ام عبد یعنی عبد اللہ بن مسعود کے علم وفضل وتفقہ وتدبر سے میں بھی مستغنی نہیں لیکن میں نے ایثار کر کے ان کو تمہارے پاس بھیجا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت علی، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور دیگر اصحاب رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سکونت اور ان کی تعلیم وتربیت نے شہر کوفہ کو اسلامی علوم وفنون کا مرکز بنا دیا، اس شہر کی علمی بساط سب سے پہلے حضرت عبد اللہ بن مسعود نے آراستہ کی، آپ کی مجلس میں بیک وقت چار ہزار طالبان علم حاضر ہوا کرتے، جب حضرت علی کوفہ تشریف لائے اور حضرت ابن مسعود کے تلامذہ ان کے استقبال کے لیے آئے، تو سارا میدان بھر گیا، حضرت علی نے خوش ہو کر فرمایا:

رحم اللہ ابن ام عبد قد ملأ ھذہ القریة علما وفی لفظ اصحاب ابن مسعود سرج ھذہ القریة ۔ (ایضا)

اللہ تعالیٰ ابن مسعود پر رحم فرمائے کہ انہوں نے کوفہ کو علم سے مالا مال کر دیا ایک روایت میں یوں ہے کہ عبد اللہ بن مسعود کے شاگرد تو اس شہر کے چراغ ہیں۔

۲۰ھ سے ۳۰ھ تک ابن مسعود نے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور ۳۵ھ میں حضرت علی نے اس شہر کو مرکز خلافت بنایا تو اس کی علمی رونق میں چار چاند لگ گئے، حضرت علی کے بعد دیگر اصحاب رسول اور تابعین وتبع تابعین نے اپنی مساعی جمیلہ سے کوفہ کے چپے چپے کو علم وعرفان کا گہوارہ بنا دیا اور اس سرزمین سے علوم وفنون کے چشمے پھوٹے۔

کوفہ کی آبادی کو ابھی سو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اس مبارک سرزمین میں ایسے ایسے افراد ظاہر ہوئے جنہوں نے عقد ثریا کے روشن تاروں کی طرح تمام عالم اسلام کو شرقا غربا جنوبا شمالا منور کر دیا، ان حضرات نے ایسے ایسے دقائق حل کیے اور ایسے ایسے علوم وفنون ایجاد کیے کہ دنیا محو حیرت ہے۔

اس مرکز علم میں حدیث وفقہ کے ایسے عظیم اساطین صدیوں تک رہے، جن سے کسب فیض کے لیے لوگ دور دراز ملکوں سے بار بار آتے تھے، امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس مرکز علم سے اکتساب فیض کے لیے بار بار حاضر ہوئے وہ خود کہتے ہیں:

لا احصی کم دخلت الی الکوفة وبغداد مع المحدثین ۔

میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں کوفہ اور بغداد محدثین کے ساتھ کتنی مرتبہ گیا۔

کوفہ کی علمی و دینی مرکزیت کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شہر کو ’’رمح اللہ ‘‘ (اللہ کا نیزہ) ’’کنز الایمان‘‘ (ایمان کا خزانہ) اور ’’جمجمۃ العرب ‘‘ (عرب کی کھوپڑی) کے القاب سے یاد کیا، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ’’قبۃ الاسلام‘‘ (اسلام کا گھر) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ’’کنز الایمان ‘‘ (ایمان کا خزانہ) ’’رأس الاسلام‘‘ (اسلام کا سر) اور ’’سیف اللہ‘‘ (اللہ کی تلوار) کا لقب دیا۔ (طبقات ابن سعد ج٦ ص ٥)

معلم امت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا دبستان فقہ

یوں تو شہر کوفہ میں باختلاف روایت ایک ہزار یا پندرہ سو اصحاب رسول وارد ہوئے ان میں ستر بدری صحابہ اور تین سو بیعت رضوان میں شرکت کرنے والے عظیم صحابہ تھے، حضرت علی، حضرت عمار بن یاسر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابو موسیٰ اشعری کوفہ تشریف لائے یہاں قیام کیا اور ان کی علمی و روحانی شخصیتوں سے اہل کوفہ فیض یاب ہوئے لیکن جس عظیم علمی شخصیت نے یہاں دس گیارہ سال تک مسلسل طالبان علوم اسلامیہ کو مالا مال کیا وہ معلم امت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ذات والا صفات ہے، اہل کوفہ پر ان کا سب سے بڑا احسان ہے، امام شعبی کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کوئی صحابی کوفہ میں نہیں آیا، جو اہل کوفہ کے حق میں عبداللہ بن مسعود سے زیادہ نافع ہو، صحابہ کے بعد میں نے ان کے شاگردوں سے حلیم و بردبار اور خون خرابہ سے دور رہنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ (طبقات ابن سعد ج٦ ص ٧)

آپ کے حلقہ درس میں قرآن و حدیث و فقہ و فتاویٰ کی تدریس ہوتی تھی، لیکن وہ علم شریعت کے لیے زیادہ مشہور ہوا، ان کے حلقہ درس کی فقہی خصوصیت ان کے بعد بھی قائم رہی، ان کے شاگردوں نے اپنے شیخ کی فقہی امانت دوسروں تک پہنچانے کے مہتم بالشان خدمت انجام دی، یوں تو ابن مسعود کے ہزاروں تلامذہ ہیں لیکن ان میں چھ حضرات خصوصیت کے ساتھ آپ کی فقہ کے ترجمان و ناشر ہیں (١) علقمہ بن قیس (٢) اسود بن یزید (٣) مسروق بن اجدع (۴) عبیدہ سلمانی (۵) حارث بن قیس (٦) عمرو بن شرحبیل۔

ابن مسعود کے شاگردوں نے اپنے شیخ کے علاوہ حضرت علی کی فقہی آرا کو بھی جمع کیا، مغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت علی کے فقہی اقوال و آرا کے بارے میں عبداللہ بن مسعود کے شاگرد سب سے زیادہ ثقہ و صادق تھے۔

اس طرح ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے فقہی اقوال و آرا کی روشنی میں جو مکتب فقہ وجود میں آیا اسے ابن مسعود کا ’’دبستان فقہ‘‘ سے تعبیر کیا گیا۔

ابن مسعود ان فقہائے صحابہ میں سے ہیں جن کا فقہی مسلک ان کے شاگردوں نے عام کیا، ابن جریر کا بیان ہے حضرات صحابہ میں عبداللہ بن مسعود کے علاوہ کسی صحابی کے تلامذہ نے اپنے شیخ کے فقہی مسلک و فتاویٰ کو نہیں لکھا۔

دعائے رسول

آپ نے عہد رسالت کے ابتدائی ایام میں قبول اسلام کا شرف حاصل کیا، ایک دن مکہ کی وادی میں بکریاں چرا رہے

تھے، دھوپ سخت تھی، اتفاقاً سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر کے ہمراہ اس جانب تشریف لائے، حضرت ابو بکر نے ابن مسعود سے کہا: فرزند تمہارے پاس دودھ ہے، جس سے ہم اپنی پیاس بجھائیں، انہوں نے جواب دیا، میں بکریوں کا مالک نہیں، امین ہوں، آپ کو دودھ دینے سے قاصر ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تیرے پاس کوئی ایسی بکری بھی ہے، جس کا ابھی تک نر سے ملاپ نہ ہوا ہو؟ جواب دیا، ہاں! ایک ایسی بکری موجود ہے، لا کر حاضر خدمت کیا، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری کے تھن پر ہاتھ پھیرا، دعا فرمائی، خشک تھن چشمہ شیر بن کر چھلکنے لگا، صدیق اکبر نے دودھ دوہنا شروع کیا، پہلے سرکار پھر ابو بکر اور ابن مسعود نے شکم سیر ہو کر دودھ نوش کیا، یہ معجزہ دیکھ کر ابن مسعود نے خدمت اقدس میں درخواست کی کہ یہ بات مجھے بھی تعلیم فرمائیں تو حضور نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا اور فرمایا:

انك غلام معلم ۔ تم بہتوں کو پڑھانے والے لڑکے ہو۔

اس واقعہ سے متاثر ہو کر ابن مسعود نے فوراً اسلام قبول کر لیا، اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس سے متجاوز تھی۔

(استیعاب ج ۳ ص ۹۸۸، مسند احمد ج ۱ ص ۳۷۹)

قبول اسلام کے بعد ابن مسعود خدمت نبوی سے اس طرح وابستہ ہو گئے کہ رسول گرامی کی پوری حیات ظاہری میں جدا نہ ہوئے، سفر و حضر ہر جگہ انہیں معیت رسول کا شرف حاصل رہا۔

خانوادہ رسالت سے تعلق و تقرب دیکھ کر لوگ آپ کو خاندان رسالت ہی کا ایک فرد سمجھتے تھے، چنانچہ ابو موسیٰ اشعری کا بیان ہے کہ ہم یمن سے آئے اور کچھ دنوں تک (مدینہ میں) رہے، ہم نے عبداللہ بن مسعود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کثرت سے آتے جاتے دیکھا کہ ہم ان کو (عرصہ تک) خاندان رسالت کا ایک رکن گمان کرتے رہے۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۴۳)

الغرض اس خدمت گزاری اور ہر وقت کی حاضر باشی نے ان کو قدرتاً بہت زیادہ خرمن کمال کے خوشہ چینی کا موقع دیا۔

ابن مسعود سابقین اولین میں سے تھے، بعض لوگوں نے انہیں چھٹا مسلمان لکھا ہے، بعض نے ۱۹ رواں اور بعض نے ۲۳ رواں، بہر حال انہوں نے اس نازک اور پر آشوب دور میں اسلام قبول کیا تھا، جب اسلام کا اظہار و اعلان کفار و مشرکین کا تختہ مشق بننے کے مترادف تھا۔

ابن مسعود نے حبشہ اور مدینہ دونوں ہجرتوں کا شرف حاصل کیا، عہد رسالت کے تقریباً تمام اہم معرکوں میں پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ شریک ہوئے، اسلام کی حمایت میں شجاعت کے جوہر دکھائے، آپ کی تلوار حمایت حق کے لیے ہمیشہ بے نیام رہی۔

حلقۂ درس

ابن مسعود پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ عہدۂ قضا کے فرائض منصبی انجام دیتے اور قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ کی

[illegible] ۱۵ [illegible]

تدریس میں معلم امت کی حیثیت سے مصروف ہو گئے اور عرصہ دراز تک اہم دینی خدمات انجام دیتے رہے، ہزاروں تشنگان علوم اس چشمہ علم وہدایت سے فیض یاب ہوتے رہے۔

نوجوان طالب علم جب آپ کی مجلس میں آتے تو مرحبا کہہ کر ان کا استقبال کرتے اور کہتے لوگ حکمت کے سرچشمے اور ظلمتوں کے چراغ ہیں، ان کے کپڑے پرانے دل نئے ہیں، اپنے گھر کی زینت اور قبیلوں کے گل بوٹے ہیں۔

شاگردوں کی تعداد کے بارے میں اسرار الانوار میں ہے:

كان ابن مسعود بالكوفة وله اربعة آلاف تلميذ يعلمون بين يديه .

ابن مسعود کوفہ میں تھے اور ان کے تلامذہ کی تعداد چار ہزار تھی، جو آپ سے علم سیکھتے تھے۔

ابراہیم نخعی کہتے ہیں: ہمارے یہاں عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ میں ساٹھ ہزار مشائخ تھے۔

حافظ ذہبی طبقات القراء میں لکھتے ہیں:

وتفقه به خلق كثير وكانوا لايفضلون احدا في العلم .

ابن مسعود سے خلق کثیر نے فقہی استفادہ کیا، وہ علم میں کسی کو ابن مسعود پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔

علامہ نووی تہذیب الاسماء واللغات میں لکھتے ہیں:

سمع عنه خلائق لايحصون من كبار التابعين .

بے شمار اکابر تابعین نے آپ سے حدیث کا سماع کیا۔

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

وكان من علماء الصحابة ومن اشتهر علمه بكثرة اصحابه الآخذين عنه .

ابن مسعود علمائے صحابہ سے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کا علم اصحاب وتلامذہ کی کثرت کی وجہ سے پھیلا۔ (فتح الباری ۷ ص ۱۰)

ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

لم يكن احد له اصحاب معروفون حرروا فتياه ومذاهبه في الفقه غير ابن مسعود .

ابن مسعود کے علاوہ کوئی ایسا نہیں ہوا، جس کے معروف ومشہور تلامذہ نے اس کے فتاویٰ اور فقہی مذہب کو تحریر کیا ہو۔

حضرت علی نے آپ کے شاگردوں کو دیکھ کر فرمایا تھا ''**سرج هذه القرية**'' یہ لوگ اس آبادی کے چراغ ہیں۔

حالات کی نیرنگیوں کے باعث کوفہ کے گورنروں کا تبادلہ ہوتا رہا، مگر ابن مسعود اپنی عالمانہ جلالت وذہانت، تقویٰ، حق گوئی، بے باکی اور علم اسلامی کی نشر واشاعت کے ساتھ عہدہ قضا پر قائم رہے۔

عہد عثمانی میں معزول ہوئے، تو ابن مسعود نے مدینۃ الرسول میں سیاسی وملکی معاملات سے کنارہ کش ہو کر تنہائی اختیار کرلیا اور اپنے اوقات عبادت وریاضت، ذکر وفکر اور طالبان علم کے جذبہ تحصیل کی تکمیل کے لیے وقف کردیے۔

ابن مسعود ۳۲ھ میں بیمار پڑے اور تقریباً ساٹھ سال کی عمر پا کر رحلت فرمائی۔

بارگاہ رسالت کی حاضری ذات نبوت سے تقرب خاص اور بے پایاں ذوق علم نے ابن مسعود کا علمی پایہ، بہت بلند کردیا تھا، وہ قرآن اور علوم قرآن کے زبردست عالم حدیث وسنت، فقہ واجتہاد میں درجہ امامت پر فائز تھے، چنانچہ آپ علم میں حضرت عمر اور حضرت علی کے ہم پلہ خیال کیے جاتے تھے۔

قرآن اور متعلقات قرآن میں ابن مسعود کافی درک رکھتے تھے، وہ فرمایا کرتے تھے، میں نے ستر سورتیں زبان رسالت سے سن کر یاد کی تھیں، وہ فرمایا کرتے تھے:

والذی لااله غیره مانزلت سورة من كتاب الله الا و انا اعلم این نزلت و لا انزلت آیة من كتاب الله تعالیٰ الا و انا اعلم فیما انزلت ولو اعلم احدا اعلم منی بكتاب الله تعالیٰ تبلغه الابل لركبت الیه ۔ (بخاری ومسلم، تلخیص الصحاح ج۵ ص ۸۴)

قسم اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی بندگی کے لائق نہیں، قرآن مجید میں کوئی سورت نازل نہیں ہوئی، مگر میں اس کے اترنے کی جگہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں اتری اور قرآن کی کوئی آیت نہیں اتری جس کی نسبت میں یہ نہ جانتا ہوں کہ کب اور کہاں اور کس بارے میں اتری ہے۔ اگر میں کسی کو خود سے زیادہ قرآن کا جاننے والا پاتا اور ان تک اونٹ پہنچ جائے تو میں ضرور سوار ہو کر اس کے پاس جاتا۔

فقہ

ارشاد رسول ہے:

تمسكوا من ابن ام عبد ۔ (ایضا)

ابن ام عبد یعنی ابن مسعود کی ہدایت اور حکم کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔

ابن مسعود ان صحابہ میں سے ہیں، جو علم وفقہ کے بانی وموسس خیال کیے جاتے ہیں، چنانچہ فقہ حنفی کا پورا ایوان تقریباً انہیں کی فقہ کے بنیادی پتھر پر قائم ہے، کوفہ کے زمانہ قضا میں ابن مسعود نے تعلیم وتربیت کے لیے جو حلقہ درس قائم کیا یا مسائل دینی کا استفسار کرنے والوں کو سیر حاصل جوابات سے نوازنے کا اہتمام کیا، اسے ان کے تلمیذ رشید ابراہیم نخعی نے محفوظ کرلیا تھا، چنانچہ ان کے پاس ابن مسعود کے فتاوے کا کافی ذخیرہ موجود تھا، جو حماد کے واسطے سے امام اعظم ابو حنیفہ تک پہنچا، جسے آپ نے اپنے علم واجتہاد سے وسعت دے کر ایک مستقل فقہی دبستان بنادیا، امام شعبی کہا کرتے تھے، صحابہ میں عبداللہ بن مسعود سے زیادہ عالم وفقیہ کوئی شخص کوفہ نہیں آیا۔

خدمت حدیث

آپ کی بارگاہ علوم اسلامی کی درس گاہ تھی، آپ کوفہ کی علمی مجلس کے بانی اور اس کی روشن شمع تھے، جس کی ضیا پاشیوں نے ہزاروں قلب ودماغ کو علم وفن کا ظرف بنا دیا، آپ کے تبحر علمی کا ذکر کرتے ہوئے مسروق فرماتے ہیں:

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی صحبت اٹھائی ہے، وہ تالابوں کے مثل تھے، کسی تالاب سے ایک سوار سیراب ہو جاتا ہے، کوئی اتنا بڑا ہوتا ہے، جو دو سواروں کو سیراب کرتا ہے اور کوئی منبع اتنا بڑا ہوتا ہے، کہ ساری دنیا کے لوگ اس پر وارد ہوں تو سب کو سیراب کر دے، عبداللہ بن مسعود ایسے ہی چشمہ ہیں۔ (سیر الاعلام النبلاء بحوالہ ابن مسعود ص ٨٩)

لوگوں نے حضرت حذیفہ بن یمان سے عرض کیا کہ آپ ہمیں وہ شخص بتائیں جو ہدایت اور حسن سیرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب ہوتا کہ ہم اس سے کچھ حاصل کریں اور حدیث سنیں انہوں نے فرمایا، ہر طور طریقہ اور سیرت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

كان اقرب الناس هديا ودلا وسمتا برسول الله صلى الله عليه وسلم ابن مسعود.

(ترمذی ج ٢ ابواب المناقب)

ہدایت، طور طریقے اور سیرت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب حضرت ابن مسعود تھے۔

تمیمہ بن حرام کا بیان ہے: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مجلسوں میں بیٹھا عبداللہ بن مسعود سے زیادہ دنیا سے بے نیاز آخرت کا طالب اور صلاح وتقویٰ میں قابل تقلید کسی کو نہیں دیکھا۔ (اصابہ ج ٤ ص ١٣٠)

ابوموسیٰ کا بیان ہے: عبداللہ بن مسعود کی ایک مجلس میں حاضری میرے نزدیک ایک سال کے عمل سے افضل ہے۔

(ایضا)

مالک بن یمامہ کہتے ہیں: جب معاذ بن جبل کا وقت آخر آیا تو شاگردوں کو وصیت کی کہ ابن مسعود کے پاس پہنچ جائیں ان کی ہم نشینی اختیار کریں اور ان سے علم حاصل کریں۔ (اعلام الموقعین ج ١ ص ١٤)

ارشاد رسول ہے:

ماحدثكم ابن مسعود فصدقوا. (ترمذی ج ٢ ابواب المناقب ص ٩٥)

ابن مسعود جب کوئی حدیث بیان کریں، تو اس کی تصدیق کرو۔

حدیث کی روایت اور اس کی حفاظت وصیانت میں آپ کا نمایاں حصہ ہے، حدیث رسول کے ساتھ فطری لگاؤ اور شیفتگی تھی، مجلسوں میں خود احادیث کی روایت کرتے اور دوسرے صحابہ سے سنتے، احادیث کے معانی ومطالب پر غور کرتے اور دوسروں کو بھی غور وفکر کی دعوت دیتے، کبھی کبھی شوق حدیث میں اپنے دوستوں اور شاگردوں کے یہاں مذاکرہ کے لیے خود پہنچ جاتے، اپنے علم سے انہیں بہرہ ور کرتے اور ان سے کوئی حدیث یا حدیث سے متعلق کوئی بات معلوم ہوتی، تو اس سے استفادہ

کرتے۔

فقیہ عراق علقمہ بن قیس رضی اللہ عنہ

علقمہ، ابن مسعود کے شاگرد خاص، ان کے علم کے ناشر اور ان کی علمی زندگی کا پرتو ہیں، انہوں نے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابودرداء وغیرہ سے روایت کی۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

علقمة بن قيس بن عبدالله من كبراء التابعين ولد فى حياة رسول الله صلى الله عليه وسلم وسمع من عمر وعثمان وابن مسعود وعلى وابى الدرداء(وزاد فى الخلاصه عن ابى بكر وحذيفه) وجود القرآن على ابن مسعود وتفقه به كان من انبل اصحابه قال عبدالرحمن بن يزيد قال ابن مسعود ما اقرأ شيئا وما اعلم شيئا الا وعلقمة يقرء ه ويعلمه قال قابوس بن ابى ظبيان قلت لابى لاى شيئ كنت تدع الصحابة وتاتى علقمة قال ادركت ناسا من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم وهم يسئلون علقمة ويستفتونه ۔ قلت كان فقيها اماما بارعا طيب الصوت بالقرآن ثبتا فيما ينقل صاحب خير وورع كان يشبه ابن مسعود فى هديه ودله وسمته وفضله مات سنة اثنتين وستين ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۵۴)

حضرت علقمہ بن قیس بن عبداللہ کبرائے تابعین میں سے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیدا ہوئے، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود، حضرت علی اور حضرت ابودرداء رضوان للہ علیہم اجمعین سے روایتیں سنیں، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس تجوید سے قرآن پڑھا، انہیں سے تفقہ بھی حاصل کیا، حضرت عبداللہ بن مسعود کے سب سے جلیل القدر شاگرد ہیں، عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں، کہ میں جو کچھ پڑھتا اور جانتا ہوں عبداللہ بن مسعود بھی پڑھتے اور جانتے ہیں، قابوس بن ابی ظبیان کا بیان ہے، کہ میں نے اپنے والد سے عرض کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس جاتے ہیں تو انہوں نے کہا اس لیے کہ میں نے بہت سے صحابہ کو ان سے مسائل اور فتاوی دریافت کرتے ہوئے پایا ہے۔ میں (ذہبی) کہتا ہوں کہ وہ فقیہ، امام، اچھی آواز میں قرآن پڑھنے والے، ثبت فی الحدیث خیر وورع کے حامل تھے، عادات واطوار، فضل وکمال میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے مشابہ تھے۔ ۶۲ھ میں وصال کیا۔

علامہ ذہبی ان کی فقاہت وامامت، حسن صوت اور خیر وورع اور ان کے متثبت فی النقل ہونے کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں تمام عادات وفضل میں عبداللہ بن مسعود کے مشابہ تھے گویا حضرت ابن مسعود کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو خصوصیت تھی وہی خصوصیت حضرت علقمہ کو ابن مسعود کے ساتھ تھی، جس طرح حضرت عبداللہ بن مسعود اخلاق واعمال، سیرت

وکردار میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ تھے اسی طرح حضرت علقمہ بھی حضرت ابن مسعود کا نمونہ تھے، یوں تو حضرت علقمہ سفر میں بھی اپنے شیخ کے ساتھ رہتے تھے، لیکن اگر کسی مجبوری کی وجہ سے سفر میں نہ جاسکتے تو کسی خاص آدمی کو ساتھ کردیتے تاکہ سفر کے حالات ومعلومات سے بھی ناواقفیت نہ رہے، حضرت عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن مسعود حج کے ارادے سے روانہ ہوئے حضرت علقمہ کسی عذر کی وجہ سے ہمراہ نہ جاسکے، مجھ کو ان کے ساتھ کردیا اور کہا ان کے ساتھ رہو اور جو کچھ دیکھو، سنو، اس سے مجھے مطلع کرنا۔

عن علقمة كنا جلوسا مع ابن مسعود فجاء خباب فقال يا ابا عبدالرحمٰن ايستطيع هؤلاء الشباب ان يقرؤا كما تقرأ قال اما انك لوشئت امرت بعضهم يقرأ عليك قال اجل فقال اقرأ يا علقمة (قال علقمة) فقرأت خمسين آية من سورة مريم فقال عبدالله كيف ترى قال قد احسن قال عبدالله ما اقرأ شيئا الا وهو يقرءه ۔(بخاری شریف ج۲ ص ٢٣٠)

حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ حضرت خباب آئے اور کہا اے ابن مسعود کیا یہ آپ کے جوان شاگرد آپ کی طرح قرآن پڑھ سکتے ہیں، حضرت ابن مسعود نے کہا، اگر آپ کہیں تو کسی سے پڑھوا کر سنواؤں حضرت خباب نے کہا: ضرور! تو حضرت ابن مسعود نے حضرت علقمہ سے کہا پڑھو حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ میں نے سورہ مریم کی پچاس آیتیں پڑھیں، حضرت ابن مسعود نے حضرت خباب سے پوچھا کیا رائے ہے تو حضرت خباب نے کہا کہ بہت خوب پڑھا، حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا جو کچھ میں پڑھتا ہوں وہی یہ بھی پڑھتے ہیں۔

فاضل میں ہے:

ولہ رحلة الى ابى الدرداء بالشام والى عمر وزيد وعائشة بالمدينة وهو ممن جمع علوم الامصار ۔

حضرت علقمہ طلب علم کے لیے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے پاس شام گئے اور حضرت عمر، حضرت زید اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ حضرت علقمہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سارے شہروں کے علوم جمع کیے۔

تہذیب التہذیب میں ہے:

اعلم الناس بعبدالله بن مسعود علقمة والاسود وعبيدة والحارث وثقه ابن معين وشعبة وابن سيرين وغيرهم واثنوا عليه خيرا وهو من اجل اصحاب ابن مسعود ۔

عبداللہ بن مسعود کے علم کو جاننے والوں میں سب سے بڑھ کر علقمہ، اسود، عبیدہ اور حارث ہیں، ابن معین،

شعبہ اور ابن سیرین وغیرہم نے علقمہ کو ثقہ قرار دیا ہے اور ان کی اچھی تعریف کی ہے، علقمہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں میں سب سے زیادہ جلیل القدر تھے۔

تقریب میں ہے:

ثقة ثبت فقيه عابد ۔

علقمہ ثقہ ثبت فقیہ اور عابد ہیں۔

ابن حبان نے اپنی ثقات میں لکھا:

كان من افضل اهل الكوفة عبادة وفضلا وفقها و كان من اشبههم بعبدالله بن مسعود هديا ودلا ۔

علقمہ عبادت، فضل، فقہ کے اعتبار سے اہل کوفہ میں افضل تھے اور عادت واطوار کے لحاظ سے ان میں سب سے زیادہ عبداللہ بن مسعود کے مشابہ تھے۔

عبداللہ بن مسعود کے انتقال کے بعد اہل علم نے علقمہ سے حضرت ابن مسعود کا جانشین بننے کے لیے کہا، تو جواب دیا کہ تم لوگ مجھ کو نشانہ بنانا چاہتے ہو آپ نے اپنے گھر پر حلقہ درس قائم کیا جہاں بہت سے علما نے آپ سے حدیث وفقہ کا درس لیا، ان میں ابراہیم نخعی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ امرا اور حکام سے ہمیشہ دور رہتے، ایک مرتبہ لوگوں نے ان سے کہا، کہ آپ امیر کوفہ کے یہاں جا کر اس کو دین کی باتیں بتائیں انہوں نے جواب دیا کہ میں ان امرا کے پاس جا کر دنیا سے جو کچھ حاصل کروں گا، وہ اس سے بہتر میرے دین سے لے لیں گے۔

امام ابراہیم بن یزید نخعی رضی اللہ عنہ

ابوعمران ابراہیم بن یزید بن اسود بن عمرو بن حارثہ بن سعد بن مالک بن نخع نخعی کوفی، کوفہ کے ممتاز ترین تابعی ہیں، چچا علقمہ کوفہ کے ممتاز فقیہ ومحدث تھے، ابراہیم نے ان کے دامن میں پرورش پائی اور ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی، خصوصیت کے ساتھ علقمہ سے تحصیل فقہ کی، بچپن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، ان بزرگوں کی فیض صحبت نے ابراہیم کا دامن دولت علم سے مالا مال کر دیا تھا اور ان کا شمار اس وقت کے ممتاز ترین علما میں ہوتا تھا۔

ابراہیم کا خاص فن فقہ تھا، اس فن کے وہ امام تھے، ان کے فقہی کمال پر سب کا اتفاق ہے، بڑے بڑے علما فقہی مسائل کے سائلین کو ان کے پاس بھیج دیتے تھے، سعید بن جبیر کے پاس جب کوئی فتویٰ پوچھنے کے لیے آتا تو اس سے کہتے ابراہیم کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو؟ ابووائل کے پاس جب کوئی مستفتی جاتا تو اس کو ابراہیم کے پاس بھیج دیتے اور اس سے کہہ دیتے کہ وہ جو جواب دیں مجھے بتانا۔

آپ کا ارشاد ہے، کہ روایت بغیر فہم وتدبر کے اور فہم وتدبر بغیر روایت کے ٹھیک نہیں ہے، حافظ شمس الدین ذہبی ابراہیم نخعی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

ابوعمران ابراهيم بن يزيد بن قيس الاسود الكوفى الفقيه روىٰ عن علقمة ومسروق والاسود وطائفة ودخل على عائشة رضى الله عنها وهو صبى اخذ عنه حماد بن سليمان الفقيه وخلق وكان من العلماء ذوى الاخلاص قال مغيرة كنا نهاب ابراهيم كما يهاب الامير قال الاعمش ربما رأيت ابراهيم يصلى ثم ياتينا فيبقى ساعة كانه مريض وقال ابراهيم كان صيرفيا فى الحديث وكان يتوقى الشهرة ولا يجلس الى الاسطوانة وقال الشعبى لما بلغه موت ابراهيم ماخلف بعده مثله وقال عبدالملك بن ابى سليمان سمعت سعيد بن جبير يقول تستفتونى وفيك ابراهيم النخعى وقالت هنيدة زوجة ابراهيم انه كان يصوم يوما ويفطر يوما ملخصا ومات فى آخر خمس وتسعين ۔

(تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج۱ص۷۰)

ابوعمران ابراہیم بن یزید بن قیس الاسود الکوفی الفقیہ نے علقمہ، مسروق، اسود وغیرہ سے روایت کی، بچپن میں حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حماد بن سلیمان الفقیہ اور بہت سے لوگوں نے آپ سے تعلیم پائی، مخلص علما میں سے تھے، مغیرہ کہتے ہیں کہ ان کی ہیبت ہمارے قلوب میں ایسی تھی جیسے دوسروں کے قلوب میں امیر کی ہوتی ہے، اعمش کہتے ہیں کہ بارہا میں نے دیکھا کہ نماز پڑھ کر آتے تو کچھ دیر کے لیے مریض جیسے معلوم ہوتے، صیرفی الحدیث کے خطاب سے مشہور ہوئے، شہرت سے بچتے تھے، ممتاز جگہ نہ بیٹھتے تھے، امام شعبی کو جب ان کی وفات کی خبر ہوئی تو کہا اپنے بعد اپنے جیسا کسی کو نہیں چھوڑا، عبدالملک بن سلیمان کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر سے سنا وہ کہتے تھے کہ کیا ابراہیم کے ہوتے ہوئے مجھ سے مسائل پوچھتے ہو؟ ابراہیم نخعی کی بیوی ہنیدہ فرماتی ہیں کہ ایک دن وہ روزہ رکھتے ایک دن افطار کرتے تھے۔ ۹۵ھ کے اخیر میں انتقال کیا۔

شعبی نے کہا:

اذا رأيت ابراهيم فلايضرك ان ترى علقمة ۔

تم نے ابراہیم نخعی کو دیکھا تو گویا علقمہ کو دیکھا یعنی ابراہیم فضل واعمال میں علقمہ کے نمونہ تھے۔

ابونعیم نے سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ امام شعبی جب ۹۵ھ میں حضرت ابراہیم کے جنازہ میں شریک ہوئے، تو ایک آدمی کو مخاطب کر کے کہا:

قد دفنتم افقه الناس فقال الرجل ومن الحسن ومن اهل البصرة ومن اهل الكوفة واهل الشام واهل الحجاز ۔

تم نے سب سے بڑے فقیہ کو دفن کیا اس شخص نے کہا کہ حسن بصری سے بھی زیادہ فقیہ تھے تو امام شعبی نے کہا حسن بصری، سے بھی سب بصرہ اور کوفہ اور اہل شام وحجاز والوں سے بھی۔

اعمش نے کہا:

حضرت ابراہیم صیر فی الحدیث (ناقد وبصیر کھوٹا وکھرا پرکھنے والے) تھے، اسی لیے میں جب حدیث سنتا ہوں تو ابراہیم پر پیش کرتا ہوں تا کہ اس کی صحت کے بارے میں مطمئن ہو جاؤں۔

امام اعظم ابوحنیفہ کا بیان ہے:

ابراهيم افقه من سالم ۔

ابراہیم سالم سے بڑے فقیہ تھے۔

امام حماد بن ابوسلیمان کوفی رضی اللہ عنہ

ابواسماعیل حماد بن ابوسلیمان مسلم کوفی، کوفہ کے جلیل القدر فقیہ ومحدث ہیں، حضرت انس بن مالک سے حدیث کا سماع کیا اور بڑے بڑے تابعین کے فیض علم سے مستفیض ہوئے۔ ابراہیم نخعی کے علوم کے حامل اور ان کے جانشین تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود سے جو سلسلہ فقہ جاری ہوا تھا، اس کا مدار آپ پر ہی تھا۔ حضرت حماد اپنے شیخ حضرت ابراہیم نخعی کی خدمت میں برابر رہتے اور علم وفقہ بھی حاصل کرتے اور گھر کی خدمات بھی انجام دیتے۔ ابوالشیخ نے تاریخ اصبہان میں نقل کیا ہے:

وجد ابراهيم النخعي حمادا يشترى له لحما بدرهم فى زنبيل فلقيه ابوه راكبا دابة بيدحماد الزنبيل فزجره ورمى به من يده فلما مات ابرهيم جاء اصحاب الحديث والخراسانية يدقون على باب مسلم بن يزيد والد حماد فخرج اليهم فى الليل بالشمع فقالوا لسنا نريدك نريد ابنك حمادا فدخل اليه فقال يا بنى قم الى هؤلاء فقد علمت ان الزنبيل ادى بك الى هؤلاء اه ۔

ابراہیم نخعی نے ایک دن حماد کو ایک درہم کا گوشت خریدنے کے لیے ٹوکری دے کر بھیجا، حماد کے باپ ایک سواری پر آرہے تھے، راستے میں ملاقات ہوئی، حماد کے ہاتھ میں ٹوکری دیکھی، تو بیٹے کو ڈانٹا اور ہاتھ سے ٹوکری لے کر پھینک دیا، پس جب ابراہیم کا انتقال ہوا، اصحاب حدیث اور خراسانی لوگ آکر حماد کے والد مسلم بن یزید کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے، رات کا وقت تھا، حماد کے والد روشنی لے کر نکلے، تو لوگوں نے کہا کہ ہمیں آپ کی تلاش نہیں، ہم کو تو آپ کے لڑکے حماد سے کام ہے، تو وہ اندر گئے اور کہا بیٹا اٹھو ان کے پاس جاؤ اب

میں سمجھا کہ ٹوکری نے تمہیں اس بلند درجہ پر پہنچایا۔

حضرت حماد مرد یگانہ اور صاحب احوال بزرگ تھے، روایت حدیث کے وقت آپ پر حال طاری ہو جایا کرتا تھا، بسا اوقات بے خود ہو جاتے ہوش آنے پر وضو کرتے اور جس جگہ سے حدیث رہ گئی تھی، اسی جگہ سے آپ حدیث روایت کرتے تھے، اللہ نے مال و دولت کے ساتھ جود و سخا کی صفت سے متصف کیا تھا، رمضان کے مہینے میں روزانہ پچاس افراد کو کھانا کھلاتے، وہ عید کے دن ان میں ہر ایک کو ایک کپڑا اور ایک سو درہم عنایت کرتے، آپ امرا و خلفا کے درباروں میں حاضری کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ سے کہا، آپ میرے لیے اس کام کی سفارش ابن زیاد سے کر دیں، آپ نے اس شخص سے فرمایا، تم کو اس کام میں کتنے منافع کی توقع ہے، اس نے ایک ہزار درہم بتایا، آپ نے اس کو پانچ ہزار درہم دیے اور فرمایا اس حقیر رقم کے واسطے ابن زیاد کے سامنے اپنی آبرو کیوں ضائع کروں۔

آپ کا حلقہ درس جامع کوفہ میں تھا، جس میں بڑے بڑے علما، فقہا اور محدثین شرکت کیا کرتے تھے۔

آپ نے انس، زید بن وہب، سعید بن میتب اور سعید بن جبیر وغیرہ سے سماع حدیث کیا اور آپ سے آپ کے بیٹے اسماعیل، عاصم احول، شعبہ، ثوری، حماد بن سلمہ، مسعر بن کدام اور امام اعظم ابوحنیفہ نے روایت کیا۔

امام بخاری نے اپنی کتاب ”الادب المفرد“ میں ان سے روایات نقل کیا ہے اور صحیح بخاری میں تعلیقاً استشہاد کے طور پر روایت کیا ہے اور امام مسلم نے صحیح میں اور اصحاب سنن اربعہ نے بھی اپنی سنن میں ان کی روایت کو نقل کیا ہے۔

فقہ میں حضرت حماد، ابراہیم نخعی کے سچے جانشین تھے، استاذ کو اپنے شاگرد کی پختگی علم پر پورا اعتماد تھا، وہ لوگوں کو ان سے مسائل دریافت کرنے کی رغبت دلایا کرتے تھے اور اپنے بعد حماد ہی کو اپنا جانشین سمجھتے تھے، چنانچہ ابن عدی نے الکامل میں بطریق یحی بن معین عن ابن ادریس عن الشیبانی عن عبدالملک بن ایاس یہ روایت نقل کی ہے، کہ عبدالملک بن ایاس شیبانی کہتے ہیں:

قلت لابراهيم من نسال بعدك قال حمادا .

میں نے ابراہیم سے پوچھا کہ آپ کے بعد کس سے ہم مسائل دریافت کریں تو ابراہیم نے کہا حماد سے۔

مغیرہ کہتے ہیں:

قلت لابراهيم قعد يفتى فقال ومايمنعه ان يفتى وقد سالنى هو وحده عما لم تسئلونى كلكم عن عشره .

میں نے ابراہیم سے کہا کہ حماد تو فتویٰ دینے لگے تو ابراہیم نے کہا فتویٰ دینے سے ان کو کیا چیز مانع ہو سکتی ہے، جیسا کہ انہوں نے مجھ سے تنہا اتنے مسائل دریافت کیے ہیں کہ تم سب نے مل کر اس کا دسواں حصہ بھی

دریافت نہیں کیا (یعنی وہ اہل ہیں فتویٰ دے سکتے ہیں)

ابن شبرمہ کہتے ہیں:

ما احد آمن علی بعلم من حماد ۔

میرے نزدیک علم کے بارے میں حماد سے زیادہ کوئی قابل اعتماد نہیں۔

معمر کہتے ہیں:

ما رایت افقه من هؤلاء الزهری وحماد وقتادة ۔

میں نے زہری، حماد اور قتادہ سے زیادہ کسی کو افقہ نہیں دیکھا۔

عجلی کہتے ہیں:

کوفی ثقة وکان افقه اصحاب ابراهیم ۔

وہ کوفی ہیں، ثقہ ہیں، حضرت ابراہیم کے تمام شاگردوں میں افقہ ہیں۔

مغنی میں ہے:

کان اعلمهم برای النخعی وکان افقه اصحاب ابراهیم ۔

وہ نخعی کی فقہ کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور ابراہیم کے شاگردوں میں سب سے بڑے فقیہ تھے۔

* * *

امام اعظم کا حلقۂ درس

اساطین علم کی بارگاہوں سے فیض اٹھانے کے بعد امام صاحب نے مروجہ علوم وفنون بالخصوص فقہ میں کامل درک حاصل کرلیا تھا، وہ کہیں بھی اپنا علاحدہ حلقۂ درس قائم کرسکتے تھے، مگر جب تک حضرت حماد زندہ رہے، انہوں نے مسند درس آراستہ نہیں کی، امام زفر کا بیان ہے:

حضرت امام ابوحنیفہ نے اپنے استاذ حماد سے وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، میں دس سال آپ کی صحبت میں رہا، پھر میرا جی حصول اقتدار کی جانب مائل ہوا، تو میں نے اپنا حلقہ الگ جمانے کا ارادہ کرلیا، ایک روز میں پچھلے پہر نکلا اور چاہا کہ یہ کام کرلوں، جب مسجد میں قدم رکھا اور شیخ حماد کو دیکھا تو ان سے علاحدگی پسند نہ آئی اور آکر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا، اسی رات حماد کو اطلاع ملی، کہ بصرہ میں ان کا کوئی عزیز فوت ہوگیا ہے، اور بہت زیادہ مال چھوڑا ہے، بجز حماد کے اس کا کوئی وارث نہیں، آپ نے مجھے اپنی جگہ بیٹھنے کا حکم دیا، ان کا جانا تھا، کہ میرے پاس چند مسائل ایسے آئے، جو میں نے اب تک ان سے نہ سنے تھے، میں جواب دیتا جاتا اور اپنے جوابات لکھتا جاتا تھا، جب حماد آئے، تو وہ مسائل پیش کردیے جو ساٹھ تھے، چالیس میں انہوں نے میرے ساتھ اتفاق کیا اور بیس میں میرے خلاف جواب دیے، میں نے قسم کھائی

فآليت علي نفسي ان لا افارقه حتي يموت فلم افارقه حتي مات

ان کی زندگی تک ان سے الگ نہ رہوں گا، پھر میں اس عہد پر قائم رہا اور تمام زندگی ان کے دامن سے وابستہ رہا۔ (تاریخ بغداد ج۱۳ ص۳۳۳)

حضرت امام صاحب نے اگرچہ حضرت حماد کی زندگی ہی میں اجتہاد کا درجہ حاصل کرلیا تھا، تاہم شاگردانہ خلوص نے گوارہ نہ کیا کہ استاذ کے ہوتے ہوئے اپنا دربار الگ جمائیں، امام صاحب اپنے استاذ کا کس درجہ ادب کرتے تھے، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگانا آسان ہوگا، کہ حماد جب تک زندہ رہے میں نے ان کے مکان کی طرف کبھی پاؤں نہیں پھیلایا۔

امام حماد بن ابوسلیمان کی وفات ۱۲۰ھ کے بعد ان کے جانشین کی ضرورت محسوس کی جانے لگی، تو لوگوں نے ان کے صاحبزادے اسماعیل بن حماد کو مسند درس پر بیٹھایا، مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ اسماعیل نحو، عربیت، کلام عرب اور اشعار، ایام عرب کے

عالم ہیں لیکن فقہ وفتاوی میں ان کو کمال حاصل نہیں ہے، جس کی توقع تھی، اس لیے لوگوں نے ابوبکر نہشلی کو حماد بن ابوسلیمان کا جانشین بنانا چاہا، مگر انہوں نے انکار کر دیا، اس کے بعد ابو بردہ عتمی سے کہا گیا، انہوں نے بھی انکار کر دیا، اس لیے سب حضرات نے متفقہ طور پر ابوحنیفہ کا انتخاب یہ کہہ کر کیا، ”ان هـذا لخزاز حسن المعرفة وان كان حديثا “ یہ ریشم فروش اگرچہ نوعمر ہے، فقہ کی معرفت اچھی رکھتا ہے۔ امام صاحب نے اپنے ساتھیوں کی بات رکھتے ہوئے استاذ کے حلقہ میں بحیثیت معلم بیٹھنا منظور کر لیا اور حماد بن ابی سلیمان کے اونچے تلامذہ ان کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے، جب اس کی خبر علمائے کوفہ میں عام ہوئی، تو ابو یوسف، اسد بن عمرو، قاسم بن معن، زفر بن ہذیل، ولید بن ابان، ابوبکر ہذلی اور دوسرے اہل علم آنے لگے، اور کوفہ کی جامع مسجد اتنی پر کشش ہوگئی کہ امراو حکام اور اعیان واشراف تک جمع ہونے لگے۔

ابتدا میں امام صاحب کو استاذ کی جانشینی اور اپنا حلقہ درس قائم کرنے میں بڑا تردد اور خلجان تھا، انہیں دنوں انہوں نے ایک خواب دیکھا، جو بظاہر بڑا پریشان کن تھا، ان کا بیان ہے، کہ میں نے دیکھا، کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کھود رہا ہوں، اس خواب سے بہت زیادہ گھبراہٹ پیدا ہوئی اور میں نے بصرہ جا کر ایک شخص کے ذریعہ حضرت محمد بن سیرین سے اس کی تعبیر دریافت کی تو انہوں نے فرمایا:

هذا رجل ينبش اخبار النبي صلى الله عليه وسلم ۔

یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ظاہر کرے گا۔ (تاریخ بغداد ج۱۳ص۳۳۵)

صاحب حدائق الحنفیہ نے شغل درس وتدریس اختیار کرنے کے سلسلے میں یہ واقعہ نقل کیا ہے

جب آپ تمام علوم میں کامل ومکمل ہوگئے تو آپ نے صوف پہن کر گوشہ نشینی کا قصد کیا، اس پر آپ نے ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرماتے ہیں کہ اے ابوحنیفہ! آپ کو خدا نے میری سنت زندہ کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، آپ گوشہ نشینی وعزلت کا قصد ہرگز نہ کریں، یہ بشارت آپ پاتے ہی افادت وافاضت خلائق اور اجتہاد واستنباط مسائل شرعیہ میں مشغول ہوئے، یہاں تک کہ آپ کا مذہب نشر آفاق ہوا۔ (ص۴۶،۴۷)

حلقہ درس قائم کرنے کی وجہ جو بھی ہو، اس سے قطع نظر یہ امر مسلم ہے کہ امام اعظم کو رب العزت جل جلالہ نے تبحر علمی تفقہ اور تفہیم وتکلم، جودت فکر، استحضار علم عطا فرمایا تھا، اس کی شہرت صرف کوفہ یا عراق کے دوسرے شہروں تک محدود نہیں رہی، بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں اس کا غلغلہ بلند ہوا اور تشنگان علم جوق در جوق حلقہ درس میں حاضر ہونے لگے۔

اندلس کے سوا اس وقت کی اسلامی دنیا کا کوئی حصہ نہ تھا، جو ان کی شاگردی کے تعلق سے آزاد رہا ہو، کوفہ ومضافات کوفہ کے علاوہ جن بلاد وامصار کے طالبان علم آپ کی بارگاہ میں کسب علم کے لیے حاضر ہوتے ان کا شمار ممکن نہیں چند اضلاع وامصار کے نام یہ ہیں۔

بصرہ، مکہ، مدینہ، دمشق، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان،

اصفہان، حلوان، ہمدان، نہاوند، رے، قومس، دامغان، طبرستان، جرجان، نیشاپور، سرخس، نسا، بخارا، سمرقند، صنعان، ترمذ، ہرات، خوارزم، سیوستان، مدائن، حمص۔

بلفظ دیگر یوں کہا جائے کہ ان کے استاذی کے حدود اس وقت کی عباسی خلافت کی حدود سلطنت کے برابر تھے۔

امام صاحب کا حلقہ درس تعلیم وتدریس فقہ کے لیے مخصوص تھا، لیکن فقہی مسائل کے مصادر، قرآن وحدیث کی تفسیر و تعبیر، اصول اجتہاد واستنباط نیز حدیث کے اصول روایت ودرایت بھی زیر بحث آتے۔ امام صاحب کا طریقہ یہ ہوتا کہ فقہی مسائل پیش کرتے اوران پر شاگردوں کو رائے زنی کی اجازت ہوتی، وہ اپنے علم وقیاس کے مطابق مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اپنی رائے پیش کرتے۔

انداز مباحثہ ومذاکرہ تربیت کا خاص اسلوب ہے، جس سے شاگرد کی فکر وتحقیق میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے اور مسائل کی تہہ تک پہنچنے کا شعور پروان چڑھتا ہے۔

جب کوئی حدیث سامنے آتی وہ جن احکام پر مشتمل ہوتی ان کے علل کے وجوہات پر غور کرتے، بحث وجدل کا بازار گرم ہوتا، جو مسائل علت میں اصل کے شریک ہوتے ان کو اس اصل پر متفرع قرار دیتے اور اسی کا نام فقہ ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے جو شخص حدیثیں بیان کرتا ہے مگر فقہ سے آشنائی پیدا نہیں کرتا ایک عطار کی طرح ہے جو دوائیں جمع کرتا ہے مگر اسے معلوم نہیں کہ یہ کس مرض کے لیے ہیں، یہاں تک کہ طبیب آ کر بتاتا ہے، اسی طرح طالب حدیث کو معلوم نہیں کہ اس حدیث کا مقصد کیا ہے اور فقیہ ہی اس کی گرہ کشائی کر سکتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ اپنے تلامذہ کو تقلید پیشہ حکم نہیں بنانا چاہتے تھے، بلکہ ایک مناظر کی حیثیت میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ امام صاحب تین باتوں کا خاص خیال رکھتے۔

(۱) تلامذہ کی مالی امداد کرتے اور گردش ایام میں ان کا ساتھ دیتے، جس کو شادی کی ضرورت ہوتی اور وہ مالی وسائل نہ رکھتا اس کی شادی کر دیتے ہر شاگرد کی ضروریات کی کفالت فرماتے۔ شریک کا قول ہے:

آپ اپنے طلبہ کو ضروریات سے بے نیاز کر دیتے اور ان پر اور ان کے اہل وعیال پر خرچ کرتے، جب شاگرد طلب علم سے فارغ ہوتا تو فرماتے، حلال وحرام کی معرفت کی وجہ سے اب تم غنی ہو گئے ہو۔

(۲) تلامذہ کی کڑی نگرانی کرتے، جب کسی میں احساس علم کے ساتھ کبر ونخوت کے آثار دیکھتے تو ان کا ازالہ فرماتے اور اس کو باور کراتے کہ وہ ہنوز دوسروں سے استفادہ کا محتاج ہے۔

(۳) آپ تلامذہ کو نصیحت کرتے رہتے خصوصاً ان لوگوں کو جو اپنے وطن کو واپس جانے والے ہوتے یا جن سے بڑا آدمی بننے کی توقع ہوتی۔ (الخیرات الحسان ص ۴۱، ۴۲، ۴۳)

- امام صاحب انتہائی محتاط اور متحمل مزاج معلم تھے، طلبہ کے اشکالات واعتراضات بڑی خندہ پیشانی سے سنتے اور انتہائی

نرمی سے جواب دیتے، ایک مرتبہ کسی مسئلے کی بابت ارشاد فرمایا: ”اخطأ الحسن “حسن نے غلطی کی۔ ایک صاحب غصے میں کھڑے ہوگئے اور آپ کی شان میں گستاخی کی مجلس میں سناٹا چھا گیا کافی دیر تک درس موقوف رہا، تلامذہ کو طیش آیا اور آپ نے منع فرمادیا، پھر جب سب کا غصہ ٹھنڈا ہوا، تو آپ نے نرمی کے ساتھ فرمایا: ”وا اللہ اخطأ الحسن واصاب ابن مسعود“ خدا کی قسم حسن سے خطا ہوئی اور ابن مسعود نے درست فرمایا۔

دوران درس مکمل انہماک اور طمانیت ہوتی۔ ایک مرتبہ چھت سے آپ کی گود میں سانپ گرا لوگ دیکھتے ہی بھاگنے لگے، لیکن آپ کی ہیئت میں کوئی فرق واقع نہ ہوا، معمولی طور پر کپڑے کو جھٹک دیا اور پھر درس میں مصروف ہوگئے۔

آپ کی تقریر اتنی جامع اور حقائق ومعارف پر مبنی ہوتی، کہ طلبہ پورے طور پر مطمئن ہوجاتے۔ حافظ ابوحمزہ محمد بن میمون نے قسم کھا کر کہا، کہ ابوحنیفہ کی تقریریں سن کر مجھے جس قدر خوشی ہوتی واللہ وہ لاکھ اشرفی کے ملنے سے بھی نہیں ہوسکتی تھی۔

یوسف بن خالد سمتی کا بیان ہے وہ فرماتے ہیں۔ جب میں دوسروں سے علم حاصل کر کے امام صاحب کے حلقے میں بیٹھا اور ان کی تقریریں سنیں، تو معلوم ہوا، کہ علم کے چہرے پر نقاب تھی، جو ان کی تقریروں سے اٹھ گئی۔

ابوسفیان حمیری فرماتے ہیں، کہ سخت مسائل کا کشف اور احادیث مبہمہ کی تفسیر جو امام ابوحنیفہ نے کی وہ کسی اور سے نہ ہوسکی۔

امام صاحب کے حلقہ درس میں لوگوں کا ہجوم اور بحث ومناظرہ کا ہنگامہ رہتا، جدل ومناظرہ کے ماحول میں جب امام صاحب تقریر شروع کرتے تو سب خاموش ہوجاتے، مصعب کہا کرتے تھے، کہ اتنی بلند آوازوں کو جس شخص کی تقریر سے اللہ تعالیٰ ساکت کردیتا ہے وہ اسلام میں ایک عظیم الشان شخص ہے۔

> علی بن مدینی کہتے ہیں: **سمعت یوسف بن خالد السمتی یقول کنا نجالس البتّی بالبصرة فلما قدمنا الکوفة جالسنا ابا حنیفة فاین البحر من السواقی فلا یقول احد یذکره انه رای مثله ماکان علیه فی العلم کلفة وکان محسودا** ۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ ص ۵۴)
>
> میں نے یوسف بن خالد سمتی سے سنا کہ بصرہ میں ہم بتی کے پاس بیٹھتے تھے اور جب ہم کوفہ آئے، ابوحنیفہ کے پاس بیٹھے، کہاں سمندر اور کہاں پانی کی نالی جس نے بھی ان کو دیکھا ہے وہ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ان کا مثل دیکھا ہے، علم میں ان کے لیے کوئی دقت نہ تھی اور ان سے حسد کیا جاتا تھا۔

امام اعظم کی مجلس درس میں طلبہ کو فقہی مسائل پر کھل کر بحث کرنے کی اجازت تھی اور بسا اوقات بحث ومباحثہ کے درمیان شاگردوں کی آواز بلند ہوجاتی۔

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مسجد میں ابوحنیفہ کی مجلس درس سے گزرا دیکھا کہ ان کے اردگرد شاگردوں کی جماعت بلند آواز سے بحث ومباحثہ کررہی ہے، میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو مسجد میں شور کرنے سے کیوں نہیں روکتے ہیں؟

انہوں نے کہا: ”دعهم فانهم لا يتفقهون الا بهذا“ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو وہ اسی طرح تفقہ حاصل کریں گے۔

(مناقب ابی حنیفہ وصاحبیہ ص ۲۱)

امام صاحب کی مقبولیت

مسند تدریس پر فائز ہونے کے بعد آپ کے طریقہ درس کی انفرادیت اور آپ کی جامع کمال عبقری شخصیت کا شہرہ شرق سے لے کر غرب اور شمال سے لے کر جنوب تک سارے اسلامی بلاد میں پھیل گیا۔ لوگ کوفہ آ کر استفادہ کرتے اور جب کبھی امام صاحب بغرض سفر باہر تشریف لے جاتے تو وہاں بھی تشنگان علم کا ازدحام ہو جاتا حتی کہ سفر حرمین شریفین میں بھی یہی کیفیت رہتی۔

کبھی وہ زمانہ تھا کہ امام ابو حنیفہ نے ایک طالب علم کی حیثیت سے حرمین کا سفر کیا تھا اب یہ نوبت پہنچی کہ سفر کا قصد کرتے تو تمام اطراف میں شہرہ ہو جاتا کہ فقیہ عراق عرب کو جا رہا ہے، جس شہر یا گاؤں میں گزر ہوتا تو ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہو جاتا اور لوگ استفادہ کرتے، ایک دفعہ مکہ معظمہ گئے تو لوگوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ مجلس میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی ارباب حدیث وفقہ دونوں گروہ کے لوگ تھے اور شوق کا یہ عالم تھا کہ ایک پر ایک گرا جاتا تھا۔ آخر امام صاحب نے تنگ آ کر کہا، کاش ہمارے میزبان سے جا کر کوئی کہتا، کہ اس ہجوم کا انتظام کرے، ابو عاصم نبیل حاضر تھے، عرض کی کہ میں جاتا ہوں، لیکن چند مسئلے دریافت کرنے سے رہ گئے، امام صاحب نے پاس بلایا اور زیادہ توجہ کے ساتھ ان کی باتیں سنیں، اس میں میزبان کا خیال ہی جاتا رہا، ابو عاصم سے فارغ ہو کر ایک اور طالب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر وہی سلسلہ قائم ہو گیا، تھوڑی دیر بعد خیال آیا تو فرمایا کس شخص نے میزبان کے پاس جانے کا اقرار کیا تھا وہ کہاں گیا ابو عاصم بولے میں نے عرض کیا تھا، فرمایا پھر تم گئے نہیں؟ ابو عاصم نے مناظرانہ شوخی سے کہا، میں نے تو یہ نہیں کہا تھا کہ ابھی جاتا ہوں جب فرصت ہو گی جاؤں گا امام صاحب نے فرمایا: ”احتال على ان مخاطبات الناس لاتقع على هذا!! لذى تريد انما على الفور“ عام بول چال میں ان احتمالات کا موقع نہیں ان لفظوں کے معنی وہی لیے جائیں گے، جو عوام کی غرض ہوتی ہے۔ (یہ بھی ایک فقہی مسئلہ تھا، جس کو امام صاحب نے باتوں باتوں میں حل کر دیا۔) (الجواہر المضیئہ باب الکنیٰ ترجمہ ابو عاصم ص ۴۵۲)

اہم تلامذہ

امام اعظم کے علمی تبحر اور شان اجتہاد سے تقریباً تیس سال تک علم فقہ کے شیدائی فیض یاب ہوتے رہے، جن کا شمار از بس دشوار ہے۔ امام صاحب کی خصوصی تعلیم وتربیت سے ہزاروں فقیہ پیدا ہوئے اور علامہ کردری نے آٹھ سو ایسے تلامذہ کا ذکر کیا ہے، جو فقہا و محدثین کی صف میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ تعداد آپ کے مشاہیر تلامذہ کی ہے، آپ کے تلامذہ میں درجنوں ایسے اصحاب شامل ہیں، جو اجتہاد کے منصب پر فائز تھے۔

آپ کے حلقہ درس میں شریک ہونے والے دس ایسے علما تھے، جو حلقہ کے ہر وقت حاضر باش تھے، ان میں چار حضرات

حافظ قرآن کی طرح فقہ کے حافظ تھے، زفر بن ہذیل، ابو یوسف، اسد بن عمرو، علی بن مسہر۔ ایک قول کے مطابق سفیان ثوری علی بن مسہر کے ذریعہ امام صاحب کے اقوال لیتے تھے اور انہوں نے اپنی کتاب الجامع کی تدوین میں علی بن مسہر سے بحث و مذاکرہ کر کے مدد لی ہے۔

امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا بیان ہے، کہ امام ابو حنیفہ کے خاص شاگرد دس تھے، ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو بجلی، عافیہ اودی، داؤد طائی، قاسم بن معن مسعودی، علی بن مسہر، یحیٰ بن زکریا بن ابی زائدہ، حبان بن علی عنزی، ان کے بھائی مندل۔ ان میں ابو یوسف اور زفر جیسا کوئی نہیں تھا۔ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۲۴۵)

انہیں کا بیان ہے، کہ ایک مرتبہ امام صاحب نے کہا کہ ہمارے تلامذہ چھتیس ہیں، ان میں اٹھائیس عہدہ قضا کے لائق ہیں، چھ فتویٰ کے قابل ہیں اور دو قاضیوں اور مفتیوں کو تعلیم و تربیت دے سکتے ہیں، یہ کہہ کر ابو یوسف اور زفر کی طرف اشارہ کیا۔

ذیل میں چند اہم تلامذہ کے اسمائے گرامی نقل کیے جاتے ہیں۔

قاضی ابو یوسف، محمد بن حسن شیبانی، زفر، حماد بن ابی حنیفہ، حسن بن زیاد، نوح بن ابی مریم، اسد بن عمرو، حکم بن عبد اللہ، مغیرہ بن مقسم، زکریا بن ابی زائدہ، مسعر بن کدام، سفیان ثوری، مالک بن مغول، یونس بن ابی اسحاق، داؤد طائی، حسن بن صالح، ابو بکر بن عیاش، عیسیٰ بن یونس، علی بن مسہر، حفص بن غیاث، جریر بن عبد الحمید، وکیع بن جراح، ابو اسحاق فزاری، یزید بن ہارون، مکی بن ابراہیم، ابو عاصم نبیل، عبد الرزاق، ابو عبد الرحمٰن مقری، ہشیم بن بشیر، علی بن عاصم، عباد بن عوام، جعفر بن عون، ابراہیم بن طہمان، حمزہ بن حبیب، یزید بن زریع، یحیٰ بن یمان، خارجہ بن مصعب، مصعب بن مقدام، ربیعہ بن عبد الرحمٰن، یحیٰ بن نصر، عمرو بن محمد، حوضہ بن خلیفہ، عبید اللہ بن موسیٰ۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۴۹)

سیاسی ہنگامہ آرائی اور امام اعظم کا کردار

زید بن علی رضی اللہ عنہ کا خروج

بنو امیہ کی حکومت عدل وانصاف کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے بجائے قیصر وکسری کی آمریت کو فروغ دے رہی تھی، ذاتی اقتدار کے استحکام کی راہ میں پیش آنے والی ہر رکاوٹ کو وہ بزور شمشیر خس وخاشاک کی طرح بہا دینے کا عزم رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں حجاج کا ظالمانہ کردار کسی سے مخفی نہیں۔ حضرت امام کا شہر کوفہ بھی اموی اقتدار کے شکنجہ میں تھا، اہل حق وصداقت نے جب بھی آواز بلند کی پوری قوت کے ساتھ اسے دبا دیا گیا۔ کوفہ میں ہشام بن عبدالملک کی طرف سے ابن النصرانیہ (١٠٥ھ تا ١٢٠ھ) مسلسل پندرہ سال تک گورنری کے فرائض انجام دیتا رہا۔ بظاہر تو یہ مسلمان تھا، لیکن اسلام کی پاسداری کے بجائے کفر وطغیان کی حمایت میں لگا رہتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا ”**کان الاسلام ذلیلا والحکم کان لاھل الذمۃ**“ اہل اسلام اس زمانہ میں ذلیل تھے اور حکومت اہل ذمہ کے حق میں تھی۔ (الکامل ج٥ ص٨٢)

ابن النصرانیہ کی ذہنیت میں اس کی نصرانی ماں کا کافی دخل تھا، جس کی متابعت میں اس نے نصرانیوں کو کھلی چھوٹ دے دی تھی حتی کہ وہ مسلمانوں سے جبری ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔ اسی ابن النصرانیہ نے کوفہ کی مسجدوں کے میناروں کو منہدم کرنے کا حکم دیا تھا، وہ کہتا تھا، کہ ان میناروں سے موذن لوگوں کی بہو بیٹیوں کو دیکھتے ہیں۔ دوسری جانب اس نے اپنی نصرانی ماں کے لیے کوفہ میں بہت بڑا گرجا گھر تعمیر کر دیا تھا۔ فرزدق نے اسی پر یہ شعر کہا تھا

بنی فیھا النصاریٰ لامہ   ویھدم من کفر منار المساجد

اپنی ماں کے لیے تو کوفہ میں اس نے گرجا گھر بنایا اور اپنے کفر کی وجہ سے مسجدوں کے میناروں کو ڈھا رہا ہے۔

(کامل ج٥ ص١٠٣)

اس طرز عمل کے باوجود چونکہ وہ اموی اقتدار کی بنیادوں کو مستحکم کر رہا تھا، اس لیے دارالخلافہ دمشق سے اس کے خلاف کوئی تادیبی فرمان جاری نہ ہوتا تھا اور وہ کوفہ ہی نہیں پورے عراق کو اپنی میراث تصور کرنے لگا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر الزام لگاتا تھا، کہ میری قوم بجیلہ سے عراق کو جبراً چھین کر مسلمانوں کے حوالے کر دیا، اسی لیے وہ کہتا تھا ”**انی مظلوم ماتحت قدمی شبر الا وھو لی**“ میں مظلوم ہوں، میرے پاؤں کے نیچے کا کوئی حصہ بھی ایسا نہیں ہے، جو میرا نہیں ہے۔

(کامل ج٥ ص٨٠)

عام مسلمان تو اس کے ظلم وتشدد سے تنگ آچکے تھے، لیکن اس کے حاشیہ نشین بڑی فراغت اور عیش کی زندگی بسر کیا کرتے تھے، خود بھی اس نے بے تحاشا دولت اکٹھا کرلی تھی، جس کی بنیاد پر خلیفہ کی گرفت میں آگیا، اس نے یمن کے گورنر یوسف بن عمر کو کوفہ کی ولایت سونپی اور حکم دیا کہ ابن النصرانیہ سے سختی کے ساتھ سرکاری خزانے کی پچاس کروڑ رقم کے بارے میں چھان بین کی جائے کہ وہ کیا ہوئی اور اس سلسلے میں پوری سختی سے کام لیا جائے ایک دن خالد بے ابن النصرانیہ نے کہا: جس رقم کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو اس کا بڑا حصہ میں نے مدینہ میں تین آدمیوں کے پاس محفوظ کردیا، جن میں حضرت امام زین العابدین کے صاحبزادے زید بھی ہیں۔ یوسف نے یہ اطلاع ہشام کو دی۔ خلیفہ ہشام نے تینوں آدمیوں کو کوفہ طلب کیا۔ جب یہ لوگ کوفہ پہنچے، تو یوسف نے خالد کے سامنے ان لوگوں سے پوچھ تاچھ شروع کی۔ خالد کو دیکھ کر حضرت زید بن علی نے فرمایا، کہ بھلا یہ ہمارے پاس مال کیوں جمع کرانے لگا۔ صبح وشام برسر منبر میرے جد امجد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو گالیاں سناتا ہے، اس کے بعد یوسف نے ابن النصرانیہ سے پوچھا کہ تم نے یہ بات کیوں کہی، اس نے جواب دیا ''**شدد علی العذاب فادعیت ذلك واملت ان یاتی اللہ یفرج قبل قدومکم**' 'مجھ پر تشدد حد سے بڑھا، تو میں نے مہلت کے لیے یہ دعویٰ کردیا کہ آپ لوگوں کے پاس مال میں نے جمع کرایا ہے، میری غرض یہ تھی، کہ شاید خدا اسی کو میری مصیبت کے ازالے کا سبب بنادے۔

(کامل ج۵ ص۸۴)

اموی دور اقتدار میں بنو ہاشم بالخصوص آل فاطمہ پر ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑے گئے اس سے ہر مسلمان بخوبی واقف ہے۔ اہل بیت کو اس شدت کے ساتھ کچل دیا گیا، کہ واقعہ حرہ جو شہادت امام حسین کے ردعمل ہی میں وقوع پذیر ہوا، امام زین العابدین یا اہل بیت میں سے کسی نے اس میں شرکت نہیں کی۔ چنانچہ امام زین العابدین فرماتے ہیں: ''**ماخرج فیھا احد من آل ابی طالب ولاخرج فیھا من بنی عبدالمطلب لزموا بیوتھم**'' ابوطالب کے خاندان میں سے کوئی بھی آدمی نہ اس ہنگامے میں شریک ہونے کے لیے نکلا اور نہ ہی عبدالمطلب کے گھرانے والے نکلے سب کے سب اپنے گھروں میں پڑے رہے۔ (کامل ج۵ ص۹۶)

اہل بیت نبوت نے واقعہ کربلا کے بعد خود کو سیاسی ہنگاموں سے دور کرلیا تھا، امام زین العابدین نے پوری عمر گوشہ عبادت میں گزاری اور ہر سیاسی ہنگامے اور شورش سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا اور دوسروں کو بھی اس سے الگ رہنے کی تاکید فرمائی۔ خراسان کے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں آئے اور اپنے اوپر بنی امیہ کے مظالم کی داستان بیان کی۔ ابن سعد کا بیان ہے:

> **ان علی بن حسین کان ینھی عن القتال فان قوما من اھل خراسان لقوہ فشکوا الیہ مایلقون من ظلم ولاتھم فاہ ھم بالصبر والکف وقال انی اقول لکم کماقال عیسی بن مریم علیہ السلام ان تعذبھم فانھم عبادك وان تغفر لھم فانك انت العزیز الحکیم ۔**

علی بن حسین لوگوں کو جنگ وجدل سے منع کیا کرتے تھے، خراسان سے کچھ لوگ آپ سے آ کر ملے اور جن مظالم میں گرفتار تھے، ان کا شکوہ حضرت سے کیا، آپ نے ان کو صبر کی تلقین کی اور لڑائی جھگڑے سے بچے رہنے کی تاکید کی اور فرمایا کہ ان ظالموں کے متعلق میں یہی کہتا ہوں، جو عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا، اگر تو انہیں سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو غالب حکمت والا ہے۔ (ایضاً ج۵ ص۱۶۰)

امام زین العابدین واقعہ کربلا کے بعد دنیا سے بے نیاز ہو کر عبادت وریاضت میں اس درجہ منہمک رہتے تھے کہ انہیں بڑے سے بڑے حادثے کی خبر نہ ہوتی تھی اور آپ ہر ہنگامے اور شورش سے دور رہتے۔

زید بن علی انہیں کے صاحبزادے تھے، زید بن علی نہایت خوبرو، دراز قامت پر کشش شخصیت کے مالک تھے، علم وتقویٰ میں اپنے اسلاف کی یادگار تھے، شیعوں کا فرقہ زیدیہ آپ ہی کی طرف منسوب ہے۔ غیر معمولی ذہانت وفطانت اور علم وفضل کے ساتھ ان کے اندر موروثی شجاعت بھی تھی، امام اعظم کا ارشاد ہے:

شاهدت زيد بن علي كما شاهدت اهله فما رايت في زمانه افقه منه ولا اعلم ولا اسرع جوابا ولا ابين قولا ۔(الروض الكبير ص ۵۰)

میں نے زید بن علی کو دیکھا تھا جیسے ان کے خاندان کے دوسرے حضرات کے مشاہدے کا موقع ملا ہے، میں نے ان کے زمانے میں ان سے زیادہ فقیہ آدمی کسی اور کو نہیں پایا اور ان جیسا حاضر جواب اور واضح صاف گفتگو کرنے والا آدمی اس عہد میں مجھے کوئی نہیں ملا۔

زید کے بھتیجے امام جعفر صادق نے آپ کی شہادت کے بعد فرمایا: واللہ میرے چچا ہم لوگوں میں سب سے زیادہ قرآن کے پڑھنے، والے سب سے زیادہ اللہ کے دین کی سمجھ رکھنے والے اور رشتہ کا خیال کرنے والے تھے، خدا کی قسم دنیا اور آخرت دونوں کے متعلقہ مسائل کے لیے انہوں نے ہمارے خاندان میں اپنے جیسا آدمی نہیں چھوڑا۔ (حوالہ بالا)

پوچھ تاچھ کے بعد زید بن علی کو کوفہ ہی میں روک لیا گیا واقعہ کربلا کے بعد کسی بھی ہاشمی کا داخلہ کوفہ میں ممنوع تھا۔ کوفہ والے اہل بیت کے معتقد اور ان کی سیاسی قیادت کے قائل تھے، امام حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے زید بن علی کو پا کر بے حد خوش ہوئے چونکہ وہ پہلے ہی سے امویوں کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے، اس لیے حکومت کے خلاف ان کی دبی ہوئی آگ پھر بھڑک اٹھی اور انہوں نے انقلاب حکومت کے ارادے سے زید بن علی کو اپنا قائد بنا لیا اور اس بات کا یقین دلایا کہ کوفہ کے ایک لاکھ باشندے آپ کے ساتھ ہیں اور چار ہزار لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر امویوں سے لڑنے مرنے کی بیعت کی۔ خروج کی تیاریاں اندر ہی اندر ہو رہی تھیں کہ اموی گورنر کو علم ہو گیا، حضرت زید نے ۱۲۲ھ میں خروج کے منصوبے کی تکمیل سے پہلے ہی خروج کر دیا، جب تصادم کا موقع آیا تو کوفہ کے شیعان علی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ جنگ کے وقت صرف ۲۱۸ آدمی آپ کے ساتھ تھے۔ دوران جنگ ایک تیر سے گھائل ہوئے اور ان کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح زید بن علی کی تحریک ناکام ہو گئی، لیکن

انہوں نے امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنے دادا کی طرح جام شہادت نوش فرمایا اور اہل حق کے سینوں میں انقلاب حکومت کی چنگاریاں چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے، کہ جب آپ کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا، تو فرمایا ''شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اپنے دین کو حد کمال تک پہنچانے کا اس وقت موقع عطا فرمایا، جبکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت شرمندہ تھا، کہ میں نے ان کی امت کو معروف کا حکم کیوں نہیں دیا اور منکر سے کیوں نہیں روکا۔

(مقدمہ الروض الکبیر ص ۷۳)

ابوعوانہ سفیان ثوری کے بارے میں نقل کرتے ہیں: ''**اذا ذكر زيد بن علي يقول بذل مهجته لربه وقام بالحق لخالقه ولحق بالشهداء مرزوقين بآبائه** '' جب سفیان ثوری حضرت زید بن علی کا ذکر کرتے تو کہتے اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کر دی اور اپنے خالق کی مرضی کی پابندی میں حق کو لے کر کھڑے ہوئے اور اپنے ان گزشتہ آبا و اجداد میں شریک ہو گئے، جنہیں خدا نے شہادت کی توفیق عطا فرمائی تھی۔ (ایضاً ص ۵۵)

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے، کہ حضرت زید بن علی کے ساتھ کوفہ کے عوام ہی نہیں بلکہ خواص اور علما کا بڑا طبقہ بھی تھا۔

امام اعظم کا رویہ

امام اعظم ابوحنیفہ بھی انہیں لوگوں میں تھے، جو زید بن علی کے طرفدار تھے لیکن کھل کر میدان میں نہیں آئے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کوفہ والوں کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ اور زید بن علی کے گرد ایسے لوگوں کا حلقہ تھا، جو مشکل وقت میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے تھے۔ مضبوط اموی حکومت کے انقلاب کی جدوجہد کے لیے جس عسکری تنظیم اور قوت کی ضرورت تھی، وہ زید بن علی کے پاس نہیں تھی، اس لیے امام صاحب کھل کر میدان میں نہیں آئے۔ حضرت زید نے خود امام صاحب کے پاس فضیل بن زبیر کو تحریک میں عملاً شرکت کی دعوت کے لیے بھیجا۔ فضیل کا بیان ہے، امام ابوحنیفہ نے سب سے پہلا سوال یہ کیا، کہ فقہا میں سے کن کن لوگوں کی آمد و رفت زید کے پاس ہے؟ فضیل نے نام شمار کرائے پھر امام نے ارشاد فرمایا:

(۱) **خروجه يظاهر خروج رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم بدر ۔**

حضرت زید کا خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدر میں تشریف آوری کے مشابہ ہے۔ (ایضاً ص ۲۶)

(۲) **لو علمت ان الناس يخذلونه ويقومون قياما معه صدق لكنت اتبعه واجاهد معه من خالفه ۔**

اگر میں جانتا کہ لوگ آپ کو وقت پر چھوڑ نہ دیں گے اور واقعی راست بازی اور سچے عزم کے ساتھ ان کی رفاقت میں کھڑے ہوں گے، تو میں ضرور ان کی پیروی کرتا اور ان کے مخالفوں سے جہاد کرتا۔ (ایضاً ص ۲۶۰)

امام ابوحنیفہ شیعان علی کے کردار سے واقف تھے، ماضی کے تلخ تجربات ان کے سامنے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ تحریک جو ابھی نشوونما کے ابتدائی مراحل میں ہے، اس میں صالح مخلص لوگوں کی کمی ہے اور یہ تحریک دوسرے اسلامی بلاد و امصار

میں نہیں، جہاں سے وقت ضرورت مدد حاصل ہو سکے، اس لیے تحریک کی ناکامی کا انہیں یقین تھا، اس بنا پر شرکت سے معذرت خواہ ہوئے، لیکن زید بن علی کا حق پر ہونا، ان کے نزدیک مسلم تھا۔ چنانچہ عملاً شرکت سے الگ رہے، لیکن مالی تعاون پیش فرمایا اور یہ پیش کش غالباً دس ہزار روپیوں کی تھی۔ اس وقت امام صاحب نے فرمایا تھا:

استعن به علي حرمك وما انت فيه واعن به ضعفاء اصحابك ۔

اپنے گھر کے لوگوں کی خبر گیری میں اس سے کام لیجیے اور آپ کے رفقا میں جو ضعیف لوگ ہیں، ان کی اس سے امداد فرمائیے۔ (موفق ج ۲ ص ۸۳)

ایک دوسری روایت میں ہے:

كان ابو حنيفة يفتي سرا لوجوب نصرة زيد وحمل المال اليه ۔

امام ابوحنیفہ پوشیدہ طور پر حضرت زید کی امداد کے فرض ہونے کا فتویٰ دیتے تھے اور ان کے پاس پوشیدہ طور پر مالی امداد بھی بھیجتے تھے۔ (مقدمۃ الروض ص ۴۶)

امام اعظم حضرت زید بن علی کی اس تحریک کے موید، مالی معاون اور در پردہ لوگوں کو تحریک سے وابستہ ہونے کی دعوت دیا کرتے تھے، جس کا واضح مطلب یہی تھا، کہ آپ حضرت زید کے خروج کو حق تسلیم کرتے تھے، لیکن ان کے رفقا کی پر خلوص رفاقت مشتبہ تھی اور ایسی صورت میں ناکامی یقینی تھی، اس لیے امام نے بنفس نفیس شرکت نہیں کی۔ کیوں کہ شریک ہو کر اپنی جان کو مفت ضائع کرنا امام کے خیال میں بے سود تھا۔ ائمہ جور کے مقابلے میں نبرد آزما ہونا اسی صورت میں ان کے نزدیک ضروری تھا، جب کہ عسکری تنظیم مکمل اور رفقا صالح اور غیر مشتبہ ہوں، تاکہ وقت کی طاغوتی قوت سے ٹکرا کر اسے پاش پاش کر دیا جائے اور انقلاب حکومت کی کوشش بار آور ہو۔

امام اعظم اور خوارج

آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد بن مروان ۱۲۷ھ تا ۱۳۲ھ جب دمشق کے تخت پر بیٹھا، تو اموی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ ہر طرف بدنظمی اور شورش کا دور دورہ تھا۔ گرتی ہوئی حکومت کو سنبھالنے کی مروان کے اندر صلاحیت نہ تھی، اس کی پے در پے سیاسی حماقتوں کی بنا پر حکومت کی ساکھ گرتی چلی گئی۔ دوسری شورشوں کے ساتھ خارجیوں نے کوفہ میں بھی سر ابھارا۔ کوفہ میں وہاں کی امارت کو لے کر عبداللہ بن عمر اور نصر بن سعید میں سخت سیاسی کش مکش پیدا ہو چکی تھی، ضرب و حرب کی نوبت تھی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر خارجیوں کا ایک سردار ضحاک بن قیس شیبانی اٹھ کھڑا ہوا وقتی طور پر نصر اور عبداللہ نے صلح کر لی۔ عبداللہ، ضحاک کے مقابلے میں آیا لیکن اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس طرح کوفہ پر خارجیوں کا قبضہ ہو گیا، تو انہوں نے برملا اپنے عقائد کا اعلان اور تبلیغ شروع کر دی، چونکہ وہ مرتکب کبیرہ کو کافر اور واجب القتل قرار دیتے تھے، انہیں جب بھی موقع ملتا مسلمانوں کے قتل و غارت گری سے باز نہیں رہتے۔ خارجیوں کے سردار نے امام اعظم کو بھی اپنے پاس طلب کیا، جب امام صاحب خارجیوں کے قائد کے

پاس آئے، تو لوگوں نے بتایا، کہ یہ کوفہ کے مسلمانوں کا پیشوا ہے۔ خارجی سردار متوجہ ہوا اور آپ سے کہا: ”تب یاشیخ من الکفر“ ”اے شیخ کفر سے توبہ کیجیے! جواب میں امام صاحب نے فرمایا: ”انا تائب من کل کفر“ میں ہر کفر سے توبہ کرتا ہوں۔

یہ سن کر خارجیوں نے امام کو چھوڑ دیا۔ لیکن کسی کو شرارت سوجھی اس نے خارجیوں کو باور کرایا، کہ کفر سے مراد ان کے نزدیک تم لوگوں کے عقائد ہیں، انہوں نے تمہارے عقائد سے توبہ کی ہے۔ خارجی گنوار تو تھے ہی، پھر امام کو واپس بلایا اور پوچھا: شیخ ہم نے سنا ہے کہ جس کفر سے تم نے توبہ کی ہے، اس سے مراد ہمارے عقائد اور ہمارا طریقہ کار ہے۔

خارجیوں نے اپنا اصول یہ مقرر کیا تھا، کہ ہر چیز سے الگ ہو کر صرف قرآن کے سامنے جھکنا چاہیے، وہی حکم اور فیصل ہے حضرت امام نے دیکھا کہ ان جاہلوں سے خلاصی کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں، کہ قرآن ہی سے ان کے اوپر الزام قائم کیا جائے۔ آپ نے فرمایا: ”یہ جو تم کہہ رہے ہو، کیا یہ صرف ظن اور گمان کے سوا اور بھی کچھ ہے، کیا آپ لوگوں کو یقین ہے، کہ کفر سے مراد میں نے وہی لیا ہے، جسے تم میری طرف منسوب کرتے ہو“۔ ان کے لیڈر نے کہا، کہ ”ہاں صرف گمان اور ظن ہے، یقین سے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے“۔

تب امام صاحب نے قرآن کی آیت ”ان بعض الظن اثم“ تلاوت کر کے فرمایا، کہ بدگمانی کر کے تم نے گناہ کا ارتکاب کیا اور گناہ کے متعلق تم لوگوں کا خیال ہے، کہ وہ کفر ہے، جو آدمی کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ یہ تقریر کر کے امام نے زور دے کر خارجیوں کے لیڈر سے کہا، کہ جناب پہلے آپ اس کفر سے توبہ کیجیے۔ یہ سن کر خارجی لیڈر بولا، کہ ہاں تم نے سچ کہا اور میں اس کفر سے توبہ کرتا ہوں، لیکن ابوحنیفہ تم بھی کفر سے توبہ کرو۔ امام نے اس کے جواب میں پھر اپنے جملے کو دہرایا کہ میں ہر قسم کے کفر سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔ کہتے ہیں، کہ یہ سن کر خارجیوں نے امام صاحب کو چھوڑ دیا۔

(موفق ج ا ص ۱۷۷)

خارجیوں نے فتح کے بعد عام باشندوں کے قتل عام کا بھی منصوبہ بنایا، ان کے نزدیک خارجیوں کے علاوہ تمام لوگ کافر اور مباح الدم تھے۔ خارجیوں کے سردار نے مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دیا اور برہنہ تلوار لے کر جامع مسجد میں بیٹھ گیا اور اعلان کرنے لگا کہ کوفہ والوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کی عورتوں اور بال بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔

امام اعظم کی زندگی کا یہ بڑا نازک وقت تھا۔ قتل عام کے اس اعلان کے بعد کسی میں ہمت نہ تھی، کہ وہ ظالم خارجیوں کے پاس جا کر کچھ کہہ سکے۔ ایسے نازک وقت میں امام صاحب اپنی جان پر کھیل کر خارجیوں کے پاس تشریف لے گئے۔ خارجیوں کے سردار ضحاک سے کہا میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس نے اجازت دی۔ امام نے ضحاک سے پوچھا، کہ مردوں کے قتل اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی اور غلام بنا لینے کو حلال کس بنیاد پر قرار دیا گیا ہے؟ ضحاک نے کہا، یہ لوگ مرتد ہیں۔ امام نے فرمایا: مرتد ہونے کا کیا مطلب؟ کیا پہلے یہ لوگ کسی اور دین پر تھے جسے ترک کر کے کوئی نیا دین قبول کیا ہے؟ یا جس دین پر پہلے سے چلے آ رہے ہیں وہی دین اس وقت بھی ان کا ہے؟ ضحاک امام کے ان الفاظ کو سن کر بولا: ”اعد علی بہ“ تم نے جو بات کہی،

اسے پھر سے دہراؤ۔ امام نے بات دہرادی۔ ضحاک نے کہا ''اخطانا'' ہم سے غلطی ہوگئی۔ یہ کہتے ہوئے اپنی تلوار میان میں کرلی۔ دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔ امام صاحب کی اس مومنانہ جرأت اور حق گوئی نے کوفہ کے مسلمانوں کو تہہ تیغ ہونے، عورتوں اور بچوں کو باندی اور غلام بننے سے بچالیا۔ یہ اہل کوفہ پر امام صاحب کا عظیم احسان تھا۔ اسی لیے ابو معاذ بلخی کہا کرتے تھے:

اهل الكوفة كلهم موالي ابي حنيفة لانه سبب عتقهم .

سارے کوفہ والے امام ابوحنیفہ کے آزاد کردہ غلام ہیں، کیوں کہ وہی ان کی آزادی کا سبب بنے۔

(موفق ج۱ ص۱۷۴)

ابن ہبیرہ اور امام اعظم

۱۲۹ھ میں ابن ہبیرہ کو عراق وعجم دونوں ملکوں کا والی مقرر کیا گیا۔ عہد بنی امیہ میں یزید بن معاویہ نے عبید اللہ بن زیاد کو ۶۰ھ میں عراق وعجم کا والی مقرر کیا تھا اور اس نے کوفہ میں بیٹھ کر امام حسین رضی اللہ عنہ کے متبعین کی قوت کو منتشر کرنے کے بعد قافلہ اہل بیت کو کربلا کے میدان میں تہہ تیغ کراڈالا تھا۔ ابن زیاد کے بہت بعد جب اموی اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور ایوان حکومت کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں، تو سیاسی مصلحت کے پیش نظر ابن ہبیرہ کو عراقین کا والی مقرر کیا گیا، جو حکمت ودانائی اور تدبیر وسیاست میں کامل تھا۔ ان اعیان امت کو جو اموی امراو خلفا کے مظالم سے سخت متنفر ہوگئے تھے، ان کو حکومت کے قریب لانے اور ان کے دل سے امویوں کی نفرت نکالنے کا کام ابن ہبیرہ کو سونپا گیا۔ چنانچہ ابن ہبیرہ نے نازک ترین حالات میں ملکی پالیسی میں خوشگوار تبدیلی لانے کا عزم کیا اور اس کام کے لیے اس نے علما ومشائخ، محدثین وفقہا کو قریب لاکر معاملات حکومت میں دخیل بنانا چاہا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کو بھی نرمی وملاطفت سے قریب لانے کی کوشش کی اور وہ دینی اور ملکی معاملات میں مشوروں کے لیے آپ کو طلب کرنے لگا۔ آپ کی سفارشات کو قبول کرتا اور امام صاحب کی لیاقت اور برتری کا اعتراف کرنے لگا۔

چنانچہ ایک بار ابن ہبیرہ ایک ملزم کو قتل کی دھمکیاں دے رہا تھا، قریب تھا، کہ اس بے چارے کو جلاد کے سپرد کردے، اچانک امام اعظم ابوحنیفہ ابن ہبیرہ کے دربار میں داخل ہوئے، غریب ملزم کی نظر جوں ہی امام ابوحنیفہ پر پڑی، بدحواسی میں یا جان بوجھ کر اس نے ابن ہبیرہ سے کہا، کہ آپ کو میرے متعلق اگر شبہات ہیں، تو یہ صاحب جو آپ کے پاس ابھی آئے ہیں، ان سے میرا حال دریافت کرسکتے ہیں (اور واقعہ یہ تھا، کہ امام صاحب نے اس کو نہ کبھی دیکھا تھا اور دا اس کے حال سے واقف تھے) لیکن یہ محسوس کرکے اس بے چارے نے مجھ سے گویا امداد چاہی ہے، اس مظلوم کو بچانے کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہیے، فوراً ایک تدبیر ذہن میں آئی، جب امام کی طرف مخاطب ہوکر ابن ہبیرہ نے پوچھا، کہ آپ کیا اس شخص کو پہچانتے ہیں؟ جھوٹ تو بول نہیں سکتے تھے، اس لیے آپ نے ملزم کی طرف خطاب کرکے پوچھا کہ ''تم وہی آدمی ہو جو اذان دیتے ہوئے لا الہ الا اللہ

کے کلمہ کو خاص طور پر کھینچا کرتے ہو؟ اس نے بھی کہہ دیا جی ہاں! امام نے فرمایا کہ اچھا اذان دو اس بے چارے نے اذان دی۔ اذان جب ختم ہوئی تو امام صاحب نے فرمایا یہ تو اچھا آدمی ہے، مجھے اس کے اندر کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی۔ امام صاحب کے اس قول پر ابن ہبیرہ نے ملزم کو رہا کر دیا۔

نگینہ

ایک دن ابن ہبیرہ نے حضرت امام کو طلب فرمایا۔ آپ پہنچے تو دیکھا کہ سامنے ایک نگینہ رکھا ہوا ہے اور ابن ہبیرہ گہری سوچ میں بیٹھا ہوا ہے، دریافت فرمایا آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ اس نے کہا یہ نگینہ مجھے پسند آ گیا ہے۔ اسے استعمال کرنا چاہتا ہوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پر دوسرے کا نام کندہ ہے امام صاحب نے نگینہ مانگا غور سے دیکھا لکھا ہوا تھا ''عطاء بن عبداللہ'' آپ نے ابن ہبیرہ سے اجازت لی اور نگینہ ایک شخص کے حوالے کرتے ہوئے کہا تم اسے نقاش کے پاس لے جاؤ اس تحریر میں صرف اتنی ترمیم کرا دو کہ ''بن'' کو ''من'' اور ''عبداللہ'' کے ''با'' کے نقطے کو مٹا کر اس کے اندر نون کا نقطہ کر دے۔ وہ شخص عبارت میں مختصر سی ترمیم کرا کر لایا۔ امام صاحب نے نگینہ ابن ہبیرہ کو دیتے ہوئے فرمایا، اب اسے بلا تامل استعمال کیجیے۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کیا ہوا؟ فرمایا، اسے پڑھیے نگینہ کو دیکھا تو اس میں ''عطاء بن عبداللہ'' کے بجائے ''عطاء من عنداللہ'' مرقوم تھا۔ امام اعظم کی سرعت فہم پر ابن ہبیرہ مسرور ہوا فوراً ہی نگینہ سنار کے یہاں بھیج کر اسے انگوٹھی میں جڑوا دیا۔

ابن ہبیرہ نے موقع غنیمت جانا اور جب امام صاحب اٹھنے لگے، تو عرض کیا:

ایها الشیخ لو اکثرت غشیاننا وزیارتنا لافدتنا و نفعتنا ۔

اے شیخ! اگر آپ اپنی آمد و رفت کو ہمارے یہاں ذرا بڑھا دیں، تو آپ سے ہم فائدہ اٹھائیں اور ہمیں آپ سے نفع پہنچے۔

بنی امیہ کی سلطنت قاہرہ کا با اختیار گورنر بڑی لجاجت سے یہ درخواست کر رہا تھا، امام صاحب اس کے بلانے پر دینی ضرورت و مصلحت کے پیش نظر کبھی کبھی اس کے پاس آیا جایا کرتے تھے، اب وہ اس آمد و رفت کو دوستی میں بدلنا چاہتا ہے اور آپ کی ذہانت وطباعی سے سلطنت بنی امیہ کی گرتی ہوئی ساکھ کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ امام صاحب نے بڑی متانت و بے نیازی سے جواب دیا: ''**ما اصنع عندك ان قربتنی فتنتنی وان اقصیتنی اخزیتنی** '' تمہارے پاس آ کر میں کیا کروں گا؟ اگر مجھے تم نزدیکی اور قرب عطا کرو گے تو فتنہ میں مبتلا کرو گے اور اگر مجھ کو تم نے دور کر دیا (قرب عطا کرنے کے بعد) تو خواہ مخواہ مجھے رسوا کرو گے۔

امام صاحب نے ارباب اقتدار سے دوری بنائے رکھا اور قرب کی صورت میں جو غم واندوہ پہنچتا ہے اس کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا چنانچہ انہوں نے بے جھجک بیان کیا ''**ولیس عندك ما ارجوه ولا عندی ما اخافك علیه**' 'تمہارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں، جس کی مجھے آرزو ہو اور نہ میرے پاس کوئی ایسی چیز ہے، جس کی وجہ سے میں تم سے ڈروں۔ ابن ہبیرہ

امام صاحب کے جواب سے خاموش ہوگیا، لیکن ان کے طرزِ عمل کی کسک اپنے دل میں محسوس کرتا رہا۔

۱۲۹ھ میں ابومحمد مسلم خراسانی نے عباسی تحریک کی جڑیں خراسان میں دور تک پھیلا دی تھیں۔ وہاں کے باشندے پوری مضبوطی کے ساتھ اموی اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی مہم میں مصروف تھے۔ ادھر والی خراسان نصر بن سیار عباسی تحریک دبانے کے لیے ابن ہبیرہ سے امداد کا بار بار مطالبہ کرتا رہا۔ بار بار کے مطالبے پر اس نے نباتہ بن حنظلہ کو پندرہ ہزار کا لشکر دے کر روانہ کیا۔ جرجان کے مقام پر اس فوج کا مقابلہ عباسی کمانڈر حسن بن قحطبہ سے ہوا۔ اس معرکے میں ابن ہبیرہ کی فوج کو شکست فاش ہوئی اور اس کے دس ہزار سپاہی قتل کردیے گئے۔ اس ذلت کے ازالے کے لیے ابن ہبیرہ نے بڑے پیمانے پر عباسیوں کے خلاف فوج جمع کرنے کا عزم کیا اور اس نے نصر بن سیار کو لکھا کہ جلد ہی تمہاری امداد کے لیے ایک لاکھ کا لشکر جرار روانہ کیا جائے گا۔ اسی زمانے میں ابن ہبیرہ نے فوج تشکیل دینے کے لیے کوفہ میں اپنی مہم تیز کردی۔ اور وہ زیادہ سے زیادہ عراقیوں کو فوج میں بھرتی کرنا چاہتا تھا۔ اس صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے ابن ہبیرہ عراق کے اکابر علما و مشائخ کو حکومت کے اہم عہدے دے کر عوام میں اموی اقتدار کا اعتماد بحال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت سے علما کو عہدے تفویض کیے۔ صاحب معجم کا بیان ہے:

ان ابن هبيرة كان واليا بالعراق من بنى امية الفتنة بالعراق وجمع فقهاء العراق فولّى كلامنهم شيئا من عمله .(ج ۲ ص ۱۷۷)

بنی امیہ کی طرف سے عراق کا والی (گورنر) ابن ہبیرہ تھا۔ عراق میں جب فتنوں نے سر اٹھایا، تو اس نے عراق کے فقہا کو اکٹھا کیا اور اپنی حکومت کے مختلف شعبوں میں سے ایک ایک شعبہ ہر ایک کے حوالہ کیا۔

ابن ہبیرہ نے عاصم بن ربیع کے ذریعہ امام صاحب کے سامنے حکومت کا ایک نہایت اہم اور کلیدی عہدہ پیش کیا اور کہا

يكون على خاتمه ولاينفذ كتاب ولايخرج شئ من بيت المال الا من تحت يده .

(معجم ج۲ص ۱۷۷)

(گورنر کی) مہر ان کے سپرد کی جائے گی تاکہ جو کوئی حکم نافذ ہو اور کوئی تحریر جو حکومت کی طرف سے صادر ہو اور خزانہ سے جو مال برآمد ہو، وہ امام ابوحنیفہ ہی کی نگرانی میں ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ آپ کو وزارت مال اور تمام شاہی دستاویزات کے صادر کرنے کا اختیار دینا چاہتا تھا۔ ابن ہبیرہ نے جن لوگوں کو طلب کیا تھا، ان میں عالم اسلام کی یہ مقتدر ہستیاں بھی تھیں، قاضی ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ، داؤد بن ابی ہند وغیرہ جنھوں نے مصلحتاً سرکاری عہدے قبول کر لیے، مگر امام اعظم نے اس عظیم عہدے کو ٹھکرا دیا، جن علما نے طوعاً و کرہاً عہدے قبول کیے تھے۔ امام صاحب کے پاس آکر کہنے لگے:

انا ننشدك الله ان تهلك نفسك فانا اخوانك وكلنا كاره لهٰذا الامر ولم نجد بدا من

ذلك .(موفق ج ۲ ص ۲۴)

ہم لوگ خدا کی تمہیں قسم دیتے ہیں کہ اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالو، ہم لوگ آخر تمہارے بھائی ہیں اور حکومت کے اس تعلق کو ہم میں ہر ایک ناپسند ہی کرتا ہے، لیکن اس وقت قبول کر لینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، پس چاہیے کہ آپ بھی انکار پر مصر نہ رہیں۔

امام صاحب نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''یہ ملازمت تو خیر بڑی بات ہے، اگر یہ شخص (ابن ہبیرہ) مجھ سے چاہے، کہ شہر واسط کی مسجد کے دروازے گنا کروں، تو میں یہ بھی نہیں کروں گا''۔

آخر میں امام صاحب نے فرمایا:

فكيف وهو يريد مني ان يكتب بضرب عنق رجل واختم على ذالك .

پھر سوچنا چاہیے کہ میں اس کی پیش کردہ اس خدمت کو کیسے قبول کر سکتا ہوں، جس میں وہ کسی کی گردن مارنے کا حکم دے گا اور میں اس حکم پر مہر لگاؤں گا۔

بار بار اس جملے کو دہراتے: ''**فوالله لاادخل في ذالك ابدا**'' خدا کی قسم اس میں اپنے آپ کو کبھی شریک نہیں کر سکتا۔

اس انکار کے بعد ابن ہبیرہ کو غصہ آیا اس نے امام صاحب کو قید میں ڈال دیا اور کچھ دنوں تک دونوں کے درمیان منصب کی قبولیت کی بابت گفتگو ہوتی رہی، جب امام صاحب نے قضا کے عہدے کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو ابن ہبیرہ نے قسم کھا کر کہا: ''**ان لم يفعل لضربته بالسياط على راسه**'' اگر اس خدمت کو بھی اس نے قبول نہیں کیا تو میں اس کے سر پر کوڑے مار کر رہوں گا۔ (موفق ج۱ص۱۷۴)

امام صاحب نے یہ بات سن کر بڑی طمانیت کے ساتھ فرمایا: ''**ضربه لي في الدنيا اسهل علي من مقامع الحديد في الآخرة**'' دنیا میں اس کی مار کو آخرت کے آہنی گرزوں کی مار کی بہ نسبت آسان خیال کرتا ہوں۔ پھر فرمایا: ''**والله لافعلت ولوقتلني**'' بخدا میں ہرگز قبول نہیں کروں گا، اگرچہ ابن ہبیرہ مجھے قتل ہی کیوں نہ کر دے۔

جب امام صاحب کے اس حتمی فیصلے کی خبر ابن ہبیرہ کو دی گئی، تو اس نے غضب ناک ہو کر کہا: ''**بلغ من قدره ان يعارض يميني بيمينه**'' اب ابوحنیفہ کا مرتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ میری قسم کا مقابلہ وہ اپنی قسم سے کرتا ہے۔ اس نے امام صاحب کو قید خانہ سے بلوایا، جب اس کے روبرو پہنچے، وہ قسم کھا کر کہہ رہا تھا: ''**ان لم يقبل ليضربن على راسه حتى يموت**'' اگر اس نے حکومت کی خدمت قبول نہ کی، تو اس کے سر پر اس وقت تک کوڑے لگائے جائیں گے، جب تک کہ اس کا دم نہ نکل جائے۔

امام اعظم کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی اور وہ عزیمت واستقامت کی چٹان بن کر آنے والے مصائب کے لیے آمادہ ہو گئے، اور فرمایا: ''**انما هي ميتة واحدة**'' موت تو صرف ایک ہی ہے۔

ابن ہبیرہ اس حق گوئی پر آتش زیر پا ہو گیا، تازیانہ برداروں کو حکم دیا کہ اس شخص کے سر پر مسلسل بیس کوڑے مارے

جائیں۔ سر پر کوڑے برسنے لگے، چند کوڑوں کے بعد امام صاحب نے ارشاد فرمایا:

”اس وقت کو یاد کر، جب تو اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور آج تیرے سامنے میں جتنا ذلیل کیا جا رہا ہوں، اس سے کہیں زیادہ ذلت کے ساتھ تو خدا کے دربار میں پیش کیا جائے گا، اس وقت تجھ سے میرے بارے میں سوال کیا جائے گا، اس وقت سچی بات کے سوا تیرا جواب سنا نہ جائے گا“۔

آخری فقرہ سن کر ابن ہبیرہ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا، اس نے جلادوں کو اشارہ کیا ”بس“ کوڑوں کی ضرب روک دی گئی۔ امام صاحب کو قید خانے میں بھیج دیا گیا، ابن ہبیرہ نے مصاحبین سے کہا: ”کیا کوئی ایسا آدمی نہیں ہے، جو اس قیدی کو یہ سمجھائے کہ مجھ سے مہلت چاہے، تاکہ میں اس معاملہ میں اسے غور کرنے کا موقع دوں“۔ (موفق ج ۲ ص ۲۲)

امام صاحب کو جب ابن ہبیرہ کی اس خواہش کی خبر پہنچائی گئی، تو آپ نے فرمایا: ”اچھا مجھے چھوڑ دیا جائے، میں اپنے احباب اور اپنے بھائیوں سے مشورہ کروں گا“۔

ایک روایت میں یہ ہے، کہ ابن ہبیرہ نے جب امام اعظم کو قید کیا اور آپ پر جلاد کو کوڑا برسانے کا حکم دیا، اسی شب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، آپ بحالت غضب اسے تنبیہ کر رہے ہیں:

اما تخاف اللہ تعالیٰ تضرب رجلا من امتی بلاجرم وتهدده ۔

کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتے کہ میرے ایک امتی کو بلا جرم زدوکوب کرتے ہو اور دھمکی دیتے ہو۔

ابن ہبیرہ نے صبح اٹھتے ہی امام صاحب کو قید سے آزاد کر دیا (جب باہر آئے تو دیکھا گیا کہ زدوکوب کے صدمے سے سر لہولہان اور چہرہ سوجا ہوا ہے)۔ (کردری ج ۲ ص ۲۶)

قید سے رہائی کے بعد امام اعظم نے مکہ کا سفر کیا اور وہیں اموی حکومت کے خاتمہ تک مقیم رہے۔

امام ابوحنیفہ کی مظلومیت پر امام احمد اور امام حماد کے تاثرات

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ابن ہبیرہ نے امام اعظم کو ۱۱۰ کوڑے مروائے اور روزانہ دس کوڑے لگوانے کا معمول تھا۔

امام احمد بن حنبل جب امام اعظم ابوحنیفہ کی اس مظلومانہ حالت کو یاد کرتے، تو بے اختیار ہو کر رونے لگتے اور امام صاحب کے لیے اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر دعائیں کرتے۔ (وفیات الاعیان ج ۳ ص ۲۰۲)

ابوحنیفہ کے پوتے اسماعیل کا بیان ہے کہ میں کوفہ میں اپنے والد حماد بن ابی حنیفہ کے ساتھ ایک مرتبہ کناسہ کے مقام سے گزر رہا تھا کہ میرے والد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، میں نے دیکھا کہ وہ بے اختیار رو رہے ہیں، مجھے حیرت ہوئی اور میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا: ”ایاابتی ما یبکیك“ ابا جان! کون سی چیز آپ کو اس طرح رلاتی ہے۔ فرمانے لگے:

یا بنی! فی هذه الموضع ضرب ابن هبیرة ابی عشرة ایام فی کل یوم عشرة اسواط علی ان یلی القضا فلم یفعل ۔

لخت جگر! یہ وہ جگہ ہے جہاں ابن ہبیرہ نے میرے والد (ابوحنیفہ) کو دس روز تک کوڑوں کی سزا دی تھی، اس طرح کہ روزانہ دس کوڑے لگائے جاتے تھے، تاکہ ابوحنیفہ منصب قضا قبول کر لیں، مگر ابوحنیفہ نے منصب قضا اور وزارت عدل کے بدلے کوڑوں کی سزا بخوبی قبول کر لی۔ (ایضا)

ابراہیم بن میمون اور امام اعظم

اموی خلفا کی بے اعتدالیوں اور ان کے جابرانہ کارناموں سے عالم اسلام کی سنجیدہ علمی شخصیتیں اور معزز شہری ناراض تھے۔ اندر ہی اندر بغاوت کے جراثیم پروان چڑھ رہے تھے۔ امویوں کے ناعاقبت اندیش خلفا وامرا کی وجہ سے ایوان اقتدار شکست وریخت کی کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا، ادھر عباسیوں کی تحریک ابومسلم خراسانی کی قیادت میں روز بروز قوت حاصل کرتی جا رہی تھی۔ اس نے خراسان میں ۱۲۹ھ میں عباسی تحریک کو سرگرم عمل کیا، مرو جو اس دور میں علما وفضلا اور مسلم دانشوروں کا مرکز تھا، ان لوگوں نے اس کی تحریک کی حمایت اس بنیاد پر کی کہ وہ اسلامی حکومت کو ظالم امویوں کے ہاتھ سے نکال کر آل عباس کے ذریعہ خلافت علی منہاج الراشدہ قائم کرنے کا نعرہ دے رہا تھا۔ لوگوں کو توقع تھی کہ امویوں کا اقتدار جب ختم ہو جائے گا، عدل ومساوات رحم ومروت اور دین ودیانت کی حکمرانی قائم ہو جائے گی۔ ابومسلم خراسانی کے حامیوں میں وقت کے جلیل القدر محدث، فقیہ ابراہیم بن میمون رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جنھیں امام اعظم ابوحنیفہ سے شرف تلمذ حاصل تھا، دوسرے بزرگ محمد بن ثابت تھے، بروایت ابن سعد ''یجلسان الیه ویسمعان كلامه '' یہ دونوں (ابراہیم ومحمد) ابومسلم کے پاس بیٹھا کرتے اور اس کی باتیں سنا کرتے تھے۔

مگر ابومسلم کی پرزور تحریک نے جب اموی حکومت کی تدفین کا عمل مکمل کر لیا اور ابوالعباس سفاح سریر آرائے خلافت ہوا، تو اس کے دور میں ظلم وعدوان، جور وجفا، ناانصافی اور بدعنوانی باقی رہی جو امویوں کے دور میں تھی، جس کے خلاف لوگوں نے عباسیوں کا ساتھ دیا تھا، خود اس تحریک کا قائد ابومسلم خراسانی اس روش پر گامزن ہوا جس پر اموی امیر حجاج بن یوسف گامزن تھا۔

جس ظلم کے خلاف ابرہیم بن میمون الصائغ جیسے جلیل القدر فقیہ محدث اور مجاہد نے ابومسلم کا ساتھ دیا تھا اور جس کا دست راست بن کر عباسی تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا، ان کے لیے یہ بات سخت ناگوار تھی کہ ابومسلم بھی امویوں کی روش پر گامزن ہو جائے، ابراہیم الصائغ زہد وورع اور حق گوئی وبے باکی کا پیکر تھے، وہ ابومسلم سے سخت متنفر ہوئے، انہوں نے اپنے طور پر ابومسلم کی فہمائش بھی کی، لیکن اقتدار کے نشے میں ابومسلم نے آپ کی نصیحتوں کو نظر انداز کیا۔ اب ابرہیم الصائغ کے نزدیک صرف ایک ہی راستہ تھا کہ لوہے کو لوہے سے کاٹا جائے اس نومولود حکومت کو جڑ پکڑنے سے پہلے ہی اکھاڑ پھینکا جائے، چنانچہ وہ مرو سے کوفہ آئے یہ وہ زمانہ تھا، جب سفاح نے کوفہ کے قریب ''ہاشمیہ'' کو اپنا دارالخلافت بنا رکھا تھا۔

ابراہیم صائغ امام اعظم کی خدمت میں پہنچے اور ابومسلم خراسانی کی داستان جور وجفا کو بیان فرمایا اور انقلاب حکومت کے

سلسلے میں امام صاحب سے طویل گفتگو کی۔ آخر میں دونوں اس بات پر متفق ہوئے کہ موجودہ حکومت کے خلاف خروج جائز ہے، امام صاحب کے الفاظ ہیں: ''الی ان اتفقنا علی انه فریضة من اللہ تعالی''

جب یہ مسئلہ طے ہوگیا، تو ابراہیم صائغ اپنا ہاتھ امام صاحب کی طرف بڑھا کر کہہ رہے ہیں ''مدیدك حتی ابایعك'' ہاتھ بڑھائیں تا کہ میں بیعت کروں، دنیائے اسلام میں جو قہرمانی طاقت برسر اقتدار تھی، اس سے ٹکرانے کے لیے ابراہیم صائغ بیعت کرنا چاہتے تھے، امام صاحب فرماتے ہیں: ''فاظلمت الدنیا بینی وبینه'' میرے اور ابراہیم کے سامنے دنیا تاریک ہوگئی۔

جان کے خوف سے امام اور ابراہیم صائغ کی یہ حالت نہ ہوئی، بلکہ ان کا منشور حیات ہی سر بہ کف ہوکر طاغوتی قوتوں سے پنجہ آزما ہونا تھا اور دونوں ہی نے حق کے لیے اپنی جان جاں آفریں کے حوالے کی۔ امام صاحب کو تذبذب صرف اس لیے تھا کہ وقت کی سب سے بڑی قوت کا مقابلہ چند اشخاص نہیں کر سکتے، رائی کو پہاڑ سے ٹکرانا دانشمندی نہیں، اس کے لیے جس عسکری تنظیم اور افرادی قوت کا ہونا ضروری ہے وہ مہیا نہیں، اسی لیے وقت اور حالات کا انتظار کرنا چاہیے، امام صاحب نے ابراہیم صائغ کے سامنے جو تقریر کی وہ کچھ اس طرح ہے:

''میں نے اس بیعت سے انکار کیا اور کہا کہ اس حق کو ادا کرنے کے لیے ایک دو آدمی اگر کھڑے ہوں گے، تو قتل کردیے جائیں گے اور مخلوق خدا کے لیے کام کی کوئی بات انجام نہ دے سکیں گے''۔ مزید فرمایا: ''لکن ان کان وجد علیه اعوانا صالحین ورجل یراس علیهم مامونا علی دین اللہ''۔ البتہ اگر اس کام کی انجام دہی میں کچھ اچھے لوگ مددگار بن جائیں اور ان لوگوں کا سردار کوئی ایسا آدمی ہو جس کے دین پر بھروسہ کیا جاسکتا ہو۔

امام صاحب کا مقصود بیان یہ تھا کہ ایسا اہم کام چند افراد نہیں کر سکتے، اس کے لیے صالح اور ذی اثر افراد کی ضرورت ہوگی جن پر اعتماد کر کے لوگ شریک تحریک ہوں، نیز اس کام کے لیے عسکری تنظیم کی ضرورت ہوگی، اس تحریک کے لیے معتمد قائد اور تحریکی شعور رکھنے والے رہنما کی ضرورت ہے، جس کی فکر صائب اور ہمت عالی کی پیروی کرتے ہوئے لوگ مہم کو کامیابی سے ہمکنار کر سکیں۔ امام صاحب نے اس امر کی طرف یوں اشارہ فرمایا:

> **هذه فریضة لیست کالفرائض یقوم بها الرجل وحده هذا الامر لا یصلح لواحد ما اطاقته الانبیاء حتی عقدت علیه من السماء۔**
>
> یہ ایسا فریضہ نہیں ہے جس کے لیے تنہا ایک آدمی کھڑا ہو جائے، یہ ایسا معاملہ ہے، جس کی صلاحیت تنہا ایک آدمی نہیں رکھ سکتا، پیغمبروں کے لیے یہ صورت حال اسی وقت قابل برداشت ہوئی جب آسمان پر ان کے لیے عہد باندھا گیا۔

امام صاحب کا سیاسی موقف یہ تھا، کہ باطل کے خلاف صف آرا ہونا ایک اہم دینی فریضہ ضرور ہے، لیکن اسے عملی جامہ

پہنانے اور حریف قوتوں کے مقابلے میں آنے کے لیے ناگزیر ہے کہ مضبوط عسکری تنظیم قابل اعتماد قائد و مخلص رفقا اور حرب وضرب کی بھرپور صلاحیت رکھنے والے مجاہدین مہیا ہوں یعنی تنظیمی قوت کی فراہمی کے بغیر ایک دو افراد کا مقابل ہونا اپنی جان کو مفت ہلاکت میں ڈالنا ہے جس کی کچھ قیمت وصول نہیں ہوتی بلکہ ان کے خاک وخون مین تڑپنے سے دوسرے افراد کے حوصلوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔

امام صاحب اور ابراہیم صائغ اگرچہ نہی عن المنکر کے فریضہ پر متفق تھے لیکن اس کے طریق کار میں دونوں کے درمیان اختلاف تھا ایک کی حق پرستی اور جذبہ تنکیر اپنے شباب پر تھی اور وہ نفع وضرر سے بے نیاز ہو کر آتش عشق میں بے خطر کود پڑنا چاہتے تھے، مگر امام صاحب اس سلسلے میں حق پرستی اور جذبہ تنکیر کے ساتھ کوئی ایسا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے، جس کے نتیجے میں جان بھی ضائع ہو اور کچھ حاصل نہ ہو سکے، چنانچہ اس نقطہ نظر پر وہ ابراہیم صائغ کو لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اس پر پیچ خارزار وادی میں تنہا سفر کرنا دانش مندی نہیں بلکہ انتظار کیا جائے، کہ کوئی مرد صالح اپنی فکر و بصیرت اور اخلاص وایثار کے ساتھ قیادت کا بیڑا اٹھائے اس کے گرد مخلص افراد جمع ہوں پھر باطل قوتوں کے روبرو صف آرائی کی جائے تا کہ کامیابی کے امکانات روشن ہوں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ابومسلم کے مقابلے میں ابراہیم کا ایمانی جوش جس خونی تماشے کو پیش کرنے پر ان کو آمادہ کر رہا تھا، امام نے اپنی پوری ذہانت اس ارادے سے ان کو باز رکھنے پر خرچ کی، لیکن ابراہیم طے کر چکے تھے، امام کی فہمائش ان کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ امام صاحب فرمایا کرتے تھے: ”**وکان یتقاضی ذلك کلما قدم علی تقاضی الغریم الملح و کلما قدم علی تقاضا نی**“ مجھ سے اس مہم میں شریک ہو جانے کے لیے ابراہیم تقاضا کرتے ایسا سخت تقاضا جیسے کوئی قرض خواہ اصرار وتشدد کے ساتھ قرض کا تقاضا کرتا ہو، جب کبھی ابراہیم میرے پاس آتے اسی کا تقاضا کرتے۔

ابراہیم الصائغ بار بار امام صاحب کی خدمت میں آتے جاتے رہے، کہ کسی طرح وہ امام صاحب کو اپنا شریک کار بنائیں، کیوں کہ فرض کے احساس میں دونوں شریک تھے، طریق کار میں اختلاف تھا اور امام صاحب اپنے نقطہ نظر سے ہٹنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہے تھے، وہ جانتے تھے کہ اس طرح ابومسلم کے مقابلے میں آنے سے فرض بھی ادا نہ ہوگا اور وہ تدوین فقہ کے اہم منصوبہ کو بھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکیں گے آخر میں امام صاحب نے ابراہیم سے فرمایا تھا، کہ ”**ولکنه ینتظر**“ لیکن چاہیے کہ انتظار کیا جائے، مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی کسی باضابطہ اجتماعی تنظیم میں شریک ہو کر مقابلہ کا موقع اگر مل گیا، تو میں اس میں شریک ہو کر فرض سے سبکدوشی حاصل کر لوں گا ورنہ انتظار کی ان گھڑیوں میں جس حد تک حق کو آگے بڑھانے اور باطل کو پیچھے ہٹانے کے امکانات ملتے چلے جائیں گے، ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں زندگی بسر کروں گا۔ تاریخ کا اتفاق ہے کہ امام کے سامنے دونوں صورتیں آئیں۔

ابراہیم الصائغ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے اور وہ احقاق حق اور ابطال باطل کے جذبے سے سرشار ہو کر مرو پہنچے ابومسلم

خراسانی اقتدار پانے کے بعد جبر واستبداد کا پیکر بن چکا تھا، معمولی معمولی باتوں پر گردنیں اڑا دینا روز کا معمول تھا، ابراہیم الصائغ ابومسلم کے دربار میں پہنچے وہ آپ کے علم وتقویٰ اور جوش ایمانی سے اچھی طرح واقف تھا، آپ نے دربار میں پہنچ کر ابومسلم کی ظالمانہ حرکتوں کے خلاف تقریر کی۔ ابن سعد کا بیان ہے: ''**ان ابراهيم الصائغ اتى ابامسلم فوعظه**' ابراہیم الصائغ ابومسلم کے پاس آئے اور اس کو نصیحت کرنے لگے۔ (ابن سعد ج۷ ص۱۰۳)

ابومسلم نے ناگواری اور عتاب کے بجائے دیرینہ تعلقات کی رعایت کرتے ہوئے کہا، آپ کی رائے مجھے معلوم ہوگئی ہے آپ اپنے مکان تشریف لے جایئے۔ (**ایضا**)

ابراہیم واپس چلے آئے، لیکن ان کا سوز دروں مضطرب کرتا رہا اور پھر ایک دن ابومسلم کے دربار میں پہنچے اور آج پہلے کی بہ نسبت ذرا تلخ کلامی سے کام لیا۔ امام صاحب کا بیان ہے ''**کلمه بكلام غليظ** '' اس دفعہ بھی ابومسلم نے قتل کا حکم نہیں دیا بلکہ گرفتار کرلیا، جب آپ کی گرفتاری کی خبر مرو اور اس کے اطراف میں پھیلی تو خراسان کے علما ومشائخ ابومسلم کے پاس جمع ہوئے چنانچہ لکھا ہوا ہے ''**فاجتمع عليه اهل خراسان وعبادهم** '' (ایضا) بالآخر علما وزہاد کے اصرار پر ابومسلم نے آپ کو رہا کردیا۔

کچھ دنوں بعد پھر ابراہیم ابومسلم کے پاس پہنچے اور اقامت دین کے لیے اسے تنبیہ فرمانے لگے ابومسلم نے اس بار صرف ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیا اور دربار سے نکلوا دیا، لیکن بار بار آپ کا آنا اس کے لیے اب ناقابل برداشت ہوگیا تھا، اس لیے وہ طے کرچکا تھا، کہ اب اگر ابراہیم نے اس قسم کی جسارت کی، تو انہیں انجام تک پہنچانا ضروری ہے ورنہ، ان کی اس دلیرانہ جرأت کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوں گے اور پھر ایوان اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے، چنانچہ جب آخری بار ابراہیم الصائغ ابومسلم کے دربار میں پہنچے تو پرزور انداز میں ارشاد فرمایا: ''حق تعالیٰ کی رضامندی کے لیے اس وقت سب سے بڑی چیز میرے نزدیک یہ ہے کہ میں تجھ سے جہاد کروں گا کوئی کام اس وقت اس سے بہتر خدا کو خوش کرنے کے لیے میرے نزدیک باقی نہیں رہا'' آپ نے فرمایا: ''**ولاجاهدنك بلساني ليس لي قوة بيدي ولكن يراني وانا ابغضك في** ''۔ (احکام القرآن للجصاص)

میں قطعاً تجھ سے اپنی زبان کے ذریعہ جہاد کروں گا، میرے ہاتھ میں اقتدار نہیں ہے، مگر میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا مالک مجھے اس حال میں دیکھے، کہ محض اللہ کی وجہ سے میں تجھ سے بغض رکھتا ہوں۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی میں ابراہیم الصائغ نے رخصت کے بجائے عزیمت پر عمل کیا اور حضور کی اس حدیث ''**افضل الجهاد كلمة الحق عند السلطان الجائر** '' (ظالم وجابر بادشاہ کے روبرو حق بات کہنا افضل جہاد ہے) کو اپنا لائحہ عمل بنایا اور سود وزیاں کی مصلحت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ حق کی راہ میں اپنی جان عزیز قربان کردینا ہی حاصل حیات ہے۔ چنانچہ وہ اس بار جب دربار میں آئے تو ان کے جسم پر کفن تھا جو مردوں کو دی

جانے والی خوشبو سے بسا ہوا تھا وہ جانتے تھے، کہ اس بار ابو مسلم کی تلوار ان کا کام تمام کر دے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں: ”و کلمه بكلام شديد فامر به فقتل و طرح فی بئر “ (طبقات ابن سعد ص۱۰۲)

ابراہیم نے ابو مسلم کو خطاب کر کے نصیحت و وعظ کہنا شروع کیا اور سخت الفاظ استعمال کیے اس پر ابو مسلم نے حکم دیا اور ان کو قتل کر دیا گیا اور کنویں میں لاش ڈال دی گئی۔

ابراہیم الصائغ کی اس عزیمت مآب قربانی کو جب امام یاد کرتے، تو بے ساختہ رو پڑتے عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں ”حتی ظننا انه سيموت “ یہاں تک کہ ہم گمان کرتے کہ وہ مر جائیں گے۔

امام اعظم اور ابو العباس سفاح

۱۳۰ھ میں امام صاحب حجاز مقدس پہنچے، پہلے مکہ مکرمہ میں قیام کیا، اس کے بعد مدینۃ الرسول میں سکونت اختیار کی۔ امویوں کے زوال تک وہ حجاز ہی میں مقیم رہے، بلکہ وہ ابو جعفر منصور کی تخت نشینی کے بعد ۱۳۶ھ میں مستقلاً کوفہ آ گئے۔ قاضی ابو یوسف اور داؤد طائی کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب اموی اقتدار کے خاتمے کے بعد کچھ دنوں کے لیے کوفہ تشریف لائے تھے، جب کہ عباسیوں کا پہلا خلیفہ ابو العباس سفاح کوفہ میں مقیم تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابو العباس سفاح نے اپنی خلافت کا پہلا خطبہ ۱۳۲ھ میں جامع کوفہ میں دیا تھا، پھر علمائے کوفہ کو ایک مجلس میں جمع کر کے یہ خطبہ دیا:

> ان هذا الامر قد افضى الى اهل بيت بينكم وحكم الله بالفصل واقام الحق وانتم معاشر العلماء احق من اعان عليه ولكم الحباء والكرامة والضيافة من مال الله ماحببتم فبايعوه بيعة تكون لكم عندامامكم حجة لكم وعليكم واما انا فی معادكم لاتلقون بالله بلا امام فتكونوا ممن لاحجة له ولاتقولوا اميرا لمومنين مهابة ان يقول الحق ۔(موفق ج ا ص ۱۰۱)
>
> بالآخر یہ خلافت تمہارے پیغمبر کے گھر والوں تک پہنچ گئی، اور اللہ کی طرف سے فیصلہ صادر ہوا، خدا نے حق کو قائم کیا (علما کو خطاب کرتے ہوئے کہا) اے گروہ علما! تم لوگ اس بات کا زیادہ حق رکھتے ہو کہ حق کی اعانت کے لیے آگے بڑھو، اس کے صلے میں داد و دہش، عزت افزائی اور تمہاری خواہش کے مطابق اللہ کے مال سے مہمان نوازی کی جائے گی۔ پس منتخب خلیفہ کے ہاتھ پر ایسی بیعت کیجیے جو امام و خلیفہ کے لیے حجت ہو، تمہارے حقوق و فرائض کی ضمانت ہوگی، آخرت میں اس کی وجہ سے تمہیں امان حاصل ہوگی، تم اللہ سے امام کے بغیر نہ ملو، اگر ایسا ہوگا تو تم ان لوگوں میں سے ہوگے، جن کے پاس کوئی وثیقہ نہیں، دیکھو محض خوف و ہیبت کی بنا پر امیر المومنین نہ کہو اور نہ حق بولنے سے باز رہو۔

یہ ۱۳۲ھ کا واقعہ ہے، جب ابو العباس کوفہ آیا تھا اور جن علما کے سامنے یہ خطاب کیا، ان میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے، علما نے آپ کی طرف دیکھا، حضرت امام نے فرمایا ”اگر اجازت ہو، تو میں آپ حضرات کی طرف سے جواب

دوں، علمانے یہ ذمہ داری آپ کو سونپی، امام صاحب نے کھڑے ہو کر جواباً یہ جامع تقریر فرمائی:

الحمد لله الذی بلغ الحق من قربة نبیه صلی الله علیه وآله وسلم وامات عنا جور الظلمة وبسط السنتنا بالحق قد بایعناك علی امر الله والوفاء لك بعهدك الی قیام الساعة فلا اخلی الله هذا الامر من قربه بنبیه صلی الله علیه وسلم ۔ (ایضا)

الحمد للہ! کہ حق ان لوگوں تک پہنچ گیا، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت رکھتے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ظالموں کے ظلم کا خاتمہ کر دیا اور ہمیں اظہار حق کی کھلی فضا میسر آئی (پھر امام صاحب نے فرمایا) خدا کے حکم اور امر پر ہم نے تمہاری بیعت کی، اور اس بیعت کے ساتھ ہم ''قیام الساعۃ'' تک وفادار رہیں گے، پس خدا سے دعا ہے، کہ امر خلافت کو ان لوگوں سے خالی نہ رکھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار ہیں۔

جب امام صاحب بیٹھے تو ابو العباس سفاح نے جواباً کہا:

وقال مثلك من خطب عن العلماء لقد احسنوا اختیارك واحسنت فی البلاغ ۔

علما کی طرف سے تمہارے ہی جیسے آدمی کو تقریر کرنا چاہیے تھا، انہوں نے تمہارا عمدہ انتخاب کیا اور تم نے خوبی کے ساتھ اپنے مقصد کو ادا کیا۔

علمانے سفاح کی مجلس سے باہر نکل کر امام صاحب سے دریافت کیا: ''قیام الساعۃ'' تک ہم وفادار رہیں اس سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ امام صاحب نے جواب دیا، تم لوگوں نے مجھے نمائندہ بنایا، تو میں نے اپنے لیے سلامتی کی راہ نکالی اور تم لوگوں کو بھی مصیبت سے بچالیا۔ علمانے یہ سن کر امام صاحب کی تحسین کی۔

''کردری'' نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا:

یحتمل ان یراد به الی قیام الساعة من المجلس فحذف الیاء واکتفی بالکسرة ۔

اس بات کا احتمال ہے، کہ قیام الساعۃ سے مراد مجلس کی گھڑی تک ہم تمہارے وفادار رہیں گے، تو ''قیامی'' کی ''یاء'' کو حذف کر دیا اور ''کسرہ'' پر اکتفا کیا۔

بعد میں امام صاحب اور علمائے کوفہ کے طرز عمل سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اپنی اور علما کی طرف سے جو بیعت کی تھی، اسی مجلس کی حد تک محدود تھی، سفاح کی دائمی اطاعت کا قلادہ انہوں نے اپنی گردن میں نہیں ڈالا تھا، امام صاحب اور دوسرے علمائے حق بنی امیہ کے جن مظالم اور بے اعتدالیوں سے نالاں اور شاکی تھے، وہی ساری بدعنوانیاں اور ستم رانیاں ابو العباس سفاح نے بھی روا رکھی، تحریک کی ابتدا میں لوگوں کو یہ خوش فہمی ضرور تھی، کہ عباسیوں کی حکومت عدل ومساوات اور خلفائے راشدین کے نہج پر استوار ہو گی، مگر اقتدار کی باگ ڈور ہاتھ میں آنے کے بعد عباسیوں نے بھی ان سارے مظالم کا

فتح باب کر دیا، جو امویوں کا وطیرہ تھے، چنانچہ ابو العباس کا لقب ہی ''السفاح'' یعنی ''خون بہانے والا'' مشہور ہو گیا۔ ابو العباس نے کوفہ ہی میں خود اعلان کیا تھا: ''انا السفاح المبیح و الثائر المتیح'' یعنی میں ہی خون بہانے والا اور لوگوں کی جان و مال کو حلال کرنے والا ہوں، میں ہی پراگندگی پھیلانے والا اور خوب داد و دہش کرنے والا ہوں۔ (کامل ابن اثیر ج۴ ص۱۵۴)

امام اعظم ابو حنیفہ نے اس ظالم انسان سے اپنی اور علمائے حق کی خلاصی کے لیے ایسی بات کہی، جس سے سفاح نے اپنے مطلب کی بات اخذ کی اور امام صاحب نے اپنا مقصد حاصل کیا، ظاہر ہے کہ امام صاحب نے ظالم و جابر ابن ہبیرہ کے عہد میں کوفہ چھوڑا تھا، عباسی تحریک کی کامیابی کے بعد وہ یہ سوچ کر کوفہ لوٹے تھے کہ اب اقتدار صالح افراد کے ہاتھوں میں آ چکا ہے، ظلم و ستم کے تاریک بادل چھٹ چکے ہیں عدل و انصاف کا ماحول پیدا ہو چکا ہوگا، لیکن جب عباسی خلیفہ کے ظالمانہ طرز عمل اور اس کی قیصری آمریت ملاحظہ فرمائی، تو پھر حجاز مقدس چلے گئے، تاکہ امن و سکون کی فضا میں علمی و دینی مشاغل جاری رکھ سکیں۔

* * *

قیام حجاز

امام اعظم نے چھ سال سے زائد عرصے تک حجاز کی مقدس سرزمین میں زندگی بسر کرنے کی سعادت حاصل کی، مکہ اور مدینہ محدثین، فقہا اور علمائے حق کا سب سے بڑے مراکز تھے، جہاں ہر وقت قال اللہ وقال الرسول کے نغمے گونجا کرتے تھے اور ساری دنیائے اسلام کے علما، فقہا، محدثین، مفسرین اس مرکز عقیدت میں حاضر ہوا کرتے تھے، باہر سے آنے والے اساطین علم کی تعداد ایام حج میں شمار سے باہر ہوتی، امام صاحب کا قیام حجاز اس دور میں ہوا، جب آپ مسند درس وافتا پر متمکن ہو چکے تھے، لیکن ان کا ذوق تحصیل علم ختم نہیں ہوا تھا اور وہ اپنی عالمانہ وجاہت کے باوجود طلب علم کے مشتاق تھے، یہی وجہ ہے کہ انہیں علم وارادت کے اس مرکز میں رہتے ہوئے بڑے وسیع پیمانے پر کسب علم کا سنہری موقع ہاتھ آیا اور آپ کے شیوخ واساتذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ابو حفص الکبیر البخاری کے مطابق

”اربعة آلاف شيخ وقال غيره له اربعة آلاف شيخ من التابعين فمابالك بغيرهم“

(الخیرات الحسان ص ۵۰)

(امام صاحب کے شیوخ کی تعداد) چار ہزار شیوخ پر مشتمل ہے، ابو حفص کے علاوہ نے کہا، چار ہزار شیوخ طبقہ تابعین سے تعلق رکھتے ہیں، غیر تابعین اساتذہ کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔

شیوخ کی کثرت کا راز امام صاحب کی قوت اخذ علم اور طویل قیام حرمین شریفین کے دوران حجازی اور غیر حجازی تابعین، تبع تابعین علما ومحدثین کی ملاقات اور ان سے شرف تلمذ کا موقع ہے۔

حجاز مقدس میں قیام کے دوران آپ کی علمی شان وعظمت کا ظہور اس طور پر ہوا، کہ علمائے حجاز خود آپ سے کسب علم کے مشتاق ہوئے اور آپ کی عالمانہ بصیرت کے معترف بنے، حضرت عطاء بن ابی رباح مشہور تابعی عالم وفقیہ جن کی ذات مرجع علما وفضلا تھی اور جن سے اکتساب فیض پر خود امام صاحب کو ناز تھا فرمایا کرتے تھے: ”مالقيت افضل من عطاء“ عطاء بن ابی رباح سے بہتر آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ (مجم ج ۲ ص ۳۹)

کبھی یہ فرماتے کہ ”مارايت اجمع لجميع العلوم من عطاء بن أبی رباح“ جو جامعیت علم، میں نے عطاء بن ابی رباح میں پائی وہ کسی میں نہ پائی۔ (موفق ج ۱ ص ۸۸)

امام اعظم اپنی پہلی ملاقات اور عطا کی توجہ کی روایت سعید بن سالم بصری سے یوں بیان فرماتے ہیں:

''میں مکہ مکرمہ میں عطاء سے ملا، ان سے میں نے کچھ دریافت کیا، انہوں نے فرمایا، کس جگہ کے ہو میں نے کہا، کوفہ کا ہوں، فرمایا تم اس بستی کے ہو، جس کے باشندے اپنے دین میں تفریق پیدا کر کے فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں انہیں لوگوں میں ہوں، فرمایا، تمہارا تعلق کس فرقے سے ہے، میں نے کہا ''ممن لا یسب السلف ویومن بالقدر ولا یکفر احدا بذنب'' اس جماعت سے میرا تعلق ہے، جو سلف کو گالی نہیں دیتی، تقدیر پر ایمان رکھتی ہے اور گناہ کی وجہ سے کسی کو کافر نہیں کہتی۔ یہ سن کر عطاء نے فرمایا ''فالزم'' ''تم میرے پاس آیا کرو''۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۳۰)

ایسے جلیل القدر عالم کا حال یہ تھا، کہ ان کے شاگرد حارث بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں:

كنا نكون عند عطاء بن ابی رباح بعضنا خلف بعض فاذا جاء ابو حنيفة اوسع له وادناه ۔

ہم عطاء بن ابی رباح کی مجلس میں اس طرح بیٹھتے کہ بعض بعض کے پیچھے ہوتا، جب ابو حنیفہ مجلس میں تشریف لاتے، تو عطاء ان کے لیے مجلس میں گنجائش پیدا کرتے اور اپنے قریب بیٹھاتے۔

مکہ مکرمہ میں حلقہ درس

امام کی یہی عالمانہ وجاہت تھی، جس کی بنا پر لوگوں نے حجاز مقدس میں مجلس تدریس قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی اور طالبان علوم نبوی کو آپ کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی۔

وزیر بن عبداللہ کا بیان ہے:

سمعت ياسين الزيات بمكة وعنده جماعة عظيمة وهو يصيح باعلىٰ صوته ويقول يا ايها الناس اختلفوا الى ابی حنيفة واغتنموا مجالسته وخذوا من علمه فانكم لم تجالسوا مثله ولن تجدوا اعلم بالحلال والحرام منه فانكم ان فقدتموه فقدتم علما كبيرا ۔

(موفق ج ۲ ص ۳۸)

میں نے مکہ مکرمہ میں یاسین زیات کو دیکھا کہ سامنے ایک بڑی جماعت ہے اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ اے لوگو! ابو حنیفہ کے پاس آیا جایا کرو اور ان کے حلقہ درس میں بیٹھنے کو غنیمت سمجھو، ان کے علم سے فائدہ اٹھاؤ، کیوں کہ ایسا آدمی پھر بیٹھنے کے لیے نہیں ملے گا اور حلال وحرام کے ایسے عالم کو پھر نہ پاؤ گے، اگر اس شخص کو تم نے کھو دیا، تو علم کی بہت بڑی مقدار کھو بیٹھو گے۔

اسلام کے سب سے بڑے علمی وروحانی مرکز میں جہاں تمام عالم اسلام کے عوام وخواص آیا جایا کرتے تھے، وہاں امام کی مجلس درس وافتا کا یہ عالم تھا، کہ لوگ پروانوں کی طرح ان کے گرد جمع ہو کر اکتساب علم کرتے تھے۔

مشہور محدث عمار بن محمد مجلس درس کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

کان ابوحنیفة جالسا فی المسجد الحرام وعلیه زحام کثیر کل الآفاق قد اجتمعوا علیه من کل جانب فیجیبهم ویفتیهم ۔(موفق ج۱ص۱۲۰)

ابوحنیفہ مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے اوران کے پاس خلقت کا ہجوم تھا، جن میں ہر علاقے اور خطے کے لوگ ہوا کرتے سب کو جواب دیتے اور فتویٰ دیتے۔

امام کے تبحر علمی اور بصیرت فی الفقہ کا چرچا رفتہ رفتہ عام ہوتا رہا اور حلقہ درس میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی اور آپ کے حلقۂ درس میں بیٹھنے والے حضرات اس دور کے اساطین علم تھے، عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

رأیت اباحنیفة جالسا فی المسجد الحرام ویفتی اهل المشرق واهل المغرب والناس یومئذ ناس یعنی الفقهاء الکبار وخیار الناس حضور ۔(موفق ج۲ص۵۷)

میں نے حرم کعبہ کی مسجد میں ابوحنیفہ کو دیکھا کہ بیٹھے ہوئے ہیں اور مشرق ومغرب کے باشندوں کو فتویٰ دے رہے ہیں اور یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ لوگ تھے یعنی بڑے بڑے فقہا اور منتخب وبرگزیدہ افراد آپ کی مجلس درس میں موجود رہتے تھے۔

امام اعظم کو حجاز مقدس کے دوران قیام حرمین شریفین کے علما ومحدثین اور دیگر اسلامی بلاد وامصار کے محدثین وفقہا محققین ومفسرین سے ملنے اور ان کی علمی بساط سے خوشہ چینی کرنے کا موقع بھی ملا اور بہت سارے علما وفقہا جو امام اعظم سے بعض افواہوں کی بنیاد پر بدظنی کا شکار ہوئے ملاقات کے دوران امام صاحب نے ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ فرمادیا۔

امام باقر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں

ایک بار مدینہ منورہ تشریف لے گئے، جہاں حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، آپ کو بتایا گیا تھا کہ ابوحنیفہ دینی مسائل واحکام میں قیاس ورائے سے فتویٰ دیتے ہیں۔ چنانچہ امام باقر کو جب معلوم ہوا، کہ آپ وہی امام عراق ابوحنیفہ ہیں، تو دریافت فرمایا، آپ وہی ابوحنیفہ ہیں، جس نے میرے نانا کے دین کو بدل دیا ہے؟ (اور قطعی نصوص اور قرآن وحدیثﷺ کے مقابلے میں قیاس کو ترجیح دینے کا اصول اپنایا ہے)

امام اعظم نے نہایت ادب واحترام کے ساتھ عرض کیا، حضرت آپ تشریف رکھیں، تو کچھ عرض کروں۔ چنانچہ امام باقر بیٹھ گئے۔ امام صاحب بھی ان کے سامنے ادب کے ساتھ دوزانو ہوکر بیٹھے، عرض کی ”میں آپ سے تین باتیں پوچھنا چاہتا ہوں، آپ مجھے ان تینوں کا جواب عنایت فرمائیں۔

امام ابوحنیفہ: ۔مرد ضعیف ہے یا عورت؟

امام باقر: ۔عورت

امام ابوحنیفہ: ۔مرد کا حصہ کتنا ہے اور عورت کا کتنا؟

امام باقر:۔ مرد کے لیے دو حصے ہیں اور عورت کے لیے ایک حصہ۔

امام ابوحنیفہ:۔ **ھذا قول جدك ولو حولت دين جدك لكان ينبغى فى القياس ان يكون للرجل سهم وللمرأة سهمان لان المرأة اضعف من الرجل .**

یہی آپ کے جد امجد کا قول ہے، اگر میں آپ کے نانا کے دین کو تبدیل کرتا اور قیاس سے فتویٰ دیتا تو ازروئے قیاس مناسب ہوتا کہ مرد کا ایک حصہ ہو اور عورت کا دو حصہ کیوں کہ عورت مرد سے زیادہ ناتواں ہے۔

امام ابوحنیفہ:۔ نماز افضل ہے یا روزہ؟

امام باقر:۔ نماز افضل ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ:۔ **ھذا قول جدك ولو حولت دين جدك فالقياس ان المرأة اذا طهرت من الحيض امرتها ان تقضى الصلوٰة ولا تقضى الصوم .**

یہ آپ کے نانا جان کا ارشاد ہے، اگر میں ان کے دین کو بدلتا، تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ عورت جب حیض سے پاک ہو تو میں اسے حکم دیتا کہ وہ نماز کی قضا کرے، روزے کی قضا نہ کرے۔ امام ابوحنیفہ:۔ پیشاب زیادہ ناپاک ہے یا نطفہ؟

امام باقر:۔ پیشاب زیادہ ناپاک ہے۔

امام ابوحنیفہ:۔ **فلو كنت حولت دين جدك بالقياس لكنت امرت ان يغتسل من البول ويتوضأ من النطفة لان البول اقذر من النطفة ولكن معاذ الله ان احول دين جدك بالقياس .**

اگر میں آپ کے نانا کے دین سے منحرف ہوتا تو میں اس مسئلہ میں حکم دیتا کہ پیشاب خارج ہونے پر غسل کیا جائے اور خروج منی پر وضو کیوں کہ پیشاب منی کی بہ نسبت زیادہ نجس ہے، اس بات سے خدا کی پناہ کہ میں آپ کے نانا کے دین کو قیاس کے ذریعہ تبدیل کروں۔

امام باقر یہ بات سن کر بے حد مسرور ہوئے، بدگمانی جاتی رہی اور امام صاحب کی ذکاوت و ذہانت اور تبحر علمی کا اعتراف اس طرح فرمایا، کھڑے ہوئے، معانقہ کیا، مہربانی فرمائی، تعظیم کی اور آپ کی پیشانی کا بوسہ لیا۔

فعانقه والطفه واكرمه وقبل وجهه (موفق ج۱ص۱۶۸)

امام مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ

امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ جلیل القدر محدث اور مجتہد مطلق تھے، پورا عالم اسلام آپ کو عقیدت و ارادت کی نظر سے دیکھتا تھا، امام اعظم نے بھی ان کی بارگاہ میں بار با حاضری دی اور آپ کے ساتھ طویل علمی و فقہی مذاکرات

ہوا کرتے تھے۔ ابن دراوردی کا بیان ہے :

رأیت مالکا وابا حنیفة فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد صلوة العشاء الآخرة وهما یتذاکران ویتدارسان حتی اذا وقف احدهما علی القول الذی قال به وعمل علیه امسك احدهما عن صاحبه من غیر تعسف ولا تخطئة لو احد منهما فلم یزالا کذالك حتی صلیا الغداة فی مجلسهما ذلك۔

میں نے مالک اور ابوحنیفہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں دیکھا کہ عشا کی نماز کے بعد دونوں باہم علمی مذاکروں اور مباحثوں میں مصروف رہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ صبح کی نماز بھی وہیں پر ادا کرتے، جہاں پر عشاء کی نماز کے بعد دونوں بیٹھ کر بحث ومباحثہ میں مشغول ہوتے تھے۔
دوران بحث ان میں سے کوئی دوسرے کے قول راجح پر مطلع ہوتا تو اسے بلاچوں وچرا اختیار کر لیتا۔

(موفق ج ۲ ص ۱۶۴)

امام مالک امام صاحب کی فکر رسا اور قوت بحث واجتہاد کے معترف تھے۔ واقدی کا بیان ہے:

قلت لمالك بن انس من افقه من قدم علیکم من اهل العراق قال ومن قدم علینا من اهل العراق قلت قدم علیکم ابن ابی لیلی وابن شبرمة وسفیان الثوری وابوحنیفة فقال مالك ذکرت ابا حنیفة فی آخرهم رأیته یکلم فقیها من فقهائنا حتی رده الی رای نفسه ثلاث مرات وقال هذا ایضا خطأ ۔(جلداول ۱۱۳ مناقب الکردری)

میں نے امام مالک سے پوچھا آپ کے پاس عراق سے آنے والوں میں سب سے بڑا فقیہ کون ہے، امام مالک نے دریافت فرمایا ہمارے پاس عراق سے کون لوگ آئے، میں نے عرض کیا، آپ کی بارگاہ میں ابن ابی لیلی، ابن شبرمہ، سفیان ثوری اور ابوحنیفہ آئے، امام مالک نے فرمایا، تم نے لوگوں کے آخر میں ابوحنیفہ کا ذکر کیا میں نے دیکھا کہ وہ حجازی فقہا میں سے کسی سے گفتگو کر رہے تھے جسے انہوں نے تین بار اپنی رائے کے ماننے پر مجبور کیا تیسری رائے جسے ماننے پر مجبور کیا تھا آخر میں اسے رد کر دیا اور فرمایا یہ بھی غلط ہے۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام دارالہجرت سے امام اعظم کے بارے میں سوال کیا تو امام دارالہجرت نے فرمایا:

سبحان اللہ لم ار مثله تاللہ لو قال ان الاسطوانة من ذهب لاقام الدلیل القیاسی علی صحة قوله ۔

سبحان اللہ میں نے ان کا مثل نہیں دیکھا خدا کی قسم اگر وہ کہتے کہ یہ ستون سونے کا ہے تو اپنے دعویٰ کو قیاسی دلیل سے ثابت کر دیتے۔ (الخیرات الحسان ص ٦٦)

عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں:

دخل ابو حنیفة علی مالك فرفعه ثم قال بعد خروجه اتدرون من هذا ؟ قالوا لا قال ابو حنیفة النعمان لو قال هذه الاسطوانة من ذهب لخرجت كما قال لقد وفق له الفقه حتی ماعلیه فیه كثیر مؤنة ۔

امام ابوحنیفہ امام مالک کے پاس تشریف لے گئے، تو آپ نے ان کی تعظیم کی جب آپ چلے گئے تو فرمایا تم لوگ جانتے ہو یہ کون تھے لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو فرمایا یہ ابوحنیفہ نعمان تھے اگر یہ کہتے کہ یہ ستون سونے کا ہے تو اسے ثابت کر دکھاتے، فقہ سے ان کو طبعی مناسبت ہے اس باب میں ان کے لیے کوئی مشقت نہیں۔ (الخیرات الحسان ص ۶۶)

امام اوزاعی سے ملاقات

حضرت عبداللہ بن مبارک امام اوزاعی سے تحصیل علم کے لیے شام تشریف لے گئے، بیروت میں ان سے ملاقات ہوئی، تو امام اوزاعی نے پوچھا:

یاخراسانی من هذا المبتدع الذی خرج بالكوفة یكنی ابا حنیفة ۔

اے خراسانی وہ بدعتی کون ہے، جو کوفہ میں ظاہر ہوا ہے جسے ابوحنیفہ کہتے ہیں؟

ابن مبارک امام صاحب کے تلمذ سے مشرف ہو چکے تھے اور آپ کے تبحر علمی، شان تفقہ سے پورے طور پر واقف ہو چکے تھے، انہوں نے سمجھ لیا کہ امام اوزاعی تک امام اعظم سے متعلق غلط باتیں پہنچائی گئی ہیں، جس کی وجہ سے آپ سوء ظن میں مبتلا ہیں اس کا ازالہ ضروری ہے چنانچہ دو تین دن بعد پھر ان کی مجلس میں حاضر ہوئے اور فقہ حنفی کے چند کتابی اجزا ساتھ میں لیتے گئے، جن کی پیشانی پر قال نعمان بن ثابت لکھا ہوا تھا، انہیں امام اوزاعی کی خدمت میں پیش کر دیا، امام اوزاعی ان نوشتوں کو بغور پڑھتے رہے جب تمام اجزا کی قرأت سے فارغ ہوئے سر اٹھایا اور ابن مبارک سے پوچھا: **”یا خراسانی من النعمان بن ثابت هذا“** اے خراسانی یہ نعمان بن ثابت کون ہیں؟ ابن مبارک نے جواب دیا کہ یہ نعمان میرے شیخ اور عراق کے ایک بزرگ فقیہ ہیں، یہ سن کر امام اوزاعی نے فرمایا:

هذا نبیل من المشائخ اذهب فاستكثره ۔

یہ بڑے پائے کے عالم ہیں تم ان کے پاس جاؤ اور مزید علم حاصل کرو۔

ابن مبارک نے عرض کیا، یہ نعمان وہی ابوحنیفہ ہیں، جن کو گزشتہ دنوں آپ مبتدع قرار دے رہے تھے، جب امام اوزاعی حج کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، تو امام اعظم سے ملاقات ہوگئی، آپ کی مجلس علمی میں شریک ہوئے آپ کی اہم فقہی گفتگو اور دلائل و براہین سے بے حد متاثر ہوئے، اس مجلس میں ابن مبارک بھی تھے، جب مجلس ختم ہوئی امام اوزاعی نے

عبداللہ بن مبارک سے فرمایا:

غبطت الرجل بكثرة علمه ووفور عقله واستغفر الله تعالىٰ لقد كنت فى غلط ظاهر الزم الرجل فإنه بخلاف مابلغنى عنه ۔

میں امام صاحب کی کثرت علم اور وفور عقل پر رشک کرتا ہوں اور میں اللہ تعالی سے استغفار کرتا ہوں میں کھلی غلطی پر تھا ان کو الزام دیتا تھا حالاں کہ وہ بالکل اس کے برخلاف ہیں۔

(تاریخ بغداد ج ١٣ ص ٣٣٨، الخیرات الحسان ص ٦٨)

امام اعظم سے امام عبدالرحمٰن اوزاعی کی ملاقات اور ایک علمی مباحثے کا ذکر سفیان بن عیینہ اس طرح کرتے ہیں:

امام اعظم اور امام اوزاعی کی مکہ معظمہ میں دارالحیاطین میں ملاقات ہوئی۔ امام اوزاعی نے امام اعظم سے کہا، کیا بات ہے آپ لوگ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین نہیں کرتے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم سے کوئی صحیح روایت نہیں۔

امام اوزاعی نے کہا کیسے نہیں! حالانکہ مجھ سے زہری نے حدیث بیان کی وہ سالم سے، سالم اپنے والد ابن عمر سے روایت کرتے ہیں:

انه كان يرفع يديه اذا افتتح الصلوة وعند الركوع و عند الرفع منه ٥

کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے، جب رکوع میں جاتے، جب رکوع سے اٹھتے تو رفع یدین کیا کرتے۔

اس کے جواب میں حضرت امام اعظم نے فرمایا۔

ہم سے حماد نے حدیث بیان کی وہ ابراہیم نخعی سے، وہ علقمہ اور اسود سے یہ دونوں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت کرتے ہیں:

كان لا يرفع يديه الا عند افتتاح الصلوة ولا يعود لشى من ذالك ٥

کہ نبی صلی اللہ تعالی علیہ وسلم افتتاح نماز کے وقت رفع یدین کرتے تھے، اس کے بعد پھر نہیں کرتے تھے۔

اس پر امام اوزاعی نے کہا میں عن زہری عن سالم عن ابیہ کی حدیث سند سے بیان کرتا ہوں اور آپ کہتے ہیں حدثنی حماد عن ابراہیم عن علقمہ حضرت امام اعظم نے فرمایا، حماد، زہری سے افقہ ہیں اور ابراہیم، سالم سے افقہ ہیں اور علقمہ فقہ میں ابن عمر سے کم نہیں۔ اگر چہ وہ صحابی ہونے کی وجہ سے علقمہ سے افضل ہیں اور اسود اور بھی صاحب علم ہیں اور حضرت عبداللہ ابن مسعود کی فقہ میں برتری سب کو معلوم ہے۔ (موفق ج ١ ص ١٣١)

امام اوزاعی نے حدیث کو علوے سند سے ترجیح دی اور امام اعظم نے راویوں کے افقہ ہونے کی بنیاد پر۔ یہ بات بالکل

واضح ہے کہ اگر دو متضاد باتیں دو فریق سے مروی ہوں۔ دونوں ثقہ ہوں مگر ایک فریق کے راوی زیادہ عالم زیادہ ذہین زیادہ سمجھ دار ہوں تو ہر دیانت دار عاقل اسی حدیث کو ترجیح دے گا جو فریق ثانی سے مروی ہو۔

امام لیث بن سعد

امام مصر حضرت لیث بن سعد امام کی شہرت سن کر شوق ملاقات میں مکہ مکرمہ تشریف لائے، دیکھا امام صاحب مجلس علمی میں تشریف فرما ہیں آپ کے گرد لوگوں کا ہجوم ہے ایک شخص نے سوال کیا آپ نے فوراً عمدہ جواب دیا جواب سے متاثر ہو کر امام لیث بن سعد ارشاد فرماتے ہیں:

> **فواللہ ما اعجبنی صوابہ کما اعجبنی سرعۃ جوابہ**۔ (موفق جلد اول ص ۱۶۳)
>
> مجھے ان کے صحیح جواب پر اتنی حیرت نہ ہوئی جتنا تعجب ان کی زود جوابی پر ہوا۔

والی مکہ موسیٰ بن عیسیٰ کا وثیقہ

لکھا ہے کہ موسی بن عیسی عباسیوں کی طرف سے مکہ کا والی تھا حج کے زمانہ میں وہاں قاضی ابن ابی لیلی اور ابن شبرمہ سرکاری قضاۃ پہنچے ہوئے تھے اور اتفاق سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ بھی وہاں موجود تھے، موسی بن عیسی والی مکہ کو کسی کام کے لیے ایک وثیقہ لکھوانے کی ضرورت پیش آئی، پہلے اس نے دونوں سرکاری قاضیوں کو بلوا کر وثیقہ لکھنے کی فرمائش کی، لیکن جو لکھتا دوسرا اس میں نقائص نکال کر رکھ دیتا، اسی جھگڑے اور باہم منازعت میں مطلوبہ وثیقہ تیار نہ ہوسکا، آخر دونوں حضرات تشریف لے گئے تھوڑی دیر بعد امام اعظم ابوحنیفہ بھی کسی ضرورت سے والی مکہ کے ہاں خود پہنچے یا بلائے گئے، موسی نے امام صاحب کو دیکھا تو بہت خوش ہوا اور وثیقہ کا سارا قصہ امام صاحب کے سامنے دہرایا، امام صاحب نے فرمایا، پریشانی کی کوئی بات نہیں، کاتب کو بلوایئے ابھی لکھوا دیتا ہوں، چنانچہ کاتب بلوایا گیا اور امام صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے وثیقہ لکھوا دیا، اور موسیٰ والی مکہ کے حوالے کر دیا، وہ جس طرح کی دستاویز لکھوانا چاہتا تھا امام صاحب نے اس کے سارے تقاضے پورے کر دیے، تحریر مطلوب کے موافق تھی۔

جب امام صاحب تشریف لے گئے، تو موسیٰ نے دونوں سرکاری قاضیوں کو بلا کر ابوحنیفہ کا لکھوایا ہوا وثیقہ خود پڑھ کر سنایا، دونوں سنتے اور سر دھنتے رہے مگر اول سے آخر تک کوئی نقص نہ نکال سکے موسیٰ نے دونوں کو بتایا کہ یہ دستاویز ابوحنیفہ کی لکھوائی ہوئی ہے، دونوں ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے لکھا ہے کہ جب دونوں سرکاری دربار سے باہر آئے تو ایک نے دوسرے سے کہا ''**اما تری ھذا الحائك جاء فی ساعۃ فكتبہ**'' 'تم نے اس جولاہے کو دیکھا کہ جس وقت آیا اسی وقت وثیقہ لکھوا دیا، تب دوسرے نے کہا: ''بھائی جولاہا بھی کہیں ایسی عبارت (دستاویز) لکھ سکتا ہے۔ (موفق ج ۱ ص ۱۷۰)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقاتی اور پیشہ ورانہ عصبیت اس دور کے بعض علما میں بھی در آئی تھی اور وہ حیاکت کے پیشے کو ذلیل اور اس کام میں مصروف لوگوں کو بزعم خویش احمق اور نادان سمجھتے تھے۔

توسیع حرم کا مسئلہ

خلیفہ ابوجعفر منصور نے ایک مرتبہ حج کے موقع پر مسجد حرام کی تنگی دیکھ کر اس کو وسیع کرنے کا ارادہ کیا اور آس پاس کے مکانوں کو حرم میں ملانے کے لیے مالکوں کو خطیر رقم پیش کی، مگر وہ لوگ جوار حرم چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوئے، ابوجعفر منصور بہت پریشان ہوا، زبردستی کر کے مکانات غصب بھی نہیں کرسکتا تھا، اس سال امام ابوحنیفہ بھی حج کو گئے ہوئے تھے، مگر لوگوں کو ان کی آمد کی خبر نہیں تھی، جب امام صاحب کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو خود ابوجعفر کے پاس گئے اور کہا کہ یہ معاملہ بہت آسان ہے امیر المومنین مکان کے مالکوں کو بلا کر ان سے دریافت کریں کہ کعبہ تمہارے جوار اور پڑوس میں اترا ہے یا تم اس کے جوار میں آ کر آباد ہوئے ہو؟ اگر وہ جواب دیں کہ کعبہ ہمارے پاس اترا ہے تو یہ جھوٹ ہے اور اگر وہ جواب دیں کہ ہم کعبہ کے جوار میں اترے ہیں تو ان سے کہا جائے گا کہ اب اس کے زائرین وحجاج زیادہ ہو گئے ہیں اور مہمانوں کے لیے اس کا صحن تنگ ہو گیا ہے اور وہ اپنے سامنے کے میدان کا زیادہ حقدار ہے اس لیے اس کی زمین خالی کرو، چنانچہ اس رائے کے مطابق ابو جعفر منصور نے مکان کے مالکوں کو طلب کر کے یہی بات کہی اور ان کے ہاشمی نمائندوں نے اقرار کیا کہ ہم لوگ کعبہ کے جوار میں اترے اس کے بعد سب لوگ اپنے مکانات فروخت کرنے پر راضی ہو گئے (حسن التقاسیم ص ۷۵)

اس طرح حرم کعبہ کی توسیع بآسانی ہو گئی۔

خلیفہ ابوجعفر منصور اور امام اعظم ابوحنیفہ

پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح نے کوفہ کے قریب ''ہاشمیہ'' نامی بستی کو دارالخلافہ بنایا تھا، منصور نے کوفہ کے قریب ''انبار'' میں قیام کیا ۱۴۵ھ میں منصور نے اپنی حکومت کے استحکام اور تنظیم سلطنت کے امور سے یک گونہ فراغت پائی، تو بغداد کو عباسی خلافت کی راجدھانی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض سے ایک وسیع شہر دارالسلام بغداد کی اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر کا آغاز کیا۔ شہر کی تعمیر سے پہلے اس نے تمام ممالک محروسہ میں مقیم علما وفضلا دانشور اور حکما کو بغداد طلب کیا۔ بغداد آنے والے فقہا ومحدثین کی جماعت میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے۔ عیسیٰ بن موسیٰ نے امام صاحب کو جب منصور کے دربار میں پیش کیا، تو آپ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا: ''یا امیر المومنین هذا عالم الدنیا الیوم'' ''اے امیر المومنین اس وقت یہ دنیا کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ (دیباچہ جامع المسانید للخوارزمی)

عیسیٰ بن موسیٰ کے تعارف کے بعد منصور امام صاحب کی طرف متوجہ ہوا، پوچھا نعمان تم نے علم کس سے حاصل کیا؟ امام صاحب نے ذرا تفصیل سے جواب دیا ''حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چار ممتاز صحابہ عمر بن خطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے اصحاب اور شاگردوں کے علم سے میرا علم ماخوذ ہے''۔

ابوجعفر خود صاحب علم تھا اس نے جواب کی تحسین کرتے ہوئے کہا، ''تم نے بڑی مستحکم راہ اپنے لیے اختیار کی''

ابو جعفر کا ارادہ تھا، کہ شہر بغداد کی تعمیر اور اس کی تزئین علما اور دانشوروں کی رائے مشورے سے کی جائے چنانچہ اس نے علما و فقہا کو مختلف ذمہ داریاں دیں۔ بیان کیا جاتا ہے، کہ امام صاحب کو منصب قضا کی پیش کش ہوئی، انہوں نے منصب قضا کو مسترد کر دیا، منصور نے جذبہ انتقام میں امام صاحب پر شہر بغداد کی تعمیر کے لیے اینٹوں کی ڈھلائی کی نگرانی، ان کا شمار، کام کرنے والوں کی نگرانی آپ کو سونپ دی۔ اس کا خیال تھا، کہ امام صاحب اس کام میں اذیتوں سے دو چار ہوں گے اور اپنی ذلت و حقارت محسوس کرتے ہوئے عہدہ قضا قبول کر لیں گے۔ لیکن امام صاحب نے دوسرے کاموں کی نگرانی کے ساتھ اینٹوں کے شمار کا اہم کام بھی انجام دیا، انہوں نے ایک ایک اینٹ شمار کرنے کے بجائے اینٹ کے ڈھیروں کی پیمائش کا طریقہ اختیار کیا، اس طرح علم حساب کی مدد سے امام صاحب چند منٹوں میں ایک بانس کے ذریعہ اینٹوں کے بڑے بڑے ڈھیروں کا شمار کر لیا کرتے، اس طرح امام اعظم نے اپنی تدبیر و حکمت سے ایک ایسا اصول وضع کر کے دنیا والوں پر احسان کیا کہ وہ محل اشیا کے رقبے طول و عرض اور بلندی کو ناپ کر نتیجہ اخذ کر سکیں، کہ اس مقام پر رکھی ہوئی چیز کی تعداد و شمار کیا ہے۔

بغداد کی تاسیس و تعمیر کے دوران امام صاحب زیادہ دنوں تک منصور کے ساتھ بغداد ہی میں رہے، منصور اور حضرت امام اعظم سے متعلق جو واقعات سیرت نگاروں نے تحریر کیے ہیں، ان میں تاریخی ترتیب کا التزام نہیں کیا ہے، تاہم اتنا ضرور واضح ہے، کہ واقعات اس ملاقات کے بعد ہی وجود میں آئے، ہم یہاں کچھ واقعات پیش کرتے ہیں، جن سے امام صاحب کی حاضر جوابی، زود فہمی، حق گوئی اور فقہی بصیرت کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ منصور آپ کی عالمانہ وجاہت سے کس درجہ متاثر تھا۔

بیع و شرا سے متعلق ایک کتاب

منصور نے بیع و شرا کے موضوع پر ایک جامع کتاب لکھوانے کا فیصلہ کیا، اس نے اس وقت کے اہم علما و فضلا ابن ابی لیلیٰ، ابن شبرمہ اور دیگر فقہا کو جمع کیا، ان سب کا تعلق دربار سے تھا، ان تمام لوگوں نے مل کر بیع و شرا کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی، جب منصور کے مطالعہ میں پیش کی گئی، اس نے غور سے پڑھنے کے بعد ناپسندیدگی کا اظہار کیا، کیوں کہ کتاب اس کے معیار کے مطابق نہیں تھی، اس نے کتاب کے اغلاط کو پیش کیا، علمائے مجلس نے عرض کیا، کہ یہ کتاب ہم نے اپنے علم کی روشنی میں مرتب کی ہے، ہم اس سے عمدہ کتاب نہیں لکھ سکتے البتہ کوفہ میں ایک فقیہ ہیں، جو آپ کی خواہش کے مطابق کتاب لکھ سکتے ہیں، چنانچہ امام اعظم کو بلایا گیا، منصور نے آپ سے کہا، مجھے اس قسم کی کتاب چاہیے اس کے لیے آپ کو دو ماہ کا وقت دیتا ہوں آپ نے فرمایا دو ماہ کا وقت زیادہ ہے انشاء اللہ اس سے پہلے ہی مکمل ہو جائے گی اور آپ نے دو دن میں کتاب مکمل کر کے منصور کی بارگاہ میں پیش کر دی اور کسی کو اس پر تنقید کرنے کی ہمت نہ ہوئی، منصور کو وہ کتاب بہت پسند آئی، اس نے آپ کو دس ہزار درہم دینا چاہا تو آپ نے قبول نہ کیا، بارہا اصرار کے باوجود قبول نہ کیا اور اجازت لے کر واپس چلے آئے۔

چنداور واقعات

تعمیر بغداد کے دوران امام صاحب کو زیادہ دنوں تک سرکاری کیمپ میں رہنے اور خلیفہ منصور سے راہ ورسم قائم کرنے کا موقع ہاتھ آیا تھا، امام صاحب کا یہ تقرب ذاتی منفعت کی غرض سے نہیں تھا، بلکہ اپنے علم وفہم، ذہانت وبصیرت سے خلیفہ پر اثر انداز ہوکر اصلاح حکومت کی صورتیں نکالنا چاہتے تھے، وہ جانتے تھے کہ مطلق العنان سلاطین کو حق وصداقت، عدل وانصاف کی روش پر چلانے سے مسلمانوں کا مفاد متعلق ہوگا اور اس طریقے سے امر بالمعروف کا فریضہ بھی انجام دیا جاتا رہے گا۔ چنانچہ منصور آپ کی عبقری شخصیت، حکیمانہ بصیرت اور مجتہدانہ صلاحیت سے خوب واقف تھا۔ وہ بھی امام صاحب کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا، اکثر اپنے دربار میں بلایا کرتا اور امور سلطنت یا فقہی مسائل میں استفادہ کرتا۔

☆ ایک دن قاضی ابن ابی لیلیٰ دربار میں موجود تھے، امام صاحب بھی پہنچے، یہ مسئلہ پیش آیا، کہ سوداگر اپنے مال کے متعلق گاہک سے یہ کہہ دے، کہ جس مال کو آپ لے رہے ہیں، میں اس کے عیوب اور نقائص سے بری ہوں، اس کے بعد بھی اگر آپ لینا چاہتے ہیں، تو لے سکتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ اس کے بعد سودے میں اگر کسی قسم کا عیب یا نقص نکل آئے، تو خریدار کو واپسی کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ سوداگر اس اعلان کے ساتھ بری الذمہ ہو جاتا ہے اور ابن ابی لیلیٰ نے کہا، سودے میں جو عیب ہو جب تک ہاتھ رکھ کر سوداگر اس کو متعین نہیں کرے گا، اس وقت تک صرف لفظی براءت کافی نہیں ہے۔ دونوں میں مسئلہ پر بحث ہونے لگی۔ منصور دونوں کی گفتگو دلچسپی سے سن رہا تھا، آخر میں امام نے ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا کہ فرض کیجیے کسی شریف عورت کا ایک غلام ہے، وہ اس کو بیچنا چاہتی ہے، لیکن غلام میں یہ عیب ہے کہ اس کے عضو مخصوص پر برص کا داغ ہے فرمایئے کہ کیا آپ اس شریف عورت کو یہ حکم دیں گے کہ عیب پر ہاتھ رکھ کر خریدار کو مطلع کرے۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ نے کہا کہ ہاں اسی مقام پر اس کو ہاتھ رکھنا ہوگا، یہ سن کر ابوجعفر منصور قاضی ابن ابی لیلیٰ پر بہت برہم ہوا۔ (موفق ج ۱ ص ۱۶۷)

☆ خلیفہ منصور کے مصاحب خاص ربیع کو امام اعظم ابوحنیفہ سے درپردہ عداوت تھی، وہ آپ کو تکلیف پہنچانے کی تاک میں رہتا تھا، اتفاق سے ایک روز امام ابوحنیفہ اور ربیع دونوں خلیفہ منصور کے یہاں جمع ہو گئے، تو ربیع نے امام صاحب کے سامنے خلیفہ منصور سے کہا کہ یہ ابوحنیفہ تمہارے چچا حضرت عبداللہ بن عباس سے عداوت رکھتے ہیں اور ان کے قول کے خلاف حکم دیتے ہیں یعنی اگر کوئی شخص حلف اٹھانے کے دو تین روز بعد انشاء اللہ کہہ دے، تو آپ کے جد بزرگوار حضرت عبداللہ بن عباس کے نزدیک اس کا استثنا صحیح ہوتا ہے، ان کا ارشاد ہے ”ان الاستثناء جائز ولو كان بعد سنة “ استثنا اگر سال بھر کے بعد ہو تب بھی جائز ہے۔ اور یہ ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ یہ انشاء اللہ قول سے متصل کہنا چاہیے ورنہ بعد میں استثنا درست نہ ہوگا، امام ابوحنیفہ کا مستدل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا: ”من حلف على يمين و استثنىٰ فلاحنث عليه “ جس نے قسم کھائی اور استثنا کر لیا وہ حانث نہیں۔ تو امام ابوحنیفہ نے خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا، خلیفہ محترم! ربیع کہنا چاہتا ہے، کہ لشکر کی بیعت آپ کے ہاتھ پر درست نہیں ہوتی، خلیفہ نے پوچھا کس طرح؟ امام صاحب نے فرمایا، کہ آپ کے سامنے قسم کھا کر بیعت کر لی، پھر گھر

جا کر ''انشاءاللہ'' کہہ دیا، تو بیعت ٹوٹ گئی، اور قسم بے اثر ہوگئی، گویا ربیع یہی کہنا چاہتا ہے کہ آپ کی فوج وغیرہ آپ کے ہاتھ پر وفاداری کی قسم کھا کر جو بیعت کرتی ہے، تو ربیع چاہتا ہے کہ اس بیعت کو غیر موثر بنا دے، یعنی بیعت کرنے کے بعد بیعت کرنے والوں کو یہ اختیار دے رہا ہے کہ گھر جا کر استثنا کرلیں، تو شرعاً بیعت کی پابندی ان کے لیے ضروری نہیں، یہ تو بے حد فتنے کی بات ہے، کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کی اس تقریر سے ربیع کا خون خشک ہوگیا۔ (مدارک شریف تفسیر سورہ کہف)

☆ ابوحفص کبیر کا بیان ہے کہ خلیفہ منصور عباسی نے امام اعظم کو طلب کیا اور کہا کہ غالی شیعوں نے ہم سے اختلاف کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ جھوٹے کو جھوٹا اور سچے کو سچا کہا جائے، اس لیے آپ اہل تشیع سے گفتگو کریں، آپ نے غالی شیعہ سے فرمایا ''**کذبت و کفرت و افتریت** ''تو نے جھوٹ کہا، تو نے کفر کیا اور تو نے افترا پردازی کی، یہی الفاظ بار بار دہراتے رہے، یہاں تک کہ ابوالعباس طوسی نے کھڑے ہوکر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کا نذرانہ پیش کیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی قرابت و فضیلت بیان کی اور ان کا ذکر خیر کیا، امام صاحب نے سن کر فرمایا تمہارا قول درست ہے۔

اس واقعہ کے بعد امام صاحب اور منصور کی مدح میں یہ اشعار کہے گئے۔

ینصر مذہب النعمان الامام غدا   منصور الهاشمی البحر منصورا
فان مدحت على نصر الهدیٰ احدا   فامدح اخا الشرف القمقام منصورا
اعجب به من فريد فی سياسته   لو كان خلد هذا السعی مشكورا
قد كان شهرة المنصور حين غدا   سيفا على فرق الاعداء مقهورا
اصاب نعمان فی الاشياء اذ غلطوا   فصار من بينهم بالحق مشهورا
كان القياس خرابًا لايلاحظه   دهر فاصبح بالنعمان معمورا
ابدی شهاب قياس كان مستترا   دهرا فاصبح من عاداه مدحورا

(مناقب کردری ج۲ ص۱۸)

☆ ابوالعباس طوسی نے ایک دن برسر دربار امام صاحب سے یہ دریافت کیا کہ ابوحنیفہ بتایئے اگر امیر المومنین ہم میں سے کسی کو یہ حکم دیں کہ فلاں کی گردن مار دو اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس شخص کا کیا قصور ہے تو کیا ہمارے لیے اس کی گردن مارنا جائز ہوگا؟ برجستہ امام نے فرمایا، کہ ابوالعباس میں تم سے پوچھتا ہوں، کہ امیر المومنین صحیح حکم دیتے ہیں یا غلط؟ طوسی نے کہا، کہ امیر المومنین غلط حکم کیوں دینے لگے؟ امام نے فرمایا، تو صحیح حکم نافذ کرنے میں تردد کی گنجائش کیا ہے، طوسی امام سے یہ جواب پا کر کھسیانا ہوگیا۔

☆ امام صاحب کو منصور کے مزاج میں بڑا دخل حاصل ہوگیا تھا اور وہ آپ کی قابلیت اور علمی عبقریت کا تذکرہ

عوام وخواص کے سامنے کیا کرتا تھا، دنیا کا دستور ہے، کہ لوگ علمی شان ووقار رکھنے والوں سے بغض وحسد کا برتاؤ کرنے لگتے ہیں، یہ حال منصور کے بعض درباریوں کا بھی تھا، انہیں امام کی مقبولیت یک چشم نہ بھاتی تھی اور وہ امام کو نیچا دکھانے کی رکیک حرکتیں کیا کرتے تھے لیکن امام صاحب کی شخصیت ان کے حملوں سے ہمیشہ محفوظ رہی اور آپ کی عزت وتوقیر بڑھتی ہی چلی گئی۔

قاضی ابو یوسف کا بیان ہے کہ منصور کا ایک بہت منہ چڑھا غلام تھا، منصور اس کو بہت مانتا تھا، اس کے دل میں بھی امام صاحب کی طرف سے حسد پیدا ہوا، جب منصور امام صاحب کی تعریف کرتا، تو وہ منہ بگاڑ لیتا اور جھوٹی سچی باتیں ادھر ادھر کی ان کی طرف منسوب کرتا، اپنے اس جاہل غلام کو منصور منع بھی کیا کرتا تھا، کہ تجھے ان سے کیا سروکار ہے، لیکن وہ اتنا شوخ تھا، کہ بار بار ممانعت کے باوجود امام کی بدگوئیوں سے باز نہیں آتا، منصور نے بہت سختی سے اسے ڈانٹا، منع کیا، تو اس نے کہا، کہ آپ ان کی بڑی تعریف کرتے ہیں، میں جاہل آدمی ہوں میرے سوالوں کا جواب دے دیں، تو میں جانوں، منصور نے کہا کہ، تو بھی حوصلہ نکال لے، دھمکایا بھی، اگر ابو حنیفہ نے تیری باتوں کا جواب دے دیا، تو پھر تیری خیر نہیں، مگر اس جاہل کو اپنے سوالوں پر بڑا ناز تھا، خلیفہ سے اجازت مل ہی چکی تھی، امام صاحب منصور کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، غلام نے خطاب کر کے کہا، آپ ہر بات کا جواب دیتے ہیں میرے سوالوں کو حل کیجیے، تو میں جانوں امام صاحب نے کہا، پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ اس نے دریافت کیا، دنیا کے ٹھیک بیچ میں کونسی جگہ ہے؟ اس جہالت کا جواب کیا ہو سکتا تھا، امام نے فرمایا، کہ وہی جگہ جہاں تو بیٹھا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی تردید وہ کیا کر سکتا تھا، چپ ہو گیا اور دوسرا سوال پیش کیا، کہ خدا کی خلقت میں زیادہ تعداد سر والوں کی ہے یا پیر والوں کی؟ امام نے اسی انداز میں فرمایا پاؤں والوں کی، اس نے کہا کہ دنیا میں نروں کی تعداد زیادہ ہے یا مادوں کی؟ امام نے فرمایا کہ نر بھی بہت سے ہیں مادہ کی کمی نہیں اچھا تو بتا کس میں ہے؟ چوں کہ وہ خصی غلام تھا جھینپ گیا، کہتے ہیں کہ منصور نے غلام کو پٹوایا اور کہا کہ آئندہ ان کے متعلق اپنے اس برے رویے سے باز آ جا۔ (موفق ج۲ص۱۶۱)

ساحل دجلہ پر شاہی کیمپ میں اقامت کے دوران امام اعظم کو خلیفہ منصور کے ساتھ راہ ورسم اور تعلقات میں وسعت پیدا کرنے کا موقع مل گیا تھا، خلیفہ بار بار آپ کو طلب کرتا اور مصالح ملکی میں مشوروں کا طالب ہوتا۔ ان ملاقاتوں میں امام کو اپنی خداداد ذہانت، اپنے کردار، اپنی گفتار، اپنی وسعت علمی سے متاثر کرنے کا کھلا میدان مل گیا تھا۔ خالی اوقات میں بھی منصور امام صاحب کو بلاتا اور آپ کی علمیت وحذاقت سے مستفید ہوتا، امام صاحب کے تجربات اور الجھے ہوئے مسائل میں ان کی رہنمائی سے وہ اس درجہ متاثر تھا، کہ وہ دوسرے درباریوں پر امام صاحب کو فوقیت دینے لگا تھا۔ معمر بن حسن ہروی کی روایت میں ہے:

یری من المنصور من تفضیله وتقدیمه واستشاربه فیما ینوبه وینوب رعیته وقضائه وحکامه۔

یعنی دیکھا جا رہا تھا، کہ منصور امام کو دوسروں پر ترجیح دے رہا ہے، ہر معاملہ میں ان ہی کو پیش پیش رکھتا ہے، ان

ہی سے مشورہ لیتا ہے ان معاملات میں جو ذاتی طور پر اسی سے تعلق رکھتے تھے یا اس کی رعایا سے یا اس کے قاضیوں اور حاکموں سے تعلق رکھتے تھے۔ (موفق ج ۱ ص ۴۴)

امام اعظم کو منصور کے یہاں اس قدر رسوخ حاصل ہو چکا تھا، کہ اس کے ذاتی اور گھریلو معاملات میں بھی امام صاحب فیصل اور حکم کی حیثیت سے طلب کیے جاتے تھے۔

☆ایک مرتبہ خلیفہ منصور اور اس کی بیوی حرہ خاتون کے درمیان کچھ شکر رنجی ہو گئی، خاتون کو شکایت تھی، کہ خلیفہ عدل نہیں کرتا، منصور نے بیوی سے کہا کسی کو منصف قرار دو اس نے امام صاحب کا نام لیا اسی وقت طلبی کا فرمان گیا۔ خاتون پردہ کے قریب بیٹھ گئی کہ امام صاحب جو فیصلہ کریں، خود اپنے کانوں سے سنے منصور نے پوچھا شرع کی رو سے مرد کتنے نکاح کر سکتا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا چار بیویاں رکھ سکتا ہے منصور خاتون کی طرف مخاطب ہوا کہ سنتی ہو، پردہ سے آواز آئی کہ ہاں! سنا، جس سے امام صاحب منصور کے سوال کی نوعیت سمجھ گئے اور اس کے بے موقع طرز استدلال پر منصور کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

> **فمن لم يعدل او خاف ان لايعدل فينبغي ان لا يجاوز الواحدة قال الله تعالىٰ فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّاتَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ۔**
>
> لیکن جو انصاف سے کام نہ لے یا جسے اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر پائے گا تو اس کو چاہیے کہ ایک عورت سے آگے نہ بڑھے قرآن حکیم میں ہے کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کرو گے تو پھر ایک ہی عورت سے نکاح کرو۔

امام صاحب نے شرعی نقطہ نظر سے جانبین کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر اپنا مذکورہ فیصلہ سنایا اور گھر تشریف لے آئے تو ایک خادم پچاس ہزار درہم کے توڑے لے کر حاضر خدمت ہوا، کہ یہ حرہ خاتون (منصور کی بیوی) نے نذر بھیجی ہے اور کہا ہے کہ آپ کی کنیز آپ کو سلام کہتی ہے اور آپ کی حق گوئی کی نہایت ہی شکر گزار ہے۔ حضرت امام اعظم نے روپے واپس کر دیے اور کہلا بھیجا:

> **ما اردت هذا الكلام تقربا الى احد ولا التماسا للبر من مخلوق،**
>
> میرے اس فقہی فیصلہ کا مقصد کسی کا تقرب حاصل کرنا اور مخلوق سے انعام و صلہ پانا نہیں تھا۔

(کردری ج ۱ ص ۲۳۱)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب خوشامدی درباریوں کی طرح خلیفہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے قائل نہ تھے، وہ ہر سطح پر حق و صداقت کی فرمانروائی چاہتے تھے۔ چنانچہ بہت سارے امور ایسے بھی پیش آئے، جن میں آپ نے خلیفہ کی مرضی اور منشا کے خلاف حکم شرع بیان کیا، جس کا مقصد یہ تھا، کہ مطلق العنان فرمانروا کو دین و شریعت کے حدود کا پابند کیا جائے، تا کہ وہ علما سے شریعت کا حکم معلوم کرے، نہ یہ کہ علما سے اپنے مزعومات اور غلط فیصلوں کی شرعی تاویل اور تائید حاصل کرے۔

امام صاحب نے خلیفہ کا کوئی منصب اور عہدہ قبول نہیں کیا تھا، ورنہ وہ بہت سے معاملات میں اس کی رضا کے مطابق فیصلے کرنے پر مجبور ہوتے، لیکن وہ اپنے علم وتقویٰ کو سرکاری منصب کے لیے رہن رکھنے کے قائل نہ تھے، اسی لیے انہوں نے اموی دور ہو یا عباسی دور کبھی بھی کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا۔ وہ آزادرہ کر امراء وخلفا کی اصلاح اور شرعی احکام کا نفاذ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ منصور کے یہاں بھی جب موقع ملا، تو آپ نے شرعی نقطہ نظر کے اظہار کا وطیرہ اختیار کیا اور منصور بھی آپ کے جرأت مندانہ شرعی فیصلوں کی قدر پر مجبور تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کی علمی ودینی خدمات کے اعتراف میں دادودہش کی سلسلہ جنبانی کی اور اپنا ممنونِ کرم بنانا چاہا، اس غرض سے دس ہزار درہم کا عطیہ امام کے نام منظور کیا۔ منصور نے یہ رقم امام صاحب کو پیش کرتے ہوئے کہا، میری خواہش ہے کہ آپ اس رقم کو قبول فرمالیں، یہ پہلا موقع تھا، جب امام کو اس راہ سے مطیع بنانے اور حکومت کی خواہش کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی، لیکن امام کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے مال ودولت کی ایسی فراوانی بخشی تھی، کہ ان کی نظر میں دس ہزار کی کیا بات ہے، بڑی سے بڑی رقموں کا قبول کرنا تو درکنار اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ درباری مناصب اور سلطانی عطیے حق گوئی وبے باکی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہیں، لیکن معاملہ یہاں پر یہ تھا، کہ وقت کا سب سے بڑا فرمانروا عطیہ قبول کرنے پر اصرار کر رہا تھا اور نہ قبول کرنے کی صورت میں ابتلائے عظیم کا اندیشہ بھی تھا، اس لیے امام صاحب تذبذب کا شکار ہو گئے اور انہوں نے اس سلسلے میں مہلت طلب کی، دربار سے نکل کر اپنے دوست خارجہ بن مصعب کے پاس آئے اور پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

هذا رجل ان رددتها عليه غضب وان قبلتها دخل علي في ديني مااكرهه ۔ (موفق ج۱ص۲۱۱)

اگر اس رقم کو واپس کرتا ہوں تو یہ شخص (خلیفہ) ناراض ہو جائے گا اور قبول کرتا ہوں، تو میرے دین میں ایسی چیز کو داخل کردے گا جو مجھے کسی طرح گوارہ نہیں۔

خارجہ نہایت زیرک اور منصور کی نفسیات سے واقف شخص تھے، انہوں نے امام صاحب سے کہا:

ان هذا المال عظيم في عينه فاذا دعيت يقبضها فقل لم يكن هذا املى من امير المومنين ۔

یہ مال بادشاہ کی نظر میں بہت عظیم ہے، جب آپ کو اسے لینے کے لیے بلایا جائے، تو آپ کہہ دیں کہ مجھے امیر المومنین سے اس قسم کی امید نہیں تھی یعنی میں آپ کی بارگاہ میں حصول زر کے لیے نہیں آیا ہوں۔ (ایضا)

جب امام کو عطیہ قبول کرنے کے لیے بلایا گیا، تو خارجہ کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے امام صاحب نے مذکورہ بالا فقرہ دہرایا، منصور نے سن کر حکم دیا کہ یہ رقم خزانے میں داخل کردی جائے۔

ایک دوسری روایت یحییٰ بن نصر سے ہے:

كان ابو حنيفة من احسن الناس خلقا واسخاهم نفسا على مايملك واطولهم ليلا وازهدهم في الدنيا ولقد امر له اميرا لمومنين بمائتى دينار وجارية فلم يقبلها فقال له امير

المومنين لا تقل للناس انك لم تقبلها ولم ياخذ ابو حنيفة من سلطان قط درهما ولا دينارا ۔

(موفق ج ا ص ۲۳۱)

امام ابوحنیفہ لوگوں میں اچھے اخلاق کے حامل اور جو اشیا ان کے قبضہ و تصرف میں تھیں، ان کی عطا و بخشش میں سب سے زیادہ سخی تھے۔ امیر المومنین منصور نے دوسو دینار اور ایک کنیز آپ کو عطا کرنے کا حکم دیا، امام نے اسے قبول نہیں کیا۔ امیر المومنین نے ان سے کہا، تم لوگوں سے یہ نہ کہنا کہ تم نے خلیفہ کے عطیہ کو قبول نہیں کیا۔ امام ابوحنیفہ نے اپنا شعار حیات بنالیا تھا، کہ وہ کسی کا عطیہ قبول نہ کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے پوری زندگی کسی خلیفہ یا امیر کا عطیہ کبھی قبول نہیں کیا۔

منصور ممنون کرم بنا کر امام کو اپنی منشا کے مطابق ڈھالنا چاہتا تھا اور امام مدارات سے کام لے کر منصور کو صراط مستقیم پر لانے کی جدوجہد فرما رہے تھے۔ نوازشات شاہی اس لیے ہوا کرتی تھیں کہ امام کو کسی طرح اپنے مقصد کا بنالیا جائے اور امام ہر پیش کش کو حیلہ حسن سے رد کر دیا کرتے تھے، جس کا احساس منصور کو بھی تھا۔ چنانچہ امام صاحب کے بعد وہ کہا کرتا تھا۔

خدعنا ابو حنيفه (موفق ج ا ص ۱۹۴) ابوحنیفہ ہمیں دھوکہ دیتے رہے۔

☆ اہل موصل نے خلیفہ منصور سے عہد شکنی کی تھی، اس نے ان سے معاہدہ کر رکھا تھا، کہ عہد شکنی کی صورت میں وہ مباح الدم ہو جائیں گے۔ منصور نے فقہا کو جمع کیا، امام ابوحنیفہ بھی تشریف فرما تھے، منصور بولا کہ کیا یہ درست نہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”**المومنون على شروطهم**“ مومن اپنی شرطوں پر ہیں۔ اہل موصل نے عدم خروج کا وعدہ کیا تھا اور اب انہوں نے میرے عامل کے خلاف بغاوت کی ہے، لہٰذا ان کا خون حلال ہے۔ ایک شخص بولا، آپ کے ہاتھ ان پر کھلے ہیں اور آپ کا قول ان کے بارے میں قابل تسلیم ہے، اگر معاف کر دیں، تو آپ اس کے اہل ہیں اور اگر سزا دیں، تو وہ ان کے کیے کی پاداش ہوگی۔ منصور امام ابوحنیفہ سے مخاطب ہو کر بولا، آپ کی کیا رائے ہے؟ امام صاحب نے فرمایا، اہل موصل نے جو شرط لگائی، وہ ان کے بس کا روگ نہیں اور جو شرط آپ نے ٹھہرائی، وہ آپ کے حدود اختیار میں نہیں، کیوں کہ مومن تین صورتوں میں (ارتداد، زنا اور قتل) مباح الدم ہوتا ہے، لہٰذا آپ کا ان پر گرفت کرنا بالکل ناروا ہوگا۔ خدائے تعالیٰ کی شرط پوری کی جانے کے زیادہ لائق ہے۔ جناب! فرمائیے، کوئی عورت منکوحہ یا لونڈی ہونے کے بغیر اپنے جسم کو کسی شخص کے لیے مباح کر دے، تو کیا اس سے مجامعت کرنا درست ہوگا؟ منصور نے فقہا کو چلے جانے کا حکم دیا۔ پھر خلوت میں امام صاحب سے عرض کیا:

يا شيخ القول ماقلت انصرف الى بلادك ولا تفت الناس بما هو شين على امامك فتبسط ايدى الخوارج على امامك ۔ (كردرى ج ۲ ص ۱۷)

اے شیخ! فتویٰ وہی درست ہے، جو آپ نے دیا، اپنے وطن تشریف لے جایئے اور ایسا فتویٰ نہ دیجیے جس سے خلیفہ کی مذمت کا پہلو نکلتا ہو کیوں کہ اس سے باغیوں کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔

منصور جب امام صاحب کے متعلق اپنے منصوبے میں ناکام ہوگیا، تو سوچا، کہ امام صاحب کو یہاں سے رخصت کردینا ہی آمرانہ حکومت کے مفاد میں ہوگا، لیکن منصور امام صاحب کی علمیت، ذہانت اور طباعی کا گرویدہ ہو چکا تھا، اس لیے جب امام رخصت ہونے لگے، تو کہا ''کبھی کبھی آپ ہمارے یہاں آیا جایا کیجیے''۔ کہتے ہیں، امام نے جواباً فرمایا:

لا لانك ان قربتني فتنتني وان اقصيتني اخزيتني وليس عندك ما ارجوك وليس عندي ما اخافك عليه وانما يغشاك من يغشاك يستغني بك عمن سواك وانا غني بمن اغناك فلم اغشاك فيمن يغشاك ۔(کردری ج۲ ص ۲۹)

نہیں، تیرا قرب فتنے سے خالی نہیں اور قرب کے بعد دوری رنج کا سبب ہوگی اور تیرے پاس وہ چیز نہیں ہے، جس کی مجھے امید ہے اور نہ میرے پاس وہ چیز ہے، جس کی وجہ سے میں تجھ سے ڈروں، دنیا کی حکومت ودولت نے تجھے جکڑ رکھا ہے، جس کی بنا پر دوسروں سے اس نے تجھے لاپروا کردیا ہے اور میں ان چیزوں سے بے پرواہوں جن میں تو جکڑا ہوا ہے۔

ایک روایت میں ہے۔ ابوجعفر منصور عباسی خلیفہ نے جب امام اعظم ابوحنیفہ کی خدمت میں مسلسل گراں قدر تحائف وہدایا اور نذرانے پیش کیے اور امام صاحب نے بڑی بے نیازی سے ٹھکرا دیے، تو ابوجعفر منصور نے امام صاحب سے گاہے گاہے دربار میں آنے اور ملاقات کا موقع بخشنے کی درخواست کی، جواب میں امام ابوحنیفہ نے اس کے دربار میں بھی وہی اشعار دہرائے جو والی کوفہ عیسیٰ بن موسیٰ کے دربار میں کہے تھے۔

کرة خبز وكعب ماء
وفور ثوب مع السلامه
خير من العيش في نعيم
يكون من بعده الملامه

کھانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا اور پینے کے لیے پانی کا پیالا اور تن ڈھانپنے کے لیے موٹا جھوٹا کپڑا مل جائے اور ایمان کی سلامتی اور عافیت حاصل رہے، تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے، کہ عیش وعشرت میں زندگی گزاری جائے اور بعد اس کے ملامت وندامت ہو۔ (کردری ج۲ ص ۳۰)

حسن بن قحطبہ کی توبہ

ائمہ جور کی شکست وریخت میں امام صاحب کے عملی اقدامات میں سے ایک اہم اقدام عباسیوں کے سپہ سالار اعظم حسن بن قحطبہ کو ابوجعفر منصور کی حمایت ونصرت کے لیے جنگ سے باز رکھنا تھا، یہ حسن اسی قبیلہ طے کے جنگجو سردار قحطبہ کا بیٹا تھا، جس نے اپنی جنگی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اموی حکومت کا خاتمہ کردیا اور عباسیوں کو سریر آرائے خلافت کردیا، ابومسلم

خراسانی عباسی تحریک کا اگر دماغ تھا تو قحطبہ اس تحریک کا دست و بازو، پے در پے کامیابیوں کے بعد جب قحطبہ ابن ہبیرہ کے مقابلے میں آیا، مقام واسط پر امویوں سے جنگ کرتے ہوئے زخمی ہوا اور اپنی جان عباسی ایوان اقتدار کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں قربان کر دی۔ قحطبہ کی موت کے بعد اس کا بیٹا حسن عباسی جیوش کا کمانڈر جنرل منتخب ہوا اور اس نے اپنے باپ کی طرح پوری وفاداری کا ثبوت فراہم کیا، اسی کے ہاتھوں اموی خلافت ختم ہوئی، خود سفاح اور اس کے بعد منصور حسن بن قحطبہ کی فوجی صلاحیت، دلیری و قوت کے معترف رہے اور وہ مسلسل تقریباً پندرہ سال تک عباسی افواج کا سپہ سالار اعظم رہا، اس دوران اپنی عسکری تنظیم اور قوت حرب و ضرب سے ہر معرکہ میں کامیابی حاصل کی۔ عباسیوں کے خلاف اٹھنے والی ہر بغاوت و شورش میں اس نے نمایاں کارنامے انجام دیے، اس سلسلے میں اس کی تلوار مسلمانوں کا بے دریغ خون بہانے سے کبھی نہ رکی۔ یہی وجہ ہے کہ عباسی خلفا کا اعتماد ہمیشہ اس پر قائم رہا اور انہوں نے اپنی نوازشوں سے خوب سرفراز کیا۔ عباسی افواج کا معتمد کمانڈر ان چیف جب امام صاحب کی بارگاہ میں پہنچتا ہے، تو اپنے سابقہ جرموں سے تائب ہو کر ہمیشہ کے لیے دنیا کی سب سے بڑی حکومت کی فوج کی اعلیٰ ترین سربراہی کو ٹھوکر مار دیتا ہے۔ اس کی تفصیلات کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہیں۔

نفس ذکیہ کے خروج ۱۴۵ھ سے ایک سال قبل وہ امام صاحب کی بارگاہ میں خلیفہ منصور کی طرف سے دس ہزار کی رقم بطور نذر لے کر حاضر ہوا، لیکن امام اس نذرانے کو دیکھ کر بے حد پریشان ہوئے، حسن نے امام صاحب کی اس پریشانی کو حیرت کی نظر سے دیکھا، کیوں کہ لوگ شاہی تحائف سے خوش ہوتے ہیں اور امام پریشان خاطر ہو رہے تھے، رقم کو لینے سے سراسر انکار کر دیا۔ اس طرح وہ امام کی عظمت کردار سے پہلی بار متاثر ہوا اور امام صاحب کے پاس آنے جانے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب محمد بن عبداللہ اور ان کے بھائی ابراہیم کی تحریک حجاز، کوفہ، بصرہ میں بال و پر پھیلا رہی تھی اور عباسی حکومت کے خلاف یہ تحریک منظم ہو رہی تھی۔ براہ راست امام اعظم اس تحریک میں شریک تھے اور ظالم عباسی حکومت کا تختہ الٹ کر عدل و انصاف کی حکومت کا قیام چاہتے تھے۔ اسی دوران حسن بن قحطبہ جس کی تلوار سے مسلمانوں کا خون ٹپک رہا تھا اور جس نے ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون محض دولت عباسیہ کے استحکام کے لیے بہایا تھا، امام صاحب کی بے لوث علمی و دینی شخصیت سے متاثر ہو کر اپنی معصیت شعار زندگی سے تائب ہونے کے لیے حاضر ہوا اور اس نے کہا:

انا ممن تعلم وعملي لايخفى عليك فهل لي من توبة .

میرے بارے میں آپ کو خوب معلوم ہے، میرا کردار آپ پر پوشیدہ نہیں، کیا میرے لیے توبہ کی کوئی سبیل ہے؟

امام اعظم نے جواباً ارشاد فرمایا ''نعم'' ہاں! حسن بن قحطبہ نے عرض کی، اس کی کیا صورت ہے؟ امام اعظم نے فرمایا:

ان يعلم الله عزوجل نيتك نية صادقة انك نادم على ماقلت واخذت وانك اذا خيرت بين ان تقتل مسلما او تقتل تختار قتلك على قتله وتجعل الله عزوجل على نفسك عهدا ان لاتعود الى شئ مماكنت فيه فان وفيت فهي توبتك .

اگر تم واقعی خدا کے سامنے اپنی نیت کو درست کرلو اور اپنے گزشتہ کرتوتوں پر ندامت کے جذبات کو اس حد تک ابھارو کہ تم پر یہ حال طاری ہو جائے کہ ان دو باتوں میں سے کسی ایک کا اگر تمہیں اختیار دیا جائے یعنی کہا جائے کہ تم کسی مسلمان کو قتل کرو یا خود قتل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، تو اپنے آپ کو قتل کرانے پر آمادہ ہو جاؤ اور یہ عہد کرو کہ اب تک تم جو کچھ بھی کرتے رہے ہو، دوبارہ نہیں کروگے اگر تم نے اسے پورا کیا، تو یہی تمہاری توبہ ہے۔

امام کے الفاظ کو حسن غور سے سنتا رہا اور جواب میں بغیر کسی تردد اور پس وپیش کے اس نے کہا:

فانی قد فعلت ذالك وعاهدت الله تعالیٰ ان لاعود فی شئ مما کنت فیه من قتل المسلمین ۔

یقیناً میں ایسا ہی کروں گا، میں خدا کی بارگاہ میں عہد کرتا ہوں کہ اب تک جن گناہوں (یعنی مسلمانوں کے قتل) کا میں ارتکاب کرتا رہا، دوبارہ ان کی طرف نہیں لوٹوں گا۔

حسن کی یہ توبہ توبۃ النصوح تھی، اپنے عہد پر پوری عمر قائم رہا اور اس نے سخت امتحان میں بھی ثابت قدمی دکھائی، ۱۴۵ھ میں جب زور وشور کے ساتھ نفس ذکیہ نے مدینہ میں اور ابراہیم نے بصرہ میں خروج کیا، تو منصور نے اپنے پرانے وفادار کمانڈر حسن بن قحطبہ کو طلب کیا، حسن دربار کی حاضری سے پہلے امام صاحب کی خدمت میں پہنچا، واقعہ سے مطلع کیا۔ امام نے فرمایا:

قد جاءك اوان توبتك اما انت فقد عاهدت الله ماقد علمت فان وفیت له ارجو ان یتوب الله علیك وان عدت اخذت بما مضیٰ ایامك ومابقی ۔

حسن تمہاری توبہ کے امتحان کا وقت آ گیا، اگر تم خدا سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہو تو مجھے امید ہے کہ خدا تمہاری توبہ قبول فرمائے گا اور اگر اپنے عہد پر قائم نہیں رہتے ہو تو جو کچھ تم نے اب تک کیا ہے اور آئندہ کروگے، اس کی سزا تمہیں ملے گی۔

یہ سن کر حسن نے کہا: "**اللهم انی افی بما عاهدت بك**" میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ آپ سے جو عہد میں نے کیا اسے پورا کروں گا۔

اس کے بعد حسن بن قحطبہ منصور کے دربار میں پہنچا اور بیماری کا عذر کر کے مستعفی ہونے کی خواہش ظاہر کی، لیکن منصور نے اسے قبول نہیں کیا اور جب مقابلہ پر جانے کے لیے اصرار کیا، تو حسن بن قحطبہ نے کہا:

یا امیر المومنین انی لست بسائر الی هذا الوجه ان کان لله طاعةٌ فیمن قتلت فی سلطانك فلی منه اوفر الحظ وان کان معصیة حسبی ماقتلت ۔

> اے امیر المومنین! میں اس مہم کی شرکت سے معذور ہوں، اب تک جن لوگوں کو آپ کی حکومت میں میں قتل کر چکا ہوں، اگر یہ خدا کی اطاعت کے لیے میں نے کیا، تو اس راہ میں، بہت کچھ کما چکا اور اگر یہ معصیت ہے، تو گناہ اور نافرمانی کا یہی ذخیرہ میرے لیے کافی ہے۔

یہ سن کر منصور غضب ناک ہوا اور کہا، کس نے میرے وفادار موروثی جرنل کو بہکا دیا۔ دربار میں حسن کا بھائی حمید موجود تھا، اس نے کہا ہم ایک سال سے حسن کے اندر یہ تغیر محسوس کر رہے ہیں اور ہمیں اندیشہ تھا کہ غیروں سے مل گیا ہے۔

(موفق ج ۲ ص ۱۸۳-۱۸۴)

حسن کے انکار کے بعد منصور نے حمید بن قحطبہ کو یہ خدمت سونپی اور اسے عیسیٰ بن موسیٰ کی سرکردگی میں مدینہ پر چڑھائی کے لیے بھیجا، چنانچہ نفس ذکیہ کے مقابلے میں عباسی فوج کی کمان حمید نے کی۔ شوال ۱۴۵ھ میں جنگ ہوئی حمید نے نفس ذکیہ کے سینے میں نیزہ مارا، سر قلم کر کے عیسیٰ کی خدمت میں بھیجا اور عیسیٰ نے منصور کے پاس کوفہ بھیج دیا۔

مدینہ کی مہم سے فارغ ہو کر ابراہیم بن عبداللہ کے خلاف بھی حمید عباسی فوج کا کمانڈر بنا "باخمرا" کے میدان میں (جو کوفہ سے اڑتالیس میل کے فاصلے پر ہے) حمید اور ابراہیم کی فوج میں لڑائی ہوئی، ابتدا میں حمید کو شکست ہوئی اور وہ بھاگنے لگا، لیکن اس دوران ابراہیم شہید کر ڈالے گئے اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔

امام اعظم نے نفس ذکیہ کی تحریک کا عملاً ساتھ دیا اور اس حمایت کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ انہوں نے عباسیوں کے سب سے معتمد، وفادار سپہ سالار حسن بن قحطبہ کو ابراہیم اور نفس ذکیہ کے مقابلہ میں صف آرا ہونے سے روک دیا، جو بلاشبہ امام اعظم کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

حسن کا منصور کے حکم کو برملا مسترد کر دینا اور جنگ کی شرکت سے صاف صاف انکار کر دینا، سلطان جابر کے روبرو معمولی بات نہ تھی، منصور سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس موروثی وفادار کو کس نے بہکا دیا، چنانچہ اس نے اپنے اعیان سلطنت کے سامنے اس مسئلے کو رکھا اور پوچھا:

> من هذا الذی یفسد علینا هذاالرجل .
>
> کون ہے جو اس آدمی (حسن) کو ہم سے بگاڑ رہا ہے؟

تو درباریوں نے یہ خبر دی "انه یدخل علی ابی حنیفة" اس کی آمد و رفت ابوحنیفہ کے پاس ہے۔ یعنی اس کا یہ تغیر ابوحنیفہ کی دین ہے۔ (ایضا)

* * *

نفس ذکیہ کا خروج اور امام اعظم کی حمایت

محمد بن عبداللہ بن حسن بن علی بن ابی طالب خانوادہ سادات حسنی کے چشم و چراغ تھے، ان کی ذات میں حسن ظاہری اور کمال باطنی کے جلوے بچپن ہی سے ظہور پذیر تھے۔ انہیں خصوصیات کی وجہ سے لوگ آپ کو نفس ذکیہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ امویوں کے آخری دور میں ہی سادات نے انقلاب حکومت کی در پردہ تحریک چلائی اور اس کام کے لیے سیاسی حکمت عملی بروئے کار لائی گئی۔ عباسی تحریک کے ساتھ ہی ساتھ اس تحریک نے بھی بال و پر پھیلائے، لیکن باضابطہ اس تحریک کا ظہور نہیں ہوا تھا، کہ عباسیوں نے امویوں کا قلع قمع کر دیا اور زمام اقتدار بنو عباس کے ہاتھوں میں آ گئی۔

عباسی تحریک اس بنا پر کامیاب ہوئی تھی، کہ انہوں نے مسلمانوں سے عہد کیا تھا، کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار ہیں، حکومت ملنے پر ہم کتاب و سنت کی روشنی میں عمل کریں گے، حدود اللہ کے قیام کی کوشش کریں گے، ربیع الثانی ۱۳۲ھ میں جب ابو العباس سفاح کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی، تو اس نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا:

انی لارجوان لایاتیکم الجور من حیث اتاکم الخیر ولا الفساد من حیث جائکم الصلاح۔

میں یہ امید رکھتا ہوں، کہ جس خاندان سے تم کو خیر ملی تھی، اس سے ظلم و ستم اور جہاں سے تم کو صلاح ملی تھی، وہاں سے فساد تم نہ پاؤ گے۔

سفاح کے بعد اس کے چچا نے تقریر کرتے ہوئے اہل کوفہ کو یقین دلایا:

ایها الناس انا واللہ ماخرجنا فی طلب هذاالامر لنکثر لجینا ولا عقبانا ولانحفر نهرا ولا نبنی قصرا وانما اخرجنا الانفة من اشرارهم حقنا والغضب لبنی عمنا وما کوننا من امورکم ومن شؤنکم ولقد کانت امورکم ترمضنا ونحن علی فرشناوشید علینا سیرة بنی امیة فیکم وخرقهم بکم واستدلالهم لکم واستشارهم بفیئکم وصدقاتکم ومفاتکم علیکم لکم ذمة اللہ تبارک للہ وذمة رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وذمة العباس رحمه اللہ ان نحکم فیکم بما انزل اللہ ونعمل فیکم بکتاب اللہ ونسیر فی العامة منکم والخاصة

> سيرة رسو ل الله صلى عليه وسلم .
> ہم اس لیے نہیں نکلے ہیں، کہ اپنے لیے سیم وزر جمع کریں یا محلات بنائیں اور ان میں نہریں کھود کرلائیں، بلکہ ہمیں جس چیز نے نکالا ہے، وہ یہ ہے، کہ ہمارا حق چھین لیا گیا تھا اور ہمارے بنی عم (آل ابی طالب) پر ظلم کیا جارہا تھا اور بنوامیہ تمہارے درمیان بُرے طریقوں پر چل رہے تھے۔ انہوں نے تم کو ذلیل وخوار کرر کھا تھا اور بیت المال میں بے جا تصرف کرر ہے تھے۔ اب ہم تمہارے درمیان اللہ کی کتاب رسول اللہ کی سیرت کے مطابق عمل کریں گے۔

خلیفہ سفاح اور عباسی زعما کے بلند بانگ اصلاحی دعووں کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ دنوں کے لیے حسنی تحریک کی رفتار روک لی گئی، وہ حالات کا جائزہ لے رہے تھے، کہ ظلم وعدوان کے خلاف کامیاب ہونے والی عباسی تحریک عدل وانصاف کی بنیادوں پر حکومت قائم کرتی ہے یا امویوں کی طرح قیصر وکسریٰ کی روش پر گامزن ہوتی ہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد عباسیوں کے چہرے سے نقاب اٹھنے لگی اور واضح ہوگیا کہ محض حصول اقتدار کے لیے عباسی تحریک نے عدل وانصاف اور اصلاح حکومت کی عبا پہن رکھی تھی، جب اقتدار حاصل ہوگیا، تو وہ کھلے بندوں امویوں کی راہ پر چل پڑے ظلم وتعدی اور آمریت کو اپنا شعار بنالیا، اس راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے بہیمانہ سفاکیوں سے بھی دریغ نہ کیا جاتا۔

دمشق کی فتح کے بعد عباسی فوج نے وہاں قتل عام کیا۔ ۵۰/ ہزار بے گناہوں کو تہہ تیغ کیا، ستر دنوں تک جامع بنی امیہ گھوڑوں کا اصطبل بنی رہی، تمام اموی خلفا کی قبریں کھود کر ہڈیاں جلادی گئیں۔ موصل میں بغاوت ہوئی، تو سفاح نے اپنے بھائی یحییٰ کو بھیجا، اس نے اعلان کیا، جولوگ شہر کی جامع مسجد میں جمع ہو جائیں گے انہیں امان ہے، گیارہ ہزار کی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے، توان پناہ گزینوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا، پھر ان مقتولین کے بچوں اور بیواؤں کو بھی قتل کر ڈالا گیا، مسلسل تین دن تک قتل وغارت گری کا بازار گرم رہا۔ یزید بن عمر بن ہبیرہ کو سفاح نے امان نامہ لکھا تھا، لیکن بعد میں اسے قتل کرا ڈالا۔ آل علی سے قرابت کے باوجود عناد وحسد کا وہی رویہ باقی رہا، جو امویوں نے قائم کیا تھا، چنانچہ محمد نفس ذکیہ کی تحریک عباسی حکومت کے خلاف ۱۴۵ھ میں اس طرح ظہور پذیر ہوئی، کہ تحریک کا مرکز مدینہ منورہ کو بنایا گیا اور وہاں سے اسلامی بلاد وامصار میں نفس ذکیہ کی بیعت اور انقلاب حکومت کے لیے فضا ساز گار کرنے کی غرض سے معتمد نمائندے بھیجے گئے۔ المسعودی نے مختلف صوبہ جات میں بھیجے گئے افراد کی یہ فہرست تحریر کی ہے، علی بن محمد نفس ذکیہ مصر، عبداللہ بن محمد نفس ذکیہ خراسان، حسن بن محمد نفس ذکیہ یمن، موسیٰ بن عبداللہ جزیرہ (موصل وغیرہ) یحییٰ بن عبداللہ رے اور طبرستان، ادریس بن عبداللہ افریقہ، مراکش وغیرہ اور ابراہیم بن عبداللہ کو بصرہ بھیجا گیا۔

ان تمام علاقوں میں اس تحریک کو پذیرائی حاصل ہوئی، چنانچہ محمد بن عبداللہ نفس ذکیہ نے مدینہ میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ منصور عباسی ان دنوں بغداد کی تعمیر میں مصروف تھا، جب نفس ذکیہ کے خروج کا اسے علم ہوا، تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر

بدحواسی کے عالم میں کوفہ پہنچا۔ اس کی پریشانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے، کہ منصور نے ولی عہد حکومت عیسیٰ بن موسیٰ کو بلا کر کہا، بھائی! جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے غرض صرف میرا اور تمہارا خاتمہ کرنا ہے، اب دو ہی صورت ہے، مدینہ تم جاؤ اور میں کوفہ میں رہوں یا مدینہ میں فوج لے کر جاتا ہوں اور کوفہ کی نگرانی تم کرو۔ (کامل ج۵ص۲۰۲)

منصور کوفہ میں رہا اور اپنے بھائی عیسیٰ بن موسیٰ کو حمید بن قحطبہ کے زیر قیادت فوج دے کر مدینہ بھیجا، منصور کے کوفہ میں قیام کی وجہ یہ ہوئی، کہ ابوجعفر منصور کو ابراہیم اور محمد کے خروج کا علم ہوا، تو اس نے عبداللہ بن علی سے جو اس کی قید میں تھا، دریافت کرایا، کہ محمد نے خروج کیا، تم اس کے بارے میں اگر کوئی مفید مشورہ دے سکتے ہو تو دو، (عبداللہ بن علی عباسیوں میں بڑا مدبر مانا جاتا تھا) اس نے کہا میں قیدی ہوں اور قیدی کی رائے بھی قیدی ہوتی ہے، پہلے تم مجھے آزاد کر دو، پھر میری رائے بھی آزاد ہو جائے گی، اس کے جواب میں ابوجعفر نے کہلا بھیجا، کہ اگر وہ دونوں میرے دروازے تک بھی آ جائیں تب بھی میں تجھے رہا نہ کروں گا یاد رکھ کہ میں اب بھی تمہارے حق میں محمد سے اچھا ہوں اور یہ حکومت تمہارے ہی خاندان کی ہے، اس پر عبداللہ بن علی نے جواب دیا اچھا یہ کرو، کہ فوراً کوفہ جا کر اہل کوفہ کے سینوں پر بیٹھ جاؤ، چوں کہ اہل کوفہ اس خاندان کے شیعہ اور انصار ہیں، اس وجہ سے شہر کے چاروں طرف فوجی چوکیاں بٹھا دو، جو شخص وہاں سے کسی طرف بھی جاتا یا کسی سمت سے بھی آتا ہو، اس کی گردن مار دو۔ مسلم بن قتیبہ کو فوراً اپنے پاس بلاؤ (یہ اس وقت رے میں تھا) پھر اہل شام کو لکھا کہ جو خاص بہادر اور جنگ جو وہاں ہوں، وہ ڈاک کے گھوڑوں کے ذریعہ تیزی سے منزلیں طے کر کے تمہارے پاس آئیں، پھر ان کو خوب رقم اور انعام دے کر مسلم بن قتیبہ کی قیادت میں محمد کے مقابلے پر بھیجو، ابوجعفر نے ایسا ہی کیا۔

عباسیوں کے دور اقتدار میں بہت سی بغاوتیں رونما ہوئیں، لیکن ایسا مستحکم اور منظم خروج کبھی نہیں ہوا، مدینہ میں امام مالک سے نفس ذکیہ کی بیعت کے بارے فتویٰ پوچھا گیا: ''ہماری گردنوں میں تو خلیفہ منصور کی بیعت ہے، اب ہم دوسرے مدعی خلافت کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں، تو انہوں نے فتویٰ دیا، کہ عباسیوں کی بیعت جبری تھی اور جبری بیعت، قسم یا طلاق جو بھی ہو باطل ہے''۔ (طبری ج۶ص۱۶۰)

مدینے میں اس فتوے کا خوش گوار اثر ہوا اور مدافعانہ جنگ کی تیاریاں شروع کر دی گئیں، خندق دوبارہ صاف کی جانے لگی، ایسا محسوس ہوتا تھا، کہ عہد نبوی لوٹ آیا ہے اور اہل مدینہ خلافت راشدہ کے عہد کو دوبارہ لانے کی تدبیروں میں سرگرم عمل ہیں۔ دوسری طرف اس تحریک کے نمائندے اسلامی بلاد وامصار میں کامرانیوں کے مراحل طے کر رہے تھے، منصور کو کوفہ میں ہر روز مختلف صوبوں سے بغاوت کی خبریں موصول ہوا کرتی تھیں۔ **كان كل يوم ياتيه فتق من ناحية**۔ (الیافعی ج۲ص۲۹۸)

بسا اوقات پریشانی کی حالت میں وہ کہتا ''بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں'' بصرہ، فارس، اہواز، واسط، مدائن، سواد جگہ جگہ سے سقوط کی خبریں آتی تھیں اور ہر طرف سے اس کو بغاوت پھوٹ پڑنے کا خطرہ تھا، دو مہینے تک وہ ایک ہی لباس پہنے رہا، بستر پر نہ سویا رات رات بھر مصلے پر گزار دیتا، کوفہ سے فرار ہونے کے لیے ہر وقت تیز رفتار سواریاں تیار کر رکھی تھیں۔

حسنی سادات کی یہ تحریک معمولی تحریک نہیں تھی، بلکہ تمام اسلامی دنیا میں یہ تہیا کرلیا گیا تھا، کہ زمین تیار کر کے ایک ہی تاریخ میں عباسی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے، اندر ہی اندر یہ سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے اور ٹھیک ایک مقرر تاریخ میں بغاوت کا اعلان کر دیا گیا، حالت اتنی نازک ہوگئی تھی جس کا اندازہ یافعی کی نقل کردہ آرا سے بخوبی ہوسکتا ہے وہ لکھتے ہیں: ”**لولا السعادة لسل عرشه**“ اگر منصور کا اقبال نہ ہوتا، تو اس کا تخت الٹ چکا تھا۔ (ج۱ص۲۱۱)

امام اعظم کی شرکت

امام اعظم کا نقطہ نظر غیر اسلامی طرز حکومت اور ظالم حکمرانوں کے متعلق یہ تھا کہ ان کے خلاف قتال کیا جائے، اسی بنا پر امام اوزاعی نے کہا تھا کہ ہم نے ابوحنیفہ کی ہر بات برداشت کی یہاں تک کہ وہ تلوار کے ساتھ آ گئے (یعنی ظالموں کے ساتھ قتال کے قائل ہوگئے) اور یہ ہمارے لیے ناقابل برداشت بات تھی۔ (احکام القرآن للجصاص ج۱ص۸۱)

محدثین کے نزدیک سلطان جابر کے خلاف خروج جائز نہیں تھا، اسی بنا پر امام اوزاعی نے یہ بات کہی۔

امام اعظم کا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں مسلک یہ تھا کہ ابتداءً زبان سے روکا جائے، لیکن اگر سیدھی راہ نہ اختیار کی جائے تو پھر تلوار اٹھانا فرض ہے۔ (ایضا)

ابراہیم الصائغ کے بیان میں گزر چکا ہے کہ امام صاحب ظالم حکومت کا تختہ بزور وقوت الٹ دینے کے قائل تھے، جب کہ قیادت صالح ہو اور رفقائے تحریک مخلص تجربہ کار ہوں۔ نفس ذکیہ کی قائدانہ صلاحیت ان کے رفقا کے اخلاص اور تنظیمی قوت سے جب وہ باخبر ہوئے اور یہ سمجھ لیا کہ یہ تحریک اتنی طاقت ور ہے، کہ عباسی اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتی ہے، اس میں شرکت محض جان کا ضیاع نہیں، بلکہ حصول مقصد کے امکانات بھی روشن ہیں۔ ابراہیم بصرہ میں کامیابیوں سے ہم کنار تھے، ان کے نمائندے کوفہ بھی پہنچ چکے تھے اور یہاں کافی کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں، کوفہ کے اندر ایک لاکھ تلواریں عباسی حکومت کا تختہ الٹ دینے کے لیے نیام میں چھپی ہوئی تھیں۔ (الیافعی ج۱ص۲۹۹)

اس لیے انقلاب حکومت کے فرض سے سبک دوش ہونے کے لیے اب امام صاحب کھلے میدان میں آئے، ابراہیم اور نفس ذکیہ جن سے ذاتی طور پر انہیں واقفیت تھی، انہیں یقین تھا، کہ یہ لوگ ان میں سے ہیں ”**رجل يراس عليهم ماموناً على دين**“ جو قیادت کے معیار پر پورے اتر رہے ہیں اور جن کی دینداری پر لوگوں کو اطمینان ہے چنانچہ امام صاحب نے کھل کر ان کی حمایت کی اور اس سلسلے میں منصور کے جابرانہ اقتدار کی مطلق پرواہ نہ کی، آپ لوگوں کو اعلانیہ نفس ذکیہ کی بیعت اور ان کے نمائندے ابراہیم کی حمایت پر آمادہ کرتے۔ مبصرین کا بیان ہے: ”**كان ابو حنيفة يجاهر فى امره ويامر بالخروج معه**“ ابراہیم کی رفاقت پر امام ابوحنیفہ لوگوں کو اعلانیہ ابھارتے اور لوگوں کو ان کے ساتھ خروج کا حکم دیتے۔ (الیافعی ج۱ص۳۰۰)

امام صاحب ابراہیم کے تعاون کو حج نفل پر بھی فوقیت دیتے تھے، مشہور محدث ابراہیم بن سوید نے اس زمانے میں امام صاحب سے پوچھا کہ نفل بہتر ہے یا ابراہیم کا ساتھ دینا؟ امام اعظم نے فرمایا ”**غزوة بعد حجة الاسلام افضل من**

خمسین حجة ”اس جنگ میں شرکت پچاس حج نفل سے زیادہ افضل ہے۔ (موفق ج۲ص۸۳)

اسی طرح حسین بن سلمہ یہ روایت بیان کرتے تھے، کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ امام ابوحنیفہ سے ابراہیم بن عبداللہ کے زمانہ خروج میں پوچھ رہی ہے کہ میرا لڑکا ابراہیم بن عبداللہ کی تائید کر رہا ہے اور میں اس کو منع کرتی ہوں، مگر نہیں مانتا، امام نے عورت سے کہا ”**لاتمنعی** “ ایسے نیک کام سے اپنے لڑکے کو نہ روک۔ حماد بن ایمن کہتے ہیں، اس زمانے میں ہم دیکھتے تھے، کہ لوگوں کو امام ابوحنیفہ ابراہیم کی امداد و نصرت پر آمادہ کر رہے ہیں اور ہر ایک کو ان کی پیروی اور رفاقت کا حکم دے رہے ہیں۔ (موفق ج۲ص۷۲)

اس زمانے میں امام صاحب ابراہیم کی حمایت کا لوگوں میں اعلان فرمایا کرتے تھے۔ زفر بن ہذیل کا بیان ہے ”**کان ابو حنیفة یجھر بالکلام ایام ابراھیم جھارا شدیدا** “ ابراہیم کے زمانے میں امام صاحب اعلانیہ بلند آواز سے گفتگو کرتے تھے۔ (موفق ج۱ص۱۷۱)

آپ نے اس قدر ابراہیم کی حمایت کی کہ ان کے شاگردوں کو خطرہ پیدا ہو گیا، کہ ہم سب باندھ لیے جائیں گے۔

(الکردری ج۲ص۷۲)

امام صاحب ابراہیم کی حمایت میں عباسی فوج کے خلاف جنگ کرنے کو کفار کے خلاف جہاد پر بھی فوقیت دیتے تھے، مشہور محدث ابراہیم بن محمد الفزاری جو شامی سرحد ”مصیصہ“ کی چھاؤنی میں فوجیوں کی تربیت کیا کرتے تھے، ان کے بھائی حسن نے امام صاحب کے فتوے پر ابرہیم طالبی کا ساتھ دیا اور قتل کیے گئے، واقعہ کو فرازی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

میں مصیصہ میں تھا، خبر ملی کہ میرے بھائی حسن نے ابراہیم طالبی کا ساتھ دیا تھا، اسی جنگ میں کام آیا، میں اس خبر کو سن کر سیدھا کوفہ پہنچا، یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میرے بھائی کو ابوحنیفہ نے فتویٰ دے کر قتل کرایا ہے، میں ان کے پاس آیا اور پوچھا، تمہیں نے میرے بھائی کو فتویٰ دے کر اس طالبی کی رفاقت پر آمادہ کیا؟ امام صاحب نے فرمایا ہاں! میں نے ہی اس کو خروج کا فتویٰ دیا تھا، یہ سن کر ابراہیم نے کہا ”**لاجزاك الله خیرا** “ خدا اس کا تجھے اچھا بدلہ نہ دے۔ امام نے فرمایا، یہی میری رائے ہے اور اس کے بعد ابراہیم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے

لو انك قتلت مع اخیك كان خیرا لك من المكان الذی جئت منه

تم اپنے بھائی کے ساتھ شہید ہو جاتے، تو جہاں سے تم آئے ہو، وہاں کے قیام سے یہ بات تمہارے لیے بھی بہتر ہوتی۔ (تاریخ بغداد ج۱۳ص۳۸۵)

امام اعظم نے فزاری کے سامنے اپنی رائے اور فتوے کا اقرار اس وقت کیا، جب ابراہیم شہید ہو چکے تھے اور منصور کے خلاف اٹھنے والا طوفان تھم چکا تھا، نیز فزاری عباسیوں کے ہم نوا بھی تھے، ایسی صورت میں امام صاحب نے اپنے موقف کا برملا اظہار کر کے ثابت کر دیا تھا، کہ انہوں نے حق کی حمایت کی تھی اور اب بھی اسی نقطہ نظر پر قائم ہیں۔

کوفہ کے عہدہ قضا کی پیش کش

نفس ذکیہ اور ابراہیم کے خروج اور انقلابی کوششوں کو ناکام بنانے کے بعد منصور ۱۴۶ھ میں کوفہ سے بغداد پہنچا اور بغداد کی تعمیر میں مصروف ہوگیا۔ اس نے نفس ذکیہ اور ابراہیم کے خروج میں ان کے حامیوں کو چن چن کر قتل کیا یا قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کیا۔ امام دارالہجرت مالک بن انس کو بھی کوڑوں سے مارا گیا اور ان کے ایک ہاتھ کو شانے سے اکھیڑ دیا گیا، جس کے صدمے سے تمام عمر وہ پوری طرح اپنا ہاتھ اٹھا نہ سکتے تھے۔ منصور کو یہ حقیقت بھی معلوم تھی، امام ابوحنیفہ نے ابراہیم کا ہر ممکن حد تک ساتھ دیا ہے، بلکہ اس تاریخی شورش کے زمانے میں اس کے معتمد سپہ سالار حسن بن قحطبہ کو مسلمانوں کے خلاف فوجی کمان سے روک دیا، اسی کا اثر تھا، کہ جب منصور نے حسن بن قحطبہ کو مہم پر بھیجنا چاہا، تو اس نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر صاف صاف انکار کر دیا۔ یہ وہ اسباب تھے، جن کی بنا پر منصور امام اعظم کا دشمن بن چکا تھا، لیکن عالمانہ وجاہت اور بلاد اسلامی میں آپ کی عبقری شخصیت کے اثر و نفوذ سے بھی اچھی طرح واقف تھا، اس لیے آپ کے خلاف انتقامی کارروائی سے فی الحال باز رہا، لیکن اس کام کے لیے وہ موقع کی تلاش میں تھا، غالباً ۱۴۸ھ میں کوفہ کے قاضی عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا انتقال ہوا، تو وہاں کی مسند قضا کے لیے قاضی کے انتخاب کا مرحلہ پیش آیا، چنانچہ منصور نے حسب ذیل علما کو بارگاہ خلافت میں طلبی کا حکم بھیجا، امام اعظم ابوحنیفہ، سفیان ثوری، شریک بن عبداللہ نخعی، مسعر بن کدام رضوان اللہ علیہم یہ چاروں دارالخلافت بغداد بلائے گئے، خلیفہ کی طلبی سے ان لوگوں کو یقین ہوگیا تھا، کہ حکومت کا کوئی عہدہ یا قضا کی خدمت قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا یہ حضرات حکومت کی کسی بھی ذمے داری کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے، وہ جانتے تھے کہ شخصی اقتدار میں آزادی کے ساتھ اسلامی نہج پر کام کرنا دشوار ہے اور فیصلہ مقدمات میں عدلیہ پر حکومت حاوی ہوتی ہے، اس لیے کسی بھی عہدہ کو منظور کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ علم و تقویٰ کو اقتدار کی بھینٹ چڑھا دیا جائے، جب یہ حضرات خلیفہ منصور کے پاس پیش کیے گئے، تو اس نے کہا، "لم ادعکم الا بخیر" میں نے تم لوگوں کو اچھے مقصد کے تحت بلایا ہے۔

مسعر بن کدام کو دیکھا گیا کہ وہ صف سے نکل کر خلیفہ کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں اور بے محابا ابوجعفر کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

> **كيف حالك يا اميرا لمومنين وكيف كنت بعدى وكيف جواريك وكيف دوابك تولينى القضاء .**

> اے امیر المومنین! آپ کا حال کیسا ہے؟ میرے بعد آپ کیسے رہے اور آپ کی باندیوں کا کیا حال ہے؟ آپ کے مویشیوں کا کیا حال ہے؟، آپ مجھے قاضی بنا دیجیے!

ایک درباری اس حرکت کو دیکھ کر آگے بڑھا اور کہا کہ یہ شخص تو پاگل ہے، انہیں دربار سے نکال دیا گیا، اس طرح مسعر کی جان بچی۔ سفیان ثوری بھی کسی بہانے بھاگ نکلے، اب امام اعظم اور قاضی شریک خلیفہ کے سامنے تھے، ابوجعفر منصور نے امام

صاحب کو سامنے بلایا اور کہا، میں تم کو کوفہ کا قاضی بنانا چاہتا ہوں، آپ نے جواباً ارشاد فرمایا:

یـا امیـر المومنین ان النعمان بن ثابت بن مملوك الخزاز بالكوفة و اهل الكوفة لا یرضون ان یلی علیهم ابن مملوك خزاز .

یعنی اے امیر المومنین! میں نعمان بن ثابت خزاز کا بیٹا ہوں، میرا نسبی تعلق عرب کے کسی معزز خاندان سے نہیں، کوفہ والے خزاز کے بیٹے کی امامت برداشت نہ کریں گے۔

منصور کو بات سمجھ میں آئی اور اس نے کہا، آپ نے سچ کہا۔

امام صاحب نے اپنی معذرت کچھ اس طرح پیش کی کہ منصور مزید اصرار نہ کر سکا، اس طرح آپ کوفہ کے عہدہ قضا سے بچ گئے۔

منصور نے شریک کو قضا کی پیش کش کی، انہوں نے دماغی ضعف کا بہانہ کیا، تو منصور نے کہا: "**اسکت مابقی غیرك احد خذ عهدك**" چپ رہو، تمہارے علاوہ کوئی باقی نہیں رہا، عہدہ کو قبول کر لو۔

شریک:۔ اے امیر المومنین! مجھے نسیان ہے

منصور:۔ روزانہ روغن بادام میں فالودہ بنا کر پلانے کا حکم تمہارے لیے دے دوں گا۔

شریک:۔ میں صادر اور وارد سب کا فیصلہ کروں گا۔

منصور:۔ تم میرا اور میری اولاد کا بھی فیصلہ کرو گے۔

شریک:۔ آپ مجھ سے اپنا رعب و دبدبہ روک لیجیے۔

منصور:۔ ٹھیک ہے۔

شریک نے ان شرطوں کے ساتھ عہدہ قضا قبول کر لیا۔

بغداد کے منصب قضا کی پیش کش اور اسیری

بغداد کی تعمیر و تزئین سے مکمل طور پر فارغ ہونے کے بعد ابو جعفر منصور کو وہاں کی مسند قضا کے لیے ایسے قاضی کی ضرورت محسوس ہوئی، جو دار الخلافت کی مسند قضا کے علاوہ تمام دیار و امصار کے قاضیوں کا چیف بھی ہو، یہ قاضی القضاۃ کا عہدہ تھا، جس کے لیے خلیفہ کی نگاہ انتخاب امام ابو حنیفہ پر پڑی اور اس نے کوفہ کے گورنر عیسیٰ بن موسیٰ کو لکھا کہ "**احمل ابا حنیفة**" ابو حنیفہ کو سوار کر کے میرے پاس بھیجو! ڈاک کی سواری کا انتظام کیا گیا اور امام صاحب کو سوار ہونے کے بعد گھر جانے کا بھی موقع نہیں دیا گیا۔ براہ راست بغداد روانہ کر دیا گیا۔ امام صاحب دربار خلافت میں پہنچے، منصور نے کہا، آپ بغداد کے قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کر لیں اور پوری سلطنت عباسیہ کے قاضی آپ کے ماتحت کام کریں گے۔ آپ نے انکار کر دیا اور مختلف تاویلیں اور عذر پیش کیے۔ منصور نے قسم کھائی کہ اگر یہ عہدہ قبول نہیں کریں گے، تو آپ کو قید کر دیا جائے گا۔ مگر آپ نے

انکار پر اصرار کیا، تو منصور نے آپ کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ مگر وہاں بھی آپ کو دعوت بھیجتا رہا، کہ آپ عہدہ قبول کر لیں، پھر بھی آپ انکار پر مصر رہے۔ تو اس نے حکم دیا کہ روزانہ آپ کو دس کوڑے لگائے جائیں، چنانچہ روزانہ آپ پر مسلسل دس کوڑے لگائے جاتے تھے، جس کی تاب نہ لا کر آپ مخلوق کو داغ مفارقت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں چلے گئے۔

(کردری ج ۲ ص ۱۹)

اس واقعہ کو مورخین نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے، بعض کہتے ہیں، کہ امام صاحب کو منصور نے سر دربار برہنہ پشت پر تیس کوڑے لگوائے تھے۔

☆ عبدالعزیز بن عصام جو امام صاحب کے دیکھنے والوں میں سے ہیں ان کا بیان ہے کہ خلیفہ ابو جعفر نے ان کو منصب قضا قبول کرنے کے لیے بلایا تھا، لیکن امام نے جب انکار کیا اور دونوں کے درمیان گفتگو اپنی شدت کو پہنچ گئی تو ابو جعفر نے غصہ سے مغلوب ہو کر امام کو برا بھلا کہا اور کوڑوں سے پٹوایا بھی، جب وہ خلیفہ کے پاس سے باہر لائے گئے، تو اس وقت صرف پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور ان کی پشت پر مار کے نشانات نمایاں تھے، ایڑیوں پر خون بھی بہہ رہا تھا، تازیانہ کے اس واقعہ کے بعد منصور کا چچا عبدالصمد بن علی بن عبداللہ بن عباس پہنچا اور کہنے لگا۔ ”امیر المومنین! آج آپ نے کیا کیا؟ ایک لاکھ تلواریں اپنے اوپر کھنچوا لیں، یہ عراق والوں کا امام ہے، مشرق والوں کا فقیہ ہے“۔ (موفق ج ۲ ص ۱۸۲)

☆ بشر بن ولید کندی کا بیان ہے، کہ امیر المومنین ابو جعفر منصور نے امام ابوحنیفہ کو بلایا اور وہ انہیں قاضی بنانا چاہتا تھا، تو ابوحنیفہ نے اس منصب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو منصور نے قسم کھائی، کہ وہ قاضی بنا کر رہے گا، جواباً ابوحنیفہ نے بھی قسم کھائی کہ میں یہ عہدہ قبول نہیں کروں گا۔ اس پر منصور کے حاجب ربیع نے کہا، اے امیر المومنین! آپ نہیں دیکھتے کہ آپ کے مقابلے میں قسم کھا رہا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا، ” **امیر المومنین علی کفارة یمینه اقدر منی علی کفارة یمینی** “ امیر المومنین اپنی قسم کا کفارہ دینے پر مجھ سے زیادہ قادر ہیں۔

اس طرح امام صاحب نے عہدہ قضا قبول کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا، تو منصور نے آپ کو قید میں ڈال دیا۔ قید سے دوبارہ طلب کر کے منصور نے کہا ” **اترغب عما نحن فیھا** “ کیا تم اب بھی عہدہ قضا سے انکار کرتے ہو؟۔ امام صاحب نے فرمایا:

> **اصلح اللہ امیر المومنین یا امیر المومنین اتق اللہ ولاتشرك فی امانتك من لایخاف اللہ واللہ ما انا بمامون الرضا فکیف اکون مامون الغضب ولو اتجه الحکم علیك ثم تھددنی علی ان تغرقنی فی الفرات او ازیل الحکم لاخترت ان اغرق ولك حاشیة یحتاجون الی من یکرمھم لك فقال له کذبت انت تصلح فقال قد حکمت لی علی نفسك کیف یحل لك ان تولی قاضیا علی امانتك وھو کذاب** ۔(موفق ج ۲ ص ۱۷۱)

اللہ امیر المومنین کی اصلاح فرمائے، اے امیر المومنین اللہ سے ڈریے اور اپنی امانت میں اس کو شریک نہ کیجیے، جس کے دل میں اللہ کا خوف نہیں، خدا کی قسم جب میں رضا سے مامون نہیں، تو غضب سے مامون کیسے ہو جاؤں گا، اگر آپ کے خلاف بھی فیصلہ دینے کا موقع میرے سامنے آگیا اور مجھے یہ دھمکی دی جائے کہ اس فیصلہ سے یا تو ہٹ جاؤ ورنہ دریائے فرات میں تجھے غرق کر دیا جائے گا، تو میں کہتا ہوں کہ فرات میں ڈوب مرنا میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے، لیکن فیصلہ بدلنے پر راضی نہیں ہوں۔ آپ کے حاشیہ میں ایسے لوگ ہیں جنہیں ضرورت ایسے آدمی کی ہے، جو آپ کی وجہ سے ان کے وقار کو برقرار رکھے۔ منصور نے امام صاحب سے کہا، تم جھوٹے ہو، اس کی صلاحیت رکھتے ہو، امام صاحب نے کہا، تم نے تو اپنے خلاف فیصلہ کر دیا، کیسے جائز ہوگا، کہ تم اپنی امانت پر کسی جھوٹے کو قاضی بناؤ؟۔

☆ موفق کی ایک روایت میں ہے: امام ابوحنیفہ جب بغداد آئے تو بارگاہ خلافت سے خنداں وشاداں نکلے، فرمانے لگے، مجھے منصور نے قضا کے لیے بلایا تھا، میں نے بتا دیا، کہ میں اس کام کے لیے موزوں نہیں۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مدعی کا کام شہادت پیش کرنا ہے اور مدعی علیہ بصورت انکار حلف اٹھائے، مگر عہدہ قضا کے لے بڑے دل گردے کا آدمی چاہیے، قاضی ایسا جری آدمی ہونا چاہیے جو آپ، آپ کی اولاد اور سپہ سالاروں کے خلاف فیصلہ دے سکے اور مجھ میں یہ ہمت نہیں۔ میری تو یہ حالت ہے کہ آپ مجھے بلاتے ہیں، تو میں آپ سے رخصت ہو کر ہی آرام کا سانس لیتا ہوں۔

منصور نے کہا، آپ میرے تحائف قبول کیوں نہیں کرتے؟ امام صاحب نے فرمایا:

ماوصلنی امیرا لمومنین من ماله بشئ فرددته ولو وصلنی بذلك لقبلته انما وصلنی امیر المومنین من بیت مال المسلمین ولاحق لی فی بیت مالهم انی لست من اقاتل من ورائهم فاخذ مایاخذ المقاتل ولست من ولدانهم فاخذ مایاخذ الولدان ولست من فقرائهم فاخذ ما یاخذ الفقراء ۔

میں نے آپ کا ذاتی مال سے دیا ہوا کوئی ہدیہ کبھی واپس نہیں کیا، بلکہ ایسا تحفہ قبول کرنے کے لیے تیار ہوں، آپ مجھے بیت المال سے عطیے بھیجتے ہیں اور بیت المال میں مجھے کوئی حق حاصل نہیں، نہ میں فوجی مجاہد ہوں کہ اپنا حصہ وصول کروں، نہ ان کی اولاد ہوں، کہ بچوں کا حصہ وصول کروں، نہ تنگ دست ہوں کہ فقرا کی طرح صدقہ وصول کروں۔

منصور نے کہا، ''اچھا جایئے! لیکن اگر بوقت ضرورت قاضی اگر آپ کی طرف رجوع کریں، تو ان کی مشکلات دور فرمایئے۔ (الموفق ج ۱ ص ۲۱۵)

☆ ابن البزازی اپنی مناقب میں لکھتے ہیں: ابوجعفر منصور نے امام ابوحنیفہ کو منصب قضا پیش کرنے اور قاضی القضاۃ

بنانے کے لیے قید کر دیا، انکار کرنے پر ایک سو دس کوڑے لگوائے اور اس شرط پر قید خانہ سے رہا کیا، کہ آپ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ نیز مطالبہ کیا، کہ جو مسائل وہ بھیجے، ان میں فتویٰ دے دیا کریں، وہ مسائل بھیجتا، مگر آپ ان کا جواب نہ دیتے تھے، منصور نے پھر قید کرنے کا حکم دیا، چنانچہ آپ دوبارہ محبوس ہوئے اور اس نے آپ پر بے حد سختی کی۔

(المناقب لابن البزاز کردری ج ۲ ص ۱۹)

بظاہر متذکرہ بالا روایات متضاد نظر آتی ہیں، لیکن فی الواقع ایسا نہیں، بلکہ امام صاحب اور منصور کے درمیان متعدد ملاقاتوں میں سوال و جواب کی نوبت آئی، جنہیں ارباب سیر نے روایت کیا۔ غالباً بغداد کے اسی آخری سفر میں امام صاحب پر جب منصور کا دباؤ حد سے بڑھا، تو آپ نے قضاء القضاۃ کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے دجلہ اس پار ایک مختصری بستی ”رصافہ“ کی قضا قبول فرمالی۔ ابن خلکان کا بیان ہے: جب منصور نے شہر بغداد کی تعمیر کے بعد وہاں قیام کیا اور اس نے مسجد رصافہ بنائی، تو امام اعظم کو دربار میں طلب کیا، وہ کوفہ سے بغداد لائے گئے، منصور نے رصافہ کی قضا آپ کے سامنے پیش کی، آپ نے انکار فرمایا، منصور نے کہا، اگر تم یہ عہدہ قضا قبول نہ کروگے، تو تمہیں کوڑوں سے پیٹوں گا، امام صاحب نے چاروناچار رصافہ کی قضا کا عہدہ قبول کیا، آپ دو روز مسند قضا پر بیٹھے، کوئی مقدمہ پیش نہیں ہوا، جب تیسرے دن ایک ٹھٹھیرا اور اس کا حریف عدالت میں حاضر ہوئے تو ٹھٹھیرے نے کہا اس شخص پر میرے ایک برتن کی قیمت سے دو درہم اور چار دانق باقی ہیں، تو امام صاحب نے اس کے حریف سے کہا، اللہ سے ڈرو اور دیکھو یہ ٹھٹھیرا کیا کہہ رہا ہے؟ اس شخص نے کہا کہ اس کا مجھ پر کچھ واجب نہیں، امام صاحب نے ٹھٹھیرے سے کہا، تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا آپ اس شخص سے قسم لیں، تو امام صاحب نے اس مرد سے کہا: ”قل واللہ الذی لاالٰہ الا ھو“ وہ شخص قسم کھانے لگا، جب امام صاحب کو یقین ہوگیا، کہ پوری قسم کھالے گا، تو اسے بیچ میں روک دیا اور اپنی آستین سے دو بھاری درہم نکال کر دیے اور ٹھٹھیرے سے کہا، تم اپنے برتن کی بقیہ قیمت لے لو، ٹھٹھیرے نے دراہم کی طرف دیکھا اور کہا ہاں مجھے قبول ہے اور اس نے وہ درہم لے لیے، اس واقعہ کے بعد آپ نے یہ منصب قضا ترک کر دیا۔ (وفیات الاعیان ج ۳ ص ۲۰۲)

امام صاحب کے سامنے متعدد بار عہدہ قضا پیش کیا گیا، کبھی کوفہ کی قضا اور کبھی کسی دوسرے علاقہ کی قضا اور آخر میں قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا گیا اور ساری مملکت اسلامیہ کے قاضی کی پوسٹ پر مقرر کرنے کا ارادہ کیا گیا، چنانچہ کردری کے ایک بیان میں ہے:

وعھد الامام الی البصرۃ والکوفۃ وبغداد ومایلیھا ۔(ج ۲ ص ۲۱)

بصرہ، کوفہ، بغداد اور ان سے ملحقہ علاقوں کے لیے امام صاحب کو منصب قضا پیش کیا گیا۔

علی بن علی الحمیری کا بیان ہے:

ارادہ علی القضاء غیر مرۃ فاعتذر واستعفیٰ واحتال بکل حیلۃ ۔

قضا کی خدمت ابوحنیفہ کے سامنے متعدد بار پیش کی گئی، لیکن وہ عذر ہی کرتے رہے اور معافی ہی چاہتے رہے

اور حیلے حوالوں سے کام لیتے رہے۔ (موفق ج۲ص۱۷۸)

موفق نے احمد بن بدیل کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

يطلب منه ان يكون قاضي القضاة ۔ (ج۲ص۱۷۳)

آپ کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا گیا۔

مجد الائمہ سرخسی کی روایت میں ہے:

ان يتولى القضاء ويخرج القضاة من تحت يده الى جميع كور الاسلام ۔

قضا کے اختیارات بھی دیے جاتے ہیں اور یہ کہ سارے اسلامی صوبوں میں قاضی امام ہی کے ہاتھ سے نکلیں۔

(ج۲ص۱۷۲)

ان روایات سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے، کہ آخر میں منصور نے امام صاحب کو قاضی القضاۃ بنانا چاہا، فیصلہ مقدمات ہی تک آپ کے فرائض نہ تھے بلکہ پورے بلاد اسلامی میں قاضیوں کے عزل ونصب اور ان کی تربیت کی ذمے داری آپ کو تفویض کی جا رہی تھی۔

ابوجعفر منصور امام صاحب کو اس طرح قابو میں لانا چاہتا تھا اور اپنی سلطنت کا ایک اہم رکن بنا کر حکومت مخالف کارروائیوں سے آپ کو باز رکھنا چاہتا تھا، ماضی میں امام صاحب نے انقلاب حکومت کے لیے اٹھنے والوں کا جو تعاون کیا تھا اور اپنے اثر ورسوخ سے لوگوں کو ان کا حامی ومددگار بنا دیا تھا، جس سے منصور بخوبی واقف تھا، وہ چاہتا تھا یا تو ابوحنیفہ کو قاضی القضاۃ بنا کر اپنا طرفدار کر لیا جائے یا وہ اپنی ضد پر قائم رہیں اور وقت کے سب سے عظیم فرمانروا کی پیش کش کو ٹھکرا دیں تو ان کی شمع حیات گل کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جائے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو عزیمت مآب اسوہ حسنہ اختیار کیا تھا اور جابر وظالم فرمانرواؤں کی حمایت اور تعاون سے تمام عمر پرہیز کرتے رہے، انہوں نے اس آخری پیش کش کو بھی ٹھکرا دیا، جس کا ردعمل یہ ہوا، کہ منصور نے پہلے تو آپ کو قید کیا، کوڑے لگواتا رہا، کہ ان شدائد سے تنگ آ کر امام اپنا موقف ترک کر کے حکومت وقت کی ملازمت قبول کر لیں، مگر امام اعظم نے جو طریق حیات اختیار کیا تھا، اس میں قید وبند اور کوڑوں کی شدید ضرب کچھ اہمیت نہیں رکھتی تھی، بلکہ اس راہ میں اپنی جان بھی قربان کر دینا ان کے لیے آسان کام تھا، زنداں کی صعوبتوں سے جی نہ بھرا، تو منصور نے سرعام سر قلم کرنے کے بجائے زہر خورانی کا منصوبہ بنایا، اعلانیہ قتل کرنے کی صورت میں کسی بڑی شورش اور بغاوت کا امکان موجود تھا، کیوں کہ امام صاحب کی عبقری علمی شخصیت کا ڈنکا پوری دنیائے اسلام میں بج رہا تھا اور لاکھوں مسلمان آپ سے عقیدت وارادت کا رشتہ رکھتے تھے، وہ اس طرح امام کے قتل پر یقیناً برانگیختہ ہو جاتے اور لاکھوں تلواریں عباسیہ حکومت کے خلاف بے نیام ہو جاتیں۔ کوڑوں کی ضرب کے بعد منصور کے چچا نے کہا تھا، امیر المومنین آپ نے آج کیا کیا ایک لاکھ تلواریں بے نیام کرا لیں، یہ عراق والوں کا امام ہے، مشرق والوں کا فقیہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ منصور منظر عام پر آپ کو قتل کرانے کے بجائے زہر ہلاہل دے کر ابدی نیند سلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے امام صاحب کو قید خانے میں زہر ہلاہل پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وفات

ابن حجر ہیتمی رقم طراز ہیں:

وروی جماعة انه رفع اليه قدح فيه سم ليشرب فامتنع وقال انی لاعلم مافيه ولااعين علی قتل نفسی فطرح ثم صب فی فيه قهرا فمات ۔

ایک جماعت نے یوں روایت کیا ہے کہ آپ کو زہر کا پیالا پینے کو دیا گیا، آپ نے انکار کیا اور فرمایا میں جانتا ہوں جو اس پیالے میں ہے میں اپنے قتل میں قاتل کا مددگار ہونا پسند نہیں کرتا ہوں، لہٰذا آپ کو زبردستی زہر پلایا گیا، جس سے آپ کی وفات ہوگئی۔ (الخیرات الحسان ص ۱۵)

جب آپ کے جسم میں زہر ہلاہل سرایت کر گیا اور زندگی کے چند لمحے باقی رہ گئے تو سر معبود حقیقی کی بارگاہ میں زمین پر رکھ دیا، اس طرح مالک حقیقی کی اطاعت وعبادت میں جان جان آفریں کے حوالہ کر دی۔ چنانچہ ابن حجر ہیتمی تحریر فرماتے ہیں:

وصح انه لما احس بالموت سجد فخرجت نفسه وهو ساجد ۔

صحت کے ساتھ یہ بات ثابت ہے، کہ جب آپ کو موت کا احساس ہوا، تو آپ سجدہ میں گر پڑے اور سجدہ ہی کی حالت میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ (ایضا)

تاریخ وفات

اکثر ارباب تاریخ کا بیان ہے، کہ امام صاحب کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ آپ نے رجب میں انتقال فرمایا اور بعض لوگوں نے نصف شوال کا قول کیا ہے۔ (الخیرات الحسان ص ۱۲۶)

وفات کے بعد پانچ آدمیوں نے جنازہ کو قید خانہ سے باہر نکالا، قاضی بغداد حسن بن عمارہ نے غسل دیا، ابو رجا عبد اللہ بن واقد ہروی پانی دیتے تھے، حسن جب امام صاحب کو غسل دے چکے تو کہا:

رحمك الله لم تفطر منذ ثلاثين سنة ولم تتوسد يمينك بالليل منذ اربعين سنة كنت افقهنا واعبدنا وازهدنا واجمعنا لخصال الخير وقبرت اذ قبرت الی خير وسنة واتعبت من بعدك ۔

اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، آپ نے تیس سال سے افطار نہ کیا اور چالیس سال سے رات کو نہ سوئے، آپ ہم سب لوگوں سے زیادہ فقیہ، عابد و زاہد اور اوصاف خیر کے جامع تھے اور جب آپ نے انتقال فرمایا تو بھلائی اور سنت کی طرف گئے اور اپنے پچھلوں کو مشکل میں ڈال رکھا۔

ابھی لوگوں نے غسل دینے سے فراغت بھی نہ پائی تھی، کہ امام صاحب کے سانحہ ارتحال کی خبر پورے بغداد میں پھیل گئی اور سارا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ جنازہ میں شرکت کے لیے جوق در جوق لوگ آنے لگے، نماز جنازہ میں پچاس ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ بقول بعض اس سے بھی زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ لوگوں کی بکثرت آمد کی وجہ سے چھ بار نماز جنازہ پڑھی گئی۔ آخر میں آپ کے صاحب زادے حضرت حماد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ کثرت ازدحام سے عصر کے بعد تک آپ کے دفن سے فراغت نہ ہوسکی۔ تدفین کے بعد بھی بیس دن تک لوگ برابر آپ کی قبر پر نماز پڑھتے رہے۔ امام صاحب نے وفات سے پہلے ہی مقام خیزران میں تدفین کی وصیت فرمائی تھی:

واوصیٰ ان یدفن بمقابر الخیزران الجانب الشرقی لان ارضها طیبة غیر مغصوبة ۔

آپ نے وصیت فرمائی تھی، کہ خیزران کے قبرستان میں مشرقی جانب دفن کیا جائے، کیوں کہ اس کی زمین پاکیزہ ہے، غصب کی ہوئی نہیں ہے۔

چنانچہ وصیت کے مطابق آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ (الخیرات الحسان ص ١٢٧)

ایک زمانے کے بعد سلطان ابوسعد مستوفی خوارزمی نے سلطان الپ ارسلان سلجوقی کے حکم پر ۴۵۹ھ میں آپ کی قبر مبارک پر ایک سلجوقی شاندار قبہ بنوایا اور اس کی ایک جانب مدرسہ قائم کیا۔ (ایضا)

یہ مقبرہ ساحل دجلہ پر زیارت گاہ عوام و خواص ہے۔

خلیفہ منصور تدفین کے بعد آپ کی قبر پر نماز پڑھنے آیا، تو اس نے پوچھا، امام صاحب کو عام قبرستان سے علاحدہ کیوں دفن کیا گیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا، کہ حضرت امام نے اپنے علاحدہ دفن کیے جانے کی وصیت فرمائی تھی، وجہ یہ تھی، کہ جس خطہ اراضی پر بغداد آباد کیا گیا تھا، امام صاحب اس کو مغصوبہ قرار دیتے تھے، اس زمین کے بارے میں ان کا یہی فتویٰ تھا اور یہی وصیت تھی، کہ مجھے ایسی زمین میں نہ دفن کرنا جو ناجائز ذریعہ سے حاصل کی گئی ہے۔ خلیفہ منصور نے سنا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا:

من یحذرنی منه حیا ومیتا ۔(دفاع ابوحنیفہ ص ٢٢٢)

زندگی اور زندگی کے بعد بھی امام ابوحنیفہ کے حملوں سے مجھے کون بچا سکتا ہے؟

غیبی ندا

امام اعظم کی تدفین سے جب لوگ فارغ ہوئے ایک غیبی ندا سنی گئی، ہاتف کہہ رہا تھا۔

ذهب الفقه فلا فقه لکم   فاتقوا الله وکونوا خلفا

مات نعمان فمن ھذا الذی　　　یحییٰ اللیل اذا ما سجنا

فقہ جاتا رہا، اب تمہارے لیے فقہ نہیں، اللہ سے ڈرو اور ان کے نائب بنو، امام ابوحنیفہ نے انتقال کیا، تو کون ہے اس رتبہ کا جو تاریک رات میں عبادت کرتا ہو۔ (الخیرات الحسان ص ١٢٨)

تاثرات

آپ کی وفات حسرت آیات پر ائمہ دین نے اپنے تاثرات اس طرح بیان فرمائے۔

فقیہ مکہ ابن جریج کو جب امام صاحب کی وفات کی خبر ہوئی انہوں نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور کہا، ''ای علم ذھب'' کتنا بڑا علم جاتا رہا۔

جب شعبہ نے آپ کے وصال کی خبر سنی انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا اور کہا:

طفیٔ عن الکوفۃ نور العلم اما انھم لایرون مثلہ ابدا ۔

علم کا نور کوفہ سے بجھ گیا اب ایسا شخص کبھی پیدا نہ ہوگا۔ (الخیرات الحسان ص ١٢٧)

صاحب الخیرات الحسان بیان کرتے ہیں، کہ علما اور اہل حاجت آپ کے مرقد انور پر حاضر ہوتے ہیں اور آپ کے پاس آ کر اپنی حاجات کے لیے آپ کو وسیلہ بناتے ہیں، اس میں کامیابی پاتے ہیں، ان میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں:

انی لاتبرک بابی حنیفۃ واجیٔ الی قبرہ فاذا عرضت لی حاجۃ صلیت رکعتین وجئت الی قبرہ وسالت اللہ عندہ فتقضی سریعا ۔

میں امام اعظم ابوحنیفہ سے برکت حاصل کرتا ہوں اور جب کوئی حاجت پیش آتی ہے، تو میں دو رکعت پڑھ کر ان کی قبر پر آتا ہوں اور وہاں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں تو وہ حاجت جلد پوری ہو جاتی ہے۔

(الخیرات الحسان ص ١٢٩)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ امام اعظم کی قبر پر حاضر ہوئے دعائے مغفرت کی، اتفاق سے صبح کی نماز پڑھنے کا وقت آیا، تو امام شافعی نے صبح کی نماز میں اپنے ہمیشہ کے معمول کی مخالفت کرتے ہوئے دعائے قنوت نہ پڑھی اور بسم اللہ میں جہر کے بجائے اخفا کیا (جب کہ ان کا مسلک ہے کہ تمام سال فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھی جائے اور بسم اللہ میں جہر کیا جائے) جب ان سے ہمیشہ کے معمول کے ترک کر دینے کی وجہ پوچھی گئی، تو فرمایا اس صاحب قبر (امام ابوحنیفہ) سے مجھے حیا آتی ہے، میں نے ادباً واحتراماً ان کے ہاں موجود ہوتے ہوئے اپنی رائے ومسلک کو ترک کر دیا ہے۔ (ایضا)

◆ ◆ ◆

محامد ومحاسن اور اخلاق

حلیہ ولباس

امام اعظم ابوحنیفہ کا قد میانہ، خوبرو، جاذب نظر، رنگ گندمی، عمدہ لباس زیب تن کرتے، عطریات کا بکثرت استعمال فرماتے، خوشبو کی وجہ سے محفل میں آمد سے پہلے ہی آمد کا پتہ چل جاتا تھا، آواز سریلی، انداز کلام شیریں۔ لوگوں کے ساتھ کرم ومروت کا برتاؤ کرتے، آپ کی رفتار وگفتار میں وقار اور متانت بدرجہ اتم موجود تھی۔ بہت عمدہ جوتے پہنتے تھے، موزہ بھی استعمال کرتے، جامع مسجد کے حلقہ درس میں لمبی سیاہ ٹوپی استعمال کرتے، بوقت ضرورت اونی کپڑے اور سنجاف وسمور بھی استعمال کرتے، جمعہ کے دن ردا اور قمیص (تہہ بند اور کرتا) پہنتے تھے، ایک شاگرد کے بقول ان دونوں کی قیمت چار درہم ہوتی۔

ابونعیم نے آپ کے بعض اوصاف حمیدہ ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

> **كان ابو حنيفة حسن الوجه حسن الثياب طيب الريح حسن المجلس شديد الكرم حسن المواساة لاخوانه ۔**
>
> امام اعظم خوبصورت عمدہ کپڑے والے، بہترین خوشبو والے، اچھے ہم نشیں، انتہائی سخی، رفیقوں کے ساتھ ہمدردی کرنے والے تھے۔ (حلیہ ج ۱۳ ص ۳۳۰)

امام صاحب کی طبعی نظافت اور جامہ زیبی خود ان کی ذات ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے متعلقین کے ملبوسات کو بھی پاکیزہ اور نفیس دیکھنا چاہتے تھے، چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ نے اپنے جلیسوں میں سے ایک شخص کو بوسیدہ لباس میں دیکھا، جب مجلس برخاست ہوئی اور صرف وہ شخص رہ گیا، آپ نے اس سے فرمایا، جانماز کو اٹھاؤ اور اس کے نیچے جو کچھ بھی ہے لے لو، اس کے نیچے سے ایک ہزار درہم نکلے آپ نے فرمایا کیا تم نے یہ حدیث شریف نہیں سنی ہے

> **ان الله يحب ان يرى اثر نعمته على عبده**
>
> اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ وہ اپنی نعمت کا اثر اپنے بندوں پر دیکھے۔
>
> لہٰذا تمہیں چاہیے کہ اپنی حالت اچھی رکھو تا کہ تمہارا دوست تم کو دیکھ کر افسردہ دل نہ ہو۔ (سوانح بے بہا ص ۴۷)

ذاتی زندگی

مال ودولت کی فراوانی کے باوجود ذاتی زندگی بڑی سادہ بسر کرتے، دولت کی افراط کے باوجود مصارف ذاتی بہت قلیل تھے،

غذا بھی سادہ استعمال کرتے، بیان کرتے ہیں کہ چالیس سال سے میرا معمول ہے کہ سالانہ چار ہزار درہم اپنے پاس رکھ کر باقی رقم نکال دیتا ہوں کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ایک آدمی کے نفقہ کے لیے چار ہزار درہم یا اس سے کم کافی ہے، اگر مجھے ڈر نہ ہوتا کہ اپنی ضرورت کے لیے مالداروں کے پاس جانا پڑے گا تو ایک درہم بھی اپنے پاس نہ رکھتا۔ (اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ ص ۴۹)

فیض ابن محمد رقی نے امام اعظم سے ایک مرتبہ بغداد میں ملاقات کی اور کہا میں کوفہ جانے کا ارادہ کر رہا ہوں کوئی ضرورت ہو تو فرمائیے، امام صاحب نے کہا تم میرے بیٹے حماد کے پاس جا کر میری طرف سے کہہ دینا کہ میرا ماہانہ خرچ دو درہم ہے کبھی ستو اور کبھی روٹی پر گزر اوقات کرتا ہوں اور تم نے اس کو بھی نہیں بھیجا، جلد بھیج دو۔ (ایضا)

امام اعظم نے امرا و سلاطین کے نذرانوں اور عطیوں کو کبھی قبول نہیں کیا، ان کی خودداری اور عزت نفس کو گوارہ نہ تھا کہ وہ وظیفہ خور بن کر سلاطین و امرا کے مرہون منت بنیں اور ان کے خلاف امر حق بیان کرنے کا موقع آجائے تو احسان کے بوجھ سے سر جھکا لیں یہی وجہ ہے کہ امام صاحب کا بیدار ضمیر ہمیشہ آزاد رہا اور ہر محاذ پر انہوں نے پوری جرأت ایمانی کے ساتھ حق گوئی وحق شعاری کا مظاہرہ کیا، جو علمائے حق اور وارثین انبیا کی شان ہے۔ امام صاحب اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

عطاء ذی العرش خیر من عطائکم وسیبہ واسع یرجی وینتظر
وانتم یکدر ما تعطون منکم واللہ یعطی بلا من ولا کدر

عرش والے کی داد اور بخشش تمہاری داد و دہش سے بہتر ہے۔ اس کا ابر کرم بہت وسیع ہے، جس سے امیدیں وابستہ ہیں اور جس کے سب منتظر ہیں مگر (حکمرانو!) تم لوگ جو کچھ دیتے ہو اس کو گدلا کر کے دیتے ہو، تمہاری بخشش کو تمہارا احسان جتانا مکدر کر دیتا ہے اور حق تعالیٰ جب دیتا ہے تو اس کے احسان میں نہ جتلانے کی اذیت ہوتی ہے نہ کدورت۔ (موفق ج ص ۲۴۴)

معمولات شب و روز

امام اعظم کی زندگی کے معمولات لیل و نہار اس نہج پر تھے۔ حلقہ درس جامع مسجد میں صبح کی نماز سے ظہر کی نماز تک اور عشا کی نماز سے ایک تہائی رات تک رہا کرتا تھا اور محلے کی مسجد میں عصر سے مغرب تک درس دیتے اور ظہر سے عصر تک گھر کے اندر تخلیہ میں رہتے، نماز عصر میں تعجیل کرتے اور مغرب میں تاخیر اور عشا میں تعجیل اور فجر اسفار میں پڑھتے تھے، ہفتہ کا دن ذاتی مصروفیات کا دن تھا، اس دن نہ مجلس میں بیٹھتے اور نہ بازار جاتے، گھر کے اسباب اور املاک کا بندوبست کرتے بازار میں چاشت کے وقت سے ظہر تک آپ بیٹھا کرتے اور جمعہ کے دن تمام اصحاب کی دعوت اپنے گھر کرتے، عمدہ کھانے تیار کراتے اور نبیذ پلاتے تھے۔ کھانا عام لوگوں کے ساتھ نہ کھاتے فرماتے "انما انفرد بنفسی عنکم لئلا تحتشموا" میں تنہا اس لیے کھاتا ہوں تا کہ تم لوگ تکلف نہ کرو۔ دعوت میں کھانے کے علاوہ طرح طرح کے میوے بھی ہوا کرتے، لوگوں کو کھلا کر بہت خوش ہوتے۔ (موفق ج۲ ص ۱۰۵، ۱۰۶)

مسعر بن کدام امام صاحب کے معمولات شب وروز کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

میں امام اعظم ابوحنیفہ کی مسجد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا کہ آپ نے صبح کی نماز پڑھی اور لوگوں کو علم دین پڑھانے میں مشغول ہوگئے، سلسلہ تعلیم ظہر تک جاری رہا پھر نماز کا وقفہ ہوا، نماز ظہر کے بعد عصر تک اور عصر سے مغرب تک اور مغرب سے عشا تک اسی جگہ بیٹھے رہے اور تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری رہا، بشری تقاضوں اور انسانی حوائج وضروریات سے قطع نظر، مسلسل یہ خدمت اور تدریس علم کا شغل دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی، امام اعظم عشا کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لے گئے مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی اور تجسس بڑھتا گیا، کہ جب آپ کا تدریسی انہماک اور تعلیمی مسائل کی مصروفیت کا یہ عالم ہے تو مطالعہ کتب اور نوافل وعبادت کے لیے آپ کو کون سا وقت ملتا ہوگا۔ ابھی میں ایسے ہی تصورات میں ڈوبا ہوا تھا، لوگ نماز عشا پڑھ کر گھروں کو جاچکے تھے، کیا دیکھتا ہوں کہ امام صاحب گھر سے مسجد میں تشریف لائے، صاف وسادہ لباس، جسم معطر اور جس کی خوشبو سے فضا بھی معطر ہورہی تھی، بڑی تمکنت اور سکون ووقار کے ساتھ مسجد کے ایک کونے میں نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوگئے یہاں تک کہ صبح صادق طلوع ہوگئی، اب رات کی عبادت، شب بیداری وریاضت سے فارغ ہوکر گھر تشریف لے گئے۔ (شاید اس دوران قضائے حاجت اور بشری تقاضوں کے پیش نظر تازہ وضو وغیرہ بنایا ہو) واپس تشریف لائے تو لباس بدلا ہوا تھا، صبح کی نماز باجماعت ادا کی، تو پھر حسب سابق وہی تدریس وتعلیم دین کا سلسلہ شروع ہوا جو برابر عشا تک جاری رہا، میں دل میں خیال کرتا تھا کہ آج رات آپ ضرور آرام کریں گے کہ کل کا دن اور رات بیداری میں گزارے ہیں مگر دوسری رات بھی آپ کا معمول وہی رہا جو پہلی رات کا تھا، تیسری رات بھی ایسے ہی گزری اور وہی کچھ دیکھا جو پہلی دوراتوں میں مشاہدہ کرچکا تھا، اس کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ ابوحنیفہ کا ساتھ اور خدمت ومصاحبت اور تلمذ اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک میرا یا ان کا دنیا سے انتقال نہ ہوجائے۔ (حدائق الحنفیہ ص٦٦)

جودوسخا

امام اعظم کو قدرت نے جودوسخا سے معمور دل عطا فرمایا تھا، بذل وعطا ان کی زندگی کا دستور تھا، وہ بہت بڑے تاجر تھے، لیکن تجارت کا مقصد مال جمع کرنا اور اپنی زندگی کو شاہانہ کروفر کے ساتھ گزارنا نہ تھا، بلکہ اس وسیع تجارت کا مقصد تجارتی نفع سے علما اور محدثین، تلامذہ اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا تھا، آپ نے اپنے اصحاب اور متعلقین کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے، شیوخ اور محدثین کے لیے اپنی تجارت کا ایک حصہ مخصوص کرلیا تھا اور اس کا نفع سال بسال انہیں پہنچادیا جاتا گھر والوں کے لیے پھل کپڑے یا کوئی چیز خریدتے تو اسی کی مقدار اشیا خرید کر فقہا ومحدثین کی نذر کیا کرتے تھے، ملنے والوں میں سے اگر کوئی حاجت مند ہوتا تو اس کی ضروریات پوری کرتے، قرضداروں کا قرض اپنی جیب خاص سے ادا کرتے۔

ابراہیم بن عتبہ چار ہزار درہم کے مقروض تھے اور اس ندامت کی وجہ سے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا، ان کے ایک دوست نے چندہ کرکے ان کا قرض ادا کرنا چاہا، لوگوں نے بقدر حیثیت اعانت کی، امام صاحب کے پاس گئے تو فرمایا تم پر کتنا قرض ہے؟

انہوں نے کہا چار ہزار درہم فرمایا، اتنی سی رقم کے لیے لوگوں کو کیوں تکلیف دیتے ہو؟ یہ کہہ کر پورے چار ہزار درہم خود دے دیے۔

(موفق ۲۴۰)

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کثرت سے صدقہ دیا کرتے، ان کو جو بھی نفع ہوتا وہ دے دیا کرتے، مجھے اس قدر تحفے ارسال کیے کہ مجھ کو وحشت ہونے لگی میں نے ان کے بعض اصحاب سے اس کا شکوہ کیا تو انہوں نے کہا:

لو رایت هدایا بعث بها الی سعید بن ابی عروبة وما کان یدع احدا من المحدثین الا بره برا واسعا ۔

اگر تم ان تحفوں کو دیکھتے جو انہوں نے سعید بن ابی عروبہ کو بھیجے ہیں تو حیران رہ جاتے امام اعظم نے محدثین میں سے کسی کو نہیں چھوڑا جس کے ساتھ بھلائی نہ کی ہو۔ (الخیرات الحسان ص ۸۳)

امام اعظم ابوحنیفہ کی مجلس ''البرکۃ'' کا تذکرہ سوانح کی متعدد کتابوں میں پایا جاتا ہے، ذیل میں اسی سلسلہ کا ایک واقعہ جسے امام اعظم کے اکثر سوانح نگاروں نے لکھا ہے نقل کیا جاتا ہے، جس سے امام ابوحنیفہ کی قیام گاہ کے مجلس ''البرکہ'' کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

کوفہ میں ایک صاحب بڑے خوش حال تھے، مگر ایام بدلے اور وہ زمانے کی گردش میں مبتلا ہو گئے، فقر و تنگ دستی کا دور آیا، لیکن بڑی غیرت اور حمیت والے تھے، جس طرح بھی گزر رہی تھی گزار رہے تھے، اتفاق سے ایک روز ان کی چھوٹی بچی تازہ ککڑیوں کو دیکھ کر چلاتی ہوئی گھر میں آئی، ماں سے ککڑی لینے کے لیے پیسے مانگے مگر افلاس تھا، ماں بچی کی مراد کب پوری کر سکتی تھی، بچی بلبلا رہی تھی، اس کا باپ بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور امام اعظم ابوحنیفہ سے امداد حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا، مجلس ''البرکہ'' میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا لیکن جس نے کبھی بھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا، آج بھی اس کی زبان نہ کھل سکی، حیاء و شرم اور حمیت مانع رہی، آخر بے چارہ یوں ہی اٹھ کر چلا آیا۔ امام اعظم ابوحنیفہ نے اس کے چہرے سے تاڑ لیا کہ اسے کوئی حاجت ہے مگر شرافت اس کے اظہار سے مانع ہے، جب وہ شخص گھر چلا تو امام ابوحنیفہ بھی چپکے سے اس کے پیچھے ہو لیے، جس گھر میں وہ داخل ہوا، اس کو خوب پہچان لیا، جب کافی رات بیت گئی تو امام ابوحنیفہ اپنی آستین میں پانچ سو درہم کی تھیلی دبائے اس صاحب حاجت کے دروازہ پر پہنچ گئے کنڈی کھٹ کھٹائی، جب وہ قریب آیا تو ابوحنیفہ نے جلدی سے وہ تھیلی اس کے دروازے کی چوکھٹ پر رکھ دی اور خود اندھیرے میں الٹے پاؤں یہ کہتے ہوئے واپس لوٹے۔ دیکھو تمہارے دروازے پر تھیلی پڑی ہوئی ہے یہ تمہارے لیے ہے۔ اس نے اندر جا کر تھیلی کھولی تو اس کے اندر ایک پرزہ پایا جس پر لکھا ہوا تھا،

هذا المقدار قد جاء به ابو حنیفة الیك من وجه حلال فلیفرغ بالا ۔

ابوحنیفہ یہ رقم لے کر تیرے پاس آیا تھا یہ حلال ذریعہ سے حاصل کی گئی ہے چاہیے کہ اس سے اپنے قلب کی فراغت میں کام لو۔ (موفق ج ۱ ص ۲۶۵، ۲۶۶)

امام صاحب کے صاحب زادے حماد نے جب سورہ الحمد پڑھی تو آپ نے ان کے معلم کو ایک ہزار درہم عطا فرمائے تو استاذ نے کہا: ”**ماصنعت حتی ارسل الی هذا فاحضره واعتذر الیه**“ میں نے یہ کام اس لیے نہیں کیا کہ آپ مجھے اتنی بڑی رقم عنایت فرمائیں امام صاحب نے معذرت چاہتے ہوئے فرمایا: ”**لاتستحقر ماعلمت ولدی واللہ لو کان معنا اکثر من ذلك لدفعنا الیك تعظیما للقرآن** ”آپ نے جو میرے لڑکے کو تعلیم دی ہے اسے آپ حقیر نہ سمجھیں خدا کی قسم اگر میرے پاس اس سے زیادہ رقم ہوتی تو میں اسے بھی عظمت قرآن کے پیش نظر آپ کے حوالے کر دیتا۔ (الخیرات الحسان ص ٨٢)

ایک مرتبہ امام اعظم ابوحنیفہ کی خدمت میں ایک نوجوان حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت مجھے دو اچھے کپڑوں کی ضرورت ہے کیا ہی بہتر ہوتا کہ آپ میرے ساتھ احسان فرماتے ہوئے از روئے مروت و ہمدردی میری مدد فرماتے، مجھے نکاح اور شادی کا مسئلہ درپیش ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر اچھا جوڑا پہن لوں تاکہ سسرال میں کچھ عزت بن سکے۔ امام اعظم نے فرمایا دو ہفتے صبر کرو، چنانچہ دو ہفتوں کے بعد جب وہ شخص دوبارہ حاضر خدمت ہوا تو امام صاحب نے اس نوجوان کو دو عمدہ کپڑے عنایت فرمائے، جب کی اس زمانے میں ان کپڑوں کی قیمت بیس دینار تھی اور اس کے ساتھ ایک دینار نقد مرحمت فرمایا، نوجوان خلاف توقع اس قدر قیمتی سوغات اور نقدی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا، امام صاحب بھی اس کی حیرت کو سمجھ گئے اور فرمایا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں یہ تو تمہاری اپنی رقم ہے تمہارا اپنا مال ہے، ہوا یوں کہ میں نے اپنی طرف سے کچھ سامان تمہارے نام سے اپنے سامان تجارت میں بغداد بھیج دیا، چنانچہ وہ فروخت ہو گیا جس کے منافع میں تمہارے لیے یہ بیس دینار کے دو کپڑے لے لیے گئے اور ایک دینار بچ بھی گیا اور مجھے اپنا راس المال بھی واپس موصول ہو گیا ہے۔ لو اگر تم انہیں قبول کرو فبہا ورنہ میں ان کو بیچ دوں گا اور تمہاری طرف سے اس کی قیمت اور دینار صدقہ کر دوں گا۔ (موفق ج ا ص ٢٦٢، ٢٦٣)

یوسف بن خالد السمتی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ کسی حاجی صاحب نے امام صاحب کی خدمت میں جوتوں کے ایک ہزار جوڑوں کا ہدیہ بھیجا، امام اعظم نے انہیں قبول فرما لیا مگر اپنے مشائخ، علما، تلامذہ اور محبین و مخلصین اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیے، دو ایک روز بعد امام صاحب کو اپنے بیٹے کے لیے جب جوتے خریدنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور بازار تشریف لے جانے لگے تاکہ اپنے بیٹے کے لیے جوتا خریدیں، تو امام صاحب کے مشہور بصری شاگرد یوسف بن خالد سمتی نے عرض کیا، حضرت آپ کی خدمت میں تو کل ایک ہزار جوتوں کا ہدیہ بھیجا گیا تھا اس کے ہوتے ہوئے پھر نئے جوتے لینے کی کیا ضرورت پڑی؟ فرمانے لگے، ان جوتوں میں ایک جوڑا بھی میری ذات کے لیے نہیں رکھا گیا اور نہ ہی میرے گھر بھیجا گیا بلکہ گھر جانے سے قبل میں نے انہیں اپنے رفقا، علما اور تلامذہ میں تقسیم کر دیا۔ (موفق ج ا ص ٢٥٨)

عبد اللہ بن بکر سہمی سے روایت ہے کہ مکہ کے راستے میں میرے رفیق سفر جمال نے میرے ساتھ کچھ رقم کے بارے میں تنازع کیا، بات بڑھ گئی تو وہ مجھے امام ابوحنیفہ کی مجلس میں کھینچ کر لے گئے جب انہوں نے ہم سے مقدمہ کی نوعیت دریافت کی تو ہم نے اصل مقدار رقم میں اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے تو امام صاحب ششدر ہو کر فرمانے لگے، کتنی رقم ہے جس میں تم لوگ

اس قدر تنازع کر رہے ہو، میرے ساتھی جمال نے عرض کیا چالیس درہم! امام صاحب فرمانے لگے عجیب بات ہے کہ لوگوں میں باہمی مروت، اخوت اور مواساۃ ختم ہو چکے ہیں مجھے تو ابو حنیفہ کے اس ارشاد سے بے شرمندگی ہوئی مگر امام صاحب نے اپنی جیب خاص سے چالیس درہم نکال کر جمال کے حوالے کر دیے اور اس طرح ان کے جود وسخا اور لطف وعنایت سے جھگڑا ختم ہو گیا۔ (موفق ج ۱ص ۲۵۹)

شفیق بن ابراہیم بیان کرتے ہیں: میں اور امام ابو حنیفہ کسی مریض کی عیادت کے لیے جا رہے تھے تو راستے میں ایک شخص نے دور سے امام صاحب کو آتے ہوئے دیکھا وہ آپ سے چھپنے لگا اور اس نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا امام صاحب نے اس کا یہ حال دیکھا تو بلند آواز سے پکارا اے فلاں شخص! تم جس راستے پر چل رہے تھے اسے کیوں بدل دیا، دوسرا راستہ اختیار نہ کرو اسی راستہ پر چلو، جب اس شخص کو معلوم ہو گیا کہ امام صاحب نے اسے دیکھ لیا ہے تو وہ شرمندہ ہوا، امام اعظم نے اس سے پوچھا، تم نے اپنی راہ کیوں بدلی ہے؟ راہ گیر نے عرض کی حضرت! دس ہزار کی رقم آپ کی مجھ پر باقی ہے ادا کرنے میں تاخیر ہو گئی ہے، آپ کو دیکھ کر سخت ندامت ہوئی، نظر ملانے کی ہمت نہیں رکھتا اس لیے دوسری گلی کی طرف مڑ گیا تھا۔ امام اعظم نے فرمایا: ”**سبحان الله بلغ بك الامر كل هذا حتى اذا رايتني تواريت**“ سبحان اللہ! اتنی سی بات کے لیے تم نے مجھے دیکھ کر راستہ بدل دیا تھا اور مجھ سے چھپنے کی کوشش کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ امام صاحب نے قرضدار سے یہ بھی کہا ”**قد وهبت منك كله**“ جاؤ! میں نے یہ ساری رقم تجھے بخش دی۔

امام اعظم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، راوی کا بیان ہے: مستزاد یہ کہ امام صاجب نے قرض دار سے معافی مانگی اور بڑی لجاجت سے کہا کہ مجھے دیکھ کر تمہارے دل میں ندامت یا دہشت کی جو کیفیت پیدا ہوئی خدا کے واسطے اسے معاف کر دو۔

(عقود الجمان ص ۲۳۵)

امام صاحب ہر سال ایک مخصوص رقم کا سامان خرید کر کوفہ سے بغداد جانے والے سامان تجارت کے ساتھ بھیج دیتے اور اسی رقم سے بغداد سے بھی سامان منگوا کر کوفہ میں فروخت کراتے، اس لین دین اور تجارت سے جو آمدنی ہوتی، اولاً کوفہ کے علما ومشائخ اور محدثین کے کھانے پینے اور ضرورت کا سامان خرید کر گھروں میں بھیج دیتے، اس کے بعد اصل سرمایہ اور منافع کی جو رقم بچ جاتی، اسے بھی انہیں لوگوں میں بڑی کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے تقسیم فرما دیتے کہ

انفقوا فی حوائجکم ولاتحمدوا الاالله تعالیٰ فانی ماعطیکم من مالی شیئا ولکن من فضل الله علی فیکم وهذه ارباح منافعکم ۔

اسے اپنی ضرورتوں میں خرچ کیجیے اور اللہ کی حمد بجا لائیے اس لیے کہ میں نے اپنے مال سے کچھ نہیں دیا بلکہ آپ حضرات کی وجہ سے مجھ پر خدا کا فضل ہے اور یہ آپ ہی لوگوں کے سرمایہ کے منافع ہیں۔

(موفق ج ۱ص ۲۶۲)

عبدالرحمٰن دوسی کا بیان ہے کہ امام صاحب اپنے صاحب زادے حماد کو حکم دیتے کہ وہ روزانہ دس درہم کی روٹیاں خرید کر پڑوسی مسکینوں کو اور دروازے پر آنے والے فقرا کو تقسیم کردیں۔ (موفق ج۱ص۲۵۹)

اسحاق بن اسرائیل کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ کو سنا وہ کہا کرتے تھے، امام اعظم بہت بڑے سخی تھے، اپنے بہت سے شاگردوں کی امداد کرتے تھے، خوشی کے دنوں میں ان پر احسان کرتے اور ہر ایک کے ساتھ حسب مراتب بخشش کرتے، محتاجوں کی شادی کراتے اپنے پاس سے مصارف ادا فرماتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے۔ (موفق ج۱ص۲۵۹)

امام اعظم کی سخاوت ضرب المثل تھی، آپ کے اس وصف جمیل کا اعتراف بہت سے لوگوں نے کیا ہے: حسین بن سلیمان فرمایا کرتے تھے:

ما رایت احدا اسخی من ابی حنیفة کان قد اجری علی جماعة من اصحابه کل شهر جرایة سوی ماکان یوسیهم فی عامة الایام ۔

میں نے ابوحنیفہ سے بڑا سخی کسی کو نہیں دیکھا، آپ اپنے تمام شاگردوں کے لیے ماہانہ وظیفہ دیا کرتے، یہ وظیفہ ان ہدایا کے علاوہ ہوتا جو انہیں عام دنوں میں دیا کرتے تھے۔ (موفق ج۱ص۲۶۰)

امانت داری

امام اعظم متدین فقیہ و مجتہد اور ایماندار تاجر تھے، ان کی ثقاہت، معاملات کی صفائی، خشیت الٰہی کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگ اپنی امانتیں تفویض کیا کرتے تھے، امام اعظم حسن اخلاق کا پیکر تھے، وہ کسی ضرورت مند کو محروم نہیں کرتے تھے۔ قاضی ابو یوسف کا بیان ہے: ”کان ابو حنیفة لا یکاد یسئل حاجة الا قضاها“ امام ابوحنیفہ کا حال یہ تھا، کہ کوئی حاجت جو پیش کرنے والے ان پر پیش کرتے، تو مشکل ہی سے کوئی ایسی حاجت ہوگی، جسے وہ پوری نہ فرماتے ہوں۔ (موفق ج۱ص۱۷۵)

رحم دلی اور مروت کی اس صفت کی بنا پر لوگوں کی امانتوں کو مسترد کرنا خلاف انسانیت تصور کرتے تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی بینکوں کا نظام قائم نہیں ہوا تھا، عام طور پر لوگوں کے گھر غیر محفوظ ہوا کرتے تھے یا پھر سفر پر جانے والوں کے لیے بڑی بڑی رقمیں خالی گھر میں چھوڑنا خطرے سے خالی نہ تھا، ان حالات میں لوگوں کی امانت رکھنا بھی خلق خدا کی بہت بڑی خدمت تھی۔ دوسری جانب خود امانتوں کی حفاظت کے لیے قابل اعتماد بندوبست ان کی نگرانی امانتوں کی فہرست، ان کے مالکوں کے نام اور پتوں کے اندراج کے لیے باضابطہ دفتر کی ضرورت تھی، امام صاحب نے وسیع کاروبار تجارت علمی و دینی مشغولیتوں کے باوجود صرف خلق خدا کی دلداری کے لیے ان کی گاڑھی کمائیوں کی حفاظت کا اہتمام فرمایا اور وہ اس امر میں اتنے ثابت قدم اور مستقل مزاج واقع ہوئے تھے کہ زندگی کے آخری ایام تک یہ اہم اخلاقی فریضہ انجام دیتے رہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وصال کے بعد آپ کے امانت خانے میں پانچ کروڑ روپے کی امانتیں موجود تھیں۔ محمد بن فضل بن عطیہ کا بیان ہے:

مات ابو حنیفة وفی بیته للناس ودائع خمسین الف الف فردها ابنه جمیع ذلك بعد موته،

علی اربابها ۔

ابوحنیفہ کی جس وقت وفات ہوئی اس وقت ان کے گھر میں پانچ کروڑ کی امانتیں لوگوں کی تھیں، تو آپ کے صاحب زادے نے ان امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کر دیا۔ (مناقب ج۱ص۲۲)

امام صاحب کے پاس عمر کے آخری ایام میں امانت کی اتنی بڑی رقم موجود تھی جب کہ وہ سلطانی فتنوں کی گرفت میں آچکے تھے، لوگوں کی امانتوں کو حتی المقدور لوٹانے کی کوشش کی ہوگی، پھر بھی پانچ لاکھ روپے بچ رہے، ظاہر ہے کہ صحت وسلامتی کے دور میں اس سے کہیں زیادہ خطیر رقمیں بطور امانت آپ کے پاس ہوا کرتی تھیں۔ آپ کی امانت ودیانت اور وفور تقویٰ کی وجہ سے لوگ بلا تامل اپنی رقمیں بطور امانت جمع کرتے، اس کام میں آپ کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ لوگ امین اعظم کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ وکیع کا بیان ہے: ”**کان ابو حنیفة عظیم الامانة**“ ابوحنیفہ بڑے امانت دار تھے۔

(موفق ج۱ص۲۲۰)

ابونعیم اور فضل بن دکین کا بیان ہے: ”**کان ابو حنیفة حسن الدیانة عظیم الامانة**“ ابوحنیفہ انتہائی دیندار اور بڑے امانت دار تھے۔ (الخیرات الحسان ص۸۸)

شام میں ایک شخص نے حکم بن ہشام ثقفی سے کہا،

کان اعظم الناس امانة وارادہ السلطان ان یتولی مفاتیح خزائنہ او یضرب ظهرہ فاختار عذابہ علی عذاب اللہ تعالیٰ ۔

ابوحنیفہ لوگوں میں بڑے امانت دار تھے، جب خلیفہ نے چاہا کہ وہ اس کے خزانے کی چابیوں کے متولی اور نگراں بن جائیں ورنہ انہیں وہ سزا دے گا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے عذاب کے بجائے خلیفہ کی ایذا رسانی کو قبول فرمالیا۔

یہ سن کر حکم بن ہشام نے کہا میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو امام ابوحنیفہ کے اوصاف اس طرح بیان کرتا ہو تو اس شخص نے کہا ”**هو واللہ کما قلت**“ خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ (ایضا)

ایک دیہاتی نے آپ کے پاس ایک لاکھ ستر ہزار درہم بطور امانت رکھے، مگر وہ فوت ہوگیا، اس نے کسی کو بتایا بھی نہ تھا کہ میں نے اس قدر رقم امام اعظم کے پاس بطور امانت رکھوائی ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، جب وہ بالغ ہوئے تو امام اعظم نے انہیں اپنے پاس بلایا اور ان کے والد کی ساری رقم لوٹا دی اور فرمایا یہ تمہارے والد کی امانت تھی، آپ نے یہ امانت خفیہ طور پر لوٹائی تا کہ لوگوں کو اتنی بڑی رقم کا علم نہ ہو اور وہ انہیں تنگ نہ کریں۔ (الموفق ص۲۳۷)

امام اعظم کا تقویٰ اور امانت ودیانت کے باعث علما اور عوام آپ کی بے حد عزت کیا کرتے تھے، جب کہ مخالفین وحاسدین حسد کی آگ میں جلتے رہتے اور مختلف حربے استعمال کر کے آپ کے مقام ورتبے کو گھٹانے کی مذموم کوشش کرتے۔

ایک بار ایک شخص کے ذریعہ آپ کے پاس ایک تھیلی امانت رکھوائی گئی، جس پر سرکاری مہر بھی لگی ہوئی تھی، حاسدوں کی بدگمانی یہ تھی کہ امام اعظم کچھ عرصہ بعد یقیناً اس رقم کو کاروبار میں استعمال کریں گے اور اس پر گرفت کی جائے گی، چنانچہ اس منصوبہ بندی کے ساتھ ایک شخص نے کوفہ کے قاضی ابن ابی لیلیٰ کے پاس دعویٰ دائر کیا کہ امام ابوحنیفہ نے فلاں شخص کا مال تجارت کے لیے اپنے بیٹے کو دے دیا ہے، حالاں کہ یہ مال امانت کے طور پر رکھوایا تھا۔ چنانچہ امام صاحب کو طلب کیا گیا اور بتایا گیا کہ آپ پر الزام ہے کہ آپ نے فلاں شخص کی امانت اپنے کاروبار میں لگا دی ہے، آپ نے فرمایا یہ الزام بالکل غلط ہے، اس کی امانت جوں کی توں میرے پاس محفوظ ہے، اگر آپ چاہیں، تو سرکاری نمائندہ بھیج کر تصدیق کر لیں۔ جب لوگ آئے تو آپ کے مال خانے میں وہ امانت ویسی ہی موجود پائی جس پر سرکاری مہر لگی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر سب کو ندامت ہوئی۔ (ایضاً ص ۲۴۴)

صبر و حلم

صبر و حلم انسانی کردار کا وہ جوہر ہے جو اس کی زندگی کو صالح اخلاقی نظام کا پابند بنا کر اس کے قول و فعل، عمل و کردار کو خالص دینی سانچے میں ڈھال دیتا ہے، جنگ و جدل، عداوت و خصومت، غضب و حسد جیسے مذموم صفات سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔ امام اعظم جلالت شان کے باوجود نہایت حلیم و بردبار اور متواضع انسان تھے۔ آپ عظیم قوت برداشت اور بے پناہ صبر و تحمل کا پیکر تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے مناظرے کے دوران گستاخانہ گفتگو شروع کی اور آپ کو بدعتی اور زندیق کہہ کر مخاطب کیا، اس پر آپ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کرے، وہ خوب جانتا ہے میرے بارے میں جو تم نے کہا وہ سچ نہیں ہے، میں تمہارے عقیدے سے اتفاق نہیں کرتا، جب سے میں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا ہے اس کے برابر کسی کو نہ جانا، میں اس کی بخشش کا امیدوار ہوں اور میں اس کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے آپ رو پڑے اور روتے روتے بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر ہوش آیا تو اس شخص نے کہا مجھے معاف کر دیجیے آپ نے فرمایا جس جاہل نے بھی میرے بارے میں کچھ کہا ہے وہ معاف ہے اور جو علم کے باوجود مجھ میں عیب بتائے تو وہ قصوروار ہے۔ (الخیرات الحسان ص ۱۳۰)

علامہ ابن حجر رقم طراز ہیں: آپ بہت باوقار انسان تھے، جب گفتگو فرماتے تو کسی کے جواب کے لیے ہی فرماتے اور بے کار ولغو باتوں پر غور نہ کرتے اور نہ ہی ایسی باتیں سنتے۔ جب آپ کے پاس کوئی شخص آ کر کہتا کہ فلاں نے ایسی بات کہی ہے تو آپ فرماتے، یہ بات چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ فلاں معاملہ میں کیا کہتے ہو۔ یہ کہہ کر اس کی بات منقطع فرماتے اور ارشاد فرماتے ایسی باتیں کہنے سے بچو جنہیں لوگ ناپسند کرتے ہوں۔ (ایضاً ص ۱۳۱)

ایک دفعہ آپ مسجد خیف میں تشریف فرما تھے، شاگردوں اور ارادت مندوں کا حلقہ تھا، ایک شخص نے مسئلہ پوچھا، آپ نے مناسب جواب دیا، اس نے کہا، مگر حسن بصری نے اس کے خلاف بتایا ہے، آپ نے فرمایا حسن بصری سے اس مسئلہ میں اجتہادی غلطی ہوئی ہے، ایک شخص کھڑا ہوا جس نے کپڑے سے منہ چھپا رکھا تھا، وہ کہنے لگا اے زانیہ کے بیٹے! تم حسن بصری کو خطاکار اور غلط کہتے ہو اس بے ہودہ گوئی پر لوگ مشتعل ہو گئے اور اسے مارنا چاہا مگر امام اعظم نے انہیں روک دیا اور سب کو

خاموش کر کے بٹھا دیا اور اس شخص سے نہایت تحمل اور وقار کے ساتھ فرمایا ہاں حسن بصری سے غلطی ہوئی اور عبداللہ بن مسعود نے اس بارے میں جو حضور سے روایت کی ہے وہ صحیح ہے۔ (مناقب للموفق ص ۲۹۸)

امام اعظم ایک دن مسجد میں درس دے رہے تھے کہ ایک شخص جو آپ سے بغض وعناد رکھتا تھا، آپ کی شان میں برے الفاظ کہنے لگا، آپ نے توجہ نہ کی اور اسی طرح درس میں مشغول رہے اور شاگردوں کو اس کی طرف توجہ کرنے سے منع فرمادیا۔ جب آپ درس کے بعد گھر کی طرف چلے تو وہ شخص بھی گالیاں بکتا ہوا پیچھے پیچھے چلا، آپ نے اسے کوئی جواب نہ دیا بلکہ خاموشی اور وقار سے سر جھکائے اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہ آپ کے دروازے پر سر مارنے لگا اور بولا تم مجھے کتا سمجھتے ہو کہ میں بھونک رہا ہوں اور تم جواب بھی نہیں دیتے۔

اس واقعہ کے ذیل میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے جب امام اعظم اپنے گھر کے قریب پہنچے تو کھڑے ہو گئے اور اس گالی بکنے والے سے فرمایا یہ میرے گھر کا دروازہ ہے اور میں اندر جانا چاہتا ہوں اس لیے تم جتنی گالیاں دینا چاہو دے لو تا کہ تمہیں کچھ حسرت باقی نہ رہے۔ وہ شخص شرم سے سر جھکا کر بولا آپ کے صبر وتحمل کی انتہا ہے آپ مجھے معاف کر دیں۔ آپ نے فرمایا، جاؤ تمہیں معاف کر دیا۔ (ایضا ص ۲۸۶)

عبادت وریاضت

امام اعظم کی ذات علم وعمل کی جامع تھی، انہوں نے تحصیل علم، اشاعت علم اور عبادت وریاضت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ وہ صائم الدہر اور قائم اللیل تھے۔ ایک رات میں ختم قرآن کیا کرتے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

وکان معدودا فی الاجواد والاسخیاء والاولیاء الاذکیاء مع الدین والعبادة والتعبد وکثرة التلاوة وقیام اللیل رضی اللہ عنہ۔

دینداری، عبادت وریاضت، تہجد گزاری، کثرت تلاوت اور شب بیداری کے ساتھ آپ کا شمار بیدا رمغز اور فیاض لوگوں میں ہوتا تھا۔ (تاریخ ذہبی ص ۲۰۶)

اسد بن عمرو سے روایت ہے:

ان اباحنیفة صلی العشاء والصبح بوضوء اربعین سنة۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے چالیس سال تک ایک ہی وضو سے عشا اور فجر کی نماز پڑھی۔ (ایضا)

یحیٰی بن عبدالحمید حمانی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں جو چھ مہینے تک ابوحنیفہ کی صحبت میں رہے۔

فما رآہ صلی الغداة الا بوضوء عشاء الاخیرة وکان یختم القرآن فی کل لیلة عند السھر۔

انہوں نے امام اعظم کو اس مدت میں عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور ہر رات صبح تک آپ

قرآن پاک ختم کر دیا کرتے تھے۔ (ایضا)

اسحاق کہتے ہیں:

كان ورعا زاهدا صواما قواما تاليا لكتاب الله عالما بما فيه غاية في الفقه لم يسمع بمثله في فنه ۔ (موفق ج ا ص ۲۵۹)

امام اعظم زاہد متقی، روزہ دار شب بیدار کتاب اللہ کی تلاوت کرنے والے، علوم قرآنی کے عالم، زبردست فقیہ، فقہ میں آپ کی نظیر نہیں ملتی۔

علامہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں:

قال الذهبي قد تواتر قيامه الليل وتهجده وتعبده ومن ثمة كان يسمى الوتد من كثرة قيامه الليل بل احياه بقرأة القرآن في ركعة ثلاثين سنة وحفظ عنه انه صلى صلاة الفجر بوضوء العشاء اربعين سنة فكان عامة الليل يقرأ جميع القرآن في ركعة واحدة يسمع بكاءه بالليل حتى يرحمه جيرانه ۔ (الخيرات الحسان ص ۷۴)

امام ذہبی نے فرمایا ابوحنیفہ کا پوری رات عبادت کرنا اور تہجد پڑھنا تواتر سے ثابت ہے اور یہی وجہ ہے کہ کثرت قیام کی وجہ سے آپ کو وتد یعنی میخ (کیل) کہا جاتا تھا۔ آپ تیس سال تک ایک رکعت مین مکمل قرآن پڑھتے رہے اور آپ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے عشا کے وضو سے فجر کی نماز چالیس سال تک پڑھی۔ عام راتوں مین ایک ہی رکعت میں پورا قرآن پڑھ لیتے تھے رات میں لوگ ان کی گریہ وزاری سنتے یہاں تک کہ ان کے پڑوسیوں کو ان پر رحم آتا۔

امام اعظم کے تمام رات عبادت کرنے کا باعث یہ واقعہ ہوا کہ ایک بار آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں آپ نے کسی شخص کو یہ کہتے سنا کہ یہ امام ابوحنیفہ ہیں جو تمام رات اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور سوتے نہیں۔ آپ نے امام ابو یوسف سے فرمایا:

سبحان الله الا ترىٰ ان الله تعالىٰ نشر لنا هذا الذكر او ليس يقبح ان يعلم الله تعالىٰ منا ضد ذلك والله لا يتحدث الناس عني بما لم افعل ۔(ايضا)

سبحان اللہ! کیا تم خدا کی شان نہیں دیکھتے کہ اس نے ہمارے لیے اس قسم کا چرچا کر دیا اور کیا یہ بری بات نہیں کہ لوگ ہمارے متعلق وہ بات کہیں جو ہم میں نہ ہو لہٰذا ہمیں لوگوں کے گمان کے مطابق بننا چاہیے خدا کی قسم! میرے بارے میں لوگ وہ بات نہ کہیں گے جو میں نہیں کرتا۔

ابو یوسف کا بیان ہے:

فكان يحيى الليل صلاة وتضرعا ودعاء .

چنانچہ آپ تمام رات نماز، گریہ وزاری اور دعا میں گزارنے لگے۔

ابونعیم نے کہا: میں علما سے بکثرت ملا ہوں، جیسے اعمش، مسعر، حمزۃ الزیات، مالک بن مغول، اسرائیل، عمرو بن ثابت اور دوسرے اکابر جن کو میں شمار نہیں کرسکتا اور میں نے ان حضرات کے ساتھ نماز پڑھی ہے، لیکن میں نے کسی کو بھی ابوحنیفہ کی نماز سے اچھی نماز پڑھنے والا نہیں پایا۔ نماز پڑھنے سے پہلے آپ دعا کرتے تھے اور اللہ سے سوال کرتے تھے اور روتے تھے، آپ کی حالت کو دیکھ کر کہنے والے کہا کرتے تھے، قسم ہے اللہ کی یہ شخص اللہ سے ڈرتا ہے۔ (اخبار ابی حنیفہ ص ۴۵)

معانی بن عمران نے الجویریہ سے سنا کہ میں نے حماد بن ابی سلیمان، حارب بن دثار، علقمہ بن مرثد، عون بن عبداللہ، سلمہ بن کہیل، عطا، طاؤس، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کو دیکھا ہے اور میں ان کی صحبت میں رہا ہوں اور میں نے ابوحنیفہ کو ان کی جوانی میں دیکھا ہے اور ان سب حضرات سے ان کو ''احسن لیلا'' پایا یعنی ان کی رات سب میں اچھی تھی (شب بیداری اور عبادت گزاری میں گزرتی تھی)۔ (ص ۴۵)

خارجہ بن مصعب نے کہا:

ختم القرآن فی رکعة اربعة من الائمة .

قرآن مجید کو ایک رکعت میں اول تا آخر ائمہ میں سے چار حضرات نے پڑھا ہے اور وہ حضرت عثمان بن عفان، تمیم داری، سعید بن جبیر اور ابوحنیفہ ہیں۔ (ص ۴۵)

ابن حجر ہیتمی مکی نے الخیرات الحسان میں خارجہ کی روایت نقل کی ہے:

ختم القرآن فی رکعة داخل الكعبة اربعة وعد منهم اباحنيفة .

کہ بیت اللہ شریف کے اندر قرآن مجید کا ختم ایک رکعت میں چار حضرات نے کیا ہے اور ان چار میں ابوحنیفہ کا شمار کیا ہے۔

ابن حجر آگے چل کر اور لکھتے ہیں: بعض اہل مناقب نے لکھا ہے کہ حضرت امام اعظم نے جب آخری حج کیا تو آپ نے اپنا آدھا مال بیت اللہ شریف کے خدمتگاروں کو دیا تا کہ ان کو بیت اللہ شریف کے اندر نماز پڑھنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ آپ کو موقع ملا اور آپ نے نصف کلام پاک ایک ٹانگ پر اور نصف کلام پاک دوسری ٹانگ پر کھڑے ہو کر پڑھا اور پھر آپ نے یہ دعا کی:

يارب عرفتك حق معرفتك وماعبدتك حق العبادة فهب لی نقصان الخدمة لكمال المعرفة فنودی من زاوية البيت عرفت واحسنت واخلصت الخدمة غفرلك ولمن كان على مذهبك الى قيام الساعة .

اے میرے پروردگار میں نے تجھ کو جانا اچھی طرح کا جاننا اور میں نے تیری بندگی کی جیسی چاہیے تھی نہیں کرسکا۔ میری بندگی کی کوتاہی کو بہ وجہ کمال معرفت عفو فرما، اس وقت بیت اللہ شریف کے کونے سے یہ ندا آئی، تو نے جانا اور اچھا جانا اور تو نے بندگی اخلاص سے کی لہذا بخش گئیں (تیری کوتاہیاں) اور ان سب کی جو تیرے طریقہ پر ہوں گے قیامت برپا ہونے تک۔ (الخیرات الحسان ص ۷۶)

ابن حجر نے لکھا ہے:

قال بعضهم ما رايت اصبر على الطواف والصلاة والفتيا بمكة من ابى حنيفة انما كان كل الليل والنهار فى طلب الآخرة وسمع هاتفا فى المنام وهو فى الكعبة يقول يا اباحنيفة اخلصت خدمتي واحسنت معرفتي فقد غفرت لك ۔

بعض حضرات نے کہا ہے، میں نے مکہ مکرمہ میں ابوحنیفہ سے طواف و نماز اور فتویٰ دینے میں زیادہ مشغول کسی شخص کو نہیں دیکھا ہے وہ ساری رات اور سارا دن آخرت کی طلب میں رہتے اور بیت اللہ میں نیند کی حالت میں انہوں نے ہاتف سے سنا کہ وہ کہہ رہا تھا، اے ابوحنیفہ تو نے میری خدمت اخلاص سے کی اور میری معرفت اچھی حاصل کی، میں نے تیری خطائیں معاف کردیں۔ (ایضاً ص ۶۷)

خشیت الٰہی

امام اعظم کا قلب خشیت و خوف الٰہی سے ہمیشہ لبریز رہتا تھا۔ ان کا یہ وصف مکارم اخلاق کی اساس ہے، جس انسان کا دل خوف خدا سے آشنا ہو جائے، اس کا دامن کبھی غبار معصیت سے آلودہ نہیں ہوسکتا، وہ اعتدال و انصاف کی ڈگر پر گامزن رہے گا اور دنیا کی بڑی بڑی جبروتی طاقتیں اسے اپنے سامنے سرنگوں نہیں کرسکتیں۔ یہی وجہ تھی کہ امام اعظم نے امرا و خلفا کے روبرو حق بات کہنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کیا۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے، اللہ کا نام آتا تو اشکبار ہو جاتے، نمازوں میں خشیت الٰہی کی وجہ سے رویا کرتے۔

وکیع بن جراح کہتے ہیں:

كان والله عظيم الامانة وكان الله تعالىٰ فى قلبه جليلا كبيرا وكان يوثر رضا ربه تبارك وتعالىٰ على كل شئ ولو اخذته السيوف فى الله تعالىٰ لاحتمل رحمة الله عليه رضى عنه ربه رضا الابرار فلقد كان منهم ۔

بخدا آپ بہت دیانت دار تھے اور خدا کی جلالت اور کبریائی آپ کے قلب میں راسخ تھی۔ آپ اپنے رب کی خوشنودی کو ہر چیز پر ترجیح دیتے اور چاہے تلواروں سے ان کے ٹکڑے کردیے جاتے وہ اپنے رب کی رضا نہ چھوڑتے۔ آپ کا رب آپ سے ایسا راضی ہوا جیسے ابرار سے ہوتا ہے اور امام اعظم واقعی ابرار میں سے تھے۔ (ایضاً)

یزید بن لیث کہتے ہیں: امام اعظم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے تھے۔ امام نے نماز عشا میں سورہ زلزال تلاوت کی، جب نماز ختم ہوئی، تو میں نے دیکھا کہ امام اعظم متفکر بیٹھے ہیں اور لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں، میں وہاں سے چلا آیا اور چراغ جس میں تیل کم ہی تھا وہیں چھوڑ دیا کہ کہیں ان کا دھیان نہ بٹے۔ صبح صادق کے وقت میں مسجد آیا تو دیکھا کہ آپ اپنی ڈاڑھی پکڑے ہوئے ہیں اور فرما رہے ہیں:

یامن یجزی بمثقال ذرة خیر خیرا ویامن یجزی بمثقال ذرة شر شرا اجز النعمان عندك من النار ومایقرب منها وادخله فی سعة رحمتك۔

اے وہ جو ذرہ بھر نیکی کا بدلہ دیتا ہے اور اے وہ جو ذرہ بھر برائی کی سزا دیتا ہے اگر نعمان کی جزا تیرے پاس جہنم یا اس سے قریب ہے تو اسے بچا اور اپنی رحمت میں داخل فرما۔

راوی کہتے ہیں جب میں پہنچا تو چراغ ٹمٹما رہا تھا آپ نے فرمایا کیا چراغ لینے آئے ہو؟ میں نے عرض کی حضور! فجر کی اذان ہو چکی ہے۔ آپ نے فرمایا جو تم نے دیکھا اسے چھپانا پھر آپ نے عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا فرمائی۔ (ایضا ص ۱۲۶)

ابو الاحوص فرماتے ہیں:

لو قیل له انك تموت الی ثلاثة ایام ما کان فیه فضل شیئ یقدر ان یزید علی عمله الذی کان یعمل۔ (الخیرات الحسان ص ۷۸)

اگر امام اعظم سے یہ کہا جاتا کہ آپ تین دن میں انتقال کر جائیں گے تو بھی آپ اپنے معمول کے اعمال سے کچھ زیادہ نیکی نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ وہ اس قدر نیکیاں کرتے تھے کہ ان میں اضافہ ممکن ہی نہ تھا۔

(ایضا ص ۱۲۷)

ابو یحییٰ نیشاپوری کہتے ہیں: میں نے ساری رات امام ابو حنیفہ کو نماز پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑاتے دیکھا، میں دیکھتا کہ آپ کے آنسو مصلے پر بارش کے قطرے کی طرح ٹپک رہے ہیں۔ (الخیرات الحسان ص ۷۹)

امام اعظم فرماتے تھے: اگر لوگ اپنے معاملات میں درست رہتے تو میں کسی کو فتویٰ نہ دیتا، مجھے اس سے بڑھ کر کوئی خوف نہیں کہ میں اپنے کسی فتویٰ کی وجہ سے کہیں دوزخ میں نہ چلا جاؤں۔ مزید فرمایا:

مااجترأت علی اللہ تعالیٰ منذ فقهت۔

میں جب سے فقیہ ہوا کبھی اللہ تعالیٰ پر جرأت نہ کی۔ (ایضا)

ایک روز امام اعظم کہیں جا رہے تھے، کہ لاعلمی میں آپ کا پاؤں ایک لڑکے کے پاؤں پر آ گیا۔ اس لڑکے نے کہا، اے شیخ! کیا تم قیامت کے روز خدا کے انتقام سے نہیں ڈرتے؟ آپ نے یہ بات سنی تو غش کھا کر گر پڑے کچھ دیر بعد ہوش آیا تو مسعر بن کدام نے عرض کیا۔ اس لڑکے کی بات نے آپ کے دل پر اتنا عظیم اثر کیا؟ آپ نے فرمایا:

اخاف انه لقن

کیا عجب کہ اس کی آواز غیبی ہدایت ہو۔ (ایضا)

آپ کے دل میں خوف خدا اس قدر تھا کہ ایک مرتبہ کسی شخص سے گفتگو فرما رہے تھے، کہ اس شخص نے کہا، خدا سے ڈرو۔ یہ سننا تھا کہ امام اعظم کا چہرہ زرد پڑ گیا، سر جھکا لیا اور فرمایا خدا تمہیں جزائے خیر دے، ہر وقت لوگوں کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی انہیں خدا کی یاد دلائے۔ (سوانح امام اعظم ص ۲۲۲)

ایک دن امام نے فجر کی نماز میں یہ آیت کریمہ پڑھی:

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰہَ غَافِلاً عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (ابراہیم: ۴۲/۱۴)

(اور ہرگز اللہ کو بے خبر نہ جاننا ظالموں کے کام سے)

تو آپ لرز گئے اور کپکپی طاری ہو گئی۔ آپ کی اس کیفیت کو لوگوں نے محسوس کر لیا۔ امام اعظم کو جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو آپ فرماتے، یہ مشکل میرے کسی گناہ کی وجہ سے ہے تو آپ اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتے اور وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرتے اور استغفار کرتے تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ آپ فرماتے، مجھے خوشی ہوئی کیوں کہ مجھے امید ہے کہ رب تعالیٰ میری توبہ قبول فرمائے گا اس بات کی اطلاع حضرت فضیل بن عیاض کو ہوئی تو بہت روئے اور فرمایا:

رحم اللہ اباحنیفة انما کان ذلك لقلة ذنوبه واما غیره فلایتنبه لذلك لان ذنوبه قد استغرقته ۔

اللہ تعالیٰ ابو حنیفہ پر رحم فرمائے یہ بصیرت ان کے گناہوں کی کمی کی وجہ سے ہے جب کہ دوسرے لوگوں کو یہ بیداری حاصل نہیں ہوتی کیوں کہ وہ گناہوں میں مستغرق ہوتے ہیں۔ (الخیرات الحسان ۷۹)

زہد و تقویٰ

امام اعظم کا دامن اخلاق زہد و تقویٰ کے لعل و گہر سے مالا مال تھا، ان کا دل دنیاوی مال و جاہ کی حرص سے پاک تھا۔ دنیا ان کے نزدیک پرکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے کبھی جاہ و منصب اور شاہی نذور و فتوح کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں: میں نے امام اعظم سے زیادہ متقی کسی کو نہ دیکھا، تم ایسے شخص کی کیا بات کرتے ہو جس کے سامنے کثیر مال پیش کیا گیا اور اس نے اس مال کو نگاہ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں، اس پر اسے کوڑوں سے مارا گیا مگر اس نے صبر کیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر مصائب کو برداشت کیا مگر مال و متاع قبول نہ کیا، بلکہ دوسروں کی طرح (جاہ و مال دنیا کی) کبھی تمنا اور آرزو بھی نہ کی حالاں کہ لوگ ان چیزوں کے لیے سو سو جتن اور حیلے کرتے ہیں، بخدا آپ ان تمام علما کے برعکس تھے جنہیں ہم مال و انعام کے لیے دوڑتا دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ دنیا کے طالب ہیں اور دنیا ان سے بھاگتی ہے۔ جب کہ امام اعظم وہ تھے کہ دنیا ان کے پیچھے آتی تھی اور آپ اس سے دور بھاگتے تھے۔ (الخیرات الحسان ص ۵۸)

مکی بن ابراہیم نے فرمایا:

جالست الکوفیین فلم ار فیهم اورع منه ۔(ایضا)

میں کوفہ والوں کے ساتھ رہا ہوں لیکن میں نے امام اعظم ابوحنیفہ سے متقی کسی کو نہ دیکھا۔

حسن بن صالح کہتے ہیں:

کان شدیداالورع هائبا للحرام تارکا للکثیر من الحلال مخافة الشبهة ما رایت فقیها اشد منه صیانة لنفسه ولعلمه وکان جهاده کله الی قبره ۔ (ایضا)

آپ سخت پرہیزگار تھے، حرام سے ڈرتے تھے اور شبہ کی وجہ سے کئی حلال چیزیں بھی چھوڑ دیتے تھے۔ میں نے کوئی فقیہ ایسا نہ دیکھا جو اپنے نفس اور علم کی حفاظت آپ سے زیادہ کرتا ہو وہ آخری عمر تک جہاد کرتے رہے۔

یزید بن ہارون فرماتے ہیں: میں نے ایک ہزار شیوخ سے علم حاصل کیا مگر میں نے ان میں امام ابوحنیفہ سے زیادہ نہ تو کسی کو متقی پایا اور نہ اپنی زبان کا حفاظت کرنے والا۔ آپ کو زبان کی حفاظت کا اتنا شدید احساس تھا کہ وکیع فرماتے ہیں، آپ نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی سچی قسم کھائی تو ایک درہم صدقہ کریں گے۔ چنانچہ ایک بار قسم کھائی تو ایک درہم صدقہ کیا پھر عہد کیا کہ اگر اب قسم کھائی تو ایک دینار صدقہ کریں گے۔ (ایضا)

آپ کے کاروباری شریک حفص کہتے ہیں: میں امام ابوحنیفہ کے ساتھ تیس سال تک رہا، لیکن میں نے کبھی نہ دیکھا کہ آپ نے اس چیز کے خلاف ظاہر کیا ہو جو آپ کے دل میں ہو، جب آپ کو کسی چیز کے بارے میں شبہ پیدا ہوتا تو آپ اپنے دل سے اس کو نکال دیتے تھے، اگرچہ اس کی خاطر اپنا تمام مال ہی کیوں نہ خرچ کرنا پڑے۔ (ایضا)

کسی نے امام اعظم سے عرض کی، آپ کو دنیا کا مال واسباب پیش کیا جاتا ہے، مگر آپ اسے قبول نہیں فرماتے، حالاں کہ آپ ایماندار ہیں اور یہ آپ کا حق ہے، آپ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ للعیال وانما قوتی فی الشهر درهمان فما جمعی ۔(ایضا)

میں نے اپنے اہل وعیال کو اللہ کے سپرد کر رکھا ہے وہ ان کا خود کفیل ہے میرا ذاتی خرچ دو درہم ماہانہ ہے تو میں اپنی ضرورت سے بڑھ کر کیوں جمع کروں۔

شقیق بن ابراہیم فرماتے ہیں: ہم ایک دن امام اعظم کے پاس مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک چھت سے ایک سانپ آپ کے سر پر لٹکتا دکھائی دیا۔ سانپ دیکھ کر لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی، سانپ سانپ کہہ کر سب بھاگے، مگر امام اعظم نہ تو اپنی جگہ سے اٹھے اور نہ ہی ان کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نظر آئے، ادھر سانپ سیدھا امام اعظم کی گود میں آ گرا آپ نے ہاتھ سے جھٹک کر اسے ایک طرف پھینک دیا مگر خود اپنی جگہ سے نہ ہلے، اس دن سے مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین اور پختہ اعتماد ہے۔

بکیر بن معروف کہتے ہیں: میں نے ایک دن امام اعظم سے عرض کی حضور میں نے آپ جیسا کوئی دوسرا نہیں دیکھا، آپ کے مخالفین آپ کا گلہ کرتے ہیں، آپ کی غیبت کرتے ہیں، مگر آپ جب بھی کسی کا ذکر کرتے ہیں تو اس کی خوبیاں ہی بیان کرتے ہیں، آپ نے فرمایا میں نے کبھی کسی کے عیب تلاش نہیں کیے اور کبھی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیا۔ (ایضاً ص ۲۱۴)

امام اعظم کے بے مثال زہد و تقویٰ کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار کوفہ میں کچھ بکریاں چوری ہو گئیں تو آپ نے دریافت کیا، بکری زیادہ سے زیادہ کتنے سال زندہ رہتی ہے لوگوں نے بتایا سات سال تو آپ نے سات سال تک بکری کا گوشت نہیں کھایا۔ (کہ کہیں چوری کی بکری کا گوشت جسم میں نہ چلا جائے)

انہی دنوں آپ نے ایک فوجی کو دیکھا کہ اس نے گوشت کھا کر اس کا فضلہ کوفہ کی نہر میں پھینک دیا تو آپ نے مچھلی کی طبعی عمر کے بارے میں دریافت کیا اور پھر اتنے سال تک مچھلی کھانے سے پرہیز کیا۔ (الخیرات الحسان ص ۱۴۳)

امام رازی شافعی لکھتے ہیں ایک مرتبہ امام اعظم کہیں جا رہے تھے راستہ میں اتفاقاً آپ کی جوتی میں کچھ نجاست لگ گئی، آپ نے نجاست دور کرنے کے لیے جوتی کو جھاڑا تو کچھ نجاست اڑ کر ایک مکان کی دیوار سے لگ گئی۔ آپ پریشان ہو گئے کہ اگر نجاست یوں ہی چھوڑ دی جائے تو اس کی دیوار خراب ہوتی ہے اور اگر اسے کرید کر دیوار صاف کی جائے تو دیوار کی مٹی بھی اتر آئے گی اور اس سے مالک مکان کو نقصان ہے۔ چنانچہ آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا صاحب خانہ باہر آیا اتفاق سے وہ شخص مجوسی تھا اور آپ کا مقروض بھی تھا، وہ یہ سمجھا کہ آپ قرض واپس لینے آئے ہیں، پریشان ہو کر عذر پیش کرنے لگا، آپ نے فرمایا قرض کو چھوڑو میں اس الجھن میں ہوں کہ تمہاری دیوار کیسے صاف کروں، پھر سارا واقعہ بتا دیا وہ مجوسی آپ کا تقویٰ اور کمال احتیاط دیکھ کر بے ساختہ بولا آپ دیوار بعد میں صاف کیجیے گا پہلے کلمہ پڑھا کر میرا دل صاف کر دیں چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا۔

(تفسیر کبیر زیر آیت یوم الدین)

کشف و فراست

امام اعظم علم و دانش، سیاست و دانائی، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت کا مجمع البحرین تھے۔ خدا داد عقل و فراست کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت کی کثرت نے ان کے قلب کو مزکی اور باطن کو مصفی کر دیا تھا۔ حقائق رسی آئندہ آنے والے حالات کا کشف انہیں اس طرح ہو جاتا، گویا وہ اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی ذات بلاشبہ علم ظاہر و باطن کا سنگم تھی، وہ صاحب کشف و کرامت ولی تھے۔ حقائق و دقائق آپ کے آئینہ قلب میں منعکس ہو جاتے تھے۔ کشف و مشاہدہ ان کا روحانی وصف تھا۔ متعدد واقعات شاہد ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے کسی موقع پر اپنی باطنی فراست سے جو بات ارشاد فرمائی وہ پوری ہو کر رہی۔

امام اعظم ایک دن اپنے اصحاب کے حلقہ میں بیٹھے تھے، اتنے میں وہاں سے ایک شخص کا گزر ہوا، امام صاحب نے اسے دیکھ کر فرمایا، کہ میرا خیال ہے کہ یہ شخص مسافر ہے۔ کچھ دیر بعد ارشاد فرمایا، کہ میرا خیال ہے کہ اس شخص کی آستین میں کوئی

میٹھی چیز بھی ہے، پھر کچھ دیر بعد فرمایا، کہ میرے خیال میں یہ شخص معلم الصبیان ہے۔ کسی نے اس اجنبی کے حالات معلوم کیے، تو پتہ چلا، کہ یہ اجنبی ہے، اس کی آستین میں کشمش ہے، پھر بچوں کا معلم ہے۔ حاضرین نے امام صاحب سے دریافت کیا، کہ آپ کو ان حالتوں کا علم کیسے ہوا؟ امام صاحب نے فرمایا، کہ وہ گھور گھور کر دائیں بائیں دیکھتا رہا اور مسافر جہاں بھی جاتا ہے یہی کرتا ہے۔ میں نے اس کی آستین پر مکھیاں دیکھیں تو سمجھا، کہ اس کی آستین میں کوئی میٹھی چیز ہے۔ مکھی ایسی چیزوں کی طرف دوڑا کرتی ہے اور میں نے اس شخص سے یہ بھی محسوس کیا، کہ صبیان (چھوٹے بچوں) کو بڑی تیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، جس سے میں نے یہ اندازہ لگایا، کہ یہ بچوں کا استاذ ہے۔ (عقود الجمان ص ۲۵۰)

قاضی ابو یوسف غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کی والدہ اکثر انہیں امام صاحب کے درس سے اٹھا کر لے جاتیں، تاکہ کچھ کمائی کریں، ایک دن امام اعظم نے ان کی والدہ سے فرمایا، تم اسے علم سیکھنے دو، میں دیکھ رہا ہوں، کہ ایک دن یہ روغن پستہ کے فالودہ کھائے گا، یہ سن کر وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ مدتوں بعد ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید کے دسترخوان پر فالودہ رکھا گیا، خلیفہ نے امام ابو یوسف کی خدمت میں پیش کیا، پوچھا، یہ کیا ہے؟ خلیفہ نے کہا، فالودہ اور روغن پستہ، یہ سن کر آپ ہنس پڑے، خلیفہ نے ہنسنے کی وجہ دریافت کی، تو آپ نے مذکورہ واقعہ بیان کیا۔ خلیفہ نے کہا، علم دین و دنیا میں عزت دیتا ہے، اللہ تعالیٰ امام ابو حنیفہ پر رحمت فرمائے، وہ باطن کی آنکھوں سے وہ چیزیں دیکھتے تھے، جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتیں۔

(تاریخ بغداد ج۱۳ ص۳۴۵)

ایک مرتبہ امام اعظم ابو حنیفہ جامع کوفہ کے طہارت خانہ میں داخل ہوئے، تو دیکھا، کہ ایک جوان وضو کر رہا ہے اور پانی کے قطرات اس کے اعضا سے ٹپک رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا، اے میرے بیٹے! والدین کی نافرمانی سے توبہ کر، اس نے فوراً کہا، میں نے توبہ کی۔ اسی طرح ایک دوسرے شخص کے پانی کے قطرات دیکھے تو فرمایا، اے بھائی! زنا سے توبہ کر، اس نے کہا میں نے توبہ کی۔ اسی طرح ایک اور شخص کے وضو کا مستعمل پانی دیکھا، تو فرمایا، شراب نوشی اور گانے بجانے سے توبہ کر، اس شخص نے توبہ کی۔ (فتاویٰ رضویہ ج۲ ص۶۵)

امام اعظم سے علمائے مدینہ کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا:

ان افلح منهم احد فالاشقر الازرق يعني مالك بن انس ۔

اگر ان میں سے کوئی فلاح یاب ہے، تو گورے چٹے رنگ والے یعنی مالک بن انس ہیں۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد صاحب الخیرات الحسان رقم طراز ہیں:

لقد بر وصدق في فراسته لان مالكا بلغ من العلم والفلاح مالم يلحقه احد من اهل المدينة في عصره ۔

امام اعظم نے ٹھیک کہا اور سچ فرمایا، اس لیے کہ امام مالک علم و فضل میں اس مرتبہ پر پہنچے کہ مدینہ شریف میں

کوئی عالم ان کا ہم پلہ نہ ہو سکا۔ (الخیرات الحسان ص ۹۱)

ابو جعفر منصور نے جب امام صاحب، شریک، سفیان ثوری اور مسعر بن کدام کو دربار میں طلب کیا اور لوگ چلنے لگے، تو امام اعظم ابو حنیفہ نے قبل از وقت ہی دربار میں پیش آنے والے واقعات اور چاروں کے طرز عمل کے بارے میں بتا دیا تھا، امام صاحب نے فرمایا تھا، میں تم لوگوں کے بارے میں اندازے سے ایک بات کہتا ہوں، میں تو کسی حیلے سے بچ جاؤں گا اور سفیان راستہ سے بھاگ جائیں گے مسعر مجنون بن جائیں گے اور شریک قاضی بنائے جائیں گے۔ چنانچہ سفیان اثنائے راہ قضائے حاجت کے لیے موقع نکال کر بھاگ کھڑے ہوئے، مسعر دربار میں پہنچے، تو پاگلوں جیسی حرکت کرنے لگے، دربار سے نکال دیے گئے، امام صاحب نے کہا، میں خزاز کا بیٹا ہوں، کوفہ والے میری امارت نہیں مانیں گے، باقی رہے شریک تو انہوں نے کوفہ کی قضا کا عہدہ قبول کرلیا، اس طرح امام صاحب کا قول سچ ثابت ہوا۔ (الخیرات الحسان ص ۹۱)

والدین سے حسن سلوک

امام اعظم کے والد گرامی آپ کے بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے جب کہ آپ کی والدہ ایک مدت تک زندہ رہیں۔ آپ اپنی والدہ سے بے حد محبت کرتے اور ان کی خوب خدمت کرتے۔ آپ کی والدہ شکی مزاج تھیں اور عام عورتوں کی طرح انہیں بھی واعظوں اور قصہ گویوں سے عقیدت تھی۔ کوفہ کے مشہور واعظ عمرو بن ذر اور قاضی زرعہ پر انہیں زیادہ اعتماد تھا، اس لیے کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو امام اعظم کو حکم دیتیں، کہ عمرو بن ذر سے پوچھ آؤ۔ آپ اپنی والدہ ماجدہ کے ارشاد کی تعمیل کے لیے ان کے پاس جاتے۔ وہ بے چارے سراپا عذر بن کر عرض کرتے، حضور! آپ کے سامنے میں کیسے زبان کھول سکتا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ عمرو کو جس مسئلہ کا جواب معلوم نہ ہوتا تو امام اعظم سے درخواست کرتے، آپ مجھ کو جواب بتا دیجیے تاکہ میں اسی کو آپ کے سامنے دہرا دوں آپ جواب بتاتے تو وہ اسے آپ کے روبرو دہرا دیتے اور پھر وہی جواب امام اعظم اپنی والدہ کو آ کر بتا دیتے۔ (الخیرات الحسان ص ۱۹۶)

آپ کی والدہ کبھی کبھی اصرار کرتیں، کہ میں خود چل کر پوچھوں گی، چنانچہ وہ خچر پر سوار ہوتیں اور امام اعظم پیدل ساتھ جاتے حالاں کہ آپ کا گھر وہاں سے کئی میل دور تھا، وہ خود مسئلہ پوچھتیں اور اپنے کانوں سے جواب سن لیتیں، تب اطمینان ہوتا۔ امام ابو یوسف کا بیان ہے، ایک دن میں نے دیکھا کہ امام اعظم اپنی والدہ کو خچر پر بٹھائے عمرو بن ذر کے پاس لے جا رہے تھے، تاکہ آپ سے کسی مسئلہ پر گفتگو کر سکیں، آپ اپنی والدہ کی خواہش پر لے جا رہے تھے ورنہ آپ کو معلوم تھا کہ عمرو بن ذر کا کیا مقام ہے۔ یہ سب اپنی والدہ کی خواہش کے احترام کے پیش نظر تھا۔ (مناقب للموفق ص ۲۹۳)

ایک بار آپ کی والدہ نے آپ سے فتویٰ پوچھا، آپ نے فتویٰ تحریر فرما دیا، وہ بولیں، میں تو وہی فتویٰ قبول کروں گی، جو زرعہ لکھیں گے۔ چنانچہ آپ اپنی والدہ کی دل جوئی کے لیے زرعہ کے پاس گئے اور فرمایا، میری والدہ آپ سے یہ فتویٰ پوچھتی ہیں، انہوں نے کہا، آپ مجھ سے بڑے فقیہ ہیں، آپ فتویٰ دیجیے! آپ نے فرمایا، میں نے یہ فتویٰ دیا ہے، لیکن وہ آپ سے

تصدیق چاہتی ہیں، تو زرعہ نے تحریر دیکھ کر کہا، فتویٰ وہی صحیح ہے، جو امام ابوحنیفہ نے دیا تھا، تب وہ مطمئن ہوئیں۔ (ایضا)

والی کوفہ یزید بن عمرو بن ہبیرہ فزاری نے امام صاحب کے سامنے عہدہ قضا پیش کیا، مگر آپ نے انکار کر دیا، اس پر ابن ہبیرہ برہم ہوا اور ایک سو دس کوڑے کی سزا دی، آپ کہتے تھے، اس سزا سے اتنی تکلیف نہ ہوئی، جتنی کہ اس حادثہ پر میری والدہ کے رنج و غم سے ہوئی۔ والدہ نے کہا کہ نعمان جس علم کی وجہ سے تم کو یہ دن دیکھنا پڑا، اس سے ترک تعلق کر لو، میں نے کہا کہ اگر میں اس علم سے دنیا حاصل کرنا چاہتا تو بہت زیادہ حاصل کر لیتا، میں نے یہ علم صرف اللہ کی رضا جوئی اور اپنی نجات کے لیے حاصل کیا ہے۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ ص ۵۳)

آپ فرماتے تھے: میں اپنے والدین کے ایصال ثواب کے لیے ہر جمعہ کے دن بیس درہم خیرات کرتا ہوں اور اس بات کی میں نے نذر مانی ہے، دس درہم والد اور دس درہم والدہ کے لیے خیرات کرتا ہوں۔ ان مقررہ درہموں کے علاوہ آپ اپنے والدین کے لیے فقرا و مساکین میں اور بھی چیزیں صدقہ کیا کرتے تھے۔ (ایضا)

پڑوسیوں سے حسن سلوک

امام اعظم ابوحنیفہ اتباع رسول کے جذبات سے سرشار تھے چنانچہ انھوں نے پڑوسیوں کے حقوق اور ان کی مراعات کا پوری عمر لحاظ کیا اور یہ سب کچھ اس ارشاد نبوی کی بدولت تھا:

> من سر ان يحب الله ورسوله اويحبه الله ورسوله فليصدق في حديثه اذاحدث وليود امانته اذااتمن وليحسن جوار من جاوره .(البيهقي في شعب الايمان)

> جسے یہ پسند ہو کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھے یا اللہ و رسول اس سے محبت کریں تو اسے چاہیے کہ سچ بولے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اسے ادا کرے اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

سیدنا امام اعظم کے پڑوس میں ایک موچی رہتا تھا جو دن میں محنت و مزدوری کرتا اور شام کو بازار سے گوشت اور شراب لے کر آتا۔ گوشت بھون کر کھاتا اور شراب پیتا، جب شراب کے نشے میں دھت ہوتا تو خوب غل مچاتا اور بلند آواز سے یہ شعر پڑھتا رہتا۔

اضاعونی وای فتی اضاعوا
لیوم کریهة وسداد ثغر

لوگوں نے مجھ کو ضائع کر دیا اور کتنے بڑے باکمال نوجوان کو کھو دیا جو لڑائی اور صف بندی کے دن کام آتا۔

امام صاحب روزانہ اس کی آواز سنا کرتے اور خود تمام رات عبادت میں مشغول رہتے۔ ایک رات آپ نے اس کی آواز نہ سنی تو صبح لوگوں سے اس کے متعلق پوچھا۔ بتایا گیا کہ اسے کل رات سپاہیوں نے پکڑ لیا ہے اور وہ قید میں ہے۔ امام صاحب نماز فجر کے بعد گورنر کے پاس پہنچے۔ گورنر نے بڑے ادب سے عرض کی، حضور آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟ آپ

نے فرمایا، میرے پڑوسی کو کل رات آپ کے سپاہیوں نے پکڑلیا ہے، اسے چھوڑ دیجیے۔ گورنر نے حکم دیا، وہ قیدی اور اس کے ساتھ کے تمام قیدی چھوڑ دیے جائیں، پھر قیدیوں سے کہا، تم سب کو امام ابوحنیفہ کی وجہ سے رہائی مل رہی ہے۔ امام اعظم نے اپنے پڑوسی نوجوان سے فرمایا، ہم نے تم کو ضائع تو نہیں کیا؟ آپ کا اشارہ اس کے شعر کی طرف تھا۔ اس نے عرض کیا، نہیں بلکہ آپ نے میری حفاظت فرمائی اور میری سفارش کی، اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے، آپ نے ہمسایہ کے حق کی رعایت فرمائی پھر اس نے توبہ کرلی اور نیک بن گیا۔ (تبیض الصحیفہ ص ۳۹)

امام اعظم اپنے پڑوسیوں سے حسن سلوک اور رواداری میں بے مثل تھے۔ آپ کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی، کہ سب لوگوں کو نفع پہنچائیں۔

اساتذہ کا ادب

امام اعظم کا ارشاد ہے: جب سے میرے استاذ امام حماد کا وصال ہوا ہے، میں ہر نماز کے بعد ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں نیز فرماتے:

ما مددت رجلی نحو دار استاذی حماد اجلالا له وكان من بين داره وداری سبع سكك۔ (مناقب ج ۲ ص ۷)

میں نے کبھی ان کے گھر کی طرف اپنے پاؤں نہیں پھیلائے حالاں کہ میرے اور ان کے گھر کے درمیان سات گلیاں ہیں۔

ایک روایت میں ہے، کہ آپ نے فرمایا، میں اپنے استاذ حماد اور اپنے والد کے لیے استغفار کرتا ہوں، بلکہ میں اپنے ہر استاذ کے لیے استغفار کرتا ہوں، جس نے مجھے ایک لفظ بھی پڑھایا۔ اسی طرح اپنے ہر شاگرد کے لیے بھی استغفار کرتا ہوں۔ (مناقب للموفق ۲۹۵)

علامہ موفق فرماتے ہیں: امام اعظم جب کسی کے لیے دعا کرتے، تو حضرت حماد کا نام سب سے پہلے لیتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے والدین بچے کو جنم دیتے ہیں، مگر استاذ اسے علم و فضل کے خزانے دیتا ہے۔ (ایضا ۲۹۶)

یہ آپ کے حسن تربیت کا نتیجہ تھا، کہ امام ابویوسف فرماتے تھے، میں اپنے والدین سے پہلے اپنے استاذ امام ابوحنیفہ کے لیے ہر نماز کے بعد استغفار کرنا واجب جانتا ہوں کیوں کہ حضرت امام اعظم فرمایا کرتے تھے، کہ میں اپنے والدین کے ساتھ اپنے استاذ کے لیے بلاناغہ استغفار کرتا ہوں۔ (ایضا)

امام اعظم ابوحنیفہ کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد چار ہزار بیان کی جاتی ہے۔ آپ اپنے اساتذہ کرام کا محبت و عقیدت سے ذکر فرماتے اور اکثر کی خدمت میں ہدیے اور تحائف بھیجتے۔ آپ کے اساتذہ اور شیوخ بھی آپ سے بہت محبت فرماتے۔ آپ کو اہل بیت اطہار سے خاص محبت تھی۔ آپ نے امام محمد باقر سے بھی اکتساب فیض کیا۔ ایک بار ان کی خدمت

میں حاضر ہوئے تو امام باقر نے فرمایا، ہم سے کچھ پوچھیے آپ نے چند سوالات دریافت کیے اور پھر اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہوئے تو امام باقر نے حاضرین سے فرمایا ابوحنیفہ کے پاس ظاہری علوم کے خزانے ہیں اور ہمارے پاس باطنی علوم کے ذخائر ہیں۔ (ایضا)

امام ابن عبدالبر لکھتے ہیں، کہ ایک مرتبہ جب امام ابوحنیفہ امام باقر سے علمی گفتگو کر کے رخصت ہوئے تو امام باقر نے فرمایا ان کا طریقہ اور انداز کتنا اچھا ہے اور ان کی فقہ کتنی زیادہ ہے۔ (سوانح بے بہائے امام اعظم ص ۱۹۵)

جامع مکارم اخلاق

خلیفہ ہارون رشید نے قاضی ابو یوسف سے امام اعظم کے فضائل، اخلاق اور عالمانہ عظمت کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے مختصر مگر جامع الفاظ میں امام اعظم کی ہمہ جہت عبقری شخصیت کا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا۔

یاامیرالمومنین! ان اللہ عز وجل یقول مایلفظ من قول الالدیه رقیب عتید کان علمی به رحمہ اللہ کان شدیدالذب من محارم اللہ تعالیٰ ان توتی شدیدالورع لاینطق فی دین اللہ بمالایعلم یحب ان یطاع اللہ تعالیٰ ولایعصیٰ مجانبا لاهل الدنیا فی زمانهم لاینافس فی عزهاطویل الصمت دائم الفکر علی علم واسع لم یکن مهذارا ولاثرثارا ان سئل عن مسألة وکان عنده فیها علم نطق به واصاب فیها وان کان غیر ذلك قاس علی الحق واتبعه صائنا لنفسه ودینه بذولاللعمل والمال مستغنیا بنفسه عن جمیع الناس لایمیل الی طمع بعیدا عن الغیبة ولایذکراحدا الابخیر (الخیرات الحسان ص ۱۱۰)

اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "بندہ نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات کہ اس کے پاس ایک نگہبان تیار ہوتا ہے" جہاں تک میرا علم ہے، ابوحنیفہ محرمات الٰہیہ سے بچنے کی بہت کوشش کرتے تھے، ان کا ورع بہت تھا، اس بات سے کہ دین میں کوئی ایسی بات کہیں جس کا ان کو علم نہ ہو، ان کی خواہش رہتی تھی، کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے اور کوئی بھی اس کی نافرمانی نہ کرے، وہ اپنے زمانے کے دنیاداروں سے بچتے تھے، دنیوی جاہ و عزت میں ان سے مقابلہ نہیں کرتے تھے، ان کا زیادہ وقت خاموش رہنے میں گزرتا تھا، ہمیشہ فکر علم میں رہا کرتے تھے، علم میں فراخی تھی باتیں بنانے والے نہیں تھے، اگر ان سے مسئلہ پوچھا جاتا اور ان کو اس سلسلے میں علم ہوتا وہ اس کو بیان کر دیتے اور اس میں درستگی تک پہنچتے اور اگر اس سلسلہ میں کچھ نہیں سنا ہے تو صحیح اور حق طریقہ پر قیاس کرتے تھے اپنے نفس کی اور دین کی حفاظت کرتے تھے، خوب عمل کرنے والے فیاض تھے، ان کا نفس تمام لوگوں سے بے نیاز تھا لالچ اور حرص کی طرف میلان نہ تھا، غیبت کرنے سے بہت دور رہتے۔ اگر کسی کا ذکر کرتے تو بھلائی سے کرتے۔

یہ سن کر ہارون رشید نے کہا، یہی اخلاق صالحین (نیکوں) کے ہیں۔

معانی موصلی امام صاحب کے فضائل ومناقب میں دس ایسی چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں، جو شاذ و نادر کسی انسان میں یکجا پائی جاتی ہیں:

کان فیه عشر خصال ما کانت واحدة منها فی انسان الاصار رئیسا فی وقته وساد قبیلته الورع والصدق والعفة ومداراة الناس والمودة الصادقة والاقبال علی ماینفع وطول الصمت والاصابة بالقول ومعونة اللهفان ولوعدوا ۔

امام صاحب کے اندر دس باتیں ایسی تھیں، کہ اگر ان میں سے ایک بھی کسی کے اندر ہو تو وہ اپنے وقت کا رئیس اور اپنے قبیلے کا سردار ہو، وہ دس باتیں یہ ہیں۔ (۱) پرہیزگاری (۲) سچ بولنا (۳) پاکدامنی (۴) لوگوں کی خاطر مدارات (۵) سچی محبت رکھنا (۶) اپنے نفع کی باتوں پر متوجہ ہونا (۷) زیادہ تر خاموش رہنا (۸) ٹھیک بات کہنا (۹) عاجزوں کی مدد کرنا (۱۰) اگرچہ وہ عاجز دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ (الخیرات الحسان ص ۱۱۱)

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں:

وکان عالما عاملا زاهدا ورعا تقیا کثیر الخشوع دائم التضرع الی اللّٰہ تعالیٰ ۔

حضرت ابوحنیفہ عالم باعمل، زاہد، پرہیزگار، متقی، خوف الٰہی سے بہت رونے والے اور اللہ کی بارگاہ میں ہمیشہ آہ وزاری کرنے والے تھے۔ (وفیات الاعیان ج ۳ ص ۲۰۲)

ابوزہرہ مصری امام اعظم کے اخلاق وکردار کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اتصف ابو حنیفة بصفات تجعله فی الذروة العلیاء بین العلماء فقد اتصف بصفات العالم الحق الثبت الثقة البعید المدی فی تفکیره المتطلع الی الحقائق والحاضر البدیهة الذی تسارع الیه الافکار ۔ وقد کان رضی اللہ عنه ضابطا لنفسه مستولیا علی مشاعره لاتعبث به الکلمات العارضة ولاتبعده عن الحق العبارات النابیة ۔ (ابوحنیفہ ص ۵۲-۵۳)

امام ابوحنیفہ میں وہ تمام خصوصیتیں موجود تھیں، جو ایک بلند پایہ عالم دین میں ہونی چاہئیں، آپ ایک سمجھ رکھنے والے، حقائق کی غوطہ زنی کرنے والے، بڑے حاضر دماغ تھے۔ آپ ضبط نفس پر قادر تھے اور اپنے جذبات واحساسات پر انہیں کنٹرول تھا، نہ دلکش عبارت آپ پر اثر انداز ہوتی، نہ شیریں کلامی آپ کو جادہ مستقیم سے منحرف کرسکتی۔

حق گوئی

امام اعظم ابوحنیفہ کے کردار کا ایک اہم باب ان کی حق گوئی وبے باکی ہے، وہ حق وصداقت کی ڈگر پر ہمیشہ استقامت

وعزیمت کے ساتھ چلتے رہے، اس سلسلے میں وقت کی بڑی سے بڑی طاغوتی قوتوں کے سامنے ان کی زبان حق بولنے سے کبھی خاموش نہ رہی، جب کہ یہ تلخ سچائیاں سلطان جابر کے خلاف ہوتیں اور ان کا بیان کرنا اپنی گردن تہہ تیغ لانے کے مترادف تھا۔ آپ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر ”**افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر**“ پر نازک سے نازک حالات میں عمل کیا اور پوری جرأت کے ساتھ ”**افضل الجهاد**“ کا فریضہ انجام دیا۔

امام اعظم کا موقف یہ تھا، کہ خلافت اہل الرائے کے اجتماع سے منعقد ہوتی ہے، پہلے اقتدار پر قبضہ کر لینا پھر بہ زور وجبر خلافت کی بیعت لینا جائز نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے اس موقف کا اعلان ایسے موقع پر کیا، جب حق بولنا اپنا سر قلم کرا دینے کے مترادف تھا، لیکن ایسے نازک موقع پر بھی امام کی زبان خاموش نہیں رہی اور بلا لیت ولعل حقیقت خلیفہ کے سامنے بیان کر دی اور جان عزیز کی ذرہ برابر پروانہ کی۔

ابو جعفر منصور کے حاجب ربیع بن یونس کا بیان ہے کہ منصور نے امام مالک، ابن ابی ذئب اور امام ابوحنیفہ کو بلایا اور ان سے کہا:

كيف ترون هذاالامر الذى حولنى الله تعالىٰ فيه من امر هذه الامة لعل انا لذلك اهل؟

یہ حکومت جو اللہ تعالیٰ نے اس امت میں مجھے عطا کی ہے، اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کیا میں اس کا اہل ہوں؟

امام مالک نے کہا:

لو لم تكن اهلا ما ولاك الله تعالىٰ

اگر آپ اس کے اہل نہ ہوتے تو یہ امر خلافت اللہ آپ کے سپرد نہ کرتا۔ ابن ابی ذئب نے کہا:

دنیا کی بادشاہت اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، مگر آخرت کی بادشاہی اسی کو دیتا ہے، جو اس کا طالب ہو اور جسے اللہ اس کی توفیق دے۔ اللہ کی توفیق آپ سے قریب ہوگی، اگر آپ اس کی اطاعت کریں، ورنہ اس کی نافرمانی کی صورت میں وہ آپ سے دور رہے گی، حقیقت یہ ہے کہ خلافت اہل تقویٰ کے اجتماع سے قائم ہوتی ہے اور جو شخص خود اس پر قبضہ کر لے اس کے لیے کوئی تقویٰ نہیں ہے۔ آپ اور آپ کے مددگار توفیق سے خارج اور حق سے منحرف ہیں۔ اب اگر آپ اللہ سے سلامتی مانگیں اور پاکیزہ اعمال سے اس کا تقرب حاصل کریں، تو یہ چیز آپ کو نصیب ہوگی ورنہ آپ خود ہی اپنے مطلوب ہیں۔

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ جس وقت ابن ابی ذئب یہ باتیں کہہ رہے تھے، میں نے اور امام مالک نے اپنے کپڑے سمیٹ لیے کہ شاید ابھی ان کی گردن اڑا دی جائے گی اور ان کا خون ہمارے کپڑوں پر پڑے گا۔ اس کے بعد منصور امام ابوحنیفہ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا آپ کیا کہتے ہیں، انہوں نے جواب دیا:

المسترشد لدينه يكون بعيدا الغضب ان انت نصحت نفسك علمت انك لم ترد الله

باجتماعنا فانما اردت ان تعلم العامة انا نقول فيك ماتهواه مخافة عنك ولقد وليت الخلافة وما اجتمع عليك اثنان من اهل الفتوىٰ والخلافة تكون اجتماع المومنين ومشورتهم وهذا ابوبكر الصديق رضى الله عنه امسك عن الحكم ستة اشهر حتى جاءه بيعة اهل اليمن ۔

اپنے دین کی خاطر راہ راست تلاش کرنے والا غصے سے دور رہتا ہے۔ اگر آپ اپنے ضمیر کو ٹٹولیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ آپ نے ہم لوگوں کو اللہ کی خاطر نہیں بلایا ہے بلکہ آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے ڈر سے آپ کی منشا کے مطابق بات کہیں اور وہ عوام کے علم میں آ جائے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ اس طرح خلیفہ بنے ہیں، کہ آپ کی خلافت پر اہل فتویٰ لوگوں میں سے دو آدمیوں کا اجتماع بھی نہیں ہوا حالاں کہ خلافت مسلمانوں کے اجتماع اور مشورے سے قائم ہوتی ہے دیکھیے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چھ مہینے تک فیصلہ کرنے سے رکے رہے، جب تک کہ اہل یمن کی بیعت نہ آ گئی۔

یہ باتیں کہہ کے تینوں حضرات اٹھ گئے، ان کے جانے کے بعد منصور نے ربیع کو تین توڑے درہموں کے دے کر ان تینوں اصحاب کے پاس بھیجا اور اس کو ہدایت کی کہ اگر مالک لے لیں، تو ان کو دے دینا، لیکن اگر ابوحنیفہ اور ابن ابی ذئب لیں تو ان کا سر اتار لانا، امام مالک نے عطیہ لے لیا، جب ربیع ابن ذئب کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا:

مارضى بهذا المال له كيف ارضاه لنفسى ۔

میں اس مال کو خود منصور کے لیے بھی حلال نہیں سمجھتا اپنے لیے کیسے حلال سمجھوں۔

ابوحنیفہ نے کہا:

والله لو ضرب عنقى على ان امس منه درهما ما فعلت ۔

خواہ میری گردن ہی کیوں نہ ماردی جائے میں اس مال کو ہاتھ نہ لگاؤں گا منصور نے یہ روداد سن کر کہا:

بهذه الصيانة احقنو ادمائهم ۔

اس بے نیازی نے ان دونوں کا خون بچادیا۔ (کردری ج ۲ ص ۱۵۔۱۶)

خالد ابن النصرانیہ کے ظالمانہ عہد کا ایک واقعہ جو امام صاحب کی غیرت دینی اور معروف ومنکر کے فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں بیان کیا جاتا ہے، جس کے راوی ابوالملیح ہیں کہتے ہیں میں جمعہ کے دن نووارد کی حیثیت سے مسجد کوفہ میں داخل ہوا، دیکھا کہ والی کوفہ خالد ابن النصرانیہ منبر پر بیٹھا ہوا ہے اور تمام لوگ خاموش ہیں، اچانک ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہا:

الصلوة الصلوة خرج الوقت ودخل وقت آخر ۔

نماز جمعہ کا وقت ختم ہو گیا اور عصر کا وقت داخل ہو گیا۔ فوراً اس شخص کو گرفتار کر لیا گیا۔ ابوالملیح کہتے ہیں میں نے

اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کسی نے کہا یہ نعمان ابوحنیفہ ہیں۔

ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ ابوحنیفہ ہاتھ میں کنکریاں لیے ہوئے تھے اور انہیں منبر کی طرف پھینکتے ہوئے بلند آواز سے پکار رہے تھے ''الصلوۃ'' یعنی نماز نماز خالد نے نماز پڑھی پھر حکم دیا کہ اس شخص کو گرفتار کر لو لوگوں نے آپ کو پکڑ لیا اور خالد کے سامنے حاضر کیا، خالد نے پوچھا اس حرکت پر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

ان الصلوۃ لاتنتظر احدا قال فی کتاب اللہ تعالیٰ وانت احق من اتبعہ اضاعوا الصلوۃ واتبعوا الشھوات ۔

نماز کسی کا انتظار نہیں کرتی، اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے اور تم زیادہ مستحق ہو کہ قرآن کی پیروی کرو (اللہ کا فرمان ہے) انہوں نے اپنی نمازیں ضائع کر دیں اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گئے، امام صاحب کے اس طرز عمل پر خالد کو یہ گمان گزرا کہ ایسا تو نہیں کہ یہ شخص امویوں کے خلاف اٹھنے والی تحریک کا نمائندہ ہے اس لیے سوال کیا سچ سچ بتاؤ کہ کیا نماز کے علاوہ کوئی دوسری چیز تمہارے پیش نظر نہ تھی؟ آپ نے ارشاد فرمایا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ تھا، خالد نے یہ سن کر انہیں چھوڑ دیا۔ (موفق ج۱ ص۱۷۲)

ائمہ وعلمائے کبار کے اقوال

امام الائمہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی بلند قامت علمی، دینی اور روحانی شخصیت اور کارناموں کے بارے میں دنیائے اسلام کی مقتدر ہستیوں نے ہر دور میں اپنے گراں قدر تاثرات پیش کیے ہیں، اور آپ کی عظیم المرتبت ذات وصفات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ذیل میں ہم وقت کے جلیل القدر ائمہ فن اور متبحر علما کے اعترافات درج کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

☆**عبداللہ بن داؤد:۔** **لایتکلم فی ابی حنیفة الا احد رجلین اما حاسد لعلمه واما جاھل بالعلم لایعرف قدر حملته** ۔(اخبار ابو حنیفہ و اصحابہ ص ۵۴)

ابوحنیفہ پر رد و قدح کرنے والا یا تو ان کے علم سے حسد کرنے والا ہے یا علم کے مرتبہ سے جاہل ہے، اور علم کے حاملوں کی قدر سے بے خبر ہے۔

☆**سفیان:۔** **ابو حنیفة فی العلم محسود** ۔ (ایضا)

علم میں ابوحنیفہ سے لوگ حسد کرتے ہیں۔

☆**سفیان ثوری:۔** **قال ثابت الزاھد کان الثوری اذا سئل عن مسألة دقیقة یقول ماکان احد یحسن ان یتکلم فی ھذا الامر الا رجل قد حسدناہ ثم یسأل اصحاب ابی حنیفة رضی اللہ عنه مایقول صاحبکم فیحفظ الجواب ثم یفتی به** ۔(ایضا)

ثابت زاہد نے کہا، جب ثوری سے کوئی دقیق مسئلہ پوچھا جاتا تھا، تو کہتے تھے، ایسے مسائل میں صحیح طور پر بولنے والا صرف ایک شخص تھا، جس سے ہم نے حسد کیا اور پھر وہ ابوحنیفہ کے اصحاب سے پوچھتے تھے، کہ اس مسئلہ میں تمہارے استاذ کیا کہتے تھے اور آپ کے اصحاب کے جواب کو یاد رکھتے تھے اور اس پر فتویٰ دیتے تھے۔

☆**مسعر:۔** ماحسد بالکوفة الارجلین اباحنیفة لفقهه والحسن بن صالح لزهده (ایضا)

مسعر کہتے ہیں، کوفہ میں دو آدمیوں سے مجھ کو رشک ہوتا ہے، فقہ کی وجہ سے ابوحنیفہ سے اور زہد کی وجہ سے حسن بن صالح سے۔

☆**یحییٰ بن معین:۔** یحییٰ بن معین سے اگر ابوحنیفہ پر طعن کرنے والے کا ذکر کیا جاتا تھا، وہ یہ دو شعر پڑھتے تھے۔ (ایضا ص ۵۵)

حسدوا الفتیٰ اذالم ینالو اسعیه   فالقوم اضداد له وخصوم
کضرائر الحسناء قلن لوجهها   حسدا وبغضا انه لدمیم

جب اس جوان کے مرتبہ کو نہ پا سکے، تو اس سے حسد کرنے لگے اور ساری قوم اس کی مخالف اور دشمن ہے۔ جس طرح حسینہ کے چہرے کو دیکھ کر اس کی سوکنیں حسد اور عداوت کی بنا پر کہتی ہیں کہ یہ بدصورت ہے۔

☆**ابن مبارک:۔** الرجال فی الاسم سواء حتی یقع المحن فی الانام والبلویٰ ولقد ابتلی ابو حنیفة بالضرب علی راسه بالسیاط فی السجن حتی یدفع الیه من الحکم ما یری مما یتنافس علیه ویتصنع له فحمد الله فصبر علی الذل والضرب والسجن لطلب السلامة فی دینه ۔ (ایضا)

نام میں سب لوگ برابر ہیں، البتہ جب کوئی آفت لوگوں میں پڑتی ہے اور کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے، (تو پتہ چلتا ہے) ابوحنیفہ پر آفت پڑی، آپ کے سر پر قید خانہ میں کوڑے مارے گئے تا کہ آپ کو حکم کا وہ پروانہ دے دیا جائے جس کے لیے لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، تعریف اللہ کے لیے ہے، کہ آپ نے اس ذلت پر، مار پر، قید ہونے پر صبر کیا اور آپ اپنے دین کی سلامتی کے طالب رہے۔

☆**زائدہ:۔** رایت تحت راس سفیان کتابا ینظر فیه فاستاذنته فی النظر فیه فدفعه الی فاذا هو کتاب الرهن لابی حنیفة فقلت له تنظر فی کتبه فقال وددت انها کلها عندی مجتمعة انظر فیها مابقی فی شرح العلم غایة ولکنا ماننصفه ۔ (ایضا ۶۵)

میں نے سفیان کے سرہنے ایک کتاب رکھی دیکھی جس کو وہ دیکھا کرتے تھے، میں نے ان سے اس کتاب کے دیکھنے کی اجازت طلب کی، انہوں نے وہ کتاب مجھ کو دی، وہ کتاب ابوحنیفہ کی کتاب الرہن تھی، میں نے ان

سے کہا کیا تم ان کی کتابیں دیکھتے ہو، انہوں نے کہا، میری خواہش ہے کہ ان کی سب کتابیں میرے پاس جمع ہوں، علم کے بیان کرنے میں ان سے کوئی بات رہی نہیں ہے، لیکن ہم ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ہیں۔

☆ **حماد بن زید:۔** **اردت الحج فاتیت ایوب اودعه فقال بلغنی ان الرجل الصالح فقیه اهل الکوفة ابو حنیفة یحج فان لقیت فاقراه منی السلام قال ابو سلیمان وسمعت حماد بن زید یقول انی لاحب اباحنیفة من اجل حبه لایوب .**

میں نے حج کا ارادہ کیا اور میں ایوب کے پاس آیا کہ ان سے رخصت چاہوں، انہوں نے مجھ سے فرمایا، کہ نیک مرد، اہل کوفہ کے فقیہ ابو حنیفہ حج کر رہے ہیں، اگر ان سے تمہاری ملاقات ہو جائے میرا اسلام ان سے کہہ دو، ابو سلیمان نے بیان کیا، کہ میں نے حماد بن زید کو کہتے سنا، میں ابو حنیفہ سے محبت رکھتا ہوں، کیوں کہ ان سے ایوب کو محبت ہے۔

☆ **نصر بن علی:۔** ہم شعبہ کے پاس تھے، ان سے کہا گیا:

مات ابو حنیفة فقال بعدما استرجعَ لقد طفیٰ عن اهل الکوفة ضوء نور العلم اما انهم لایرون مثله ابدا ۔(ایضاص ۷۲)

ابو حنیفہ کی وفات ہو گئی، انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر کہا، اہل کوفہ سے علم کے نور کی روشنی بجھ گئی، جان لو کہ اب اہل کوفہ ان کا مثل کبھی نہ دیکھیں گے۔

☆ **ابن نمیر:۔** **قال ابی کان الاعمش اذا سئل عن مسئلة قال علیکم بتلك الحلقة یعنی حلقة ابی حنیفة ۔ (ایضاص ۷۰)**

میرے والد نے کہا جب اعمش سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا، وہ کہتے تھے، تم اس حلقہ میں جاؤ یعنی ابو حنیفہ کے حلقہ میں۔

☆ **ابن عیینہ:۔** **اتیت سعید بن ابی عروبة فقال لی یا ابامحمد مارایت مثل هدایا تاتینا من بلدك من ابی حنیفة وددت ان اللہ اخرج العلم معه الی قلوب المومنین فلقد فتح اللہ لهٰذا الرجل فی الفقه شیئا کانه خلق له ۔(ص ۷۵)**

ابن عیینہ نے کہا میں سعید بن ابی عروبہ کے پاس گیا، انہوں نے مجھ سے کہا، اے ابو محمد میں نے ان ہدایا کا مثل نہیں دیکھا ہے جو تمہارے شہر سے ابو حنیفہ کے پاس سے ہمارے پاس آتے ہیں، میں سمجھتا ہوں، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم مخزون کو قلوب مومنین پر کھول دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آدمی (ابو حنیفہ) پر فقہ کے اسرار کھول دیے ہیں، گویا کہ ان کی تخلیق اسی کام کے لیے ہوئی تھی۔

☆**ابن مبارک:۔** ذکر ابو حنیفة بین یدی داؤد الطائی فقال ذلك نجم یهتدی به الساری وعلم تقلبه قلوب المومنین فکل علم لیس من علمه فهو بلاء علی حامله معه والله علم بالحلال والحرام والنجاة من عذاب الجبار مع ورع مستکن وخدمة دائمة ۔ (ایضاص ٧٦)

ابن مبارک نے بیان کیا، کہ حضرت داؤد طائی کے پاس امام ابوحنیفہ کا ذکر آیا، آپ نے فرمایا، آپ وہ ستارہ ہیں، جس سے سفر کرنے والے ہدایت پاتے ہیں اور آپ وہ علم ہیں، جس کو مومنین کے دل لیتے ہیں، ہر وہ علم جو ان کے علم میں سے نہیں ہے وہ اس علم والے کے لیے آفت ہے، اللہ کی قسم ہے ان کے پاس حلال وحرام کا، اور بڑے طاقت ور کے عذاب سے نجات پانے کا علم ہے اور اس علم کے ساتھ عاجزی، ورع اور پیوستہ خدمت بھی۔

☆**یحیٰ بن اکثم:۔** کان ابو یوسف اذا سئل عن مسئلة اجاب فیها وقال هذا قول ابی حنیفة ومن جعله بیْنه وبین ربه فقد استبرأ لدینه ۔ (ایضا ص ٧٦)

جب ابو یوسف سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا، وہ اس کا جواب دیتے تھے اور کہتے تھے، یہ ابوحنیفہ کا قول ہے اور جو شخص ابوحنیفہ کو اپنے اور اللہ کے بیچ میں رکھے گا، اس نے دین کو بری کرلیا۔

حافظ ابوبکر احمد بن علی خطیب بغدادی متوفی ٤٦٢ھ نے اپنی کتاب تاریخ بغداد جلد ١٣ کے ص ٣٢٣ سے ٣٦٨ تک امام اعظم کے بارے میں علمائے حق کی جو آرا درج کی ہیں، ان میں سے بعض یہاں نقل کی جاتی ہیں:

☆**خلف بن ایوب:۔** صار العلم من الله تعالیٰ الی محمد صلی الله علیه وسلم ثم صار الی اصحابه ثم صار الی التابعین ثم الی ابی حنیفة واصحابه فمن شاء فلیرض ومن شاء فلیسخط ۔ (ص ٣٣٦)

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علم عنایت کیا اور آپ سے آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو پہنچا، پھر ان سے تابعین کو پہنچا اور ان سے ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کو پہنچا، اب چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش۔

☆**روح بن عبادہ:۔** کنت عند ابن جریج سنة خمسین واتاه موت ابی حنیفة فاسترجع وتوجع وقال ای علم ذهب قال ومات فیها ابن جریج ۔ (ص ٣٣٨)

روح بن عبادہ نے کہا میں ١٥٠ھ میں ابن جریج کے پاس تھا کہ ان کو ابوحنیفہ کی وفات کی خبر پہنچی، انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھی اور غمگین ہوئے اور انہوں نے کہا کیسا علم ہاتھ سے گیا اور راوی نے بیان کیا کہ اسی سال ابن جریج کی وفات ہوئی ہے۔

☆**فضیل بن عیاض:۔** کان ابو حنیفة رجلا فقیها معروفا بالفقه مشهورا بالورع واسع المال

معروفا بالافضال علی من یطیف به صبورا علی تعلیم العلم باللیل والنهار حسن اللیل کثیر الصمت قلیل الکلام حتی ترد مسئلة فی حلال وحرام فکان یحسن ان یدل علی الحق هاربا من مال السلطان ۔(خطیب ج۱۳ ص ۳۴۵)

ابوحنیفہ ایک فقیہ شخص تھے اور فقہ سے معروف تھے، ان کی پرہیزگاری مشہور تھی، ان کے مال میں فراخی تھی، جو ان کے پاس آتے تھے ان کے ساتھ بھلائی کرتے تھے اور یہ بات معروف تھی، کہ علم کے سکھانے میں رات دن مصروف رہتے تھے، رات میں عبادت کرتے تھے، خاموش زیادہ رہتے تھے، بات کم کرتے تھے، ہاں جب مسئلہ حلال وحرام کا ہوتا، تو اچھی طرح حق کو بیان کرتے، سلطان کے مال سے بھاگتے تھے۔

☆**ابویوسف:**۔ ماخالفت اباحنیفة فی شیٔ قط فتدبرته الا رایت مذهب الذی ذهب الیه انجیٰ فی الآخرة وکنت ربما ملت الی الحدیث وکان هو ابصر بالحدیث الصحیح منی ۔

(ایضا)

میں نے جب بھی کسی مسئلہ میں ابوحنیفہ کی مخالفت کی اور پھر میں نے اس میں غور وخوض کیا، یہ ظاہر ہوا کہ ابوحنیفہ کا مذہب جس کی طرف وہ گئے ہیں آخرت میں زیادہ نجات دہندہ ہے بسا اوقات میں حدیث کی طرف مائل ہو جاتا تھا اور صحیح حدیث کی پرکھ میں وہ مجھ سے زیادہ بصیرت رکھتے تھے۔

☆**عبداللہ بن مبارک:**۔ مارایت احدا اورع من ابی حنیفة وقد جرب بالسیاط والاموال ۔(ایضا ص ۲۵۷)

میں نے ابوحنیفہ سے زیادہ پرہیزگار کسی کو نہیں دیکھا، ان کی آزمائش دولت اور کوڑوں سے ہوئی ہے۔

☆**ابن خلدون:**۔ اہل عراق کے امام اور مذہبی پیشوا ابوحنیفہ النعمان بن ثابت جن کا مقام فقہ میں اتنا اعلیٰ وارفع ہے کہ کوئی اس تک نہ پہنچ سکا، یہاں تک کہ ان کے ہم مشرب حضرات بھی خصوصا امام مالک وشافعی کھلے الفاظ میں کہہ گئے کہ فقہ میں امام ابوحنیفہ کا کوئی مثیل ونظیر نہیں۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۲۱)

☆**علامہ ابن عبدالبر قرطبی:**۔ قد اثنیٰ علیه قوم کثیر لفهمه ویقظته وحسن قیاسته وورعه ومجانبة السلاطین ۔

ابوحنیفہ کی سمجھ، آگاہی، آپ کے قیاس کی خوبی، آپ کے ورع اور امرا وسلاطین سے کنارہ کش رہنے کی وجہ سے بڑی جماعت نے آپ کی تعریف کی ہے۔ (سوانح بے بہا ص ۱۹۵)

☆**قاضی شریک:**۔ کان ابو حنیفة رحمه الله طویل الصمت دائم الفکر قلیل المجادلة للناس

(ایضا ص ۱۹۷)

ابوحنیفہ پر اللہ رحم فرمائے کم گو، ہر وقت فکر میں ڈوبے رہتے تھے لوگوں سے نہ جھگڑتے۔

☆ابن شبرمہ:۔ عجزت النساء ان تلد مثل النعمان ۔(ایضاص ۱۹۸)

عورتیں عاجز ہوگئیں کہ نعمان ابوحنیفہ کا مثل جنیں۔

☆سلیمان بن ابی شیخ:۔ کان ابو حنیفة حلیما ورعا سخیا ۔(ایضاص ۱۹۹)

ابوحنیفہ بردبار، پرہیزگار اور سخی تھے۔

اسماعیل بن عیاش کا بیان ہے انہوں نے کہا کہ میں نے ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمرو اوزاعی شامی اور عمری سے سنا یہ دونوں صاحبان کہہ رہے تھے:

ابو حنیفة اعلم الناس بمعضلات المسائل ۔(ایضاص ۲۲۶)

سخت اور مشکل مسائل میں ابوحنیفہ سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔

◆

امام اعظم کی تابعیت

امام اعظم ابوحنیفہ بلاریب تابعی تھے اور یہ عظیم شرف اورسعادت کبریٰ ان کے معاصر فقہا ومحدثین امام اوزاعی (شام) امام حماد بن زید اور امام حماد بن سلمہ (بصرہ) امام سفیان ثوری (کوفہ) امام مالک بن انس (مدینہ) امام لیث بن سعد (مصر) مسلم بن خالد زنجی (مکہ) کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ یہ وہ فخر ہے جو ائمہ اربعہ میں صرف امام اعظم کی کلاہ افتخار میں چار چاند لگاتا ہے۔

تابعی

تابعی کی تعریف میں مختلف اقوال ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی تدریب الراوی میں لکھتے ہیں:

اختلف فی حد التابعی قیل ای قال الخطیب ہو من صحب صحابیا ولایکتفی فیہ بمجرد اللقاء وقیل ہو من لقیہ وان لم یصحبہ کماقیل فی الصحابی وعلیہ الحاکم قال ابن الصلاح وہو اقرب وقال المصنف النووی وہو الاظہر قال العراقی وعلیہ عمل الاکثرین واشترط ابن حبان ان یکون راہ فی سن من یحفظ عنہ فان کان صغیرا لم یحفظ عنہ فلا عبرۃ لرویتہ قال العراقی وما اختارہ ابن حبان لہ وجہ کما اشترط فی الصحابی رویتہ وہو ممیز قال وقد اشار النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الصحابۃ والتابعین بقولہ طوبی لمن رانی وآمن بی وطوبی لمن رای من رانی الحدیث فاکتفی فیہما بمجرد الرویۃ . (تدریب الراوی ص ۴۱۷)

تابعی کی تعریف میں اختلاف ہے، خطیب کا قول یہ ہے کہ تابعی وہی ہے جو صحابی کی صحبت میں رہا ہو، صرف ملاقات کافی نہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ تابعی وہ ہے جس نے صحابی سے ملاقات کی ہو چاہے اس کی صحبت میں نہ رہا ہو، جیسا کہ صحابی کی تعریف میں صرف ملاقات کافی ہے، یعنی جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایمان کی حالت میں دیکھا ہو، چاہے حقیقتاً یا حکماً (جیسے نابینا) اور ایمان ہی پر اس کا خاتمہ ہوا ہو یعنی جس طرح صحابی کے لیے صرف ملاقات ورویت کافی ہے صحبت میں رہنا کوئی ضروری نہیں، اسی طرح تابعی میں بھی صرف

ملاقات کافی ہے، یہی حاکم کا مسلک ہے، ابن صلاح فرماتے ہیں، یہی اقرب ہے، علامہ نووی فرماتے ہیں، یہی زیادہ ظاہر ہے، علامہ عراقی فرماتے ہیں، اسی کے مطابق اکثر لوگوں کا عمل ہے، البتہ ابن حبان نے شرط لگائی ہے کہ سن تمیز میں دیکھا ہو اگر بہت چھوٹا ہو تو اس کی رویت معتبر نہیں، علامہ عراقی فرماتے ہیں، کہ ابن حبان کے قول مختار کی وجہ یہ ہے کہ صحابی میں بھی یہی شرط ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ اور تابعین کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ بشارت ہو اس کے لیے جس نے مجھے دیکھا اور اس کے لیے بھی جس نے میرے دیکھنے والے کو دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف رویت پر اکتفا کیا۔

اکثر محققین کے نزدیک تابعیت کے لیے صحابی کی لقا ہی کافی ہے، جیسا کہ صحابیت کے لیے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی لقا۔ امام بخاری صحابی کی تعریف میں فرماتے ہیں:

من صحب النبی اور آه من المسلمین فهو من اصحابه (بخاری کتاب المناقب)

مسلمانوں میں سے جس نے بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی یا فقط آپ کو دیکھا، وہ آپ کا صحابی ہے۔

علامہ ابن حجر عسقلانی تابعی کی تعریف کرتے ہیں:

وهو من لقی الصحابی کذلك وهذا من متعلق باللقاء (نزهة النظر ص ٦٧)

تابعی وہ ہے جس نے صحابی سے ملاقات کی ہو اسی طرح (جیسا کہ صحابی کی تعریف میں مذکور ہوا) اور اس (تعریف) کا تعلق ملاقات کے ساتھ ہے۔

علامہ شیخ محمد بن علوی مالکی مکی لکھتے ہیں:

هو من لقی الصحابی مومنا ومات علی الایمان وان لم یصحبه ولم یرو عنه کما رجحه ابن الصلاح وغیره ۔(المنهل اللطیف ص ۲۴۹)

تابعی وہ ہے جس نے حالت ایمان میں صحابی سے ملاقات کی ہو اور ایمان پر ہی فوت ہوا ہو اگرچہ نہ تو ان کی صحبت اختیار کی ہو اور نہ ہی ان سے روایت کیا ہو جیسا کہ محدث ابن صلاح اور دیگر علما نے اس تعریف کو ترجیح دی ہے۔

قول مختار کی رو سے امام صاحب کی ولادت ۸۰ھ تسلیم کی جائے، تو آپ کے عہد میں مندرجہ ذیل صحابہ کرام مختلف دیار و امصار میں موجود تھے۔

(۱) حضرت ابو طفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ م ۱۰۷ھ یا ۱۱۰ھ۔ (التاریخ الصغیر ج۱ ص ۲۵۰)

(۲) حضرت ہرماس بن زیاد رضی اللہ عنہ م ۱۱۰ھ کے بعد۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ ج۷ ص ۲۳۰)

(۳) حضرت عبد اللہ بن حارث بن جزء الزبیدی رضی اللہ عنہ م ثقہ قول کے مطابق ۹۹ھ۔
(مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ للکردری ج ۱ ص ۱۲)

(۴) حضرت عکراش بن ذویب رضی اللہ عنہ کی وفات پہلی صدی ہجری کے آخر میں ہوئی۔
(تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۲۹)

(۵) حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ م ۹۹ھ۔ (مشاہیر علماء الامصار لابن حبان ج ۱ ص ۲۸)

(۶) حضرت یوسف بن عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی وفات عمر بن عبد العزیز کے دور میں ہوئی، ان کا عہد خلافت ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک رہا۔

(۷) حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ م ۸۸ھ یا ۹۶ھ (الاصابہ ج ۴ ص ۲۳)

(۸) حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ م ۹۶ھ۔ (الثقات لابن حبان ج ۵ ص ۴۳۴)

(۹) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ م ۹۱ھ یا ۹۲ھ یا ۹۵ھ۔ (التاریخ الکبیر ج ۲ ص ۲۷)

(۱۰) حضرت مالک بن اوس رضی اللہ عنہ م ۹۲ھ۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۴ ص ۱۷۲)

(۱۱) حضرت سائب بن یزید بن سعید کندی رضی اللہ عنہ م ۹۱ھ۔
(مشاہیر علماء الامصار ج ۱ ص ۲۹)

(۱۲) حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ م ۸۸ھ یا ۹۱ھ۔ (التاریخ الکبیر ج ۴ ص ۹۷)

(۱۳) حضرت عبد اللہ بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ م ۸۹ھ۔ (مشاہیر علماء الامصار ج ۱ ص ۳۶)

(۱۴) حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ م ۸۷ھ یا ۸۸ھ۔ (التاریخ الصغیر ج ۵ ص ۱۴۵)

(۱۵) حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ م ۸۷ھ۔ (تقریب التہذیب ج ۱ ص ۵۴۵)

(۱۶) حضرت عتبہ بن عبد السلمی رضی اللہ عنہ م ۸۷ھ۔ (مشاہیر علماء الامصار ج ۱ ص ۵۲)

(۱۷) حضرت ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ م ۸۶ھ۔ (سیر اعلام النبلاء ج ۳ ص ۳۶۳)

(۱۸) حضرت بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ م ۸۶ھ۔ (الاصابہ ج ۱ ص ۲۸۹)

(۱۹) حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ م ۸۵ھ۔ (التاریخ الصغیر ج ۱ ص ۱۸۱)

(۲۰) حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ م ۸۳ھ یا ۸۵ھ۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۸۹)

(۲۱) حضرت عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ م ۸۴ھ یا ۹۰ھ۔ (ایضاً ج ۵ ص ۱۴۹)

حضرت امام اعظم کا عہد جس میں خیر و صلاح کے چشمے پھوٹتے تھے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور آپ کی سنت معلوم کرنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا، لوگ اس امر کے لیے صحابہ کرام کی جستجو کرتے اور جہاں یہ

مقدس ہستیاں موجود ہوتیں، زیارت کرنے والوں کا ازدحام رہتا۔ زائرین کی صفوں میں بچے جوان بوڑھے سبھی شامل ہوا کرتے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے، کہ امام اعظم ابوحنیفہ کی ذات صحابہ کے شرف لقا سے محروم رہ جاتی، جب کہ خود کوفہ ہی میں عبداللہ بن ابی اوفی، عمرو بن ابی حریث اور مکہ میں ابوالطفیل عمرو عامر بن واثلہ، عبداللہ بن حارث بن جزء مدینہ میں سہل بن سعد اور بصرہ میں انس بن مالک موجود تھے۔

انس بن مالک بارہا کوفہ آئے اور امام اعظم نے صغر سنی ہی میں والد گرامی کے ساتھ حج و زیارت کی سعادت حاصل کی، حرمین شریفین میں رہنے والے صحابہ کی زیارت ضرور کی ہوگی اگرچہ متذکرہ بالا صحابہ کرام میں ہر ایک کے ساتھ ملاقات کی صراحت تذکروں میں نہیں ملتی، تاہم چند اصحاب رسول سے لقا کی وضاحت کتب تاریخ و سیر سے ہوتی ہے۔

انس بن مالک کی زیارت

امام اعظم خود فرماتے ہیں:

رایت انس بن مالك قائما یصلی ۔ (مسند الامام ابی حنیفہ ص ١٧٦)

میں نے حضرت انس بن مالک کو نماز پڑھتے ہوئے اس حال میں دیکھا کہ وہ حالت قیام میں تھے۔

ایک روایت میں امام صاحب نے فرمایا:

قدم انس بن مالك الكوفة ونزل النخع رایته مرارا ۔ (التدوین فی اخبار قزوین ج ٣ ص ١٥٣)

حضرت انس کوفہ تشریف لائے اور مقام نخع پر اترے میں نے انہیں کئی بار دیکھا۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

رای انس بن مالك ۔ (تاریخ بغداد ج ١٣ ص ٣٢٤)

حضرت انس بن مالک کو دیکھا ہے۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

رای انس بن مالك غیر مرة لما قدم الكوفة ۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ١ ص ١٥٨)

حضرت انس بن مالک کو جب وہ کوفہ آئے کئی مرتبہ دیکھا۔

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

رای انسا ۔ (تہذیب التہذیب ج ١ ص ٤٠١)

حضرت انس کو دیکھا۔

بہت سے علما نے تصریح کی ہے، کہ حضرت انس کو دیکھا، جمہور اہل رجال کا یہی مسلک ہے، بڑے بڑے علامہ اجل اور ثقات اکمل مثل دار قطنی، ابن سعد، خطیب، ذہبی، ابن حجر، ولی عراقی، سیوطی، علی قاری، اکرم سندھی، ابومعشر، حمزہ سہمی، یافعی،

جزری، تورپشتی، ابن الجوزی، سراج، وغیرہ نے بھی اس کا اقرار کیا ہے۔ نواب حسن صدیق خاں مقتدائے اہل حدیث نے بھی اتحاف النبلاء ~~ ~~ اتاج المکلل میں حضرت انس کی رویت کا اعتراف کیا ہے۔

عبداللہ بن حارث بن جزء کی زیارت اوران سے روایت

ان اباحنيفة راى انس بن مالك وعبدالله بن الحارث بن الجزء . (جامع بیان العلم وفضلہ ج۱ص۱۰۱)

یقیناً امام ابوحنیفہ نے حضرت انس بن مالک اور عبداللہ بن حارث بن جزء کو دیکھا ہے۔

بچپن میں امام صاحب نے مکہ مکرمہ میں ایام حج میں حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء کی زیارت کی اوران سے ایک حدیث سن کراس کی روایت کی۔ مسند ابی حنیفہ کتاب العلم میں ہے:

قال ابوحنيفة رضى الله عنه ولدت سنة ثمانين وحججت مع ابى سنة ست و تسعين وانا ابن ست عشرة سنة فلما دخلت المسجد الحرام رايت حلقة فقلت لابى حلقة من هذه؟ فقال حلقة عبدالله بن الحارث بن جزء صاحب النبى صلى الله عليه وسلم فتقدمت فسمعته يقول سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من تفقه فى دين الله كفاه الله مهمه ورزقه من حيث لايحتسب . (مسند ابى حنيفة ص ٢٥، ٢٦)

امام ابوحنیفہ نے بیان کیا ہے، کہ میں ۸۰ھ میں پیدا ہوا اور ۹۶ھ میں اپنے والد کے ساتھ حج کیا، اس وقت میں سولہ سال کا تھا، جب مسجد حرام میں داخل ہوا، تو ایک حلقہ درس دیکھا، والد سے پوچھا کہ یہ کس کا حلقہ ہے؟ انہوں نے بتایا، کہ یہ صحابی رسول عبداللہ بن حارث بن جزء کا حلقہ ہے، یہ سن کر میں آگے بڑھا، تو ان کو کہتے ہوئے سنا، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے، کہ جو شخص اللہ کے دین میں تفقہ حاصل کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی مہمات کے لیے کافی ہوگا اوراس کو بے شان وگمان روزی دے گا۔

عبداللہ بن ابی اوفیٰ کی زیارت

امام بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

عبدالله بن ابى اوفىٰ واسمه علقمة بن خالد بن الحارث الاسلمى المدنى من اصحاب بيعة الرضوان روى له خمسة وتسعون حديثا للبخارى خمسة عشر وهو آخر من لقى من اصحابه بالكوفة مات سنة سبع وثمانين وهو احد الصحابة السبعة الذين ادركهم ابوحنيفة سنة سبع وثمانين وكان عمره سبع سنين سن التميز والادراك من الاشياء .

(عمدۃ القاری ج۱۱ص۲۰۶)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ کے والد کا نام حضرت علقمہ بن خالد بن حارث اسلمی مدنی ہے، آپ اصحاب بیعت

رضوان میں شامل ہیں، آپ سے ۹۵/ احادیث روایت کی گئی ہیں، امام بخاری نے پندرہ روایت کی ہیں، آپ وہ آخری صحابی ہیں، جنہوں نے کوفہ میں ۸۷ھ میں وصال فرمایا اور آپ کا شمار ان سات صحابہ کرام میں ہوتا ہے، جن کو امام اعظم نے ۸۷ھ میں پایا، امام ابوحنیفہ کی عمر اس وقت سات سال تھی، جو کہ اشیا کو سمجھنے اور ان میں تمیز کرنے کا زمانہ ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کوفی کی وفات ۸۷ھ یا ۸۸ھ میں ہوئی اور ان کی وفات کے وقت امام کی عمر علامہ کوثری کی تحقیق کی بنا پر سترہ یا اٹھارہ برس ہوتی ہے کیوں کہ ان کے نزدیک امام صاحب کی ولادت ۷۰ھ میں ہوئی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کی تحقیق کی بنا پر سات یا آٹھ برس ہوگی۔ یہ بھی ان صحابہ میں سے ہیں، جن سے امام کی ملاقات اور روایت بھی ثابت ہے۔

حافظ خوارزمی نے جامع المسانید میں یہ روایت نقل کی ہے:

> عن ابی التمام عن ابی حنیفة قال سمعت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من بنی للہ بیتا بنی اللہ له بیتا فی الجنة وقد ذکر سید الحفاظ الدیلمی عنه قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یقول حبك الشیٔ یعمی ویصم والدال علی الخیر کفاعله واللہ یحب اغاثة اللهفان۔

یہ صحابی کوفہ کے رہنے والے ہیں، امام بھی کوفہ ہی میں رہتے تھے، اس لیے ملاقات وروایت میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہیے، خاندانی حالات کے لحاظ سے بھی امام کے جدامجد زوطی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آتے رہتے تھے اور حضرت ثابت کا حاضر ہونا اور ان کے لیے ان کی اولاد کے لیے دعا کرنا بھی روایات میں موجود ہے، پھر امام اعظم ایک صحابی کی خدمت میں حاضری کو غنیمت نہ سمجھیں یہ ناممکن ہے، اس روایت کے ثبوت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور صغرسنی کا عذر درست نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ حسب تحقیق علامہ کوثری امام کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی، حافظ وغیرہ کی تحقیق کی بنا پر سات یا آٹھ سال کی بھی ہو تو یہ عمر بالاتفاق شعور وادراک کے لیے کافی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کی زیارت صحابہ اور آپ کے تابعی ہونے پر ائمہ حدیث کی ان تصریحات کے بعد آپ کے تابعی ہونے میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔ ایسا جلیل القدر رتبہ معاصرین اور بعد کے کسی امام کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود اگر کوئی آپ کی تابعیت کا انکار یا شک کرے، تو بقول امام بدرالدین عینی تعصب، عناد اور بغض وحسد کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

صحابہ کرام سے روایت

امام اعظم کے تمام تذکرہ نگار محدثین ومورخین کی کتابوں کے گہرے مطالعے سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی

ہے، کہ امام اعظم نے نہ صرف صحابہ کی زیارت ولقا کا شرف پایا، بلکہ آپ نے براہ راست صحابہ کرام سے سماع وروایت حدیث بھی کیا۔ اگرچہ صحابہ سے روایت حدیث کے بارے میں بعض لوگوں کا اختلاف ہے، چنانچہ امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:

> **وقفت على فتيارفعت الى الحافظ العراقي صورتها هل روى ابو حنيفة عن احد من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وهل يعد في التابعين ام لا فاجاب بمانصه الامام ابو حنيفة لم تصح روايته عن احد من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وقد راى انس بن مالك فمن يكتفي في التابعي مجرد روية الصحابة يجعله تابعيا ومن لايكتفي بذالك لايعده تابعيا ورفع هذا السوال الى الحافظ ابن حجر العسقلاني فاجاب بما نصه ادرك الامام ابو حنيفة جماعة من الصحابة لانه ولد بالكوفة سنة ثمانين من الهجرة وبها يومئذ من الصحابة عبدالله بن ابي اوفیٰ فانه مات بعد ذالك بالاتفاق وبالبصرة يومئذ انس بن مالك ومات سنة تسعين اوبعدها وقد اورد ابن سعد بسند لاباس به ان اباحنيفة راى انسا وكان غير هذين من الصحابة احياء في البلاد ۔** (تبییض الصحیفہ ص ۲۳)

حافظ ولی عراقی کی خدمت میں ایک فتویٰ پیش کیا گیا کہ کیا امام ابوحنیفہ نے کسی صحابی سے روایت کیا ہے اور کیا تابعین میں ان کا شمار ہے یا نہیں؟ تو جواب دیا کہ امام کی کوئی روایت کسی صحابی سے ثابت نہیں البتہ انس بن مالک کو دیکھا ہے، پس جو لوگ تابعیت کے لیے صرف رویت کو کافی سمجھتے ہیں وہ ان کو تابعی کہتے ہیں (جیسا کہ اکثر محدثین کی تحقیق ہے) جو صرف رویت کو کافی نہیں سمجھتے وہ ان کو تابعی نہیں کہتے۔ (یہ صرف بعض کا قول ہے) اور یہی سوال حافظ ابن حجر عسقلانی کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ امام ابوحنیفہ نے صحابہ کی ایک جماعت کا زمانہ پایا اس لیے کہ ۸۰ھ میں ان کی ولادت کوفہ میں ہوئی اور کوفہ میں اس وقت عبداللہ بن ابی اوفیٰ صحابی تھے اس لیے کہ باتفاق ان کا انتقال اس کے بعد ہوا اور اس وقت بصرہ میں حضرت انس تھے جن کا انتقال ۹۰ھ میں یا اس کے بعد ہوا اور ابن سعد نے قابل اعتماد سند سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے حضرت انس کو دیکھا اور دوسرے شہروں میں اس وقت ان دو کے علاوہ بھی صحابہ موجود تھے۔

امام اعظم کا صحابہ کرام سے لقا جس طرح ثابت ہے، اسی طرح صحابہ سے آپ کا روایت کرنا بھی علمائے محققین کے نزدیک ثابت ہے ذیل میں چند علما و محققین کے اقوال درج کیے جاتے ہیں:

امام فضل بن دکین

امام اعظم کے شاگرد اور امام احمد بن حنبل کے شیخ امام ابونعیم فضل بن دکین امام صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں:

> **راى انس بن مالك سنة خمس وتسعين وسمع منه .**

امام ابوحنیفہ نے حضرت انس بن مالک کو ۹۵ھ میں دیکھا اور ان سے سماع کیا۔

حضرت انس بن مالک کے سن وصال میں اختلاف ہے۔ ان کے سن وصال پر ایک قول ۹۵ھ کا بھی ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ امام اعظم نے ان سے اس سال بھی سماع کیا ہو۔

امام یحییٰ بن معین

امام بخاری، امام مسلم اور امام ابوداود کے شیخ امام یحییٰ بن معین (۲۳۳ھ) فرماتے ہیں:

ابو حنیفة صاحب الرای قد سمع من عائشة بنت عجرد .(روایة الدوری تاریخ ابن معین ج ۳ ص ۴۸۰)

امام ابوحنیفہ صاحب رائے نے عائشہ بنت عجرد سے سنا ہے۔

بعض لوگوں نے عائشہ بنت عجرد کو تابعی بتایا ہے، لیکن یحییٰ بن معین نے ان کا حضور سے سماع صراحتاً بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ان اباحنیفة صاحب الرای سمع عائشة بنت عجرد تقول سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم .(الانتصار والترجیح للمذهب الصحیح ص ۴۶۳)

امام ابوحنیفہ صاحب الرائے نے حضرت عائشہ بنت عجرد کو سنا کہ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

امام ابومعشر عبدالکریم شافعی نے اپنے ایک جز میں امام اعظم کی صحابہ سے مرویات کو شمار کرایا ہے۔ اس میں ذکر کرتے ہیں:

قال ابوحنیفة لقیت من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم سبعة انس بن مالك عبدالله بن انیس عبدالله بن جزء الزبیدی وجابر بن عبدالله ومعقل بن یسار وواثلة بن الاسقع وعائشة بنت عجرد ثم روی له عن انس ثلاث احادیث وعن ابن جزء حدیثا وعن واثلة حدیثین وعن جابر حدیثا وعن عبدالله بن انیس حدیثا وعن عائشة بنت عجرد حدیثا وروی له ایضا عن عبدالله بن ابی اوفیٰ حدیثا . (تبییض الصحیفہ ص ۲۳)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں، میں نے سات اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہے، جن میں حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن انیس، حضرت عبداللہ بن جزء زبیدی، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت معقل بن یسار، حضرت واثلہ بن اسقع اور حضرت عائشہ بنت عجرد رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ پھر آپ نے حضرت انس سے تین احادیث، حضرت ابن جزء سے ایک حدیث، حضرت واثلہ سے دو حدیثیں، حضرت

جابر سے ایک حدیث، حضرت عبداللہ بن انیس سے ایک حدیث، حضرت عائشہ بنت عجرد سے ایک حدیث اور حضرت عبداللہ بن ابی اوفی سے ایک حدیث روایت کی۔

امام ابوالمؤید محمد بن محمود خوارزمی (۶۶۵ھ) اپنی کتاب جامع المسانید کی نوع ثالث کا عنوان یوں تحریر کرتے ہیں:

من مناقبه وفضائله التی لم یشارکه فیها احد بعده انه روی عن اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم فان العلماء اتفقوا علی ذلك وان اختلفوا فی عددهم فمنهم من قال انهم ستة وامرأة ومنهم من قال خمسة وامرأة ومنهم من قال سبعة وامرأة .(خوارزمی جامع المسانید للامام ابی حنیفة ج ۱ ص ۲۲)

امام اعظم کے ایسے مناقب اور فضائل کا بیان جو آپ کے بعد کسی کے حصے میں نہیں آئے، بے شک آپ نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، علما اس بات پر متفق ہیں، مگر کتنے صحابہ سے روایت کی، ان کی تعداد میں اختلاف ہے، ان میں سے کسی نے کہا، چھ صحابہ اور ایک صحابیہ، کسی نے کہا پانچ صحابہ اور ایک صحابیہ اور کسی نے کہا، سات صحابہ اور ایک صحابیہ۔

امام عبدالقادر بن ابی الوفاء قرشی (۷۷۵ھ) نے امام اعظم سے روایت پر مشتمل جزء تالیف کیا اور آپ کی صحابہ کرام سے روایت کو بیان کیا، اس سلسلے میں وہ امام اعظم کے تذکرہ میں فرماتے ہیں:

ادعی بعضهم انه سمع ثمانیة من الصحابة وقد جمعهم غیر واحد فی جزء وروینا هذا الجزء عن بعض شیوخنا وذکرت هذالجزء من سمعه من الصحابة ومن رآه . والذی سمعه منهم رضی الله تعالیٰ عنهم اجمعین عبدالله بن انیس وعبدالله بن جزء الزبیدی وانس بن مالك وجابر بن عبدالله ومعقل بن یسار وواثلة بن الاسقع وعائشة بنت عجرد . (الجواهر المضیئة فی طبقات الحنفیة ص ۲۱)

ائمہ میں سے بعض نے دعویٰ کیا ہے، کہ امام ابوحنیفہ نے آٹھ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے سماع کیا، کئی محدثین نے ان کو الگ الگ جزء میں جمع کیا ہے اور ہم نے بھی اس جزء کو اپنے بعض شیخوں سے روایت کیا ہے، میں نے اس جزء میں ان صحابہ کا ذکر کیا ہے، جن سے آپ نے سماع کیا اور جن کی زیارت کی آپ نے صحابہ کرام میں سے ان حضرات سے سماع کیا، حضرت عبداللہ بن انیس، حضرت عبداللہ بن جزء زبیدی، حضرت انس بن مالک، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت معقل بن یسار، حضرت واثلہ بن اسقع اور حضرت عائشہ بنت عجرد رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

ان روایات وتحقیقات کی روشنی میں امام اعظم ابوحنیفہ کی تابعیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔

علم وفضل

امام اعظم نے اپنے عہد کے مقتدر علماو مشائخ سے قرآن، حدیث، فقہ، کلام اور دیگر علوم وفنون حاصل کیے۔ اپنی ذہانت وطباعی اور خداداد علمی استعداد سے سب میں عبور حاصل کیا۔ وہ اپنے انہماک علم کے بارے میں کہتے ہیں:

میں نے جب تحصیل علم کا ارادہ کیا، تو تمام علوم کے حصول کو اپنا نصب العین قرار دیا، ہر فن کو پڑھا۔ (تاریخ علم فقہ ص ۱۴)

امام اعظم نے جس ذوق وشوق کے ساتھ علوم اسلامی کی تحصیل کی، وہ اپنے وقت کے بے نظیر فقیہ، مجتہد، امام حدیث اور عبقری عالم بن گئے۔ قدرت نے ان کی ذات میں بے شمار صوری ومعنوی خوبیاں جمع کر دی تھیں اور وہ بلا ریب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مصداق کامل بن گئے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے، کہ ہم حضور کی بارگاہ میں حاضر تھے، اسی مجلس میں سورہ جمعہ نازل ہوئی، جب آپ نے اس سورہ کی آیت ''و آخرین منھم لما یلحقوا بھم '' کی تلاوت فرمائی تو حاضرین میں سے کسی نے پوچھا، حضور! یہ دوسرے کون ہیں، جو ابھی تک ہم سے نہیں ملے؟ حضور نے اس کے جواب میں سکوت فرمایا، جب بار بار سوال کیا گیا، تو حضرت سلمان فارسی کے کندھے پر دست اقدس رکھ کر فرمایا:

> **لو كان الايمان عند الثريا لناله رجال من هؤلاء ۔** (بخاری ج ۲ ص ۷۲۷)
> اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہوگا تو اس کی قوم کے لوگ اس کو ضرور تلاش کریں گے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اس حدیث کو متعدد ماخذوں کے حوالہ سے اپنی تبییض الصحیفہ فی مناقب ابی حنیفۃ میں تحریر فرمایا:

> **قد بشر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالامام ابی حنیفۃ فی الحدیث الذی اخرجہ ابو نعیم فی الحلیۃ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو کان العلم بالثریا لنالہ رجال من ابناء فارس واخرج الشیرازی فی الالقاب عن قیس بن سعد بن عبادۃ قالؑ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو کان العلم معلقا بالثریا لتناولہ قوم من ابناء فارس واخرج البخاری ومسلم فی صحیحیھما حدیث ابی ھریرۃ بلفظ لو کان الایمان عند الثریالنالہ رجال من فارس ولفظ مسلم لو کان الدین عندالثریاللذھب بہ رجل**

من ابناء فارس حتى يتناوله وفى معجم الطبرانى عن ابن مسعود قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لو كان الدين معلقا بالثريا لتناوله ناس من ابناء فارس فهذا اصل صحيح يعتمد عليه فى البشارة والفضيلة فى الاشارة الى ابى حنيفة ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام اعظم ابوحنیفہ کے حق میں ایک حدیث میں بشارت سنائی، جس کی تخریج ابونعیم نے حلیہ میں کی ہے، حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر علم ثریا پر ہو، تو ابنائے فارس میں سے ایک شخص اسے پالے گا شیرازی نے القاب میں تخریج کی، قیس بن سعد سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، علم اگر ثریا پر بھی ہو تو ابنائے فارس میں سے ایک قوم اسے پالے گی، بخاری اور مسلم نے صحیحین میں ابو ہریرہ کی اس حدیث کی تخریج ان الفاظ میں کی ہے، اگر ایمان ثریا کے پاس ہو تو اسے رجال فارس پالیں گے۔ مسلم کے الفاظ ہیں، اگر دین ثریا کے پاس ہو، تو ابنائے فارس میں سے کوئی شخص وہاں تک پہنچ کر اسے حاصل کرے گا۔ معجم طبرانی میں ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اگر دین ثریا پر ہو تو ابنائے فارس کے کچھ لوگ اسے پالیں گے۔ پس یہ اصل صحیح ہے، جو امام اعظم ابوحنیفہ کی بشارت وفضیلت میں قابل اعتماد اشارہ ہے۔

امام سیوطی کے شاگرد محمد بن یوسف دمشقی تحریر کرتے ہیں:

ماجزم به شيخنا من ان اباحنيفة هو المراد من هذا الحديث ظاهر لاشك فيه لانه لم يبلغ احد اى فى زمنه من ابناء فارس فى العلم مبلغه احد ۔(حاشيه تبييض الصحيفه ص ۲۱)

ہمارے شیخ امام سیوطی نے جو فیصلہ کیا ہے کہ اس حدیث سے مراد ابوحنیفہ ہیں، وہ بالکل ظاہر ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، اس لیے کہ اہل فارس میں کوئی شخص علم میں ابوحنیفہ تک نہیں پہنچا۔

علمائے اسلام کی تصریحات اور امام اعظم کے علمی کمالات، تفقہ فی الدین سے یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے، کہ اس حدیث نبوی کا مصداق صرف اور صرف آپ کی ذات والا صفات ہے، کیوں کہ ائمہ اربعہ میں فقط امام اعظم ہی فارسی النسل ہیں۔ امام اعظم سے پہلے یا آپ کے بعد ایرانیوں میں اس رتبہ کا کوئی فقیہ و مجتہد پیدا نہیں ہوا۔

یہ حدیث بھی امام اعظم کی عظمت شان پر روشن دلیل ہے۔ علامہ ابن حجر مکی لکھتے ہیں:

انه قال ترفع زينة الدنيا سنة خمسين ومأة ۔(الخيرات الحسان ص ۳۰)

دنیا کی زینت ۱۵۰ھ میں اٹھالی جائے گی۔

آگے رقم طراز ہیں:

ومن ثم قال شمس الائمة الكردرى ان هذا الحديث محمول على ابى حنيفة لانه مات

تلك السنة ۔

اسی وجہ سے شمس الائمہ کردری نے کہا ہے، یہ حدیث امام اعظم ابوحنیفہ پر صادق آتی ہے، کیوں کہ اسی سن میں ان کا وصال ہوا۔

امام اعظم کی علمی جلالت وفقہی کمال، اجتہادی قوت اور عظیم عبقریت کا اعتراف ملت کے علما وفقہا محدثین ومجتہدین عہد امام سے لے کر آج تک کرتے چلے آرہے ہیں۔ ذیل میں کچھ اہم شخصیتوں کے اقوال درج کیے جاتے ہیں۔

☆ **عبداللہ بن مبارک:۔** افقه الناس ابو حنیفة ما رایت فی الفقه مثله ۔ (تہذیب التہذیب ج۱۰ ص۴۰۱)

لوگوں میں ابوحنیفہ سب سے بڑے فقیہ تھے، میں نے فقہ میں کسی کو ان کی مانند نہیں دیکھا۔

لو رایت اباحنیفة لرایته رجلا کبیرا ۔ (فتح الرحمان فی اثبات مذہب النعمان ص۱۰)

اگر تم ابوحنیفہ کو دیکھتے تو یقیناً انہیں بڑا آدمی پاتے۔

☆ **ابونعیم:۔** کان ابو حنیفة صاحب غوص فی المسائل ۔ (تہذیب ج۱۰ ص۴۰۲)

ابوحنیفہ مسائل کی گہرائیوں میں اترنے والے تھے۔

☆ **یزید:۔** ما رایت احدا اورع ولا اعقل من ابی حنیفة ۔ (ایضا)

میں نے ابوحنیفہ سے زیادہ پرہیزگار اور ان سے زیادہ عقل مند کسی کو نہیں دیکھا۔

☆ **ابوداؤد:۔** ان اباحنیفة کان اماما ۔ (ایضا)

بے شک ابوحنیفہ امام تھے۔

☆ **یحییٰ بن معین:۔** القرأة عندی قرأة حمزة والفقه فقه ابی حنیفة ۔ (ایضا)

میرے نزدیک قرأت حمزہ کی ہے اور فقہ ابوحنیفہ کی۔

☆ **اسرائیل:۔** احکام سے متعلق کسی کو ان سے زیادہ احادیث یاد نہ تھیں، ان سے زیادہ کوئی حدیث کی فقہ جاننے والا نہ تھا۔ (تذکرۃ المحدثین ص۶۰)

☆ **امام وکیع:۔** میں کسی عالم سے نہیں ملا، جو امام ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ ہو اور ان سے زیادہ نماز پڑھتا ہو۔ (ایضا)

☆ **سفیان ثوری:۔** سفیان ثوری نے ایک شخص سے فرمایا (جو امام صاحب کی مجلس سے واپس آیا تھا) تم روئے زمین پر سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے واپس آرہے ہو۔ (محدثین عظام ص۵۲)

☆ **امام احمد بن حنبل:۔** انه من العلم والورع والزهد بمحل لا یوجد له فی زمانه مثال ۔ (فتح الرحمان فی تائید مذهب النعمان)

وہ علم، تقویٰ اور زہد کے ایسے مقام پر فائز ہیں، جس کی نظیر ان کے زمانے میں نہیں ملتی۔

☆**امام اوزاعی:۔** مجھے امام ابوحنیفہ پر ان کی کثرت علم اور وفور عقل کی وجہ سے رشک آیا۔ (ایضا)

☆**علی بن عاصم:۔** لووزن علم ابی حنیفة بعلم اهل زمانه لرجح علیهم ۔ (تاریخ ذهبی ص ۳۱۲)
اگر ابوحنیفہ کے علم کو ان کے زمانہ والوں کے علم کے ساتھ وزن کیا جائے، تو آپ کے علم کا پلہ بھاری ہوگا۔
عبداللہ بن مبارک درج ذیل اشعار میں امام صاحب کے مناقب بیان کرتے ہیں۔

رایت ابا حنیفة کل یوم　　یزید نبالة ویزید خیرا
وینطق بالصواب ویصطفیه　　اذا ما قال اهل الجور جورا
یقایس من یقایسه بلب　　ومن ذا تجعلون له نظیرا
کفانا فقد حماد وکانت　　مصیبتنا به امرا کبیرا
فرد شماتة الاعداء عنا　　وابدی بعده علما کثیرا
رایت ابا حنیفة حین یوتی　　ویطلب علمه بحرا غزیرا
اذا ما المشکلات تدافعتها　　رجال العلم کان بها بصیرا

میں نے ابوحنیفہ کو دیکھا کہ ان میں ہر دن شرافت اور خیر کا اضافہ ہوتا ہے۔
اور وہ صحیح بات کہتے ہیں اور اسی کو اختیار کرتے ہیں جب کہ اہل جور ٹیڑھی بات کرتے ہیں۔
وہ اس شخص سے قیاس کی بحث کرتے ہیں جو آپ سے عقل کی بات کرے وہ کون ہے جس کو تم ان کی نظیر بناتے ہو۔
انہوں نے ہمارے لیے حضرت حماد کے فقدان کا مداوا کیا حالاں کہ حماد کی جدائی ہمارے لیے ایک بڑی مصیبت تھی۔
انہوں نے ہم پر دشمنوں کے ہونے والے شر کا دفاع کیا اور اس کے بعد اپنی ذات سے علم کثیر کا فیض عام کیا۔
میں نے ان کو گہرا سمندر دیکھا جب کہ کوئی ان کے پاس آتا تھا اور علم کا طلب گار ہوتا تھا۔
جب کہ علما مسائل کو ایک دوسرے پر ٹالتے تھے آپ ان سے واقف تھے۔ (تبییض الصحیفہ ص ۵۶)

☆**عبداللہ بن مبارک:۔** لولا ان اللہ تعالیٰ اغاثنی بابی حنیفة وسفیان کنت کسائر الناس ۔
(تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۰)

اگر اللہ تعالیٰ امام اعظم اور سفیان ثوری کے ذریعہ میری دستگیری نہ فرماتا تو میں عام آدمیوں میں سے ہوتا۔

☆**حضرت امام شافعی:۔** الناس عیال فی الفقه علی ابی حنیفة من لم ینظر فی کتبه لم یتبحر فی العلم ولا یتفقه ۔ (تبییض الصحیفه ص ۱۸)

سب لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے عیال ہیں، جس نے امام ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اسے علم میں تبحر حاصل نہیں ہوا اور نہ وہ فقیہ ہوا۔

☆ **خلیفہ ابوجعفر منصور عباسی:۔** ھذا عالم الدینا الیوم ۔(تبییض الصحیفہ ص ۲۵)

یہ دنیائے اسلام کے آج سب سے بڑے عالم ہیں۔

☆**ابن عیینہ:۔** ما رات عینی مثلہ ۔ (الخیرات الحسان ص ۲۹)

آپ جیسا میری آنکھ نے نہ دیکھا۔

☆**مکی بن ابراہیم:۔** کان ابو حنیفۃ اعلم اھل زمانہ ۔(الخیرات الحسان ص ۳۱)

امام ابوحنیفہ اپنے زمانے میں سب سے بڑے عالم تھے۔

☆**حافظ محمد بن میمون:۔** لم یکن فی زمن ابی حنیفۃ اعلم واورع ولاازھد ولااعرف ولاافقہ ۔
(الخیرات الحسان ص ۳۲)

امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں آپ سے بڑھ کر نہ کوئی عالم تھا نہ کوئی پرہیز گار نہ زاہد نہ عارف نہ فقیہ۔

امام اعظم کی عبقری شخصیت اور مقبولیت نے ان کے بعض معاصرین اور کچھ ناعاقبت اندیشوں کو آپ کا مخالف بنادیا تھا اور وہ اس آفتاب علم وحکمت پر کیچڑ اچھالنے کی مذموم کوشش کرتے اور آپ کو طرح طرح سے متہم کرتے، مخالفین کا یہ طرز عمل آپ کی عظمت شان کو چھپانے کی ناکام کوشش تھی، چنانچہ آپ کے حاسدوں کا نام تو مٹ گیا، مگر امام صاحب کی علمی جلالت اور فقہی عظمت کا آفتاب پوری دنیا کو منور کررہا ہے۔

امام اعظم اور علم کلام ومناظرہ

اسلام جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر جب دنیا کے مختلف خطوں میں پہنچا اور مختلف ادیان وملل کے ماننے والے مسلمان ہوئے۔ ان کی طبیعتوں میں عربوں جیسی سادگی نہ تھی، بلکہ ان کے مزاج میں نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکالنے کا وصف موجود تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے سابق مذہب کی روایات اور عقائد کے عناصر نے ان کو اسلامی عقائد ومسائل میں اپنی ذہنی اُپج سے کام لینے اور نکتہ آفرینی کا خیال پیدا ہوا۔ مزید برآں وہ اسلام دشمن عناصر جو اس کی عسکری قوت سے دب گئے تھے، اور بظاہر اسلام بھی قبول کرلیا تھا، لیکن دشمنی کی چنگاری ان کے دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی تھی، انہوں نے اپنے باطل افکار وآرا کو اسلامی فکر واعتقاد میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح مسلمانوں میں متعدد مذہبی فرقے وجود میں آئے اور اسلامی معتقدات پر بحث ومناظرہ کا بازار گرم ہوا۔ امام صاحب کی زندگی میں چند مخصوص فرقے وجود میں آچکے تھے۔ شیعہ، خوارج، مرجئہ، معتزلہ، قدریہ، جبریہ، یہ سارے فرقے اسلام کے بعض بنیادی عقائد سے انحراف رکھتے تھے اور وہ شد ومد کے ساتھ اپنے اقوال وآرا پھیلانے کی جدوجہد کررہے تھے، لیکن ان باطل فرقوں کی تردید کے لیے جس اعلیٰ ترین ذہانت، دقیقہ رسی، قرآن وحدیث کے صحیح رموز واسرار سے واقفیت اور مذہبی معلومات درکار تھیں، یہ اوصاف امام اعظم سے بڑھ کر کسی دوسری علمی شخصیت میں یک جا نظر نہیں آتے۔ رگوں میں ایرانی خون اور طبیعت میں زور اور حدت تھی۔ چنانچہ جوانی کے ایام میں بحث ومناظرہ کے

میدان میں اترے۔ خداداد ذہانت وطباعی اور بصیرت علم سے اسلامی عقائد وافکار کی صحیح ترجمانی کی۔ خوارج، روافض، معتزلہ، مرجئہ، قدریہ، جبریہ، زنادقہ اور ملاحدہ سے مناظرے کیے اور انہیں شکست فاش دی۔ اس دور کے اہم کلامی مباحث جو باطل فرقوں نے پیدا کیے مثلاً ایمان کی حقیقت، مرتکب کبیرہ کا حکم، مسئلہ تقدیر، مسئلہ جبر واختیار، امام اعظم نے ان مسائل کے سلسلے میں صحیح اسلامی نقطہ نظر کو اپنی کتاب ''الفقہ الاکبر'' میں بھی بیان فرمایا، اس طرح وہ علم کلام کے مدون اول ہوئے۔ ان کلامی بحثوں کی گرم بازاری یوں تو ایران وعراق کے مختلف شہروں میں تھی، لیکن ان کا خاص مرکز بصرہ تھا، جہاں بھانت بھانت کے مذہبی افکار وآرا کے مبلغین موجود تھے۔ چنانچہ امام اعظم نے ان باطل فرقوں کے نمائندوں سے بار بار بصرہ جا کر مناظرے کیے اور جب تک وہ علم فقہ کی طرف مائل نہ ہوئے ان کی ساری توجہ کلامی مباحث اور جدل ومناظرہ کی طرف منعطف رہی۔ وہ خود بیان کرتے ہیں:

> کنت اعطیت جدلا فی الکلام واصحاب الاھواء فی البصرۃ کثیرۃ فدخلتھا نیفا وعشرین مرۃ وربما اقمت بھا سنۃ او اکثر او اقل ظنا ان علم الکلام اجل العلوم ۔

(کردری ج ۱ ص ۱۲۱)

> مجھے کلامی مباحث میں جدل ومناظرہ کا شوق تھا، چوں کہ بصرہ میں باطل فرقے بکثرت موجود تھے، تو میں ان سے مناظرہ کرنے کے لیے بیس مرتبہ سے زیادہ بصرہ گیا اور کبھی کبھی میں سال سال بھر یا اس سے کم وبیش وہاں ٹھہرا رہتا اس لیے کہ میرا گمان یہ تھا، کہ یہ عظیم ترین علم ہے۔

ذیل میں امام صاحب کے بعض اہم مناظروں کی اجمالی روداد پیش کی جاتی ہے، جس سے آپ کی حاضر جوابی، قوت استدلال، دقت نظر، وسعت فکر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

☆ امام اعظم مسجد کوفہ میں تشریف فرما تھے، کہ مشہور رافضی مناظر شیطان الطاق آپ کے پاس حاضر ہوا اور کہا، یہ بتائیے، کہ لوگوں میں سب سے بڑا طاقت ور اور اشد الناس کون ہے؟ امام صاحب نے فرمایا، کہ ہمارے نزدیک اشد الناس حضرت علی ہیں اور تمہارے نزدیک اشد الناس حضرت ابوبکر ہیں۔ شیطان الطاق سٹ پٹایا اور کہا، تم نے بات الٹ کر کہی ہے، اصل میں ہمارے نزدیک اشد الناس کا مصداق حضرت علی اور تمہارے نزدیک ابوبکر صدیق ہیں۔ ابوحنیفہ نے فرمایا، ہرگز ایسا نہیں، ہم جو حضرت علی کو اشد الناس قرار دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے، کہ جب انہیں معلوم ہو گیا، کہ خلافت کا استحقاق ابوبکر ہی کو حاصل ہے، تو انہوں نے اسے تسلیم کر لیا اور تمام عمر ابوبکر کی اطاعت کی اور تم لوگ کہتے ہو، کہ خلافت حضرت علی کا حق تھا، ابوبکر نے جبراً ان سے یہ حق چھین لیا تھا، مگر حضرت علی کے پاس اتنی قوت اور طاقت نہیں تھی، کہ وہ اپنا حق ابوبکر سے واپس لے لیتے، معلوم ہوتا ہے، کہ تمہارے نزدیک ابوبکر حضرت علی سے زیادہ طاقت ور اور قوت والے تھے۔ شیطان الطاق رافضی ابوحنیفہ کا جواب سن کر لال پیلا ہو کر بھاگ گیا۔ (کردری ج ۱ ص ۱۶۲)

☆ علامہ مکی المناقب میں لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ جہم بن صفوان گفتگو کے لیے امام ابوحنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا، عندالملاقات بولا: میں چند مسائل میں آپ سے تبادلہ افکار کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا تمہارے ساتھ گفتگو کرنا باعث عار ہے اور جن مسائل میں تم مشغول ہو ان میں حصہ لینا سبب دخول نار۔

جہم:۔ آپ نے مجھ سے ملاقات اور کلام کے بغیر یہ فیصلہ کیسے صادر کر دیا؟

امام صاحب:۔ تمہارے جو اقوال مجھے پہنچے وہ مسلمانوں کے نہیں ہو سکتے۔

جہم:۔ آپ بغیر دیکھے سنے یہ فیصلہ صادر کر رہے ہیں۔

امام صاحب:۔ یہ باتیں تمہارے متعلق مشہور ہیں اور ہر کس و ناکس جانتا ہے، لہٰذا مجھے تمہارے خلاف یہ بات کچھ وثوق سے کہنی پڑی۔

جہم:۔ میں آپ سے صرف ایمان کی حقیقت دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

امام صاحب:۔ کیا تم ابھی تک حقیقت حال سے آشنا نہیں ہو کہ سوال کی ضرورت پڑی۔

جہم:۔ کیوں نہیں البتہ ایمان کی ایک نوع میں مجھے شبہ ہو گیا وہ دور کرنا چاہتا ہوں۔

امام صاحب:۔ ایمان میں شک کرنا کفر ہے۔

جہم:۔ آپ کے لیے بالکل جائز نہیں کہ میرے کفر کی وجہ نہ بتائیں۔

امام صاحب:۔ پھر بولو کیا پوچھتے ہو۔

جہم:۔ اچھا بتائیے ایک شخص دل سے خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے، وہ اس کو واحد یگانہ اور بلا مثیل و نظیر سمجھتا ہے، اس کی صفات سے بھی آشنا ہے "لیس کمثلہ شئ" بھی مانتا ہے، مگر ان باتوں کا زبان سے اقرار کیے بغیر فوت ہو جاتا ہے، کیا یہ شخص کفر پر مرا یا اسلام پر؟

امام صاحب:۔ یہ شخص کافر ہے اور لہٰذا دوزخی، جب تک کہ قلبی معرفت کے ساتھ لسانی اقرار جمع نہ ہو۔

جہم:۔ وہ مومن کیسے نہیں جب کہ وہ خدا کی مع صفات معرفت حاصل کر چکا؟

امام صاحب:۔ اگر تم قرآن پر ایمان رکھتے ہو اور اسے حجت شرعیہ سمجھتے ہو، تو میں قرآنی دلائل پیش کروں اور اگر ایسا نہیں تو میرا انداز گفتگو تم سے وہی ہو گا جو مخالفین اسلام سے ہوتا ہے۔

جہم:۔ میں قرآن پر ایمان رکھتا ہوں اور اس کو حجت سمجھتا ہوں۔

امام صاحب:۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کا تعلق قرآن میں دو اعضا سے وابستہ کیا ہے، ایک دل اور دوسری زبان چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۔ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۔ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (المائدۃ:۵/۸۵،۸۴،۸۳)

جب وہ آیات قرآنی سنتے ہیں، تو معرفت حق کی وجہ سے ان کے آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہم ایمان لا چکے، ہمیں حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ دے اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ ہم خدا اور اس کے نازل کردہ حق وصدق کو نہ مانیں، ہم امیدوار ہیں کہ ہمارا خدا ہمیں نیکوکاروں میں داخل فرمائے گا۔ اس قول کی وجہ سے خدا نے بدلہ میں انہیں جنت عطا کی، جس میں نہریں جاری ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے اور نیکوکاروں کا بدلہ یہی ہے۔

فرمایا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معرفت اور اقرار کی وجہ سے جنتی فرمایا ہے اور ماننے کے باعث مومن قرار دیا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۔ (البقرۃ:۲/۱۳۷،۱۳۶)

کہہ دیجیے کہ ہم خدا تعالیٰ اور اس کی نازل کردہ آیات پر ایمان لائے اور جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور آپ کے اسباط واحفاد پر اتارا گیا، جو موسیٰ وعیسیٰ اور دیگر انبیا کو خدا کی طرف سے عطا کیا گیا، ہم ان میں باہم فرق نہیں کرتے اور اسی کے تابع ہیں، اگر وہ تمہاری طرح ایمان لے آئیں، تو وہ ہدایت یافتہ ہو گئے۔

ایک مقام پر ارشاد باری ہے:

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى ۔ (الفتح:۴۸/۲۶)

لازم کر دیا ان پر کلمہ تقویٰ۔

نیز ارشاد ربانی ہے:

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۔ (الحج ۲۲/۲۴)

انہیں پاکیزہ باتوں کی ہدایت کی گئی۔

نیز فرمایا:

اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ ۔(الفاطر:۳۵/۱۰)

پاکیزہ کلمات اسی کی جانب چڑھتے ہیں۔

نیز فرمایا:

یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَةِ ۔ (ابرٰهیم ۱۴/۲۷)

اللہ تعالیٰ مومنوں کو دنیوی زندگی اور آخرت میں قول ثابت کی وجہ سے ثابت قدم رکھتا ہے۔

اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی ملاحظہ ہوں

قولوا لا اله الا الله تفلحوا ۔

لا الہ اللہ کہہ دو فلاح پاؤ گے۔

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے، کہ فلاح و بہبود کا انحصار صرف معرفت پر نہیں بلکہ قول بھی اس میں شامل ہے۔

نیز فرمایا:

یخرج من النار من قال لا اله الا الله و کان فی قلبه کذا ۔

جو شخص زبان سے لا الہ الا اللہ کہہ دے اور وہ دل سے اس پر ایمان رکھتا ہو تو وہ دوزخ سے نکل جائے گا۔

اگر قلبی معرفت کافی ہوتی اور اقرار باللسان کی مطلقاً حاجت نہ ہوتی، تو زبان سے اللہ تعالیٰ کی تردید اور انکار کرنے والے دل سے خدا کی معرفت حاصل کر کے مومن بن جاتے۔ اندریں صورت ابلیس کا مومن ہونا بھی کسی شبہ سے بالا ہوتا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس کا خالق، مارنے والا، زندہ کرنے والا اور اس کو جادہ مستقیم سے بھٹکانے والا ہے، جیسا کہ ابلیس نے کہا:

رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ ۔(الحجر:۱۵/۳۹)

اے رب تو نے مجھے گمراہ کیا۔

اور کہا:

اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ ۔(الحجر ۱۵/۳۶)

روز قیامت تک کے لیے مہلت عطا کر۔

نیز کہا:

خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِیۡنٍ ۔(صٓ ۳۸/۷۶)

تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔

اگر صرف خدا کی معرفت موجب ایمان ہوتی تو کافر حصولِ معرفت کے بعد زبان سے منکر ہونے کے علی الرغم مومن ہوتے حالاں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ۔(النمل ۲۷ / ۱۴)

یقین کرنے کے باوجود انہوں نے انکار کر دیا۔

اس آیت میں وحدانیت کا یقین رکھنے کے باوجود مومن نہیں کہا، کیوں کہ وہ زبان سے منکر تھے۔

نیز فرمایا:

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔(النحل: ۱۶ / ۸۳)

خدا کی نعمت کو پہچان کر انکار کر دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر تو بالکل نہیں مانتے۔

نیز فرمایا:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۔فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۔(یونس: ۱۰/ ۳۱، ۳۲)

ان سے پوچھیے تو، کہ تمہیں زمین و آسمان سے رزق کون بہم پہنچاتا ہے یا کان اور آنکھ کس کے قبضہ قدرت میں ہیں؟ اور زندے کو مردے اور مردے کو زندے سے کون نکالتا ہے، جملہ امور کس کے زیر تصرف ہیں تو جواب میں کہیں گے یہ سب تصرف خدا کے قبضہ میں ہیں، پھر ان سے پوچھیے کہ تم اس سے ڈرتے کیوں نہیں؟ بس یہی تمہارا خدا ہے جو پروردگار حقیقی ہے۔

مندرجہ بالا آیت پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے، کہ انکار کی موجودگی میں ان کی معرفت قطعی طور سے بے کار تھی، نیز فرمایا:

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔(البقرہ: ۲/ ۱۴۶)

وہ آپ کو ایسے پہچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹے کو۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ منکرین کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان لینا کافی نہ تھا، جب کہ وہ آپ کی نبوت و رسالت کو مانتے نہ تھے اور انہوں نے اس واضح حقیقت پر پردہ ڈال رکھا تھا۔

جب امام ابوحنیفہ یہ دلائل بیان کر چکے، تو جہم نے کہا، آپ نے میرے دل کی دنیا ہی بدل دی، میں پھر لوٹ کر حاضر خدمت ہوں گا۔ (موفق ج ۱ ص ۱۴۵ تا ۱۴۸، کردری ج ۱ ص ۱۸۶)

☆ فرقہ قدریہ کے ایک وفد نے امام اعظم ابوحنیفہ سے دریافت کیا، کہ جب اللہ تعالیٰ بندہ کے کفر کا ارادہ کرے تو اس کے حق میں اچھا ہے یا برا؟ آپ نے فرمایا، برے سلوک کی نسبت اس شخص کی طرف کی جاتی ہے، جو مامور بہ کی خلاف ورزی کرتا ہو اور خدائے تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ (الانتقاء ص ۱۶۵)

امام ابوحنیفہ نے مناظرہ میں کامیابی کے اصول بتاتے ہوئے ایک مرتبہ یہ بھی ارشاد فرمایا: جب کسی سے مناظرہ کا اتفاق ہوتو الٹا اسی سے پوچھنا شروع کردو تم ہی غالب آجاؤ گے، پھر خود اپنی زندگی میں امام ابوحنیفہ نے اس اصول پر عمل کیا، ذیل میں بطور مثال مناقب کردری سے خوارج سے مناظرہ کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

☆ ایک مرتبہ خوارج کے ستر افراد پر مشتمل ایک گروہ اچانک امام ابوحنیفہ کے سر پر آچڑھا اور تلواریں نکال کر کہا، چوں کہ تم مرتکب کبیرہ کو کافر نہیں کہتے، اس لیے تمہیں قتل کردیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا، جذبات میں آنے کے بجائے ٹھنڈے دل سے بات کیجیے، پہلے بات پوچھ لیں اگر واقعتاً میری ہی غلطی ہے تب قتل کا اقدام کریں، بہتر ہے کہ اولاً اپنی تلواریں نیام میں ڈالیں اور سنجیدگی سے اپنے سوالات بیان کرلیں بعد میں جو جی میں آئے کریں۔

خوارج نے کہا، ہم اپنی تلواروں کو آپ کے خون سے رنگین کریں گے، ہمارے عقیدے کے مطابق ایسا کرنا، ستر سال جہاد فی سبیل اللہ سے افضل ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا، اچھا بات کرو، کیا کہنا چاہتے ہو۔ تب خارجیوں نے کہا، کہ باہر دو جنازے پڑے ہیں، ایک جنازہ مرد کا ہے اور ایک عورت کا۔ مرد نے شراب پی اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوگئی، جب کہ عورت حاملہ تھی اور اس نے خودکشی کرلی اور مرگئی، ان کے بارے میں تمہارا کیا قول ہے؟

امام اعظم نہ تو گھبرائے نہ ذہن غائب ہوا، بڑی حاضر دماغی، حوصلے اور سنجیدگی سے ان سے ہی دریافت فرمایا اور کہا یہ بتاؤ، کہ یہ دونوں یہودی تھے یا نصرانی تھے یا مجوسی تھے؟ خارجیوں نے کہا، نہ یہودی تھے، نہ نصرانی اور نہ مجوسی۔ امام ابوحنیفہ نے دریافت کیا اچھا تو ان کا تعلق کس ملت سے تھا؟ خارجیوں نے کہا، کہ ان کا تعلق اس ملت سے تھا، جو کلمہ شہادت پڑھتے اور اقرار کرتے ہیں، کہ

اشهد ان لااله الاالله واشهد ان محمدا رسول الله ۔

تو امام ابوحنیفہ نے پھر دریافت کیا اچھا یہ بتاؤ کہ یہ کلمہ ایمان کا کونسا جزء ہے؟ نصف ہے یا چوتھائی یا تہائی؟ خارجیوں نے کہا، یہ تو کل ایمان ہے اس لیے کہ ایمان کے اجزا نہیں ہوتے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا: جب ایمان کے اجزا نہیں ہوتے اور وہ دونوں اس کلمہ کے قائل اور اس پر یقین کرنے والے تھے، تو اب تم ہی بتاؤ کہ یہ دونوں جنازے کن کے ہوئے مسلمانوں کے یا کافر کے؟ خارجی پریشان ہوئے، حواس باختگی ان پر طاری ہوئی اور کہنے لگے اچھا ان کو رہنے دیجیے!

ایک دوسرے سوال کا جواب عنایت فرمائیے! وہ یہ کہ یہ دونوں جہنمی ہیں یا جنتی؟ ابوحنیفہ نے فرمایا: اس سوال کے جواب میں میرے سامنے انبیا کا اسوہ حسنہ موجود ہے، جو اللہ کی سچی کتاب قرآن میں منقول ہے، میں وہی کہوں گا، جو حضرت ابراہیم نے ان دونوں سے بڑے مجرموں کے بارے میں اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا تھا:

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔(ابراہیم:۱۴/۳۶)

جس نے میری اتباع کی، وہ میرا ہے اور جس نے نافرمانی کی، پس اے خدا تو غفور رحیم ہے اور وہ کہوں گا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۔ (المائدۃ:۵/۱۱۸)

اے اللہ! اگر تو ان کو عذاب دے، تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر بخش دے، تو تو غالب حکمت والا ہے۔

اور وہ کہوں گا، جو حضرت نوح علیہ السلام نے کہا تھا:

وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّیْ ۔(الشعراء:۲۶/۱۱۳)

جو کچھ انہوں نے کیا، وہ مجھ پر نہیں، ان کا حساب تو اللہ پر ہے وہ جو چاہے کرے۔

خارجیوں نے امام ابوحنیفہ کی یہ مدلل گفتگو سن کر ندامت محسوس کی، نیام سے نکلی اور سونتی ہوئی تلواریں واپس نیاموں میں داخل کر لیں۔ توبہ کی اور عقیدہ اہل سنت و جماعت کو اختیار کیا۔ امام ابوحنیفہ کے حسن سلیقہ، تدبیر و فراست کی وجہ سے ان کی عظمت کے قائل ہوئے اور ان کے غلام بن گئے۔ (کردری ج ۱ ص ۱۲۴)

* * *

فقہ اکبر اور مسلک اہل سنت کی وضاحت

امام ابوحنیفہ کے عہد تک جو سیاسی اور کلامی فرقے وجود میں آ چکے تھے اور ان کے باطل معتقدات امت اسلام میں افتراق وشقاق پیدا کر رہے تھے، سادہ لوح مسلمان ان مدعیان فرق وملل کے اوہام باطلہ سے متاثر ہو کر صراط مستقیم سے انحراف کی راہ اختیار کر رہے تھے، ایسے نازک حالات میں امام اعظم نے سب سے پہلے رسالہ ”الفقہ الاکبر“ لکھ کر اہل سنت وجماعت کے صحیح معتقدات کو بیان فرمایا، تاکہ مسلمان سنت متواترہ کے ذریعہ جو صحیح عقائد وافکار اسلامی چلے آ رہے ہیں، ان پر بلا ریب وشک ایمان واعتقاد درست کریں۔ ذیل میں چند اعتقادی مسئلے فقہ اکبر سے درج کیے جاتے ہیں، جو اس وقت زیر بحث تھے۔

مسئلہ خلافت

مسئلہ خلافت میں شیعہ وخوارج اہل سنت وجماعت سے مختلف تھے، خوارج حضرت علی کو دین سے خارج مانتے تھے، شیعہ حضرات شیخین اور عثمان غنی کی خلافت کے منکر بلکہ معاذ اللہ ان کو غاصب خیال کرتے تھے، امام اعظم نے خلفاے راشدین کی حیثیت اور ان کی ترتیب بیان کر کے اہل سنت کے عقیدہ خلافت کی وضاحت فرمائی:

افضل الناس بعد النبیین ابوبکر الصدیق ثم عمر بن الخطاب ثم عثمان بن عفان ثم علی بن ابی طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین ۔(الفقۃ الاکبر ص ۴)

انبیا کے بعد سب سے افضل ابوبکر صدیق ہیں، پھر عمر بن خطاب پھر عثمان بن عفان پھر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم۔

عقیدہ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح اس طرح کی گئی ہے:

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تمام امت پر افضل قرار دیتے ہوئے سب سے پہلے خلافت ان کے لیے ثابت کرتے ہیں، پھر عمر بن خطاب کے لیے پھر عثمان کے لیے پھر علی بن ابی طالب کے لیے اور یہ خلفاے راشدین اور ائمہ مہدین ہیں۔ (شرح الطحاویہ ص ۴۰۳)

صحابہ کرام

روافض حضرات صحابہ کرام کے بارے میں سب وشتم کو روا رکھتے تھے اور بعض غالی شیعہ یہاں تک کہتے تھے، کہ

چند صحابہ کے علاوہ سارے صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد معاذ اللہ دین سے منحرف ہو گئے تھے، امام اعظم نے ان کی تردید فرمائی اور یہ اعلان کیا، کہ تمام صحابہ حق پر تھے اور وہ قابل احترام ہیں کیوں کہ وہ دین حق کے مبلغ اور ملت بیضا کے امین تھے۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

ولا نذکر احدا من الصحابة الا بخیر (شرح فقہ اکبر ص ۳۰۵)

ہم صحابہ کا ذکر بھلائی کے سوا اور کسی طرح نہیں کرتے۔

عقیدہ طحاویہ میں اس کی مزید تفصیل یہ ہے:

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب کو محبوب رکھتے ہیں، ان میں سے کسی کی محبت میں حد سے نہیں گزرتے اور نہ کسی سے تبری کرتے ہیں، ان سے بغض رکھنے والے اور برائی کے ساتھ ان کا ذکر کرنے والے کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی اور طرح نہیں کرتے۔ (شرح الطحاویہ ص ۳۹۸)

ایمان

ایمان کی تشریح و تعبیر کے بارے میں کلامی موشگافیاں عام ہو رہی تھیں، امام نے ایمان کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی:

الایمان ھو الاقرار و التصدیق ۔(فقہ اکبر ص ۲)

ایمان اقرار و تصدیق کو کہتے ہیں۔

الوصیۃ میں اس کی تشریح یوں ہے:

ایمان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کا نام ہے، پھر کہتے ہیں، نہ اقرار اکیلا ایمان ہے اور نہ محض معرفت ہی کو ایمان کہا جاسکتا ہے، آگے چل کر اس کی مزید تشریح کرتے ہیں، عمل ایمان سے الگ ایک چیز ہے اور ایمان عمل سے الگ، اس کی دلیل یہ ہے، کہ بسا اوقات مومن سے عمل مرتفع ہو جاتا ہے، مگر ایمان اس سے مرتفع نہیں ہوتا، مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ فقیر پر زکوۃ واجب نہیں، مگر یہ نہیں کہا جاسکتا، کہ اس پر ایمان واجب نہیں۔ (الجوہرۃ المنیفہ ص ۳)

اس طرح انہوں نے خوارج کے اس خیال کی تردید کر دی، کہ عمل ایمان کی حقیقت میں شامل ہے اور گناہ لازماً عدم ایمان ہے۔

گناہ کبیرہ

خوارج کا عقیدہ تھا، کہ مرتکب کبیرہ مومن نہیں رہتا ہے اور اس عقیدے کی وجہ سے وہ عام مسلمانوں کو مباح الدم قرار دیتے تھے۔ امام صاحب نے اس سلسلے میں صراط مستقیم کی وضاحت فرمائی:

ولا نکفر مسلما بذنب من الذنوب وان کانت کبیرۃ اذا لم یستحلها ولا نزیل عنه اسم الایمان ونسمیه مومنا حقیقة ویجوز ان یکون مومنا فاسقا غیر کافر (فقه اکبر ص ۳)

ہم کسی مسلمان کو کسی گناہ کی بنا پر خواہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، کافر نہیں قرار دیتے، جب تک کہ وہ اس کے حلال ہونے کا قائل نہ ہو، ہم اس سے ایمان کا نام سلب نہیں کرتے بلکہ اسے حقیقۃً مومن قرار دیتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مومن شخص فاسق ہو اور کافر نہ ہو۔

وصیہ میں امام اس مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:

امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گنہگار سب مومن ہیں کافر نہیں ہیں۔ (ص ۲۴)

عقیدہ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح کی گئی ہے:

بندہ خارج از ایمان نہیں ہوتا مگر صرف اس چیز کے انکار سے جس کے اقرار نے اسے داخل ایمان کیا تھا۔ (ص ۳)

اس عقیدے اور اس کے اجتماعی نتائج پر پوری روشنی اس مناظرے سے پڑتی ہے، جو گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

گنہگار مومن کا انجام

گناہ کبیرہ سے مومن کافر نہیں ہوتا، لیکن گنہگار مومن کی عاقبت کے لیے مغفرت ممکن ہے اور گناہوں کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہونے کا مستحق ہے اگر اللہ مغفرت نہ فرمائے۔ امام صاحب نے اہل سنت وجماعت کے نقطۂ نظر کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی:

ولا نقول ان المومن لا تضره الذنوب ولا یدخل النار ولا انه یخلد فیه وان کان فاسقا بعد ان یخرج من الدنیا مومنا (فقه اکبر ص ۴)

ہم یہ نہیں کہتے کہ مومن کے لیے گناہ نقصان دہ نہیں ہے اور ہم نہ یہ کہتے ہیں کہ مومن دوزخ میں نہیں جائے گا اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا، گو وہ فاسق ہو۔

ولا نقول ان حسناتنا مقبولة وسیئاتنا مغفورۃ کقول المرجئة (ایضاً)

ہم مرجئہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں ضرور مقبول اور ہماری برائیاں ضرور معاف ہو جائیں گی۔

عقیدہ طحاویہ اس پر اتنا اضافہ اور کرتا ہے:

ہم ان میں سے کسی کے نہ جنتی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں نہ دوزخی ہونے کا اور نہ ہم ان پر کفر و شرک یا منافقت کا حکم لگاتے ہیں، جب تک کہ ان سے اس کی بات کا کھلا ظہور نہ ہو اور ان کی نیتوں کا معاملہ ہم خدا پر چھوڑتے ہیں۔ (ص ۳۲)

اس طرح امام نے شیعہ و خوارج اور معتزلہ و مرجئہ کی انتہائی آراء کے درمیان ایک ایسا متوازن عقیدہ پیش کیا، جو مسلم معاشرے کو انتشار اور باہمی تصادم و منافرت سے بھی بچاتا ہے اور اس کے افراد کو اخلاقی بے قیدی اور گناہوں پر جسارت سے بھی

روکتا ہے، جس فتنے کے زمانے میں امام نے عقیدہ اہل سنت کی یہ وضاحت پیش کی تھی، اس کی تاریخ کو نگاہ میں رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے، کہ یہ ان کا بڑا کارنامہ تھا، جس سے انہوں نے امت کو راہ اعتدال پر قائم رکھنے کی سعی بلیغ فرمائی تھی۔ اس عقیدے کے معنی یہ تھے، کہ امت اس ابتدائی اسلامی معاشرے پر پورا اعتماد رکھتی ہے، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا، اس معاشرے کے لوگوں نے جو فیصلے بالاتفاق یا اکثریت کے ساتھ کیے تھے، امت ان کو تسلیم کرتی ہے، جن اصحاب کو انہوں نے یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب کیا تھا، ان کی خلافت کے بھی اور ان کے زمانے کے فیصلوں کو بھی وہ آئینی حیثیت سے درست مانتی ہے اور شریعت کے اس پورے علم کو بھی قبول کرتی ہے، جو اس معاشرے کے افراد یعنی صحابہ کرام کے ذریعہ سے بعد کی نسلوں کو ملا ہے۔

الزام ارجاء

امام اعظم کی بلند رتبہ علمی و دینی شخصیت پر ان کے بعض معاندین نے جہاں قلت حدیث، قلت عربیت، قلت حفظ جیسے نازیبا الزامات عائد کیے ہیں، وہیں بعض نافہم منکرین امام نے آپ کو فرقہ مرجئہ کا مقلد قرار دیا ہے اور آپ کی نسبت عقیدہ ارجاء کا الزام لگا کر خود اپنی ذات کو ہدف طعن بنالیا ہے۔ ابو مسہر کا قول ہے:

کان ابو حنیفة رأس المرجئة (تاریخ بغداد ص ۳۷۴)

ابو حنیفہ مرجئہ کے سردار تھے۔

امام پر یہ الزام حسد اور ناواقفیت کی بنیاد پر لگایا گیا حتی کہ امام بخاری بھی عدم آگاہی کی بنا پر اس گروہ میں شامل ہو گئے اور انہوں نے اپنی کتاب تاریخ کبیر میں لکھ دیا:

کان مرجئا (ج ۲ ص ۸۱)

ابو حنیفہ مرجی تھے۔ فرقہ مرجئہ کا عقیدہ یہ تھا، کہ ایمان کے ہوتے ہوئے گناہ ضرر رساں نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا، ایمان کے ساتھ کوئی معصیت نقصان نہیں پہنچاتی، جس طرح کفر کے ساتھ کوئی طاعت مفید نہیں یعنی مومن گناہوں کی وجہ سے عذاب کا مستحق قرار نہیں پائے گا۔ (کتاب الملل والنحل ج ۱ ص ۳۵۸)

علامہ کوثری نے اپنی کتاب ”تانیب الخطیب“ میں خطیب بغدادی کی تاریخ میں مذکور اقوال و آرا کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور امام صاحب پر الزام ارجاء کو دلائل کی روشنی میں بے اصل قرار دیا ہے۔

امام اعظم مرجئہ کے اس باطل عقیدے سے منزہ تھے، چنانچہ ابن اثیر نے آپ کی براءت ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے:

والظاهر انه كان منزها عنها ۔ (اوشحة الجيد)

ظاہر یہی ہے کہ امام صاحب اس الزام سے بری ہیں۔

خود امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس غلط عقیدے سے براءت ظاہر کرتے ہوئے اپنی کتاب ”فقہ اکبر“ میں لکھا

ہے:

ولا نقول ان حسناتنا مقبولة وسيئاتنا مغفورة كقول المرجئة ۔(فقه اكبر ص ۵)

ہم نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں مقبول اور ہمارے گناہ مغفور ہیں جیسا کہ مرجۂ کہتے ہیں

مرجۂ نے گناہوں کو موجب عذاب قرار نہیں دیا اور خوارج نے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر گردانا اور معتزلہ مرتکب کبیرہ کو نہ مومن کہتے ہیں نہ کافر، امام اعظم نے اس سلسلے میں اہل سنت کے عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

ولاتقول ان المومن لاتضره الذنوب ولايدخل النار ولا انه يخلد فيه وان كان فاسقا بعد ان يخرج من الدنيا مومنا ۔(ايضا)

ہم یہ نہیں کہتے، کہ گناہ مومن کے لیے ضرر رساں نہیں اور نہ یہ کہتے ہیں کہ مومن دوزخ میں نہیں جائے گا اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ ابدی جہنمی ہے۔(اگر چہ وہ فاسق ہو بشرطیکہ وہ ایمان کے ساتھ دنیا سے گیا ہو)۔

اصول عقائد میں مناظرہ پسندی آغاز حیات میں آپ کا محبوب موضوع تھا، جس میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی جو اصول دین کے سمجھنے میں آپ کا طریق کار بن گیا تھا، بلکہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تحصیل فقہ میں مصروف ہونے کے بعد اگر ان اصول میں مناظرہ کی ضرورت لاحق ہوتی، تو آپ خوش اسلوبی سے یہ کام سرانجام دیتے۔

* * *

امام اعظم اور علم حدیث

تاریخ علم کا یہ بہت بڑا المیہ ہے، کہ امام اعظم کی تحقیر شان کے لیے قلیل البضاعت فی الحدیث کا بے بنیاد الزام آپ کے نام کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا، آپ کی محدثانہ حیثیت پر کلام کرتے ہوئے مخالفین نے طرح طرح کی باتیں کہی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے، کہ امام اعظم حدیث میں قلیل البضاعت تھے۔ ان کی کل مرویات سترہ ہیں۔ وہ حدیث پر قیاس ورائے کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے فقہی مسلک کی اساس سنت پر قائم نہیں۔

خطیب بغدادی نے امام صاحب کا تذکرہ اپنی تاریخ کے اندر سو صفحات میں کیا ہے، ابتدائی صفحات میں مناقب وفضائل تحریر کیے ہیں، پھر ۵۴؍ صفحات پر تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا ہے۔ جن میں نکتہ چینیاں اور معائب ذکر کیے ہیں۔ ذرا سی عقل رکھنے والا انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے یہ باور نہیں کر سکتا، کہ کوئی انسان ایسے دو متضاد صفات کا حامل ہو سکتا ہے؟ وہ کہنے پر مجبور ہوگا، کہ یا تو اس کے مناقب کی داستان فرضی ہے یا پھر عیوب کی طویل فہرست محض افترا و بہتان کا مجموعہ ہے۔

ابن خلکان نے اس تضاد کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

وقد ذكر الخطيب فى تاريخه منها شيئا كثيرا ثم اعقب ذلك بذكره ما كان الاليق فى تركه والاضراب عنه فمثل هذا الامام لايشك فى دينه ولافى ورعه وحفظه ولم يكن يعاب بشئ سوى قلة العربية ۔(وفیات الاعیان ج۳ ص۲۰۵)

خطیب نے اپنی تاریخ میں آپ کے مناقب کا بہت سا حصہ ذکر کیا ہے، اس کے بعد ایسی ناگفتنی باتیں لکھی ہیں، جن کا ذکر نہ کرنا اور ان سے اعراض کرنا مناسب تھا، کیوں کہ امام اعظم جیسے شخص کے متعلق نہ دیانت میں شبہہ کیا جا سکتا ہے، نہ حفظ وورع میں۔ آپ پر کوئی نکتہ چینی بجز قلت عربیت کے اور نہیں کی گئی۔

بعض ائمہ حدیث نے بھی حضرت امام اعظم پر حدیث میں ضعف کا طعن کیا ہے، خطیب نے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ابوحنیفہ حدیث میں قوی نہیں ہیں۔ (فتح الباری ج۱ ص۱۱۲)

مورخین کے اقوال وآرا میں حق وصداقت کا عنصر کس قدر ہے؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہم ذیل میں اکابر علمائے ملت کے اقوال وآرا پیش کرتے ہیں۔

مصری فاضل محمد ابوزہو لکھتے ہیں:

زعمهم انه كان قليل البضاعة فى الحديث زعم باطل بعد ان اجمعت الامة على انه من ائمة الهدى المجتهدين الذين لهم خبرة واسعة بالكتاب والسنة ومعانيها وقد جمع محمد بن محمد الخوارزمى المتوفىٰ سنة ٦٦٥ مسندا لابى حنيفة اخذه من خمسة عشر مسندا ۔(الحديث والمحدثون ص ۲۸۴)

لوگوں کا خیال ہے کہ امام اعظم حدیث میں قلیل البضاعت تھے، ان کا یہ زعم باطل ہے، اس لیے کہ امت نے اس بات پر اجماع کیا ہے، کہ وہ ائمہ ہدیٰ اور مجتہدین میں سے ہیں، جو کتاب وسنت اور ان کے معانی کے سلسلے میں وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ محمد بن محمد خوارزمی متوفی ٦٦٥ھ نے مسند ابی حنیفہ ترتیب دیا جسے انہوں نے پندرہ مسانید سے اخذ کیا۔

علامہ ابن خلدون رقم طراز ہیں:

امام ابوحنیفہ کے بارے میں کہا جاتا ہے، کہ ان سے صرف سترہ احادیث مروی ہیں یا اس کے قریب قریب یہ بعض حاسدوں کی خام خیالی ہے، کہ جس امام سے روایت کم مروی ہوں، وہ حدیث میں قلیل البضاعت ہوتا ہے، حالاں کہ ایسا لغو تخیل کیا ائمہ کے بارے میں سخت گستاخی و بے عقلی نہیں ہے؟۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۷)

ابن حجر مکی شافعی الخیرات الحسان میں تحریر فرماتے ہیں:

مر انه اخذ عن اربعة آلاف شيخ من ائمة التابعين وغيرهم ومن ثم ذكره الذهبى فى طبقات الحفاظ من المحدثين ومن زعم قلة اعتناء ه بالحديث فهو لحسده اذ كيف يتاتى لمن هو كذلك استنباط مثل ما استنبطه من المسائل التى لا تحصى كثرته مع انه اول من استنبط من الادلة على الوجه المخصوص المعروف فى اصحابه ولاجل اشتغاله بهذا الاهم لم يظهر حديثه فى الخارج ۔

یہ بات بیان ہو چکی ہے، کہ امام ابوحنیفہ نے چار ہزار مشائخ ائمہ تابعین سے حدیث اخذ کی ہے، اسی وجہ سے ذہبی وغیرہ نے حفاظ محدثین کے طبقہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور جو شخص کہتا ہے ان کو حدیث میں کم دخل تھا، تو اس کا یہ قول حسد پر مبنی ہے، اس لیے کہ جس کو چند حدیثیں معلوم ہوں گی ان سے بے شمار مسائل کا استنباط واحکام شرعیہ کا استخراج کیوں کر ہو سکتا ہے؟

حالاں کہ امام اعظم سب سے پہلے امام ہیں، جنہوں نے ادلہ شرعیہ سے مخصوص اصول وضوابط کے تحت استنباط و اجتہاد کا کام کیا اور ظاہر ہے کہ یہ کام بغیر فن حدیث کی مہارت کے ہو نہیں سکتا اور اسی اہم مشغولیت کی وجہ سے محدثانہ انداز میں آپ کی

حدیثیں زیادہ ظاہر ہیں۔ (ص ۱۲۲)

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی امام اعظم کے قلیل البضاعۃ فی الحدیث ہونے کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ان اباحنیفة رحمه الله امام مجتهد باجماع الموافقين والمخالفين ومن شرائط الاجتهاد ان يحيط المجتهد باحاديث الاحكام وهى الف وعلى اقل تقدير بضع مئات كما ذهب اليه بعض الحنابلة فكيف جاز لابى حنيفة ان يجتهدوهو لم يستكمل اهم شرط من شروط الاجتهاد؟ كيف اعترف الائمة اجتهاده وعنوابفقهه ونقلوه فى الآفاق ......ان من يطالع مذهب الامام يجد قد وافقت الاحاديث الصحيحة فى مئات من المسائل وقد جمع شارح القاموس السيد مرتضىٰ الزبيدى رحمه الله كتابا جمع فيه الاحاديث من مسانيد الامام ابى حنيفة والتى وافقه فى روايتها اصحاب الكتب الستة سماه عقد الجواهر المنيفة فى ادلة ابى حنيفة فكيف وافق اجتهاد الامام مئات الاحاديث الصحيحة وليس عنده الا بضعة عشر حديثا او خمسون اومأة وخطا فى نصفها ۔ (السنۃ ومکانتہا ص ۴۱۲)

بلاشبہ ابوحنیفہ مخالفین وموافقین کے اجماع سے امام ومجتہد تھے اور اجتہاد کے شرائط سے ہے کہ مجتہد احادیث احکام کا احاطہ کرے اور وہ ایک ہزار حدیثیں ہیں، بعض حنابلہ نے جو چند سو حدیثوں کے بارے میں کہا ہے، پس ابوحنیفہ کے لیے کیسے جائز ہے، کہ وہ اجتہاد کریں اور شرائط اجتہاد کی ایک شرط پوری نہ کریں اور ایسی صورت میں ائمہ نے ان کے اجتہاد کا اعتبار کیسے کرلیا اور ان کی فقہ کی اعانت کی اور اسے دنیا میں مشتہر کیا ...... جو امام اعظم کے فقہی مذہب کا مطالعہ کرے گا، وہ اسے احادیث صحیحہ کے موافق صدہا مسائل میں پائے گا۔ شارح قاموس سید مرتضٰی زبیدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب مرتب کی، جس کے اندر امام اعظم ابوحنیفہ کے مسانید سے حدیثیں جمع کی ہیں، وہ صحاح ستہ کے مصنفین کے موافق ہیں، جس کا نام عقد الجواہر المنیفہ فی آدلۃ ابی حنیفۃ رکھا، تو کیسے امام کا اجتہاد صدہا احادیث صحیحہ کے موافق ہوگا، جب کہ ان کے پاس سترہ یا پچاس یا ڈیڑھ سو احادیث کے علاوہ نہیں۔

اب ہم ملت کے مقتدر ائمہ کے اقوال پیش کرتے ہیں، جن سے امام صاحب کی محدثانہ جلالت اور حدیث دانی کا اندازہ کرنا آسان ہوگا۔

☆ حافظ محمد بن یوسف شافعی محدث دیار مصر:۔ **كان ابو حنيفة من كبار حفاظ الحديث واعيانهم ولولا كثرة اعتنائه بالحديث ماتهيا له استنباط مسائل الفقه ۔**

امام ابوحنیفہ کبار واعیان حفاظ حدیث میں تھے، اگر ان میں زیادہ اعتناء بالحدیث نہ ہوتا، تو وہ مسائل فقہیہ کا استنباط نہیں

کر سکتے تھے۔ (الحدیث والمحدثون ص ۲۸۴)

☆ **حفص بن غیاث:** ۔ امام ابوحنیفہ جیسا عالم ان احادیث کا میں نے نہیں دیکھا جو احکام میں مفید صحیح ہوں۔

(انوار الباری ج ۱ ص ۵۹)

☆ **امام سیوطی:** ۔ من کبار الحفاظ وثقة الناس وماضعفه الا متعصب ۔ (الحدیث والمحدثون ص ۲۸۵)

ابوحنیفہ کبار حفاظ حدیث اور ثقہ لوگوں میں تھے، ان کی تضعیف متعصب لوگوں کے علاوہ کسی نے نہیں کی۔

☆ **یحییٰ بن سعید قطان:** ۔ واللہ امام ابوحنیفہ اس امت میں خدا اور رسول سے جو کچھ وارد ہوا ہے، اس کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ (محدثین عظام ص ۵۸)

☆ **یحییٰ بن معین:** ۔ لاباس به لم یکن یتهم ۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۱۶۹)

امام ابوحنیفہ حدیث میں ثقہ تھے، ان میں اصول جرح وتعدیل کی رو سے کوئی عیب نہیں تھا۔

ان اقوال واقتباسات کی روشنی میں امام اعظم پر قلت حدیث کا طعن بالکل بے بنیاد ہو کر رہ جاتا ہے اور ان کی محدثانہ شان وعظمت نکھر کر سامنے آجاتی ہے، علاوہ ازیں امام اعظم کے تلامذہ میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں، جو اپنے وقت کے امام حدیث تھے اور ان کی امامت فی الحدیث پر سب متفق ہیں۔

امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری فرماتے ہیں:

نعمان بن ثابت (ابوحنیفہ) سے عبداللہ بن مبارک، عباد بن عوام، وکیع، ہشیم، خالد بن مسلم اور معاویہ قصری نے روایت کی۔ (دراسات)

ان حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ امام اعظم ابوحنیفہ علم نبوی کے حافظ، عادل اور ثقہ تھے اور وہ اپنے اجتہادی امور میں احادیث صحیحہ کی جانب رجوع کرتے تھے اور احادیث کی صحت وضعف کو خوب پہچانتے تھے ان کے معانی ومفاہیم اور دقائق وغوامض کا علم رکھتے تھے۔

امام کی مرویات دیگر محدثین کے مقابلہ میں قلیل ضرور ہیں، مگر قلت روایت کا سبب حدیث میں ان کی بے مائگی نہیں، بلکہ نقل وروایت حدیث میں ان کے شرائط دیگر ائمہ محدثین کی بہ نسبت زیادہ سخت ہیں اور وہ اصول روایت کے ساتھ ساتھ اصول درایت کو بھی خاص طور پر اہمیت دیتے تھے۔

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

امام ابوحنیفہ کی روایت کے کم ہونے کا مسئلہ تو اس کا راز یہی ہے، کہ انہوں نے تحمل روایت کی شرطیں سخت کر دی تھیں، حدیث یقینی سے نقل نفسی اگر معارض ہوتا تھا تو اس حدیث کو ضعیف ٹھہرا کر رد کر دیا کرتے تھے، انہیں پابندیوں اور قیود سے ان کی روایات کم ہو گئیں، یہ نہیں کہ نعوذ باللہ آپ نے قصداً یا عمداً حدیث کی روایت سے اعراض کیا۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۲۸)

قبول حدیث کا معیار

علم حدیث میں امام اعظم کا سب سے اہم کارنامہ قبول روایت اور تنقیح حدیث کے وہ معیار و اصول ہیں، جنہیں آپ نے وضع فرمایا، جن سے بعد کے علمائے حدیث نے استفادہ کیا اور وہ علمائے احناف کی کتابوں میں متفرق انداز سے آج بھی موجود ہیں۔

۱- امام اعظم ضبط کتاب کے بجائے ضبط صدر کے قائل تھے اور صرف اسی راوی سے حدیث لیتے تھے، جو اس روایت کا حافظ ہو۔ (مقدمہ ابن صلاح)

۲- صحابہ اور فقہائے تابعین کے علاوہ اور کسی شخص کی روایت بالمعنیٰ کو قبول نہیں کرتے تھے۔ (شرح مسند امام اعظم از ملا علی قاری)

۳- امام اعظم اس بات کو ضروری قرار دیتے تھے، کہ صحابہ کرام سے روایت کرنے والے ایک یا دو شخص نہ ہوں، بلکہ اتقیا کی ایک جماعت نے صحابہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہو۔ (میزان الشریعۃ الکبریٰ)

۴- معمولات زندگی سے متعلق عام احکام میں امام ابوحنیفہ یہ ضروری قرار دیتے تھے، کہ ان احکام کو ایک سے زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہو۔ (الخیرات الحسان)

۵- جو حدیث عقل قطعی کے مخالف ہو (یعنی اس سے اسلام کے کسی مسلم اصول کی مخالفت لازم آتی ہو) وہ امام اعظم کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔ (تاریخ ابن خلدون)

۶- جو حدیث خبر واحد ہو اور وہ قرآن کریم پر زیادتی یا اس کے عموم کو خاص کرتی ہو امام صاحب کے نزدیک وہ بھی مقبول نہیں ہے۔ (الخیرات الحسان)

۷- جو خبر واحد صریح قرآن کے مخالف ہو وہ بھی مقبول نہیں ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح)

۸- جو خبر واحد سنت مشہورہ کے خلاف ہو وہ بھی مقبول نہیں ہے۔ (احکام القرآن)

۹- اگر راوی کا اپنا عمل اس کی روایت کے خلاف ہو، تو وہ روایت مقبول نہیں ہوگی کیوں کہ یہ مخالفت یا تو راوی میں طعن کا موجب ہوگی یا نسخ کے سبب سے ہوگی۔ (نبراس)

۱۰- جب ایک مسئلہ میں مبیح اور محرم دو روایتیں ہوں تو امام اعظم محرم کے مقابل میں مبیح کو قبول نہیں کرتے۔
(عمدۃ القاری)

۱۱- ایک ہی واقعہ کے بارے میں اگر ایک راوی کسی امر زائد کی نفی کرے اور دوسرا اثبات اگر نفی دلیل پر مبنی نہ ہو تو نفی کی روایت قبول نہیں کی جائے گی کیوں کہ نفی کرنے والا واقعہ کو اصل حال پر محمول کر کے اپنے قیاس سے نفی کر رہا ہے اور اثبات کرنے والا اپنے مشاہدہ سے امر زائد کی خبر دے رہا ہے۔ (حسامی)

۱۲-اگر ایک حدیث میں کوئی حکم عام ہو اور دوسری حدیث میں چند خاص چیزوں پر اس کے برخلاف حکم ہو تو امام اعظم حکم عام کے مقابلہ میں خاص کو قبول نہیں کرتے۔ (عمدۃ القاری)

۱۳-حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح قول یا فعل کے خلاف اگر کسی ایک صحابی کا قول وفعل ہو تو وہ مقبول نہیں ہے صحابی کے خلاف کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ اسے یہ حدیث نہیں پہنچی۔ (عمدۃ القاری)

۱۴-خبر واحد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول وفعل ثابت ہو اور صحابہ کی ایک جماعت نے اس سے اختلاف کیا ہو تو آثار صحابہ پر عمل کیا جائے گا کیوں کہ اس صورت میں یا تو وہ حدیث صحیح نہیں ہے اور یا وہ منسوخ ہو چکی ورنہ حضور کے صحیح اور صریح فرمان کے ہوتے ہوئے صحابہ کرام کی جماعت اس کی کبھی مخالفت نہ کرتی۔ (الخیرات الحسان)

امام اعظم نے حدیث کی تمام اقسام پر اجتہادی حیثیت سے کام کیا ہے اور صیانت حدیث کے لیے بصیرت افروز راہ نما اصول مرتب فرمائے ہیں اور اس میدان کے شہسواروں کو عقل وآگہی کا نور عطا کیا ہے۔

قلت روایات کے اسباب

قلت روایت کا ایک سبب یہ بھی تھا، کہ امام صاحب کے نزدیک دیگر محدثین کی طرح ذخیرہ احادیث کی کمیت مقصود نہ تھی، بلکہ وہ کیفیت وصحت حدیث کے قائل تھے خاص طور پر ان احادیث کو ہی وہ قابل روایت سمجھتے تھے، جن سے فقہی مسائل کا استخراج واستنباط ہو، جو حدیث کی تشریعی حیثیت کا اقتضا ہے۔

امام صاحب کی قلت روایت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے، کہ وہ صرف ایک محدث ہی نہ تھے، بلکہ متکلم، مجتہد، فقیہ اور داعی بھی تھے، خصوصیت کے ساتھ انہوں نے حالات وزمانہ کے اہم تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قانون اسلامی کی تدوین کا جو مہتم بالشان کارنامہ انجام دیا، وہ یک سوئی اور انہماک کا طالب تھا اور اتنا وقیع اہم کام تھا، جس نے دوسرے امور کو پس انداز کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

فہم حدیث

حضرت امام صاحب حدیث کے ظاہری الفاظ، حفظ و یادداشت اور ان کی روایت پر زور نہیں دیتے تھے، بلکہ وہ احادیث کے مفاہیم ومراد کی گہرائی معلوم کرنے اور ان سے مسائل فقہیہ کی تخریج واستنباط پر زور دیتے۔ جہاں تک کثیر الروایہ محدثین کی عقل وفہم کی رسائی نہ ہوتی۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> مارایت احدا اعلم بتفسیر الحدیث ومواضع النکت التی فیه من الفقه من ابی حنیفة وقال ایضا ماخالفته فی شئ قط فتدبرته الا رایت مذهبه الذی ذهب الیه انجی فی الاخرة وکنت ربما ملت الی الحدیث فکان هو ابصر بالحدیث الصحیح منی وقال کان اذا

صمم على قول درت على مشائخ الكوفة هل اجذ فى تقوية قوله حديثا اواثرا فربما وجدت الحديثين والثلاثة فاتيته بها فمنها مايقول فيه هذا غير صحيح او غير معروف فاقول له وماعلمك بذالك مع انه يوافق قولك فيقول انا عالم بعلم اهل الكوفة ۔

(الخیرات الحسان ص۶۱)

میرے نزدیک حدیث کی تفسیر اور حدیث میں فقہی نکتوں کے مقامات کا جاننے والا امام ابوحنیفہ سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے انہیں سے منقول ہے کہ میں نے جن جن مسئلوں میں امام صاحب سے اختلاف کیا ان سب میں امام صاحب کی رائے کو آخرت میں زیادہ نجات دینے والا پایا اور بسا اوقات میں حدیث کی طرف نگاہ کرتا تو آپ کو اپنے سے زیادہ واقف کار صحیح حدیث کے بارے میں پاتا۔ جب امام صاحب کسی قول پر مصمم رائے فرما لیتے میں مشائخ کوفہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اس رائے کی تقویت میں کوئی حدیث تلاش کرتا، تو کبھی دو بلکہ تین حدیثیں پاتا اور ان کو آپ کے پاس لاتا، تو بعض حدیثوں کے بارے میں فرماتے کہ یہ حدیث صحیح نہیں یا یہ حدیث غیر معروف ہے میں عرض کرتا، اس کا حضور کو کیوں کر علم ہوا حالاں کہ یہ تو آپ کے قول کے مطابق ہے آپ فرماتے میں کوفہ والوں کے علم سے واقف ہوں۔

نیز فرماتے ہیں:

الثورى اكثر متابعة لابى حنيفة منى ووصفه يوما لابن المبارك فقال انه ليركب من العلم احد من سنان الرمح كان والله شديد الاخذ للعلم ذابا عن المحارم متبعا لاهل بلده لايستحل ان ياخذ الا ماصح عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ومادرك عليه علماء اهل الكوفة فى اتباع الحق اخذ به وجعله دينه ۔ (الخیرات الحسان ص۳۰)

مجھ سے زیادہ امام صاحب کے متبع سفیان ثوری ہیں، سفیان ثوری نے ایک دن ابن مبارک سے امام اعظم کی تعریف بیان کی، فرمایا، کہ وہ ایسے علم پر سوار ہوتے ہیں، جو برچھی کی انی سے زیادہ تیز ہے۔ خدا کی قسم وہ غایت درجہ علم کو لینے والے، محارم سے بہت رکنے والے، اپنے شہر والوں کی بہت اتباع کرنے والے ہیں، صحیح حدیث کے سوا دوسری قسم کی حدیث لینا حلال نہیں جانتے۔ اتباع حق میں جس امر پر علمائے کوفہ کو متفق پاتے اس کو قبول فرماتے اور اسے اپنا دین بناتے تھے۔

ابوغسان کہتے ہیں، کہ میں نے اسرائیل سے کہتے ہوئے سنا:

كان نعم الرجل النعمان ماكان احفظه لكل حديث فيه فقه واشد فحصه عنه فاكرمه الخلفاء والامراء والوزراء ۔ (تبییض الصحیفہ ص۲۷)

نعمان بن ثابت اچھے آدمی ہیں، احادیث فقہیہ کے کیسے زبردست حافظ ہیں اور ان احادیث کی بہترین جانچ اور چھان بین کرنے والا آپ سے زیادہ کوئی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے خلفا امیروں اور وزیروں نے ان کی تعظیم کی۔

کسی نے یحییٰ بن معین سے امام صاحب کے متعلق دریافت کیا، تو فرمایا:

ثقة ماسمعت احداً ضعفه هذا شعبة يكتب له ان يحدث ويامره ۔(الخیرات الحسان ص ۳۲)

وہ ثقہ ہیں کسی نے ان کو ضعیف نہ کہا، یہ امام شعبہ ہیں جو ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حدیث بیان کریں اور حکم کریں۔

حسن بن صالح فرماتے ہیں:

ان ابا حنيفة كان شديد الفحص عن الناسخ والمنسوخ عارفا بحديث اهل الكوفة شديد الاتباع لما كان الناس عليه حافظا لما وصل الى اهل بلده ۔(ایضا)

امام ابوحنیفہ ناسخ ومنسوخ کا خوب تفحص فرماتے، احادیث اہل کوفہ کے عارف تھے، لوگوں کے تعامل کا بہت ہی اتباع کرتے، جو کچھ ان شہر والوں کو پہنچتا ان سب کے حافظ تھے۔

معمر کہتے ہیں:

مارايت رجلا يحسن ان يتكلم فى الفقه ويسعه ان يقيس ويشرح الحديث احسن معرفة من ابى حنيفة ۔(ایضاص ۳۱)

میں نے کسی شخص کو ایسا نہ پایا، جو امام ابوحنیفہ سے بہتر فقہ میں کلام کرے اور ایک مسئلہ کو دوسرے پر قیاس کر سکے اور آپ سے عمدہ حدیث کی شرح کرے۔

ایک دن مشہور محدث اعمش نے قاضی ابو یوسف سے دریافت کیا کہ آپ کے استاذ نے عبداللہ بن مسعود کا یہ مسئلہ کیوں ترک کردیا کہ باندی کے آزاد ہونے سے اس پر طلاق ہو جاتی ہے، انہوں نے فرمایا، کہ حضرت عائشہ کی اسی حدیث کی بنا پر جو آپ نے ان سے بواسطہ ابراہیم واسود کے نقل فرمائی تھی، کہ بریرہ جب آزاد ہوئیں، تو ان کی آزادی طلاق نہیں سمجھی گئی، بلکہ ان کو یہ اختیار دیا گیا، کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے پہلے نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں، اس پر اعمش نے کہا بلاشبہ ابوحنیفہ نہایت سمجھدار شخص ہیں۔ (خطیب ج ۱۳ ص ۳۴۱)

یہ واقعہ جہاں حضرت امام کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے وہیں عمل بالحدیث اور اعتصام بالسنہ کی روشن دلیل بھی ہے۔ یہی وجہ تھی، کہ امام اعظم کی فقہ پر وقت کے جلیل القدر محدثین فتوے دیا کرتے تھے۔

حافظ ابن عبدالبر، یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں، وکیع امام صاحب کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے اور آپ کی

روایت کردہ تمام حدیثیں یاد کیا کرتے تھے اور انہوں نے آپ سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹)

تلامذۂ حدیث

امام اعظم علم حدیث میں جس عظیم مہارت کے حامل اور جلیل القدر مرتبہ پر فائز تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا، کہ تشنگان علم حدیث کا انبوہ کثیر آپ کے حلقہ درس میں سماع حدیث کے لیے حاضر ہوتا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے ذکر کیا ہے، کہ امام اعظم سے حدیث کا سماع کرنے والے مشہور حضرات میں حماد بن نعمان، ابراہیم بن طہمان، حمزہ بن حبیب، زفر بن ہذیل، قاضی ابویوسف، عیسیٰ بن یونس، وکیع، یزید بن زریع، اسد بن عمرو، خارجہ بن مصعب، محمد بن بشیر، عبدالرزاق، محمد بن حسن شیبانی، مصعب بن مقدام، ابوعبدالرحمٰن مقری، ابونعیم، ابوعاصم اور دیگر یگانہ روزگار افراد شامل تھے۔

حافظ ابن عبدالبر امام وکیع کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

وکان یحفظ حدیثه کله وکان قد سمع من ابی حنیفة حدیثا کثیرا ۔

وکیع بن جراح کو امام اعظم کی سب حدیثیں یاد تھیں اور انہوں نے امام اعظم سے احادیث کا بہت زیادہ سماع کیا تھا۔

امام مکی بن ابراہیم، امام اعظم ابوحنیفہ کے شاگرد اور امام بخاری کے استاذ تھے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں بائیس ثلاثیات میں سے گیارہ ثلاثیات صرف امام مکی بن ابراہیم کی سند سے روایت کی ہیں، امام صدر الائمہ موفق بن احمد بن مکی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

ولزم اباحنیفة رحمه الله وسمع منه الحدیث ۔ (مناقب موفق ج ۱ ص ۲۰۳)

انہوں نے اپنے اوپر سماع حدیث کے لیے ابوحنیفہ کے درس کو لازم کر لیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا، کہ امام بخاری کو اپنی صحیح میں عالی سند کے ساتھ ثلاثیات درج کرنے کا جو شرف حاصل ہوا ہے، وہ در اصل امام اعظم کے تلامذہ کا صدقہ ہے اور یہ صرف ایک مکی بن ابراہیم کی بات نہیں ہے۔ امام بخاری کی اسانید میں اکثر شیوخ حنفی ہیں، ان حوالوں سے یہ امر آفتاب سے زیادہ روشن ہو گیا، کہ امام اعظم علم حدیث میں مرجع خلائق تھے، ائمہ فن نے آپ سے حدیث کا سماع کیا اور جن شیوخ کے وجود سے صحاح ستہ کی عمارت قائم ہے، ان میں اکثر حضرات آپ کے علم حدیث میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد ہیں۔

امام ابوحنیفہ نے کوفہ جیسے عظیم شہر میں جو فقہ وحدیث کا بڑا مرکز تھا، پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ ابن سعد کے بقول کوفہ صحابہ کی ایک بڑی جماعت کا مسکن تھا، جن میں تین سو اصحاب الشجرہ میں سے اور ستر صحابہ بدری تھے قتادہ سے منقول ہے کہ صحابہ میں سے ایک ہزار پچاس اشخاص کوفہ میں آ کر فروکش ہوئے تھے۔ (کتاب الکنیٰ والاسماء ج ۱ ص ۱۷۴)

بعض اہل علم نے کوفہ میں حدیث کی کثرت پر بڑی شہادتیں جمع کی ہیں۔

امام صاحب نے جن شیوخ واساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا ان کا حدیث میں مقام بہت بلند تھا، جیسے امام شعبی اور حماد بن سلیمان (مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ میں ان کی مرویات موجود ہیں) ان کے علاوہ جن جلیل القدر تابعین سے آپ نے علمی استفادہ کیا ان میں ابراہیم نخعی، قاسم بن محمد، قتادہ، نافع، طاؤس، عکرمہ، عطاء بن ابی رباح، عمرو بن دینار، سلیمان اعمش قابل ذکر ہیں۔ (ان کی روایات صحاح ستہ میں موجود ہیں) بعض اہل علم نے آپ کے مشائخ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے، ان میں سے اکثریت محدثین کی ہے۔

امام صاحب کے تلامذہ میں ایک بڑی تعداد محدثین کی ہے، جن میں سے بعض کو امامت کا درجہ حاصل ہے، مثلاً عبداللہ بن مبارک، جرح وتعدیل کے امام یحیٰی بن سعید قطان اور یحیٰی بن معین، مسعر بن کدام وکیع بن الجراح، یزید بن ہارون، مکی بن ابراہیم، یحیٰی بن زکریا، ابوعاصم نبیل، قاسم بن معن، علی بن مسہر، عباد بن العوام، صلت بن الحجاج، وغیرہ (ان کی مرویات صحاح ستہ وغیرہ میں موجود ہیں)

بعض محققین نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ تقریباً تمام اصحاب کتب حدیث امام صاحب کے بالواسطہ شاگرد ہیں۔ بڑے بڑے علمائے حدیث نے علم حدیث میں آپ کے بلند مقام کا اعتراف کیا ہے۔

شعبہ انہیں حسن الفہم جید الحفظ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ (الخیرات الحسان ص ۳۴)

ذہبی نے امام صاحب کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور الامام الاعظم، فقیہ العراق کے لقب سے یاد کیا ہے۔
(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۶)

اور حافظ محدثین کی اصطلاح میں وہ ہوتا ہے، جسے کم از کم ایک لاکھ حدیثیں یاد ہوں۔

امام زفر سے منقول ہے کہ بڑے بڑے محدثین مثلاً زکریا بن ابی زائدہ، عبدالملک بن ابی سلیمان، لیث بن ابی سلیم، مطرف بن طریف، حصین بن عبدالرحمٰن وغیرہ امام ابوحنیفہ سے علمی مسائل دریافت کرتے اور جس حدیث کے متعلق ان کو اشتباہ ہوتا، اس کے متعلق سوال بھی کرتے تھے۔

يختلفون الى ابى حنيفة ويسالونه عما ينوبهم من المسائل وما يشتبه عليهم من الحديث ۔(موفق ج ۲ ص ۱۴۹)

طحاوی، ذہبی، سیوطی، ابن حجر مکی اور ملا علی قاری جیسے جلیل القدر محدثین نے امام صاحب کے مناقب پر کتابیں تصنیف کی ہیں اور حدیث میں ان کے مقام بلند کا اعتراف کیا ہے۔

امام صاحب کی خدمات حدیث میں سے ایک اہم خدمت ان کی احادیث پر مشتمل کتاب الآثار ہے، سیوطی کے نزدیک یہ فقہی ابواب پر حدیث کی سب سے پہلی مرتب کتاب ہے اور امام مالک نے موطا کی ترتیب میں اسی کی پیروی کی ہے۔
(تبییض الصحیفہ ص ۱۹۲)

یہ کتاب آپ کے شاگردوں ابو یوسف، محمد، زفر اور حسن بن زیاد سے مروی ہے، اس کے علاوہ بڑے بڑے محدثین نے امام صاحب کی مرویات جمع کر کے مسند ابی حنیفہ کے نام سے انہیں مرتب کیا۔ ان کی تعداد اکیس کے قریب ہے، ان میں ابو نعیم اصفہانی، ابن عساکر، ابن مندہ اور حافظ ابن عدی جیسے محدثین شامل ہیں، محدث خوارزمی نے جامع المسانید للامام الاعظم کے نام سے پندرہ مسانید کو جمع کر دیا ہے۔

امام صاحب مجتہد مطلق تھے اور اجتہاد علم حدیث میں مکمل بصیرت اور مہارت کے بغیر ممکن نہیں جیسا کہ حافظ یوسف صالحی لکھتے ہیں:

ولولا كثرة اعتنائه بالحديث ما تهيا له استباط مسائل الفقه ۔(عقود الجمان ص ۳۱۹)

اگر وہ حدیث کا بکثرت اہتمام نہ کرتے تو فقہ کے مسائل میں استنباط کا ملکہ انہیں کیسے حاصل ہو سکتا تھا۔

امام اعظم اور عمل بالحدیث

معاندین امام اعظم ابوحنیفہ پر طعن کرتے ہیں، کہ حدیث کے ہوتے ہوئے قیاس ورائے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن معاندین کا یہ ادعاے محض ہے۔ احناف عمل بالحدیث میں اس درجہ آگے ہیں، کہ کوئی طبقہ ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ امیرالمومنین فی الحدیث امام بخاری کے استاذ الاساتذہ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں، کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا:

واذا جاء الحديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فعلى الراس والعين واذا جاء عن الصحابة اخترنا ولم نخرج عن اقوالهم واذاجاء عن التابعين زاحمناهم ۔

(الخیرات الحسان ص ۲۷، تبییض الصحیفہ ۲۷)

جب رسول اللہ کی حدیث ملے، تو سر آنکھوں پر ہے اور جب صحابہ کے اقوال ملیں تو ان کو اختیار کرتے ہیں اور ان سے تجاوز نہیں کرتے البتہ تابعین کی بات آتی ہے تو ہم ان سے مزاحمت کرتے ہیں۔

ابو حمزہ سکری فرماتے ہیں، کہ میں نے امام اعظم ابوحنیفہ کو فرماتے سنا:

اذاجاء الحديث عن النبي صلى الله عليه وسلم لم نحل عنه الى غيره واخذنابه واذاجاء عن الصحابة تخيرنا واذاجاء عن التابعين زاحمناهم ۔(تبييض الصحيفه ص ۲۶)

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کسی مسئلہ میں مل جاتی ہے، تو اسی کو دلیل بناتا ہوں اور کسی طرف نہیں جاتا اور جب صحابہ کرام کے اقوال ملتے ہیں، تو ان سے ہم انتخاب کر لیتے ہیں اور جب تابعین کے اقوال ملتے ہیں، تو ان کی طرح ہم بھی اجتہاد کرتے ہیں۔

سفیان فرماتے ہیں:

سمعت اباحنيفة يقول اخذ بكتاب الله فما لم اجد فيه اخذ بسنة رسول الله صلى الله عليه

وسلم فما لم اجد فی کتاب اللہ ولا فی سنۃ رسول اللہ اخذت بقول اصحابہ اخذ بقول من شئت منھم وادع من شئت منھم وما اخرج من قولھم الی قول غیرھم فاما اذا انتھی الامر وجاء الی ابراھیم والشعبی وابن سیرین والحسن وعطاء وسعید بن المسیب وعدد رجالا فقوم اجتھدوا فاجتھد کما اجتھدوا ۔(تبییض الصحیفہ ۲۳)

میں نے امام ابوحنیفہ سے یہ فرماتے سنا کہ میں قرآن پاک سے حکم کرتا ہوں تو جو اس میں نہیں پاتا ہوں اس کا حکم رسول اللہ کی حدیث سے لیتا ہوں اور جو قرآن اور حدیث میں نہیں پاتا اس میں صحابہ کرام کے اقوال سے حکم کرتا ہوں اور جس صحابی کے قول سے چاہتا ہوں سند پکڑتا ہوں اور جس کا قول چاہتا ہوں نہیں لیتا ہوں اور صحابہ کرام کے قول سے باہر نہیں جاتا، لیکن جب حکم ابراہیم اور شعبی اور ابن سیرین اور حسن اور عطا اور سعید بن مسیب وغیرہم تک پہنچتا ہے تو ان لوگوں نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں جیسے انہوں نے اجتہاد کیا۔

حدیث پر قیاس کو مقدم کرنے کا الزام

یہ اعتراض کہ آپ حدیث پر قیاس کو مقدم کرتے تھے بالکل غلط ہے جیسا کہ حضرت علامہ عبدالوہاب شعرانی نے فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

فی بیان ضعف قول من الی نسب الامام ابی حنیفۃ الی انہ یقدم القیاس علی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلم ان ھذاالکلام صدر من متعصب علی الامام متھور فی دینہ غیر متورع فی مقالہ غافلا عن قولہ تعالیٰ ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا وعن قولہ تعالیٰ مایلفظ من قول الالدیہ رقیب عتید وعن قولہ صلی اللہ علیہ وسلم لمعاذ وھل یکب الناس فی النار وعلی وجوھھم الا حصائد السنتھم

(میزان الشریعۃ الکبریٰ ص ۷۱)

یہ کلام جس کی نسبت حضرت امام ابوحنیفہ کی طرف کی گئی ہے کہ وہ قیاس کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مقدم کرتے ہیں، اس شخص سے صادر ہوا ہے، جو کہ امام صاحب سے تعصب رکھتا ہے اور ان کے دین سے غافل ہے اور ان کی بات میں غیر متورع ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول **ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا** یعنی بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے اور اس قول پر کہ کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک **ھل یکب الناس فی النار وعلی وجوھھم الاحصائد السنتھم** سے غافل ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

وقد روی الامام ابوجعفر الشبزماری نسبتہ الی قریۃ من قری بلخ سندہ المتصل الی

الامام ابی حنیفة رضی اللہ عنه انه کان یقول یکذب واللہ وافتری علینا من یقول عنا اننا نقدم القیاس علی النص وھل یحتاج بعد النص الی قیاس ۔

تحقیق روایت کی ہے امام ابوجعفر شیرامازی (یہ نسبت ہے بلخ کے ایک گاؤں شیراماز کی طرف) نے متصل سند کے ساتھ امام ابوحنیفہ سے وہ فرماتے تھے، کہ جس نے یہ کہا ہے، کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم رکھتے ہیں اس شخص نے ہم پر جھوٹ اور افترا باندھا ہے حالاں کہ نص کے بعد قیاس کی حاجت نہیں رہتی۔

علامہ ذہبی باب **ومن قوله الرای** کے تحت فرماتے ہیں:

نعیم بن حماد سمعت ابا لمعه وھو نوح الجامع قال سمعت اباحنیفة یقول ماجاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فعلی الراس والعین وماجاء عن الصحابة اخترنا وکان من غیر ذلك فھم رجال ونحن رجال (مناقب امام ابی حنیفة للذھبی ص ۲۰)

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمایا، کہ جو کچھ حکم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آئے وہ ہمارے سر آنکھوں پر اور صحابہ کا حکم ہو تو اسے ہم اختیار اور قبول کرتے ہیں اور جو دوسروں سے (یعنی تابعین سے آئے) تو وہ بھی مرد ہیں اور ہم بھی مرد ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

واتباع امام ابی حنیفۃ باحادیث واقوال صحابہ است دیگرے را نیست امام حافظ ابومحمد بن حزم گفتہ کہ اصحاب ابوحنیفہ ہمہ متفق اند کہ حدیث ہر چند اسناد او ضعیف بود مقدم نزداو، اولی تر از قیاس واجتہاد است و وی رضی اللہ عنہ تا بحد ضرورت نرسد عمل بقیاس نکند وعمل بحدیث باقسامہ از دست ندہد۔ (مقدمہ شرح سفر السعادۃ ص ۲۴)

حضرت امام ابوحنیفہ کو جس قدر تابعداری اور پیروی احادیث اور اقوال صحابہ کی تھی کسی دوسرے کو نہ تھی اور ابن حزم نے کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے سب اصحاب اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث اگرچہ ضعیف ہو قیاس اور اجتہاد پر مقدم ہے اور امام صاحب کا یہ دستور تھا کہ حتی الامکان حدیث کو ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے اور سخت ضرورت کے وقت جب کوئی حدیث کسی قسم کی نہ ملتی تو ناچار قیاس پر عمل کرتے تھے۔

نیز فرماتے ہیں:

ونقل است کہ امام ابوحنیفہ فرمودہ کہ عجب از مردم کہ مرا میگویند وی فتویٰ برائے خود میدہد حال آنکہ من ہرگز فتویٰ ندہم مگر ماثور و مرویست۔ (مقدمہ شرح سفر السعادۃ ص ۲۴)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا، کہ مجھ کو ان لوگوں پر بڑا تعجب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ میں اپنی رائے سے فتویٰ دیتا ہوں حالاں کہ میں بجز اس بات کے جو ماثور و مروی ہے ہرگز فتویٰ نہیں دیتا۔

ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا، کہ یہ کہنا کہ آپ قیاس کو احادیث پر ترجیح دیتے تھے آپ پر صریح بہتان ہے۔

فقہ واجتہاد

فقہ کے لغوی معنیٰ ''الشق و الفتح ''یعنی پھاڑنا اور کھولنا ہے۔

امام اعظم سے فقہ کی تعریف ان الفاظ میں منقول ہے:

الفقه معرفة النفس مالها وماعليها ۔(تنقیح الاصول ص ۱۶)

فقہ نفس کو نفع پہنچانے والی اور نقصان پہنچانے والی چیزوں کی پہچان کا نام ہے۔

یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں حق و باطل، حلال وحرام اور مفید ومضر کے درمیان فرقِ وامتیاز کرنے کی صلاحیت کا نام فقاہت ہے۔

ابتدا میں علم فقہ کا اطلاق اصولِ وفروع سارے علوم پر ہوتا تھا، لیکن جب علوم وفنون کو الگ الگ خانوں میں بانٹا گیا، تو علم شریعت کو فقہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ چنانچہ متاخرین نے علم فقہ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

العلم بالاحكام الشرعيةالعملية من ادلتها التفصيلية ۔(ایضا)

فقہ شریعت کے عملی احکام کا علم ہے جو تفصیلی دلائل سے ماخوذ ہوں۔

فخر الاسلام بزدوی فقہ کے اجزاے ثلاثہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هو الفقه وهو ثلثة اقسام علم المشروع بنفسه القسم الثانى اتقان المعرفة به وهو معرفة النصوص بمعانيها وضبط الاصول بفروعها والقسم الثالث هو العمل به حتى لا يصير نفس العلم مقصودا فاذا تمت هذه الاوجه كان فقيها .

(الاصول للبزدوی برحاشیہ کشف الاسرار ج ۱ ص ۱۲)

علم فروع فقہ سے عبارت ہے، فقہ کے تین اجزا ہیں ایک نفس احکام کا علم دوسرا اس علم کی پختگی یعنی نصوص کے معانی وعلل کی معرفت اور اصول کا فروع پر انطباق اور تیسرا اجزا احکام پر عمل کرنا تا کہ علم بذات خود مقصود نہ بن جائے جب یہ تینوں اجزا مکمل ہو جائیں تو انسان فقیہ بن جاتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کو قدرت نے فقہی بصیرت اور مجتہدانہ صلاحیت سے مالا مال فرمایا تھا، ان کے اندر اصول دین کے

ادراک اور قرآن وسنت کے نصوص کی گہرائیوں تک رسائی کا ملکہ اور اصول کی روشنی میں فروعی مسائل کے استنباط واستخراج کی پوری قوت موجود تھی، ذہن وفراست عقل وشعور میں وہ ممتاز تھے۔ حافظ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں:

كان من اذكياء بنى آدم .

آپ بنی آدم کے ذکی ترین لوگوں میں تھے۔

محمد بن شجاع بیان کرتے ہیں:

لووزن عقل ابى حنيفة بعقل نصف الناس لرجح بهم . (تاریخ ذھبی ج۲، ص۳۱۲)

اگر ابوحنیفہ کی عقل آدھی دنیا کے لوگوں کی عقل سے وزن کی جائے تو آپ کی عقل کا پلہ بھاری رہے گا۔

امام مالک فرماتے ہیں:

لو كلمك فى هذه السارية ان يجعلها ذهبا لقام بحجته . (تاریخ بغداد ج۱۳ ص۳۳۸)

اگر امام ابوحنیفہ تم سے یہ کہیں کہ یہ ستون سونے کا ہے تو وہ اس پر حجت قائم کردیں گے۔

مبدأ فیاض نے ذکاوت وذہانت، طباعی، زود فہمی، معاملات کی تہہ تک رسائی، حاضر جوابی کی بھرپور قوت آپ کو عطا فرمائی تھی۔ علم کے حفظ وضبط اور فہم وادراک کے لیے جن عقلی وشعوری صلاحیتوں کی ضرورت تھی وہ امام صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھیں، اس لیے جب وہ علم فقہ کی تدریس کے لیے آمادہ ہوئے تو انہوں نے کوفہ کے سب سے بڑے مدرسہ فقہ یعنی حماد بن ابی سلیمان کی درسگاہ واقع جامع کوفہ میں شرکت کی۔ یہ فقہ کی وہ درسگاہ ہے، جس کی بنیاد کوفہ کی تاسیس کے وقت معلم امت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عہد فاروقی میں رکھی تھی اور ان کے بعد ان کے شاگرد علقمہ پھر ان کے شاگرد ابراہیم نخعی اور ان کے بعد حماد بن ابی سلیمان مسند تدریس پر فائز ہوئے۔ امام اعظم اپنی جس فقہی استعداد کے ساتھ حماد کے حلقہ درس میں شامل ہوئے بہت جلد وہ تلامذہ حماد میں سب سے ممتاز ہوگئے۔ اس طرح وہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی فقہ کے وارث وامین بن گئے چنانچہ فقہا نے لکھا ہے:

الفقه زرعه عبدالله بن مسعود رضى الله عنه وسقاه علقمة وحصده ابراهيم النخعى وداسه حماد وطعنه ابوحنيفة وعجنه ابويوسف وخبزه محمد وسائر الناس ياكلون .

(درمختار ج۱ص۴)

فقہ کا کھیت عبداللہ بن مسعود نے بویا، حضرت علقمہ نے اسے سینچا، ابراہیم نخعی نے اس کو کاٹا، حماد نے اس کو گاہا، امام ابوحنیفہ نے اس کو پیسا، امام ابویوسف نے اس گوندھا، امام محمد نے روٹی پکائی، باقی سب اسے کھا رہے ہیں یعنی عبداللہ بن مسعود نے اجتہاد واستنباط احکام کے طریقے کو فروغ بخشا اور حضرت علقمہ نے اس کی تائید وترویج کی، ابراہیم نخعی نے اس کے فوائد متفرقہ جمع کیے اور علم فقہ کی تدریجی ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ سراج

الائمہ امام اعظم ابوحنیفہ نے کمال تک پہنچا کر باقاعدہ اس کی تدوین کی۔ ابواب میں مرتب کیا اور دیگر ائمہ نے اپنی اپنی کتابوں میں آپ کی پیروی کی۔ امام محمد نے آپ کی اتباع کی، اجتہادات ورسائل کو جمع کر کے فروع کی تنقیح کی اور آپ کے مرجوعات کو بیان کیا اور فقہ کو اصول وفروع اور جزئیات کے ساتھ مدون کیا اس طرح عظیم مصنفات فقہ امت محمدیہ کے حوالہ کیں، جن سے عالم اسلام مستفید ہو رہا ہے۔

امام صاحب کی فقہی بصیرت، زود فہمی اور دقیقہ رسی کا اندازہ ذیل کے چند واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

☆ ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک مسئلہ پیش کیا گیا، کہ ایک شخص کی بیوی سیڑھی پر کھڑی ہے، اس کے شوہر نے جھگڑے کے دوران اس سے کہا، اگر تو اوپر چڑھی، تو تجھے طلاق ہے اور اگر نیچے اتری تو طلاق تو آپ فرمایئے کہ اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟ آپ نے فرمایا، اس عورت سمیت سیڑھی اٹھالی جائے اور زمین پر رکھ دی جائے، اب عورت جہاں چاہے چلے پھرے، طلاق واقع نہ ہوگی۔ (الخیرات الحسان ص ۱۰۴)

☆ ایک شخص کو اپنی بیوی کی طلاق میں شک واقع ہوا، اس نے قاضی شریک سے مسئلہ دریافت کیا، آپ نے فرمایا، اسے طلاق دے کر رجوع کر لو، پھر اس نے سفیان ثوری سے یہی مسئلہ پوچھا، انہوں نے جواب دیا، کہ کہہ دو اگر میں نے تمہیں طلاق دی ہے، تو رجوع کیا، پھر امام زفر سے یہی مسئلہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا، جب تک تمہیں طلاق کا یقین نہ ہو جائے وہ تمہاری بیوی ہے۔

پھر یہ تینوں جوابات امام صاحب کی بارگاہ میں پیش کیے گئے، آپ نے فرمایا، ثوری نے ورع اور تقویٰ کی بات کہی ہے اور زفر نے ٹھیک فقہ کی بات کہی ہے اور رہے شریک تو ان کی مثال ایسے شخص کی ہے، جس سے کوئی پوچھے مجھے پتہ نہیں کہ میرے کپڑے پر نجاست ہے یا نہیں تو وہ کہہ دیں گے کہ کپڑے پر نجاست ہے آپ دھو لیں۔ (الخیرات الحسان ص ۱۰۲)

☆ وکیع کا بیان ہے، کہ ہم ابوحنیفہ کے پاس تھے، کہ ایک عورت آئی اور اس نے کہا، میرے بھائی کی وفات ہوئی ہے، اس نے چھ سو دینار چھوڑے اور مجھ کو وراثت میں ایک دینار ملے، ابوحنیفہ نے کہا، میراث کی تقسیم کس نے کی ہے؟ عورت نے کہا داؤد طائی نے کی ہے، آپ نے فرمایا، انہوں نے ٹھیک کیا، کیا تمہارے بھائی کی دو لڑکیاں ہیں، عورت نے کہا، ہاں! آپ نے پوچھا اور ماں زندہ ہے؟ عورت نے کہا، ہاں! پوچھا بیوی زندہ ہے، اس نے کہا، ہاں! آپ نے پوچھا اور ایک بہن اور بارہ بھائی بھی چھوڑے ہیں، عورت نے کہاں ہاں! آپ نے فرمایا، لڑکیوں کا دو تہائی حصہ ہے یعنی چار سو دینار اور چھٹا حصہ ماں کا ہے یعنی ایک سو دینار اور آٹھواں حصہ بیوی کا ہے یعنی پچھتر دینار باقی رہے پچیس دینار اس میں بارہ بھائیوں کے چوبیس دینار اور تمہارا ایک دینار۔ (سوانح بے بہا ص ۱۲۹-۱۳۰)

☆ امام اعمش اور ان کی بیوی میں ایک شب تلخ کلامی ہوئی، بیوی نے امام اعمش سے بولنا بند کر دیا، امام اعمش نے بہت تدبیریں کیں، مگر بیوی راضی نہ ہوئی، آخر غصہ میں آ کر امام اعمش نے قسم کھائی، کہ اگر آج کی رات تو مجھ سے نہ بولی تو تجھ

پر طلاق بائن۔ بیوی جو امام اعمش سے ہمیشہ طلاق کی متمنی رہا کرتی تھی، اس تعلیق سے اس کی امید بر آئی، ادھر امام اعمش اپنی بات پر نادم ہوئے، کہ گھریلو کاروبار اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش کیسے ہوگی۔ اسی الجھن میں متعدد لوگوں کے پاس گئے، لیکن مسئلہ کا حل نہ ہو سکا۔ بالآخر امام ابو حنیفہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کیا۔ امام ابو حنیفہ نے تسلی دی اور فرمایا، کہ فکر کی بات نہیں مطمئن رہیے آج کی صبح کی اذان آپ کے محلے میں صبح صادق سے پہلے پڑھوا دوں گا۔ چنانچہ امام صاحب مسجد کے موذن سے ملے اور انہیں صبح صادق سے پہلے اذان کہنے پر رضامند کر لیا، ابھی صبح صادق طلوع نہیں ہوئی تھی، کہ موذن نے اذان دے دی۔ ادھر امام اعمش کی بیوی ساز و سامان سمیٹ کر صبح صادق کا انتظار کر رہی تھی، اذان سنتے ہی جوش مسرت میں بول اٹھی خدا کا شکر ہے، کہ آج بوڑھے بد اخلاق سے میرا دامن چھوٹا۔ امام اعمش نے کہا خدا کا شکر ہے کہ موذن نے امام ابو حنیفہ کی مہربانی سے صبح صادق سے قبل اذان دے کر آپ کے ٹوٹنے والے رشتے کو میرے ساتھ جوڑ دیا۔

(موفق ج۱ ص۱۳۳)

☆ کوفہ میں ایک امیر شخص نے اپنی دو بیٹیوں کا نکاح دو سگے بھائیوں کے ساتھ کیا۔ رات کو غلطی سے دلہنیں بدل گئیں، دونوں نے شب باشی کی، صبح ہوئی، تو حقیقت حال معلوم ہوئی اور ہر ایک کو پریشانی لاحق ہوئی، اس شخص نے ولیمہ میں امام اعظم، سفیان ثوری، مسعر بن کدام و دیگر علماء و فقہا کو مدعو کیا تھا۔ سفیان ثوری نے اس مسئلہ میں کہا، کہ ہر شخص نے جس سے وطی کی ہے، اس کو مہر دے اور اپنی زوجہ واپس لے اور دوسری مرتبہ اسے مہر دے، اس سے نکاح میں کوئی فرق نہیں آیا، امام مسعر بن کدام امام اعظم کی طرف متوجہ ہوئے اور اس مسئلے کا حل پوچھا، آپ نے دونوں بھائیوں کو علاحدہ علاحدہ بلایا، اور ان سے پوچھا، کہ رات جو لڑکی تمہارے ساتھ رہی اگر وہی تمہارے نکاح میں رہے، تو کیا تمہیں پسند ہے، ہر ایک نے کہا ہاں مجھے پسند ہے پھر آپ نے فرمایا تم دونوں اپنی اپنی بیوی کو یعنی جس سے تمہارا نکاح ہوا اسے طلاق دے دو اور پھر جس سے وطی کی ہے اس سے نکاح کر لو، سفیان ثوری کا جواب بھی صحیح تھا، مگر امام اعظم کا جواب زیادہ مبنی بر حکمت تھا، جب آپ نے یہ حل پیش فرمایا، تو مسعر بن کدام نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا، لوگو! مجھے اس شخص کی محبت میں ملامت کرتے ہو آج اس نے مجھے اور سفیان ثوری کو بھی مطمئن کر دیا ہے اللہ اسے خوش رکھے۔ (الخیرات الحسان ص ۹۴)

مشکل اور پیچیدہ مسائل میں آپ کا ذہن بڑی تیزی کے ساتھ صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا، کہ دوسرے لوگ حیران رہ جاتے، بلکہ حقیقت یہ ہے، کہ جو مسائل کسی سے حل نہ ہوتے انہیں آپ حل فرما دیتے چنانچہ ایک مرتبہ امام عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ کے پاس امام اعظم تشریف لائے اور اس آیت کے بارے میں سوال کیا:

و آتیناہ اھلہ و مثلھم معھم ۔

عطاء بن ابی رباح نے جواب دیا، اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کے اہل و عیال واپس کر دیے اور ان کے ساتھ ان کی مثل اولاد عنایت فرمائی۔ امام اعظم نے پوچھا، کیا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو ایسی اولاد عطا کرتا ہے، جو اس کی پشت سے نہ

ہو، اس پر انہوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت دے، اس بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، آپ نے فرمایا، میرے نزدیک اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کی بیوی اور اولاد جوان کی صلبی اولاد تھیں واپس کی اور ساتھ ہی ان کی اولاد کو ان جیسا اجر و ثواب عطا فرمایا۔ حضرت عطاء نے کہا، یہ عمدہ تفسیر ہے۔ (ایضا)

امام صاحب کی فقاہت اور ان کی اجتہادی مساعی جلیلہ سے ان کے تلامذہ ہی نے نہیں، بلکہ ان کے معاصرین اور بعد کے لوگوں نے بھی استفادہ کیا اور اکابر ائمہ مجتہدین آپ کی فقہی بصیرت کے مداح اور قائل تھے، چنانچہ امام شافعی کا قول ہے:

الناس عیال علی ابی حنیفة فی الفقه ما رایت احدا افقه من ابی حنیفة من لم ینظر فی کتب ابی حنیفة لم یتبحر فی العلم ولا یتفقه ۔(عقود الجمان ص۱۸۷)

جو آدمی فقہ میں ماہر ہونا چاہے وہ امام ابوحنیفہ کا محتاج ہے، یہ بھی فرمایا، کہ میں ابوحنیفہ سے بڑا فقیہ کسی کو نہیں جانتا، جس نے امام صاحب کی کتابیں نہیں دیکھیں وہ علم میں ماہر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی فقیہ بن سکتا ہے۔

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں:

میری آنکھوں نے ابوحنیفہ جیسا کسی کو نہیں دیکھا، جو علم فقہ سیکھنا پسند کرتا ہو اسے کوفہ جانا چاہیے اور اصحاب ابوحنیفہ کے حلقہ درس مین بیٹھنا چاہیے۔ (ایضا)

عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں:

افقه الناس ابو حنیفة ما رایت فی الفقه مثله ۔(تهذیب التهذیب ج۱۰ص۴۰۱)

ابوحنیفہ سب سے بڑے فقیہ ہیں، میں نے فقہ میں ان کی نظیر نہیں دیکھی۔

علامہ ذہبی رقم طراز ہیں:

تفقه بحماد وغیره فبرع فی الرای فساد اهل زمانه فی الفقه وتفریع المسائل ۔

امام اعظم نے حماد وغیرہ سے علم فقہ حاصل کیا جس کی بنا پر رائے میں مہارت کاملہ ہوگئی اور تفقہ و تفریع مسائل میں اہل زمانہ کے سردار ہوگئے۔ (تاریخ ذہبی ج۲ص۳۰۶)

حفص بن غیاث کہتے ہیں:

کلام ابی حنیفة فی الفقه ادق من الشعر لا یعیبه الا جاهل ۔(ایضا)

ابوحنیفہ کی فقہی گفتگو بال سے زیادہ باریک ہے جس پر جاہل ہی طعن کر سکتا ہے۔

مغیرہ نے جریر سے کہا:

جالس اباحنیفة تفقه فان ابراهیم النخعی لو کان حیا لجالسه ۔(ایضا)

ابوحنیفہ کی صحبت اختیار کرو تم فقیہ ہو جاؤ گے اس لیے کہ ابراہیم نخعی اگر زندہ ہوتے تو ان کی صحبت اختیار کرتے۔

معمر کہتے ہیں:

ماعرف رجلا یحسن یتکلم فی الفقه او یسعه ان یقیس ویشرح لمخلوق النجاۃ احسن معرفة من ابی حنیفة۔ (تاریخ بغداد ج۱۳ ص ۳۳۹)

میں کسی شخص کو نہیں جانتا جو ابوحنیفہ سے زیادہ فقہ میں خوبی کے ساتھ کلام کرتا ہو یا اسے اس بات پر قدرت ہو کہ وہ قیاس کرے اور مخلوق کے لیے نجات کا دروازہ کھولے۔

ابوجعفر رازی کہتے ہیں:

مارایت احدا افقه من ابی حنیفة ومارایت احدا اورع من ابی حنیفة۔

میں نے ابوحنیفہ سے بڑا فقیہ کسی کو نہیں پایا اور نہ ان سے بڑا صاحب ورع کسی کو پایا۔

ابوغسان کا بیان ہے:

سمعت اسرائیل یقول کان نعم الرجل النعمان ماکان احفظه لکل حدیث فیه فقه واللہ فحصه عنه واعلمه بمافیه من الفقه وکان قد ضبط عن حماد فاحسن الضبط عنه فاکرمه الخلفاء والامراء والوزراء وکان اذاناظره رجل فی شیٔ من الفقه همته نفسه ولقد کان مسعر یقول من جعل اباحنیفة بینه وبین اللہ رجوت ان لا یخاف ولایکون فرط فی الاحتیاط لنفسه۔ (تاریخ بغداد ج۱۳ ص ۳۳۹)

میں نے اسرائیل سے سنا وہ کہہ رہے تھے نعمان اچھے شخص ہیں کیا ہی خوب حافظ تھے ہر اس حدیث کے جس میں فقہ ہوتی تھی اور بڑے شد و مد سے ایسی احادیث کی تلاش کرتے تھے اور ان کی فقہ کے بڑے عالم تھے، انہوں نے حماد سے اس کو حاصل کیا اور جب کوئی شخص ابوحنیفہ سے فقہ میں مناظرہ کرتا تھا تو ان کی ہمت بڑھتی تھی، مسعر کہا کرتے تھے، جو شخص ابوحنیفہ کو اپنے اور اللہ کے بیچ میں رکھے مجھے امید ہے کہ اس پر خوف نہیں ہے اور اس نے اپنے نفس کی احتیاط میں کوتاہی نہیں کی ہے۔

صلت بن حریث کا بیان ہے:

سمعت النضر بن شمیل یقول کان الناس نیاما عن الفقه حتی ایقظهم ابو حنیفة بما فتقه وبینه ولخصه۔ (تاریخ بغداد ج۱۳ ص ۳۴۵)

ابن صلت نے کہا میں نے حسین بن حریث سے سنا وہ کہہ رہے تھے فقہ سے لوگ غفلت میں تھے، ابوحنیفہ نے زوایا خفایا سے فقہ کو نکال کر اچھی طرح اس کو بیان کر کے اس کا مغز پیش کر کے لوگوں کو ہوشیار و آگاہ کیا ہے۔

حرب نے کہا:

انبأ عبداللہ بن الاجلح قال کان ابو حنیفة غواصا یغوص فیخرج احسن الدرر والیاقوت ۔

(مناقب موفق ج ا ص ١٢٠)

عبداللہ بن اجلح نے کہا کہ ابوحنیفہ غواص تھے، (بحر علم) میں غوطہ لگا کر عمدہ موتی اور یاقوت نکالتے تھے۔

امام زفر کہتے تھے:

کان ابو حنیفة اذاتکلم خیل الیك ان ملکا یلقنه ۔(ایضا)

ابوحنیفہ جب گفتگو فرماتے تھے ہم یہ سمجھتے تھے کہ فرشتہ ان کو تلقین کر رہا ہے۔

علی بن ہاشم کا قول ہے:

کان ابو حنیفة کنز العلم ما کان یصعب المسائل علی اعلم الناس فهو کان سهلا علی ابی حنیفة (ایضا ص ١٢٢)

ابوحنیفہ علم کا خزانہ تھے، جو مسائل بہت بڑے عالم پر مشکل ہوتے تھے آپ پر آسان ہوتے تھے۔

* * *

قانون اسلامی کی تدوین

حقیقتاً اسلامی فقہ کی تدوین کا عمل عہد رسالت میں شروع ہو چکا تھا، مگر وہ چند ہدایت ناموں اور ضابطوں پر مشتمل تھا، پھر خلفائے راشدین کے دور میں خصوصاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مکاتیب اور تحریری فرامین سے یہ عمل آگے بڑھا۔ اس کے علاوہ حضرت علی کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ حضرت ابن عباس کے پاس پیش کیا گیا، پھر حضرت زید بن علی رضی اللہ عنہ کے نام سے کتاب المجموع منسوب کی گئی۔ حضرات صحابہ وتابعین کی محتاط علمی شخصیتیں پیش آمدہ فقہی استفسارات کے جوابات دیتی تھیں، جو اپنے وسیع اور ہمہ گیر نظام اور جامع فن ہونے کی وجہ سے جزئیات مسائل پر حاوی ہوتے تھے، جنہیں باقاعدہ طور پر ایک دستور اور قانون کے رتبہ تک پہنچانے کے لیے ابھی بہت سے مرحلے باقی تھے۔

اسلامی حکومت کے دائرے میں وسعت پیدا ہوئی اور اس کے حدود سندھ سے اسپین تک پھیل گئے، بیسوں قومیں اپنے الگ الگ تمدن، رسم ورواج اور حالات کے ساتھ اس میں شامل ہو چکی تھیں، چنانچہ وسیع سلطنت کے حدود میں مالیات کے مسائل، تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت کے مسائل، دستوری، دیوانی اور فوج داری قوانین کے مسائل روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ عظیم اسلامی سلطنت کے تعلقات دوسرے ممالک سے بھی تھے اور ان میں جنگ، صلح، سفارتی روابط، تجارتی معاملات بری وبحری اسفار کے نت نئے مسائل سامنے آ رہے تھے۔ مسلمان دنیا کی واحد قوم ہے، جو اپنا مستقل نظریہ حیات اور ضابطہ زندگی رکھتی ہے۔ اس لیے ضروری تھا، کہ وہ اپنے ہی اساسی نظام قانون کی روشنی میں پیش آنے والے جدید مسائل کا حل تلاش کرے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت تھی، لیکن حال یہ تھا، کہ آمریت پسند، مطلق العنان مسلم اقتدار کسی ایسے ادارے کو تشکیل دینے کے حق میں نہ تھا، جس میں وقت کے ان تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی قانون کی تدوین کے لیے ایسے معتمد اہل علم، فقیہ، دانش ور سر جوڑ کر آزادی رائے کے ساتھ قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل کا حل پیش کر سکیں، جو متفقہ طور پر پوری مملکت اسلام میں نافذ کیا جا سکے۔

دوسری طرف اسلامی شہروں میں جو قاضی اور فقیہ مسند قضا وافتا پر فائز تھے، وہ اپنے محدود علم وعقل کی روشنی میں فقہی استفسارات کے جوابات دیتے۔ بسا اوقات ان میں تضاد اور ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ ابن المقفع نے خلیفہ منصور عباسی کو اپنے ایک خط میں اس خطرناک صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

عدالتوں میں بدنظمی چھائی ہوئی ہے، اس میں کسی مشہور قانون کی طرف رجوع نہیں کیا جاتا، بلکہ ان فیصلوں کا دارومدار قاضیوں کے اپنے اجتہاد پر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے، کہ ایک ہی ساعت میں متضاد احکام صادر ہوتے رہتے ہیں، چنانچہ ایک قاضی کے حکم کے مطابق اگر کوفہ کی ایک عدالت میں بعض لوگوں کی جان و مال اور عصمت کے خلاف فیصلہ دیا جاتا ہے، تو دوسرے علاقے میں دوسرے قاضی کے فیصلے کے مطابق اس کی حمایت میں فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ (ضحیٰ الاسلام ص۲۱۹-۲۱۸)

خود کوفہ کے مشہور قاضی ابن ابی لیلیٰ تقریباً تیس سال تک مسند قضا پر متمکن رہے، ان کے فیصلوں میں بھی فاش غلطیاں ہوتیں، جن پر امام اعظم گرفت فرماتے۔ محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی عدالت مسجد میں قائم ہوا کرتی تھی، جہاں وہ مقدمات کے فیصلے کیا کرتے۔

ایک روز قاضی صاحب مجلس قضا سے فارغ ہو کر اٹھے تو جاتے ہوئے راستے میں دیکھا کہ ایک عورت ایک شخص سے لڑ جھگڑ رہی ہے، آپ نے سنا کہ اس عورت نے اسے یوں گالی دی ''یـا ابـن الـزانیین '' اے زانی مرد اور زانی عورت کے بیٹے!۔ قاضی صاحب نے حکم دیا، کہ اس عورت کو گرفتار کر لیا جائے، خود واپس لوٹے مسجد میں تشریف لائے، فیصلہ دیا کہ اس عورت کو کھڑا کر کے حد قذف (اسی کوڑے) لگائی جائے اور اسے دو حدوں کے ایک سو ساٹھ کوڑے مارے جائیں کیوں کہ اس نے ماں باپ دونوں پر تہمت زنا لگائی۔ حضرت امام ابوحنیفہ کو اس واقعہ کی تفصیلات معلوم ہوئیں، تو ارشاد فرمایا، کہ قاضی صاحب نے فیصلہ میں چھ غلطیاں کی ہیں (۱) انہوں نے مجلس قضا سے فارغ ہونے اور اٹھ جانے کے بعد فیصلہ دیا (۲) مسجد کے اندر حد جاری کی، حالاں کہ مسجد میں حد جاری کرنا ممنوع ہے۔ (۳) عورت کو کھڑا کر کے حد لگائی، حالاں کہ عورت کو بٹھا کر حد لگانے کا حکم ہے (۴) قاضی صاحب نے دو حدیں لگانے کا حکم دیا حالاں کہ ایک لفظ سے ایک ہی حد لازم ہونی چاہیے تھی (۵) قاضی صاحب نے دو حدیں اکٹھی لگائیں، اگر بالفرض کسی پر دو حدیں لازم بھی ہوں تو ایک ساتھ نفاذ کے بجائے اس پر ایک حد کا اثر ختم ہونے کے بعد دوسری حد لگائی جاتی ہے۔ (٦) حد قذف میں مقذوف کی طرف سے قاذف پر دعویٰ شرط ہے اور مذکورہ صورت میں جب مقذوف شخص (جسے گالی دی گئی) نے حد قذف کے مطالبہ کے لیے دعویٰ اور مطالبہ ہی نہیں کیا تو قاضی صاحب کو از خود مقدمہ قائم کرنے کا کیا اختیار تھا؟

قاضی صاحب کو اطلاع پہنچی، تو سخت برہم ہوئے اور گورنر سے شکایت کر دی، چنانچہ گورنر نے حضرت امام اعظم کو فتویٰ دینے سے منع کر دیا۔ (ابن خلکان ترجمہ قاضی ابن ابی لیلیٰ)

ابوجعفر منصور عباسی نے امام ابوحنیفہ کو بلایا امام صاحب منصور کے پاس پہنچے وہاں قاضی ابن شبرمہ اور ابن ابی لیلیٰ کو بیٹھا دیکھا، منصور نے امام ابوحنیفہ سے پوچھا، ان خوارج کے متعلق کیا کہتے ہو جنہوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہو؟ امام صاحب نے کہا، آپ ان دونوں قاضیوں سے دریافت کریں، جو آپ کے پاس ہیں، منصور نے کہا، ایک نے کہا ہے کہ اس معاملہ میں ان سب کی گرفت ہوگی اور دوسرے نے کہا ہے، کہ کسی چیز میں بھی گرفت نہ ہوگی۔ یہ سن کر امام ابوحنیفہ نے کہا، دونوں نے جواب میں

خطا کی ہے۔ منصور نے کہا اسی واسطے ہم نے تم کو بلوایا ہے، کہ حکم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، اگر خوارج نے قتل وغارت گری کی ہے اور ان خوارج پر اسلامی احکام جاری نہیں تھے، ان سے گرفت نہیں کی جائے گی اور اگر خوارج نے قتل وغارت گری کی ہے اور ان پر اسلامی قوانین جاری تھے تو ان پر گرفت کی جائے گی۔

منصور ابوجعفر کے دربار میں اس وقت جتنے علما بھی تھے، انہوں نے کہا، ''**القول ماقال ابو حنيفة**'' حقیقت وہی ہے جو ابوحنیفہ نے بیان کی ہے۔ (مناقب امام اعظم ج ۱ ص ۱۱۶)

یہ تو عام مسائل میں قاضیوں کے غلط فیصلوں کا حال تھا، وہ بھلا آئندہ پیش آنے والے مسائل کا اسلامی حل ڈھونڈنے کی ضرورت کیا محسوس کرتے، بلکہ ایسے مسائل کا سوچنا بھی ان کے نزدیک شجر ممنوعہ تھا۔ مشہور مفسر ومحدث قتادہ کوفہ پہنچے اور اعلان کردیا، کہ مسائل فقہیہ میں جس کو جو پوچھنا ہے پوچھے میں ہر مسئلہ کا جواب دوں گا۔ جوق در جوق لوگ آتے تھے اور مسئلہ پوچھتے تھے۔ امام ابوحنیفہ بھی موجود تھے، کھڑے ہوکر پوچھا، کہ ایک شخص سفر میں گیا، برس دو برس کے بعد اس کے مرنے کی خبر آئی، اس کی بیوی نے دوسرا نکاح کرلیا اور اس سے اولاد ہوئی، کچھ سالوں کے بعد وہ شخص واپس آیا لڑکے کی نسبت اس کو انکار ہے، کہ میری صلب سے نہیں ہے، زوج ثانی دعوی کرتا ہے کہ اولاد میری ہے، تو آیا دونوں اس پر زنا کا الزام لگاتے ہیں یا صرف وہ شخص جو ولدیت سے انکار کرتا ہے؟ قتادہ نے کہا، یہ صورت پیش بھی آئی ہے امام نے کہا، نہیں انہوں نے کہا:

فلم تسألوني عما لم يكن ؟

جو صورت پیش نہیں آئی ہے اس کے بارے میں سوال کیوں کرتے ہو؟

امام صاحب نے فرمایا:

ان العلماء يستعدون للبلاء ويتحرزون منه قبل نزوله فاذا نزل عرفوه وعرفوا الدخول فيه والخروج منه ۔

علما کو کسی مسئلہ کے پیش آنے سے پہلے اس کے تحمل وازالہ اور حکم شرعی کی وضاحت وتعبیر کے لیے تیار رہنا چاہیے، کہ جب وقوع پذیر ہو تو علما تحرز کرسکیں اور جب پیش آئے تو اسے پہچان سکیں اور یہ بھی پہلے سے جانتے ہوں کہ اختیار کرنے یا چھوڑ دینے کی شرعی راہ کون سی ہوسکتی ہے؟۔ (عقود الجمان ص ۲۶۳)

فیصلوں میں تضاد اور پیش آنے والے لاینحل مسائل کی کثرت عوام، علما، گورنر، حکام، قاضی سب محسوس کررہے تھے، کیوں کہ انفرادی اجتہاد اور معلومات کے بل پر روزمرہ پیش آنے والے اتنے مختلف مسائل کو بروقت حل کرنا ہر مفتی، ہر حاکم، ہر جج اور ناظم محکمہ کے بس کا کام نہیں تھا۔ اور اگر فرداً فرداً انہیں حل کیا بھی جاتا تھا، تو اس سے بے شمار متضاد فیصلوں کا ایک جنگل پیدا ہورہا تھا۔ اس انتشار وافتراق کا واحد حل یہ تھا کہ کوئی ایسا مستند فقہی ادارہ قائم کیا جائے جس میں وقت کے فقہا اور مجتہدین، محدثین ومفسرین، ارباب فکر ودانش سر جوڑ کر فقہی مسائل پر غور کریں اور قرآن وسنت کی روشنی میں قیاس واجتہاد

سے کام لیتے ہوئے حل پیش کریں۔ اس طرح اسلامی قانون منضبط ہو کر سامنے آئے اور پورے بلادِ اسلامی میں اس کو نافذ العمل قرار دیا جائے، یہ کام حکومت کے پیمانے پر ہو سکتا تھا، چنانچہ ابن المقفع نے خلیفہ منصور کے سامنے یہ تجویز پیش کی:

خلیفہ اہل علم کی ایک کونسل بنائے جس میں ہر نقطۂ نظر کے علما پیش آمدہ مسائل پر اپنا اپنا علم اور خیال پیش کریں پھر خلیفہ خود ہر مسئلہ پر اپنا فیصلہ دے اور وہی قانون ہو۔ (رسالۃ الصحابہ)

لیکن منصور اس رائے پر عمل درآمد نہ کر سکا، خود اس کی علمی پوزیشن ایسی نہ تھی کہ وہ فقہا و مجتہدین کی آرا کے بالمقابل اپنا کوئی فیصلہ دے سکے اور اسے امت اسلام قبول بھی کر لے۔

ابن المقفع کا یہ قول تو درخور اعتنا نہ بنا کہ علم کی سلطنت میں بھی قول فیصل حکمران کا قول ہو، البتہ منضبط و مدون نظام قانون کی ضرورت کا احساس دربار کو بھی بہ شدت ہونے لگا تھا۔ آگے چل کر جب مدون قانون کے بغیر کام چلانا مشکل ہو گیا تو دربار کا یہ احساس باقاعدہ ایک تقاضے کی صورت اختیار کر گیا۔ ابو جعفر منصور ۱۴۸ھ میں حج کے لیے گیا، تو امام مالک سے خواہش کی، کہ اگر آپ اجازت دیں، تو تمام مسلمانوں کو آپ کی فقہ پر جمع کر دیا جائے، ۱۶۳ھ میں دوبارہ حج کو گیا، تو پھر درخواست کی، مگر امام نے نہیں مانا۔ منصور نے کہا:

اے ابو عبداللہ! آپ علم فقہ کو ہاتھ میں لیجیے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدون کر ڈالیے۔ عبداللہ بن عمر کے تشددات، عبداللہ بن عباس کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعود کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجیے، جو خیر الامور اوسطہا کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہ کے متفق علیہ مسائل کا مجموعہ ہو، اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی، تو انشاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے اور اس کو تمام مملکت کے اندر جاری کر کے اعلان کر دیں گے کہ کسی حال میں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ (ضحیٰ الاسلام، امام مالک ابوزہرہ)

امام مالک نے منصور کے کہنے پر موطا فقہی ابواب پر مرتب کر دی، تاکہ مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت پوری ہو مگر وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے، کہ اس کتاب کو پوری اسلامی مملکت کا حتمی قانون بنا دیا جائے، جب منصور نے اس کتاب کو حکومت کے قانون کی اساس بنانے پر اصرار کیا، تو امام مالک نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا:

امیر المومنین! آپ ہرگز ہرگز ایسا نہ کریں، دیکھیے مسلمانوں کے پاس مختلف علما کے قول پہلے سے پہنچ چکے ہیں، وہ حدیثیں سن چکے ہیں اور روایتیں روایت کر چکے ہیں اور اسی کو اپنا دین بنا چکے ہیں، پس جس علاقے کے باشندوں نے جو باتیں اختیار کر لی ہیں ان کو انہیں کے حال پر چھوڑ دیجیے!۔ (المیزان الکبریٰ للشعرانی)

امام مالک کی ذات کتنی محتاط اور خدا ترس ہے، کہ جس موطا کو اپنی ذہنی کاوش اور علمی دیانت کے ساتھ مرتب کیا اسے حکومت کا قانون بنا کر پوری دنیائے اسلام پر مسلط کرنے سے روک دیا، وہ سمجھتے تھے، کہ تنہا ایک شخص کی علمی ذات ان تمام شرعی و دینی حقائق کی جامع نہیں ہو سکتی، اور نہ اس کی قوت استنباط و اجتہاد پر پوری ملت اسلامیہ کو جمع کرنا مناسب ہے، بلکہ اس کے

لیے تو علم و فضل کی معتبر ہستیوں کا جمع ہو کر اپنے علم و عقل کی روشنی میں کتاب و سنت، اجماع امت کو سامنے رکھتے ہوئے دینی، سیاسی، سماجی، تجارتی مسائل کا حل باتفاق رائے منضبط کرنا ہوگا۔

اس صورت حال اور وقت کے اہم تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے امام اعظم نے حکومت کے اثر و نفوذ سے بالاتر ہو کر ایک قانون ساز مجلس قائم کی اور اس اہم کام کا عزم ایک بدیع الفکر متبحر عالم ہی کر سکتا تھا، جسے اپنی بھرپور علمی لیاقت، اپنے کردار، اپنے اخلاقی وقار پر اتنا اعتماد ہو کہ اگر وہ ایسا کوئی ادارہ قائم کر کے قوانین مدون کرے گا، تو کسی سیاسی قوت نافذہ کے بغیر اس کے مدون کردہ قوانین اپنی خوبی، اپنی صحت، اپنی مطابقت احوال اور اپنے مدون کرنے والوں کے اخلاقی اثر کے بل پر خود نافذ ہوں گے اور سلطنتیں ان کو قبول کرنے پر مجبور ہوں گی۔

اسلامی قانون کی تدوین اور دستوری حیثیت میں اس کی ترتیب جتنی ناگزیر تھی، اتنی ہی وسیع و پرخطر تھی، جو حد درجہ حزم و احتیاط کی متقاضی تھی جس کو تنہا ایک شخص انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس میں دسیوں شبہات و زلات اور لغزشوں کا احتمال تھا، چنانچہ امام اعظم نے اس کام کے لیے تنہا اپنے وفور علم و عقل پر اعتماد نہیں کیا، بلکہ اس اہم مشکل اور وسیع کام کے لیے شورائی نظام کی ضرورت کو محسوس کیا، شورائی قانون ساز کمیٹی کے لیے جن باوثوق اصحاب علم اور قوت اجتہاد و استنباط رکھنے والے ماہر ارکان کی ضرورت تھی، اس کی تکمیل کا بندوبست بھی امام اعظم نے اپنے استاذ حضرت حماد بن سلیمان کی مسند درس و افتا پر بیٹھنے ہی کے ساتھ شروع کر دیا، وہ اپنے حلقہ بگوش طلبا کی استعداد اور فکر و تخیل کی رفعت، ان کے رجحان طبع اور اخلاق و کردار ہر چیز کا جائزہ لیتے اور اسی انداز سے ان کی تعلیم و تربیت فرماتے، جب مردان کار کی ایک معتمد ٹیم تیار ہو گئی، تو امام اعظم نے ان کو اپنی مجلس قانون ساز کا اہم رکن مقرر کیا، جن کی تعداد مورخین نے اڑتیس یا چالیس بتائی ہے، جن کو امام اعظم نے اپنے مدرسہ علم میں باقاعدہ قانونی مسائل پر سوچنے، علمی طرز پر تحقیقات کرنے اور دلائل سے نتائج مستنبط کرنے کی تربیت دی تھی، ان میں سے قریب قریب ہر ایک امام کے علاوہ وقت کے دوسرے بڑے بڑے اساتذہ سے بھی قرآن و حدیث، فقہ اور دوسرے مددگار علوم مثلاً لغت، نحو، ادب اور تاریخ و سیر کی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ متعدد شاگرد مختلف علوم کے اختصاصی ماہر سمجھے جاتے تھے، تدوین فقہ کے لیے جس قدر علوم و فنون کی ضرورت تھی، اس کے ماہرین کو امام صاحب نے منتخب کر لیا تھا مثلاً امام محمد کو عربیت اور علم ادب میں خاص کمال حاصل تھا، قاسم بن معن بھی علم ادب میں مسلم استاذ تھے، استخراج و استنباط مسائل میں امام زفر اپنی نظیر آپ تھے، قاضی ابو یوسف، داؤد طائی، یحییٰ بن ابی زائدہ، عبداللہ بن مبارک اور حفص بن غیاث کو روایات احادیث و آثار میں خاص کمال اور امتیاز حاصل تھا اور وہ اس میں زمانہ کے مسلم اساتذہ تسلیم کیے جاتے تھے، چالیس افراد کی اس دستوری کمیٹی کے علاوہ بارہ افراد پر مشتمل ایک دوسری مجلس شوریٰ تھی، جو فیصلے کو آخری شکل دیتی اور حتمی نتائج پر پہنچتی تھی، اس کمیٹی میں عبداللہ بن مبارک، امام ابو یوسف، امام زفر، یوسف بن خالد اور امام ابوحنیفہ شریک تھے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کی قائم کردہ مجلس شوریٰ کے ارکان کی عظمت اور علمی جلالت قدر کا اندازہ مشہور محدث حضرت وکیع کے

اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک شخص نے ان کے سامنے کہا، کہ ابو حنیفہ سے فلاں مسئلہ میں غلطی ہوئی ہے تو وکیع بھڑک اٹھے اور فرمایا:

کیف یقدر ابو حنیفہ ان یخطی ومعہ مثل ابی یوسف وزفر ومحمد فی قیاسھم واجتھادھم ومثل یحییٰ بن ابی زائدہ وحفص بن غیاث وحبان ومندل ابنا علی فی حفظھم للحدیث ومعرفتھم بہ والقاسم بن معن یعنی ابن عبدالرحمن بن عبداللہ بن مسعود فی معرفۃ باللغۃ والعربیۃ وداؤد الطائی وفضیل بن عیاض فی زھدھما وورعھما من کان اصحابہ ھؤلاء وجلساءہ لم یکن لیخطی لانہ ان اخطأ ردوہ الی الحق ۔

(جامع المسانید ج ۱ ص ۳۳)

ابو حنیفہ کیوں کر غلطی کر سکتے ہیں، جب کہ ان کے ہمراہ بحث و تحقیق کے شرکا قاضی ابو یوسف، زفر اور امام محمد جیسے قیاس میں یدطولیٰ رکھنے والے اور یحییٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان اور مندل جیسے حفاظ حدیث وعالم حدیث، قاسم بن معن جیسے عربی زبان اور علوم عربیت کے ماہر، داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زہد وتقویٰ میں شہرہ آفاق حضرات موجود ہوتے ہیں، جس شخص کے ایسے ہم نشیں ہوں وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس سے اگر کبھی غلطی سرزد بھی ہو تو یہ حضرات فوراً ٹوک دیں گے۔

امام وکیع بن الجراح نے امام اعظم کے مدونہ قوانین پر اعتراض کرنے والوں کے بارے میں یہ فیصلہ بھی صادر فرمایا:

والذی یقول مثل ھذا کالانعام بل ھم اضل ۔(ایضا)

ان کی طرف اس قسم کی باتیں منسوب کرنے والے جانور یا ان سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔

وکیع کے اس بیان سے جہاں تدوین فقہ کی دستوری کمیٹی کے افراد کی علمی جلالت قدر سامنے آتی ہے اور بحث و تحقیق کا طریقہ کار معلوم ہوتا ہے، وہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ابو حنیفہ کو جیسے رفقا میسر آئے، خالص علمی ماحول اور حضرات صحابہ سے قریب کا زمانہ حاصل ہوا، اسلامی تعلیمات میں خود ان کو جس قدر اعلیٰ درجہ کی فہم و بصیرت اور اجتہاد میں جو فوق العادت ادراک نصیب ہوا جس کے فضل و تقدم کا اپنے اور بے گانے سب اعتراف کرتے ہیں۔ ایسی خصوصیت کسی اور کے نصیب میں نہیں آئی۔

ایک بار امام صاحب نے اپنے رفقائے مجلس کی علمی صلاحیت و قابلیت کا اعتراف ان الفاظ میں فرمایا:

ھؤلاء ستۃ وثلاثون رجلا منھم ثمانیۃ وعشرون یصلحون للقضاء وستۃ یصلحون للفتویٰ والثنان ابو یوسف وزفر یصلحان لتادیب القضاۃ وارباب الفتوی ۔(مناقب للموفق ج ۲ ص ۲۴۹)

یہ چھتیس آدمی ہیں جن میں سے ۲۸ / قاضی ہونے کے لائق ہیں، چھ فتویٰ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور دو یعنی

ابو یوسف اور زفر قاضی اور مفتی تیار کر سکتے ہیں۔

شرکائے تدوین فقہ

امام اعظم کو تدوین فقہ کے لیے جن علوم وفنون کے ماہرین کی ضرورت تھی، وہ سب یک جا تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:

ایک اور مشکل یہ تھی، کہ فقہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہے اور قانون کے ماخذوں میں قانون کے علاوہ لغت، صرف، نحو، تاریخ وغیرہ ہی نہیں، حیوانیات، نباتیات بلکہ کیمیا و طبعیات کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ قبلہ معلوم کرنا جغرافیہ طبعی پر موقوف ہے، نماز اور افطار و سحری کے اوقات علم ہیئت وغیرہ کے دقیق مسائل پر مبنی ہیں۔ رمضان کے لیے رویت ہلال کو اہمیت حاصل ہے اور بادل وغیرہ کی وجہ سے ایک جگہ چاند نظر نہ آئے، تو کتنے فاصلے کی رویت اطراف پر موثر ہوگی وغیرہ وغیرہ مسائل کی طرف اشارے سے اندازہ ہوگا، کہ نماز روزہ جیسے خالص عباداتی مسائل میں بھی علوم طبعیہ سے کس طرح قدم قدم پر مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاروبار تجارت، معاہدات، آبپاشی، صرافہ، بنک کاری وغیرہ وغیرہ کے سلسلے میں قانون سازی میں کتنے علوم کے ماہروں کی ضرورت نہ ہوگی، امام اعظم ہر علم کے ماہروں کو ہم بزم کرنے اور اسلامی قانون یعنی فقہ کو ان سب کے تعاون سے مرتب و مدون کرنے کی کوشش میں عمر بھر لگے رہے اور بہت کچھ کامیاب ہوئے۔ (حیات ابوحنیفہ ص ۱۸۰)

مجلس تدوین فقہ کے اہم ارکان

مجلس تدوین کے ارکان کی تعداد میں کمی بیشی ہوا کرتی تھی، لیکن ہر مجلس میں ان کی معتدبہ تعداد ضرور حاضر ہوتی۔ کتب سیر و تذکرہ میں شرکائے مجلس کے نام کچھ اس طرح درج ہوئے ہیں۔

۱۔ مجلس فقہ کے صدر نشیں امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت م۱۵۰ھ

۲۔ امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری ۱۸۲ھ

۳۔ امام زفر بن ہذیل بن قیس العنبری م۱۵۸ھ

۴۔ امام محمد بن حسن شیبانی ۱۸۹ھ

۵۔ عافیہ بن یزید الاودی الکوفی ۱۸۰ھ

۶۔ اسد بن عمرو البجلی ابو عمرو ۱۸۸ھ

۷۔ داؤد بن نصیر ابو سلیمان الطائی الکوفی ۱۶۵ھ

۸۔ قاسم بن معن بن عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن مسعود الہذلی الکوفی م۱۷۵ھ

۹۔ علی بن مسہر الکوفی ۱۸۹ھ

۱۰۔ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ۱۸۲ھ

۱۱- وکیع بن الجراح ۱۹۹ھ

۱۲- حفص بن غیاث بن طلق بن عمرو النخعی الکوفی ۱۹۴ھ

۱۳- حبان بن علی الکوفی ۱۷۲ھ

۱۴- مندل بن علی الکوفی ۱۶۸ھ

۱۵- یحییٰ بن سعید القطان ۱۹۸ھ

۱۶- عبداللہ بن المبارک ۱۸۱ھ

۱۷- یزید بن ہارون الواسطی ۲۰۶ھ

۱۸- عبدالرزاق بن ہمام ۲۱۱ھ

۱۹- الضحاک بن مخلد ابو عاصم النبیل ۲۱۲ھ

۲۰- حماد بن ابی حنیفہ ۱۷۹ھ

۲۱- مسعر بن کدام ۱۵۵ھ

۲۲- مکی بن ابراہیم البلخی ۲۱۵ھ

۲۳- نوح بن ابی مریم ابو عصمہ ۱۷۳ھ

۲۴- نوح بن دراج الکوفی ابو محمد النخعی ۱۸۲ھ

۲۵- فضیل بن عیاض بن مسعود التمیمی ۱۸۷ھ

۲۶- ابراہیم بن طہمان تقریباً ۱۶۰ھ

۲۷- سعید بن اوس ابو زید الانصاری ۲۱۵ھ

۲۸- فضیل بن موسیٰ ۱۹۱ھ

۲۹- النضر بن عبدالکریم ۱۶۹ھ

۳۰- حفص بن عبدالرحمٰن ابو عمرو النیشاپوری ۱۹۹ھ

۳۱- ہشیم بن بشیر السلمی ۱۸۳ھ

۳۲- یوسف بن خالد بن عمر ابو خالد السمتی ۱۸۹ھ

۳۳- الحسن بن زیاد اللؤلؤی الکوفی ۲۰۴ھ

۳۴- ابو مطیع الحکم بن عبداللہ بن مسلمہ البلخی ۱۹۷ھ

۳۵- ہوذہ بن خلیفہ ابو الاشہب الثقفی البصری ۲۱۵ھ

۳۶- بشر بن غیاث المریسی ۲۲۸ھ
۳۷- مالک بن مغول البجلی ۱۵۹ھ
۳۸- خارجہ بن مصعب
۳۹- ابوالجویریہ
۴۰- محمد بن وہب
۴۱- الحسن بن رشید
۴۲- نعیم بن عمرو التزیدی
۴۳- عمر بن میمون ابوعلی القاضی البلخی ۱۷۱ھ
۴۴- شریک بن عبداللہ الکوفی القاضی ۱۷۷ھ
۴۵- علی بن ظبیان العبسی القاضی ۱۹۲ھ
۴۶- زہیر بن معاویہ بن خدیج الکوفی ۱۷۲ھ
۴۷- عفان بن سیارہ
۴۸- القاسم بن الحکم ابواحمر القاضی ۲۰۸ھ
۴۹- خالد بن سلیمان البلخی ابومعاذ ۱۹۹ھ
۵۰- منصور ابوشیخ

طریقہ تدوین

تدوین فقہ کے سلسلے میں امام اعظم کا طریقہ کار یہ تھا، کہ مسائل اپنے شاگردوں کے سامنے پیش کرتے اور انہیں اپنے خیالات بیان کرنے کی آزادی ہوتی، اس طرح بحث وتمحیص کا بازار گرم ہو جاتا۔ دلائل وبراہین سامنے آتے پھر امام صاحب اپنی رائے کا اظہار فرماتے۔ موفق کا بیان ہے:

> فوضع ابو حنيفة رحمه الله شورى بينهم لم يستوى فيه بنفسه دونهم اجتهادا منه فى الدين و مبالغة فى النصيحة لله ورسوله والمومنين و كان يلقى مسئلة مسئلة ويقلبهم ويسمع ماعندهم ويقول ماعنده ويناظرهم شهرا او اكثر من ذالك حتى يستقرى احد الاقوال فيها ثم يثبتها القاضى ابويوسف فى الاصول۔ (مناقب موفق ج ۲ ص ۱۳۳)

ابوحنیفہ نے اپنا مذہب شاگردوں کے مشورے سے مرتب کیا ہے اور اپنی حد وسع تک دین کی خاطر زیادہ سے زیادہ جانفشانی کرنے کا جو جذبہ رکھتے تھے اور خدا اور رسول خدا اور اہل ایمان کے لیے جو کمال درجہ کا اخلاص

ان کے دل میں تھا اس کی وجہ سے انہوں نے شاگردوں کو چھوڑ کر یہ کام محض اپنی انفرادیت سے کر ڈالنا پسند نہ کیا وہ ایک ایک مسئلہ ان کے سامنے پیش کرتے تھے اس کے مختلف پہلو ان کے سامنے لاتے تھے، جو کچھ ان کے پاس علم اور خیال ہوتا اسے سنتے اور اپنی رائے بھی بیان کرتے، حتی کہ بعض اوقات ایک ایک مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مہینہ مہینہ بھر یا اس سے زیادہ لگ جاتا تھا۔ آخر میں جب ایک رائے قرار پا جاتی اسے قاضی ابو یوسف کتب اصول میں تحریر کرتے۔

ابن البزاز کردری اپنی مناقب میں لکھتے ہیں:

کانوا اصحابه یکثرون الکلام فی مسئله من المسائل و یاخذون فی کل فن وهو ساکت فاذا اخذنی شرح ماتکلم فیه کان کانه لیس فی المجلس احد غیره ۔ (کردری ج ۲ ص ۱۰۸)

ان کے شاگرد کسی مسئلہ پر خوب دل کھول کر بحث کرتے اور ہر فن کے نقطہ نظر سے گفتگو کرتے، اس دوران امام خاموشی کے ساتھ ان کی تقریریں سنتے رہتے تھے، پھر جب امام زیر بحث مسئلہ پر اپنی تقریر شروع کرتے تو مجلس مین ایسا سکوت ہوتا جیسے یہاں ان کے سوا کوئی نہیں بیٹھا ہے۔

اس مجلس فقہ میں امام ابوحنیفہ اپنی جو رائے ظاہر کرتے تھے اسے بعد میں پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے، چنانچہ امام صاحب کے ایک شاگرد ابوعبداللہ کا بیان ہے:

کنت اقرأ علیه اقاویله و کان ابویوسف ادخل فیه ایضا اقاویله و کنت اجهد علی ان لا اذکر قول احد بجنبه فزل لسانی یوما وقلت بعد ذکر قوله وفیها قول آخر ۔فقال ومن هذاالذی یقول هذاالقول (کردری ج ۲ ص ۱۰۹)

میں امام کے اقوال ان کو پڑھ کر سناتا تھا، ابو یوسف ساتھ ساتھ اپنے اقوال بھی درج کر دیا کرتے تھے، اس لیے پڑھتے وقت میں کوشش کرتا تھا، کہ ان کے اقوال چھوڑتا جاؤں اور صرف امام کے اپنے اقوال انہیں سناؤں ایک روز چوک گیا اور دوسرا قول بھی میں نے پڑھ دیا امام نے پوچھا یہ دوسرا قول کس کا ہے۔

مجلس تدوین فقہ کا یہ ضابطہ تھا، کہ امام صاحب ہر مسئلہ میں اپنے شاگردوں سے بحث و مناظرہ کرتے امام محمد بن حسن شیبانی کہتے ہیں:

کان ابوحنیفة رحمه اللّٰه یناظر اصحابه فی المقائس فیستصفون منه ویعارضونه ۔

(موفق ج ۱ ص ۹۰)

امام ابوحنیفہ کی عادت تھی کہ وہ اپنے تلامذہ سے مناظرہ کرتے تلامذہ کبھی امام صاحب کی بات مان لیتے اور کبھی امام کے دلائل کے مقابلہ میں اپنی دلیلیں پیش کرتے۔

امام ابوحنیفہ نے اپنی مجلس کے اراکین کو بحث ومناظرہ کی اس قدر آزادی دی تھی، کہ وہ بلا جھجک امام کو ٹوک دیتے اور ایسا انداز اختیار کرتے کہ دیکھنے والے کو تعجب ہوتا۔ جرجانی کا بیان ہے، کہ میں امام کی مسجد میں حاضر تھا، کہ ایک نوجوان نے امام سے کوئی سوال کیا جس کا امام صاحب نے جواب دیا، لیکن نوجوان کو میں نے دیکھا کہ جواب سنتے ہی اس نے کہا اخطات آپ نے غلطی کی، جرجانی کہتے ہیں کہ نوجوان کے اس انداز تخاطب کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور حاضرین کو خطاب کر کے میں نے کہا حیرت کی بات ہے تم اپنے شیخ کا قطعا لحاظ نہیں کرتے، جرجانی نے ابھی اپنی بات مکمل نہ کی تھی امام ابوحنیفہ نے انہیں ٹوک دیا اور فرمایا:

دعهم فاني قد عودتهم ذلك من نفسه ۔ (معجم المصنفين ص ۱۷۴)

تم ان لوگوں چھوڑ دو میں نے خود ہی اس طرز کلام کا ان کو عادی بنایا ہے۔

آزادی رائے اور بے لاگ تبصرے کے بغیر تدوین فقہ کا یہ مہتم بالشان کام تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا، یہی وجہ تھی، امام صاحب نے اپنے شاگردوں کو اظہار خیال اور نکتہ چینی کی آزادی دے رکھی تھی۔

امام صاحب اس سلسلہ میں اس درجہ محتاط واقع ہوئے تھے، کہ اگر کسی دن مجلس کا کوئی اہم رکن غیر حاضر ہوتا تو بحث وتمحیص کے باوجود اس دن کا فیصلہ تحریر کرنے سے روک دیتے، رفیق مجلس عافیہ بن یزید کے بارے میں ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں:

عافیہ بن یزید ایک دن مجلس میں حاضر نہ تھے، مسئلہ پر بحث وتمحیص، ہوئی شرکائے مجلس نتیجہ پر بھی پہنچ گئے، مگر امام ابوحنیفہ نے ارشاد فرمایا کہ ابھی اس مسئلہ کو ضبط تحریر میں نہ لایا جائے جب تک کہ عافیہ کی نظر سے نہ گزر جائے۔ مورخین نے لکھا:

اذاحضر عافية ووافقهم قال اثبتوه ۔(الجواهر المضيه ج ۱ ص ۲۶۷)

جب عافیہ حاضر ہوئے اور لوگوں سے اتفاق کیا تو امام صاحب نے فرمایا مسئلہ کو درج کرو۔

موفق کے بقول مجلس تدوین فقہ میں ۸۳ر ہزار قانونی مسائل طے کیے گئے۔ خوارزمی کے بیان کے مطابق بھی ان مسائل کی تعداد ۸۳ر ہزار تھی۔ امام مالک کا ایک قول ہے، کہ امام ابوحنیفہ نے ساٹھ ہزار مسائل کو لیا۔ ایک روایت یہ ہے طے شدہ مسائل کی تعداد پانچ لاکھ تھی، جن میں سے اڑتیس ہزار کا تعلق عبادات سے تھا۔ کردری کی روایت کے بموجب کوفہ کی مجلس تدوین قانون نے چھ لاکھ مسائل طے کیے۔ اور صاحب کتاب الصیانہ کا دعویٰ ہے کہ جملہ مسائل بارہ لاکھ نوے ہزار تھے۔ تعداد مسائل کی روایت کا یہ اختلاف دو وجہ سے ہوسکتا ہے ایک یہ کہ کام کے مختلف مراحل پر حاصل کردہ معلومات کو راوی نے آگے پہنچا دیا اور وہ کتابوں میں درج ہوئیں اور دوسرے یہ کہ کسی نے محض بڑے بڑے اصول مسائل کا شمار کیا اور کسی نے ان کے اجزا کو بھی گنتی میں لے لیا۔

ان میں صرف وہی مسائل نہیں تھے جو اسلامی معاشرہ کو اب تک پیش آچکے تھے، بلکہ معاملات کی امکانی صورتیں فرض

کر کے ان پر بھی بحث کی جاتی اور ان کا حل تلاش کیا جاتا تھا، تاکہ آئندہ اگر کبھی نئی صورت پیش آ جائے تو قانون میں پہلے سے اس کا حل موجود ہو۔ یہ مسائل تقریباً ہر شعبہ قانون سے متعلق تھے، اور اس مجلس کے ذریعہ زندگی کے ہزارہا مسائل کے لیے ایسے واضح فروعی احکام متعین ہو گئے جو اصولوں کے چوکھٹے میں ٹھیک ٹھیک نصب ہو جائیں اور ان میں باہمی تعارض نہ ہو۔ اس تدوین کارنامے کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ نہ صرف تمام مسائل ایسے مستحکم دلائل کے ساتھ طے ہوئے کہ معاشرہ میں اور خصوصاً اہل علم میں ان کو قبولیت حاصل ہوئی، بلکہ تمام جزئی احکام پوری ہم آہنگی کے ساتھ ایک مربوط نظام قانون میں نصب ہو گئے اور اس کام کی اولیت وتقدم کا شرف امام اعظم کو حاصل ہوا۔

علامہ شمس الدین محمد بن یوسف صالحی شافعی دمشقی نے لکھا ہے:

انه ابا حنيفة النعمان اول من دون علم الفقه رتبه ابوابا ثم تابعه مالك بن انس فى ترتيب الموطا لم يسبق اباحنيفة احد لان الصحابه و التابعين رضى الله عنهم انما كانوا يعتمدون على قوة حفظهم فلما راى ابو حنيفة العلم منتشرا اخاف عليه فجمعه ابوابا ميوبة و كتبا مرتبة فبدا بالطهارة ثم بالصلاة ثم بالصوم ثم بسائر العبادات ثم بالمعاملات ثم ختم بالمواريث لانها اخر احوال الناس وهو اول من وضع كتاب الفرائض واول من وضع كتاب الشروط۔ (عقود الجمان ص ۱۸۴)

یقیناً ابوحنیفہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم فقہ کی تدوین کی ہے اور اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے، پھر مالک بن انس نے موطا کی ترتیب میں ابوحنیفہ کا اتباع کیا ہے، ابوحنیفہ پر کوئی سبقت نہیں لے جا سکا ہے، کیوں کہ حضرات صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کا اعتماد اپنی قوت حفظ پر تھا، جب ابوحنیفہ نے دیکھا کہ علم شریعت اطراف واکناف عالم میں پھیل گیا ہے، آپ کو اس علم کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا، لہٰذا آپ نے اس کو ابواب وکتب میں مرتب اور منضبط کیا، ابتدا کتاب الطہارت سے کی، پھر کتاب الصلاۃ کتاب الصوم، کتاب عبادات کتاب معاملات کا بیان کیا اور کتاب المواریث پر ختم کیا کیوں کہ یہی لوگوں کی آخری حالت ہے اور آپ ہی وہ اول شخص ہیں جنہوں نے کتاب الفرائض اور کتاب الشروط تصنیف کی۔

امام صاحب کا تلامذہ سے خطاب

تدوین فقہ کی تکمیل کے بعد امام اعظم ابوحنیفہ نے دور دراز علاقوں سے اہم اور نامور شاگردوں کو کوفہ بلایا اور ایک دن جامع کوفہ میں تقریباً ایک ہزار نامور تلامذہ کو جمع کیا اور ان میں سے چالیس اہم اور معتمد شاگردوں کو اپنے قریب بٹھایا پھر یہ تقریر فرمائی:

انتم مسار قلبى وجلاء حزنى اسرجت لكم الفقه والحمته وقد تركت الناس يطؤون

اعقابکم ویلتمسون الفاظکم ما منکم واحد الا وهو یصلح للقضاء فسالتکم بالله وبقدر ما وهب الله لکم من جلالة العلم لما صنتموه عن ذل الاستیجار وان بلی احد منکم بالقضاء فعلم من نفسه خربة ستر الله عن العباد لم یجز قضاءه ولم یطب له رزقه فان دفعته ضرورة الی الدخول فیه فلا یحتجبنّ عن الناس ولیصل الخمس فی مسجده وینادی عند کل صلاة من له حاجة فاذا صلی العشاء نادی ثلاثة اصوات من له حاجة ثم دخل الی منزله فان مرض مرضا لایستطیع الجلوس معه اسقط من رزقه بقدر مرضه وایما امام غل فینا اوجار فی حکم بطلت امامته ولم یجز حکمه ۔ (کتاب المناقب ص۱۷)

تم میری مسرت ہو اور میرے غم کو زائل کرنے والے ہو، میں نے تمہارے واسطے فقہ پر زین کس دی ہے اور لگام لگادی ہے اور لوگوں کو اس حال میں چھوڑ رہا ہوں کہ وہ تمہارے نقش قدم پر چلیں اور تمہارے ارشادات کے طلب گار ہوں، تم میں سے ہر ایک قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، میں تم سے اللہ کا اور اس رتبہ کا جو اللہ تعالیٰ نے تم کو علم کی بڑائی کا عطا کیا ہے واسطہ دے کر یہ چاہتا ہوں کہ اس علم کو اجرت لینے کی ذلت سے بچانا۔ اگر تم میں سے کوئی قضا میں مبتلا ہو جائے اور اس کو اپنی کسی خرابی کا علم ہو جس کو اللہ نے اپنے بندوں سے چھپا رکھا ہے تو اس کا قاضی بننا جائز نہیں، اس کے لیے روزینہ لینا ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی مجبوری کی بنا پر قاضی بن جائے تو وہ اپنے کو لوگوں سے نہ چھپائے، وہ پانچوں وقت کی نماز اپنی مسجد میں پڑھے اور ہر نماز کے وقت پکارے کیا کوئی حاجت مند ہے اور عشا کی نماز کے بعد تین مرتبہ یہ آواز لگائے اور پھر وہ اپنے گھر جائے اور اگر وہ ایسا بیمار ہو جائے کہ وہ بیٹھ نہ سکے تو بیماری کے دنوں کی تنخواہ نہ لے اور جو امام (والی) مال غنیمت میں خیانت کرے اس کی ولایت اور امامت ختم ہوئی اور اس کا حکم نافذ نہیں ہے۔

انفرادی طور پر بھی منصب قضا پر فائز ہونے والوں کے لیے جامع نصیحت فرمائی۔

نوح بن ابی مریم کو نصیحت

امام ابو عصمہ نوح بن ابی مریم نے بیان کیا کہ میں حضرت امام عالی مقام سے احادیث مبارکہ کے معانی دریافت کیا کرتا تھا اور آپ بہت اچھے پیرایہ میں ان کو بیان کیا کرتے تھے اور میں آپ سے دقیق مسائل پوچھتا تھا، ایک دن حضرت امام نے فرمایا: اے نوح! تم قضا کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہو اور جب میں اپنے وطن مرو پہنچا، کچھ دن گزرے تھے کہ میں قضا میں مبتلا ہو گیا، میں نے حضرت امام کو خط لکھا کہ میں نے مجبوراً قاضی کا عہدہ قبول کر لیا ہے حضرت امام نے تحریر فرمایا، تمہارے گلے میں بہت بڑی امانت ڈال دی گئی ہے اس بھنور سے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرو، اللہ کے خوف کو لازم پکڑو اور آپ نے تحریر فرمایا، یہ بات خوب جان لو کہ فیصلوں کے ابواب ایسے ہیں کہ ان کو بڑا عالم ہی سمجھ سکتا ہے، جو اصول علم، قرآن، حدیث، اقوال صحابہ سے

واقف ہو اور خود بھی صاحب بصیرت ہو، وہ فیصلہ کر سکتا ہے، جب تم کو کسی واقعہ میں اشکال پیش آئے تو کتاب وسنت اور اجماع کی طرف رجوع کرو، اگر واضح طور پر مسئلہ مل جائے، تو اس پر عمل کرو، ورنہ نظائر تلاش کر کے قیاس کرو اور جو کتاب وسنت اور اجماع سے اقرب اور اشبہ ہو، اس میں اہل معرفت سے مشورہ کرو اور اس پر عمل کرو، جب مدعی اور مدعا علیہ حاضر ہوں تو ضعیف وقوی شریف اور وضیع میں فرق نہ کرو، ایسی بات ظاہر نہ ہو کہ بڑا یا شریف تم سے بے جا امید رکھنے لگے، اللہ تعالیٰ تم کو سلامت رکھے اور ہم کو اور تم کو اچھی حیات اور آخرت میں بہتر مقام نصیب کرے۔

(سوانح بے بہائے امام اعظم ص ۱۳۹)

◆

آزاد عدلیہ کا قیام

امام صاحب نے اس خطبہ میں اپنے تلامذہ کو مطلع کیا کہ جس نصب العین کے لیے کوشش جاری تھی، اس میں کامیاب ہونے کا وقت آ گیا۔ امام کے بلیغانہ اشارے کہ کس کسا کر گھوڑے کو تیار کر دیا گیا ہے، لگام بھی چڑھا دی گئی ہے، راستہ صاف ہے، دنیا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے، تم لوگوں کے علم کی ضرورت کا احساس عام لوگوں میں پھیل چکا ہے، صرف سوار ہو کر چل پڑنے کی ضرورت ہے۔ پھر اسی کے ساتھ چالیس آدمیوں میں سے تیں کو قضا کے عہدہ کے مناسب قرار دیا اور دس شاگردوں کے متعلق یہ دعویٰ کہ قاضیوں کی تربیت و پرداخت کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں، قاضی القضاۃ کے اس اہم عہدے کے قیام کے امکان کو محسوس کر کے جن لوگوں میں اس جلیل منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی قابلیت پائی جاتی تھی، ان کو بھی امام صاحب نے متعین کر کے بتا دیا، گویا ''فقہ اسلامی'' کا شاندار مستقبل جو بعد میں پیش آنے والا تھا، امام نے پہلے ہی بھانپ لیا، کہ اس کے لیے زمین تیار ہو چکی ہے۔ چنانچہ امام صاحب کی وفات کے بعد ہی خلفائے بنو عباس حنفی فقہا کو اسلامی بلاد و امصار کی مسند قضا پر متمکن کرنے لگے اور ہارون رشید کے زمانے میں تو یہ حال ہو گیا تھا، کہ بغداد، کوفہ، واسط، مدائن، مرو، مدینہ، مصر، خوارزم، رے، کرمان، نیشاپور، بجستان، دمشق، ترمذ، جرجان، بلخ، ہمدان، صنعا، شیراز، اہواز، تستر، اصفہان، سمرقند، ہرات اور ان کے سوا ممالک محروسہ عباسیہ کے تقریباً اکثر مرکزی شہروں میں حنفی قاضی محکمہ عدالت میں قابض و دخیل نظر آتے ہیں، جن میں بعض کا تقرر ابو جعفر منصور نے، بعض کا مہدی نے اور بعض کا ہادی نے بھی کیا تھا اور ہارون نے جب اسلامی تاریخ کے نئے عہدے قاضی القضاۃ کی مسند پر امام مالک کو فائز کرنا چاہا، تو وہ کسی حال میں مدینہ چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے تو مکہ جا کر سفیان بن عیینہ کو یہ خدمت سونپنی چاہی، انہوں نے اپنا دفتر خلیفہ کے حوالہ کر دیا، مگر آمادگی کے باوجود وہ معیار قضا پر پورے نہ اترے۔ طاش کبریٰ زادہ نے ''مفتاح السعادۃ'' میں یہ روایت نقل کی ہے:

امام مالک کو بغداد لانے سے مایوس ہونے کے بعد وہ واپسی میں مکہ معظمہ پہنچا اور اس زمانے میں مکہ کی علمی امامت اور ریاست جن کے ہاتھ میں تھی، یعنی سفیان بن عیینہ ان سے ملا، ملنے کے بعد ان کو حکم دیا، کہ جو کتابیں انہوں نے لکھی ہیں، میرے ساتھ کر دیں، ابن عیینہ نے سارا دفتر ہارون رشید کے لوگوں کے حوالہ کر دیا۔ عراق پہنچ کر جب ہارون نے ان کے کاموں کی جانچ کرائی، تو لکھا ہے کہ نتیجہ بہت مایوس کن نکلا اور ہارون نے بڑے افسوس کے لہجہ میں کہا:

رحم الله سفيان تواطأ لنا فلم ننتفع بعلمه ۔(ج۲ص۸۸)

سفیان پر خدا رحم کرے، ہمارے ساتھ ہم آہنگی پر آمادہ ہوئے تو ان کے علم سے ہم نفع نہ اٹھا سکے۔

ابن عیینہ کے پاس جو ذخیرہ تھا، وہ احادیث اور صحابہ وتابعین کے آثار تھے، لیکن ان کو سامنے رکھ کر کوئی فقہی قانون مرتب نہیں کیا گیا تھا، جسے حکومت کے طول وعرض میں نافذ کیا جا سکے۔

قاضی ابو یوسف

قاضی ابو یوسف مہدی اور ہادی کے زمانے میں بہت دنوں تک بغداد کے مشرقی خطہ کے قاضی رہے اور یہ عہدہ بھی انہوں نے معاشی تنگ حالی کی بنا پر قبول کیا تھا۔ ابو یوسف اپنے عہدہ قضا کے تعلق سے فرماتے ہیں:

مہدی نے مجھے بغداد کے مشرقی حصہ کا قاضی مقرر کیا، پھر مہدی کا انتقال ہو گیا اور میں ہادی کی طرف سے قاضی رہا پھر رشید نے بھی مجھے قضا پر بحال رکھا۔ (کردری ج۲ص۱۶۲)

ہارون رشید جب امام مالک اور ابن عیینہ سے مایوس ہو گیا تو اس نے امام ابوحنیفہ کے دو شاگردوں میں سے کسی ایک کو پوری مملکت اسلامیہ کا قاضی القضاۃ بنانے کا ارادہ کیا، ان میں امام زفر بن ہذیل تو کسی قیمت پر حکومت کا کوئی عہدہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے، اگرچہ اس کی پاداش میں ان کا گھر منہدم کر دیا گیا۔ ہاں! قاضی ابو یوسف وہ پہلے ہی سے مشرقی بغداد کے قاضی چلے آ رہے تھے، ان کے علمی دبدبہ، فقہی وقار اور فیصلوں کی حقانیت، امرا، عوام اور خواص کے درمیان مشہور ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ کو پوری مملکت اسلام کا قاضی القضاۃ مقرر کیا گیا، ممالک محروسہ کے اندر قاضیوں کا عزل ونصب، ان کی دیکھ ریکھ اور ان کی تربیت کا اختیار آپ کو تفویض کیا گیا۔ چنانچہ مقریزی کا بیان ہے:

فلما قام هارون الرشيد بالخلافة ولى القضاء ابايوسف يعقوب بن ابراهيم احد اصحاب ابى حنيفة رحمة الله عليه بعد سنة سبعين ومائة فلم يقلد بلاد العراق وخراسان والشام ومصر الا من اشاربه القاضى ابويوسف ۔(ج۴ص۱۸۱)

جب خلافت کی گدی پر ہارون رشید آیا، تو اس نے ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم کے سپرد منصب قضا کر دیا، یہ ابو یوسف امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں تھے اور واقعہ ۱۷۰ھ کے بعد کا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراق، خراسان، شام مصر میں کوئی قاضی مقرر نہیں ہو سکتا تھا، لیکن وہی جس کے متعلق ابو یوسف رائے دیتے۔

حافظ ابن عبدالبر کے حوالہ سے قرشی نے نقل کیا ہے:

كان اليه تولية القضاء فى الآفاق من الشرق الي الغرب ۔(جواہر ج۲ ص۲۲۰)

قاضی ابو یوسف ہی کے اختیار میں تھا، کہ مشرق سے مغرب تک قاضیوں کا تقرر کریں۔

ہارون رشید کے زمانے میں سب سے پہلی بار یہ عہدہ قائم ہوا اور چیف جسٹس کے عہدہ پر قاضی ابو یوسف اس حیثیت

سے فائز ہوئے کہ قاضیوں کا تقرر، خلفا کے ہاتھ سے نکل کر ان کے ہاتھ میں آ گیا، اس طرح عدلیہ حکومت کے دباؤ سے تقریبا آزاد ہوگئی۔ اس عہدہ جلیل پر ہارون رشید نے بڑے غور و خوض اور تلاش و جستجو کے بعد ابو یوسف کو تجویز کیا تھا، اس نے اچھی طرح قاضی ابو یوسف کے علم و تقویٰ، دیانت و فراست اور صلاحیت قضا کا اندازہ کرلیا تھا، چنانچہ قاضی ابو یوسف کے بعض حاسدین نے آپ کا غیر معمولی اختیار و اقتدار دیکھ کر جب خلیفہ سے شکایت کی، تو ہارون نے جواب میں کہا:

عن معرفة منی بـه فعلت ذلك وعن تجربة واللہ مامتحنته فی باب من ابواب العلم الا وجدته كاملا فيه ومع ذلك استقامة فی المذهب وصيانة فی الدين هاتو الی مثله۔

(موفق ج ۲ ص ۲۳۱)

میں نے جو کچھ کیا ہے، جان بوجھ کر کیا ہے کافی تجربوں کے بعد میں اس فیصلہ پر پہنچا ہوں، خدا کی قسم علم کے جس باب میں بھی میں نے اس شخص کو جانچا، اس میں کامل اور ماہر پایا، ان علمی امتیازات کے ساتھ ساتھ میں نے مذہب میں اس شخص کے قدم کو استوار پایا ہے، میں آلودگیوں سے اس کے دین کو محفوظ پاتا ہوں۔ آخر کوئی آدمی قاضی ابو یوسف کے جیسا ہو تو پیش کرو۔

امام اعظم کے برگزیدہ فقیہ و مجتہد تلامذہ نے جب عدلیہ کی ذمے داریاں ہاتھوں میں لیں، تو وہ شرعی احکام کے بیان اور فیصلہ مقدمات میں خود کو تمام تر سلطانی اثر سے بے نیاز رکھتے اور حکم وہی سناتے جو اللہ و رسول کی خوش نودی کا سبب ہے، چاہے ان فیصلوں سے خواص و امرا حتی کہ خلفا بھی ناراض کیوں نہ ہو جائیں۔ انہوں نے حالات کے سانچے میں ڈھلنے کے بجائے حالات کو منہاج شریعت پر چلانے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں امام اعظم کے تلامذہ کے کچھ فیصلے اور خلفاے وقت کے خلاف فیصلہ مقدمات کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں، جو تاریخ اسلام کا بڑا ہی سبق آموز باب ہے۔

خلیفہ ہادی کے زمانے میں جب کہ قاضی ابو یوسف صرف بغداد کے مشرقی خطے کے قاضی تھے، ایک باغ کے معاملہ میں خود ہادی سے کسی آدمی کا جھگڑا تھا، پہلی بات تو یہ ہے کہ ہادی نے حکم دیا کہ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہو، خلیفہ کی طرف سے بعض لوگوں نے قاضی صاحب کے اجلاس میں شہادت ایسی ادا کی، کہ اس شہادت پر اگر بھروسہ کیا جاتا تو باغ خلیفہ ہی کے قبضہ میں رہ جاتا، قاضی ابو یوسف کو تحقیق سے معلوم ہوگیا تھا، کہ دراصل باغ اسی بے چارے کا ہے، جس کے خلاف گواہوں نے گواہی دی ہے، اس وقت ایک تدبیر ان کی سمجھ میں آئی، مقدمہ کو اس وقت تو ملتوی کردیا، ہادی سے ملاقات ہوئی، اس نے پوچھا کہیے، اس مقدمہ میں آپ نے کیا فیصلہ کیا، جو میری طرف سے عدالت میں دائر کیا گیا ہے، قاضی صاحب نے کہا جی ہاں! آپ کے گواہوں کی شہادتیں تو گزری ہیں، لیکن فریق مخالف کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہے، مدعی (خلیفہ) سے اس بات پر حلف لیا جائے کہ ان کے گواہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے، سچ بیان کیا ہے، ہادی نے پریشان ہو کر پوچھا، پھر آپ کی کیا رائے ہے، حالاں کہ حنفی مذہب میں مدعی علیہ کو اس قسم کے مطالبہ کا حق نہیں، خود قاضی صاحب کی

رائے بھی یہی تھی، لیکن جواب میں خلیفہ سے انہوں نے کہا، کہ ابن ابی لیلیٰ کا فتویٰ یہی تھا، یہ سننے کے ساتھ ہی ہادی نے کہا کہ باغ مدعی علیہ کے حوالے کر دیجیے اور حلف لینے سے اس نے انکار کیا۔ (مناقب ابی حنیفہ ج اص ۴۷۵)

امام ابو یوسف نے وقت کے سب سے بڑے حکمران کے سامنے بھی اپنے علم و وقار کو اقتدار سے بالا رکھا، ایک مجلس میں خلیفہ ہارون رشید نے قاضی صاحب سے کہا:

اتدری مع من حضرت؟

تمہیں پتہ ہے کہ تم کس کے ساتھ ہو؟

مقصد اپنے منصب خلافت پر فخر تھا، امام ابو یوسف نے برجستہ جواب دیا آپ کو پتہ ہے، آپ کس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہارون رشید نے کہا، ہاں! ابو یوسف کے ساتھ امام ابو یوسف نے کہا، اگر آپ کو اپنے نسب پر فخر ہے کہ ہاشمی ہیں تو ہزاروں لوگ آپ کی طرح ہاشمی النسب موجود ہیں اور میں دنیا میں اپنے وقت کا تنہا فرد ہوں، خلیفہ نے کہا کاش کہ میں خلیفہ نہ ہوتا ایک قاضی ہوتا، اور میرے پاس علم کی دولت ہوتی۔ (ایضاص ۴۸۲)

قاضی ابو یوسف جس منصب قضا پر فائز تھے، محض عدالت عالیہ کے حاکم اعلیٰ کا نہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ وزیر قانون کے فرائض بھی تفویض کیے گئے، مقدموں کے فیصلے، قضاۃ کے تقرر کے ساتھ ساتھ سلطنت کے تمام داخلی و خارجی معاملات میں قانونی رہنمائی بھی ان کا کام تھا، اس طرح آپ کو ایک وسیع دائرہ عمل میسر آیا، جہاں اس وقت کی سب سے بڑی سلطنت کے معاملات سے عملاً سابقہ درپیش تھا، اس طرح انہیں فقہ حنفی کو واقعی حالات پر منطبق کر کے اسے زیادہ سے زیادہ ایک علمی نظام قانون بنانے کا موقع مل گیا۔

قاضی یحییٰ بن اکثم

عہد مامون کے قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم کا یہ حال تھا، کہ وہ مامون کے دل و دماغ پر چھا گئے تھے، جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے:

اخذ بمجامع قلبه حتى قلده قضاء القضاة وتدبير مملكته فكانت الوزراء لا تعمل في تدبير الملك شيئا الا بعد مطالعة يحيیٰ بن اكثم ۔(خطيب ص ۱۹۸)

اس نے حکومت کے معاملات میں بھی آپ کو دخیل کر لیا وزراء حکومت کسی تجویز پر اس وقت تک عمل نہ کرتے، جب تک کہ قاضی یحییٰ بن اکثم کی نظر سے وہ تجویز گزر نہ جائے۔

قاضی یحییٰ بن اکثم نے اپنے اس اقتدار و رسوخ سے حکومت کو ایک ایسے فیصلے سے روک دیا، جس سے معاشرہ میں فحاشی کا بازار گرم ہو جاتا اور بدکرداری کا سیلاب پاکیزہ اسلامی قدروں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا۔ متعہ جس کی حرمت کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بار دیا، لوگوں نے خلیفہ مامون کو یہ باور کرایا کہ اس کے جد اعلیٰ عبد اللہ بن

عباس رضی اللہ عنہما متعہ کو جائز قرار دیتے تھے، چنانچہ اس نے بزور طاقت متعہ کو حدود مملکت میں رائج کرنے کا ارادہ کرلیا، قاضی یحییٰ بن اکثم کو معلوم ہوا تو دربار میں حاضر ہوئے، مامون نے پوچھا آپ کا چہرہ کیوں غمزدہ ہے؟ بولے مسلمانوں کے لیے زنا جب حلال کردیا جائے تو اس سے زیادہ صدمہ کی بات اور کیا ہوسکتی ہے، زنا کے حلال ہونے کا فتویٰ مامون نے پوچھا قاضی صاحب نے کہا ہاں زنا ہی کا فتویٰ مامون نے کہا تم کس دلیل سے کہتے ہو قاضی نے قرآن کی مشہور آیت تلاوت کی جس میں بیویوں اور لونڈیوں کے علاوہ دوسری عورتوں کو حرام قرار دیا گیا ہے، پھر کہا بتایئے متاعی عورت شرعی لونڈی تو ظاہر ہے کہ نہیں ہے اور ازواج میں بھی اس کو شریک نہیں کرسکتے کیوں کہ قرآن نے زوج کو شوہر کا اور شوہر کو زوج کا وارث قرار دیا ہے، متاعی عورت نہ وارث ہوتی ہے اور نہ متعہ کرنے والا اس کا وارث ہوتا ہے، مامون یہ سن کر حیران رہ گیا، پھر قاضی صاحب نے حضرت علی کی یہ حدیث سنائی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حضرت علی نے متعہ کی حرمت کو منسوب کیا ہے، مامون نے بروقت رہنمائی کی وجہ سے قاضی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ارادے سے باز رہا۔ (خطیب ص ۱۹۸)

قاضی احمد بن بدیل

مرو کے قاضی احمد بن بدیل کی عدالت میں ترکی جنرل بغا کے بیٹے موسیٰ کا ایک مقدمہ پیش ہوا، معاملہ یہ تھا، کہ موسیٰ ایک جائیداد لینا چاہتا تھا، جس میں کسی یتیم کا حصہ بھی تھا، موسیٰ بن بغا کے سکریٹری عبیداللہ بن سلیمان کا بیان ہے کہ میں نے قاضی ابن بدیل کو باصرار آمادہ کرنا چاہا، کہ موسیٰ کی جلالت قدر کا خیال کرتے ہوئے یتیم کے سلسلے میں ذرا سی چشم پوشی سے کام لیں، لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے تب میں نے جھلا کر کہا، قاضی تمہیں معلوم ہے کس کا معاملہ ہے؟ ’’**انہ موسیٰ بن بغا**‘‘ موسیٰ بن بغا کا معاملہ ہے، قاضی نے کہا ’’**اعزك الله انه تبارك وتعالى** ‘‘ خدا تیری عزت کو قائم رکھے ادھر تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا معاملہ ہے راوی کہتے ہیں کہ شرم سے میری گردن جھک گئی اور میں نے موسیٰ کے سامنے قاضی کے اس جملہ کو دہرایا تو وہ بھی اس درجہ متاثر ہوا کہ ’’**انه تبارك وتعالىٰ**‘‘ کے الفاظ کو بار بار دہراتا رہا اور روتا رہا۔ (المنتظم ج ۵ ص ۹)۔

* * *

فقہ حنفی کے اساسی اصول

امام اعظم کا مجتہد مطلق ہونا ایک نا قابل انکار حقیقت ہے، ان کی مجتہدانہ حیثیت کو علما وفقہا نے ہر دور میں تسلیم کیا، اس کے برخلاف آپ کی اجتہادی قوت وصلاحیت کا منکر شاید ہی مل سکے۔ علما وفقہا کا اس بات پر اتفاق ہے، کہ اجتہاد کے مقام پر وہی متبحر عالم فائز ہوسکتا ہے، جو قرآن وحدیث، مذاہب سلف، لغت اور قیاس میں کافی دستگاہ رکھتا ہو، یعنی مسائل شرعیہ کے متعلق جس قدر قرآن میں آیتیں ہیں، جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، لغت کا علم جس قدر درکار ہے، سلف کے جو اقوال ہیں، قیاس کے جو طریق ہیں، سب اچھی طرح جانتا ہو، ان چیزوں میں سے کسی چیز میں کمی ہے، تو وہ مجتہد نہیں۔ اسے دوسرے مجتہدین کی تقلید کرنی چاہیے۔ امام اعظم قرآن وسنت قضایائے صحابہ وتابعین کے اجماع امت، لغت وادب، قیاس ورائے کا مکمل علم رکھتے تھے اور انہوں نے فقہ حنفی کا ایوان انہیں اہم اصولوں پر قائم کیا، ابوجعفر شیرامازی نے بسند متصل امام اعظم کا یہ قول نقل کیا ہے:

> كذب والله وافترى علينا من يقول عنا اننا نقدم القياس على النص وهل يحتاج بعدالنص الى قياس وكان رضى الله عنه يقول نحن لانقيس الا عند الضرورة الشديدة وذلك اننا ننظر اولا فى دليل تلك المسئلة من الكتاب والسنة او اقضية الصحابة فان لم نجد دليلا قسنا حينئذ سكوتا عنه على منطوق به بجامع اتحاد العلة بينهما ۔ (المیزان ص ۱۱۰)
>
> بخدا وہ شخص جھوٹا ہے اور اس نے ہم پر بہتان لگایا جو کہتا ہے کہ ہم نص پر قیاس کو مقدم کرتے ہیں، کیا نص کے بعد بھی قیاس کی کوئی ضرورت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ہم سخت ضرورت کے وقت ہی قیاس کرتے ہیں، ہم مسئلہ دائرہ میں پہلے کتاب پھر سنت اس کے بعد صحابہ کے فیصلے کو دیکھتے ہیں، اگر ہمیں ان میں کوئی دلیل نہ ملے، تو علت جامعہ کو بنیاد بنا کر حکم منطوق پر حکم مسکوت کو قیاس کرتے ہیں۔

ابو مطیع بیان کرتے ہیں:

> كنت يوما عندالامام ابى حنيفة فى جامع الكوفة فدخل عليه سفيان الثورى ومقاتل بن حيان وحماد بن سلمة وجعفر الصادق وغيرهم من الفقهاء فكلموا الامام اباحنيفة وقالو

قد بلغنا انك تكثر من القياس في الدين وانا نخاف عليك منه فان اول من قاس ابليس فناظرهم الامام من بكرة نهار الجمعة الى الزوال وعرض عليهم مذهبه وقال انى اقدم العمل بالكتاب ثم بالسنة ثم باقضية الصحابة مقدما ما اتفقوا عليه على مااختلفوا فيه وحينئذ اقيس فقاموا كلهم وقبلوا يده وركبته وقالوا له انت سيد العلماء فاعف عنا فيما مضى منا من وقيعتنا فيك بغير علم فقال غفر الله لنا ولكم اجمعين۔ (ایضا)

ایک دن میں امام اعظم کی بارگاہ میں کوفہ کی جامع مسجد کے اندر حاضر تھا، آپ کے پاس سفیان ثوری، مقاتل بن حیان، حماد بن سلمہ اور جعفر صادق وغیرہ فقہاے کرام تشریف لائے اور انہوں نے امام اعظم سے کہا، ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ آپ دین میں بکثرت قیاس کرتے ہیں، ہمیں آپ کے اوپر اندیشہ ہے اس لیے کہ سب سے پہلے قیاس ابلیس نے کیا تھا، تو آپ نے ان علما سے جمعہ کی صبح سے لے کر ظہر تک مناظرہ کیا اور اپنے مذہب کو پیش کیا اور فرمایا، میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں، پھر سنت نبوی اور پھر صحابہ کے متفقہ فیصلوں پر اگر ان کے فیصلے باہم مختلف ہوں تو قیاس کرتا ہوں یہ سن کر علماے کرام کھڑے ہوئے اور آپ کے ہاتھ اور گھٹنوں کو چوما اور فرمایا آپ علما کے سردار ہیں ماضی میں جو کچھ ہم نے آپ کے متعلق ناروا باتیں کہیں وہ لاعلمی تھی، آپ اسے معاف کر دیں، آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ کی مغفرت فرمائے۔

ابو جعفر منصور نے امام ابو حنیفہ سے کہا، مجھے خبر پہنچی ہے، کہ آپ قیاس کو حدیث پر مقدم کرتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا، ایسی کوئی بات نہیں ہے:

> **انما اعمل اولا بكتاب الله ثم بسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم باقضية ابى بكر. وعمر وعثمان وعلى رضى الله عنهم ثم باقضية بقية الصحابة ثم اقيس بعد ذلك اذااختلفوا وليس بين الله وبين خلقه قرابة**۔ (ایضا ص ۱۱۱)

میں سب سے پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں، پھر سنت رسول پر پھر ابو بکر، عمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے فیصلوں پر پھر بقیہ صحابہ کے فیصلوں پر اس کے بعد قیاس کرتا ہوں اگر یہ لوگ مختلف ہو جائیں اور اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی قرابت نہیں ہے (اللہ کے دین میں کسی کی رعایت نہیں کی جاتی)

ان شہادتوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ امام اعظم کا فقہی اجتہاد محض قیاس ورائے پر مبنی نہیں جیسا کہ بعض کج فہم لوگ خیال کرتے ہیں، رہی بات سخت ضرورت کے وقت جب نصوص خاموش ہوں، کتاب وسنت میں دوسرے احکام کی روشنی میں قیاس کو امام اعظم حجت شرعی قرار دیتے ہیں، جب کہ دونوں مسئلوں کی علتیں مشترک ہوں اور ایسا قیاس تو امام صاحب کے علاوہ دوسرے بہت سارے ائمہ مجتہدین نے کیا ہے۔ علامہ عبد الوہاب شعرانی تحریر کرتے ہیں:

لا خصوصية للامام ابى حنيفة فى القياس بشرط المذكور بل جميع العلماء يقيسون فى مضايق الاحوال اذا لم يجدوا فى المسئلة نصا من كتاب ولاسنة ولا اجماع ولا اقضية الصحابه و كذلك لم يزل مقلدهم يقيسون الى وقتنا هذا فى مسئلة لا يجدون فيها نصا من غير نكير فيما بينهم بل جعلوا القياس احدالادلة الاربعة فقالو الكتاب والسنة والاجماع والقياس وقد كان الامام الشافعى يقول اذا لم نجد فى المسئلة دليلا قسناها على غيرها ۔ (الميزان ص ۱۱۲)

شرط مذکور کے ساتھ قیاس کرنا تنہا امام اعظم کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ تمام علما جب پیش آمدہ مسئلہ میں کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع امت اور صحابہ کے فیصلوں میں صراحت نہیں پاتے تو اس مشکل وقت میں قیاس کرتے ہیں، اسی طرح بلا اختلاف آج تک مقلدین ہر اس مسئلہ میں قیاس کرتے ہیں، جس میں نص نہیں پاتے بلکہ ائمہ نے تو قیاس کو چار دلائل میں سے ایک دلیل قرار دیا ہے، چنانچہ ان لوگوں نے کہا فقہ کی بنیاد کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع امت اور قیاس پر ہے۔ امام شافعی کہا کرتے تھے، جب ہم کسی مسئلہ میں کوئی دلیل نہیں پاتے تو اس مسئلہ کو دوسرے مسائل پر قیاس کرتے ہیں۔

ذیل میں امام اعظم کے مجتہدات کے بنیادی اصول پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) اللہ کی نازل کردہ کتاب قرآن مجید فرقان حمید (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال وتقریرات (۳) حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل اور ان کے فتاوی (۴) اجماع یعنی اہل علم کا کسی دور میں کسی مسئلہ پر اتفاق کرلینا (۵) قیاس یعنی کسی ایسے مسئلہ کا حکم جس کا بیان نہیں آیا ہے کسی ایسے مسئلہ سے نکالنا جس کا حکم معلوم ہو۔ (۶) استحسان علما نے فرمایا ہے، قیاس کی ایک قسم جلی اور واضح ہے اور اس کا اثر ضعیف ہوتا ہے اور دوسری قسم خفی اور غیر واضح ہے، لیکن اس کا اثر قوی ہوتا ہے پہلی قسم کو قیاس کہتے ہیں اور دوسری قسم کو استحسان (۷) وہ مروج طریقہ ہے جس پر بندگان خدا کا تعامل ہو۔

علامہ ابن حجر ہیتمی نے لکھا ہے:

اعلم انه يتعين عليك ان لا تفهم من اقوال العلماء عن ابى حنيفة واصحابه انهم اصحاب الراى ان مرادهم بذلك تنقيصهم ولا نسبتهم الى انهم يقدمون رايهم على سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا على قول اصحابه انهم براء من ذلك فقد جاء عن ابى حنيفة من طرق كثيرة ماملخصه انه اولا ياخذ بما فى القرآن فان لم يجد فبالسنة فان لم يجد فبقول الصحابة فان اختلفوا اخذ بما كان اقرب الى القرآن او السنة من اقوالهم ولم يخرج عنهم فان لم يجد لاحد منهم قولا لم ياخذ بقول احد من التابعين بل يجتهد كما

اجتھدوا (الخیرات الحسان ص ٦٢)

جان لو علما کی اس بات سے کہ ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اہل رائے ہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ علمانے ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی تنقیص کی ہے یا یہ نہ سمجھ لے کہ یہ حضرات اپنی رائے کو سنت پر ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ حضرت امام ابوحنیفہ سے یہ بات متعدد طریقوں سے کثرت کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ پہلے قرآن مجید سے لیتے ہیں، اگر قرآن میں حکم نہیں ملتا ہے تو سنت سے لیتے ہیں اور اگر سنت میں نہ ملا تو حضرات صحابہ کا قول لیتے ہیں اور اس قول کو لیتے ہیں جو قرآن یا سنت کے زیادہ قریب ہو اور اگر صحابہ کا قول نہیں ملتا تو آپ تابعین کے قول کے پابند نہیں رہتے بلکہ آپ بھی اجتہاد کرتے ہیں جیسا کہ تابعین نے اجتہاد کیا ہے۔

عبداللہ بن مبارک نے ابوحنیفہ سے روایت کی ہے:

عجبا للناس یقولون افتی بالرای ما افتی الا بالاثر (ایضا)

لوگوں پر تعجب ہے کہ وہ میرے متعلق کہتے ہیں کہ میں اپنی رائے پر فتویٰ دیتا ہوں میں تو اثر پر فتویٰ دیتا ہوں۔

ابن مبارک نے امام اعظم سے یہ بھی روایت کی ہے:

لیس لاحد ان یقول برائه مع کتاب الله تعالیٰ ولا مع سنة رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا مع ما اجمع علیه اصحابه واما مااختلفوا فیه فنتخیر من اقاویلهم اقرب الی کتاب الله تعالیٰ او الی السنة ونجتهد وما جاوز ذلك فالاجتهاد بالرای لمن عرف الاختلاف وقاس وعلی هذا کانوا۔ (ایضا ص ٦٣)

کتاب اللہ میں حکم ہوتے ہوئے کسی کو اپنی رائے سے بولنے کا حق نہیں ہے اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ہوتے ہوئے کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے اور اسی طرح حضرات صحابہ کے اجماع کے ہوتے ہوئے کسی کو بولنے کا حق نہیں البتہ جس امر میں صحابہ کا اختلاف ہوا ہے تو ہم اس قول کو لیتے ہیں جو قرآن کے قریب تر ہو اس کے بعد ہی قیاس کیا جاتا ہے اور اپنی رائے سے اجتہاد وہ شخص کر سکتا ہے جس کو اختلاف کا علم ہو اور قیاس کو جانتا ہو اسی پر ائمہ کا عمل تھا۔

وسمعه رجل یقایس آخر فی مسئلة فصاح دعوا هذه المقایسة فان اول من قاس ابلیس فاقبل الیه ابوحنیفة فقال یا هذا وضعت الکلام فی غیر موضعه ابلیس رد بقیاسه علی الله تعالیٰ امره کما اخبر تعالیٰ عنه فی کتاب فکفر بذلك وقیاسنا اتباع لامر الله تعالیٰ لاننا نرده الی کتابه وسنة رسوله او اقوال الائمة من الصحابة والتابعین فنحن ندور حول الاتباع فکیف نساوی ابلیس لعنه الله فقال له الرجل غلطت وتبت فنورالله قلبك کما نورت

قلبی ۔(ایضا)

ایک دن ابوحنیفہ کسی سے قیاس کے سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے، وہاں ایک شخص بیٹھا تھا وہ چلا کر بولا اس قیاس بازی کو چھوڑ دو کیوں کہ پہلا قیاس ابلیس نے کیا تھا حضرت امام نے اس سے کہا، ابلیس نے اپنے قیاس سے اللہ کے حکم کو رد کیا ہے، جس کا بیان اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے، لہذا ابلیس کافر ہوا اور ہمارا قیاس اللہ کے امر کی پیروی کے لیے ہے کیوں کہ ہم مسئلہ کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اور ائمہ صحابہ وتابعین کے اقوال کی طرف لے جا رہے ہیں، ہم فرماں برداری کے سلسلے میں گھوم رہے ہیں، بھلا ہم کس طرح ابلیس ملعون کے مساوی ہو سکتے ہیں، یہ سن کر اس شخص نے کہا مجھ سے غلطی ہو گئی، میں توبہ کرتا ہوں اللہ آپ کے دل کو منور کرے۔ جس طرح آپ نے میرے دل کو منور کیا۔

کتاب اللہ

قرآن حکیم دین اسلام کی دستوری و آئینی کتاب ہے، جو اعتقادیات، عملیات، نصائح واقعات کا مجموعہ ہے، جس سے دین وشریعت کے احکام حاصل کیے جاتے ہیں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّرَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۔

(النحل ۱۶/۸۹)

ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے جو دین کی ہر بات بیان کرتی ہے اور ہدایت، رحمت، بشارت ہے مسلمانوں کے لیے۔

قاضی بیضاوی اس آیت کریمہ کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

بیانا بلیغا من امور الدین علی التفصیل او الاجمال بالاحالة الی السنة والقیاس ۔ (بیضاوی شریف ج ۱ ص ۵۵۴)

قرآن دینی امور میں سے ہر چیز کا پورا بیان، تفصیلاً یا اجمالاً یا سنت اور قیاس کے حوالے کے ذریعہ۔

ائمہ مجتہدین نے فقہ اسلامی کی اساس قرآن حکیم کو قرار دیا، کیوں کہ فقہ کا بنیادی ماخذ قرآن کریم ہی ہے، یہ اصول و کلیات کی کتاب ہے، جس میں الٰہی حکمت عملی اور دستور سے بحث ہے، جزوی قوانین کی تفصیل بہت کم ہے علامہ شاطبی کہتے ہیں:

القرآن علی اختصاره جامع ولایکون جامع الا والجمجموع فیه امور کلیات لان الشریعه تمت بتمام نزوله لقوله تعالیٰ الیوم اکملت لکم دینکم ۔

قرآن حکیم مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور یہ جامعیت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ اس میں کلیات بیان

ہوئے ہوں کیوں کہ شریعت اس کے نزول کے ساتھ کامل ہوگئی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا۔ (الموافقات ج۳ ص۳۶۷)

فقہا و مجتہدین نے قرآن حکیم کی پانچ سو آیات کریمہ سے فقہی احکام و مسائل مستنبط کیے ہیں اور قرآن سے استنباط مسائل کے لیے فقیہ و مجتہد درج ذیل امور کو مدنظر رکھتا ہے۔

(۱) ناسخ و منسوخ کا علم (۲) مجمل و مفسر کا علم (۳) خاص و عام کا علم (۴) محکم و متشابہ کا علم (۵) اس بات کا علم بھی ضروری ہے کہ عمل میں لانے کی جو باتیں ہیں وہ کس درجے کی ہیں فرض، واجب، سنت، مستحب وغیرہ اور نہ کرنے کے متعلق جو ہیں ان کی کیا نوعیت ہے، حرام و مکروہ وغیرہ (عقد الجید ص ۶)

قرآن اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے جو فصاحت و بلاغت میں آپ ہی اپنی مثال ہے، اس مبارک کتاب سے وہی شخص حکم بیان کر سکتا ہے جو علوم عربیہ سے پوری طرح واقف ہو خاص و عام، مشترک و مؤول کو پہچانتا ہو اور ظاہر و نص کی تمیز کرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ یہ مفسر ہے یا محکم اور اس کا جو بیان کیا گیا ہے وہ حقیقی ہے یا مجازی اور وہ صریح ہے یا کنائی اور جو استدلال کیا گیا ہے وہ نص عبارت ہے یا اشارہ ہے وہ دلالت و اقتضا کے فرق کو بھی سمجھتا ہو۔

سنت

قرآن حکیم کے بعد فقہ اسلامی کا ماخذ و مصدر حدیث و سنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور تقریرات پر مشتمل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث قرآن کے اجمالی بیان کی تفصیل ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (النحل: ۱۶/ ۴۴)

اور ہم نے آپ پر ذکر (قرآن) نازل کیا تا کہ جو تعلیم لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے وہ ان پر واضح کر دیں اور تا کہ وہ لوگ غور و فکر کریں۔

حدیث رسول کے حجت شرعی ہونے کا ثبوت قرآن حکیم کی متعدد آیتوں سے عیاں ہے چنانچہ فرمان الٰہی ہے:

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ (الحشر: ۵۹/ ۷)

رسول جو تمہیں دیں لے لو جس سے منع کریں باز آ جاؤ۔

خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ما امرتکم به فخذوه وما نهيتکم عنه فانتهوا (ابن ماجہ ص ۲)

میں تمہیں جس چیز کا حکم دوں اسے بجا لاؤ اور جس سے روک دوں اس سے باز آ جاؤ۔

امت اسلام کا یہ متفقہ اجماعی مسئلہ ہے کہ قرآن کے بعد حدیث رسول حجت شرعی ہے، قرآن حکیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا غیر مشروط حکم دیا گیا ہے، حضرت ابوبکر صدیق حدیث رسول کو حجت شرعی تسلیم کرتے تھے

اور اس کی روشنی میں فیصلے صادر فرماتے:

کان ابوبکر اذورد علیه حکم نظر فی کتاب الله تعالیٰ فان وجد فیه مایقضی به قضی به وان لم یجد فی کتاب الله نظر فی سنة رسول الله فان وجد فیها مایقضی به قضی به فان اعیاه ذلك فسال الناس هل علمتم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قضی فیه قضاء فربما قام الیه القوم فیقولون قضی فیه بکذا و کذا ۔(حجۃ اللہ البالغہ ج۱)

حضرت ابوبکر کے سامنے جب کوئی قانونی معاملہ آتا تو وہ قرآن حکیم میں اس کا حل تلاش کرتے اگر وہاں نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے اگر سنت میں بھی نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس معاملے میں رسول اللہ کے فیصلہ کا کس کو علم ہے بسا اوقات صحابہ میں کچھ لوگ بتا دیتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں یہ فیصلہ فرمایا ہے۔

حضرت ابوبکر کے علاوہ حضرت عمر، عثمان، علی اور دیگر صحابہ و تابعین کا یہی طرز عمل رہا جسے امام اعظم ابوحنیفہ نے اختیار فرمایا اور وہ صحیح حدیث کے مقابلے میں اپنی رائے کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔

حسن بن صالح کہتے ہیں:

کان ابوحنیفة شدیدالفحص عن الناسخ من الحدیث والمنسوخ فیعمل بالحدیث اذاثبت عنده عن النبی صلی الله علیه وسلم وعن اصحابه وکان عارفا بحدیث اهل الکوفة وفقه اهل الکوفة شدید الاتباع لما کان علیه الناس ببلده وکان یقول ان لکتاب الله ناسخا ومنسوخا وان للحدیث ناسخا ومنسوخا وکان حافظا لفعل رسول الله صلی الله علیه وسلم الاخیر الذی قبض علیه مما وصل الی اهل بلد ۔(مناقب موفق ج۱ص۸۹)

ابوحنیفہ ناسخ اور منسوخ حدیثوں کی شدت کے ساتھ جستجو کرتے تھے، وہ حدیث پر عمل کرتے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے ثابت ہو جاتی تھی اور آپ اہل کوفہ کی حدیث اور ان کی فقہ کے عارف تھے اور اپنے شہر والوں کے طریقہ کے سختی کے ساتھ پابند تھے اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ کتاب اللہ میں ناسخ و منسوخ ہے اور حدیث میں بھی ناسخ و منسوخ ہے اور آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری فعل پر جس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تھی نظر رکھتے تھے ان افعال میں سے جو ان کے شہر والوں کو پہنچا۔

اقوال صحابہ

اقوال صحابہ بھی امام اعظم کے نزدیک مصدر شریعت ہیں، ان کا ارشاد ہے:

’’اذا جاء عن الصحابة تخيرنا ‘‘جب ہمارے پاس صحابہ کے اقوال آجائیں تو ہم ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں گے، اگر کتاب اللہ میں اور سنت رسول میں حکم نہیں ملتا تو میں صحابہ کے اقوال میں سے کسی کا حکم لیتا ہوں اور ان کے دائرہ اقوال سے باہر نہیں نکلتا ہوں۔

حنفی اصول فقہ کی کتابوں میں بھی اسے تسلیم کیا گیا ہے۔ امام سرخسی لکھتے ہیں:

عن ابی سعید البردعی انه کان یقول قول واحد من الصحابة مقدم علی القیاس یترك القیاس بقوله وعلی هذا ادرکنا مشائخنا .(اصول سرخسی ج ۲ ص ۱۰۵)

ابوسعید بردعی کہا کرتے تھے، کہ صحابہ کرام کا قول قیاس پر مقدم ہے اور صحابی کے قول کی موجودگی میں قیاس کو ترک کر دیا جاتا ہے اور اسی پر ہم نے اپنے مشائخ کو پایا ہے۔

امام اعظم کے نزدیک اقوال صحابہ قیاس و اجتہاد پر مقدم ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کا امکان و احتمال موجود ہے، کہ صحابی نے جو بات کہی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو کیوں کہ صحابہ کی عادت تھی کہ ان میں سے جس کے پاس کوئی نص ہوتی وہ کبھی تو اسے نقل کر دیتا اور کبھی نقل کیے بغیر اس کے مطابق فتویٰ دیتا تھا۔

شمس الائمہ سرخسی نے کہا ہے کہ دلائل سے ثابت ہے کہ حضرات صحابہ کے اقوال کا لینا ہر حال میں واجب ہے، اللہ نے فرمایا ہے:

والسابقون الاولون من المهاجرین والانصار والذین اتبعوهم باحسان .

(توبہ، آیت ۱۰۱)

اور جو لوگ قدیم ہیں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے بعد نیکی میں ان کی اتباع کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجر اور انصار صحابہ کی مدح کی ہے اور ان لوگوں کی مدح کی ہے جنہوں نے ان حضرات کی پیروی کی ہے ان کی پیروی کرنی مدح کا سبب ہے اور اس مدح اور پیروی کی وجہ سے اللہ ان کی اتباع کی طرف بلاتا ہے اور یہ اتباع اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ دین میں ان کی رائے کی پیروی کی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **انا امان لاصحابی واصحابی امان لامتی .**

میں اپنے صحابہ کے واسطے امان ہوں اور میرے صحابہ میری امت کے لیے امان ہیں۔

اجماع

فقہ حنفی کا تیسرا ماخذ اجماع ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں اجماع کسی معاملے میں اہل حل وعقد کے اتفاق کو کہتے ہیں، چنانچہ اصول کی کتابوں میں یہ تعریف مذکور ہے:

وھو اتفاق اھل الحل والعقد من امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی امرہ من الامور ۔(منھاج الاصول)

امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارباب حل وعقد کا کسی امر پر متفق ہو جانا۔

چنانچہ تمام فقہا کے نزدیک اجماع حجت شرعی ہے اس کا حجت ہونا حدیث واثر سے ثابت ہے۔ حدیث نبوی ہے:

لا تجتمع امتی علی ضلالۃ (تلخیص الجبیر ص ۲۸۹)

میری امت گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔

اور ارشاد گرامی ہے:

ماراى المسلمون حسنا فھو عنداللہ حسن ۔(ایضا ص ۵۴۳)

جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔

امام شافعی نے روایت کی ہے:

الا فمن سرہ بھجۃ الجنۃ فلیلزم الجماعۃ فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین ابعد ۔(الرسالہ ص ۴۷۴)

سمجھ لو جس کو جنت کی راحت پسند ہو وہ جماعت سے لگا رہے اکیلے کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور وہ دو سے دور رہتا ہے۔

حضرت ابوبکر فیصلہ طلب امور میں اہل علم کا جس بات پر اجماع ہوتا، اسے قبول فرما لیتے، حضرت عمر نے کوفہ کے قاضی شریح کو لکھا تھا:

فان جائك مالیس فی كتاب اللہ ولم یكن فیہ سنۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانظر مااجتمع علیہ الناس فخذ بہ ۔(سنن دارمی ج ۱ ص ۷۱)

اگر تیرے پاس ایسا معاملہ آجائے جس کا حکم قرآن میں مذکور نہ ہو اور اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت معلوم نہ ہو تو جس حکم پر لوگوں (اہل علم) نے اتفاق کرلیا ہو اسے تلاش کر کے اسی کے مطابق فیصلہ کرلیا کرو۔

حنفی اصول فقہ کے امام فخر الاسلام بزدوی فرماتے ہیں، اجماع سے ثابت شدہ حکم پر اعتقاد رکھنا واجب ہے اور اس پر عمل کرنا بھی لازم ہے اور قطعی اجماع سے انکار کفر ہے۔ (اصول البزدوی ص ۲۴۵)

امام صاحب نہ صرف یہ کہ اجماع کو حجت اور ماخذ شریعت تسلیم کرتے تھے، بلکہ آپ کی فقہ کی تدوین اجتماعی بحث وتدقیق کے طریقے پر ہوتی تھی اور آپ انفرادی رائے پر اجتماعی اجتہاد کو ترجیح دیتے تھے، کیوں کہ حضرت علی کے ایک سوال کے

جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

شاوروا فيه الفقهاء العابدين ولا تمض فيه رای خاصة .(مجمع الزوائد ج ا ص ۱۷۸)

ایسے معاملے میں جس کے متعلق قرآن وسنت سے کچھ معلوم نہ ہو سکے تو تم عبادت گزار فقہاء سے مشورہ کرلیا کرو اور کسی کی ذاتی رائے پر نہ چلو۔

قیاس

قیاس کا لغوی معنی اندازہ کرنا اور اصطلاح میں علت کو مدار بنا کر سابقہ فیصلہ اور نظیر کی روشنی میں نئے مسائل حل کرنے کو قیاس کہتے ہیں۔ چنانچہ نور الانوار میں ہے:

تقدير الفرع با لاصل في الحكم و العلة .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل کو حاکم بنا کر یمن بھیجنے کا قصد فرمایا آپ نے معاذ سے کہا ’’بما تقضی‘‘ ’’تم حکم کس سے کروگے؟ عرض کی کتاب اللہ سے آپ نے فرمایا ’’فان لم تجد‘ ’اگر کتاب اللہ میں حکم نہ ملا؟ عرض کی رسول اللہ کی سنت سے۔ آپ نے فرمایا ’فان لم تجد‘ ’اگر تم کو سنت رسول میں حکم نہ ملا؟ عرض کی ’’اجتهد برائی‘ ’اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، یہ سن کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحمد لله الذی وفق رسول رسوله بما يرضی به رسوله

حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے اپنے رسول کے قاصد کو توفیق اس بات کی دی کہ وہ اللہ کے رسول کو راضی کرے۔

شریعت کے احکام کی علتوں کا معلوم کرنا آسان کام نہیں ہے اس کے لیے اسباب نزول معلوم کرنا الفاظ کا عبارات کا اشارات کا سمجھنا ضروری ہے۔ شریعت کے احکام میں دینی اور دنیوی فوائد مضمر ہیں، علل کے معلوم کرنے سے ان فوائد سے استفادہ کا موقع ملتا ہے۔

قیاس کی حجیت پر روشنی ڈالتے ہوئے امام سرخسی فرماتے ہیں:

مذهب الصحابة ومن بعد هم من التابعين و الصالحين و الماضين من ائمة الدين جواز القياس بالرای علی الاصول التی تثبت احكامها بالنص لتعدية حكم النص الى الفروع جائز مستقيم يدان الله به وهو مدرك من مدارك احكام الشرع ولكنه غير صالح لاثبات الحكم به ابتداء . (اصول السرخسی ۲ ص ۱۱۸)

صحابہ، تابعین وصالحین اور ائمہ دین کا مسلک یہ ہے کہ ان اصولوں پر قیاس کرنا جن کے احکام نص سے ثابت ہوں جائز ہے تاکہ نص کا حکم فروع پر نافذ کردیا جائے، جس کے ذریعہ اللہ کی اطاعت کی جاتی ہے اور یہ شرعی احکام کے مآخذ میں سے ایک ماخذ ہے، لیکن قیاس ورائے میں ابتداء حکم کے اثبات کی صلاحیت موجود نہیں

ہے۔ قیاس کا رکن اصلی علت ہے اور علت وہ وصف ہے جو حکمت و مصلحت پر مشتمل ہو، جس کی بنا پر اصل کا حکم فرع پر جاری کیا جاسکتا ہے۔

مصادر شرعیہ میں قرآن وسنت اور اجماع اصول وکلیات ہیں جو اپنے ظاہری معنی میں محدود ہیں اور دوسری طرف معاشرہ کے پھیلاؤ کی وجہ سے نت نئے پیش آنے والے معاملات ومسائل ہیں ایسی صورت میں فطری طور پر اصول وکلیات اور تصریحی احکام کے عقلی مفہوم میں غور وفکر اور ان کی روح اور مغز سے واقفیت حاصل کر کے اس حد تک ان کے دامن کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر دور کے تقاضوں کو وہ اپنے اندر سمیٹ سکیں۔

خود صحابہ کرام نے ان مسائل میں اپنی رائے سے فتویٰ دیا، جن میں قرآن وسنت کی نص صریح موجود نہیں تھی۔ حضرت ابوبکر نے کلالہ کے بارے میں فرمایا:

اقول فيها برائي فان يكن صوابا فمن الله وان يكن خطا فمني ومن الشيطان ۔

میں اپنی رائے سے یہ بات کہتا ہوں اگر وہ صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری طرف سے اور شیطان کی طرف سے ہے۔ (منہاج الاصول بیان قیاس)

حضرت عمر سے ایک موقع پر حضرت عثمان نے کہا:

ان اتبعت رايك فسديد وان اتبعت راى من قبلك فنعم الراى .(ايضا)

اگر آپ اپنی رائے کی اتباع کریں تو ٹھیک ہے اور اگر اپنے پیش رووں کی اتباع کریں تو اور بہتر ہے۔

حضرت عمر نے ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ کی امارت پر مقرر کرتے وقت حکم دیا تھا:

اعرف الاشباه والنظائر وقس الامور برايك .(ايضا)

پیش آمدہ مسائل کے مشابہ فیصلہ اور نظیروں کی معرفت حاصل کرو اور ان پر اپنی رائے سے قیاس کرو۔

امام اعظم سلف کی طرح جب کتاب وسنت اور اقوال صحابہ میں مسئلہ کا حل نہ پاتے تو اجتہاد کرتے اور پیش آمدہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غائرانہ نظر ڈالتے، کبھی قیاس کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی استحسان پر عمل کرتے، لوگوں کی مصلحت اور عدم حرج آپ کے رہنما اصول تھے جنہیں کسی وقت نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔

استحسان

استحسان فقہ حنفی کا ایک اصول ہے، فقہا کی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ مسئلہ کے دو پہلو میں ایک کو کسی معقول دلیل کی بنا پر ترجیح دینا۔ اس کی تعریف میں فقہا کے مختلف الفاظ ہیں مگر سب کا مآل ایک ہی ہے۔

العدول عن قياس الى قياس اقوى .(كتا ب التحقيق)

ایک قیاس کو چھوڑ کر اس سے زیادہ قوی قیاس اختیار کرنا۔

الاستحسان ترك القياس بما هو ارفق للناس (المبسوط ج۱۰ ص۱۴۵)

قیاس کو ترک کر کے اس حکم کو اخذ کرنا جو لوگوں کے لیے زیادہ سازگار ہو استحسان کہلاتا ہے۔

طلب السهولة في الاحكام فيما يبتلى فيه الخاص والعام (ایضا)

ان احکام میں جو خاص عام سب کو پیش آتے ہیں، ان میں آسانی تلاش کرنا۔

استحسان درپیش مسائل کے حل کے لیے اسلامی شریعت کے مصادر و مآخذ میں سے ایک ہے، اس کی طرف اس وقت رجوع کیا جائے گا، جب عمومی احکام، عمومی نصوص یا قیاس کے ظاہری معنی پر عمل کرنے سے مقاصد شریعت میں سے کوئی مقصد متاثر ہو رہا ہو تو اس صورت میں متبادل شرعی دلیل پر عمل کر کے حکم اخذ کیا جائے گا۔

بحیثیت مجموعی استحسان کی ضرورت تین صورتوں میں پیش آتی ہے (۱) موقع و محل کا تعین (۲) نئے مسائل کی تحقیق (۳) دفع مشقت۔

اللہ تعالیٰ خود انسانوں کے لیے آسانی چاہتا ہے، فرماتا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۔(البقرہ:۲/۱۸۵)

اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خير دينكم اليسر (المبسوط ج۱۰ بحث استحسان)

تمہارے دین کی بہتری آسانی میں ہے۔

حضرت علی اور معاذ بن جبل کو یمن بھیجتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يسرا ولاتعسرا قربا ولاتنفرا ۔(مسند احمد)

آسان کرنا مشکل میں نہ ڈالنا لوگوں کو قریب لانا ان کو متنفر نہ کرنا۔

وضاحت کے لیے ایک مسئلہ لکھا جاتا ہے:

شکاری پرندوں کا جوٹھا پانی نجس ہے یا نہیں قیاس کی رو سے پانی نجس ہے کیوں کہ شکاری پرندوں کا حکم شکاری چوپایوں کا ہے دونوں کا گوشت نجس ہے لہٰذا دونوں کا جوٹھا پانی نجس ہونا چاہیے لیکن "**يسروا ولا تعسروا**" کے پیش نظر شکاری پرندوں کا جوٹھا پانی نجس نہیں ہے کیوں کہ پرندہ چونچ سے پانی پیتا ہے اور چونچ میں اس کا لعاب نہیں ہوتا ہے بر خلاف چوپائے کے کہ وہ ہونٹوں اور زبان سے پانی پیتا ہے اس کا لعاب پانی میں ملتا ہے اور پانی نجس ہو جاتا ہے لہٰذا شکاری پرندہ کا پانی کراہت کا متحمل ہے نجس نہیں ہے۔

تعامل وعرف

امام موفق سہل بن مزاحم سے روایت کرتے ہیں:

كلام ابی حنيفة اخذ بالثقة وقرار بالقبح والنظر فی معاملات الناس وما استقاموا عليه وصلحت عنه امورهم .

ابوحنیفہ کی بات یہ تھی کہ وہ مستند اور صحیح کو لیتے تھے اور برے سے دور رہتے تھے اور لوگوں کے معاملات پر نظر رکھتے تھے اور دیکھتے تھے کہ ان کا صحیح رویہ کیا ہے اور ان کے امور کس پہلو پر درست ہوتے ہیں۔

يمضی الامور علی القياس فاذاقبح القياس يمضيها علی الاستحسان ما دام يمضی له فاذا لم يمض له رجع الی ما يتعامل به المسلون .

حضرت امام قیاس کر کے مسئلہ حل کرتے تھے اور جب قیاس میں قباحت پیدا ہوتی تھی، استحسان سے حل کرتے جب تک کہ استحسان ساتھ دیتا تھا اور جب معاملہ حل نہ ہوتا آپ مسلمانوں کے طور طریقوں اور ان کے تعامل کی طرف رجوع کرتے۔ ٥

اس بیان سے دو باتیں ثابت ہوئیں کہ پہلے آپ قیاس اور استحسان سے مسئلہ حل کرنے کی سعی کرتے اور قیاس و استحسان سے راہ سہولت نہیں نکلتی، تو آپ لوگوں کے تعامل اور عرف سے مسئلہ حل کرتے تھے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ اصول ستہ (چھ اصول) کے بعد عرف سے حضرت امام استدلال کرتے تھے اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے ارشاد:

وما رای المسلمون حسنا فهو عندالله حسن .

جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھا ہے۔

سے عرف کا دلیل ہونا ثابت کرتے ہیں۔ (موفق بحوالہ سوانح بے بہا ص ۱۲۳)

* * *

فقہ حنفی کے ناقلین

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی قانون ساز مجلس میں جو اسلامی احکام ومسائل مرتب ومدون ہوئے انہیں آپ کے شاگرد قلم بند کیا کرتے اور اسے انہوں نے دوسروں تک پہنچانے کی سعی بلیغ کی، تلامذہ آپ کی مرویات کے ناقل ہوئے، ان میں سے ہر ایک ثقہ اور صاحب علم وفضل تھا، اس لیے ان کی مرویات پر اہل علم نے ہر دور میں اعتماد کیا، آپ کے فقہی آرا اور مسلک کو نقل کرنا بلاشبہ ایک عظیم خدمت دین ہے، جس کے ذریعے عالم اسلام میں فقہ حنفی کی اشاعت ہوئی، مجلس درس اور مجلس قانون ساز میں ہزاروں تلامذہ شریک ہوئے، ان میں سے بعض نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر زانوے ادب تہہ کیا، کچھ نے عرصہ تک کسب فیض کیا اور آپ کا طریق ومنہاج اخذ کرنے کے بعد وطن لوٹ گئے۔ بعض مستقلا وابستہ دامن رہے اور تا حین حیات آپ کو چھوڑ کر نہ گئے ایسے چھتیس نامور تلامذہ کے بارے میں امام صاحب نے ایک بار ارشاد فرمایا:

هؤلاء ستة وثلاثون رجلا منهم ثمانية وعشرون يصلحون للقضاء وستة يصلحون للفتوىٰ واثنان ابويوسف وزفر يصلحان لتاديب القضاة وارباب الفتوىٰ۔ (ابوحنیفہ، ابوزہرہ ص ۱۷۲)

یہ چھتیس آدمی ہیں، ان میں سے اٹھائیس قاضی بننے کے لائق ہیں، چھ مفتی بننے کے لائق ہیں اور ابویوسف، زفر قاضیوں اور مفتیوں کی تادیب واصلاح کی قابلیت رکھتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جن تلامذہ کو آپ نے قاضی، مفتی اور ان کے مربی بننے کے لائق بتایا ہے، ان کا علمی ذوق آپ کی زندگی میں اتنا کامل وپختہ ہو چکا تھا، کہ یہ لوگ بخیر وخوبی قضا وافتا اور قضاء القضاۃ کے مناصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے، چنانچہ امام صاحب کی وفات کے بعد جب حکومت اسلامیہ کے بلاد وامصار کی قضا کے عہدے ان شاگردوں کو پیش کیے گئے، تو انہوں نے بحسن وخوبی امام صاحب کے مدونہ قانون اسلامی اور اصول شریعت کی بنیادوں پر فتوے دیے، مقدمات کے فیصلے کیے اور ساتھ ہی اپنے زیر درس تلامذہ کو فقہ حنفی کے اصول وآئین اور امام اعظم کے فقہی اقوال وآرا سے روشناس کرایا، اس طرح مملکت اسلامیہ کے طول وعرض میں فقہ حنفی خوب شائع وذائع ہوا۔ خصوصیت کے ساتھ قاضی ابویوسف جب قضاء القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے قاضیوں کی تعلیم وتربیت امام اعظم کے وضع کردہ قواعد فقہ وافتا کی روشنی میں کی، اس طرح ابویوسف کی درسگاہ سے جو قاضی اور مفتی بھی پیدا ہوا، وہ مسلک ابوحنیفہ کا ترجمان اور اس کا معتبر ناقل بنا، یہ

سلسلہ امام صاحب کے تلامذہ ہی تک محدود نہیں رہا، بلکہ چراغ سے چراغ جلتے رہے اور ان شاگردوں کے شاگرد اور پھر ان کے شاگرد صدیوں تک اسلامی بلاد و امصار میں فقہ حنفی کی ترویج و اشاعت کا مہتم بالشان فریضہ انجام دیتے رہے۔

ذیل میں ان اہم شاگردوں کے مختصر حالات زندگی اور علمی کمالات پیش کیے جائیں گے جو فقہ حنفی کے راوی و ناقل اور اس کی اشاعت میں جن کا اہم کردار رہا ہے۔

(۱) قاضی ابو یوسف رضی اللہ عنہ ۹۳ھ تا ۱۸۲ھ

ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم بن حبیب کے جد اعلیٰ سعد بن حتبہ صحابی رسول تھے، قاضی ابو یوسف کو قدرت نے ذہن رسا اور شوق علم سے حظ وافر عطا فرمایا تھا، مگر ابتدا میں والد کے ساتھ کسب معاش کی مصروفیات کی بنا پر تحصیل علم کا موقع نہ ملا، فرصت کے جو اوقات میسر آتے محمد بن ابی لیلیٰ کی درسگاہ میں شریک ہوتے یہ سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک جاری رہا، اس کے بعد امام اعظم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور یہ مجلس ان کو اتنی پسند آئی، کہ ہمیشہ کے لیے اسی سے وابستہ ہو کر طلب علم میں منہمک ہو گئے، ان کے والد نے جب یہ حال دیکھا، تو ایک دن امام صاحب کے حلقہ درس میں پہنچے اپنے فرزند کو زبردستی گھر لائے اور کہا، ابوحنیفہ مالدار شخص ہیں، تم ان کا مقابلہ کیوں کرتے ہو؟ کچھ دنوں مجلس درس میں حاضر نہ ہونے کے بعد جب آئے، تو امام صاحب نے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا، جواب دیا:

الشغل بالمعاش وطاعة والدی

کسب معاش کی مشغولیت اور والد کی اطاعت مانع رہی۔

مجلس برخاست ہوئی، تو امام صاحب نے انہیں روپیوں کی ایک تھیلی دی اور فرمایا، اسے ضروریات میں خرچ کرو اور ختم ہو جائے تو کہنا۔ اس طرح امام صاحب آپ کے اخراجات کے کفیل ہو گئے اور آپ بے فکری کے ساتھ تحصیل علم میں مصروف ہو گئے، مدد معاش کا یہ سلسلہ امام اعظم کی آخری عمر تک جاری رہا۔

امام اعظم کے علاوہ دوسرے شیوخ و اساتذہ سے بھی علوم و فنون کی تحصیل کی تھی۔

امام ابو یوسف نے خداداد ذہانت، فطری ذوق علم اور ذاتی محنت و کاوش سے اپنے دور کے اجلہ علما و فقہا سے سالہا سال کسب علم کر کے اپنے دامن کو علم و فضل کی دولت سے بھر لیا تھا اور دنیائے اسلام کی عظیم عبقری شخصیت بن گئے تھے۔ فقہ و اجتہاد میں ذروہ کمال تک پہنچے، حدیث و سنت کے زبردست عالم، ایام عرب، تفسیر قرآن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔

ابن خلکان لکھتے ہیں:

كان فقيها عالما حافظا، (وفیات الاعیان ج ۳ ص ۳۸۹)

ابو یوسف فقیہ، عالم اور حافظ تھے۔

عمار بن ابی مالک کہتے ہیں:

ماکان فی اصحاب ابی حنیفة مثل ابی یوسف لولا ابویوسف ماذکر ابوحنیفة ولا محمد بن ابی لیلیٰ ولکنه هو نشر قولهما وبث علمهما ۔(ایضا ص ۳۹۰)

امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں ابویوسف جیسا کوئی نہ تھا، اگر ابویوسف نہ ہوتے، تو امام اعظم اور محمد بن ابی لیلیٰ کا ذکر نہ ہوتا، انہوں نے ہی ان دونوں کے اقوال اور علم کو پھیلایا ہے۔

امام اعظم ابویوسف کی عیادت کر کے نکلے، تو فرمایا:

ان یمت هذاالفتی فانه اعلم من علیها واومی الی الارض ۔(ایضا ص ۳۹۱)

اگر یہ نوجوان مر گیا، تو روئے زمین کا سب سے بڑا عالم گزر گیا۔

۱۵۰ھ میں امام اعظم کی وفات کے بعد حلقہ درس قائم کیا، جس میں طالبان علوم جوق در جوق شامل ہونے لگے، ۱۶۶ھ تک یہ حلقہ درس باقاعدہ قائم رہا، عہدہ قضا کی وجہ سے دن میں فرصت نہ ملتی، تو رات میں درس دیتے، آپ سے ہزاروں افراد نے علم حاصل کیا۔

عہدہ قضا

پورے دور اموی اور ابتدائے دور عباسی میں عموماً قضاۃ خلفا وامرا کے تابع ہوا کرتے تھے اور انہی کی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے، یہی وجہ تھی، کہ امام اعظم، سفیان ثوری، امام مالک جیسی عبقری شخصیتوں نے یہ عہدہ قبول نہ کیا۔ لیکن امام ابویوسف نے ان لوگوں کے برخلاف خلیفہ مہدی کے زمانے میں عہدہ قضا قبول کر لیا، جس میں ان کی معاشی زبوں حالی اور دینی مصلحت شامل تھی، کہ وہ اس منصب پر فائز رہ کر اہل اسلام کو حق وانصاف دلا سکیں گے اور امام اعظم کی فقہ کی روشنی میں فیصلے کر سکیں گے، جس سے یہ فقہی مسلک عام ہوگا اور ساری دنیا اس سے فائدہ حاصل کرے گی، چنانچہ آپ نے اس عہدے پر فائز رہ کر پوری ایمانی جرأت کے ساتھ وہی فیصلے صادر کیے، جو اسلامی شریعت کی رو سے حق تھے۔ اس سلسلے میں کبھی کسی کی ناحق رعایت نہ کی، وزرا وارکان دولت کی شہادتیں رد کر دیں، ہارون جیسے باقتدار خلیفہ کو معمولی رعایا کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا اور اس کے سامنے کبھی اظہار حق سے باز نہ رہے، ہارون نے اپنے زمانے میں آپ کو تمام ممالک اسلامیہ کا قاضی القضاۃ بنا دیا تھا، آپ ہی کے حکم سے قاضیوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔

فقہ واجتہاد

امام ابویوسف کا سب سے وسیع میدان فقہ واجتہاد تھا اور انہوں نے اس علم میں سب سے زیادہ اپنی جولانی طبع اور جودت فکر کا استعمال کیا ہے، وہ بلاشبہ امام اعظم کے تلامذہ ہی میں نہیں بلکہ اپنے تمام معاصرین میں بحیثیت فقیہ و مجتہد سب سے نمایاں ہیں اور امام اعظم کی مجلس تدوین فقہ کے سب سے اہم رکن ہیں اور اس حیثیت سے ان کو شہرت بھی حاصل ہوئی۔ علی بن

صالح ان کو افقہ الفقہا اور سید الفقہا کہتے تھے۔

یحییٰ بن معین کہتے ہیں: اہل عراق میں وہ سب سے بڑے فقیہ تھے۔

امام صاحب کی کتاب ''اختلاف ابن ابی لیلیٰ و ابی حنیفہ'' ان کے تفقہ کا بڑا ثبوت ہے۔ فقہ میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ اصول فقہ کی تدوین ہے۔ طلحہ بن محمد بن جعفر کہتے ہیں:

ابو یوسف مشهور الامر ظاهر الفضل وهو صاحب ابی حنیفة وافقه اهل عصره ولم یتقدمه احد فی زمانه وکان النهایة فی العلم والحکم والریاسة والقدر واول من وضع الکتاب فی اصول الفقه علی مذهب ابی حنیفة واملی المسائل ونشرها وبث علم ابی حنیفة فی اقطار الارض ۔(وفیات الاعیان ج۳ص ۳۹۰)

ابو یوسف مشہور الامر اور صاحب فضل تھے، وہ ابوحنیفہ کے شاگرد تھے، اپنے معاصرین میں سب سے بڑے فقیہ تھے، ان کے زمانے میں کوئی عالم ان سے آگے نہیں بڑھا، وہ علم وحکمت ریاست اور فضل میں مرتبہ کمال پر فائز تھے، وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مذہب ابی حنیفہ پر اصول فقہ میں کتاب لکھی اور مسائل کو املا کرایا اور انہیں عام کیا اور روئے زمین میں ابوحنیفہ کے علم کی اشاعت کی۔

تصانیف

امام ابو یوسف ان علما وفقہا میں ہیں، جنہوں نے علوم وفنون اسلامی کی تدوین کی، تدوین کے ابتدائی دور میں بیش بہا کتابیں تصنیف فرمائیں۔ آپ نے حدیث، فقہ، اصول فقہ، قانون، اختلافیات پر جامع، مفید کتابیں تصنیف کیں۔ کشف الظنون میں ہے:

ان الامالی لابی یوسف فی ثلاث مائة مجلد ۔

ابو یوسف کی امالی تین سو جلدوں میں تھیں۔

ابن ندیم نے آپ کی ایک امالی کا ذکر کیا ہے جو ۳۶/ مباحث پر مشتمل تھی۔ دوسری کتاب ''کتاب الجوامع''، جس کے چالیس حصے تھے، جس میں اختلاف علما کا بیان ہے، ان کی ایک کتاب اصول فقہ میں تھی، جس میں انہیں اولیت حاصل تھی، افسوس کہ یہ کتابیں دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

آپ کی کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:

(۱) کتاب الآثار (۲) اختلاف ابن ابی لیلیٰ وابی حنیفۃ (۳) الرد علی سیر الاوزاعی (۴) کتاب الخراج (۵) کتاب المخارج والحیل۔

کتاب الخراج

قاضی ابو یوسف کی سب سے اہم شہرہ آفاق کتاب کتاب الخراج ہے۔ آپ کے زمانہ میں اور بعد کی صدیوں میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، جن میں یحییٰ بن آدم کی کتاب الخراج، ابن عبید کی کتاب الاموال اور ابن رجب کی استخراج احکام الخراج وغیرہ بہت مشہور ہیں، مگر کوئی کتاب ان خصوصیات کی حامل نہیں، جن کی امام ابو یوسف کی کتاب حامل ہے۔

امام ابو یوسف نے یہ کتاب خلیفہ ہارون رشید کی فرمائش پر تحریر کی۔ کتاب کی ابتدا میں امام ابو یوسف تحریر کرتے ہیں:

> امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ چاہا ہے کہ میں ان کے لیے ایک جامع کتاب تیار کروں، جس کے مطابق خراج، عشور، صدقات اور جزیوں کی تحصیل میں اور دوسرے ان معاملات میں عمل کیا جائے، جن کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری ان پر ہے...... وہ تفصیلی جواب چاہتے ہیں تاکہ آئندہ ان امور میں اس پر عمل درآمد ہو۔

کتاب کا اسلوب نگارش یہ ہے، کہ پہلے مسئلہ کے متعلق قرآنی آیات پیش کرتے ہیں پھر احادیث نبویہ وآثار صحابہ اس کے بعد ضرورت مقتضی ہوتی ہے تو امام ابو حنیفہ یا دیگر ائمہ کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں، اس کے بعد بھی اگر ضرورت مقتضی ہوتی ہے، تو خود اجتہاد کرتے ہیں۔

اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے صرف اسلامی خزانہ کے محاصل ومخارج کی تفصیل ہی بیان نہیں کی ہے، بلکہ حکومت کے اسلامی تصور اور خلافت راشدہ کے منہاج کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس طرح انہوں نے قیصری طرز حکمرانی کو بدل کر اسلامی جمہوریت کی روح کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب الخراج میں ابو یوسف نے جہاں امام اعظم کے افکار وآرا کا ذکر کیا ہے، انہیں دلائل وبراہین سے موید کیا اور قیاس واستحسان کی وجہ بھی بتائی، علمی امانت کی ادائیگی کی فکر انہیں اس قدر دامن گیر رہتی کہ وہ استاذ کی دلیل کو بیان کرنا اتنا ضروری سمجھتے ہیں، جتنا اپنی دلیل کا نہیں۔

کتاب کی ابتدا میں قاضی ابو یوسف نے خلیفہ کو خلافت راشدہ کے نہج پر حکمرانی کی تاکید کی اور اپنے فرض منصبی کو بڑی قوت وجرأت کے ساتھ انجام دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے جو حمد وثنا کا مستحق ہے، آپ پر ایک بڑے بھاری کام کا بار ڈالا ہے، اس کا ثواب سب سے بڑا اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔ اس نے اس امت کی سربراہی آپ کے سپرد کی ہے اور آپ شب وروز ایک خلق کثیر کے لیے تعمیر کرتے ہیں اس نے آپ کو ان کا راعی بنایا ہے، ان کی امامت آپ کے حوالہ ہے، ان کے ذریعہ آپ کو آزمائش میں ڈالا ہے اور سلف کے معاملات چلانے کی ذمے داری آپ کو سونپ دی ہے، جو تعمیر خوف خدا کے سوا کسی اور چیز پر کی جائے وہ کچھ دیر نہیں ٹھہرتی اکھاڑ کر اسی پر گرادیتا ہے جو اس کا بنانے والا اور اس تعمیر میں اس کی مدد کرنے والا ہو، راعیوں کو اپنے رب کے سامنے اسی طرح حساب دینا ہے، جس طرح دنیا میں کوئی چرواہا گلے کے مالک کو حساب دیتا ہے، ٹیڑھی راہ نہ

چلیے، کہ آپ کا گلہ ٹیڑھا چلنے لگے، تمام لوگوں کو خدا کے قانون میں یکساں رکھیے، خواہ آپ سے قریب ہوں یا دور، کل خدا کے حضور آپ اس طرح نہ حاضر ہوں، کہ آپ زیادتیاں کرنے والوں میں سے ہوں، کیوں کہ یوم الدین کا حاکم لوگوں کے فیصلے ان کے اعمال کی بنا پر کرے گا، نہ کہ مرتبوں کی بنا پر...... اس سے ڈریے کہ آپ اپنے گلہ کو ضائع کریں اور گلے کا مالک اس کا پورا پورا بدلہ آپ سے لے۔ (کتاب الخراج ص ۳-۴)

(۲) امام محمد بن حسن شیبانی رضی اللہ عنہ ۱۳۲ھ تا ۱۸۹ھ

ابوعبداللہ محمد بن حسن شیبانی واسط میں پیدا ہوئے، پھر والدین نے کوفہ کو وطن بنایا، جہاں آپ کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ کوفہ اس وقت علم و فضل کا گہوارہ تھا، یہیں امام محمد کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔ اولاً قرآن، ادب، لغت کی تحصیل کی، پھر شیوخ کوفہ کے حلقہائے درس میں شریک ہوئے۔ فطری صلاحیت اور ذوق علم نے صغر سنی ہی میں جوہر قابل بنا دیا۔ چودہ سال کی عمر میں امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ پھر آپ کی زندگی میں کسی اور کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ جب امام صاحب کا وصال ہوا، تو قاضی ابو یوسف سے فقہ کی تکمیل کی۔ پھر حدیث کی تحصیل کے لیے امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے، تین سال قیام کر کے آپ سے حدیث و سنت کا درس لیتے رہے۔

قوت حفظ و ضبط، جودت فہم و ادراک نے امام محمد کو قرآن و تفسیر، فقہ و حدیث، نحو، عربیت اور حساب میں حاکمانہ قدرت عطا کر دی تھی۔ آپ کے فضل و کمال کا اعتراف اکابر ملت نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

☆ **ابوعبید:۔** ”ما رایت اعلم بکتاب اللہ من محمد بن حسن“ ’میں نے محمد بن حسن سے بڑا عالم قرآن نہیں دیکھا۔ (الفوائد البہیہ ص ۶۹)

☆ **امام شافعی:۔** ”ما رایت افصح منہ و کنت اظن اذ رایتہ یقرأ القرآن کان القرآن نزل بلغتہ“ ”میں نے ان سے زیادہ فصیح کلام کرنے والا نہیں دیکھا، میں جب ان کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھتا تو گمان کرتا گویا قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ (کتاب الانساب للسمعانی)

☆ **ابن عماد حنبلی:۔** امام محمد بن حسن سے زیادہ حلال و حرام، علل حدیث، ناسخ و منسوخ کا جاننے والا میرے علم میں کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ اگر لوگوں میں انصاف ہوتا، تو یقین کرتے کہ امام محمد جیسا کوئی شخص انہوں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ (شذرات الذہب)

☆ **ربیع بن سلیمان:۔** میں نے امام محمد سے زیادہ کوئی صاحب عقل نہیں دیکھا۔ (تاریخ بغداد)

☆ **امام شافعی:۔** ”ما رایت اعقل و لا افقہ و لا ازھد و لا اورع و لا احسن نطقا من محمد بن حسن“ میں نے امام محمد سے بڑھ کر عقلمند، فقیہ، زاہد، متورع نہیں دیکھا، نہ ان سے اچھا کلام کرنے والا (تہذیب الاسماء نووی)

حلقہ درس

امام محمد نے اپنے عہد کے اساطین علم سے علم وفضل کی دولت حاصل کی اور اسے عام کرنے کے لیے جامع کوفہ میں حلقہ درس قائم کیا اور آپ کے حلقہ درس سے ہزاروں طالبان علم وابستہ ہوئے، لوگوں کا رجوع عام آپ کی طرف ہوتا، امام شافعی فرماتے ہیں:

كان اذا حدثهم عن مالك امتلأ منزله و كثر الناس حتى يضيق عليه الموضع .

جب آپ حلقہ درس میں امام مالک کی مرویات بیان کرتے تو لوگوں کی کثرت کی وجہ سے گھر بھر جاتا اور جگہ تنگ ہو جاتی۔

امام محمد نے کوفہ کے علاوہ بغداد، رے اور دوسرے مقامات میں بھی جہاں وہ گئے، مجلس درس قائم کی اور ان کی فیض رساں بارگاہ سے لوگوں نے خوب خوب کسب علم کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے امام محمد سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا، اگر وہ نہ ہوتے تو مجھ پر وہ علم نہ کھلتا جو کھلا ہے۔ (شذرات الذہب)

خدمت حدیث

امام محمد نے اپنے دور کے اساطین حدیث سے اس علم میں کمال پیدا کیا، وہ اپنی قوت حفظ وضبط کی بنا پر بہت بڑے محدث بن گئے تھے، بالخصوص امام مالک کی مرویات کے امین سمجھے جاتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

كان محمد بن حسن من بحور العلم و الفقه قويا في مالك .

امام محمد علم وفقہ کے سمندر تھے اور امام مالک کی مرویات میں قوی تھے۔

مؤطا امام مالک کے سولہ متداول نسخے ہیں، جن میں یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کے نسخے کو مؤطا امام مالک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مؤطا کی مرویات کو امام محمد نے اپنی کتاب مؤطا امام محمد میں نقل کیا ہے، جسے مصمودی کے نسخے پر اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے، کہ انہوں نے صرف امام مالک کی مرویات کو نقل کیا ہے، جب کہ امام محمد نے امام مالک کے علاوہ دیگر شیوخ حدیث کی روایتیں بھی شامل کی ہیں، ظاہر ہے کہ اس اضافے میں افادیت زیادہ ہوگی۔

فقہ واجتہاد

امام محمد کی علمی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو علم فقہ ہے اور وہ اپنے عہد میں فقہ کے تاجدار تھے، ان کی فقہی بصیرت واجتہاد کے دوسرے مجتہدین صرف معترف ہی نہیں بلکہ ان کی صحبت کے تربیت یافتہ یا ان کی فقہی تصانیف کے خوشہ چیں ہیں۔

☆ امام احمد بن حنبل کا بیان ہے: فقہ کے تمام دقیق مسائل میں نے امام محمد سے اخذ کیے ہیں۔

☆ امام مزنی کہتے ہیں: امام ابوحنیفہ اہل عراق کے سردار ہیں، ابویوسف ان سب سے زیادہ متبع سنت ہیں۔ امام محمد نے

سب سے زیادہ تفریع کی ہے۔

☆ حافظ ذہبی کہتے ہیں: "انتهت اليه رياسة الفقه بالعراق بعد ابى يوسف وتفقه به الائمة "عراق میں ابو یوسف کے بعد فقہ کی ریاست امام محمد پر ختم ہوگئی اور ان سے ائمہ نے تفقہ حاصل کیا۔ (میزان ترجمہ امام محمد)

☆ امام شافعی کہا کرتے تھے: میں فقہ میں امام محمد کا سب سے زیادہ ممنون احسان ہوں۔

امام محمد نے ایک لاکھ سے زیادہ مسائل مستنبط کیے، استنباط واستخراج مسائل کے لحاظ سے ان کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا، خلیفہ ہارون رشید نے آپ کی فقہی بصیرت سے متاثر ہو کر قاضی بنایا۔ امام محمد جب تک اس عہدہ پر فائز رہے بلاخوف وخطر عدل وانصاف کے ساتھ فیصلے صادر فرماتے رہے، انہوں نے کبھی اپنے فیصلوں میں خلیفہ وقت یا ارکان دولت کی پروا نہ کی۔ چنانچہ جب امان یافتہ یحیٰی بن عبداللہ کے خلاف عہد شکنی کا مسئلہ پیش ہوا تو امام محمد نے خلیفہ ہارون رشید کی مرضی کے خلاف فیصلہ دیا تو آپ عتاب شاہی میں مبتلا ہوئے۔ منصب قضاوافتا سے معزول کر کے آپ کو قید کر دیا گیا، اس طرح آپ نے قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں۔ کچھ دنوں بعد آپ کو قید سے نکال کر اعزاز واکرام کے ساتھ قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز کیا گیا۔ (مناقب کردری ج ۲ ص ۱۶۵)

تدوین فقہ کے باب میں امام محمد کا مرتبہ ان کے تمام معاصرین میں سب سے بلند ہے۔ انہوں نے امام اعظم کے مجتہدات دوسرے ائمہ کے اقوال نیز اپنے استنباط وتفریعات کو مبسوط، جامع کبیر، جامع صغیر، سیر صغیر، سیر کبیر اور زیادات میں جمع کر کے صرف احناف ہی نہیں بلکہ دیگر مکاتب فقہ کے فقہا کے لیے اجتہاد واستنباط کی راہ کھول دی، بلاشبہ دنیائے اسلام پر امام محمد کا یہ احسان عظیم ہے۔

تصنیفات

امام محمد نے بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کی تصنیف کردہ تمام کتب کی تعداد نوسو ننانوے شمار کی گئی ہے۔ اور کل مسائل جو آپ نے کتاب وسنت واجماع کی روشنی میں مستنبط کیے ہیں، ان کی تعداد دس لاکھ ستر ہزار تیس یا دس لاکھ ستر ہزار ایک سو بتائی گئی ہے۔ (حدائق الحنفیہ ص ۱۵۵)

ظاہر روایت

آپ کی سب سے پہلی تصنیف مبسوط ہے، اسی وجہ سے اس کو اصل کہا جاتا ہے، پھر جامع صغیر پھر جامع کبیر پھر زیادات تصنیف کی۔ پھر سیر صغیر، سیر کبیر تصنیف کی۔ ان کتابوں کو فقہا کی اصطلاح میں ظاہر روایت اور اصول کہتے ہیں۔

مبسوط

مبسوط میں آپ نے امام ابو یوسف کے جمع کردہ مسائل کو وضاحت کے ساتھ عمدہ انداز میں مرتب کیا ہے۔

جامع صغیر

اس کتاب میں امام محمد نے امام ابو یوسف کی روایت سے امام اعظم کے اقوال لکھے ہیں۔

سید الحفاظ امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معین نے جامع صغیر امام محمد سے پڑھی۔ تہذیب الاسماء واللغات میں ہے:

عن یحییٰ بن معین قال کتبت الجامع الصغیر عن محمد بن الحسن ۔

یحییٰ بن معین نے کہا: میں نے جامع صغیر امام محمد سے لکھی۔

جامع کبیر

اس میں امام صاحب کے اقوال کے ساتھ امام ابو یوسف اور امام زفر کے اقوال بھی موجود ہیں۔ ہر مسئلہ کو دلیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہ جامع صغیر سے زیادہ دشوار اور دقیق ہے۔ بعد کے فقہا نے اصول فقہ کے مسائل زیادہ تر اسی سے اخذ کیے ہیں۔ بڑے بڑے نامور فقہا نے اس کی شروح لکھیں۔ جن میں سے ۴۲ کا ذکر کشف الظنون میں ہے۔

ادب و عربیت میں اگر چہ امام محمد کی کوئی مستقل کتاب نہیں، لیکن فقہ کے جو مسائل نحو کے جزئیات پر مبنی ہیں، اکثر جامع کبیر میں موجود ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے، کہ اس فن میں ان کا پایہ کتنا بلند تھا۔ چنانچہ ابن خلکان وغیرہ نے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ کتب تاریخ میں موجود ہے کہ ایک بڑا عیسائی عالم علمائے اسلام سے مناظرہ کرتا رہتا۔ دین اسلام سے خوب واقف تھا، لیکن مسلمان نہ ہوتا، اس نے جامع کبیر کا مطالعہ کیا تو مسلمان ہو گیا اور کہا: ''**ھذا محمد کم الاصغر فکیف محمد کم الاکبر** '' یہ تمہارے چھوٹے محمد کی کتاب جب اس قدر علوم و کمالات کا مجموعہ ہے تو تمہارے بڑے محمد کے علوم کتنے اعلیٰ و ارفع ہوں گے۔

زیادات

جامع کبیر کے بعد جو فروع یاد آتے رہے، وہ اس میں جمع کیے ہیں اسی لیے اس کو زیادات کہتے ہیں۔

سیر صغیر

یہ کتاب سیر میں ہے امام اوزاعی نے اس کو دیکھا تو تعریف کی، لیکن یہ بھی کہا، اہل عراق کو سیر سے کیا نسبت۔

سیر کبیر

جب امام محمد کو امام اوزاعی کا مذکورہ بالا جملہ معلوم ہوا تو انہوں نے سیر کبیر لکھی۔ ساٹھ ضخیم اجزا میں مرتب کیا اور تیاری کے بعد ایک خچر پر لدوا کر ہارون رشید کے پاس لے جانے کا ارادہ کیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی تو اس نے از راہ عزت افزائی شہزادوں کو استقبال کے لیے بھیجا اور ان کو ہدایت کی کہ امام محمد سے اس کی سند حاصل کریں۔ امام اوزاعی نے بھی اس محققانہ کتاب کی بہت تعریف کی۔

اس کے علاوہ آپ کی ایک کتاب کتاب الحج بھی ہے۔

امام محمد اور قضا

امام محمد نے اگرچہ زندگی کا بڑا حصہ دربار کے تعلق سے بسر کیا، لیکن آزادی اور حق گوئی پر قائم رہے "**لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم**" پر عمل کرتے رہے۔ ۱۷۵ھ میں یحییٰ علوی نے علم بغاوت بلند کیا، تو ہارون رشید ان کا سروسامان دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا اور روب کر صلح کر لی۔ معاہدہ صلح قلم بند ہوا۔ یحییٰ کے اطمینان کے لیے بڑے بڑے علما، فضلا، محدثین وفقہا نے اس پر دستخط کیے۔ یحییٰ صلح پر راضی ہوکر بغداد آئے تو چند روز کے بعد ہارون رشید نے نقض عہد کرنا چاہا، بہت سے علما نے ہارون رشید کے خوف سے فتویٰ دے دیا کہ صورت موجودہ میں نقض عہد جائز ہے، لیکن امام محمد نے علانیہ مخالفت کی اور اخیر تک اپنے اصرار پر قائم رہے۔ بالآخر خلیفہ ہارون نے غصہ سے مغلوب ہوکر امام محمد کے منہ پر دوات پھینک کر ماردی، جس سے آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہوگیا اور خون کپڑوں پر بہنے لگا۔ خلیفہ نے یہ بھی کہا، کہ آپ جیسے لوگ ہی ہمارے خلاف بغاوت کرنے والوں کے حوصلے بڑھاتے ہیں، امام محمد لوٹ کر آئے تو خلیفہ کا قاصد پہنچا کہ آج سے آپ نہ مقدمات کے فیصلے کریں، نہ فتویٰ دیں، لیکن امام محمد نے کوئی پروانہیں کی اور خلیفہ کے موافق فتویٰ نہ دیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد خلیفہ کو ندامت ہوئی، قاضی القضاۃ اور مقرب بنایا اور اپنے ساتھ رے لے گیا، جہاں ان کا اور امام نحو کسائی کا ایک ہی دن انتقال ہوا۔ خلیفہ افسوس کے ساتھ کہا کرتا تھا، کہ ہم نے ایک ہی دن فقہ اور نحو دونوں کو مقام رے میں دفن کر دیا۔

(۳) امام زفر رضی اللہ عنہ ۱۱۰ھ تا ۱۵۸ھ

ابوالہذیل زفر بن ہذیل بصرہ کے باشندے تھے، والد اصفہان کے والی تھے، جہاں امام زفر کی ولادت ہوئی۔

آپ نے تحصیل علم کا آغاز محدثین کی آغوش سے کیا اور علم حدیث میں کمال پیدا کیا لوگ آپ کو صاحب الحدیث کہنے لگے۔ پھر آپ کی ذہانت وطباعی تحصیل فقہ کے لیے امام اعظم کی درسگاہ میں لائی۔ امام اعظم کی مجلس درس میں عجیب کشش تھی، کہ جو ایک بار اس میں شریک ہوگیا، تو پھر کیا مجال کہ وہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جائے۔ امام زفر بھی جب امام صاحب کی بارگاہ میں آئے تو اپنے سابقہ شیوخ کی درسگاہوں کو خیرآباد کہہ دیا، امام صاحب کی مجلس درس عام مجلسوں سے مختلف تھی، اس میں مسئلہ پیش کیا جاتا، تلامذہ ہی سے جواب اور دلائل دریافت کیے جاتے، پھر بحث وتمحیص کے بعد مسئلے کا جواب اور طریقہ استنباط تحریر کر دیا جاتا۔ حلقہ درس میں قوت استدلال واجتہاد کی حیثیت سے امام ابو یوسف کے بعد امام زفر امتیازی شان رکھتے تھے۔

امام زفر امام اعظم کا حد درجہ احترام کرتے تھے، فرماتے تھے، میں امام صاحب کی زندگی میں ان سے اختلاف کرتا تھا، مگر اب ہمت نہیں پڑتی، اپنی شادی کے موقع پر امام صاحب کو خطبہ نکاح کے لیے مدعو کیا، امام صاحب نے دوران خطبہ

فرمایا، حاضرین! یہ زفر ہیں جو مسلمانوں کے امام ہیں اور شرافت و علمیت کے لحاظ سے مسلمانوں کی عظمت کا ایک نشان ہیں۔ بعض لوگوں نے امام زفر سے کہا، کہ تمہارے خاندان میں ممتاز لوگ موجود ہیں، ان سے نکاح نہیں پڑھوایا، امام زفر نے فرمایا "اگر میرے والد بھی ہوتے، تو ان کو آپ پر ترجیح نہ دیتا"۔

امام زفر حدیث و فقہ میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے، قیاس و اجتہاد میں ان کا پلہ اصحاب امام میں سب سے بھاری تھا، خود امام صاحب ان کے بارے میں فرماتے "**اقیس اصحابی زفر**" زفر میرے اصحاب میں سب سے بڑے قیاس ہیں۔ عام تذکرہ نگار لکھتے ہیں: "**احدھم قیاسا**"

حلقہ درس

امام صاحب کو آپ کی علمی پختگی کا یقین ہوا، تو اپنی زندگی ہی میں درس و تدریس کی اجازت دے دی تھی، مگر استاذ کے احترام میں ۱۵۰ھ تک حلقہ درس قائم نہیں کیا۔ جب امام صاحب کا وصال ہو گیا، تو کوفہ میں مجلس درس قائم کی، پھر بصرہ منتقل ہو گئے۔

بصرہ میں فضا فقہ حنفی کے خلاف تھی، اس لیے اس مکتب کی بساط تدریس موقع و ماحول کے اعتبار سے ممکن نہ تھی، چنانچہ امام زفر نے بھی ابتدا میں حلقہ درس قائم نہ کیا، بلکہ شیخ عثمان بن مسلم کے حلقہ درس میں شرکت کرنے لگے، کچھ دنوں خاموشی سے درس سنتے رہے، اس کے بعد ان کے اصول و فروع پر نظر ڈالی، تو بہت سے مسائل کے سلسلے میں اصل و فرع اور ماخذ و ماخوذ میں تضاد نظر آیا۔ امام زفر ان مسائل کا تذکرہ ان کے تلامذہ سے کرتے اور پھر بدلائل ان کی غلطی واضح کرتے وہ تلامذہ اس کا ذکر شیخ سے کرتے اور ان سے اپنی رائے سے رجوع کرنے پر اصرار کرتے تھوڑے دن کے بعد نتیجہ یہ ہوا، کہ امام زفر سے استفادہ کرنے والوں کا ہجوم ہوا اور ان کو الگ حلقہ درس قائم کرنا پڑا۔ ابو اسد کا بیان ہے، کہ ان کے درس میں اتنا ہجوم ہونے لگا، کہ وہاں کے اکثر حلقہ درس ٹوٹ گئے۔ (مناقب کردری ج ۲ ص ۱۸۷)

امام اعظم کے بعض تلامذہ بھی آپ کے حلقہ درس میں شریک ہوتے، چنانچہ وکیع بن الجراح آپ کے یہاں مستقل حاضر ہوتے اور فرمایا کرتے تھے:

> **الحمد للّٰه الذی جعلك خلفا لنا عن الامام ولكن لايذهب عنی حسرة الامام ۔**
>
> خدا کا شکر ہے، کہ آپ کو اس نے امام کا جانشین بنایا اگرچہ امام صاحب کی غیر موجودگی کی حسرت کسی طرح دل سے نہیں جاتی۔

آپ کے حلقہ درس کی برکتوں نے بصرہ کے اندر امام اعظم کے خلاف پھیلی ہوئی بدگمانیوں کا ازالہ کر دیا اور لوگ فقہ حنفی سے قریب تر ہونے لگے۔

اجتہاد

امام زفر کو قدرت نے اجتہادی ملکہ ودیعت فرمایا تھا، چنانچہ تقریباً ۱۷ اجتہادی مسئلوں میں منفرد ہیں۔ فقہ حنفی میں ان کے مطابق فتوے دیے جاتے ہیں۔ ان مسائل کو علامہ حموی نے ایک رسالے میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح ابوزید دبوسی نے اپنی کتاب ”تاسیس النظر“ میں ایک باب میں خاص طور سے ان مسائل سے بحث کی ہے، جن میں امام زفر نے امام صاحب سے اصولی یا فروعی اختلاف کیا ہے۔ تمام تفصیلات علامہ زاہد الکوثری نے امام زفر کی سوانح حیات میں بیان کی ہیں۔ آخر میں رقم طراز ہیں:

فان كان شان المجتهد المطلق الانفراد بمسائل فى الاصول والفروع فها هو زفر له انفرادات فى الناحيتين على ان الموافقة للامام فى الراى فى بعض مسائل الاصول والفروع عن علم بادلتها لا تخل بالاجتهاد المطلق اصلا ۔

اگر مجتہد مطلق کی شان یہی ہے، کہ وہ بعض اصولی اور فروعی مسائل میں منفرد ہوں، تو دونوں حیثیتوں سے امام زفر منفرد ہیں اور بعض اصولی یا فروعی مسائل میں ان کے دلائل وماخذ کی واقفیت کے ساتھ امام صاحب کی ہمنوائی کرنا بھی اجتہاد مطلق میں مخل نہیں۔

صاحبین کی بہ نسبت آپ میں تصنیف وتالیف کا ذوق کم تھا، اس لیے ان کے علمی مشاہدات اور فقہی اقوال وآثار محفوظ نہ رہ سکے۔ اسی بنیاد پر ائمہ احناف میں جو شہرت صاحبین کو ملی وہ آپ کے حصے میں نہیں آئی۔ مناقب کردری میں ہے:

كان زفر قليل الكتابة يحفظ بالسمع وحسن القياس ۔

امام زفر لکھتے بہت کم تھے، وہ جو کچھ سنتے تھے، اسے حافظے میں محفوظ کر لیتے تھے۔

آپ نے فقہ میں کمال درک کے باوجود بصرہ کا عہدہ قضا قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

(۴) عافیہ بن یزید رضی اللہ عنہ ۱۸۰ھ

عافیہ بن یزید بن قیس اودی کوفی کوفہ کے رہنے والے تھے، بڑے صاحب علم فقیہ، صاحب دانش، محدث اور صدوق تھے۔ امام اعظم کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ آپ کی ذہانت، طباعی اور علمی بصیرت پر امام اعظم کو ناز تھا۔ تدوین فقہ کی مجلس کے رکن رکین تھے۔ جس مجلس میں آپ موجود نہ ہوتے، دیگر ارکان کی بحث وتمحیص کے باوجود بھی مسئلہ قلم بند نہ کیا جاتا، جب عافیہ آجاتے اور ان کی رائے بھی سامنے آجاتی، تو پھر فیصلہ ضبط تحریر میں لایا جاتا۔ اسحاق بن ابراہیم کا بیان ہے:

كان اصحاب ابى حنيفة يخوضون معه فى المسئلة فاذالم يحضر عافية قال ابو حنيفة لاترفعوا المسئلة حتى يحضر عافية فاذاحضر عافية ووافقهم قال البتوها ۔

(الجواہر المضیۃ ص ۱۷۶)

ابوحنیفہ کے اصحاب ان کے ساتھ مسئلہ میں غور وفکر کرتے تھے، جب عافیہ مجلس میں حاضر نہ ہوتے، تو ابوحنیفہ فرماتے، مسئلے کو آخری شکل نہ دو، جب تک عافیہ نہ آجائیں، جب عافیہ آجاتے اور وہ لوگوں کی موافقت کرتے، تو امام صاحب فرماتے، مسئلے کو لکھ لو۔

امام اعظم کے پوتے اسماعیل فرماتے ہیں: امام صاحب کے حلقہ درس میں بارہ اصحاب کو دوسرے ارکان پر فضیلت حاصل تھی، انہیں میں عافیہ بھی تھے۔

عاصم بن یوسف کا بیان ہے: امام اعظم جیسی مجلس علم اور کسی کی نہیں تھی، آپ کے اصحاب میں چار کو ارشد تلامذہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ زفر، ابویوسف، عافیہ اور اسد بن عمرو۔ (مناقب ج ۲ ص ۲۱۴)

(۵) عبداللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ ۱۱۸ھ تا ۱۸۱ھ

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مبارک مرو میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان بڑا خوش حال تھا، ناز ونعم میں پرورش پائی۔ جب سن شعور کو پہنچے، تو تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے، ابتدائی تعلیم مرو میں حاصل کی، پھر طلب علم کے شوق میں اسلامی بلاد وامصار کے سفر کیے۔ تلاش وجستجوئے علم کا بے پایاں ذوق اور مالی فراغت نے عبداللہ کو تمام بڑے اسلامی شہروں کے شیوخ سے تحصیل علم کا موقع فراہم کیا۔ چنانچہ احمد بن حنبل کہتے ہیں:

لم یکن فی زمان ابن المبارك اطلب للعلم منه (تذکرہ ج ۱ ص ۲۵۴)

عبداللہ بن مبارک کے زمانے میں ان سے زیادہ علم طلب کرنے والا نہ تھا۔

ابواسامہ کا بیان ہے:

مارایت رجلا اطلب للعلم فی الآفاق من ابن المبارك ۔

میں نے دنیا میں ابن مبارک سے زیادہ علم طلب کرنے والا نہیں دیکھا۔

ابن مبارک خود ارشاد فرماتے ہیں: میں نے چار ہزار شیوخ واساتذہ سے فیض اٹھایا اور ان میں ایک ہزار سے روایت کی۔

اپنے تعلیمی اسفار کے دوران وہ کوفہ بھی آئے اور امام اعظم کے حلقہ درس کو اختیار کیا۔ انہوں نے اگرچہ چار ہزار علما ومشائخ سے کسب علم کیا، لیکن ان میں سب سے زیادہ امام اعظم اور سفیان ثوری سے متاثر ہوئے، وہ خود فرماتے ہیں:

لو لا ان اللہ تعالیٰ اغاثنی بابی حنیفة وسفیان کنت کسائر الناس ۔

اگر اللہ تعالیٰ نے ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے ذریعے میری دستگیری نہ کی ہوتی، تو میں بھی ایک عام آدمی سے بڑھ کر نہ ہوتا۔

علم وفضل

ابن مبارک نے اپنے عہد کے بڑے بڑے محدثین وفقہا سے اسلامی علوم وفنون حاصل کیے اور اپنے دامن کمال کو حدیث وفقہ، شعر وادب، نحو ولغت کے درو جواہر سے بھر لیا۔ امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کے علمی وروحانی کمالات کا اعتراف اس طرح کیا گیا ہے۔

☆ **سفیان بن عیینہ:** ۔ لقد كان فقيها عالما عابدا زاهدا شيخا شجاعا شاعرا ۔

عبداللہ بن مبارک فقیہ، عالم، عابد، زاہد، شیخ، بہادر اور شاعر تھے۔

☆ **نووی:** ۔ عبداللہ بن مبارک کی امامت وجلالت پر سب کا اتفاق ہے، وہ تمام چیزوں میں امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی اور ان کی صحبت میں بخشش کی توقع کی جاتی تھی (تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۸۵)

☆ **حسن بن عیسی:** ۔ جمع العلم والفقه والادب والنحو واللغة والشعر والفصاحة والورع والانصات وقيام الليل والعبادة والغزوة والفروسية والشجاعة والشدة في بدنه وترك الكلام فيما لايعنيه وقلة الخلاف على اصحابه ۔

عبداللہ بن مبارک نے حدیث، فقہ، نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، ورع، خاموشی، قیام لیل عبادت، جہاد، شہ سواری، شجاعت اور جسمانی قوت کو اپنے اندر جمع کرلیا تھا۔ لغو باتوں کو ترک کرنا، اپنے اصحاب سے کم اختلاف کرنا آپ کی عادت تھی۔

حدیث

یوں تو ابن مبارک جملہ علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے، لیکن آپ کا خاص میدان علم حدیث تھا، جس کی تحصیل کے لیے انہوں نے دور دراز شہروں اور ملکوں کا سفر کیا تھا۔ قوت حفظ وضبط کا یہ عالم تھا، کہ جو باتیں سنتے یاد ہو جاتیں۔

آپ ہر کس وناکس سے حدیث کی روایت نہ کرتے اور نہ ہر شخص سے روایت قبول کرتے، روایت لینے اور نقل کرنے میں حد درجہ احتیاط سے کام لیتے تھے۔

علم حدیث سے اتنا شغف تھا، کہ پوری پوری رات اس کی نقل وضبط میں صرف کر دیتے اور بسا اوقات پورے پورے دن گھر سے باہر نہ نکلتے۔ کسی نے کہا، آپ کو تنہائی میں وحشت نہیں ہوتی، فرمایا وحشت کی کیا بات ہے، جب کہ مجھے اس تنہائی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے شرف صحبت کی دولت نصیب ہوتی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۵۴)

آپ کی جلالت فی الحدیث کے بارے میں ائمہ فن کا اعتراف ہے:

☆ **عجلی:** ۔ ثقة ثبت في الحديث رجل صالح وكان جامعا للعلم ۔ (تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۳۳۷)

عبداللہ بن مبارک حدیث میں ثقہ، ثبت تھے، نیک آدمی اور جامع علم تھے۔

☆ابن حبان:۔ **کان فیه خصال لم تجتمع فی احد من اھل العلم فی زمانه فی الارض کلھا**

(ایضا)

عبداللہ بن مبارک کے اندر ایسی خصلتیں تھیں جو ان کے زمانے میں دنیا کے کسی اور عالم کے اندر نہیں پائی جاتی تھیں۔

آپ نے کہیں ایک جگہ حلقہ درس قائم نہیں کیا، لیکن آپ کی عالمانہ شخصیت اتنی پر کشش تھی، کہ جہاں جاتے طالبان علم نبوت آپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ اسی لیے آپ کے بکثرت شاگرد ہوئے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

حدث عنه خلق لایحصون من اھل الاقالیم ۔

ممالک اسلامیہ کے اتنے لوگوں نے ان سے حدیث روایت کی جن کا شمار ممکن نہیں۔

فقہ

ابن مبارک امیر المومنین فی الحدیث ہونے کے باوجود فقہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ امام اعظم کے ارشد تلمیذ تھے اور فقہ ان ہی کی بارگاہ سے حاصل کی تھی۔ علمانے آپ کے تفقہ کا اعتراف کیا ہے، ایک بار امام مالک کی مجلس میں پہنچے تو انہوں نے تعظیم وتکریم کی اور جب واپس ہوئے تو امام صاحب نے حاضرین سے کہا:

ھذا ابن المبارك فقیه خراسان

یہ خراسان کے فقیہ ابن مبارک ہیں۔

ابن شماس کہتے ہیں: میں نے سب سے بڑے فقیہ کو دیکھا اور سب سے بڑے متقی کو بھی اور سب سے زیادہ قوی حافظہ رکھنے والے کو بھی، سب سے بڑے فقیہ ابن مبارک ہیں۔

آپ نے متعدد کتابیں بھی لکھیں، کتاب السنن، کتاب التفسیر، کتاب التاریخ، کتاب البر والصلہ، کتاب الزہد والرقائق۔

(۶) حسن بن زیاد رضی اللہ عنہ ۲۰۴ھ

حسن بن زیاد لولوی کوفی، کوفہ کے باشندے، عظیم فقیہ اور محدث تھے۔ امام اعظم کے مخصوص تلامذہ میں شمار کیے جاتے ہیں اور آپ کی مجلس تدوین فقہ کے اہم رکن تھے۔ مجلس میں سوالات سب سے پہلے آپ ہی پیش کرتے۔ شمس الائمہ سرخسی نے فرمایا:

الحسن بن زیاد المقدم فی السوال والتفریع (الجواھر المضیة ص ۱۲۸)

حسن بن زیاد سوال اٹھانے اور دریافت کرنے میں مقدم تھے۔

اپنی جودت طبع اور نظر وفکر کی بدولت وہ بڑے نادر سوالات پیش کیا کرتے تھے۔ لوگ آپ کے ان سوالوں سے پریشان ہوجاتے۔ علی بن صالح کا بیان ہے: ایک مرتبہ آپ قاضی ابویوسف کی درسگاہ میں پہنچے، قاضی صاحب نے اپنے شاگردوں سے کہا، تم لوگ ان سے فوراً سوالات شروع کردینا اگر انہوں نے سوالات پوچھنا شروع کردیے، تو پھر تمہارے لیے خاموشی کے سوا کچھ چارہ نہ ہوگا۔ امام حسن بن زیاد نے مجلس میں آتے ہی سلام کیا اور اس کے ساتھ ہی ایک سوال کردیا۔ راوی کا بیان ہے:

فقد رایت ابایوسف یلوی وجهه الی هذا الجانب مرة والی هذا الجانب مرة من کثرة ادخالات الحسن علیه ورجوعه من جواب الی جواب ۔

میں نے ابویوسف کو دیکھا، کہ انہوں نے حسن کے اشکالات اور سوال وجواب کی کثرت کی بنا پر ادھر ادھر دیکھنا شروع کردیا۔

حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اوقات کو مختلف حصوں میں تقسیم کررکھا تھا، آپ فجر کی نماز سے فراغت کے بعد زوال کے وقت تک فروعی مسائل میں غور وفکر کرتے تھے، پھر گھر تشریف لاتے اور ظہر کی نماز تک گھریلو امور سرانجام دیتے، ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد عصر تک کا وقت ملاقاتیوں سے ملنے کے لیے مخصوص تھا، عصر سے مغرب تک آپ اصول مسائل میں اپنے اصحاب کے ساتھ بحث ومناظرہ میں مشغول رہتے، مغرب پڑھ کر گھر تشریف لے آتے، کچھ دیر بعد واپس آتے اور عشا کی نماز تک پیچیدہ ترین مسائل پر بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری رکھتے، عشا کی ادائیگی کے بعد رات گئے تک مختلف مسائل پر غور وفکر کا سلسلہ جاری رہتا۔

آپ کے علمی انہماک کا یہ عالم ہوتا، کہ کھانے پینے اور وضو کے وقت بھی فقہی مسائل بیان کرتے رہتے تھے۔ ملا علی قاری لکھتے ہیں:

کان له جاریة اذااشتغل بالطعام اوالوضوء اوبغیر ذلك تقرأ علیه المسائل حتی یفرغ من حاجته ۔(اثمار الجنیة فی اسماء الحنفیة ص۱۲۵)

آپ کی ایک باندی تھی، جب آپ کھانے، وضو یا کسی اور کام میں مصروف ہوتے، وہ آپ سے مسائل پوچھتی، یہاں تک کہ آپ اپنی ضرورت سے فارغ ہوتے۔

پوری پوری رات جاگ کر علمی تحقیق میں بسر کردیتے۔ خود فرماتے ہیں:

مکثت اربعین سنة لاابیت الا والسراج بین یدی ۔

چالیس برس سے ساری رات چراغ میرے سامنے جلتا رہتا ہے۔

آپ کی فقہی جلالت کا اعتراف بہت سے لوگوں نے کیا ہے۔

☆ یحییٰ بن آدم:۔ **مارایت افقه من الحسن بن زیاد** ۔(الجواهر المضیة ص۱۲۷)

میں نے حسن بن زیاد سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا۔

تمر بن حذار سے جب لوگوں نے پوچھا، کہ حسن بن زیاد بڑے فقیہ ہیں یا محمد بن حسن تو انہوں نے کہا، کہ بخدا میں نے حسن بن زیاد کو ایسا دیکھا ہے کہ جب وہ محمد بن حسن سے کوئی سوال کرتے تو یہاں تک ان کو مضطرب کر دیتے تھے، کہ رونے کے قریب ہو جاتے تھے۔ (حدائق الحنفیہ ص ۱۶۳)

۱۹۴ھ میں حفص بن غیاث کے انتقال کے بعد کوفہ کے قاضی بنائے گئے تو تمام تر فقہی صلاحیتوں کے باوجود یہ منصب ان کے لیے ساز گار ثابت نہ ہو سکا اور آپ نے استعفا دے دیا۔

امام اعظم کی کتاب المجرد کی آپ نے روایت کی، اس کے علاوہ یہ کتابیں تصنیف کیں۔

کتاب ادب القاضی، کتاب الخصال، کتاب معانی الایمان، کتاب النفقات، کتاب الخراج، کتاب الفرائض، کتاب الوصایا، کتاب الامالی۔

فقہ میں کمال کے باوصف احادیث نبویہ کے بڑے حافظ تھے، جن کی فقہا کو ضرورت ہوتی تھی، انہوں نے خود فرمایا

سمعت ابن جریج اثنی عشر الف حدیث یحتاج الیہ الفقھاء ۔(اثمار الجنیۃ ص ۱۲۵)

میں نے ابن جریج سے بارہ ہزار ایسی حدیثیں سنیں، فقہا جن کے محتاج ہیں۔

حسن اخلاق کے زیور سے آراستہ تھے، حد درجہ متبع سنت تھے۔

(۷) امام حفص بن غیاث رضی اللہ عنہ ۱۱۷ھ تا ۱۹۴ھ

ابو عمر حفص بن غیاث کوفہ میں پیدا ہوئے، جہاں کا ذرہ ذرہ علم کی تابانیوں سے جگمگا رہا تھا، آپ نے فطری استعداد کے ساتھ تحصیل علم کے کوچے میں قدم رکھا اور مشاہیر علم کی بارگاہوں سے علم و فن کی تحصیل کی۔

اپنے عہد کے مقتدر شیوخ سے کسب علم نے حفص کے علمی درجے کو بہت اونچا کر دیا تھا۔ خاص طور سے حدیث و فقہ میں ان کا پایہ کافی بلند تھا، ان کی ثقاہت اور جلالت فی الحدیث کا اعتراف ائمہ فن نے اس طرح کیا ہے۔

☆ عجلی: ۔ ثقۃ فقیہ مامون (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۵۸)

حفص ثقہ، فقیہ، مامون تھے۔

☆ یحیٰ بن سعید: ۔ اوثق اصحاب الاعمش ۔(ایضا)

حفص اعمش کے شاگردوں میں سب سے زیادہ ثقہ ہیں۔

☆ ابن نمیر: ۔ کان حفص اعلم بالحدیث من ابن ادریس ۔(ایضا)

حفص، ابن ادریس سے بڑے عالم حدیث تھے۔

☆ابوحاتم:۔ **حفص اتقن و احفظ من ابی خالد الاحمر ۔(ایضا)**

حفص ابوخالد الاحمر سے زیادہ متقن اور بڑے حافظ ہیں۔

☆ابن سعد:۔ **کان ثقة مامونا کثیر الحدیث ۔(ایضا)**

حفص، ثقہ، مامون اور کثیر الحدیث تھے۔

☆ابن معین:۔ **کان حفص بن غیاث صاحب حدیث له معرفة ۔(ایضا)**

حفص بن غیاث محدث تھے اور انہیں اس میں پوری مہارت حاصل تھی۔

ابن معین، ابن خراش اور نسائی نے آپ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ (ایضا)

حضرت حفص کو ہزاروں حدیثیں از بر تھیں، ان کا علمی پایہ ان کے شیوخ سے بھی بلند تھا۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

کان حفص کثیر الحدیث حافظا له ثبتا فیه و کان ایضا مقدما علی المشائخ الذین سمع منهم الحدیث ۔(تاریخ بغداد ج۸ ص ۱۹۴)

حفص بن غیاث کثیر الحدیث، حافظ اور ثقہ تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے شیوخ سے بھی بلند مرتبہ تھے۔

انہوں نے علم کی اشاعت میں بڑی فیاضی سے کام لیا اور سخاوت کا پیکر تھے، اپنے اصحاب کو کھانا کھلاتے۔ ابو جعفر مسندی کا بیان ہے:

کان حفص بن غیاث من اسخی العرب و کان یقول من لم یاکل من طعامی لا احدثه واذا کان یوم ضیافته لایبقی راس فی الرواسین ۔(تذکرہ ج ۱ ص ۲۷۴)

حفص تمام عربوں سے زیادہ سخی تھے، فرمایا کرتے تھے، جو میرا کھانا نہیں کھائے گا میں اسے حدیث نہیں پڑھاؤں گا جب وہ دعوت کرتے، تو رواسیوں کے محلے میں ایک آدمی پیچھے نہ رہتا۔

آپ کا حافظہ بہت قوی تھا، ہزاروں حدیثیں سند کے ساتھ حافظے میں محفوظ تھیں اور اپنے تلامذہ کو کتاب کے بغیر درس دیا کرتے تھے۔

ابن معین کہتے ہیں:

جمیع ماحدث به حفص ببغداد وبالکوفة فمن حفظه لم یخرج کتابا کتبوا عنه ثلاثة آلاف و اربعة آلاف حدیث من حفظه ۔

بغداد اور کوفہ میں حفص نے جتنی حدیثیں روایت کیں، سب صرف اپنے حافظہ سے بغیر کتاب کے بیان کیں، لوگوں نے اس طرح ان سے تین یا چار ہزار حدیثیں لکھیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص ۲۷۴)

آپ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا، جس میں طالبان علوم بڑی تعداد میں شریک ہوتے۔

فقہ وقضا

حفص حدیث کی طرح فقہ میں بھی کامل درک رکھتے تھے۔ عجلی کہتے ہیں:

ثبت فقیه البدن (تهذيب ج ۲ ص ۳۵۹)

ان کی فقہی بصیرت کی بنا پر ہارون رشید نے ۱۷۷ھ میں بغداد کے عہدہ قضا پر سرفراز کیا، وہ بڑی شان کے ساتھ قرآن وحدیث اور دلائل ونظائر کی بنیاد پر مقدمات کے بے لاگ فیصلے فرمایا کرتے، اس سلسلے میں کسی عہدہ ومنصب، دولت وثروت اور اثر ورسوخ کی ذرا بھی پروانہ کرتے۔ ان کے فیصلوں کو بڑی قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا۔

قاضی حفص نے ایک قرض دار مجوسی سردار کے مقدمہ میں دلائل وشواہد کی بنا پر اس کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ ۲۹؍ہزار کے اس قرض کا کچھ تعلق ام جعفر سے بھی تھا، چنانچہ اس نے خلیفہ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا، کہ وہ قاضی حفص کو معزول کر دیں، لیکن ہارون رشید اس کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوا، بلکہ وہ اس بے لاگ فیصلہ سے اس قدر خوش ہوا، کہ اس نے حفص بن غیاث کو ۳۰؍ہزار درہم دینے کا حکم دیا۔ لیکن بعد میں جب ام جعفر کا دباؤ بڑھا، تو ہارون نے قاضی حفص کو بغداد کے بجائے کوفہ کا قاضی بنا دیا، جہاں وہ ۱۳؍سال تک اس منصب کی ذمہ داری پوری دیانت کے ساتھ انجام دیتے رہے۔

وہ تقریباً ۱۵؍سال منصب قضا پر فائز رہے، اس پوری مدت میں جرأت، غیر جانبداری، حق گوئی وبے باکی کے ساتھ زیر سماعت قضیوں کا منصفانہ فیصلہ صادر فرمایا کرتے تھے۔ وہ اپنے فیصلوں میں کسی قسم کا دباؤ قبول نہ کرتے، پوری تحقیق اور بصیرت کے ساتھ حق فیصلہ دیتے۔ انہوں نے عہدہ قضا کی تمام تر ذمہ داریوں کو حسن وخوبی کے ساتھ پورا کیا۔ علما ومحققین نے آپ کی حیثیت قضا اور برحق فیصلوں کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ وکیع بن الجراح سے کسی بات کا سوال کیا جاتا، تو فرماتے:

اذهبوا الى قاضينا فسئلوه .

ہمارے قاضی حفص کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو۔

کہا جاتا ہے: **ختم القضاء بحفص** حفص پر قضا کا خاتمہ ہو گیا۔ (ایضا)

(۸) مسعر بن کدام رضی اللہ عنہ م ۱۵۵ھ

ابوسلمہ مسعر بن کدام جلیل القدر تبع تابعین میں تھے، وہ علم وورع کا مجمع البحرین تھے، یعلی بن مرہ کہتے ہیں کہ مسعر کی ذات علم اور ورع دونوں کی جامع تھی۔

ہشام کہتے ہیں کہ عراقیوں میں مسعر اور ایوب سے افضل ہمارے یہاں کوئی نہیں ہے۔

آپ نے ابتدا میں بڑے بڑے محدثین سے علم حدیث حاصل کیا اور اس علم میں ذروہ کمال تک پہنچے، آپ کی ثقاہت وعدالت پر سب کا اتفاق تھا، اختلاف کی صورت میں لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے تھے، سفیان ثوری کا بیان

ہے: جب ہم لوگوں میں حدیث کی کسی چیز کے بارے اختلاف ہوتا تھا، تو مسعر سے پوچھتے تھے۔ ابراہیم بن سعد کہتے تھے: جب سفیان اور شعبہ میں کسی حدیث کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا تو میزان یعنی مسعر کے پاس جاتے تھے۔

اس جلالت علمی کے باوجود روایت حدیث میں بڑے محتاط واقع ہوئے تھے۔

ابتدا میں آپ امام اعظم کے حاسدین میں تھے اور ان کے عیوب شمار کراتے تھے، آپ کا حلقہ درس علاحدہ قائم ہوتا، لیکن ایک بار امام اعظم کی خدمت میں آئے، تو آپ کا زہد و تقویٰ دیکھ کر سخت نادم ہوئے، چنانچہ معتقد ہو کر صحبت اختیار کر لی اور فقہ میں استفادہ کیا۔

سلیم بن سالم کا بیان ہے ہم امام مسعر بن کدام کے درس میں بیٹھے ہوئے تھے، ہم ان سے سوال کرتے تو امام اعظم کے اقوال سے بات شروع کرتے، ایک شخص نے کہا، ہم آپ سے اللہ اور رسول کی بات پوچھتے ہیں، تو آپ بدعتیوں کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ امام مسعر اس شخص سے بہت ناراض ہوئے اور فرمایا تمہاری اس بے ہودہ بات کا جواب صرف یہ ہے کہ تم میری مجلس سے اٹھ کر چلے جاؤ تمہیں معلوم نہیں کہ امام اعظم کا چھوٹا شاگرد حج کے ایام میں خانہ کعبہ کے پاس کھڑا ہو جائے تو ساری دنیا کے علما اسے سنتے رہیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ دعا مانگی: اے اللہ! میں تیرا قرب چاہتا ہوں اور اس کے لیے امام اعظم کا وسیلہ پیش کرتا ہوں۔

آپ کوفہ کے صاحب افتا فقہا کی جماعت میں شامل تھے۔ آپ فقہ میں امام اعظم کے تلمیذ و مقلد تھے اور فقہ حنفی پر فتویٰ دیتے تھے۔

عبداللہ بن مبارک نے کہا: میں نے مسعر کو امام اعظم سے سوال کرتے ہوئے اور استفادہ کرتے ہوئے دیکھا۔

آپ بڑے عابد و زاہد اور متقی تھے۔

(۹) وکیع بن الجراح رضی اللہ عنہ ۱۱۹ھ تا ۱۹۷ھ

ابوسفیان وکیع بن الجراح کوفہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کوفہ کے بیت المال کے نگراں تھے۔ کوفہ علم و فن کا مرکز تھا۔ وکیع نے وہیں تعلیم کا آغاز کیا اور اپنی فطری صلاحیت علم کو بروئے کار لانے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی۔

قدرت نے انہیں حفظ و ذکاوت کی غیر معمولی قوت عطا فرمائی تھی، ان کی ذکاوت و فطانت کے جوہر بچپن ہی سے کھلنے لگے تھے، زمانہ طالب علمی میں ایک حدیث کسی شیخ سے سنی تھی، وہ عمر بھر ان کے حافظے میں محفوظ رہی۔ قاسم جرمی کا بیان ہے:

کان سفیان یدعو وکیعا وھو غلام فیقول ای شی سمعتہ فیقول حدثنی فلان کذا قال وسفیان یتبسم ویتعجب من حفظہ۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۱۱۲)

سفیان ثوری اپنے شاگرد وکیع کو دیکھ کر پوچھتے، جب کہ ابھی وہ بچے تھے، تم نے کون سی حدیث سنی ہے، وہ پوری سند

کے ساتھ اس کو بیان کر دیتے، کہ مجھ سے فلاں شخص نے اس طرح حدیث روایت کی ہے۔ سفیان ثوری اپنے شاگرد کی اس حاضر دماغی کو دیکھ کر مسکراتے اور تعجب وحیرت کا اظہار کرتے۔

وکیع اپنی قوت حفظ کے بارے میں کہتے ہیں: میں نے گزشتہ پندرہ سال کے عرصہ میں سوائے ایک دن کے کبھی کتاب کھول کر نہیں دیکھی اور اس ایک مرتبہ میں بھی سرسری طور سے دیکھا اور دیکھ کر کتاب کو اس کی جگہ رکھ دیا۔

(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۴۷۵)

زمانہ طالب علمی میں دوران درس کبھی حدیثیں قلم بند نہیں کیں، بلکہ گھر آ کر لکھا کرتے تھے۔ خود فرماتے ہیں: میں نے سفیان ثوری کے درس کے وقت کبھی حدیث نہیں لکھی، بلکہ اس کو دماغ میں محفوظ کر لیتا، پھر گھر واپس آ کر لکھتا تھا۔

علی بن حشرم کا بیان ہے:

رایت وکیعا ومارایت بیده کتابا قط انما هو یحفظه فسالته عن دواء الحفظ فقال ترك المعاصی ماجربت مثله للحفظ. (تهذیب التهذیب ج ۱۱ ص ۱۱۳)

میں نے امام وکیع کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی، وہ صرف اپنے حافظہ سے درس دیا کرتے تھے، ان کی حیرت انگیز قوت حفظ وضبط دیکھ کر میں نے ان سے ایسی دوا پوچھی، جس سے حافظہ قوی ہو جائے، انہوں نے فرمایا، اجتناب معاصی سے بڑھ کر قوت حافظہ کے لیے کوئی چیز میرے تجربہ میں نہیں آئی۔

حضرت وکیع نے اپنی بے پناہ قوت حفظ اور ذہانت وذکاوت سے کام لے کر اپنے عہد کے تمام محدثین وفقہا کے خزائن علم وفقہ سے استفادہ کیا اور اس سلسلہ میں رحلت وسفر کی مشقتیں برداشت کیں۔

سچے جذبہ تحصیل علم اور سعی بلیغ نے وکیع کو علم وفن کے اتنے اونچے مقام تک پہنچا دیا، کہ دنیا ان کو امام المسلمین، احد ائمۃ الاسلام اور محدث عراق کے خطابات سے یاد کرنے لگی۔ تحصیل علم کی ابتدا ہی میں بعض شیوخ نے آپ کے شاندار مستقبل کی خبر دے دی تھی۔ امام اعمش نے آپ کا نام پوچھنے کے بعد فرمایا "ما احسب الا سیکون لك نبأ" "میرا خیال ہے کہ تمہارا مستقبل شاندار ہوگا۔ سفیان ثوری نے آپ کی آنکھوں میں دیکھ کر لوگوں سے کہا "ترون هذا الرواسی لایموت حتی یکون له نبأ" "تم لوگ اس رواسی کو دیکھ رہے ہو موت سے پہلے اس کی بڑی منزلت ہو جائے گی۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۶۹)

حلقہ درس اور فضیلت علم

امام وکیع نے حضرت سفیان ثوری کے بعد ان کے جانشین کی حیثیت سے درس دینا شروع کیا۔ یحیٰی بن یمان کہتے ہیں: جب امام سفیان ثوری کا وصال ہوا تو وکیع ان کی جگہ مسند نشیں ہوئے۔

جلد ہی آپ کے درس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور مختلف ملکوں اور شہروں کے طالبان علم کوفہ آ کر حلقہ درس میں شامل ہونے لگے، کوفہ ہی نہیں بلکہ وہ جس مقام پر پہنچتے شائقین علم کا ازدحام ہو جاتا اور وسیع حلقہ درس قائم ہو جاتا تھا۔ آپ کے حلقہ درس

کے سامنے دوسرے تمام حلقہائے درس ویران ہو جاتے تھے۔

امام وکیع نے علم حدیث میں جو دستگاہ بہم پہنچائی تھی، اس کا اعتراف ان کے معاصر محدثین اور بعد کے علمائے فن نے بڑی کشادہ دلی سے کیا ہے۔

☆ احمد بن حنبل: ”مارایت اوعی للعلم من وکیع ولا احفظ منه“ میں نے وکیع سے بڑا علم کا ظرف (جمع کرنے والا) اور ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔ (تہذیب التہذیب ج ١١ ص ١١٠)

☆ ابن معین: ”مارایت احفظ منه ووکیع فی زمانه کالاوزاعی فی زمانه“ میں نے ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔ وکیع اپنے زمانہ میں ایسے ہی ممتاز تھے جس طرح اوزاعی اپنے زمانہ میں۔ (ایضاً ص ١١٣)

فقہ

حدیث کے ساتھ امام وکیع فقہ میں بھی کمال رکھتے تھے، وہ امام اعظم کے شاگرد تھے، انہیں کے مسلک پر فتویٰ دیا کرتے تھے۔ امام یحییٰ فرماتے ہیں:

مارایت افضل منه یقوم اللیل ویسرد الصوم و یفتی بقول ابی حنیفة۔ (تذکرہ ج ١ ص ٢٨٢)

میں نے وکیع سے افضل کوئی آدمی نہیں دیکھا وہ رات کو قیام کرتے، دن کو روزہ رکھتے اور ابو حنیفہ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔

یحییٰ بن معین فرماتے تھے، امام وکیع ابو حنیفہ کے قول کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور انہوں نے امام صاحب سے کافی سماعت کی تھی۔ (تاریخ بغداد ج ١٣ ص ٤٧١)

وکیع امام اعظم کے شاگرد اور ان کے فقہی آرا کے مبلغ اور امام صاحب کی اصابت رائے پر کامل یقین رکھتے تھے۔

آپ کی فقہی بصیرت دیکھ کر ہارون رشید نے کوفہ کے منصب قضا کی پیش کش کی، مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ (تذکرہ ج ١ ص ٢٨٣)

تصانیف

امام وکیع نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کو بھی اپنا مشغلہ بنایا تھا، امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے۔ وکیع کی تصنیف کردہ کتابوں کا بالالتزام مطالعہ کرو ”علیکم بمصنفات وکیع“ (تذکرہ ج ١ ص ٢٨٣)

امام ابن جوزی نے تحریر فرمایا ”صنف التصانیف الکثیرة“ انہوں نے بکثرت کتابیں تصنیف کیں۔ (صفة الصفوہ ج ٣ ص ١٦٤)

خیر الدین زرکلی لکھتے ہیں ”له مصنف فی الفقه والسنن“

افسوس ہے کہ دوسرے اسلاف کی طرح حضرت وکیع کی مصنفات بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئیں۔ آج ان کی دو کتابوں

کے نام ملتے ہیں۔ (۱) مصنف ابی سفیان (۲) کتاب السنن۔

(۱۰) یزید بن ہارون رضی اللہ عنہ ۱۱۸ھ تا ۲۰۶ھ

کنیت ابو خالد اسم گرامی یزید سلسلہ نسب یہ ہے: یزید بن ہارون بن زاذان بن ثابت۔ آپ کا وطن واسط تھا۔ آباو اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ قبیلہ سلم کے غلام تھے، اس لیے سلمی کہلائے۔ آپ کی ولادت ۱۱۸ھ میں ہوئی اور زندگی کے بیشتر ایام یہیں بسر ہوئے۔

امام یزید نے اپنے وطن واسط میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر طلب علم کا ذوق انہیں کشاں کشاں اسلامی بلاد وامصار کے علمی مرکزوں تک لایا اور انہوں نے اپنے زمانہ کے اکابر تابعین ومحدثین سے حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کی۔

یزید بن ہارون نے غیر معمولی حافظے اور تحصیل علم کے بے پایاں ذوق کے ساتھ رحلت وسفر کی مشقتیں برداشت کر کے علما وشیوخ کی بارگاہوں سے اکتساب علم کیا تھا اور وہ علم کا ظرف بن گئے تھے۔ انہوں نے دوسری صدی کے نصف آخر میں علم وعمل کی ایسی شمع فروزاں کی جس سے ہزاروں قلوب واذہان نے روشنی حاصل کی اور ان کی عظمت وجلالت کا سکہ علمی دنیا میں چلتا رہا۔ ان کی درسگاہ حدیث وفقہ کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ حدیث میں ان کی عظمت ورفعت کا اعتراف بڑے بڑے ائمہ فن نے کیا ہے۔

☆ احمد بن حنبل:۔ ”**کان حافظا للحدیث صحیح الحدیث عن حجاج بن ارطاۃ**“ وہ حافظ حدیث تھے حجاج بن ارطاۃ کی حدیثوں کے صحیح ناقل تھے۔ (تہذیب ج ۱۱ ص ۳۲۱)

☆ ابن مدینی:۔ ”**ھو من الثقات ...... مارایت احفظ منہ**“ وہ ثقہ تھے، میں نے ان سے بڑا حافظ کسی کو نہیں دیکھا۔ (ایضا ص ۳۲۲)

☆ ابن حبان:۔ ”**کان من خیار عباد اللہ تعالیٰ ممن یحفظ حدیثہ**“ وہ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں میں سے تھے، جن سے حدیثیں یاد کی جاتی ہیں۔ (ایضا)

☆ ابن سعد:۔ **کان ثقۃ کثیر الحدیث** ۔ وہ معتبر اور کثیر الحدیث تھے۔ (ایضا)

یزید بن ہارون کو قدرت نے غیر معمولی قوت حفظ وضبط سے سرفراز فرمایا تھا۔ علی بن مدینی جیسے محدث نے فرمایا، میری نظر میں یزید بن ہارون سے بڑھ کر کوئی حافظ حدیث نہیں۔ خود امام یزید فرمایا کرتے تھے:

> **احفظ اربعۃ وعشرین الف حدیث بالاسناد ولا فخر واحفظ للشامین عشرین الفا لا اسال عنہ** ۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۲۹۲)

مجھے مع اسناد ۲۴ رہزار احادیث حفظ ہیں اور اس پر کوئی فخر نہیں۔ نیز مجھے شامی اساتذہ کی بیس ہزار حدیثیں اس طرح یاد ہیں کہ مجھے ان کے متعلق کچھ پوچھنے کی حاجت نہیں ہے۔

فقہ

یزید بن ہارون فقہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، کسی نے امام احمد سے پوچھا کیا ہارون فقیہ تھے؟ جواب دیا ”**نعم ما کان افطنه واذکاه وافقهه**‘ ہاں! ان سے زیادہ ذہین وفطین اور عقل وشعور والا میری نظر سے نہیں گزرا۔ سائل نے کہا، اچھا ابن علیہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ فرمایا ”**کان له فقه لا اعلم انی لم اخبره خبری یزید**‘ وہ فقیہ ضرور تھے، لیکن مجھ کو ان کی نسبت اتنا علم نہیں جتنا کہ یزید بن ہارون کی نسبت ہے۔ (تہذیب ج ۱۱ ص ۳۲۳)

یزید بن ہارون فقہ میں امام اعظم کے شاگرد رشید تھے اور فقہ حنفی کے مبلغ کی حیثیت سے ان کو شہرت حاصل تھی۔ انہوں نے اس فقہ کو عام کرنے میں بڑی جدوجہد کی۔

ایک دن امام یزید بن ہارون رحمہ اللہ درس کے دوران امام اعظم کے ارشادات سنا رہے تھے، کہ کسی نے کہا ہمیں حدیثیں سنایئے اور لوگوں کی باتیں نہ کیجیے۔ آپ نے اس سے فرمایا، اے احمق! یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تفسیر ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ تمہارا مقصد صرف حدیثیں سننا اور جمع کرنا ہے، اگر تمہیں علم حاصل کرنا ہوتا تو تم حدیث کی تفسیر اور معانی معلوم کرتے اور امام اعظم ابوحنیفہ کی کتابیں اور ان کے اقوال دیکھتے جو تمہارے لیے حدیث کی تفسیر کرتے ہیں، پھر آپ نے اس کو ڈانٹ کر مجلس سے باہر نکال دیا۔ (مناقب للموفق ج ۲ ص ۳۴۴)

آپ فرمایا کرتے تھے، میں بے شمار لوگوں سے ملا ہوں، مگر میں نے کسی کو امام اعظم سے بڑھ کر عاقل، فاضل اور پرہیزگار نہیں پایا۔ (تبییض الصحیفہ ص ۲۵)

علمی دبدبہ

حضرت یزید بن ہارون ان عظیم فقہا ومحدثین میں تھے، جن کی علمی شان اور تمکنت کا سکہ دلوں پر چلتا تھا۔ عوام ہوں یا خواص سب کے دل پر ان کے کمالات علمی کا رعب قائم تھا اور ان کی شخصیت سے خود خلیفہ مامون الرشید بھی مرعوب تھا۔ وہ یونانی منطق وفلسفہ کا دلدادہ تھا، جس کے اثر سے خلق قرآن کا فتنہ رونما ہوا۔ مامون خود بھی قرآن کو مخلوق مانتا تھا، مگر اس باطل عقیدے کی برملا تشہیر اور اعلان سے یزید بن ہارون کی شخصیت مانع تھی۔

یحییٰ بن اکثم کا بیان ہے، ایک مرتبہ مامون نے ہم سے کہا، ”**لولا مکان یزید بن هارون لاظهرت القرآن مخلوق**“ اگر یزید بن ہارون کے وقار کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں قرآن کے مخلوق ہونے کا اظہار کر دیتا۔

یزید بن ہارون کا مستقل حلقہ درس واسط میں قائم ہوتا تھا، جب وہ بغداد جاتے وہاں بھی شائقین علم ان کے گرد جمع ہو کر درس حدیث لیتے۔ ان کے حلقہ درس میں لوگوں کا ازدحام ہوتا کبھی کبھی شرکائے درس کی تعداد ستر ہزار تک پہنچ جاتی۔

(۱۱) یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ رضی اللہ عنہ ۱۲۰ھ تا ۱۸۲،۸۳ھ

اسم گرامی یحییٰ، کنیت ابوسعید، سلسلہ نسب یہ ہے: یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ میمون بن فیروز ہمدانی کوفی۔ والد کا نام زکریا تھا، لیکن اپنے دادا ابوزائدہ کی نسبت سے مشہور ہیں۔

محمد بن مبشر سے ولاء کا تعلق رکھتے تھے۔ کوفہ میں ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے۔ کوفہ اس زمانے میں علم وفن کا زبردست مرکز تھا، جہاں کے چپہ چپہ سے علم وفضل کی شعاعیں پھوٹتی تھیں، آپ کے والد حضرت زکریا خود صاحب علم اور محدث تھے۔ یحییٰ کو علم کی مناسبت وراثت میں ملی تھی۔

یحییٰ ایک محدث وفقیہ کے فرزند تھے، اس لیے ابتداہی سے اپنے والد کے زیرسایہ علمی ماحول میں پروان چڑھے۔ حضرت زکریا اپنے فرزند کو بڑا عالم بنانا چاہتے تھے۔ یحییٰ بن یونس کا بیان ہے: میں نے زکریا بن ابی زائدہ کو دیکھا کہ اپنے صغرسن بچے یحییٰ کو مجالد بن سعید کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے۔ (تہذیب التہذیب ج۱۱ص۱۸۴)

انہوں نے فطری صلاحیت، والد کی تربیت اور کوفہ کی علمی فضا سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور علم وفضل میں اتنا کمال پیدا کیا کہ وقت کے ممتاز شیوخ میں شمار کیے جانے لگے۔

یحییٰ بن ابی زائدہ علم وفن میں 'تیازی شان کے مالک تھے، حدیث ان کا خاص میدان تھا، اس باب میں ان کی رفعت وبلندی کا اعتراف بڑے بڑے ائمہ حدیث نے کیا ہے۔

☆ علی بن مدینی:۔ ''لم یکن بالکوفة بعد سفیان الثوری اثبت منه ......انتهی العلم الی یحییٰ بن ابی زائدة فی زمانه'' سفیان ثوری کے بعد کوفہ میں ان (یحییٰ) سے زیادہ پختہ کار کوئی نہیں تھا۔ یحییٰ بن ابی زائدہ کے زمانہ میں علم ان پر ختم ہوگیا ہے۔ (تذکرہ ج۱ص۲۴۷)

☆ ''ابوحاتم:۔ ''مستقیم الحدیث ثقة صدوق'' یحییٰ مستقیم الحدیث ثقہ صدوق تھے۔

(تہذی التہذیب ج۱۱ص۱۸۳)

☆ امام نسائی:۔ ''ثقة ثبت'' وہ ثقہ اور ثبت تھے۔ (ایضا)

☆ ابوخالد:۔ ''کان جید الاخذ'' وہ اخذ حدیث میں جید تھے۔ (تہذیب التہذیب ج۱۱ص۱۸۳)

☆ ابن عیینہ:۔ ''ماقدم علینا مثل ابن المبارك ویحییٰ بن ابی زائده'' ہمارے پاس عبداللہ بن مبارک اور یحییٰ بن ابی زائدہ جیسا کوئی محدث نہیں آئے۔ (ایضا)

☆ عجلی:۔ ''ثقة وهو جمع له الفقه والحدیث وکان علی قضاء المدائن ویعد من حفاظ الکوفیین للحدیث متقنا ثبتا صاحب سنة'' یحییٰ معتبر ہیں اور ان کی حدیث وفقہ کو جمع کیا گیا ہے وہ

مدائن کے قاضی تھے۔ وہ کوفہ کے حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے، متقن، ثبت اور صاحب سنت تھے۔ (ایضا)

یحییٰ اپنے زمانے میں اسناد کے سب سے بڑے مدار تھے۔ علی بن مدینی کا بیان ہے: اسناد کا دارومدار پہلے زمانہ میں چھ بزرگوں پر تھا، پھر ان کا علم ایسے مختلف اصحاب کی طرف منتقل ہوا، جنہوں نے علم کی مختلف شاخوں میں کمال پیدا کیا، پھر ان سب کا علم دو بزرگوں پر آ کر ختم ہو گیا، ایک ابوسعید یحییٰ بن سعید جو بنو تمیم کے غلام تھے (م ۱۹۸ھ) اور دوسرے بزرگ یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ ہیں۔ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۱۷)

تصانیف

یحییٰ بن ابی زائدہ محدثین کوفہ میں سب سے پہلے امام فن ہیں، جنہوں نے حدیث میں کتاب تصنیف کی۔ خطیب بغدادی، سمعانی، علامہ ابن حجر سب اس بات پر متفق ہیں ''هو اول من صنف بالكوفة'' 'یحییٰ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے کوفہ میں کتابیں تصنیف کیں۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں، یحییٰ ثقہ حسن الحدیث تھے لوگ کہتے ہیں وہ کوفہ کے اولین صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ (تہذیب ج ۱۱ ص ۱۸۴)

آپ کا انداز تصنیف اس قدر مقبول ہوا، کہ دوسرے ائمہ فن نے ان کی تفسیر میں کتابیں لکھیں، حضرت وکیع نے اپنی کتابوں میں حضرت یحییٰ کی کتابوں کی پیروی کی ہے۔ عجلی کہتے ہیں: ''وكيع انما صنف كتبه على كتب يحيىٰ بن ابى زائدة'' (ایضا)

امتداد زمانہ کی وجہ سے ان کی کتابیں ناپید ہو چکی ہیں، ابن ندیم نے ان کی ایک کتاب کتاب السنن کا ذکر کیا ہے۔

فقہ

حضرت یحییٰ حدیث کی طرح فقہ میں بھی کمال رکھتے تھے۔ آپ امام اعظم کے شاگرد تھے، بکثرت آپ کی مجلس میں حاضری دیتے اور فقہ میں درک حاصل کیا۔ اسی مسلک فقہ پر فتویٰ دیتے امام اعظم کی صحبت سے ان کے اندر اجتہاد و استنباط مسائل کی قوت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جلیل القدر محدث ہونے کے باوجود صرف عطار ہی نہ تھے، بلکہ طبیب بھی تھے۔

ایک بار امام عجلی کے سامنے یحییٰ بن ابی زائدہ کا ذکر آیا، انہوں نے فرمایا، حضرت یحییٰ کے والد زکریا بن ابی زائدہ ثقہ تھے، ان کے فرزند یحییٰ بھی ثقہ ہیں اور یہ دونوں باپ بیٹے ان اکابر امت میں سے ہیں جو حدیث و فقہ دونوں کے جامع تھے۔

(تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۱۶)

حسن بن ثابت ایک بار حضرت یحییٰ بن ابی زائدہ سے ملاقات کر کے واپس ہوئے تو انہوں نے بیان کیا کہ میں کوفہ کے سب سے بڑے فقیہ یحییٰ بن ابی زائدہ کے پاس مہمان تھا۔ (تہذیب ج ۱۱ ص ۱۸۳)

آپ کو ہارون رشید نے مدائن کا قاضی بنایا تھا، جہاں چار سال تک فقہ حنفی کے مطابق مقدمات کے فیصلے کیے اور وہیں انتقال فرمایا۔

(۱۲) حماد بن ابی حنیفہ رضی اللہ عنہ م ۱۷۹ھ

ابو اسماعیل حضرت حماد، امام اعظم کے اکلوتے صاحبزادے، علم وتقویٰ میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ حدیث وفقہ کی تعلیم والد بزرگوار سے حاصل کی تھی۔ آپ ان عظیم فقہا میں ہیں، جو امام اعظم کی مجلس تدوین فقہ کے رکن تھے۔ فقہ کے ساتھ حدیث وسنت کی کتابت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ تفقہ میں آپ کی عظمت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے، کہ امام اعظم کی زندگی ہی میں فتویٰ دینے لگے تھے، فقہا آپ کو امام ابو یوسف، محمد بن حسن، زفر اور حسن بن زیاد کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔ آپ بڑے زاہد اور عبادت گزار تھے۔

سمعانی کہتے ہیں: حماد زہد وعبادت، فقہ وکتابت حدیث میں مشغول رہا کرتے تھے۔

فضل بن دکین کا بیان ہے: کہ ایک مرتبہ حماد کسی گواہی کے سلسلے میں قاضی شریک کے پاس تشریف لے گئے، تو انہوں نے کہا اے حماد! آپ عفیف البطن (حرام کھانے سے بچنے والے) اور عفیف الفرج (حرام کاری سے بچنے والے) مسلمان اور نیک آدمی ہیں (مناقب کردری)

بشر بن ولید نقل کرتے ہیں حماد بد مذہبوں کے معاملے میں بہت سختی کیا کرتے تھے۔ ان کے دلائل کی توڑ اور اتمام حجت کے سلسلے میں مشہور تھے۔ آپ کے دلائل کا جواب مخالفین کے مانے ہوئے متکلمین کے پاس بھی نہیں ہوتا تھا۔

قاسم بن معن کے بعد آپ کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا گیا، پھر بغداد کا عہدہ قضا آپ کے سپرد ہوا، آخر میں بصرہ کے قاضی مقرر ہوئے اور اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ جب آپ پر فالج کا حملہ ہوا، عہدے سے مستعفی ہوئے۔ جب حماد بصرہ کے عہدہ قضا سے الگ ہوئے تو یحییٰ بن اکثم رسم مشایعت کے طور پر ساتھ ہو لیے، لوگوں کو اکٹھا کیا گیا، لوگوں نے کہا، آپ ہمارے مال اور جانوں سے بری الذمہ ہیں۔

آپ کی ذہانت وتقویٰ پر خود امام اعظم ابوحنیفہ کو بھی کامل اعتماد تھا، چنانچہ حسن بن قحطبہ نے امام صاحب کے پاس ایک ہزار دینار بطور امانت رکھوایا، امام صاحب سے عرض کیا گیا، آپ نے اتنی بڑی رقم بطور امانت رکھ لی ہے، لیکن اس میں کئی قسم کے خطرات پوشیدہ ہیں، امام صاحب نے فرمایا "من كان مثل ابن حماد في الورع فانه يقبل" جس کا بیٹا حماد جیسا پرہیز گار وامین ہو اسے کوئی تردد نہیں۔

جب امام اعظم کا انتقال ہوا، تو حسن بن قحطبہ حماد کے پاس آئے اور امانت طلب کی، حماد نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا، کہ آپ کی امانت آپ کے اپنے ہاتھ کے بندھے ہوئے کپڑے میں اسی حالت میں موجود ہے، آپ اسے لے جاسکتے ہیں۔ (مناقب کردری، الجواہر المضیہ ص ۲۸۶)

آپ کے چار صاحبزادے تھے۔ اسماعیل، ابوحیان، عمر اور عثمان۔ اسماعیل بن حماد مامون کے زمانے میں بصرہ کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔

فقہ حنفی کا شیوع

امام اعظم کی زندگی ہی میں اہل عراق کی اکثریت فقہ حنفی پر عمل پیرا ہو چکی تھی، آپ کی وفات کے نصف صدی گزرتے گزرتے فقہ حنفی آپ کے تلامذہ اور تلامذہ کے شاگردوں کے ذریعے باستثناے اندلس ساری مملکت اسلامیہ میں پھیل چکی تھی اور امام کے مقلدین کا ایک وسیع حلقہ ہر جگہ پایا جانے لگا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، کہ فقہ حنفی کی اتنے بڑے پیمانے پر اشاعت اس وجہ سے ہوئی، کہ امام اعظم کے شاگردوں نے مسند قضا پر بیٹھ کر فقہ حنفی کے مطابق فیصلے کیے، اس طرح بالواسطہ حکومت وقت فقہ حنفی کی اشاعت میں مدد و معاون ہوئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فقہ حنفی کا دائرہ اس قدر وسیع نہ ہوتا، یہ خیال ایک خیال خام ہے، فقہ حنفی کی جامعیت، اس کے شیوع میں معاون ہوئی، امام اعظم اور ان کے شاگردوں نے جس وسیع پیمانے پر عبادات کے ساتھ معاملات، سیاسی و سماجی مسائل اور نئے پیش آمدہ مباحث کو اپنی تدوینی سرگرمیوں کا محور بنایا اور قدیم و جدید مسائل سے متعلق لاکھوں جزئیات فراہم کر دیے، جو دیگر فقہا و مجتہدین کے مستنبط مسائل سے کہیں زیادہ ہیں، جن میں ہر مسئلہ کا حل دین و شریعت کی روح کے ساتھ موجود ہے، یہی وجہ تھی، کہ وقت کے فرمانروا فقہاے احناف کو عدالتوں کی ذمہ داریاں دینے پر مجبور ہوئے تاریخ شاہد ہے کہ فقہائے قضا کے عہدوں سے حتی الامکان بچتے تھے، انہوں نے عدلیہ کے مناصب کی خواہش کا اظہار کبھی نہیں کیا اور نہ اس سلسلے میں امرا و خلفا کی دریوزہ گری کی، بلکہ حکومت وقت سلطنت کے وسیع کاروبار کو چلانے کے لیے جس جامع قانون کی ضرورت محسوس کر رہی تھی، اسے صرف فقہ حنفی پورا کر رہی تھی، اس لیے یہ کہنا کہ فقہ حنفی حکومت کے بل بوتے پر پھیلی تاریخ اور انصاف کا خون کرنا ہے۔

فقہ حنفی کے شیوع اور اس کے پھیلاؤ کا واحد سبب اس کی جامعیت ہے اور وہ جامعیت اس طور پر پیدا ہوئی، کہ امام اعظم نہ صرف فقیہ و مجتہد تھے، بلکہ ایک بڑے تاجر بھی تھے اور انہوں نے بسلسلہ تجارت مختلف علاقوں کا سفر بھی کیا تھا۔ تجارت اور اقتصادیات سے متعلق بہت سی پیش آمدہ پیچیدگیوں اور نت نئے مسائل کا انہیں ادراک تھا۔ نیز مرکز تدوین فقہ کوفہ بہت سے عربی، عجمی قبائل کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ شہر کوفہ عرب و عجم کے تمدن کا سنگم تھا، جہاں ہر روز نئے نئے مسائل پیش آتے تھے، تمدن کی وسعت نے ہزارہا نئے مسئلوں کو جنم دے دیا تھا۔ عباسی دور کی ابتدا میں اس کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہو گیا تھا اور لوگ نئے پیش آمدہ مسائل میں اپنے شہروں کے علما سے رجوع کر رہے تھے۔ بالخصوص کوفہ جو نئے مسائل کی آماجگاہ تھا، لوگ امام ابوحنیفہ کی طرف

رجوع کرتے، احمد امین مصری اس صورت حال کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ومن اسباب التضخم ان المملكة الاسلامية اصبحت فی صدر الدولة العباسية بعيدة الاطراف تضم بين جوانبها امما مختلفة لكل امة عادات اجتماعية وعادات قانونية وطرق فی المعاملات ولكل امة دين له تقاليد فلما دخلت هذه الامم فی الاسلام واستقرت الامور فی العهد العباسی وصبغت الامور كلها صبغة دينية عرضت هذه العادات والتقاليد على الائمة فعرضت امور العراق على ابی حنيفة وامثاله وفيها العادات الفارسية والعادات النبطية وغيرها فكان من عمل هؤلاء الائمة النظر اليها بالقواعد العامة للاسلام واقرار بعضها وانكار بعضها وتعديل بعضها وهذا بلا شك باب واسع من الابواب التی تضخم التشريع وتغذيه ۔ (ضحیٰ الاسلام ج ٢ ص ١٦٥)

> مسائل کی گونا گونی کی وجہ یہ ہے، کہ عباسی دور حکومت کی ابتدا ہی میں اسلامی مملکت کے حدود بہت وسیع ہو گئے تھے، جن میں مختلف قومیں آباد تھیں، جن کا تمدن، عادتیں اور قانون بہت مختلف تھے اور طریق عبادت ومعاملات کی بھی بہت متنوع شکلیں رائج تھیں، لیکن جب یہ مختلف قومیں عباسی عہد تک اسلام میں داخل ہو گئیں اور اسی دور میں استقرار آیا اور سب کاموں پر دینی رنگ چڑھ گیا تو ان مختلف قوموں کو جو مسلمان ہوئیں اپنے اپنے خصوصی تمدن وعادات کو بھی اسلامی رنگ دینے پر مجبور ہونا پڑا، اس کے لیے انہیں اپنے اپنے علاقے کے فقہا سے رجوع کرنے کی ضرورت ہوئی، چنانچہ عراق کے لوگوں نے جن میں فارسی نبطی وغیرہ تمدنوں کی نمود تھی، امام ابوحنیفہ اور ان کے درجہ کے لوگوں سے رجوع کیا، تو ان ائمہ نے ان سب باتوں پر گہری نظر ڈال کر اسلام کے عام اصول وقواعد کی روشنی میں انہیں زندگی گزارنے کے لیے ان کے رواجوں میں کتر بیونت کی یعنی اسلام سے جو چیزیں ہم آہنگ تھیں انہیں برقرار رکھا اور جو صریحاً مخالف تھیں ان کو بدل دیا اور جن میں جزوی تبدیلی سے کام چل سکتا تھا، ان میں بقدر ضرورت ہی تغیر کیا۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا اور اہم کام تھا، جسے ان ائمہ نے انجام دیا، جس سے شریعت کو غذا اور وسعت ملی۔

امام اعظم کو ان مسائل میں اسلامی نقطہ نظر واضح کرنے کی اولیت کا شرف حاصل ہے۔ آپ نے سب سے پہلے وقت کی اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے فقہی مسائل کو مآخذ شریعت کی روشنی میں مستنبط کرنے کا فیصلہ فرمایا، جس کے لیے انہوں نے علم وتفقہ میں غیر معمولی قوت استنباط واجتہاد کے باوجود اتنے عظیم کام کے لیے تنہا اپنی ذات پر انحصار نہیں کیا، بلکہ علوم اسلامیہ کے ماہرین، لغت وعربیت کے رمز شناس، سیاسی، ملکی، تجارتی، سماجی، اقتصادی امور ومسائل پر نظر رکھنے والے ارباب فضل وکمال کو اپنے ساتھ شریک کیا اور انہیں ہر مسئلہ پر کھل کر بحث کرنے اور مسائل کی تنقیح کا آزادانہ حق عطا کیا، اس طرح شورائی نظام کے ذریعہ فقہ حنفی مدون ہوئی اور مسائل کے ممکنہ تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر حتمی فیصلہ کیا گیا جو دین فطرت کے مطابق تھا، یہی وجہ ہے کہ جب اس قانون فقہی کی اشاعت ہوئی تو لوگوں نے اسے بطیب خاطر قبول کیا۔

فقہ حنفی کی قبولیت عام کی ایک اہم وجہ امام ابوحنیفہ کے اصول واجتہاد واستنباط کی وسعت بھی ہے کہ امام صاحب نے ادلہ اربعہ کتاب وسنت، اجماع وقیاس کے علاوہ قضایاے صحابہ، استحسان، عرف استصحاب اور مصالح مرسلہ سے بھی مسائل کے استخراج واستنباط میں مدد لی، جب کہ دوسرے ائمہ کے نزدیک اتنے اصول استنباط نہیں۔

فقہ حنفی کی وسعت کا ایک سبب یہ بھی ہے، کہ اس زمانے میں فقہ تقدیری کو عام طور پر معیوب خیال کیا جاتا تھا، مگر امام صاحب نے اس میدان میں اپنی فکری صلاحیتیں صرف فرما کر ہزاروں تقدیری مسائل کا حل مستنبط فرما کر امت مسلمہ کے لیے وہ آسانی فراہم کردی، جس سے دوسرے فقہا کا دامن اجتہاد تقریبا خالی ہے۔ اگر چہ بعض ناقدین امام نے اس بنیاد پر طنزاً یہاں تک کہا، ”اعلم الناس بمالم یکن“ لیکن امام صاحب کو مسلمانوں کے معاملات ومسائل اوران کی پیش آنے والی مشکلات کا احساس قبل ازوقت ہوگیا تھا، ان کا نقطہ نظر تھا، کہ معاملات اور مسائل سامنے آنے سے پہلے ہی ان کا شرعی حل ڈھونڈ لیا جائے، آپ فرمایا کرتے تھے:

انا نستعد للبلاء قبل نزولها فاذا ماوقع عرفنا الدخول فيه والخروج منه ۔

(تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۸)

مصیبت آنے سے پہلے اس کے مقابلے کے لیے ہم تیاری کر لیتے ہیں، تاکہ جب وہ پیش آئے تو ہمیں معلوم رہے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔

ایک بار آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

لولا هذا لبقى الناس فى الضلالة ۔ (کردری ج ۱ ص ۴۴)

اگر یہ تیاری نہ ہو تو لوگ گم کردہ راہ ہو جائیں گے۔

فقہ حنفی میں ہر زمانے کے جدید مسائل کا حل پیش کرنے کی کامل صلاحیت موجود ہے۔ امام اعظم نے مسائل فقہیہ کے استنباط میں انسانی فطرت کا لحاظ کیا ہے، کیوں کہ اسلام دین فطرت ہے، اس بنا پر ایسے مسائل میں جہاں کوئی نص موجود نہ ہو یا روایات مختلف ہوں، تو مذہب حنفی میں عام طور پر فطری تقاضوں کو وجہ ترجیح قرار دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مسواک کے متعلق ”عند كل صلوة“ کی روایت کے مقابلے میں ”عند كل وضوء“ کو اس لیے ترجیح حاصل ہے، کہ یہ روایت فطری تقاضے کے قریب تر ہے۔ چوں کہ مسواک فطری طور پر منہ اور دانتوں کی صفائی کے کام آتی ہے اور صفائی طہارت کا جز ہے اس لیے احناف کے نزدیک مسواک وضو کی سنت ہے۔ جب کہ دیگر ائمہ کے نزدیک مسواک نماز کی سنت ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ نے فرمان الٰہی ”یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر“ کے مطابق فرض اور حرام کی تعریفات میں سخت قیود لگا کر لوگوں کے لیے آسانی پیدا کی ہے۔ آپ کے نزدیک فرض وحرام کا اثبات ایسی نص سے ہوتا ہے، جو ثبوت اور دلالت دونوں اعتبار سے قطعی ہو۔ اسی طرح امام اعظم کے وضع کردہ دیگر اصولوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حنفی فقہ دیگر فقہوں کے مقابلے میں نہایت

آسان اور نرمی پر مبنی ہے۔

جن معاملات میں ائمہ کا اجتہادی اختلاف ہے، ان میں اگر امام اعظم کے موقف کا تجزیہ کیا جائے تو آپ کا نقطہ نظر مبنی براحتیاط نظر آئے گا۔

یہ وہ اہم خصوصیات ہیں جن کی بنا پر فقہ حنفی کو مسلمانوں کے ہر طبقہ نے قبول کیا اور ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والوں نے اس کی رہنمائی میں زندگی بسر کی، چنانچہ عہد امام اعظم سے لے کر آج تک یہ مکتب فقہ اپنی پوری قوت وتوانائی کے ساتھ پھیلتا چلا جارہا ہے، دنیا کے تمام ملکوں میں امام اعظم کے مقلد موجود ہیں، بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا، کہ آج حنفی مسلک فقہ پر چلنے والے مسلمان سب سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں اور امام کی یہ مقبولیت ان کی فقہ کی عظمت وہمہ گیری حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس دعا کا ثمرہ ہے، جو آپ نے امام صاحب کے والد اور ان کی اولاد واحفاد کے بارے میں ارشاد فرمائی تھی۔ امام صاحب کے پوتے اسماعیل بن حماد کا بیان ہے:

نحن نرجوا ان یکون اللہ تعالیٰ قد استجاب بعلی فینا ۔(تبییض الصحیفہ ص ۵)

ہم امید رکھتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کی دعا ہمارے حق میں ضرور قبول فرمائی ہے۔

محدث علی قاری نے گیارہویں صدی ہجری میں حنفی مذہب کے مقلدین کو تمام اہل اسلام کا دوتہائی قرار دیا ہے۔

(مرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۱ ص ۲۴)

امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں:

کسی تکلف اور تعسف کے بغیر کہا جاسکتا ہے، کہ کشف کی نظر میں مذہب حنفی ایک عظیم دریا کی صورت میں نظر آتا ہے اور دوسرے مذاہب نہروں کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں، ظاہری نظر سے بھی دیکھا جائے تو امت مسلمہ کا سواد اعظم امام اعظم ابوحنیفہ کا پیروکار ہے۔ (مکتوبات دفتر دوم مکتوب ۵۵)

علامہ ابن خلدون ۷۳۲ھ تا ۸۰۸ھ فقہ حنفی کے متبعین کی کثرت اور اس کے بعض اسباب کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

آج امام ابوحنیفہ کی فقہ کے پیرو اہل عراق، مسلمانان ہند وچین وماوراء النہر اور تمام بلاد عجم کے اہل اسلام ہیں، کثرت کی وجہ دراصل یہ ہوئی، کہ اول تو اس مذہب حنفی نے دارالاسلام عراق میں جنم لیا، جس کو قدرتاً مقبولیت عامہ نصیب ہونی چاہیے، پھر ان کے شاگردوں نے خلفاے عباسیہ کی صحبت میں رہ کر تالیفات کے تودے لگادیے تھے، شافعیوں کے ساتھ ان کے زبردست مناظرے رہے اور اختلافی مسائل میں اچھی اچھی بحثیں ان کے قلم سے نکلیں، یوں وہ علم میں منجھ گئے اور عمیق النظر بن گئے اور جو کچھ ان کی فضیلت وبرتری تھی وہ منظر عام پر آگئی۔ حنفیوں کے کچھ علمی کارنامے قاضی ابن العربی اور ابوالولید الباجی کے توسط سے مغرب میں پہنچ گئے۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۳۰، ۴۳۱)

ابن خلدون کا یہ تجزیہ تقریباً سوا چھ سو سال پرانا ہے، اس دور میں فقہ حنفی کی مقبولیت اور اس کے متبعین کے دائرے میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے، عراق، ایران، افغانستان، پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، چین، برما، سری لنکا، نیپال، ترکی، مصر، شام، سوڈان، یورپ وامریکہ میں جہاں بھی سنی مسلمان موجود ہیں ان کی غالب اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے۔ مصر جہاں امام شافعی نے اپنی فقہ کو از سر نو مرتب کیا تھا، وہاں بھی حنفیوں ہی کی اکثریت ہے اور حکومت کا آئین ودستور مسلک حنفی ہی ہے۔ اس طرح بلا شک وشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے، کہ دنیا میں مسلمانوں کی دو تہائی سے زیادہ اکثریت حنفی فقہ پر عمل کرتی ہے۔

فقہ حنفی کی عالم گیر مقبولیت کا اندازہ ۱۹۱۱ء کی اس رپورٹ سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جس میں عالمی سطح پر تمام مسلمانان عالم کے فقہی مسالک کے ماننے والوں کا عمومی جائزہ پیش کیا گیا تھا، کہ کس مسلک کے ماننے والوں کی تعداد کیا ہے۔

زیدیہ مکتب فکر کی تعداد تقریباً ۳۰/لاکھ اثنا عشریہ ایک کروڑ ۳۵/لاکھ
اور اہل سنت وجماعت میں سے امام احمد کے مقلدین کی تعداد تقریباً تیس لاکھ
امام مالک کے مقلدین چار کروڑ امام شافعی کے مقلدین تقریباً دس کروڑ
امام اعظم کے مقلدین تقریباً چونتیس کروڑ۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مختصر لیڈن ۱۹۱۱ء)

◆ ◆ ◆

فقہ حنفی کا قبول عام

قرآن وحدیث کے احکام اور صحابہ وتابعینؒ کے فیصلوں اور فتاوی کی نظیروں کی چھان بین کر کے اہل علم کی ایک مجلس نے ابوحنیفہ جیسے متبحر عالم اور نکتہ رس مجتہد کی سربراہی میں قانون اسلامی کے جو احکام منقح شکل میں نکال کر دنیا کے سامنے پیش کیے، مزید براں اصول شریعت کی روشنی میں وسیع پیانہ پر اجتہاد کر کے زندگی کے ہر پہلو میں پیش آنے والی امکانی صورتوں کے لیے جو قابل عمل آئین مرتب کر دیے تھے، ان کے بعد مشکل ہی سے انفرادی کوشش کرنے والے فقہا کی آرا کو وقیع سمجھا جاسکتا تھا، چنانچہ مشہور فقیہ یحییٰ بن آدم کہتے ہیں:

> **وكانت الكوفة مشحونة بالفقه وفقهاء ها كثير مثل ابن شبرمة وابن ابى ليلىٰ والحسن بن صالح وشريك وامثالهم فكسدت اقاويلهم عند اقاويل ابى حنيفة وسير بعلمه الى البلدان وقضى به الخلفاء والائمة والحكام واستقر عليه الامر** ۔(موفق ج۲ص ۴۱)
>
> کوفہ فقہ سے بھرا ہوا تھا، وہاں بے شمار فقہا تھے، مثلا ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ، حسن بن صالح اور شریک وغیرہ مگر ابوحنیفہ کے اقوال کے آگے دوسرے فقہا کے اقوال کا بازار سرد پڑ گیا، انہیں کا علم مختلف علاقوں میں پھیل گیا، اسی پر خلفا، ائمہ اور حکام فیصلے کرنے لگے اور معاملات کا چلن اسی پر ہو گیا۔

خلیفہ مامون الرشید کے عہد تک حنفی فقہ کا چلن اس بڑے پیمانے پر عام ہو گیا تھا، کہ امام اعظم کے مخالف ایک فقیہ نے خلیفہ مامون کے وزیر اعظم فضل بن سہل کو مشورہ دیا، کہ حنفی فقہ کا استعمال بند کرنے کے احکام جاری کر دیے جائیں، وزیر اعظم نے اس سلسلے میں معاملہ فہم دانشوروں کو بلا کر رائے لی، انہوں نے بالاتفاق کہا:

> **ان هذا الامر لاينفذ وينتقص جميع الملك عليكم ومن ذكر لك هذا فهو ناقص العقل فقال له الفضل بن سهل هذا ان سمعه امير المومنين لا يرضى به** ۔(موفق ج۲ص ۱۵۷)
>
> یہ بات نہیں چلے گی اور سارا ملک آپ لوگوں پر ٹوٹ پڑے گا، جس شخص نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے "ناقص العقل" ہے، وزیر نے کہا میں خود بھی اس خیال سے متفق نہیں ہوں اور امیر المومنین بھی اس سے راضی نہ ہوں گے۔

اسلامی تاریخ کا یہ اہم واقعہ ہے، کہ شخص واحد کی قائم کی ہوئی، فقہی کونسل کے شرعی فیصلے اور فقہی مسائل ارکان مجلس کے علمی وقار اور ان کی حسن نیت واخلاص کی بدولت اسلامی حکومتوں کا قانون اور مسلمانوں کی دینی ومعاشرتی زندگی کا قابل قبول راستہ بن گیا۔ مزید براں مستقبل کے لیے انفرادی طور پر قانون اسلامی کو مدون ومرتب کرنے والوں کے لیے روشن لائحہ عمل عطا کردیا۔ چنانچہ بعد میں جتنے دوسرے بڑے بڑے فقہی نظام بنے وہ اپنے طرز اجتہاد اور نتائج اجتہاد میں چاہے اس سے مختلف ہوں، مگر ان کے لیے فقہ حنفی کا اصول اجتہاد ہی نمونہ تھا، جنہیں سامنے رکھ کر دیگر فقہی نظام کی تشکیل وتعمیر کی گئی۔

امام موفق نے بہ سند متصل امام ابوالقسم بن برہان نحوی ثقہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

من رزقه الله فهما لمذهب ابی حنيفة ونحو الخليل رای منهما الآية الباهرة والجرعة المعجزة واستلو فی قلبه ان الله لم يخص بهما الا منهج الحق وشرعة الصدق ۔

جس کو اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ کے مذہب اور امام خلیل بصری کی نحو کے سمجھنے کی صلاحیت عنایت کرتا ہے، وہ متحیر کرنے والی نشانی اور عاجز کردینے والا گھونٹ بھرے گا اور اس کے دل میں نور پیدا ہوگا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے ابوحنیفہ کے مذہب اور خلیل کی نحو سے راہ حق اور طریقہ صدق کو مخصوص کیا ہے۔

استاذ ادیب ابو یوسف یعقوب بن احمد نے کہا ہے ۔

حسبی من الخيرات ما اعددته　　يوم القيامة فی رضی الرحمن
دين النبی محمد خير الوری　　ثم اعتقادی مذهب النعمان

کافی ہیں مجھ کو قیامت کے دن وہ بھلائیاں جو اللہ کی رضامندی کے لیے میں نے مہیا کر رکھی ہیں اور وہ حضرت محمد ﷺ بہترین خلائق کا دین اور ابوحنیفہ نعمان کے مذہب کا اعتقاد ہے۔

ابتدا میں بعض اہل علم کا گمان تھا، کہ فقہ حنفی اپنے مرکز تدوین سے باہر پھیلنے کی قوت نہیں رکھتی، لیکن ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ امام اعظم کی وفات کو ابھی چند دہائیاں ہی گزری تھیں، کہ فقہ حنفی دنیائے اسلام کے غالب خطوں تک پہنچ گئی۔

سفیان بن عیینہ کہتے تھے:

شيئان ماظننت انهما يجاوزان قنطرة الكوفة وقدبلغا الآفاق قرأة حمزه ورای ابی حنيفة ۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۷)

دو چیزوں کے متعلق مجھے خیال نہیں آتا تھا، کہ وہ کوفہ کے پل پار پہنچیں گی حالاں کہ وہ دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئیں۔ حمزہ کی قرأت اور ابوحنیفہ کی فقہ۔

* * *

امام صاحب کی مصنفات اوران کی اہمیت

عالم اسلام میں حدیث وفقہ کے موضوع پر کتابوں کی تالیف کا آغاز دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں ہو چکا تھا۔ اس دور میں ہمیں متعدد اصحاب علم وقلم کی کتابوں کا سراغ ملتا ہے۔ ربیع بن صبیح متوفی ۱۶۰ھ نے بصرہ میں، معمر راشد متوفی ۱۵۳ھ نے یمن میں، ابن جریج متوفی ۱۵۰ھ نے مکہ میں، سفیان ثوری متوفی ۱۶۱ھ نے کوفہ میں عبداللہ بن مبارک متوفی ۱۸۱ھ نے خراسان میں، ولید بن مسلم متوفی ۱۹۴ھ نے شام میں، ہشیم بن بشیر متوفی ۱۸۳ھ نے واسط میں اوراسی زمانہ میں امام ابوحنیفہ نے بھی کوفہ میں فقہ کی تدوین کی۔ اپنے تلامذہ کی ایک جماعت کو لے کر المجمع الفقہی قائم کیا اوراحادیث وفقہ کا املا کرایا، بعد میں تلامذہ نے ان کتابوں کو اپنے حلقہ درس میں روایت کیا، جس کی وجہ سے وہ کتابیں شاگردوں کی طرف منسوب ہوئیں۔ پھر بھی کچھ کتابیں امام صاحب کے نام سے باقی رہ گئیں۔ ابن ندیم نے ان کتابوں کے نام دیے ہیں (۱) کتاب الفقہ الاکبر (۲) کتاب رسالۃ الی البتی (۳) کتاب العالم والمتعلم (۴) کتاب الرد علی القدریہ۔ (الفہرست ص ۲۸۵)

امام صاحب کی وفات کے بعد تک ان کی کتابوں سے استفادہ ہوتا رہا اوران کا ذکر اس زمانہ کے اہل علم کے یہاں ملتا ہے۔ عبداللہ بن داؤد واسطی کا قول ہے:

من اراد ان یخرج من ذل العمی والجهل ویجد لذة الفقه فلینظر فی کتب ابی حنیفة۔

(اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ ۷۸)

جو شخص چاہتا ہے کہ کور چشمی اور جہالت کی ذلت سے نکل کر فقہ کی لذت پائے وہ ابوحنیفہ کی کتابوں کو دیکھے۔

زائدہ بن قدامہ کا بیان ہے، کہ میں نے سفیان ثوری کے سرہانے ایک کتاب پائی، جس کو وہ دیکھا کرتے تھے، میں نے اس کو دیکھنے کی اجازت چاہی، تو انہوں نے دے دیا:

فاذا کتاب الرهن لابی حنیفة فقلت له تنظر فی کتبه فقال وددت انها کلها عندی مجتمعة انظر فیها فما بقی فی شرح العلم غایة ولکن ماننصفه۔ (اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ ص ۶۵)

وہ ابوحنیفہ کی کتاب الرہن تھی، میں نے کہا، کہ آپ ان کی کتابیں دیکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا، میری خواہش ہے، کہ ان کی تمام کتابیں میرے پاس جمع ہوتیں اور میں ان کو دیکھتا رہتا، علم کی تفصیلات کی کوئی انتہا نہیں

ہے، ہم نے ابوحنیفہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

امام مالک نے خالد بن مخلد قطوانی کو خط لکھ کر ابوحنیفہ کی کتابیں طلب کیں اور انہوں نے بھیجا:

یسالہ ان یحمل الیہ شیئا من کتب ابی حنیفۃ ففعلہ ۔(عقود الجمان ص ۱۸٦)

امام مالک نے خالد سے سوال کیا کہ ابوحنیفہ کی کچھ کتابیں بھیج دو چنانچہ انہوں نے یہ کام کیا۔

عبداللہ بن داؤد کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ اعمش نے حج کا ارادہ کیا اور کہا، کہ

من ھھنا یذھب الی ابی حنیفۃ یکتب لنا کتاب المناسک ۔(اخبار ابی حنیفۃ و اصحابہ ص ۷۰)

کوئی یہاں ہے، جو ابوحنیفہ کے پاس جا کر ہمارے لیے کتاب المناسک لکھ دے۔

امام ابوحنیفہ کی تصانیف اور کتابوں کے بارے میں ان کے معاصر ائمہ دین کی شہادت کے بعد یہ سمجھنا کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی، بڑی نادانی کی بات ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے، کہ امام صاحب کی کتابیں کئی صدیوں تک دائر و سائر رہیں اور فقہا و محققین ان سے استفادہ کرتے تھے، امیر بن ماکولا نے الاکمال میں ابوحامد احمد بن اسماعیل بن جبریل بن قیل مقری قرام متوفی ۳۳۳ھ کے حال میں لکھا ہے:

وسمع کتب ابی حنیفۃ و ابی یوسف من احمد بن نصر عن ابی سلیمان الجوزجانی عن محمد وغیر ذلک ۔

انہوں نے امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کی کتابیں احمد بن نصر سے سنی ہیں اور احمد بن نصر نے ابوسلیمان جوزجانی سے اور انہوں نے امام محمد سے یہ کتابیں سنی ہیں۔

قاضی ابوعاصم محمد بن احمد عامری مروزی کبار ائمہ احناف میں سے ہیں، ان کا قول ہے:

لو فقدت کتب ابی حنیفۃ رحمہ اللہ لاملیتھا من نفسی حفظا ۔

اگر امام ابوحنیفہ کی کتابیں معدوم ہو جائیں تو میں ان کو اپنے حافظہ کی مدد سے املا کرا سکتا ہوں۔

کتاب الآثار

ازمنہ ماضیہ میں کتاب سازی کا یہ بھی انداز تھا، کہ شیوخ و اساتذہ کی مرویات تلامذہ ضبط تحریر میں لاتے تھے اور وہ کتابیں شیوخ و اساتذہ کی جانب منسوب ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ احکام الاحکام جو ابن دقیق العید کی تصنیف قرار دی جاتی ہے، اصل میں ان کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ انہوں نے اپنے تلمیذ رشید قاضی اسماعیل سے املا کرایا۔ اسی طرح کتاب الآثار بھی ہے، جسے امام اعظم کے تلامذہ قاضی ابو یوسف، محمد، زفر، حسن بن زیاد نے حدثنا و اخبرنا کے صیغوں کے ساتھ منضبط کیا گو کہ مولانا شبلی نے کتاب الآثار کو امام صاحب کی تصنیف تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ (سیرۃ النعمان ص ۱۲۲)

مگر یہ ان کا اپنا خیال ہے، جس کی تائید کسی اور محقق کے قول سے نہیں ہوتی۔

علماے ماسبق نے کتاب الآثار کو امام صاحب کی تصنیف قرار دیا ہے۔

☆ ملا علی قاری:۔ امام ابوحنیفہ نے اپنی تصانیف میں ستر ہزار سے زائد احادیث بیان کی ہیں اور چالیس ہزار احادیث سے کتاب الآثار کا انتخاب کیا ہے۔ (مناقب امام اعظم بحوالہ تذکرہ محدثین ص ۸۸)

☆ امام احمد بن حنبل:۔ امام ابوحنیفہ نے کتاب الآثار کا انتخاب چالیس ہزار حدیثوں سے کیا۔ (ایضاً ص ۸۰)

☆ علی بن حجر عسقلانی:۔ ”والموجود من حديث ابی حنيفة مفردا انما هو كتاب الآثار التی رواه محمد بن الحسن“ اس وقت امام اعظم کی احادیث میں سے ”کتاب الآثار“ موجود ہے، جسے محمد بن حسن نے روایت کیا ہے۔ (ایضاً ص ۸۶)

☆ امام عبداللہ بن مبارک:۔

روی الآثار عن نبل ثقات غزار العلم شيخة حصيفه

امام اعظم نے ”الآثار“ کو ثقہ اور معزز لوگوں سے روایت کیا ہے، جو وسیع العلم اور عمدہ مشائخ تھے۔

(مناقب موفق ج ۲ ص ۱۹۱)

☆ امام عبدالقادر حنفی امام یوسف بن قاضی ابو یوسف کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

روی كتاب الآثار عن ابی حنيفة وهو مجلد ضخم۔ (الجواهر المضيئة ج ۲ ص ۳۲۵)

امام یوسف نے اپنے والد ابو یوسف کے واسطے سے امام ابوحنیفہ سے کتاب الآثار کو روایت کیا ہے جو ایک ضخیم جلد میں ہے۔

مسانید امام اعظم

امام اعظم کی مرویات کو بعد کی صدیوں میں ان کے ہر ہر شیخ کے نام سے علاحدہ علاحدہ ترتیب دیا گیا، جسے مسند ابی حنیفہ کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

مرتبین مسانید ابی حنیفہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حافظ محمد بن مخلد ۳۳۱ھ (۲) حافظ عمر بن عقدہ ۳۳۲ھ (۳) حافظ ابوالقاسم ۳۳۳ھ (۴) حافظ اشتانی ۳۳۹ھ (۵) امام عبداللہ حارثی ۳۴۰ھ (۶) حافظ محمد بن مظفر ۳۷۹ھ (۷) حافظ ابن عدی ۳۳۶ھ (۸) حافظ طلحہ ۳۸۰ھ (۹) حافظ ابن المقری (۱۰) حافظ ابن شاہین ۳۵۰ھ (۱۱) حافظ دارقطنی ۴۳۰ھ (۱۲) حافظ ابن نعیم اصفہانی ۵۰۷ھ (۱۳) حافظ ابن عساکر ۵۷۱ (۱۴) حافظ ابن القیسرانی ۵۲۲ھ (۱۵) حافظ ابن خسرو ۴۲۵ھ (۱۶) مسند الدنیا ۵۷۱ھ (۱۷) عیسیٰ جعفری ۱۰۸۰ھ

امام عبدالوہاب شعرانی مسانید امام اعظم کو ان الفاظ سے خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

قد من الله علی بمطالعة مسانيد الامام ابی حنيفة الثلاثة فرايته لايروی حديثا الا عن اخيا

والتابعين العدول الثقات الذين هم من خير القرون بشهادة رسول الله صلى الله عليه وسلم كالاسود وعلقمة وعطاء وعكرمة ومجاهد ومكحول والحسن البصرى واضرابهم رضى الله عنهم اجمعين فكل الرواة الذين هم بينه وبين رسول الله صلى الله عليه وسلم عدول ثقات اعلام اخيار ليس فيهم كذاب ولا متهم بكذب .

(میزان الشریعۃ الکبریٰ ج۱ ص۶۸)

اللہ تعالٰی نے مجھ پر احسان کیا، کہ میں نے امام اعظم کی مسانید ثلاثہ کا مطالعہ کیا، پس میں نے دیکھا کہ امام اعظم ثقہ اور صادق تابعین کے سوا کسی سے روایت نہیں کرتے جن کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر القرون ہونے کی شہادت دی جیسے اسود، علقمہ، عطا، عکرمہ، مجاہد، مکحول اور حسن بصری وغیرہم پس امام اعظم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تمام راوی عدول ثقہ اور مشہور اخیار میں سے ہیں جن کی طرف کذب کی نسبت بھی نہیں کی جا سکتی نہ ہی وہ کذاب ہیں۔

* * *

منقبت

از

حکیم الامت حضرت مفتی احمد یار خان صاحب سالکؔ نعیمی علیہ الرحمہ

ہمارے آقا ہمارے مولیٰ امام اعظم ابو حنیفہ
ہمارے ملجا ہمارے ماویٰ امام اعظم ابو حنیفہ

زمانہ بھر نے زمانہ بھر میں بہت تجسس کیا و لیکن
ملا نہ کوئی امام تم سا امام اعظم ابو حنیفہ

تمہارے آگے تمام عالم نہ کیوں کرے زانوئے ادب خم
کہ پیشوایان دیں نے مانا امام اعظم ابو حنیفہ

نہ کیوں کریں ناز اہل سنت کہ تم سے چمکا نصیب امت
سراج امت ملا جو تم سا امام اعظم ابو حنیفہ

ہوا اولی الامر سے یہ ثابت کہ تیری طاعت ہے ہم پہ واجب
خدا نے ہم کو کیا تمہارا امام اعظم ابو حنیفہ

کسی کی آنکھوں کا تو ہے تارا کسی کے دل کا بنا سہارا
مگر کسی کے جگر میں آرا امام اعظم ابو حنیفہ

جو تیری تقلید شرک ہوتی محدثین سارے ہوتے مشرک
بخاری، مسلم وابن ماجہ امام اعظم ابو حنیفہ

کہ جتنے فقہا محدثین ہیں تمہارے خرمن سے خوشہ چیں ہیں
ہوں واسطے سے کہ بے وسیلہ امام اعظم ابو حنیفہ

سراج تو ہے بغیر تیرے جو کوئی سمجھے حدیث و قرآن
پھرے بھٹکتا نہ پائے رستہ امام اعظم ابو حنیفہ

خبر لے اے دستگیر امت ہے سالکؔ بے خبر پہ شدت
وہ تیرا ہو کر پھرے بھٹکتا امام اعظم ابو حنیفہ

حضرت امام مالک بن انس

﴿رضی اللہ تعالیٰ عنہ﴾

نقوش حیات

نام ونسب اور خاندان

امام دارالہجرت لقب، ابوعبداللہ کنیت، اسم گرامی مالک۔ سلسلہ نسب یہ ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابوعامر بن عمرو بن حارث بن غیمان یا عثمان بن جُثَیل یا خُثَیل بن عمرو بن ذی اصبح اصبحی مدنی۔ (وفیات الاعیان ج۲ ص۳۰۰)

آپ کا نسب یمن کے مشہور قبیلہ حُمَیر بن سبا سے ملتا ہے، جس کا تعلق یعرب بن قحطان سے ہے۔ ابوعامر اس خاندان کے پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اسلام قبول کیا۔

بعض اہل سیر نے دعوی کیا ہے، کہ امام مالک اور ان کا خاندان موالی سے تھا، انہوں نے بیان کیا:

ان جده الاعلى اباعامر من موالى بنى التيم وهم البطن الذى كان منه ابو بكر الصديق رضى الله عنه فهو على هذاالادعاء قرشى بالولاء ۔ (مالک ص۲۸، ابوزہرہ)

امام مالک کے جدِاعلیٰ ابوعامر بنوتیم کے موالی تھے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خاندان بنوتیم کی شاخ ہے اور اس دعوی کے مطابق آپ کی نسبت ولا قرشی ہے۔

ابوعامر کب مدینہ آئے اور بنوتیم سے ولا اور مصاہرت کا تعلق قائم کیا، یا ان کے لڑکے مالک مدینہ آئے اور انہوں نے بنی تیم سے موالات کیا، اس بارے میں مختلف روایتیں ہیں:

(۱) امام مالک کے چچا ابوسہیل کہتے ہیں:

نحن قوم من ذى اصبح قدم جدنا بالمدينة فتزوج فى التيميين فكان معهم ونسبنا اليهم ۔

ہم قبیلہ ذی اصبح سے نسبی تعلق رکھتے ہیں، ہمارے دادا مدینہ آئے اور انہوں نے تیمیوں میں شادی کی اور انہیں کے ساتھ رہ پڑے، ہمارا نسب انہیں سے ملتا ہے۔

یہ تعلق حضرت طلحہ بن عبیداللہ تیمی کے بھائی حضرت عثمان بن عبیداللہ تیمی سے قائم ہوا تھا۔

یہ قول وضاحت کرتا ہے، کہ ابوعامر پہلے شخص ہیں، جو مدینہ آئے اور انہوں نے بنوتیم سے موالات قائم کی۔

قاضی بکر بن قشیری قول اول کی تائید کرتے ہیں، کہتے ہیں:

ان ابا عامر جد ابی مالك من اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم وشهد المغازی كلها خلا بدرا ۔

امام مالک کے پردادا ابو عامر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، بدر کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔

(۲) بعض لوگوں کا قول ہے، کہ امام مالک کے پردادا ابو عامر نے اسلام تو عہد رسالت میں قبول کیا، لیکن رحلت رسول کے بعد مدینہ آکر اقامت گزیں ہوئے، چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لقا ثابت نہیں اس لیے تابعی مخضرمی ہیں۔

(۳) ابن عبد البر لکھتے ہیں:

قدم مالك بن ابی عامر المدینة من الیمن متظلما من بعض ولاة ابن مرة فعاقده وصار معهم ۔

مالک بن ابو عامر یمن سے بعض ولاۃ ابن مرہ کے ظلم سے تنگ آکر مدینہ آئے۔ (مالک ص ۲۹)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس قبیلے کے سب سے پہلے شخص جو مدینہ آئے، وہ مالک ہیں، نہ کہ عامر۔ ابو زہرہ مصری نے دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے:

نحن نختار الروایة الثانیة لانها تتفق مع المروی عن ابی سهیل وهو اعلم الناس باسرته فهو یذكر ان جده حضر الی المدینة وصاهر بنی تیم ولأن كونه صحابیا وان كان مشهورا لدی المالكیة لم یقبله المحققون من المحدثین وقد قال فی ذلك السیوطی فی كتابه تزیین الممالك قال الحافظ شمس الدین الذهبی فی تجریده ولم ار احدا ذكره فی الصحابة ونقل الحافظ ابن حجر فی الاصابة كلام الذهبی ولم یزد علیه ۔

ہم دوسری روایت کو اختیار کرتے ہیں، اس لیے کہ وہ ابو سہیل کی روایت کے موافق ہے۔ ابو سہیل اپنے خاندان کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے ہیں، وہ ذکر کرتے ہیں کہ ان کے دادا ابو عامر مدینہ آئے اور انہوں نے بنو تیم میں شادی کی اور ان کا صحابی ہونا اگرچہ مالکیوں میں مشہور ہے، لیکن محققین محدثین نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔ حافظ سیوطی نے اپنی کتاب ”تزئین الممالک“ میں تحریر کیا ہے، کہ حافظ شمس الدین ذہبی نے اپنی تجرید میں لکھا ہے، کہ میں نے کسی کو نہیں پایا، جو ابو عامر کو صحابہ میں شمار کرتا ہو۔ حافظ ابن حجر نے ”الاصابہ“ میں ذہبی کا کلام نقل کیا ہے اس پر کچھ اضافہ نہیں کیا ہے۔ (مالک حیاتہ وعصرہ ص ۳۰)

مالک کے دادا ابو انس مالک کبار تابعین میں سے تھے، جو حضرت عمر، حضرت طلحہ، حضرت عائشہ، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کرتے ہیں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ انہیں خاص لگاؤ

تھا، چنانچہ شہادت عثمان کے بعد جب کہ مدینہ پر فتنوں کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، لوگوں کا گھروں سے نکلنا دشوار ہو رہا تھا، جن چار باہمت اولوالعزم افراد نے اپنا سر ہتھیلیوں پر رکھ کر حضرت عثمان کا جنازہ اٹھایا، ان میں ابوانس مالک بھی تھے۔ آپ سے آپ کے تینوں بیٹوں انس امام مالک کے پدر بزرگوار، ربیع و ابوسہیل نافع اور ایک جماعت نے حدیث کا درس لیا۔ مؤطا امام مالک میں بھی ان کی سند سے حدیث ہے۔ امام نسائی ان کو ثقہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

امام مالک کے چچا ابوسہیل نافع جن کا شمار ثقات تابعین میں ہے، صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمر اور تابعین میں اپنے والد ابوانس مالک، سعید بن مسیب، علی بن حسین اور ایک کثیر جماعت سے روایت کرتے ہیں۔ امام مالک نے بھی مؤطا میں ان سے روایت کی ہے۔ تابعین اور تبع تابعین میں امام زہری، امام مالک، اسماعیل بن جعفر وغیرہ ان کے شاگرد ہیں۔ امام احمد، ابوحاتم اور نسائی جیسے ائمہ فن حدیث نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ امام مالک کے والد انس اور دوسرے چچا ربیع بھی عالم حدیث تھے، مگر ان کا پایہ چنداں بلند نہیں، چنانچہ مؤطا میں امام مالک نے ان سے کوئی روایت نہیں لی ہے۔

آپ کی والدہ کا نام عالیہ تھا، جو شریک بن عبدالرحمٰن بن شریک کی صاحبزادی تھیں اور ان کا تعلق احرار سے تھا۔ چنانچہ امام مالک پر ماں کی جانب سے بعض لوگوں نے رقیت کا جو قول کیا ہے، وہ صحیح نہیں ابوزہرہ لکھتے ہیں:

فابوه وامه عربيان يمنيان فلم يجر عليه رق قط ۔(مالک ص ۲۸)

ولادت

امام مالک کے سن ولادت میں مورخین کا اختلاف ہے، چنانچہ سن ولادت ۹۰ھ، ۹۳ھ، ۹۴ھ، ۹۵ھ، ۹۶ھ اور ۹۸ھ لکھا گیا ہے، لیکن اکثر مورخین کے نزدیک آپ کی ولادت ۹۳ھ میں ہوئی۔ جس کی تائید امام مالک کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

لقد روى ان مالكا قال ولدت سنة ثلاث وتسعين ۔

امام مالک سے روایت کی جاتی ہے، انہوں نے فرمایا، میری ولادت ۹۳ھ میں ہوئی۔ (مالک حیاتہ وعصرہ ص ۲۷)

امام مالک کی ولادت ان کے آبائی مکان قصر المقعد میں ہوئی، جو مدینہ سے چند میل کے فاصلہ پر وادی عقیق میں تھا۔ یہ علاقہ بہت ہی سرسبز و شاداب تھا۔ قاضی عیاض لکھتے ہیں:

كان ابو مالك بن انس مقعدا وكان له قصر بالجرف يعرف بقصر المقعد ۔

(وفاء الوفاء ج ۴ ص ۱۱۷۵)

امام مالک کے والد انس مقعد تھے اور مقام جرف میں ایک محل تھا، جو قصر مقعد کے نام سے مشہور تھا۔

چوں کہ امام مالک کے خاندان کے افراد مدینہ میں کم اور غیر معروف تھے، اسی بنا پر ان کے والد کو مقعد کے عرف سے شہرت ملی، جیسا کہ کمزور قبیلے والے فرد کو مقعد النسب یا مقعد الحسب کہتے ہیں۔

امام صاحب اسی آبائی مکان میں سکونت گزیں تھے، کچھ لوگوں نے ایک بار وادی عقیق میں مقیم ہونے کی وجہ دریافت کی

اور کہا دوری کی وجہ سے آپ کو مسجد نبوی تک آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے، امام صاحب نے جواب دیا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی عقیق سے محبت رکھتے تھے اور وہاں تشریف لے جاتے تھے اور بعض صحابہ نے وہاں سے منتقل ہو کر مسجد نبوی سے قریب مقیم ہونا چاہا تو ارشاد فرمایا کیا تم لوگ مسجد تک آمد و رفت میں ثواب نہیں سمجھتے؟

امام صاحب بعد میں مدینہ منورہ چلے آئے تھے اور مسجد نبوی سے متصل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مکان میں قیام کرتے تھے۔

تحصیل علم اور شیوخ

باقاعدہ تحصیل علم سے پہلے امام مالک اپنے بھائی نضر کے ساتھ کپڑوں کی تجارت میں شریک ہوئے:

وکان اخوہ النضر یبیع البز وکان مالك معه بزازا ثم طلب العلم ۔

مالک کے بھائی نضر سوتی کپڑے بیچتے تھے اور مالک ان کے ساتھ رہ کر بزاز تھے اور بعد میں علم حاصل کیا۔

جب تک امام مالک تجارت میں بھائی کے سہیم وشریک رہے، مالک ''اخوالنضر'' کے نام سے پکارے جاتے تھے، جب تجارت چھوڑ کر علما کی صحبت اختیار کی اور آپ کا علمی پایہ لوگوں پر روشن ہوا تو وہ اپنے بھائی سے زیادہ مشہور ہو گئے اور ان کے بھائی نضر ''اخو مالک'' کے نام سے پکارے جانے لگے۔

امام مالک نے جس گھر میں آنکھ کھولی تھی، اس کا ماحول دینی اور علمی تھا، ان کے دادا، والد اور چچا علم نبوت کے وارث تھے۔ اس سے بڑھ کر امام مالک کا وطن مدینۃ الرسول علم وعرفان کا سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں سے علوم ومعارف کے چشمے پھوٹے۔ عہد رسالت کے بعد بھی یہ شہر اکابر صحابہ کا مسکن اور آماجگاہ علم دین رہا۔ خلافت عثمانی کے بعد یہ شہر مسلمانوں کا دارالسلطنت تو نہ رہا، مگر اس کی علمی مرکزیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور ساری دنیا کے مسلمان اس شہر کے علمی چشموں سے سیراب ہونے کے لیے دور دور سے آتے تھے۔ امام صاحب نے آنکھ کھولی تو مدینہ منورہ قال اللہ وقال الرسول کے نغموں سے گونج رہا تھا اور اس کی علمی روایت اور شان اوج کمال پر تھی۔

حضرت ربیعہ رائی کی درسگاہ میں

خاندانی ماحول اور مدینۃ الرسول کی عرفانی فضا نے امام مالک پر صغر سنی ہی سے اثر ڈالا اور وہ بچپن ہی میں طلب علم کے ذوق سے سرشار تھے، انہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کیا، پھر ان کے دل میں طلب حدیث کا ولولہ پیدا ہوا، انہوں نے اپنے اس شوق کا اظہار والدہ ماجدہ سے کیا، تو انہوں نے عمدہ لباس پہنائے، سر پر عمامہ باندھا، پھر کہا ''اذھب فاکتب الآن'' جاؤ اب حدیث لکھو! یا یہ کہا ''فاذھب الی ربیعة فتعلم علمه قبل ادبه' 'ربیعہ کے پاس جاؤ شعر وادب سے پہلے ان سے علم حاصل کرو۔

ان کے بعض معاصرین کا قول ہے ''رایت مالکا فی حلقة ربیعة وفی اذنه شنف ''میں نے مالک کو ربیعہ کے

حلقہ درس میں دیکھا، اس وقت ان کے کان میں بند اتھا۔

یہ روایت دلالت کرتی ہے، کہ صغرسنی ہی میں طلب حدیث کا آغاز کردیا تھا۔ (مالک ص۳۳)

حضرت ربیعہ رائی متوفی ۱۳۶ھ عظیم تابعی کثیر الحدیث، ثقہ، محدث تھے، مدینہ کے نامی گرامی علما وفقہا ان کے حلقہ درس میں شریک ہوا کرتے تھے، جو مسجد نبوی میں قائم ہوتا تھا، جن میں چالیس عمامہ پوش مشائخ بھی شامل ہوتے۔

نافع مولی ابن عمر کی خدمت میں

اسی زمانہ میں امام مالک حضرت نافع مولی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی علم حاصل کرنے جایا کرتے تھے، وہ کہتے ہیں، میں بچپن میں اپنے ملازم کے ساتھ نافع کے یہاں جایا کرتا تھا، وہ اوپر سے اتر کر زینہ پر بیٹھ جاتے اور مجھ سے حدیث بیان کرتے۔ فرماتے ہیں:

> كنت اتى نافعا نصف النهار ما تظلنى الشجرة من الشمس كنت اتحين خروجه فاذا خرج ادعه ساعة كانى لم اره ثم اتعرض له فاسلم عليه وادعه حتى اذا دخل اقول له كيف قال ابن عمر فى كذا و كذا فيجيبنى ثم احبس عنه ۔ (الديباج المذهب ص۱۱۷)

> میں دوپہر میں نافع کے پاس جاتا تھا، راستے میں کہیں سایہ بھی نہیں ہوتا تھا، میں ان کے نکلنے کا انتظار کرتا جب وہ نکلتے تھوڑی دیر دم لیتا پھر ان کی طرف متوجہ ہوتا ان سے سلام کرتا، پھر اندر جا کر ان سے سوال کرتا ابن عمر نے فلاں فلاں مسئلہ میں کیا کہا ہے اور وہ بیان کرتے پھر ان سے رخصت ہو جاتا۔

یہ واقعہ امام مالک کے طلب علم کے بے مثال شوق اور اس راہ میں تکلیف واذیت خوشی سے گوارہ کرنے پر دلالت کرتا ہے، عرب کے سخت گرم علاقہ میں جب کہ ظہر کے وقت بادسموم کے جھونکے چلتے اور پوری فضا تنور کی طرح گرم ہوتی ہے، امام مالک مقام جرف سے چل کر مدینہ سے باہر بقیع میں نافع مولی ابن عمر کے گھر آتے اور سخت دھوپ اور لو کے تھپیڑوں میں دروازے پر کھڑے ہو کر حضرت نافع کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے رہتے، جب وہ برآمد ہوتے انہیں لے کر مسجد نبوی شریف میں جاتے، جب نافع اپنی مسند درس پر بیٹھ جاتے تو ان سے حدیث اور فقہ کے متعلق سوالات کرتے اور ان سے کثیر حدیثیں اخذ کرتے اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فتاوے معلوم کرتے جب کہ ابن عمر کا علمی مقام یہ تھا:

> ولابن عمر مكانة فى فقه الاثر والتخريج عليه واستنباط الاحكام على ضوء الحديث النبوى الشريف ۔(مالك ص۳۶)

> فقہ اور اثر کی تخریج میں ابن عمر کا مقام یہ تھا، کہ وہ استنباط مسائل حدیث نبوی کی روشنی میں کرتے تھے۔

نافع سے جو حضرت عبداللہ بن عمر کی مرویات کے سب سے بڑے مستند اور معتمد راوی ہیں، امام مالک نے علم حدیث

حاصل کیا اور مالک عن نافع عن ابن عمر کی سند کتب حدیث میں سلسلۃ الذہب کا درجہ رکھتی ہے۔

حضرت نافع جب تک زندہ رہے، امام مالک ان کے حلقہ درس سے وابستہ رہے، شاگرد کو استاذ کے علم وفضل پر اتنا ناز تھا، کہ فرمایا کرتے، جب میں عبداللہ بن عمر کی حدیث نافع سے سن لیتا ہوں تو مجھے پروا نہیں ہوتی، کہ اس کو کسی اور سے سنوں۔

ابوعبداللہ نافع نے تیس سال تک ابن عمر کی خدمت میں رہ کر ان کی مرویات اور فقہی مسائل کا سب سے بڑا سرمایہ اپنے سینے میں محفوظ کر لیا تھا، امام مالک جب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ایک ایک مسئلہ کے بارے میں ابن عمر کے اقوال وآرا اور استنباط واجتہاد کو دریافت کرتے اور انہیں لکھ لیا کرتے، آگے چل کر امام مالک نے اپنی فقہ کی عمارت ابن عمر کے انہیں اقوال وآرا اور مجتہدات پر رکھی۔

عبدالرحمٰن بن ہرمز کے حلقہ درس میں

نافع مولی ابن عمر سے تلمذ کے زمانے ہی میں امام مالک نے عبدالرحمٰن بن ہرمز کی درسگاہ میں جانا آنا شروع کر دیا تھا، جس کی وجہ امام صاحب خود بیان کرتے ہیں، کہ میرے ایک بھائی جو عمر میں مجھ سے بڑے اور ابن شہاب کے ہم عصر تھے، ایک دن والد صاحب نے ہم دونوں کے سامنے ایک مسئلہ پیش کیا بھائی نے صحیح بتایا اور میں غلطی کر گیا، والد نے کہا، کہ تم کو کبوتروں نے طلب علم سے غافل کر دیا ہے یہ جملہ مجھ پر بہت گراں گزرا اور میں عبدالرحمٰن بن ہرمز کے حلقہ درس میں جانے لگا، جہاں رہ کر میں نے سات سال تک کسب علم کیا اور اس طویل مدت میں کسی دوسرے شیخ کے پاس نہیں گیا۔ میں اپنے پاس کھجور رکھ کر ان کے یہاں جاتا اور اپنے ساتھ پڑھنے والے لڑکوں کو دے کر کہتا، کہ اگر کوئی شخص شیخ کے بارے میں پوچھے تو تم لوگ کہہ دینا کہ وہ اس وقت منہمک ہیں، ایک دن میں ابن ہرمز کے دروازے پر پہنچا تو انہوں نے اپنی باندی کو بھیج کر معلوم کیا کہ دروازہ پر کون ہے؟ اس نے جا کر کہا کہ وہی اشتر (سرخ گورا) ہے ابن ہرمز نے کہا کہ ان کو آنے دو، وہ امام ہیں اور ابن ہرمز کا حلقہ درس مسجد نبوی میں قائم ہوتا تھا۔

ابوداؤد عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج مدنی متوفی ۱۱۷ھ رضی اللہ عنہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد اور ان کے علم کے وارث تھے، بہت سارے تابعین سے حدیثیں روایت کی ہیں، کثیر الحدیث، ثقہ محدث تھے، اسی کے ساتھ انساب، عربیت اور قرأت کے زبردست عالم بھی تھے۔

حضرت صفوان بن سلیم

امام مالک نے صغرسنی میں جن شیوخ واساتذہ سے تحصیل علم کیا ہے، ان میں ایک بہت بڑے بزرگ عالم دین صفوان بن سلیم ہیں، چنانچہ انہوں نے ایک دن اپنے شاگرد مالک سے ایک خواب کی تعبیر معلوم کی، تو شاگرد نے عرض کیا، کہ حضرت! آپ جیسے عظیم بزرگ مجھ سے کسی بات کو معلوم کریں یہ عجیب سی بات ہے، استاذ نے کہا، بھتیجے! کوئی بات نہیں ہے۔ اس میں کیا حرج ہے؟ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آئینہ دیکھ رہا ہوں، شاگرد نے فوراً عرض کیا کہ آپ اپنی آخرت سنوار رہے ہیں اور تقرب

الی اللہ کا سامان ہم پہنچا رہے ہیں، استاذ نے یہ تعبیر کی تو خوش ہو کر فرمایا:

انت اليوم مويلك ولئن بقيت تكونن مالكا اتق الله يا مالك اذ كنت مالكا والا فانت هالك ۔

آج تم مویلک ہو اگر زندہ رہے، تو مالک ہو جاؤ گے اے مالک! جب تم واقعی مالک بن جانا تو اللہ سے ڈرنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

امام مالک بیان کرتے ہیں، کہ اس زمانہ میں لوگ مجھے پیار کی وجہ سے مویلک کہہ کر پکارتے تھے، صفوان بن سلیم نے پہلی بار اس موقع پر مجھے ابو عبد اللہ کی کنیت سے پکارا اور یہ انہیں ہی کا عطیہ ہے۔ (ترتیب المدارک ج ۱ ص ۱۲۸)

ابو عبد اللہ صفوان بن سلیم قرشی زہری مدنی متوفی ۱۳۲ھ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر اور کبار تابعین سے روایت کی ہے ان کے زہد و تقویٰ کا عالم یہ تھا، کہ اگر انہیں یہ اطلاع دی جاتی کہ کل قیامت آنے والی ہے تو ان کو مزید عمل کی ضرورت نہیں پڑتی امام مالک بیان کرتے ہیں صفوان جاڑے میں چھت پر اور گرمی میں اندر رات کو نماز پڑھتے تھے تا کہ سردی اور گرمی کی وجہ سے شب بیداری میں مدد ملے۔

امام ابن شہاب زہری

امام مالک نے مدینہ کے جن اساطین علوم نبویہ سے اکتساب فیض کیا ان میں ابن شہاب زہری بہت اہم ہیں، اسلام کی علمی تاریخ کے قرن اول کی اخیر اور قرن ثانی کی ابتدائی دہائیوں میں جامعیت کے لحاظ سے جو چند ممتاز ہستیاں نظر آتی ہیں، انہیں میں ابن شہاب زہری کا بھی شمار ہوتا ہے قرآن، حدیث، فقہ، انساب اور مغازی میں درجہ امامت پر فائز تھے، آپ کا اسم گرامی محمد کنیت ابو بکر ہے، سلسلہ نسب اس طرح ہے: محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب بن عبد اللہ بن حارث بن زہرہ بن کلاب بن مرہ قرشی۔ (الحدیث والمحدثون ص ۱۷۷)

آپ کی ولادت ۵۰ھ میں ہوئی، امام زہری کے دادا عبد اللہ بن شہاب ابتدائے اسلام میں اسلام کے بدترین دشمنوں کی صف اول میں شریک تھے، انہوں نے اسلام دشمنی کو اپنا شعار بنا لیا تھا، مگر انہیں کی نسل سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوا، جس نے علوم اسلامی کی تحصیل اور ترویج و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد اولین قرار دیا۔

خداوند تعالیٰ نے امام زہری کو حصول علم کی غیر معمولی صلاحیت اور نادر قوت حفظ کی دولت سے نوازا تھا، ذہانت و ذکاوت میں ممتاز تھے، تحصیل علم کے شوق میں اقران و معاصرین پر فائق تھے، حافظہ ایسا تھا، کہ ایک بار جو بات سن لی نقش کالحجر ہو گئی، اسی راتوں میں پورا قرآن کریم حفظ کر لیا۔

خلیفہ ہشام بن عبد الملک نے امام زہری کی قوت حفظ و ضبط کا امتحان اس طرح لیا، کہ اپنے لڑکوں کے لیے ان سے حدیثیں قلم بند کرانے کی درخواست کی، آپ نے چار سو حدیثیں لکھوا دیں ایک ماہ بعد ہشام نے کہا، کہ آپ کا لکھوایا ہوا دفتر

حدیث گم ہوگیا، امام زہری نے پھر وہی حدیثیں لکھوادیں، ہشام کے حکم سے دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا گیا تو کچھ بھی فرق نہیں تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۱ص۱۰۳)

چنانچہ اپنی قوت حفظ کے بارے میں وہ خود فرماتے ہیں:

مااستعدت حدیثا قط وماشککت فی حدیث الا حدیثا واحدا فسئلت صاحبی فاذاهو کما حفظت ۔

میں نے (ایک بار یاد کر لینے کے بعد بغرض حفظ) کسی حدیث کا اعادہ نہیں کیا اور مجھے کسی حدیث میں کبھی کوئی شک وارد نہیں ہوا مگر ایک حدیث میں نے جب اپنے ساتھی سے دریافت کیا تو وہ اسی طرح تھی، جس طرح میں نے یاد کی تھی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۱ص۱۰۴)

ابن شہاب نے جس زمانے میں طلب علم کا آغاز کیا، وہ صحابہ اور تابعین کا مبارک عہد تھا، جن کے خرمن علم سے انہوں نے خوشہ چینی کی، وہ صرف حدیثیں سننے اور زبانی یاد کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ قید تحریر میں بھی لاتے، اس طرح ان کے پاس احادیث نبویہ اور آثار صحابہ کا بہت بڑا ذخیرہ کتابوں میں محفوظ ہوگیا تھا۔

عموماً ان کتابوں کو دیکھنا معمول تھا، جس کی بنا پر گھریلو کاموں سے دور رہتے ایک دن آپ کی اہلیہ نے تنگ آکر کہا

”واللہ لهذه الکتب اشد علی من اربع ضرائر“

قسم خدا کی تمہاری یہ کتابیں مجھ پر چار سوکنوں سے بھی زیادہ گراں ہیں۔

اس ذوق وشوق اور قبول علم کی بے کراں استعداد کے ساتھ زہری نے علم وفضل میں ایسا کمال پیدا کیا، کہ اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل کر لی، ان کے تبحر علمی کا اعتراف اکابر علماے امت نے ان الفاظ میں کیا ہے:

☆**عمر بن دینار:**۔ ”مارایت انص للحدیث من الزهری“ میں نے زہری سے بڑا راوی حدیث نہیں دیکھا۔

☆**لیث بن سعد:**۔ ”مارایت عالما قط اجمع من ابن شهاب ولااکثر علما منه“ میں نے کسی عالم کو نہیں دیکھا جو ابن شہاب سے زیادہ علم جمع کرنے والا ہو اور ان سے زیادہ علم والا کسی کو نہیں پایا۔

☆**مالک:**۔ ”بقی ابن شهاب وماله فی الدنیا نظیر“ ابن شہاب زندہ ہیں، اس حال میں کہ (علم میں) دنیا کے اندر ان کی نظیر نہیں۔

☆**ایوب سختیانی:**۔ ”مارایت اعلم منه“ میں نے زہری سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔

☆**ربیع:**۔ ”ماظننت ان احدا بلغ من العلم ما بلغ ابن شهاب“ میرا گمان ہے کہ کوئی شخص علم کے اس درجہ تک نہیں پہنچا جہاں ابن شہاب پہنچے۔

☆**عمر بن عبدالعزیز:**۔ ”لم یبق احد اعلم بسنة ماضیة من الزهری“ کوئی شخص ابن شہاب زہری سے بڑھ کر

سنت ماضیہ کا جاننے والا نہیں رہا۔

یوں تو امام زہری نے قرآن، فقہ و فتاوی، انساب، تاریخ و مغازی سارے علوم و فنون میں کمال حاصل کیا تھا، مگر انہیں حدیث و آثار میں ید طولیٰ حاصل تھا، اور وہ اس علم کے امام تھے، اس شعبہ علم کی تحصیل میں زہری کا شغف ذکر کرتے ہوئے ان کے ایک معاصر لیث بن سعد نے فرمایا:

جلس الزهری ذات لیلة یذاکر نفسه الحدیث فما زال حتی اصبح ۔ (السنة قبل التدوین ص ۴۹۲)

ایک شب زہری حدیث کے مذاکرہ میں بیٹھے اور پوری رات اسی شغل میں منہمک رہے، یہاں تک کہ صبح کر دی۔

امام زہری خود فرماتے ہیں:

ماصبر احد علی العلم صبری و لانشر احد نشری ۔

کسی نے میری طرح طلب علم میں صبر نہیں کیا اور نہ میری طرح اس کی نشر و اشاعت کی۔

اس سرچشمہ علم سے ہزاروں تشنگان حدیث سیراب ہوئے، جن میں امام مالک کی ذات گرامی بھی ہے، جنہوں نے علم نبوت کے بحر زخار سے خوب خوب جرعہ خواری کی۔ وہ خود فرماتے ہیں:

ہم طلبہ حدیث ابن شہاب زہری کے مکان واقع بنی الریل میں بہت زیادہ بھیڑ لگاتے تھے ان کے دروازہ پر بیٹھے رہتے تھے، اور جب کھلتا تو اندر جاتے وقت دھکم دھکا کرتے تھے۔ ابن شہاب حلقہ درس میں قال ابن عمر کذا و کذا کہتے اور سن لیتے اور حلقہ ختم ہونے کے بعد سوال کرتے کہ ابن عمر کے یہ اقوال آپ تک کیسے پہنچے، وہ بتاتے کہ ان کے صاحبزادے سالم نے ان کو بیان کیا ہے۔

امام مالک ابن شہاب زہری سے اتنے مانوس اور آپ سے طلب علم کے اس قدر مشتاق تھے، کہ عید کے دن بھی استفادہ سے باز نہ رہے۔ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ عید کے دن میں یہ سوچ کر کہ آج ابن شہاب خالی ہوں گے، عیدگاہ سے باہر ہی باہر ان کے گھر چلا گیا، ابن شہاب نے خادمہ سے کہا، دیکھو دروازہ پر کون ہے؟ خادمہ نے خبر دی ”مولاك الاشقر مالك“ اجازت ملنے پر میں اندر گیا، انہوں نے فرمایا، میرا خیال ہے تم اپنے مکان جانے کے بجائے باہر ہی باہر میرے یہاں آگئے ہو، کھانا کھالو، میں نے کہا، کھانے کی حاجت نہیں ہے، حدیث بیان فرمادیں، چنانچہ انہوں نے اسی وقت سترہ حدیثیں بیان کیں اور کہا اس سے تم کو کیا فائدہ کہ میں حدیثیں بیان کردوں اور تم یاد نہ کرو، میں نے کہا آپ کہیں تو میں ابھی سبھی حدیثوں کو سنادوں اور اسی وقت ان کو زبانی سنادیا۔

ایک روایت میں ہے کہ میں نے اپنی تختیاں دکھائیں، تو ابن شہاب نے مزید چالیس حدیثیں لکھائیں، انہوں نے کہا، اگر تم ان کو یاد کرلو تو ان کے حافظ ہو جاؤ گے میں نے کہا کہ ان کو بھی زبانی سنا سکتا ہوں، ابن شہاب نے کہا سناؤ میں نے وہ تمام

حدیثیں سنا دیں اور انہوں نے کہا:

قم فانت من اوعیة العلم اوقال انك لنعم المستودع للعلم۔ (ترتیب المدارک ج۱ص۱۲۲)

اٹھو تم علم کا خزانہ ہو یا یہ کہ تم علم کے لیے بہترین خزانہ ہو۔

ابن شہاب زہری صرف محدث ہی نہیں تھے، بلکہ جلیل القدر فقیہ بھی تھے، جن سے امام مالک نے حدیث وفقہ دونوں شعبوں میں فیض پایا تھا۔ امام مالک فرماتے ہیں:

میں نے مدینہ میں صرف ایک محدث کو فقیہ پایا، پوچھا گیا کون؟ جواب دیا، ابن شہاب زہری۔ (طبقات ابن سعد ج۲ص۳۸۸)

انتخاب شیوخ میں احتیاط

متذکرہ بالا بلند قامت علمی ہستیاں وہ ہیں، جن سے امام مالک نے برسہا برس طلب علم کیا اور مدتوں ان کے حلقہائے درس سے وابستہ رہے۔ ویسے امام مالک مدینہ منورہ کی انہیں علمی شخصیتوں سے حدیث لیتے تھے، جو ان کے نزدیک متقن، ضابط اور ثقہ ہیں۔ خود فرماتے ہیں:

> **ان ھذا العلم دین فانظروا عمن تاخذون دینکم لقد ادرکت سبعین ممن یقول قال فلان قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عند ھذه الاساطین فاشار الی مسجد الرسول صلوات اللہ وسلامه علیه فما اخذت عنھم وان احدھم لو اوتمن علی بیت مال لکان به امینا الا انه لم یکونوا من اھل ھذا الشان** ۔(مالك حیاته وعصره ص ۹۲)
>
> بے شک یہ علم حدیث دین ہے، تو دیکھو، تم کس سے دین حاصل کر رہے ہو، میں نے ستر ایسے افراد کو پایا، جو کہتے تھے فلاں نے ان ستونوں کے پاس کہا، اللہ کے رسول نے فرمایا اور اشارہ کرتے مسجد نبوی صلوات اللہ وسلامہ علیہ کی طرف پھر بھی میں نے ان سے حدیث نہیں لی، جب کہ ان میں سے ہر ایک اس رتبے کا تھا کہ اگر بیت المال کا امین بنایا جاتا تو اس کے لائق تھا، لیکن وہ لوگ اس رتبہ کے نہیں تھے، کہ ان سے حدیث قبول کی جائے۔

امام صاحب کا بیان ہے، کہ میں نے اس شہر مدینہ میں ایسے بزرگوں کو پایا ہے، جن کے وسیلے سے طلب باراں کی دعا کی جائے، تو ضرور بارش ہو جائے، انہوں نے احادیث کی روایت بھی کی تھی، مگر میں نے ان حضرات سے حدیث نہیں اخذ کی تھی، کیوں کہ وہ خوف خدا اور زہد وتقویٰ کی زندگی اختیار کر چکے تھے اور یہ علم دین اور علم حدیث وفقہ زہد وتقویٰ اور خوف خدا کے ساتھ اتقان فہم کا بھی متقاضی ہے، تا کہ روایت کرنے والا سمجھ سکے، کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کل اس کا انجام کیا ہوگا، جس عالم میں اتقان معرفت اور دین کی فہم نہ ہو، نہ حجت اور دلیل ہو سکتا ہے اور نہ اس سے علم دین حاصل کیا جا سکتا ہے، ہم کو حق نہیں ہے، کہ ان کو

متہم قرار دیں مگر وہ علم حدیث کے حامل نہیں ہیں۔ امام صاحب نے یہ بھی کہا ہے، کہ میں نے بہت سے اہل علم کو دیکھا ہے جنہوں نے صحابہ کا زمانہ پایا ہے، مگر ان سے علم حاصل نہیں کیا ہے۔ امام مالک چلتے پھرتے عجلت اور قیام کی حالت میں سماع حدیث اور اس کی کتابت کو ناپسند کرتے اور احترام حدیث کے خلاف سمجھتے تھے۔ اگر اس قسم کے مواقع آتے، تو وہ بے نیازی سے آگے بڑھ جاتے جیسا کہ واقعات ذیل سے معلوم ہوتا ہے:

سئل مالك هل سمع عمرو بن دينار فقال رايته يحدث والناس قيام يكتبون فكرهت ان اكتب حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم وانا قائم ۔

امام مالک سے پوچھا گیا آپ نے عمرو بن دینار سے حدیث سنی ہے تو کہا میں نے ان کو حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھا اور طلبہ کھڑے کھڑے لکھ رہے تھے تو میں نے ناپسند کیا کہ کھڑے ہو کر حدیث رسول لکھوں۔

ومر مالك بابی الزناد وهو يحدث فلم يجلس اليه فلقيه بعد ذالك فقال له مامنعك ان تجلس الى قال كان الموضع ضيقا فلم ارد ان احدث حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم وانا قائم ۔(مالك حياته وعصره ص ۳۸)

امام مالک ابوالزناد کے پاس سے گزرے اور وہ حدیث بیان کر رہے تھے مگر وہ وہاں بیٹھے نہیں، اس کے بعد ابوالزناد امام مالک سے ملے تو ان سے کہا آپ میرے یہاں کیوں نہیں بیٹھے تو امام صاحب نے کہا جگہ تنگ تھی، میں نے کھڑے ہو کر حدیث رسول لکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

ربما جلس الينا الشيخ فيحدث جل نهاره مانا خذ عنه حديثا واحدا مابنا ان نتهمه ولكن لم يكن من الحديث وكيف لا ينظر مالك فى الرجال ويفحص الاسانيد وهو القائل ادركت جماعة من اهل المدينة مااخذت عنهم شيئا من العلم وانهم لمن يوخذ عنهم العلم وكانوا اصنافا فمنهم من كان كاذبافى احاديث الناس ولايكذب فى علمى فتركته لكذبه فى غير علمه ومنهم من كان جاهلا بما عنده فلم يكن عندى اهلا لاخذ عنه ومنهم من كان يرى برای سوء وكيف لايكون مالك محدثا وهذا يحيىٰ بن سعيد القطان يقول كان مالكاماما فى الحديث وهذا ابوقدامة يقول كان مالك احفظ اهل زمانه

(الحدیث والمحدثون ص ۲۵۸)

بسا اوقات ایک شیخ ہمارے پاس بیٹھ کر دن بھر حدیثیں بیان کرتا رہتا تھا، مگر ہم اس سے ایک حدیث بھی اخذ نہ کرتے، ہم اس پر دروغ گوئی کی تہمت عائد نہیں کرتے تھے، صرف بات یہ تھی، کہ وہ محدث نہیں ہوتا تھا، امام مالک کا قول ہے: اہل مدینہ کی ایک جماعت سے میری ملاقات ہوئی، مگر میں نے ان سے مطلقا علمی استفادہ

نہیں کیا، حالاں کہ لوگ ان کے چشمہ علم سے سیراب ہوتے تھے، یہ لوگ کئی قسم کے تھے، ان میں سے ایک قسم کے لوگ تو وہ تھے، جو لوگوں کے ساتھ بات چیت میں دروغ گوئی کے عادی تھے، مگر علمی باتوں میں جھوٹ نہیں بولتے تھے، تاہم میں نے ان کے جھوٹ کی بنیاد پر ان سے استفادہ نہیں کیا دوسری قسم کے لوگ جاہل تھے، اور میری نگاہ میں اس بات کے مستحق نہ تھے، کہ ان سے حدیثیں اخذ کی جائیں، تیسری قسم کے لوگ وہ تھے جن کے بارے میں عوام الناس اچھی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ یحییٰ بن سعید قطان جیسے محدث امام مالک کے بارے میں کہتے ہیں: امام مالک امام فی الحدیث تھے۔ ابوقدامہ فرماتے ہیں: امام مالک اپنے زمانے کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔

اخذ حدیث میں اس حزم واحتیاط کے باوجود امام مالک کے شیوخ کی تعداد بقول زرقانی نوسو سے زائد اور بقول غافقی ۹۵ رہے، جب کہ امام مالک نے طلب علم کے لیے معدن علم مدینہ سے باہر قدم نہیں نکالا۔ علامہ ابن حجر عسقلانی نے اہم شیوخ کے اسما اس طرح درج کیے ہیں:

عامر بن عبداللہ بن زبیر بن عوام، نعیم بن عبداللہ المجمر، زید بن اسلم، نافع مولی ابن عمر، حمید الطّویل، سعید مقبری، ابوحازم سلمہ بن دینار، شریک بن عبداللہ بن ابونمر، صالح بن کیسان، زہری، صفوان بن سلیم، ربیعہ بن عبدالرحمٰن رائی، ابوالزناد، ابن منکدر، عبداللہ بن دینار، ابوطوالہ، یحییٰ بن سعید، عمرو بن ابوعمرو مولی المطلب، علا بن عبدالرحمٰن، ہشام بن عروہ، یزید بن مہاجر، یزید بن عبداللہ بن خصیفہ، ابوزبیر مکی، ابراہیم، موسیٰ بن عقبہ، ایوب سختیانی، اسماعیل بن ابوحکیم، حمید بن عبدالرحمٰن، جعفر بن محمد صادق، حمید بن قیس مکی، داؤد بن حسین، زیاد بن سعد، زید بن رباح، سالم ابونضر، سمی مولی ابوبکر بن عبدالرحمٰن، سہیل بن ابوصالح، صیفی مولی ابوایوب، ضمرہ بن سعید، طلحہ بن عبدالملک ایلی، عبداللہ بن ابوبکر بن حزم، عبداللہ بن فضل ہاشمی، عبداللہ بن یزید مولی اسود، عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابوصعصعہ، عبدالرحمٰن بن قاسم، عبیداللہ بن ابوعبداللہ اغر، عمرو بن مسلم بن عمارہ بن امیمہ، عمرو بن یحییٰ بن عمارہ، قطن بن وہب، ابوالاسود تیم عروہ، محمد بن عمرو بن حلحلہ، محمد بن یحییٰ بن حبان، مخرمہ بن بکیر وغیرہم

(تہذیب التہذیب ج۱۰ص۵)

امام مالک نے قرآن حکیم بچپن ہی میں حفظ کرلیا تھا اور قرأت وتجوید کی تعلیم بعد میں اپنے زمانے کے امام القرا ابورویم نافع بن عبدالرحمٰن متوفی ۱۶۹ھ سے حاصل کی، جن کی قرأت آج تمام دنیائے اسلام کا معمول بہا ہے۔

دورِ تحصیل علم کی تنگ دستی

امام مالک کا خاندان ثروت ودولت سے خالی تھا، ان کے والد تیر سازی کی صنعت سے کسب معاش کرتے تھے، قاضی عیاض لکھتے ہیں: ”کان یعیش من صنعۃ النبل“ (ترتیب المدارک ج۱ص۱۰۸)

اور امام صاحب کے بھائی بزازی کرتے تھے، خود امام صاحب بھی ان کے ساتھ کپڑے فروخت کیا کرتے تھے، ظاہر

ہے، ان پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد خوش حال زندگی نہیں گزار سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ امام صاحب طلب علم کے پورے دور میں عسرت وتنگ دستی کے مصائب جھیلتے رہے۔ اگرچہ طلب علم کے بعد امام صاحب بہت مرفہ الحال ہو گئے تھے، ایک بار خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی کو امام صاحب نے رعایا کی خبر گیری کی نصیحت کی تو منصور نے کہا کیا یہ واقعہ نہیں ہے، کہ جب آپ کی بچی بھوک کی وجہ سے روتی تھی، تو آپ خادمہ کو خالی چکی چلانے کا حکم دیتے تھے، تو وہ چکی چلاتی تھی، تاکہ پڑوسی رونے کی آواز نہ سن سکیں، تو امام مالک نے ارشاد فرمایا ''**واللہ ما علم بھذا احد الا اللہ**'' خدا کی قسم اس بات کو اللہ کے سوا کسی نے نہیں جانا۔ تو منصور نے کہا ''**فعلمت ھذا ولا اعلم احوال رعیتی**۔'' جب میں اس کو جانتا ہوں تو کیا رعایا کا حال مجھے معلوم نہ ہوگا۔ (مالک حیاتہ وعصرہ ص۴۹)

یہ عسرت وتنگ دستی محض اس بنیاد پر تھی، کہ امام مالک کا انہماک فی العلم کسی وسیع تجارت کی اجازت نہ دیتا تھا، یہی وجہ تھی، کہ کبھی کبھی افلاس وتنگ دستی چھت کی لکڑی بیچنے پر مجبور کر دیتی تھی، ابن قاسم کہتے ہیں:

> **اقضی بمالک طلب العلم الی ان نقض سقف بیتہ فباع خشبہ ثم مالت علیہ الدنیا بعد** ۔(الدیباج المذھب بحوالہ مالک حیاتہ وعصرہ)
>
> طلب علم کی مصروفیات نے امام مالک کو اس قدر مفلوک الحال کر دیا تھا، کہ اپنے مکان کی چھت کو توڑا اور اس کی لکڑیاں فروخت کیں اس کے بعد دنیا ان کی طرف مائل ہوئی یعنی وہ خوش حال ہو گئے۔

یہ افلاس اور معاشی تنگی امام صاحب کو طلب علم کی جدوجہد کے لیے حارج نہ ہو سکی اور وہ پورے صبر واستقلال کے ساتھ تحصیل علم کی راہ میں سرگرداں رہے۔

علمی مقام ومرتبہ

امام مالک نے بے پناہ قوت حفظ وذہانت اور بے پایاں ذوق وشوق کے ساتھ معدن علم وفضل مدینہ منورہ کے اساطین علما سے قرآن وحدیث، فقہ وفتاوی کا درس لیا اور ان علما کے ذخیرہ علم کو اپنے سینے میں محفوظ کر کے علم وعرفان کا عظیم خزانہ فراہم کر لیا، اس طرح حدیث وفقہ میں ممتاز محدث اور فقیہ بن گئے۔ زمانہ طالب علمی میں آپ کا انہماک علم دیکھ کر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

> **ان کان نجیباً منھم فالاشقر الازرق یعنی مالکا** ۔
>
> اگر ان میں سے کوئی نجیب ہوگا تو سرخی مائل مالک۔

دوسری روایت میں ہے، کہ امام ابو حنیفہ نے کہا، میں نے مدینہ میں علم کو بکھرا ہوا دیکھا ہے اگر کوئی اس کو جمع کرے گا تو یہی لڑکا۔ چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہ کی پیشین گوئی حرف بحرف صادق آئی اور تنہا امام مالک کی ذات میں تمام اہل مدینہ کا علم سمٹ کر آ گیا اور آپ امام دار الہجرت کے لقب سے مشہور ہوئے۔ امام صاحب کے معاصر واقران اور بعد میں آنے والے علمائے

اسلام نے امام دارالہجرت کی ممتاز علمی شخصیت کا اعتراف کیا ہے۔

☆**امام اعظم ابوحنیفہ:**۔''ما رايت اسرع منه لجواب صادق ونقد تام'' میں نے امام مالک سے زیادہ جلد صحیح جواب دینے والا اور کامل نقاد حدیث کسی کو نہیں دیکھا۔ (مالک ص۱۵)

☆**امام شافعی:**۔''اذا ذكر العلماء فمالك النجم لولا مالك وابن عيينة لذهب علم الحجاز'' امام مالک علما کے درمیان درخشندہ ستارے ہیں، اگر امام مالک اور سفیان بن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز کا علم رخصت ہو جاتا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۱۹۴)

☆**سفیان بن عیینہ:**۔''ماترك على ظهر الارض مثله'' امام مالک نے روئے زمین پر اپنا مثل نہیں چھوڑا۔ (ایضا)

☆**مصعب بن زبیری:**۔''كان مالك ثقة مامونا ثبتا ورعا فقيها عالما حجة'' امام مالک ثقہ، مامون، ثبت، متقی، فقیہ، عالم اور حجت تھے۔ (تہذیب التہذیب ج۱۰ص ۷)

☆**امام شافعی:**۔''مالك حجة الله تعالىٰ على خلقه بعد التابعين'' امام مالک تابعین کے بعد مخلوق خدا پر حجت ہیں۔ (ایضا)

☆**عبدالرحمٰن بن مہدی:**۔''مارايت رجلا اعقل من مالك'' میں نے امام مالک سے بڑا عقل مند نہیں دیکھا۔ (ایضا)

☆**امام اوزاعی:**۔امام مالک استاذ العلماء عالم حجاز اور مفتی حرمین ہیں۔ (تذکرۃ المحدثین ص۱۰۳)

☆**امام ابویوسف:**۔''مارايت اعلم من ثلثة مالك وابن ابى ليلىٰ وابى حنيفة'' میں نے تین اشخاص سے بڑا عالم نہیں دیکھا مالک، قاضی ابن ابی لیلیٰ اور ابوحنیفہ۔ (مالک ص۷۶)

☆**امام احمد:**۔''مالك سيد من سادات اهل العلم وهو امام فى الحديث والفقه ومن مثل مالك متبع لآثار من مضى مع عقل وادب'' امام مالک اہل علم کے سردار ہیں اور وہ حدیث وفقہ میں امام ہیں، امام مالک جیسا کون ہے؟ وہ عقل وادب کے ساتھ اپنے پیش رو علمائے اسلام کی پیروی کرنے والے ہیں۔ (مالک ص۷۷)

* * *

مسجد نبوی علوم اسلامی کی مرکزی درسگاہ

مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد نماز باجماعت کے قیام کے ساتھ ہی ساتھ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے لیے دین وشریعت کی تعلیم وتربیت کا باضابطہ نظام قائم فرمایا، جسے مجلس یا حلقہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز فرض کے بعد ستون ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لاتے، جہاں پہلے سے اصحاب صفہ، ضعفا ومساکین، مولفۃ القلوب اور باہر سے آنے والے افراد اور وفود حلقہ بنا کر بیٹھے رہتے تھے، آپ ان کو قرآن، حدیث، تفقہ اور دین کی تعلیم دیتے اور ان کی دل جوئی ودل داری فرماتے۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا، کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے، تو انہوں نے فرمایا، کہ ہاں میں بہت زیادہ آپ کی مجلس میں شریک رہا کرتا تھا، جب تک آفتاب طلوع نہیں ہوتا تھا، آپ مصلے پر رہتے تھے اور طلوع آفتاب کے بعد اٹھ کر مجلس میں تشریف لاتے تھے۔

اس حلقہ درس میں قرآن، دینی احکام ومسائل، مکارم اخلاق، تہذیب نفس، تزکیہ باطن کی تعلیم وتربیت، اصحاب صفہ، مہاجرین وانصار باہر سے آنے والے وفود واشخاص کو دی جاتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان طالبان علم کو بشارت عظمی سے سرفراز فرمایا:

مرحبا بطالب العلم ان طالب العلم لتحف به الملائكة وتظله باجنحتها فيركب بعضها بعضا حتى تعلو الى السماء الدنيا من حبهم لما يطلب. (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۳۲)

مرحبا طالب علم کے لیے، طالب علم کو اس کے طلب علم سے محبت کی وجہ سے فرشتے گھیرے رہتے ہیں اور اپنے پروں سے اس پر سایہ کرتے ہیں، ان کی جماعت نیچے اوپر آسمان دنیا تک ہوتی ہے۔

مدینہ اور اطراف مدینہ کے بہت سے لوگ جو اپنی مصروفیات کی وجہ سے روز درسگاہ نبوی میں حاضری نہیں دے سکتے تھے، تو باری باری سے دربار رسالت میں حاضر ہوتے اور اپنے بھائیوں کو اس روز کی تعلیمات کی خبر دیتے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں:

كنت انا وجار لى من الانصار فى بنى امية بن زيد وهى من عوالى المدينة وكنا نتناوب

النزول على رسول الله صلى الله عليه وسلم ينزل يوما وانزل يوما فاذا نزلت جئته بخبر ذالك اليوم من الوحى وغيره واذانزل فعل مثل ذالك ۔ (بخاری باب التناول فی العلم)

میں اور عوالی مدینہ میں قبیلہ بنی امیہ بن زید کا ایک انصاری پڑوسی ہم دونوں باری باری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جاتے تھے، ایک دن وہ جاتا اور ایک دن میں جاتا، جب میں جاتا تو اس دن کی وحی وغیرہ کی خبر لاتا اور جس دن وہ جاتا اسی طرح کرتا تھا۔

معلم کتاب وحکمت کا طریقہ درس یہ تھا، کہ تمام حاضرین مجلس کو اس طرح تعلیم دیتے تھے، کہ عالم، جاہل، شہری، بدوی، عربی، عجمی، بوڑھے، بچے، جوان پوری طرح فیض اٹھاتے تھے اور آپ کی ہر بات سب کے دل میں اتر جاتی تھی۔

حضرت انس فرماتے ہیں:

انه كان اذتكلم بكلمة اعادها ثلاثا حتى تفهم عنه واذا اتى على قوم فسلم عليهم ثلاثا

(بخاری کتاب العلم باب من اعاد الحدیث ثلاثا لیفہم عنہ)

جب آپ کوئی بات کہتے تھے، تو تین بار کہتے تھے، تاکہ سمجھ لی جائے اور جب کسی جماعت کے پاس جاتے تو ان کو تین بار سلام کرتے تھے۔

حاضرین مجلس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی امور کے بارے میں سوالات کرتے تھے اور حضور ان کے جوابات دیتے تھے۔

حضرت مقداد بن اسود کہتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، کہ یارسول اللہ میں نے ایک بات آپ سے سنی ہے، جس کے بارے میں مجھے تردد ہے۔ آپ نے فرمایا ”**اذا شك احدكم فى الامر فليسئلنى عنه**“ جب تم میں سے کوئی کسی بات میں شک کرے تو مجھ سے پوچھ لے۔ اس کے بعد مقداد بن اسود نے اپنا شک بیان کیا اور آپ نے ان کو تسلی بخش جواب دیا۔ (الفقیہ والمتفقہ ج ۲ ص ۱۳۷)

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین وشریعت کی تعلیم وتربیت کا جو عرفانی نظام مسجد نبوی میں قائم کیا، اس سے صحابہ کرام پورے طور پر مستفیض ہوئے اور اپنی جگہ علم وعرفان کے بلند مینار بن گئے اور یہی صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد کتاب وسنت، فقہ وفتوی اور دینی علوم وفنون کے حامل وناشر اور معلم وترجمان تھے، جن کے بارے میں خیار امت کا بیان ہے:

كان اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم ابر هذه الامة قلوبا واعمقها علما واقلها تكلفا واحسنها خلقا واصدقها ايمانا اولئك قوم اختارهم الله لصحبة نبيه وتبليغ دينه ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام امت میں سب سے زیادہ پاکیزہ دل، علم میں سب سے زیادہ گہرے، کم گو، اخلاق میں سب سے بہتر، ایمان میں سب سے سچے تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے

دین کی تبلیغ کے لیے منتخب کیا تھا۔

رحلت نبوی کے بعد قرآن وسنت کے حامل صحابہ بلاد وامصار میں پھیل گئے انہوں نے اپنے اپنے قبیلوں، شہروں، قصبوں قریوں اور مفتوحہ علاقوں میں اسلام کی اشاعت اور علوم نبویہ کی تعلیم وتربیت کا عمل جاری رکھا۔

امام ابو محمد عبدالرحمٰن بن ابو حاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الجرح والتعدیل کے مقدمہ میں لکھا ہے:

ثم تفرقت الصحابة رضی الله عنهم فی النواحی والامصار والثغور وفی فتوح البلدان والامارة والقضاء والاحكام فبث كل واحد منهم فی ناحية وبالبلد الذی هو به ماوعاه وحفظه عن رسول الله صلی الله عليه وسلم حكموا بحكم الله عز وجل وامضوا الامور علی ما سن رسول الله صلی الله عليه وسلم وافتوا فی ما سئلوا عنه وبها حضرهم من جواب رسول الله صلی الله عليه وسلم عن نظائرها من المسائل وجردوا انفسهم مع حسن النية والقربة الی الله تقدس اسمه لتعليم الناس الفرائض والاحكام والسنن والحلال والحرام حتی قبضهم الله عز وجل رضوان الله ومغفرته ورحمة الله عليهم اجمعين۔ (مقدمة الجرح والتعديل ص ٨)

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم عالم اسلام کے اطراف ونواحی، بلاد وامصار، سرحدوں میں اور فتوحات، امارت، قضا اور تبلیغ احکام کے سلسلہ میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنا دیکھا اور یاد کیا تھا سب کو عام کیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہر معاملہ میں عمل کیا اور ان سے کیے گئے سوال میں وہی فتویٰ دیا جو اس جیسے سوال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا تھا۔ لوگوں کو فرائض، احکام، سنن، حلال، حرام کی تعلیم کے لیے حسن نیت اور تقرب خداوندی کے جذبہ کے ساتھ اپنے آپ کو وقف کر دیا اور اسی میں زندگی بسر کی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا۔

ایک قول کے مطابق مدینہ منورہ میں صحابہ کرام کی تعداد تیس ہزار تھی، ان میں سے ہر ایک دین وشریعت کا معلم ومربی تھا، خصوصیت کے ساتھ مسجد نبوی میں جن اکابر علماے صحابہ کے حلقے قائم ہوا کرتے تھے ان میں حضرت ابی بن کعب، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو سعید خدری، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم قابل ذکر ہیں۔

عہد فاروقی میں مسجد نبوی کے تعلیمی حلقوں میں صرف اہل مدینہ ہی نہیں بلکہ دور دراز علاقوں سے طالبان علم سفر کی تکلیفیں برداشت کر کے مدینہ آتے انہی حلقوں میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا حلقہ تھا، جس میں خاص طور سے بیرونی طلبہ شریک

ہوتے تھے۔

مسجد نبوی کے تعلیمی حلقے ستونوں کے پاس قائم ہوا کرتے تھے، اس طرح کہ سارے طلبا اپنے معلم صحابی کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے اور ان سب کے چہرے معلم کی طرف ہوتے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی توسیع کی اور پتھر کے ستون نصب کرائے تو علمی حلقوں کے لیے مزید گنجائش پیدا ہوگئی، عہد عثمانی کے حلقوں کا ذکر عبداللہ بن مسعود کے شاگرد اس طرح کرتے ہیں ''عهدی لهذا المسجد وانه كمثل الروضة اختر منها حيث شئت' 'اس مسجد میں میرا وہ دور گزرا ہے جب یہ باغیچہ کے مانند تھی، تم اس کے جس حصہ میں چاہو بیٹھ جاؤ۔ (المحدث الفاصل ص۱۸۰)

حضرات صحابہ کرام اپنی مجلسوں میں باوضو جاتے تھے، اولا دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھتے تھے پھر انتہائی متانت ووقار کے ساتھ قبلہ رو بیٹھتے، بسم الرحمٰن الرحیم اور حمد وصلاۃ کے بعد درس کا آغار کرتے، مضامین درس کتاب وسنت اور تفقہ فی الدین ہوا کرتے، جو صاحب علم صحابی جس مضمون میں ممتاز ہوتے، ان کے درس میں اسی کا رنگ غالب ہوتا، البتہ تمام معلم صحابہ روایت حدیث میں مشترک ہوتے اور اپنے اصول وانداز کے مطابق حدیثیں حلقہ درس میں بیان کرتے۔

درس حدیث کے مختلف طریقے رائج تھے، جن کے لیے بعد میں محدثین نے اصطلاحی الفاظ مقرر کیے۔ درس حدیث کی مندرجہ ذیل صورتیں دور صحابہ میں تھیں۔

(۱) صحابہ شاگردوں کے سامنے حدیث بیان کرتے اور شاگرد اسے زبانی یاد کرتے یا قلم بند کیا کرتے، تحدیث کا یہ سب سے عمدہ اور اعلیٰ طریقہ تھا، بالعموم یہی رائج تھا، شاگرد ایسی صورت مین سمعنا حدثنا اور اخبرنا کہتے تھے، صحیفہ ہمام بن منبہ میں ہے:

هذا ما حدثنا ابو هريرة عن محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الخ (المحدث الفاصل ص ۳۷۹)

(۲) شاگرد اپنے شیوخ صحابہ کے سامنے ان کا تحریر کردہ نسخہ پڑھتے اور شیوخ صحابہ ان کی تصدیق کرتے، اس صورت کو عرض یا عرض القراٗۃ کہتے ہیں۔

(۳) شیوخ صحابہ مجلس درس میں اپنی کتاب حدیث پڑھ کر سناتے اور طلبہ سنتے تھے۔

(۴) بعض معلم صحابہ اپنی احادیث کا نسخہ تیار کرتے اور طلبہ کو دے دیتے اور وہ اس کی روایت کرتے اس طریقہ کو مناولہ یا عرض مناولہ کہتے ہیں۔

اختتام درس پر صحابہ کرام اپنے لیے اور شرکائے مجلس کے لیے دعا کرتے، حضرت عبداللہ بن عمر اس موقع پر یہ دعا پڑھتے تھے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی دعا کو پڑھتے تھے:

اللهم اقسم لنا من خشيتك ماتحول بيننا وبين معصيتك ومن طاعتك وماتبلغنا به الى حبك ومن اليقين ماتهون علينا مصائب الدنيا به اللهم متعنا باسماعنا وابصارنا وقوتنا مااحييتنا واجعله الوارث منا واجعل ثارنا على من ظلمنا وانصرنا على من عادانا

ولاتجعل مصيبتنا في ديننا ولاتجعل الدنيا اكبر همنا ولا مبلغ علمنا ولا تسلط علينا من لا يرحمنا ۔

اے اللہ! ہم کو اپنی خشیت دے، جو ہمارے اور تیری معصیت کے درمیان حائل ہو جائے اور اپنی اطاعت دے جو ہم کو تیری محبت عطا کرے اور یقین دے، جس سے تو ہم پر دنیا کے مصائب آسان کر دے۔ اللہ! جب تک تو ہم کو زندہ رکھے ہمارے کان ہماری آنکھ، ہماری قوت سے ہم کو نفع پہنچا اور ہماری طرف سے اس تمتع کو وارث بنا اور ہمارے خوں بہا کو ہمارے ظالموں پر ڈال دے اور ہمارے دشمنوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما اور ہم کو دینی مصائب میں مبتلا نہ کر اور دنیا کو ہمارا سب سے بڑا مقصد اور ہمارے علم کا منتہیٰ نہ بنا اور ہم پر ایسے (فرو یا قوم) کو مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کرے۔

احادیث میں مجلس کے خاتمے پر دوسری دعائیں بھی منقول ہیں، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام پڑھتے تھے۔

علم دین کے معلم وناشر تمام صحابہ نہیں تھے، بلکہ ان میں ایک خاص طبقہ مرجع عام تھا اور اس کے تعلیمی حلقے قائم تھے، جس میں تابعین شریک ہو کر تحصیل علم کیا کرتے تھے ابن خلدون کا بیان ہے:

ثم ان الصحابة كلهم لم يكونوا اهل فتيا ولاكان الدين يوخذ عن جميعهم وانما كان ذالك مختصا بالحاملين للقرآن العارفين بناسخه ومنسوخه ومتشابهه ومحكمه وسائر دلائله بما تلقوه من النبي صلى الله عليه وسلم اومن سمعه منهم وكانوا يسمعون لذالك القراء اى الذين يقرؤن الكتاب ۔

تمام صحابہ نہ اہل فتویٰ تھے اور نہ ہی ان سب سے علم دین حاصل کیا جاتا تھا، بلکہ تحصیل علم کا تعلق ان صحابہ کے ساتھ خاص تھا، جو قرآن کے حامل تھے اور اس کے ناسخ ومنسوخ متشابہ ومحکم اور اس کے سارے بیانات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا یا اپنے طبقہ کے ان لوگوں سے حاصل کیا تھا، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست حاصل کیا، یہ حضرات قراء کہے جاتے تھے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل علم صحابہ کو لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے مقرر کیا یا ان کی نشان دہی فرمائی ان حضرات نے عہد رسالت کے بعد تعلیمی مجلسیں قائم کیں اور پھر ان کو امت اسلام میں دینی علمی مرجعیت حاصل ہوئی، یوں تو دائرہ اسلام کی وسعت کی وجہ سے بہت سے صحابہ مختلف اطراف وبلاد میں پھیل گئے، لیکن ایک بڑا طبقہ مدینہ منورہ میں مصروف تعلیم وتعلم رہا اور مدینہ کو علم کی مرکزیت کا شرف حاصل رہا۔

تابعین عظام

صحابہ کرام کے بعد تابعین کا دور شروع ہوا انہوں نے بھی تعلیم دین کی وہی روش اور طریقہ اختیار کیا جو انہیں صحابہ کرام

سے ورثہ میں ملا تھا، تابعین کی مجلسوں میں وقت اور حالات کے مطابق کچھ مضامین ومباحث کا اضافہ ہوگیا تھا، تفسیر، حدیث، فقہ وفتاوی، انساب، ایام عرب وغیرہ کی تعلیم وتدریس کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہ مستقل تعلیمی حلقے اپنے تلامذہ کی تعلیم وتربیت میں مصروف رہتے۔ امام ابن ابوحاتم رازی فرماتے ہیں:

> **فخلف بعدهم التابعون الذين اختارهم الله عز وجل لاقامة دينه وخصهم بحفظ فرائضه وحدوده وامره ونهيه واحكامه وسنن رسوله صلى الله عليه وسلم وآثاره فحفظوا عن صحبة رسول الله صلى الله عليه وسلم مانشروه وبثوه من الاحكام والسنن والآثار وسائرما وصفنا الصحابة به رضى الله عنهم فاتقنوه وعلموه وفقهوا فيه فكانوا من الاسلام والدين ومراعة امرالله عزوجل ونصبهم له اذيقول الله والذين اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه ۔** (تقدمة الجرح والتعديل ص ۸،۹)

صحابہ کے بعد تابعین ان کے جانشین ہوئے، جن کو اللہ نے اپنے دین کی اقامت اور اپنے فرائض، حدود، امر، نہی، احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن وآثار کی حفاظت کے لیے پسند اور مخصوص کیا تھا، چنانچہ تابعین نے ان تمام احکام وسنن، آثار وغیرہ کو یاد رکھا، جن کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سکھایا، پڑھایا اور عام کیا تھا، اس کو اچھی طرح حاصل کر کے تفقہ سے کام لیا اور اسلام، دین اور اللہ کے امر ونہی کی حفاظت کے معاملے میں اسی مقام ومنصب پر رہے، جس پر اللہ نے ان کو رکھا تھا، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، **والذین اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه ۔**

آخیر عہد صحابہ میں فتنوں کا آغاز ہوچکا تھا، اہل ہوی اپنے مقاصد کے لیے حدیثوں میں تحریف اور وضع کے مرتکب ہورہے تھے، چوں کہ احادیث رسول دین کی اساس ہے اسی بنا پر صحابہ میں حضرت ابن عباس حضرت ابوہریرہ تابعین میں حسن بصری، محمد بن سیرین، زید بن اسلم، ابراہیم نخعی وغیرہ نے اخذ حدیث کے سلسلے میں یہ تاکید فرمادی تھی، کہ ثقہ اور متدین راویوں ہی سے حدیث لی جائے۔

> **ان هذا العلم دين فانظروا عمن تاخذون دينكم ۔(مقدمه مسلم)**

یہی وجہ ہے کہ تابعین کرام نے حدیثوں کو کذب وافترا سے پاک رکھنے کے لیے راویوں کو پرکھنے کا اہتمام کیا، نقد وجرح کے ابتدائی اصول بنائے اور علما نے حدیثوں کے حفظ وتفتیش میں خاص طور پر کوشش کی اور روایت حدیث میں سندوں کا اہتمام کیا گیا۔

حضرت محمد بن سیرین کہتے ہیں:

> **كان في زمن الاول الناس لايسالون عن الاسناد حتى وقعت الفتنة فلما وقعت الفتنة**

سالوا عن الاسناد لیحدث حدیث اهل السنة ولیعرك حدیث اهل البدعة ۔(مقدمہ مسلم)

پہلے زمانے میں لوگ سند کے بارے سوال نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ فتنہ برپا ہو گیا، اس کے بعد سند کے متعلق سوال کرنے لگے، تا کہ اہل سنت کی حدیث بیان کی جائے اور اہل بدعت کی حدیث چھوڑ دی جائے۔

عہد تابعین میں حدیث وفقہ، تفسیر وقرآن کی تعلیم کا ذوق اتنا پروان چڑھا کہ لوگ دور دراز خطوں سے سفر کر کے مدینہ منورہ حاضر ہوتے اور اکابر تابعین کی درس گاہوں سے خوب خوب فیض حاصل کرتے، ان واردین مدینہ میں عام علما، طلبہ کے علاوہ خلفا وامرا بھی مدینہ منورہ حاضر ہوتے اور علما وفقہا مدینہ کی طرف دینی وفقہی مسائل میں رجوع کرتے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے، حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے دور امارت میں علما وفقہا کو جمع کر کے یہ خطبہ دیا:

انی دعوتکم لامر توجرون علیه وتکونون فیه اعوانا علی الحق ماارید ان اقطع الا برایکم اوبرای من حضر منکم ۔

میں نے آپ لوگوں کو ایک اہم کام کے لیے بلایا ہے، جس میں آپ لوگوں کے لیے اجر وثواب ہوگا اور آپ لوگ حق کے حامی وناصر ہوں گے، میں چاہتا ہوں کہ آپ سب کی رائے یا آپ میں سے جو حاضر ہو اس کی رائے کے بغیر کسی بات کا قطعی فیصلہ نہ کروں۔

مدینہ منورہ اس دور کا ایسا علمی مرکز بنا جہاں کی درسگاہوں میں حدیث وتفسیر، فقہ وفتاوی، سیر ومغازی، شعر وادب، ایام عرب کی تعلیم دی جاتی تھی اور خاص طور پر مسجد نبوی میں یہ علمی فقہی درسگاہیں قائم ہوتی تھیں، ان کے خاص مسند نشیں شیوخ واساتذہ درج ذیل حضرات تھے:

حضرت سعید بن میسب، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر، حضرت ربیعہ رائی، حضرت اسلم عدوی، حضرت نافع مولی ابن عمر، حضرت علی بن حسین، سلیمان بن یسار، حضرت ابو الزناد بن ذکوان، حضرت محمد بن ابی ذئب، حضرت ابو جعفر باقر العلم، حضرت محمد بن یحیٰی انصاری، حضرت موسیٰ بن عقبہ، حضرت ابراہیم بن عقبہ، حضرت محمد بن عقبہ، حضرت محمد بن عجلان، (رضی اللہ عنہم اجمعین) بطور خاص مشہور ہیں۔

حضرت نافع مولی ابن عمر کے وصال کے بعد ان کے حلقہ درس کے صدر نشیں امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس ہوئے اور اسی علمی وفقہی درسگاہ کا فیضان تمام بلاد اسلامیہ کے شرق وغرب تک عام ہو گیا اور ان کی مساعی جمیلہ سے مسجد نبوی کا علمی مرکز شہرت وعروج کے بام بلند تک پہنچ گیا۔

* * *

امام مالک کا حلقہ درس وافتا

امام دارالہجرت نے جس ذوق وشوق اور محنت ولگن سے اساطین علمائے مدینہ کا علم اپنے سینے میں محفوظ کیا تھا اور وہ حدیث وفقہ میں جس امتیازی مرتبہ پر فائز تھے، اس کا تقاضا تھا، کہ درس وافتا کی مجلس قائم فرمائیں اور تشنگان علوم نبوت کو سیراب کریں۔ یہی وجہ ہے، کہ اپنے اساتذہ اور شیوخ کی موجودگی ہی میں علاحدہ حلقہ درس قائم کیا۔ جب کہ ان کے ستر شیوخ نے آپ کی تکمیل علم کو مدنظر رکھتے ہوئے تحدیث وافتا کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ امام صاحب کا قول ہے:

وماجلست حتی شهد لی سبعون شیخا من اهل العلم انی موضع لذالك ۔ (مالك ص ۴۱)

جب تک ستر اہل علم شیوخ نے گواہی نہ دی، کہ میں مسند درس کا اہل ہوں، میں نے حلقہ درس قائم نہیں کیا۔

اس وقت آپ کی عمر سترہ سال تھی اور آپ کے کئی اہم شیوخ زندہ تھے اور ان کی زندگی ہی میں امام صاحب فتویٰ دیا کرتے تھے۔ ایوب سختیانی کہتے ہیں، کہ میں حضرت نافع کی زندگی میں مدینہ گیا اس وقت امام مالک کا حلقہ درس وافتا قائم تھا، ابن منذر کا بیان ہے، کہ نافع اور زید بن اسلم کی زندگی ہی میں امام صاحب فتویٰ دینے لگے تھے۔

امام صاحب کی مجلس درس وافتا دو جگہ منعقد ہوتی تھی، ایک ان کے آبائی مکان وادی عقیق میں اور دوسری مسجد نبوی شریف میں۔ حضرت نافع کی رحلت کے بعد آپ مسجد نبوی میں ان کی نشست گاہ پر بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے، جب آپ حدیث وفقہ کے درس کے لیے تشریف لاتے تو پہلے وضو یا غسل کرکے عمدہ اور قیمتی پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگا کر باہر تشریف لاتے۔ مجلس حدیث جب تک قائم رہتی عود واگر کی خوشبو سے فضا معطر رہتی۔

ابن ابی اوس کہتے ہیں:

کان مالك اذاارادان یحدث توضا وجلس علی صدر فراشه وسرح لحیته وتمکن فی جلوسه بوقاز وهیبة ثم حدث فقیل له فی ذالك فقال احب ان اعظم حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا احدث به الا متمکنا علی طهارة وکان یکره ان یحدث علی الطریق اوقائما او مستعجلا ویقول احب ان ان یفهم ماحدث به عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وکان لایرکب فی المدینة مع ضعفه وکبر سنه ویقول لا ارکب فی مدینة فیها جثة

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدفونة ۔(صفة الصفوہ ج ۲ص ۴۳۴)

امام مالک جب حدیث بیان کرنا چاہتے، تو وضو کرتے، صدر مجلس میں بیٹھتے، ڈاڑھی میں کنگھی کرتے، بڑے وقار و عظمت کے ساتھ رونق مجلس ہوتے، پھر حدیث بیان کرتے۔ اس سلسلے میں ان سے پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا، مجھے یہ بات بڑی محبوب ہے، کہ حدیث رسول کی تعظیم کروں اور بغیر طہارت حدیث نہ بیان کروں۔ آپ راستہ چلتے ہوئے، کھڑے ہو کر یا جلد بازی میں حدیث بیان کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور فرماتے تھے، کہ مجھے یہ بات پسند ہے، کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کروں، تو لوگ اسے خوب اچھی طرح سمجھیں۔ وہ مدینہ منورہ میں بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود سواری پر نہیں بیٹھتے تھے اور فرماتے تھے، کہ میں اس شہر میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مدفون ہو سواری پر نہیں بیٹھ سکتا۔

کاشانہ امامت پر آپ کی مجلس بڑی پر تکلف ہوا کرتی، فرش پر بیش قیمت عمدہ قالینیں بچھائی جاتیں، وسط مجلس میں شہہ نشیں ہوتی۔ دائیں بائیں تکیے رکھے جاتے، جس پر آپ درس حدیث کے وقت جلوہ افروز ہوتے، جگہ جگہ پنکھے رکھے جاتے، حاضرین درس متانت اور سنجیدگی کا پیکر بنے ہوئے ادب واحترام کے ساتھ بیٹھتے کسی قسم کا شور یا ہنگامہ نہ ہوتا، امام صاحب کی ہر ادا پر شکوہ اور باوقار ہوتی، مجلس درس پر دربار شاہی کا گمان ہوتا، تلامذہ کی شائستگی اور ادب کا یہ حال تھا، کہ وہ کتاب کے اوراق بھی حد ادب کی وجہ سے نہ پلٹتے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کہ ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں الٹتے تھے، کہ کہیں کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ ہو۔

مطرف کا بیان ہے:

کان مالک اذا اتاہ الناس خرجت الیھم الجاریة فتقول لھم یقول لکم الشیخ اتریدون الحدیث ام المسائل فان قالوا المسائل خرج الیھم فافتاھم وان قالوا الحدیث قال لھم اجلسوا ودخل مغتسله فاغتسل وتطیب ولبس ثیابا جیّدا ولبس ساجة وتعمم وتلقی له المنصة فیخرج الیھم قد لبس وتطیب وعلیه الخشوع ویوضع عود فلا یزال ینجز حتی یفرغ من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ۔(الدیباج المذھب ص ۳۲)

امام مالک کے در دولت پر جب لوگوں کا ہجوم ہوتا تو ان کی کنیز لوگوں کے پاس آتی اور ان سے پوچھتی، شیخ تم سے پوچھ رہے ہیں، کہ تم حدیث پڑھنا چاہتے ہو یا مسائل پوچھنے کا ارادہ ہے؟ اگر لوگ جواب دیتے، کہ ہم مسائل پوچھنے آئے ہیں، تو امام مالک اندرون خانہ سے باہر تشریف لاتے اور ان کے سوالوں کا جواب دیتے، اگر لوگ کہتے کہ ہم حدیث سننے آئے ہیں تو ان سے کہتے تم لوگ بیٹھ جاؤ اور خود غسل خانہ میں جا کر غسل کرتے، خوشبو لگاتے اور عمدہ کپڑے زیب تن فرماتے اور ساج پہنتے (ساج بادشاہوں کے لباس کی طرح سر کا

ایک لباس ہے) اور دستار باندھتے اور ان کی مسند درس آراستہ کی جاتی تو وہ لوگوں کے پاس اس حال میں تشریف لاتے کہ عمدہ لباس میں ملبوس خوشبو لگائے ہوئے ان پر خشوع کی کیفیت طاری رہتی اور عود سلگائی جاتی اور وہ مسلسل خوشبو دیتی یہاں تک کہ وہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درس سے فارغ ہو جاتے۔

کاشانہ امامت پر مجلس درس قائم ہوتی، تو درس کے لیے اولا اپنے اصحاب کو خاص کرتے، پھر عام لوگوں کو مجلس میں آنے کی اجازت دی جاتی اور آپ ان سے حدیثیں بیان فرماتے، اس امید پر کہ یہ لوگ ان طالبان علوم نبوت کو یہ حدیثیں پہنچادیں، جن کی حفاظت کی وہ طاقت رکھتے ہیں، پھر آپ کے شاگرد بیٹھے رہتے اور فقہی مسائل معلوم کرتے اور انہیں محفوظ کرتے اور حدیثیں یاد کرتے، اس طرح عوام تو علم کا کچھ حصہ پاتے کیوں کہ امام صاحب ان لوگوں سے وہی حدیثیں بیان فرماتے، جو ان کے دین کے لیے مفید ہوتیں۔

کاشانہ اقدس پر مجلس درس اور شرکاے درس کی باریابی کی کیفیت حسن بن ربیع ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

كنت على باب مالك فنادى مناديه الاليدخل اهل الحجاز فما دخل الا هم ثم نادى في اهل الشام ثم في اهل العراق فكنت آخر من دخل وفينا حماد بن ابي حنيفة ۔(مالك ص ٥٥)

میں امام مالک کے دروازے پر تھا، تو ان کے منادی نے اعلان کیا کہ اہل حجاز سب سے پہلے مجلس درس میں داخل ہوں تو صرف اہل حجاز ہی داخل ہوئے پھر منادی اہل شام داخل ہو جائیں، پھر اہل عراق تو میں سب سے آخر میں داخل ہوا ہماری جماعت میں حماد بن ابی حنیفہ بھی تھے۔

آپ کے حلقہ درس میں قریش اور انصار کے علاوہ بیرونی طلبہ کا ازدحام رہتا تھا، جس میں علما، فقہا، امرا اور صاحب ثروت لوگ سماع حدیث کے لیے جمع ہوتے۔ یہ لوگ صرف مدینہ منورہ یا اس کے اطراف ہی کے نہ ہوتے، بلکہ اسلامی دنیا کے دور دراز علاقوں سے امام دارالہجرت کی بارگاہ میں حاضری، سعادت اور تلمذ کو مایہ افتخار سمجھ کر آتے اس طرح امام مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پاک کے مصداق کامل بن گئے تھے:

يوشك ان يضرب الناس اكباد الابل يطلبون العلم فلا يجدون احدا اعلم من عالم المدينة ۔(جامع الاصول ج٩ ص ٢٢١)

عنقریب لوگ دور دراز ممالک سے سفر کر کے آئیں گے، لیکن انہیں مدینہ کے عالم سے بڑا کوئی عالم نہیں ملے گا۔

ابن عیینہ نے ابو ہریرہ کی اس حدیث کے بارے میں کہا، کہ وہ عالم مدینہ امام مالک ہی ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج١٠ ص٧)

امام عبدالرزاق بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں۔

مجلس میں خاص وعام کی کوئی تمیز نہیں تھی اور نہ درس حدیث میں کسی کے ساتھ امتیازی سلوک رکھا جاتا، چاہے وہ اپنے وقت کی کتنی ہی عظیم اور پر وقار شخصیت کیوں نہ ہو، خلیفہ ہارون رشید عباسی مدینہ منورہ آیا تو وہ مؤطا کے سماع کا خواہش مند ہوا، امام صاحب نے فرمایا، کہ کل کا دن اس کام کے لیے ہے۔ ہارون رشید منتظر رہا، کہ امام صاحب خود اس کی قیام گاہ پر تشریف لائیں گے، مگر امام صاحب اپنی مجلس درس میں ہی تشریف فرما رہے۔ ہارون رشید نے وجہ پوچھی، تو ارشاد فرمایا "العلم یزار لا یزور" ، علم کے پاس لوگ آتے ہیں لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا۔ چنانچہ ہارون رشید کو اپنے تمام تر طمطراق حکومت کے باوصف کاشانہ امامت پر ادنی تلمیذ کی طرح حاضر ہونا پڑا، خلیفہ ہارون کی نخوت اقتدار نے پھر جوش مارا اور اس نے کہا، عام لوگوں کو مجلس سے باہر کر دیا جائے تو امام صاحب نے فرمایا، شخصی منفعت کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا۔

خلیفہ مہدی اور ہارون رشید دونوں نے خیمہ خلافت میں املاے حدیث کی خواہش ظاہر کی تو امام صاحب نے انکار کر دیا۔

امام صاحب درس حدیث یا املاے حدیث حلقہ درس کے علاوہ کسی اور مقام پر احترام حدیث کے خلاف سمجھتے تھے۔

طریقہ درس

امام مالک رضی اللہ عنہ کا طریقہ درس یہ تھا، کہ امام صاحب کے کاتب حدیث ابن حبیب جو خود ایک بڑے محدث تھے، مؤطا لے کر اس کی حدیثیں پڑھتے اور تمام شرکاے درس خاموشی سے سنتے تھے، اگر ابن حبیب کوئی غلطی کرتے تو امام صاحب تصحیح کر دیتے تھے، اکثر ایسا ہی ہوتا، مگر کبھی کبھی امام صاحب خود بھی مؤطا طلبہ کے سامنے پڑھتے، یحیٰ بن بکیر کہتے، کہ میں نے چودہ مرتبہ امام صاحب سے ان کی کتاب مؤطا سنی ہے۔

امام مالک کا حلقہ درس مدینہ منورہ میں سب سے عظیم تھا، مدینہ، اطراف مدینہ اور دور دراز بلاد وامصار کے طلبہ شریک درس ہوا کرتے تھے۔ ابوزہرہ لکھتے ہیں:

كان الناس يحضرون اليه من كل فج عميق ۔(مالك ص٥٦)

لوگ ان کے پاس دنیا کے اطراف واکناف سے آتے تھے۔

امام مالک نے اپنے حلقہ درس میں سکون ووقار کا ہمیشہ التزام فرمایا اور لغو باتوں سے ہمیشہ احتراز کرتے اور ان امور کو وہ طلبہ کے لیے ضروری سمجھتے، انہوں نے اپنے بعض بھتیجوں کو نصیحت فرماتے ہوئے کہا:

تعلم لذالك العلم الذى علمته بالسكينة والحلم والوقار ۔

جو علم میں نے تمہیں سکھایا، اسے اطمینان وسکون اور حلم ووقار کے ساتھ حاصل کرو۔

اکثر فرمایا کرتے تھے:

حق على من طلب العلم ان يكون فيه وقار وسكينة وخشية ان يكون متبعا لآثار من مضىٰ

وينبغى لاهل العلم ان يخلو انفسهم من المزاح وبخاصة اذا ذكروا العلم ۔

(مالکؒ ص۵۲)

طالب علم کے لیے ضروری ہے، کہ اس کے اندر سکون ووقار اور خوف خدا ہو اور وہ گزشتہ آثار کی اتباع کرنے والا ہو اور علما کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی ذات مزاح سے دور رکھیں، بالخصوص جب وہ حدیث بیان کریں۔

امام صاحب متانت ووقار کے اس اصول پر بڑی سختی کے ساتھ عمل پیرا رہے، انہوں نے پچاس سال تک اسی نہج پر حدیث نبوی کا درس دیا، اس طویل مدت میں صرف ایک بار یا دو بار ہنسے، ان کی باتوں میں طنز ومزاح اور لغویات، پہیلیاں وغیرہ نہ ہوتیں، یہ باتیں اس لیے نہیں تھیں، کہ ان کی ذات میں معاذ اللہ کبر وغرور یا نخوت علم ہو، بلکہ یہ ساری چیزیں احترام علم اور خوف خدا کی وجہ سے تھیں، ان کے بعض شاگردوں کا بیان ہے:

كان مالك اذا جلس معنا كانه واحد منا يتبسم معنا فى الحديث وهو اشد تواضعا منا له فاذا اخذ فى الحديث تهيبنا كلامه كانه ماعرفنا ولاعرفناه ۔ (ايضا)

جب امام مالک عام حالات میں ہمارے ساتھ بیٹھتے تو وہ ہماری مجلس کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوتے اور ہمارے ساتھ مل جل کر گفتگو کرتے، وہ ہمارے ساتھ حد درجہ تواضع سے پیش آتے اور جب وہ حدیث رسول کا درس دیتے تو ان کا کلام اس طرح ہم پر ہیبت طاری کر دیتا، گویا وہ ہم کو نہیں پہچان رہے ہیں اور ہم ان کو نہیں پہچان رہے ہیں۔

ایک شاعر نے ان احوال کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے۔

يدع الجواب فمايراجع هيبة   والسائلون نواكس الاذقان
ادب الوقار وعز سلطان التقى   فهو المهاب وليس ذا سلطان

اگر امام جواب دیتے تو ہیبت سے پھر پوچھا نہیں جا سکتا، پوچھنے والے سر نیچے کیے رہتے ہیں۔ وقار کا ادب اور سلطان تقویٰ کا جاہ وجلال ہے، لوگ اس سے ڈرتے ہیں حالاں کہ وہ صاحب حکومت نہیں ہے۔

امام صاحب خود حاکم تھے اور نہ اصحاب اقتدار سے کبھی وابستہ رہے مگر علم وفضل کے اس تاجدار کو ایسی عزت وسربلندی نصیب ہوئی کہ طالبان علم کی صفوں میں جہاں علم نبوت کے جرعہ خوار ہوتے وہیں بڑے بڑے اہل ثروت شرفا امرا اور وزرا کاشانہ امامت پر حاضری میں فخر محسوس کرتے۔

معمول یہ تھا، کہ نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک اوراد ووظائف میں مشغول رہتے، طلوع شمس کے بعد لوگوں کی آمد شروع ہوتی، امام صاحب آنے والوں سے خیریت دریافت کرتے، مجلس کی ترتیب یوں تھی، کہ قریب تر جید اور مستعد صاحب فہم طلبہ کو جگہ دیتے پھر علی قدر المراتب ابتدائے درس سے پہلے فرماتے کہ متعدد صاحب فہم لوگ قریب بیٹھیں "املا" آہستہ اور سکون

کے ساتھ کراتے ایک حدیث ختم ہو جاتی تو دوسری حدیث شروع کرتے۔

بیان حدیث کے وقت وقار و متانت کا یہ عالم ہوتا کہ کوئی چیز بیان حدیث کے تسلسل میں حارج اور مانع نہ ہوتی اس دوران بڑی سے بڑی اذیت گوارہ کر لیتے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں:

ایک روز میں امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ روایت حدیث فرما رہے تھے، ایک بچھو نے نیش زنی شروع کی، تو شاید دس مرتبہ ڈسا اور غیر معمولی تکلیف کی وجہ سے بار بار امام صاحب کا چہرہ کچھ متغیر ہو کر مائل بہ زردی ہو جاتا تھا، مگر امام صاحب نے نہ حدیث کو قطع فرمایا اور نہ ہی آپ کے کلام میں لغزش ظاہر ہوئی، جب مجلس حدیث ختم ہوئی حاضرین چلے گئے تو میں نے آپ سے عرض کیا، آج آپ کے چہرے پر کچھ تغیر کے آثار نظر آرہے تھے، امام صاحب نے فرمایا بے شک تمہارا خیال صحیح ہے اور تمام واقعہ بیان کر کے فرمایا میرا اس قدر صبر کرنا طاقت و شکیبائی کی بنا پر نہ تھا، بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی وجہ سے تھا۔ (بستان المحدثین ص۱۶)

امام صاحب نے درس حدیث کا جو ضابطہ قائم کیا تھا، اس میں کبھی فرق نہ آنے دیا بڑے بڑے لوگوں سے حدیث بیان کرنے کے لیے ان کے کاشانوں پر حاضری نہیں دی اور جو شخص حلقہ درس میں حاضر ہوا اس کے ساتھ امتیازی سلوک جائز نہ رکھا، خواہ وہ اپنے وقت کی کتنی ہی بلند مرتبت شخصیت کیوں نہ ہو۔

خلیفہ مہدی عباسی

خلیفہ مہدی عباسی موسم حج میں مدینہ آیا امام صاحب اس کی فرودگاہ پر ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، خلیفہ نے بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنے صاحبزادوں موسیٰ اور ہارون کو امام صاحب سے حدیث پڑھنے کا حکم دیا، خلیفہ کا خیال یہ تھا، کہ امام صاحب بذات خود شہزادوں کو درس حدیث دینے ان کی قیام گاہ پر آئیں گے، مگر خلاف توقع جب امام صاحب پڑھانے نہیں گئے، تو خلیفہ نے وجہ دریافت کی، تو آپ نے فرمایا، علم قابل احترام چیز ہے اس کے پاس آنا چاہیے، خلیفہ نے اس بات کو تسلیم کیا اور صاحبزادوں کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور یہ حکم دیا کہ آپ خود ان کو حدیث پڑھ کر سنائیں آپ نے فرمایا، اس شہر میں طلبہ استاذ کے سامنے پڑھتے ہیں، صاحبزادوں نے خلیفہ کے پاس جا کر اس بات کی خبر دی، خلیفہ نے امام صاحب کے پاس آدمی بھیج کر کہلوایا کہ آپ نے موسیٰ اور ہارون کو بلانے کے بعد ان کو پڑھانے سے انکار کر دیا؟ امام صاحب نے جواب دیا، کہ امیر المؤمنین میں نے ابن شہاب سے سنا ہے، کہ ہم نے سعید بن مسیب، ابو سلمہ، عروہ بن زبیر، سالم، خارجہ، سلیمان اور نافع سے اسی طرح اس مقام میں علم حاصل کیا ہے، نیز ابن ہرمز، ابو الزناد، ربیعہ، بحر العلم ابن شہاب وغیرہ کے سامنے حدیث پڑھی جاتی تھی، وہ حضرات خود نہیں پڑھتے تھے، اس کے بعد مہدی نے اپنے صاحبزادوں سے کہا، تم لوگ خود جا کر پڑھو یہ ائمہ دین قدوہ اور اسوہ ہیں، چنانچہ صاحبزادوں کے مودب و معلم نے امام صاحب کے سامنے حدیث پڑھی اور صاحبزادوں نے سماع کیا۔

ایک عالم کے لیے تین حدیثوں کی روایت

امام مالک کا عام طریقہ درس یہ تھا، کہ آپ کا کاتب مجلس درس میں مؤطا پڑھ کر سناتا یا تلمیذ مؤطا کی حدیثیں پڑھتا، امام صاحب اپنی زبان سے حدیث بیان نہیں کرتے، چنانچہ خلیفہ بغداد کے دونوں صاحبزادوں کو ان کے اتالیق نے مجلس درس میں امام صاحب کے روبرو مؤطا پڑھ کر سنائی۔ دنیاے اسلام کی سب سے بڑی با اقتدار شخصیت کے صاحبزادوں کے لیے بھی امام صاحب نے اپنے ضابطہ درس میں لچک نہ آنے دی اور یہ طرز عمل اس بنا پر تھا، کہ دنیاوی عظمت وجلال کے سامنے عظمت علم کا جھنڈا سرنگوں نہ ہو اور علم نبوت کی قلمرو کا تاجدار سلطان وقت کے سامنے وقار علم مجروح نہ ہونے دے، مگر ایک بار جب ایک صوفی عالم نے آکر امام صاحب سے کہا، کہ آپ تین حدیثیں مجھ سے بیان کردیں، امام صاحب نے کہا، تم کو ضرورت ہو تو مجھ کو پڑھ کر سنا دو پھر مجھ سے اس کی روایت کرو، اس عالم نے کہا، کہ ابوعبداللہ ہمارے یہاں عرض (القرأۃ علی المحدث) کا رواج نہیں ہے، امام صاحب نے کہا تم اس کے بارے میں زیادہ علم رکھتے ہو، وہ عالم بار بار یہی کہتے تھے اور امام صاحب یہی جواب دیتے تھے، جب امام مالک مجلس سے اٹھنے لگے تو انہوں نے امام صاحب کا دامن پکڑ لیا اور کہا، کہ اس قبر والے کے رب کی قسم جب تک آپ تینوں حدیثیں مجھ سے نہ بیان کریں گے میں دامن نہیں چھوڑوں گا۔ امام صاحب نے اپنے شاگرد ابوطلحہ سے کہا، تم مجھ کو اس آدمی سے بچاؤ! یہ شخص دیوانہ معلوم ہوتا ہے، ابوطلحہ نے کہا، ہ دیوانہ نہیں ہے، آپ مناسب سمجھیں تو تینوں حدیثیں بیان کردیں، اس کے بعد امام صاحب نے اس عالم سے کہا، کہ اچھا آؤ کیا چاہتے ہو بیان کرو اس نے کہا پہلی حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے تو کیا آپ کے سر پر مغفر (خود) تھا؟ امام صاحب نے کہا:

حدثنی الزهری عن انس ان النبی صلی الله علیه وسلم دخل مكة یوم الفتح وعلی راسه المغفرة قال فقال ابن شهاب ولم یكن رسول الله صلی الله علیه وسلم یومئذ محرما ۔

اس صوفی عالم نے کہا، دوسری حدیث یہ ہے کہ ابن عباس سے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا گیا، جس کی دو بیویاں تھیں، ان میں ایک عورت نے ایک لڑکے کو دودھ پلایا اور دوسرے نے ایک لڑکی کو امام صاحب نے کہا:

حدثنی ابن شهاب عن عمرو بن الشرید ان ابن عباس سئل عن رجل له امرأتان ارضعت احداهما غلاما والاخری جاریة ایتناكحان قال لا الفطام واحد ۔

اس صوفی عالم نے کہا تیسری حدیث یہ ہے کہ کیا ابن عمر نے اقامت سنی اور بقیع میں تھے؟ امام صاحب نے کہا:

حدثنی عن ابن عمر سمع الاقامة وهو بالبقیع فاسرع المشی ۔ (المحدث الفاصل ص ۲۵، ۲۴، ۲۲۳)

حلقۂ درس کی عظمت وشان

حضرت امام مالک کے حلقہ درس میں عرب وعجم، مصر وشام اور اندلس کے طلبہ شریک ہوا کرتے تھے، آپ کی علمی شان

اور پروقار شخصیت کا یہ عالم تھا، کہ لوگ ان کے درس میں حاضری کے لیے بڑے بڑے مصائب وآلام جھیل کر آتے اور ان کا مقصد صرف تحصیل علم ہوتا ان کی توجہ اور انہاک علم میں بڑی سے بڑی چیز حائل نہ ہوتی۔

ایک امام مالک کی جامع کمالات علمی وعبقری شخصیت کی درسگاہ سے کتنے کثیر علما، طلاب، امرا اور ملوک نے کسب فیض کیا بجائے خود یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ اور تنہا ایک ذات نے جو وسیع تعلیم حلقہ قائم کیا ہے بہت سے علما مجتمع ہو کر بھی انجام نہیں دے سکتے، امام مالک کے حلقہ درس اور ان کی درسگاہ میں طالبان علوم نبویہ فقہ اسلامی کی تحصیل کرنے والوں کا نقشہ محمد ابوزہرہ مصری نے اس طرح کھینچا ہے:

> **هـذه صـفة درس مـالك وهـذه حالة عنددرس ولقد بارك الله له في العمر وزاده بسطة من الـعـقـل وانا ر بصيرته فكانت تنفذ في كل شئ وكلما تقدم به العمر ازداد فهما وادراكا وجـلالا واقبالا وتسامعت بذكره البلاد الاسلامية من اقصى المشرق الى اقصى المغرب قـصده العلما والطلاب بسماع الحديث للاستفتاء في المسائل التي كانت تقع فيعرفهم حـكـمهـا ويبيـن اصـلـه من الشرع الاسلامي وازدحمت على بابه الوفود وخصوصا في موسم الحج ولهٰذا الازدحام كان له حاجب كالملوك** ۔(مالك ص ۵۴)

امام مالک کے درس کی یہ کیفیت تھی اور اثنائے درس ان کی شان ہوتی جوں جوں عمر میں اضافہ ہوتا گیا ان کی عقل میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور ان کا نور بصیرت روشن تر ہوتا گیا اور اس کا اثر آپ کی زندگی کے تمام گوشوں میں نظر آتا اور جب عمر کافی پختہ ہوگئی تو فہم وادراک، جلال واقبال بام عروج کو پہنچ گیا اور آپ کے علم وفضل کی شہرت شرق وغرب کے اقصائے بعید (خراسان واندلس) میں لوگوں نے سنی تو ان علاقوں کے علما اور طلبہ آپ سے سماع حدیث اور پیش آنے والے پیچیدہ مسائل کے جوابات کے لیے حاضر ہوتے، آپ لوگوں کو حکم شرع بتاتے اور قرآن وسنت سے دلائل فراہم کرتے، آپ کے دروازے پر وفود کا ازدحام ہوتا بالخصوص موسم حج میں لوگوں کی آمد بڑھ جاتی، اس بڑے ہجوم کے لیے شاہی دربار کی طرح حاجب ہوا کرتے پولس کی طرح آپ کے شاگردوں اور مریدوں کا محافظ دستہ ہوتا، اس طمطراق اور رعب وجلال کی وجہ سے کاشانہ امامت پر دربار شاہی کا گمان ہوتا۔

مدینہ منورہ خود مرکز اسلام اور تعلیمات اسلامی کی عظیم درسگاہ تھی، امام مالک کا خاندان ابتدا ہی سے علم وفضل کے لیے مشہور تھا، ان امور کے علاوہ امام ہمام کی ذاتی قابلیت اور علمی عبقریت نے امام کی صدائے علم وفضل کو پورے عالم اسلامی میں پھیلا دیا اور آپ کی درسگاہ بلا اختلاف جغرافیائی سرحدوں سے اوپر اٹھ کر بوقلموں زار بن گئی۔

* * *

تلامذہ

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تقریبا ۶۲ / سال تک طالبان علم کو حدیث وفقہ کا درس دیتے رہے اور آپ کی مجلس درس میں شریک ہونے والے صرف مدینہ واطراف مدینہ حجاز اور عرب سے تعلق رکھنے والے نہ تھے، بلکہ اس وقت کی اسلامی دنیا کے گوشے گوشے سے آنے والے شائقین علم آپ کی مجلس درس سے فیض یاب ہو رہے تھے۔

بلاد عرب:۔ مدینہ، مکہ، صنعاء، ایلہ، سیراف، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، بلقا۔

بلاد شام:۔ دمشق، عسقان، خلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت المقدس، اردن، صور انطا کیہ۔

بلاد عراق:۔ بغداد، بصرہ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسق، انبار، رقہ، رے۔

بلاد عجم:۔ جرجان، کرمان، ہمدان، طالقان، نیشاپور، طبرستان، مرو، سرخس، پوس، مدائن، قزوین، قوہستان، صنعان، آمد، کردستان، اینور، سیستان،

بلاد ترکستان:۔ ترکستان، ہراۃ، بخارا، سمرقند، خوارزم، ترمذ، بلخ، نسا۔

بلاد مصر:۔ مصر، اسکندریہ، فیوم، اسوان، تنیس۔

بلاد افریقہ:۔ افریقہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مغربی مراکش۔

بلاد اندلس:۔ طلیطلہ، بسطہ، باجا، قرطبہ، سرقطہ، صیقلہ، سسلی، سمرنا۔

امام مالک کی علمی جلالت کا شہرہ مشرق ومغرب، جنوب وشمال ہر طرف پھیلا اور متذکرہ بالا بلاد وامصار سے جوق در جوق طالبان علم نبوت درس مالک میں شرکت کے لیے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور آپ کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی۔ اس طرح امام مالک کے حلقہ درس کی بے نظیر وسعت کے ساتھ آپ کے فیض یافتہ تلامذہ کی تعداد حدوشمار کے دائرے سے باہر ہے۔ حافظ شمس الدین ذہبی کہتے ہیں:

حدث عنه امم لايكادون يحصون ۔(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ترجمہ امام مالک)

امام مالک سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے کہ جن کا شمار تقریبا ناممکن ہے۔

امام صاحب سے کسب علم کرنے والوں میں ایسے علما بھی ہوا کرتے جو دوسری درسگاہوں سے باقاعدہ سند یافتہ تھے، بلکہ خود امام مالک کے شیوخ نے بھی ان سے حدیثیں لیں، اس طرح آپ کے بعض شیوخ بھی تلامذہ کی صف میں نظر آتے ہیں، امام صاحب خود فرماتے ہیں "بہت کم ایسے لوگ ہیں جن سے میں نے سیکھا ہے اور آخر ان کو خود مجھ سے پوچھنے کی حاجت نہ پڑی"۔ امام صاحب کو اپنے تلامذہ اور مستفیدین کی حیثیت سے بھی متعدد خصوصیات حاصل ہیں، جس کثرت تعداد، جس رتبہ وکمال، جس اختلاف طبقات کے لوگ امام کے حلقہ فیض میں داخل ہیں، تمام محدثین وفقہا میں کسی کو حاصل نہیں۔ کثرت تعداد کے ساتھ ساتھ آپ کے بہت سے تلامذہ حدیث وفقہ کے بلند مرتبہ پر فائز تھے اور انہیں اجتہاد کا مرتبہ حاصل تھا اور آپ کے تلامذہ اسلامی بلاد کے ہر خطہ اور اسلامی سوسائٹی کے ہر طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ذیل میں شاگردوں کی تفصیل طبقات کے لحاظ سے تحریر کی جاتی ہے۔

خلفاے اسلام:۔ ابوجعفر منصور عباسی، مہدی، موسیٰ ہادی، ہارون رشید، محمد امین، عبداللہ مامون۔

امراے بلاد:۔ حسن بن مہلب شیبانی امیر خراسان، عبداللہ بن سعید بن عبدالملک بن مروان اموی، ہاشم بن عبداللہ التجیبی امیر برقہ (افریقہ)

تابعین وشیوخ امام:۔ ابن شہاب زہری، یحییٰ بن سعید انصاری، محمد بن عبدالرحمٰن ابوالاسود، شعبہ، نافع انصاری، جعفر صادق، ہشام بن عروہ، ربیعہ رائی، ابوسہیل نافع، سفیان ثوری، حماد، ایوب سختیانی، محمد بن مطرف ابوغسان، عبداللہ بن دینار، یزید بن عبداللہ۔

ائمہ محدثین کبار:۔ محمد بن عجلان، حیوۃ بن شریح، سلام تیمی، یحییٰ بن سعید قطان، یحییٰ بن بکیر، یحییٰ مصمودی، زید بن اسلم، وہیب بن خالد، ابن ابی ذئب، وکیع بن الجراح، ولید بن مسلم دمشقی، خالد امام خراسان، مسلم بن خالد زنجی، سلیمان اعمش، زبیر بن بکار، ابراہیم امام مصیصہ، عبداللہ بن مسلمہ قعنبی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالعزیز بن محمد دراوردی، ابونعیم فضل بن دکین، عبدالملک بن جریج، عبدالرزاق بن ہمام، لیث بن سعد، شیخ الاسلام محمد بن مبارک، ہیثم بن جمیل محدث انطاکیہ، قتبہ بن سعید محدث خراسان، حافظ حدیث ابومحمد زہرانی، سلیمان بن داؤد طیالسی، مان بن عیسیٰ، ابومصعب زبیری، ابوحذافہ سہمی وغیرہم۔

ائمہ مجتہدین:۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی، امام محمد، امام ابویوسف، امام ابن قاسم مالکی۔

فقہا:۔ حسن زیاد لولوی صاحب ابی حنیفہ، عبداللہ بن وہب مفتی مصر، ابوعمر اشہب فقیہ مصر، اسد بن فرات فقیہ عراق۔

قضاۃ:۔ ابراہیم بن اسحاق قاضی مصر، ایوب بن سوید قاضی سرد، اسد بن عمر قاضی، احرم بن حوشب قاضی ہمدان، داؤد بن منصور قاضی مصیصہ، شریک بن عبداللہ قاضی، شجرہ بن عیسیٰ قاضی قروان (افریقہ) عبداللہ بن عمر غانم قاضی افریقہ، یحییٰ افریقہ، یحیی بن بکیر قاضی کرمان، ابن اشرس العمری قاضی طرطوس، محمد بن عبداللہ کنانی قاضی افریقہ، اسد بن فرات قاضی

سسلی، زیاد بن بسیط قاضی طلیطلہ (اسپین) محمد بن سعید قاضی باجہ (اسپین)

زہاد وصوفیاے کرام:۔ ابراہیم بن ادہم، ابونصر بشر بن حارث زاہد، ثابت بن محمد زاہد، حسن بن حسین، عطیہ صوفی، ذوالنون مصری، کارح بن رحم زاہد، محمد بن فضیل بن عیاض زاہد۔

ادباو شعرا:۔ ابوالعتاہیہ شاعر، دعبل شاعر، محمد بن عبدالملک قعنبی شاعر، عبدالملک اصمعی لغوی، عمر بن سہیل مازنی بصری نحوی۔

مورخین:۔ احمد بن محمد بن ولید ازرقی صاحب تاریخ مکہ، موسیٰ بن عقبہ صاحب سیرت نبوی، محمد بن عمر واقدی صاحب تصانیف کثیرہ، علی بن محمد مدائنی صاحب انساب وتصانیف کثیرہ۔

مفسرین:۔ مقاتل بن سلیمان صاحب تفسیر

فلفی:۔ احمد بن محمد صاحب بیت الحکمت بغداد

اس عہد کے بعد آنے والے تمام جلیل القدر محدثین ایک واسطہ یا دو واسطہ سے امام مالک کی شاگردی کا شرف رکھتے ہیں، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابوداؤد یہ تمام مصنفین مسند وصحاح صرف ایک واسطہ سے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور اس پر ان کو ناز وفخر بھی ہے، یہ ناز وفخر آٹھویں صدی تک باقی ہے، جب کہ محدث کبیر شمس الدین ذہبی تفاخراً لکھتے ہیں: سات واسطوں سے امام کا شاگرد ہوں، امام نووی کو بھی ساتویں صدی میں امام صاحب سے قرب نسبت پر ناز ہے، مقدمہ شرح مسلم میں اپنے اسناد کے حال میں لکھتے ہیں:

> قد وقع لنا اعلى من هذه الكتب وان كانت عالية مؤطا الامام مالك بن انس هو شيخ الشيوخ المذكورين كلهم ۔
>
> ایک کتاب کی سند مجھ کو کتب بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی سب سے بہتر ملی، وہ امام مالک کی مؤطا ہے جو ان تمام محدثین کے شیخ تھے۔

* * *

خلفاوامراسے تعلقات اوران کوہدایات

حضرت امام مالک کی ولادت ۹۳ھ اور وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی۔ آپ نے خلفاے بنی امیہ میں ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، عمر بن عبدالعزیز، ولید بن ولید، ابراہیم بن ولید، مروان بن محمد بن مروان کا زمانہ پایا۔ اموی خلافت کا دورشباب تھا، لیکن ہشام کی موت ۱۲۵ھ کے بعد ۸/سال کے اندر ہی اموی خلافت پرزوال آیا اور ۱۳۳ھ میں خلافت عباسیہ کے نام سے تاریخ کا نیاباب شروع ہوا۔

خلافت عباسیہ کا بانی ابوالعباس سفاح ساڑھے چار برس تک سریرآرائے خلافت رہا، پھر اس کا بھائی ابوجعفر منصور ۱۳۶ھ میں خلیفہ ہوا، جس نے ابومسلم خراسانی کا خاتمہ کرکے عباسی حکومت کو استحکام بخشا۔ ۱۳۹ھ میں دارالخلافہ بغداد تعمیر ہوا جو آخر تک عباسیوں کی راجدھانی رہا، ۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا، تو اس کی جگہ محمد مہدی بن منصور خلیفہ ہوا، اس کے بعد ۱۶۹ھ میں موسیٰ ہادی بن مہدی سریرآرائے خلافت ہوا اس کی موت کے بعد ہارون رشید بن مہدی ربیع الاول ۱۷۰ھ میں مسند خلافت پر بیٹھا۔

امام مالک کے تعلقات ابوجعفر منصور عباسی سے لے کر خلیفہ ہارون رشید تک رہے، ان تعلقات کا مقصد جلب منفعت یا حکومت کی پناہ میں عزت وشہرت حاصل کرنا نہ تھا اور نہ ہی امام صاحب ان خلفا کی حکومت کو خلافت علیٰ منہاج الراشدہ سمجھتے تھے اور نہ ہی امام صاحب نے ان خلفا کے خلاف کسی خروج اور بغاوت میں سرگرم حصہ لیا اور تخت حکومت الٹنے کی ناکام تحریکوں میں شرکت فرمائی وہ فتنہ وانتشار کی فضا سے ہمیشہ کنارہ کش رہے، خلفا وامرا سے تعلقات صرف اس بنیاد پر تھے کہ وہ ان کی غلطیوں پر متنبہ کرسکیں اور انہیں صراط مستقیم پر چلنے کی تاکید کریں۔

محمد ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں:

> کان مالك لایری ان حکم الخلفاء الذین عاصروه هو حکم الاسلام لکنه لم یر جواز الانتقاض علیهم لیاسه من الاصلاح من طریق الانتقاض ولان الفتن التی بلغه خبرها والتی شاهدها لم تنقل الامر من فساد الی صلاح بل کانت تحوله من فساد الی افسد ومع هذاالزای لم یقطع صلته بالخلفاء والامراء بل کان یری من الواجب علیه ارشادهم

واصلاحهم لانه رجل ينظر الى وقائع الامور ولايقف عندالصور المثالية وحدها وقد وجد ان وعظ هؤلاء يذهب ببعض مايقعون فيه ويقلل من شرهم وربما حملهم على الصلاح المطلق وصار منهم مثل عمر بن عبدالعزيز ۔(مالك ص ٧٢)

امام مالک کا نقطہ نظر یہ نہ تھا، کہ موجودہ خلفا کا حکم ہی اسلام کا حکم ہے، اس کے باوجود وہ خلفا کے فرامین واحکام کے انتقاض کے حق میں نہ تھے، کیوں کہ طریقہ انتقاض اختیار کرنے میں انتشار ہوتا اور وہ خلفا وامرا کی اصلاح سے مایوس ہوجاتے، اس لیے کہ جن فتنوں کی خبر آپ کو پہنچتی اور جن کا آپ مشاہدہ کرتے وہ ایسے نہ تھے کہ ان کی کامل اصلاح کی جا سکے۔ بلکہ فتنوں کے مزید بڑھنے کا امکان تھا اس نقطہ نظر کے باوجود آپ نے خلفا وامرا سے اپنا تعلق نہ توڑا، کیوں کہ آپ ان خلفا وامرا کے غلط طریقوں کی اصلاح کرنا اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے اس لیے کہ آپ ایسے شخص تھے جو معاملات کے وقائع کی طرف نظر رکھتے تھے، صرف مثالی تصویروں کے پاس ٹھہرتے نہیں تھے، اور وہ یہ جانتے تھے کہ ان لوگوں کو نصیحت ان کے بعض فتنوں کو دور کردے گی اور ان کے شر کو کم کرے گی اور بسا اوقات آپ ان کو مطلق صلاح پر ابھارتے تھے اور ان ہی خلفا میں سے عمر بن عبدالعزیز جیسے خلیفہ ہوئے۔

خلیفہ ابوجعفر منصور امویوں کے زمانہ میں مدینہ منورہ میں علم حاصل کررہا تھا، وہی زمانہ امام مالک کی تحصیل علم کا بھی تھا، دونوں شیوخ کی بارگاہوں میں ایک ساتھ طلب علم کیا کرتے تھے اور وہ امام مالک کا شریک صحبت تھا، خلیفہ ہونے کے بعد ١٤٠ھ میں حج کے لیے آیا، تو سفیان ثوری، سلیمان خواص اور شہر کے دیگر شرفا وعلما استقبال کے لیے نکلے، امام مالک صرف اس غرض سے آئے کہ منصور جو امویوں کے دور خلافت میں عام طلبہ کی طرح شریک درس ہوا کرتا تھا، دیکھیں کہ خلیفہ ہونے کے بعد اس کا حال کیسا ہے؟ منصور کے دربار میں تمام علما وفقہا موجود تھے، منصور نے امام صاحب سے مخاطب ہوکر کہا، اے ابوعبداللہ! میں فقہی اختلافات سے گھبرا گیا ہوں، عراق میں تو کچھ نہیں ہے شام میں صرف جہاد کا شوق وہاں کوئی بڑا علم نہیں، جو کچھ ہے وہ حجاز میں اور علمائے حجاز کے سرخیل آپ ہیں، آپ ایک ایسی کتاب تصنیف فرمادیں، جو عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر کے اصول فقہ کے مابین اور معتدل ہو، (تاکہ وہ میری قلمرو میں بسنے والوں کا فقہی مسلک ہو)۔

خلیفہ وقت کا یہ اعزاز اور خواہش جو جاہ پسندوں کے لیے یقیناً باعث فخر بات تھی، مگر امام صاحب نے بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ منصور کی خواہش کو ٹھکراتے ہوئے فرمایا:

صحابہ تمام اطراف ملک میں پھیل گئے ہیں، ان کے فتاوے اور احکام اپنے اپنے مقام میں وراثتاً ان کے فقہا اور علما تک پہنچے ہیں اور ہر جگہ وہی مقبول ہیں ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے وعقل پر جو صحت وغلطی دونوں کرسکتا ہے تمام ملک کو مجبور کرنا درست نہیں۔ منصور نے کہا، اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں یہی کرتا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج١ ص١٨٩)

ایک بار اس نے پوچھا اے ابوعبداللہ! تم سے بھی زیادہ عمدہ کوئی عالم ہے؟ امام نے فرمایا ہاں! پوچھا وہ کون ہے؟ فرمایا ان کے نام یاد نہیں! منصور نے کہا میں بنوامیہ کے زمانہ میں طلب علم کر چکا ہوں سب کو جانتا ہوں۔ (مناقب للزواوی ص ۲۴)

ابوجعفر منصور آپ کے فضل وکمال کا اعتراف صرف روبرو ہی نہ کرتا تھا، بلکہ غائبانہ بھی آپ کی رفعت شان کا خطبہ پڑھا کرتا تھا، ایک بار حضرت سفیان ثوری اور سلیمان خواص منصور سے ملنے گئے، منصور نے خیمہ کے اندر بلایا، سفیان ثوری نے کہا، جب تک یہ مکلف فرش اٹھایا نہیں جائے گا خیمہ کے اندر داخل نہیں ہوسکتا۔ فرش اٹھا دیا گیا، تو آیت کریمہ ”**منها خلقنكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة اخرى**“ پڑھتے ہوئے سفیان ثوری زمین پر بیٹھ گئے، منصور آبدیدہ ہوگیا سفیان ثوری دیر تک اسے سخت الفاظ میں نصیحت کرتے رہے، پھر اٹھ کر چلے آئے، ایک درباری عہدہ دار ابوعبیدہ نے کہا، امیر المومنین ایسے زبان دراز شخص کے قتل کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ منصور نے کہا، خاموش! سفیان ثوری اور مالک بن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے۔

خلفا کے روبرو حق گوئی

رسول گرامی وقار صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر (اتحاف المهرة ج۶ ص ۳۴۳)

علمائے حق نے کفار ومشرکین کے خلاف میدان کارزار میں داد شجاعت دے کر جہاد کا فریضہ بھی انجام دیا اور اپنے عہد کے ظالم وجابر خلفا وامرا کے روبرو ان کی روش ظلم وستم اور خلاف شریعت اعمال پر بے لاگ تبصرے کیے اور جان کی پروا کیے بغیر کلمہ حق پیش کیا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے کر جہاد افضل کی فضیلت سے بھی بہرہ مند ہوئے، انہیں مردان حق میں حضرت امام مالک بن انس کی ذات گرامی بھی تھی، انہوں نے خلفا وامرا سے تعلقات ذاتی فائدے یا جلب منفعت کے لیے قائم نہیں کیے بلکہ مقصد یہ تھا، کہ اپنے اثر ورسوخ سے خلفا وامرا کو سیدھی راہ دکھائیں ان کے مظالم اور استبداد سے خلق خدا کو محفوظ ومامون رکھیں چنانچہ ایک بار لوگوں نے آپ سے دریافت کیا آپ جابر وظالم حکمراں اور خلفا کے پاس آتے جاتے ہیں؟ جواب میں ارشاد فرمایا: ”**يرحمك الله فاين التكلم بالحق**“ ان کے یہاں نہیں تو کہاں حق بات کہی جائے گی۔ (تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۳۰)

امام صاحب کہتے ہیں کہ میں خلیفہ ابوجعفر منصور کے پاس بارہا گیا ہوں مگر میں نے کبھی اس کے ہاتھ کو بوسہ نہیں دیا، حالاں کہ کوئی ہاشمی یا غیر ہاشمی ایسا نہیں تھا، جو اس کے ہاتھ کو بوسہ نہ دے۔ (ایضاً ص ۲۵)

آپ نے ارشاد فرمایا ۱۵۰ھ میں ابوجعفر منصور مدینہ آیا میں ملاقات کے لیے گیا تو کہا مالک آپ کے بال بہت سفید ہوگئے ہیں، میں نے کہا، جس کی عمر زیادہ ہوتی ہے اس کے بال زیادہ سفید ہوتے ہیں پھر اس نے کہا مالک! آپ صحابہ میں ابن عمر کی بات پر زیادہ اعتماد کیوں کرتے ہیں؟ میں نے جواب دیا، کہ وہ آخری صحابی تھے، جو ہمارے یہاں زندہ رہے، بوقت

ضرورت لوگ ان سے دینی سوالات کرتے تھے اور ان کے قول پر عمل کرتے تھے ابوجعفر منصور نے یہ سن کر کہا، کہ مالک! کوئی باشندہ نہیں ہے آپ کے پاس حق ہے۔

حسین بن عروہ کہتے ہیں کہ ہارون حج کے موقع پر مدینہ آیا اور امام صاحب کی خدمت میں پانچ سو دینار کی ایک تھیلی بھیجی، جب حج سے فارغ ہوکر دوبارہ مدینہ آیا تو امام صاحب کے پاس پیغام بھیجا کہ امیر المومنین کی خواہش ہے کہ امام مالک بغداد تک آپ کے ہم سفر رہیں، امام صاحب نے اس کے جواب میں قاصد سے کہا، کہ تم جا کر کہہ دو کہ وہ تھیلی مہر بند رکھی ہوئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ’’المدینة خیر لهم لو کانوا یعلمون‘ ‘مدینہ لوگوں کے لیے بہتر ہے اگر وہ اس کو جانیں یہ جواب سن کر ہارون رشید اپنے ارادہ سے باز آ گیا۔ (ایضاً ص ۲۹)

امام صاحب کی عزیمت اور کوڑوں کی سزا

عباسیوں کے خلاف علویوں کا خروج بڑی شد و مد کے ساتھ ہوا، جس کی قیادت حجاز میں محمد بن عبد اللہ (نفس ذکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبد اللہ عراق میں کر رہے تھے، اس تحریک بغاوت نے اتنی قوت حاصل کی، کہ عباسی ایوان اقتدار میں زلزلہ آ گیا اور منصور اپنی حکومت سے تقریباً مایوس ہوگیا، حضرت امام مالک نے ابوجعفر منصور کی ملاطفتوں کے باوجود فتویٰ دیا، کہ خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے، لوگوں نے پوچھا، کہ ہم منصور کی بیعت پر حلف اٹھا چکے ہیں، امام صاحب نے فرمایا، منصور نے جبراً بیعت لی ہے اور جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں، حدیث شریف میں ہے کہ اگر جبراً کسی سے طلاق دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔

نفس ذکیہ کی ناکامی کے بعد جب منصور نے مدینہ کا نظم و نسق اپنے چچیرے بھائی جعفر کے سپرد کیا تو اس نے مدینہ پہنچ کر از سر نو منصور کی بیعت لینی شروع کی اور امام صاحب کو کہلا بھیجا، کہ آئندہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ لوگوں کو بیعت جبری کی بے اعتباری و عدم صحت کے لیے سند ہاتھ آئے، امام صاحب نے شاہی حکم کے علی الرغم حق و صداقت کی ڈگر پر چلنا ترک نہ کیا اور طلاق جبری کی عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے، تو ان کے بارے میں حکم صادر ہوا کہ ستر کوڑے مارے جائیں، دار الامارت میں مجرموں کی طرح لائے گئے، جسم سے کپڑے اتارے گئے، جلاد نے بڑی بے رحمی کے ساتھ پے در پے ستر کوڑوں کی ضرب پوری کی۔ جسم مبارک لہولہان ہوگیا اور دونوں ہاتھ مونڈھوں سے اتر گئے، اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا، کہ اونٹ پر بیٹھا کر شہر میں تشہیر کی جائے، اسی حال زار میں امام عالی مقام مدینہ کے کوچہ و بازار میں پھرائے گئے اس وقت آپ باآواز بلند اعلان صداقت فرما رہے تھے، جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں۔ (طبقات ابن سعد)

اس کے بعد اسی طرح خون آلود کپڑے میں مسجد نبوی میں تشریف لائے، پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور لوگوں سے ارشاد فرمایا، کہ سعید بن مسیب کو جب کوڑے مارے گئے تھے، تو انہوں نے بھی مسجد میں آ کر نماز پڑھی

تھی۔ (تزئین الممالک ص ۳)

یہ تعزیر تشہیر امام مالک کی شان گھٹانے اور انہیں سر عام حقیر و رسوا کرنے کے لیے بروئے کار لائی گئی، لیکن اس سے امام مالک کی عظمت و وقار میں چار چاند لگ گئے۔ یہ واقعہ ۱۴۷ھ میں پیش آیا۔

ابوزہرہ مصری اس واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں، کہ امام صاحب نے محمد بن عبداللہ بن حسن نفس ذکیہ کی تحریک میں کوئی سرگرم حصہ نہیں لیا اور نہ لوگوں کو عباسی خلافت کی مخالفت پر برانگیختہ کیا، بلکہ امام مالک کے حاسدوں نے جعفر بن سلیمان کے کان بھرے اور اس نے آپ کو اس حدیث کی تحدیث سے باز رہنے کی تاکید کی مگر آپ اس کی بدستور روایت کرتے رہے، جس کے نتیجے میں آپ کو کوڑوں کی سزا دی گئی:

> وعندی ان سبب المحنة ليس وهو التحديث بالحديث وحده بل التحديث به في وقت الفتن واستخدام الثائرين لذلك الحديث لتعريض الناس على الخروج مستغلين مكانة مالك في العلم والافتاء ووجدالذين يسعون بالعلماء واهل الفضل في ذلك سبيلا للكيد بما لك فكادوا له فنهى مالك عن التحديث به فلم يفعل (مالك ص ۷۰)
>
> میرے نزدیک کوڑوں کی ضرب کا سبب طلاق جبری کی حدیث کا مطلقاً روایت کرنا نہیں بلکہ امویوں کے خلاف خروج کے ہنگامے میں لوگوں کو استعمال کرنے کے لیے مخالفین نے اس حدیث کا سہارا لیا تھا، اس بنا پر کہ لوگ شریعت میں امام مالک کے مقام بلند کے قائل تھے اور جو لوگ علما اور اہل فضل پر کیچڑ اچھالتے ہیں، انہوں نے اس سلسلے میں امام مالک کے متعلق فریب دینے کی راہ پالی اور اس کے درپے ہوئے امام مالک کو اس حدیث کے بیان کرنے سے روکا گیا تو آپ نہ رکے۔
>
> امام مالک بغاوت اور سیاسی تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہے، ابوزہرہ لکھتے ہیں:
>
> ان مالكا رضى الله عنه كان ممن لايخوضون في السياسة وكان لايحرض على الثورات ولايرضى عن الفتن ولايالوا نصحا للولاة والخلفاء وياخذ عطايا الخلفاء ۔ (مالك ص ٦٧)

خلیفہ منصور کی معذرت

جب خلیفہ منصور کو والی مدینہ جعفر بن سلیمان کی نازیبا حرکت کا علم ہوا، تو اس نے اسے معزول کر دیا اور حکم دیا، کہ گدھے پر سوار کر کے جعفر کو مدینہ سے بغداد لایا جائے اور امام کی بارگاہ میں اپنی لاعلمی اور معذرت کا خط لکھا۔

جب عراق و حجاز میں امن قائم ہو گیا، تو منصور بارادہ حج حجاز آیا تو امام مالک اس سے ملنے کے لیے گئے تو منصور نے بڑی تعظیم کی اور زور دے کر کہا، نہ میں نے تعزیر کی اجازت دی اور نہ مجھے اس کا علم ہوا، امام مالک نے فرمایا کہ ہاں آپ کو اطلاع نہ ہو گی اس کے بعد منصور نے کہا:

اے ابوعبداللہ! جب تک آپ زندہ ہیں آپ اہل حرمین کے ملجا و ماویٰ ہیں، جن مصائب کا ان کو نشانہ بننا چاہیے صرف آپ کی ذات سے وہ ان سے محفوظ ہیں، مجھ کو جہاں تک علم ہے ان دونوں مقامات کے باشندے نہایت فتنہ جو ہیں اور پھر ان میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ استقلال سے مقابلہ کرسکیں، میں نے دشمن خدا (جعفر) کی نسبت حکم دیا ہے کہ وہ مدینہ سے بغداد گدھے پر سوار کرکے لایا جائے اور اسے ذلت وایذا پہنچائی جائے، امام صاحب نے فرمایا، اس انتقام کی حاجت نہیں، امیرالمومنین! پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی خاطر اس کو معاف کرتا ہوں۔ (کتاب الامامۃ ج۲ ص۲۹۰ تا ۲۹۷)

منصور نے خلعت پیش کی، قاعدہ تھا، کہ خلعت کے کپڑے درباری کے کندھے پر رکھ دیے جاتے تھے حاجب نے یہی عام طریقہ امام صاحب کے ساتھ برتنا چاہا، امام صاحب پیچھے ہٹ گئے منصور نے حاجب کو ڈانٹا کہ اس خلعت کو ابوعبداللہ کی فرودگاہ میں پہنچادو۔

خلیفہ منصور کی بے وقت طلبی

ایک بار منصور کو معلوم ہوا کہ علما کو میری حکومت سے ناراضی ہے، اس نے بے وقت شب میں ابن ابی ذئب وابن سمعان فقہائے حجاز اور امام مالک کو طلب کیا، امام صاحب واقعہ سمجھ گئے، زندگی سے ناامید ہوکر غسل فرمایا، کفن کے کپڑے پہن کر حنوط (مردوں کو لگایا جاتا ہے) مل کر دربار میں آئے۔ منصور نے کہا اے گروہ فقہا مجھ کو ایک خبر معلوم ہوئی ہے جس پر افسوس ہے حالاں کہ تمہارا فرض تھا، کہ سب سے پہلے تم میری اطاعت کرتے اور مجھ کو برا کہنے سے باز رہتے اگر مجھ میں کچھ عیب ہوتا تو تم مجھ کو نصیحت کرتے۔ امام صاحب نے فرمایا اے امیرالمومنین! خدائے پاک نے ارشاد فرمایا ہے "یا ایھا الذین آمنوا ان جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین" منصور نے کہا اچھا بتاؤ، کہ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟ امام نے فرمایا، للہ مجھے اس کے جواب دینے سے معاف کرو، منصور نے ابن سمعان کی طرف رخ کیا کہ تم بتاؤ میں کیسا ہوں؟ ابن سمعان بولے، امیرالمومنین! آپ سب سے بہتر ہیں، حج کرتے ہیں، جہاد کرتے ہیں، مظلوموں کی امداد کرتے ہیں، اسلام کی پشت پناہ ہیں، عادل ہیں، اب منصور نے ابن ابی ذئب سے پوچھا، کہ ابن ابی ذئب تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو؟ ابن ابی ذئب نے نہایت دلیری سے کہا کہ تم بدترین مخلوق ہو، مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان وشوکت میں صرف کرتے ہو غریبوں کو ہلاک کرڈالا، امیروں کو پریشان کرڈالا بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دوگے؟ منصور نے کہا تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے کیا چیز ہے؟ ابن ابی ذئب نے کہا ہاں ننگی تلواریں دیکھ رہا ہوں، لیکن آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ابن سمعان اور ابن ابی ذئب اٹھ کر چلے گئے، منصور نے کہا مجھے آپ کے کپڑوں سے حنوط کی بو آتی ہے، امام صاحب نے فرمایا اس بے وقت طلب کی بنا پر میں اپنی زندگی سے مایوس ہوکر آیا تھا، منصور نے کہا، سبحان اللہ! ابوعبداللہ کیا میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گرادوں گا۔ (کتاب الامامۃ والسیاسۃ ج۲ ص۲۷۶)

محمد المہدی

اس سفر حج میں حج سے پہلے ۶ رذوالحجہ ۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور محمد المہدی اس کا جانشیں ہوا، دو سال کے بعد ۱۶۰ھ میں مہدی مع شہزادگان موسیٰ وہارون حج کے ارادے سے عازم حجاز ہوا، حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا، شہر کے قریب پہنچا تو شرفا و علماے شہر نے استقبال کیا، جن میں امام مالک بھی داخل تھے، مہدی نے امام کو دیکھا، تو ان کی طرف توجہ کی اور سلام کر کے سینہ سے لگالیا۔ اس سال حجاز میں سخت قحط تھا، موقع پا کر امام نے فرمایا، امیر المومنین! اس وقت آپ جس شہر میں جارہے ہیں، وہاں مہاجرین وانصار کی اولاد آباد ہے وہ روضہ نبوی کے ہمسایہ ہیں، مہدی امام کا مقصود سمجھ گیا ۲۵ رلاکھ درہم امام کے پاس بھیج دیے کہ تقسیم کر دیجیے۔ امام صاحب نے رقم اپنے معتمد تلامذہ کے حوالہ کی تا کہ حسب حاجت لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

(کتاب الامامۃ ج ۲ ص ۲۹۰ مناقب مالک للزواوی ص ۲۷)

جب مہدی نے دربار میں حاضری کے لیے سواری بھیجی، امام صاحب نے سواری واپس کر دی اور فرمایا، کہ میں مدینہ منورہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا، کیوں کہ ان گلی کوچوں میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پیادہ چلتے تھے، ان گلیوں کو سواریوں کے قدموں سے روندنا خلاف ادب ہے۔ امام صاحب پیدل ہی دربار میں تشریف لے گئے، چوں کہ بیمار تھے، اس لیے مشاہیر علماے مدینہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے۔ مہدی نے کہا، سبحان اللہ! اگر میں اس کام کو کہتا تو شاید ان میں کوئی قبول نہ کرتا۔ مغیرہ نے کہا، امیر المومنین! مالک جس سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہیں، وہ اس کے لیے شرف کی بات ہے۔ (زواوی عن ابی مصعب ص ۲۸)

خلیفہ مہدی نے امام دار الہجرت سے مؤطا کی سماعت کی اور اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ اور ہارون سے کہا، کہ وہ مؤطا کا درس لیں، شہزادوں نے امام کو بلا بھیجا، امام صاحب نے فرمایا، علم بیش قیمت شی ہے شائقین خود چل کر اس کے پاس آتے ہیں۔ مہدی نے حکم دیا، کہ تم دونوں امام صاحب کی مجلس درس میں خود حاضری دو۔ جب حلقہ درس میں پہنچے تو شہزادوں کے اتالیق نے امام صاحب سے عرض کیا، آپ مؤطا پڑھ کر سنائیں؟ امام صاحب نے ارشاد فرمایا، کہ ہمارے علما کا دستور یہ ہے طلبہ پڑھیں شیوخ سنیں۔ مہدی کو خبر دی گئی اس نے کہا کہ ان علما کی اقتدا کرو اور تم خود پڑھو، چنانچہ انہوں نے خود پڑھا اور امام نے سماعت کی۔ (تزئین الممالک ص ۴۵)

خلیفہ ہارون رشید اور امام دار الہجرت

خلیفہ مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات پائی اور اس کی جگہ موسیٰ ملقب بہ ہادی مسند خلافت پر بیٹھا، لیکن ایک سال بعد ہی ۱۴ رربیع الاول ۱۷۰ھ میں فوت ہوا، جس کی جگہ ہارون رشید بن مہدی سریر آرائے خلافت ہوا۔ خلافت کے پہلے ہی سال بغرض حج وزیارت حجاز آیا، جب مدینہ منورہ پہنچا، لوگ پیدل استقبال کے لیے باہر نکلے، امام صاحب بھی محمل میں سوار ہو کر آئے۔ جب ہارون کی نظر پڑی بہت خوش ہوا اور کہا، آپ کی تصنیفات پہنچیں، خاندان کے نوجوانوں کو ان کے مطالعہ کی تاکید کی ہے، لیکن ہم نے ان کتابوں میں عبداللہ بن عباس اور علی بن ابی طالب کی روایتیں نہیں پائیں، کیا وجہ ہے؟ امام دار الہجرت

نے فرمایا اے امیر المومنین! یہ دونوں بزرگوار ہمارے شہر میں نہ تھے۔ (تزئین الممالک ص۴۶)

۱۷۴ھ میں ہارون رشید حج کے لیے آیا تو اس کے دونوں بیٹے امین و مامون ساتھ تھے، ہارون رشید نے امام مالک کو مؤطا املا کرانے کی غرض سے سراپردہ خلافت میں طلب کیا، امام صاحب نے انکار کیا، اور ہارون کے پاس مؤطا لیے بغیر تشریف لائے رشید نے شکایت کی امام صاحب نے فرمایا، اے ہارون رشید! علم تیرے گھر سے نکلا خواہ اس کو ذلیل کر خواہ عزت دے۔ ہارون شرمندہ ہوا اور امین و مامون دونوں کو ساتھ لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا۔ مجلس درس میں عام طلبہ کا ہجوم تھا، ہارون رشید نے کہا، اس بھیڑ کو الگ کر دو، امام صاحب نے فرمایا، شخصی منفعت کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جاسکتا۔ ہارون مسند پر بیٹھ گیا امام نے فرمایا، اے امیر المومنین! تواضع پسندیدہ ہے ہارون نیچے اتر گیا۔

ہارون نے امام صاحب سے کہا، مؤطا کی قرأت کیجیے امام نے فرمایا یہ بات خلاف عادت ہے یہ کہہ کر اپنے ایک ہونہار شاگرد معن بن یحییٰ کو اشارہ کیا، انہوں نے قرأت شروع کی، ہارون اور شہزادوں نے مؤطا کا سماع کیا۔

اس سفر حج میں ہارون کے ساتھ عراق و حجاز کے علما و فقہا تھے، ہارون رشید نے ان علما کی ایک مجلس منعقد کی، امام صاحب مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے، مؤطا کا املا شروع ہوا۔ ہر مسئلہ کے اختتام پر فقہا و محدثین خاموشی کے ساتھ صحت کی تصدیق کرتے جاتے تھے۔

حدیث و فقہ کی یہ مجلس ختم ہوئی اور امام صاحب واپس تشریف لے گئے تو ہارون رشید نے حاضرین مجلس سے خطاب کیا:

اے فقہائے عراق و حجاز! اس وقت مالک بن انس نے جو مسائل بیان کیے ہیں کیا تم لوگوں کو اس میں کچھ اختلاف ہے؟ فقہائے کرام نے ارشاد فرمایا نہیں، ہمیں صرف ایک مسئلہ میں کلام ہے۔ ہارون نے کہا کہ عجب نہیں کہ امام مالک کے اس مسئلہ کا ماخذ قرآن ہو، بہر صورت ہارون رشید نے امام صاحب کو تشریف لانے کی دعوت دی، امام صاحب تشریف لائے۔ ہارون رشید نے کہا اے ابوعبداللہ! مؤطا کے ایک مسئلہ سے ان کو اختلاف ہے، آپ اپنے اس مسئلہ کی دلیل و صحت ان کو بتائیں۔ خلیفہ ہارون رشید کو امام صاحب سے کتنی عقیدت و محبت تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے، کہ تمام فقہا کے مقابلے میں کہتا ہے اور میں بھی اس مسئلے میں آپ کے ساتھ ہوں۔

امام صاحب نے قرآن و حدیث کے ذریعہ دلائل و براہین قائم کیے، جس پر جملہ فقہائے عظام نے سر تسلیم خم کر دیا۔

اس کے بعد امام صاحب نے ہارون سے خطاب کیا، اے امیر المومنین! جس طرح آپ نے یہاں اس وقت مجھے یاد کیا، آپ کے والد نے بھی اسی طرح مجھے یاد کیا تھا اور میں نے ان کو حدیثیں سنائی تھیں۔ بعد ازاں امام صاحب نے مدینہ منورہ کے فقرا و مساکین اور ستم رسیدہ لوگوں کی طرف توجہ دلائی۔ ہارون رشید نے زر کثیر سے فقرائے مدینہ کی امداد کی۔

منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم

مسجد نبوی میں ایک منبر تھا، جس پر بیٹھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے، اس منبر پر صرف تین زینے

تھے، لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے چند زینوں کا اور اضافہ کر دیا تھا۔ ہارون رشید نے چاہا کہ زائد زینے نکال کر پھر منبر نبوی اپنی اصلی حالت پر کر دیا جائے۔ امام صاحب سے مشورہ کیا۔ امام صاحب نے فرمایا، کہ ایسا نہ کیجیے، کہ اس منبر کی لکڑی کہنہ اور کمزور ہو گئی ہے، اگر تختوں کو ادھر ادھر کیا جائے گا تو ٹوٹ جائیں گے۔ اور اس کی اصل وجہ یہ تھی، کہ وفات نبوی کے وقت مدینہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگاروں پر تھا۔ بستر شریف، پیالا، عصا، موے مبارک، نعلین پاک بہت سی چیزیں مدینہ میں تھیں، لیکن آج مدینہ نے ایک ایک کر کے سب کو کھو دیا ہے، تاراج شدہ سرمایہ سے صرف ایک یہی منبر رہ گیا ہے، جو بھاری ہونے کے سبب مسجد نبوی سے کبھی نکلتا نہیں، اگر اس میں کہیں تین زینے کر دیے جائیں، تو مجھ کو خوف ہے کہ مسجد نبوی کے بدلے بارگاہ خلافت کہیں اس سے مزین نہ ہو جائے۔ ہارون رشید بھی اس نکتہ کو سمجھ گیا اور اپنے خیال سے باز آیا۔

(کتاب الامامۃ والسیاسۃ ج ۲ ص ۲۹۷)

موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کرنے کی تجویز

ابونعیم نے حلیہ میں خود امام مالک سے روایت کی ہے، کہ ہارون رشید نے چاہا، کہ موطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کیا جائے اور تمام مسلمانوں کو فقہی احکام میں اس کے اختیار و اتباع پر مجبور کیا جائے۔ یہ وہ وقت تھا، کہ عزت طلب اشخاص کے لیے اس سے زیادہ طلائی موقع ہاتھ نہیں آ سکتا، لیکن امام مالک نے جواب دیا، ایسا نہ کرو خود صحابہ فروع میں مختلف ہیں اور وہ ممالک میں پھیل چکے ہیں اور ان میں ہر شخص مصیب ہے۔ (تزئین الممالک عن ابی نعیم ص ۴۶)

حضرت امام مالک بن انس نے خلیفہ ہارون رشید کے دور خلافت میں وفات پائی، امین و مامون عہد شہزادگی ہی میں امام صاحب سے مستفید ہو چکے تھے، ہارون رشید کے نام امام صاحب کا ایک رسالہ بھی ہے، جس میں امام صاحب نے ہارون کو نصائح کیے ہیں اور آداب و سنن کی تعلیم دی ہے۔

خلفا کو نصائح

امام مالک کا نقطہ نظر یہ تھا، کہ امرا و وزرا کو براہ راست نصیحت کی جائے اور انہیں اسلامی شریعت اور منہج خلافت کا پابند بنایا جائے، تاکہ عوام کے ساتھ انصاف کر سکیں اور رعایا کی ضروریات کی تکمیل کر سکیں۔ اعلان حق امرا و سلاطین کے روبرو موثر اور مفید ہوتا ہے، ان کی اصلاح سے انتظام سلطنت کی اصلاح اور عدل اجتماعی کے راستے ہموار ہوتے ہیں۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مہتم بالشان فریضہ امرا و خلفا کے سامنے ہی ادا ہوتا ہے اور یہ علماے ربانیین کی ذمہ داری ہے، امام مالک فرماتے ہیں:

> حق علی کل مسلم اورجل جعل اللہ فی صدرہ شیئا من العلم و الفقہ ان یدخل الی ذی سلطان یامرہ بالخیر وینہاہ عن الشر حتی یتبین دخول العالم عن غیرہ فاذا کان فہو الفضل الذی مابعدہ فضل ۔(مالک ص ۷۳)

ہر مسلمان پر فرض ہے، جس کے سینے میں اللہ تعالیٰ نے علم اور فقہ کا کچھ حصہ ودیعت کیا ہے، کہ وہ جب کسی حکمراں کے پاس جائے تو اسے خیر کا حکم دے اور برائی سے منع کرے، یہاں تک کہ حاکم کے پاس عالم کا آنا اس کے غیر کے آنے سے ممتاز ہو جائے گا تو یہی فضیلت ہے، جس کے بعد کوئی فضل نہیں۔

امام مالک کے بعض شاگردوں نے کہا، کہ خلفا کے پاس آپ کی حاضری پر لوگ تنقید کرتے ہیں، تو جواب میں ارشاد فرمایا:

ان ذلك بالحمل من نفسي وذلك انه ربما استشير من لاينبغي٥ (ایضاً ۷۳)

اس میں شک نہیں ہے، کہ میں آنے جانے کی مشقت برداشت کرتا ہوں، مگر یہ صرف اس لیے ہے، تاکہ غیر مناسب لوگوں سے مشورہ نہ لیا جائے۔

جب خلفا موسم حج میں حرمین شریفین آتے، تو امام مالک ان کو پند وموعظت کرتے اور خود خلفا بھی آپ سے نصیحتوں کے طالب ہوا کرتے، خلیفہ ابوجعفر منصور نے ان سے عرض کیا، کہ آپ ولایت حجاز کے بارے میں اپنی رائے ظاہر فرمائیں اور اس سلسلے میں دریافت کیا:

ان رايك ريب من عامل المدينة او عامل مكة او احد من عمال الحجاز في ذاتك او ذات غيرك او سوء او شر بالرعية فاكتب الي بذالك انظر بهم مايستحقون .(مالك ص ۷۳)

اگر آپ کو عامل مدینہ، عامل مکہ یا حجاز کے کسی عامل کے بارے میں اپنی ذات یا کسی اور کی ذات کے حوالے سے شک ہو یا رعایا کے متعلق ان کی بدسلوکی یا شر پا رہے ہوں تو اس کے بارے میں مجھے لکھیں، تو میں ان کے متعلق غور کروں گا، جس چیز کے وہ مستحق ہیں۔

امام مالک خلیفہ مہدی کے پاس گئے، تو اس نے کہا مجھے کوئی نصیحت کیجیے! آپ نے فرمایا:

اوصيك بتقوىٰ الله وحده والعطف على اهل رسول الله صلى الله عليه وسلم وجيرانه فانه بلغنا ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال المدينة جزى بها قبري وبها مبعثي واهلها جيراني وحقيق على امتي حفظي في جيراني فمن حفظهم كنت له شهيدا وشفيعا يوم القيامة .(مالك ص ۷۳)

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں، کہ صرف اللہ سے ڈرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں اور پڑوسیوں پر رحم کرو، اس لیے کہ ہمیں خبر پہنچی ہے، کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، کہ مدینہ میری ہجرت گاہ ہے اور اس میں میری قبر ہے اور وہیں سے میں اٹھایا جاؤں گا، اس کے باشندے میرے پڑوسی ہیں اور میری امت پر پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا فرض ہے۔ جو پڑوسیوں کی حفاظت کرے گا، جو میں قیامت کے

دن اس کے لیے گواہ یا شافع ہوں۔

اس نصیحت کا مہدی پر بڑا اثر ہوا اور اس نے اہل مدینہ کو بہت سارے عطیے دیے۔ جب مدینہ سے جانے کا ارادہ کیا تو امام مالک اس سے ملنے گئے تو مہدی نے آپ سے کہا:

انی محتفظ بوصیتك التی حدثتنی بها ولئن سلمت ماغبت عنهم ۔ (مالك)

میں آپ کی اس وصیت پر عمل پیرا رہوں گا، جو آپ نے مجھ سے بیان کی، جب تک میں زندہ رہا اہل مدینہ کے حقوق کا خیال رکھوں گا۔

امام مالک خلفا کے درباروں میں اپنے علمی وقار و وجاہت کے ساتھ تشریف لے جایا کرتے اور اپنی عزت نفس کا پورا لحاظ کرتے یہی وجہ ہے کہ آپ کی نصیحتیں موثر ہوتیں، کیوں کہ قول کا مقام قائل کے مقام کے مطابق ہوتا ہے۔

خلیفہ مہدی ایک مرتبہ مدینہ آیا تو لوگ اس کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوئے، جب مجلس بھر گئی، امام مالک آئے اور انہوں نے اجازت طلب کی، لوگوں نے کہا، آج مالک تمام لوگوں سے پیچھے بیٹھیں گے، جب امام صاحب اندر داخل ہوئے اور لوگوں کی بھیڑ دیکھی تو فرمایا اے امیر المومنین! آپ کا شیخ مالک کہاں بیٹھے؟ مہدی نے جواب دیا، اے ابوعبداللہ! آپ میرے پاس بیٹھیں گے، لوگوں نے راستہ دیا اور امام صاحب مہدی کے پاس پہنچے تو مہدی نے آپ کو داہنی طرف بغل میں بٹھایا۔

(ایضاً ص ۷۴)

امام مالک خلفا کے روبرو نصیحتیں فرمایا کرتے تھے اور انہیں اپنے خطوط میں بھی پند و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ ان کا ایک مکتوب جس میں انہوں نے خلیفہ کو بھرپور نصیحت کی یہ ہے:

اعلم ان الله تعالىٰ قد خصك من موعظتي اياك به قديما واتيت لك فيه مارجوان يكون الله تعالىٰ جعله لك سعادة وامرا جعل سبيلك به الى الجنة فلتكن رحمنا الله واياك فيما كتبته اليك مع القيام بامر الله وما استرعاك الله من رعيته فانك المسئول عنهم صغيرهم وكبيرهم وقد قال النبى صلى الله عليه وسلم كلكم راع وكلم مسئول عن رعيته وروى فى بعض الحديث انه يوتى بالوالى ويده مغلولة الى عنقه فلايفك عنه الاالعدل وكان عمر بن الخطاب رضى عنه يقول والله ان هلكت سخلة بشط الفرات ضياعا لكنت ارى الله تعالىٰ سائلا عنها عمر وحج عمر عشرسنين وبلغنى انه ماكان ينفق فى حجه الا اثنى عشر دينارا وكان ينزل فى ظل الشجرة ويحمل على عنقه الدرة ويدور فى الاسواق يسال من احوال من حضره وغاب عنه ولقد بلغنى انه وقت اصيب حضر اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم فاثنوا عليه فقال المغرور من غررتموه لوان ما على الارض ذهب

لافتديت به من اهوال المطلع فعمر رحمه الله تعالىٰ ما كان مسددا موفقا مع انه قد شهد له النبى صلى الله عليه وسلم بالجنة ثم هو مع هذا خالفٌ لما تقلد من امور المسليمن فكيف بمن قد علمت فعليك بما يقربك الى الله، وينجيك منه غدا، واحذر يوما لاينجيك فيه ا لاعملك اسوة بمن قد مضى من سلفك وعلى ب تقوىٰ الله فقدمه حيث هممت وتطلع فيما كتبت به اليك فى اوقاتك كلها وخذ نفسك بتعاهدها والاخذ به والتأدب عليه واسأل الله التوفيق والرشد ان شاء الله تعالىٰ (مالك ص ۷۴، ۷۵)

آگاہ ہوجاؤ، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پہلے بھی میری نصیحتوں سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا اور اس سلسلے میں میری جو امید تھی، پوری ہوئی، کہ اللہ تعالیٰ ان نصیحتوں کے ذریعے تمہیں سعادت اور دخول جنت کا مستحق بنائے تو چاہیے، کہ اب کی جانے والی نصیحت پر بھی تم عمل کرو، ساتھ ہی اللہ کے حکم کی پابندی کرو اور جو حقوق اللہ نے رعایا کے متعلق تم پر رکھے انہیں ادا کرو اس لیے کہ تم سے رعایا کے ہر فرد کے بارے میں سوال کیا جائے گا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تم میں کا ہر ایک اپنے ماتحتوں کا نگہبان ہے اور ان کے بارے میں جواب دہ ہوگا، بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ قیامت کے دن حاکم کو لایا جائے گا اس حال میں کہ اس کا ہاتھ گردن سے بندھا ہوگا اور عدل کے علاوہ کوئی چیز اس کے ہاتھ کو گردن سے جدا نہیں کرسکتی، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے، کہ اگر کوئی بکری کا بچہ دریائے فرات کے ساحل پر ہلاک ہوجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں عمر سے سوال کرے گا۔ حضرت عمر نے دس سال حج کیا، مگر روایت کے مطابق وہ اپنے حج میں صرف بارہ دینار خرچ کرتے تھے، درخت کے سائے میں فروکش ہوتے اور اپنی گردن پر کوڑا اٹھائے ہوتے اور بازاروں میں گشت کرتے ہوئے حاضر و غائب کے بارے میں دریافت کرتے اور روایت میں یہ بھی آیا ہے، کہ جس وقت آپ زخمی ہوئے صحابہ کرام آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے آپ کی تعریف کی، تو آپ نے ارشاد فرمایا، جس کی تم نے تعریف کی وہ فریب خوردہ اور ہلاکت میں پڑنے والا ہے، پوری روئے زمین سونا ہوجائے اور میں اسے فدیہ میں دے کر مامون ہوجاؤں تو میں ضرور ایسا کرتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سچے اور خدا کی توفیق سے بہرہ مند تھے، ساتھ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے جنت کی شہادت دی تھی، پھر بھی وہ مسلمانوں کے امور خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں خوفزدہ رہتے تھے، تو کیا حال ہوگا، جو خود سے امر خلافت حاصل کرے تو تم پر لازم ہے کہ وہ طریقے اختیار کرو، جو تمہیں اللہ سے قریب کردے اور کل اس کے عذاب سے نجات دے اور ڈرو اس دن سے جس دن تمہارے اعمال خیر کے سوا کوئی چیز نجات نہیں دے گی اور اس لیے کہ یہ تمہارے گزرے ہوئے اسلاف کا نمونہ ہو اور تم اللہ سے ڈرو تو تم میرے ارادے

کے مطابق ان باتوں کو مقدم رکھو اور جو باتیں میں نے تمہیں لکھی ہیں ہر وقت ان کو پیش نظر رکھو اور پابندی سے ان کو بجالاؤ ان پر عمل کرو اور ان پر سختی سے قائم رہو اور میں اللہ سے توفیق اور ہدایت کا طالب ہوں۔

دنیا کا عام دستور ہے، کہ لوگ بادشاہوں اور امیروں کے سامنے ان کی جھوٹی یا کم از کم مبالغہ آمیز مدح وستائش کرتے ہیں، ان تعریفوں سے ممدوح اپنے معائب، کوتاہیوں اور ناانصافیوں کو بھول جاتا ہے اور خود کو محاسن ومکارم اخلاق کا جامع تصور کرنے لگتا ہے، تعریف وتوصیف کی شیرنی اسے مغرور، متکبر، فرض ناشناس اور ظالم وجابر بنادیتی ہے، حقائق کی تلخیوں سے وہ چراغ پا ہو جاتا ہے، گریبان میں جھانک کر اپنی ذات وصفات کا جائزہ لینے کے بجائے تشدد کے ذریعہ حق وصداقت کی آوازوں کو خاموش کر دیتا ہے۔

امام مالک رضی اللہ عنہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ جابر سلاطین کے روبرو انجام دیتے اور انہیں جھوٹے مداحین سے بچنے اور ان کی خود غرضانہ توصیف وثنا سننے سے باز رکھتے۔

ایک بار امام مالک رضی اللہ عنہ کسی امیر کے پاس تھے، کسی نے اس کی تعریف کی، امام مالک اس شخص پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا:

> ایاك ان یغرك هؤلاء بثنائهم علیك فان من اثنی علیك وقال فیك من الخیر مالیس فیك اوشك ان یقول فیك من الشر ما لیس فیك فاتق الله فی التزكیة منك لنفسك اوترضی بها من احد بقولة یقولها لك فی وجهك فانك انت اعرف بنفسك منهم فانه بلغنی ان رجلا مدح عند النبی صلی الله علیه وسلم فقال قطعتم ظهره اوعنقه لوسمعها ما افلح وقال صلی الله علیه وسلم احثواالتراب فی وجوه المداحین ۔ (مالك ص۷۵)

تم بچو اس سے کہ یہ لوگ تمہاری تعریف کر کے تمہیں دھوکے میں ڈالیں اس لیے کہ جس نے تمہاری تعریف کی اور تمہارے متعلق وہ بھلائی کی بات کہی، جو تم میں نہیں تو قریب ہے کہ وہ تمہارے متعلق ایسی بری بات کہے جو تم میں نہ ہو تو اپنی ذات کو بہتر سمجھنے اور متکبر ہونے میں اللہ سے ڈرو اور اس سے بچو کہ تم راضی ہو جاؤ اس شخص کی بات پر جو تمہارے روبرو اچھی اچھی بات کہے اس لیے کہ تم لوگوں سے کہیں زیادہ اپنی حقیقت سے واقف ہو، اس لیے کہ مجھے خبر پہنچی ہے، کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی شخص کی تعریف کی گئی، تو آپ نے ارشاد فرمایا، کہ اگر وہ شخص اس تعریف کو سن لے تو نجات نہیں پائے گا اور آپ نے فرمایا، تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دو۔

* * *

علم حدیث

امام دارالہجرت نے مدینۃ الرسول کی علمی وروحانی فضاؤں میں زندگی کے لیل ونہار بسر کیے، انہوں نے طلب علم کا آغاز کیا تو مدینہ منورہ قال اللہ وقال الرسول کے نغموں سے گونج رہا تھا، اکابر تابعین عظام کے درس مسجد نبوی اور اس کے علاوہ جابجا قائم تھے، اور ہر طرف علم نبوت کے چشمے موجیں مار رہے تھے۔ امام مالک نے ان علمی حلقوں سے بھرپور فیض اٹھایا اور اپنے دامن کو علم نبوت کے تابناک جواہرات سے بھر لیا۔ محدثین عظام کی صف اول میں امام مالک کو نمایاں مقام حاصل ہوا، اس کا اعتراف دنیائے اسلام کی عظیم علمی وعبقری شخصیتوں نے دل کھول کر کیا۔ ماہرین فن کا اعتراف اگر فضیلت کا معیار ہے تو کہا جاسکتا ہے، کہ امام مالک کا پایہ اس معیار فضیلت کی بناپر بہت بلند اور ارفع ہے۔ امام مالک اگرچہ ارباب رائے محدثین میں ہیں جب کہ ائمہ فن اہل الرائے محدثین کی عظمت کا اعتراف کم کرتے ہیں، مگر امام مالک باوجود انتساب رائے محدثین میں وہی درجہ رکھتے ہیں جو صاحب فن امام حدیث اپنے اتباع میں۔

انہیں علم حدیث میں جو مرتبہ بلند حاصل ہوا اس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ ہر محدث سے حدیثیں قبول نہیں کرتے، بلکہ ان ثقہ، متدین، حافظ وضابط، بالغ نظر، تفقہ فی الدین رکھنے والے شیوخ ہی سے سماع وکسب حدیث کیا کرتے تھے، جن کی علمی جلالت اور ثقاہت پر انہیں پورا اعتماد ہوتا۔

امام مالک کا انتخاب شیوخ

امام مالک کا زمانہ حضرات تابعین کا سنہری دور تھا، ہر طرف تحدیث وروایت کا غلغلہ عام تھا۔ امام مالک نے ہر حلقہ درس یا ہر راوی حدیث شیخ سے سماع حدیث کو جائز نہ سمجھا۔ سماع حدیث کے لیے وہ بڑے حزم واحتیاط سے کام لیتے، جب تک کسی شیخ کے بارے میں یقین نہ ہوجاتا، کہ وہ ثقہ، تام الضبط، صادق القول اور عقل کامل رکھتا ہے، صحیح وسقیم میں اسے تمیز کا ملکہ حاصل ہے، اس وقت تک اس سے حدیث نہ لیتے، اگرچہ دور تابعین، دورِ صحابہ کی طرح خیر القرون میں شامل ہے، مگر عہد رسالت کے بعد کی وجہ سے اس دور میں بعض مفاسد اور اخلاقی کمزوریوں نے معاشرے میں راہ پالی تھی اور بہت سے لوگ ان کے مرتکب ہورہے تھے، کچھ لوگ زہد وورع میں ممتاز تو تھے، لیکن نقد حدیث کا ملکہ نہ ہونے کی وجہ سے ہر کس وناکس سے سنی ہوئی حدیث کو صحیح سمجھ کر بلا تامل روایت کررہے تھے، سیکڑوں غیر فقیہ راوی ایسے تھے، جو اپنی روایات کا پورا محمل ومفہوم نہیں سمجھتے تھے، کچھ ایسے

تھے، جو عدم ممارست فن کے سبب جید وردی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے، لیکن چوں کہ اس زمانہ میں روایت حدیث عزوشرف کا سبب تھا، اس لیے اہل فضل و مستحقین علم کے پہلو بہ پہلو غیر مستحقین بھی اپنی مسند درس آراستہ کیے ہوئے تھے اور لوگ ان کی درسگاہوں میں بھی شریک ہوتے اور حدیثیں سن کر محفوظ کرتے، مگر امام مالک نے جب طلب حدیث کے کوچے میں قدم رکھا تو صغرسنی کے باوجود ان کا پاکیزہ علمی ذوق اور نقد حدیث کی قوت انہیں ایسے شیوخ ہی کی بارگاہوں تک لے گئی، جو ہر قسم کے معائب سے پاک، صدق وطہارت میں معروف اور حفظ وفقہ میں ممتاز تھے اور ان کا شعور نقد ونظر احادیث کی صحت وسقم میں ممتاز تھا، امام صاحب نے کبھی بھی ان شیوخ کے حلقوں کا رخ نہیں کیا، جنہیں وہ تحدیث وروایت کا اہل نہیں سمجھتے تھے وہ تحدیث نعمت کے طور پر خود فرمایا کرتے تھے، میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں، کہ یہ مخصوص نعمت تھی، جو صرف امام مالک کے حصے میں آئی، امام مالک کا بیان ہے، کہ میں نے مسجد نبوی کے ان ستونوں کے پاس ستر ایسے شیوخ کو پایا، جو قال رسول اللہ قال رسول اللہ کہا کرتے تھے، لیکن ان میں سے کسی کے پاس نہیں بیٹھا، کبھی فرماتے، مدینہ میں بیسوں اشخاص تھے، جن سے لوگ حدیث سنتے تھے، لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا۔

امام صاحب کسی عراقی شیخ سے حدیث نہیں لیتے، جب کسی غیر مدنی شیخ سے اخذ حدیث کرنا چاہتے تو ہمیشہ اس کا تجربہ اور نقد کر لیتے تھے، امام صاحب کا کوئی شیخ اگر عراقی کہا جا سکتا ہے، تو وہ مشہور تابعی ابوایوب سختیانی ہیں، جن کی نسبت ابن سعد کا بیان ہے:

كان حجة ثقة ثبتا فی الحديث جامعا كثير العلم .

جن کو امام شعبہ نے سید الفقہا کا خطاب دیا ہے، جن کا نام رجال میں احد الائمۃ الاعلام کے وصف کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ابن عیینہ کہتے تھے "لم الق مثله" مجھے ان کے مثل نہیں ملا۔ ابن ناصر الدین کے بقول ایوب علما کے سردار تھے حفاظ حدیث کے امام ثقہ اور بیدار مغز علما میں سے تھے۔ (شذرات الذہب ج۱ ص۱۸۱)

امام نووی کہتے ہیں: سب ان کی جلالت وامامت، حفظ اور ثقاہت، وفور علم وفہم اور سیادت پر متفق ہیں۔

(تہذیب ج۱ ص۲۴۸)

خود امام مالک بیان فرماتے ہیں:

كان من العالمين العاملين الخاشعين من عباد الناس وخيارهم .(ايضا)

ایوب علمائے عالمین وخاشعین میں سب سے بہتر ہیں۔

امام مالک کہتے ہیں، کہ میں نے ایام حج میں دو سال ایوب سختیانی کو دیکھا لیکن ان سے کوئی حدیث نہیں لکھی، تیسرے سال دیکھا کہ وہ بیرزمزم پر بیٹھے تھے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لیا جاتا، تو اتنا روتے تھے، کہ مجھ کو رحم آتا تھا، جب یہ حال دیکھا، تو ان کی حدیث لکھی، امام مالک ایسے شیوخ سے بھی حدیث لینے میں محتاط تھے، جن کی عمریں سو یا سو سے زیادہ ہو گئی

تھیں اوران کے قوی مضمحل ہو گئے تھے، کیوں کہ اس عمر تک پہنچنے کے بعد عموماً حفظ وضبط میں خلل واقع ہو جاتا ہےاور سہو ونسیان کا صدور ہونے لگتا ہے، خود فرماتے ہیں، میں نے مدینہ میں بعض ایسے حضرات کا زمانہ پایا، کہ وہ سو یا ایک سو پانچ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے، لیکن ایسے بوڑھوں کی روایت نہیں لی جاتی ہےاور کوئی لے تو عیب شمار کیا جائے گا۔ امام مالک کی اس احتیاط، تمیز اور نقد کا یہ اثر ہوا کہ امام مالک جس شیخ سے روایت کرتے تھے، وہ ثقاہت وعدالت، حفظ واتقان میں علامت سمجھا جاتا تھا، یحیٰی بن معین جو امام جرح وتعدیل ہیں فرماتے ہیں ہم لوگ امام کے آگے کیا ہیں؟ ہم لوگ تو امام مالک کے نقش قدم پر چلتے ہیں جب کسی شیخ کا نام آتا ہے تو دیکھتے ہیں، کہ امام مالک نے اس سے حدیث لی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں لی ہے تو چھوڑ دیتے ہیں، امام احمد بن حنبل سے کسی نے ایک راوی کی نسبت پوچھا تو انہوں نے فرمایا، میرے نزدیک وہ اچھا ہے، کیوں کہ امام مالک نے اس سے روایت کیا ہے۔

قوت حفظ وضبط

امام مالک فطرتاً حفظ وضبط کی اعلیٰ صلاحیت سے مالا مال تھے، جو اخذ حدیث اور روایت حدیث کے لیے بنیادی وصف ہے وہ خود فرمایا کرتے تھے، کہ کوئی چیز میرے خزانہ دماغ میں آنے کے بعد خود سے نہ نکلی اور دوسروں کو بھی اس خصوصیت کا اعتراف تھا۔ ابوقلابہ کہتے ہیں ''**كان مالك احفظ اهل زمانه**'' ایک بار امام مالک اپنے استاذ ربیعہ رائی کے ساتھ محمد ابن شہاب زہری کی مجلس درس میں حاضر ہوئے امام زہری نے اس دن چالیس سے زیادہ حدیثیں املا کرائیں دوسرے دن پھر مجلس منعقد ہوئی تو امام مالک اپنے استاذ ربیعہ کے ساتھ پھر حاضر ہوئے امام زہری نے کہا کتاب لاؤ میں اس سے بیان کروں کل جو میں نے بیان کیا اس سے تم کو کیا فائدہ ہوا، ربیعہ رائی نے کہا اس مجلس میں ایک شخص ہے جو کل کی تمام حدیثیں زبانی سنا دے گا، زہری نے پوچھا، وہ کون ہے؟ ربیعہ نے کہا، ابن ابی عامر امام زہری نے اشارہ کیا کہ سناؤ امام صاحب فرماتے ہیں کہ چالیس حدیثیں میں نے [illegible]دیں، امام زہری نے اظہار تعجب کرتے ہوئے فرمایا، کہ میرا خیال تھا کہ میرے سوا کسی کو یاد نہیں۔

(تزئین الممالک ص ۱۰)

محدثانہ عظمت

بے مثال قوت حافظہ اور پر خلوص جذبۂ تحصیل حدیث نے امام مالک کو حدیث نے امام مالک کو حدیث، سنت کا بحر زخار بنا دیا تھا۔

☆ یحیٰی بن معین:۔ ''مالك امير المومنين فى الحديث'' امام مالک امیر المومنین فی الحدیث تھے۔

☆ عبدالرحمٰن بن مہدی:۔ روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث نبوی کا کوئی امانت دار نہیں۔

ائمة الحديث الذين يقتدى بهم اربعة سفيان الثورى بالكوفة ومالك بالحجاز والاوزاعى بالشام وحمادبن زيد بالبصرة ووازن بين الثورى والاوزاعى فقال الثورى امام فى الحديث وليس بامام فى السنة والاوزاعى امام فى السنة وليس بامام فى الحديث ومالك

امام فيهما ولعل امامة مالك فى الحديث والسنة سببها انه كان فقيها فكان يحفظ احاديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ويعرف معها فتاوى الصحابة والتابعين لكيلا يشذ فى فتياه عن سلف الامة ۔ (مالك ص ٧٦-٧٧)

وہ ائمہ حدیث جن کی اقتدا کی جاتی ہے، چار ہیں (١) سفیان ثوری کوفہ میں (٢) مالک حجاز میں (٣) اوزاعی شام میں (٤) حماد بن زید بصرہ میں۔ ابن مہدی نے ثوری اور اوزاعی کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے کہا، ثوری حدیث کے امام ہیں سنت کے امام نہیں اور اوزاعی امام سنت ہیں امام حدیث نہیں اور امام مالک حدیث وسنت دونوں میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں، امام مالک حدیث وسنت دونوں کے امام اس لیے تھے، کہ وہ فقیہ تھے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یاد کرتے اور اس کے ساتھ صحابہ اور تابعین کے فتووں کو بھی جانتے تھے تاکہ ان کے فتوے ائمہ سلف کے فتووں سے جدا نہ ہوں۔

☆ **سفیان بن عیینہ:**۔ ”رحم الله مالكا ما كان اشد انتقاءه للرجال وقال فى تفضيله على نفسه مانحن عند مالك انما كنا نتبع آثار مالك وننظر الشيخ اذا كتب عنه مالك كتبنا عنه وكان يقول كان لايبلغ من الحديث الا صحيحا ولايحدث الا عن ثقات الناس ومااری المدينة الاستخرب بعد موت مالك بن انس“ (الانتقاء لابن عبدالبر ص ٢١)

اللہ تعالیٰ امام مالک پر رحم کرے وہ انتخاب شیوخ میں بہت سخت تھے اور سفیان ثوری نے امام مالک کو اپنی ذات پر فضیلت دیتے ہوئے کہا، مالک کے سامنے ہم کیا ہیں؟ ہم تو آثار مالک کی پیروی کرتے ہیں اور ہم جس شیخ کو دیکھتے کہ مالک اس سے حدیث لکھ رہے ہیں تو ہم بھی اس سے حدیث لکھتے اور سفیان کہا کرتے تھے وہ صرف صحیح حدیث ہی روایت کیا کرتے تھے اور ثقہ راویوں کی ہی حدیث بیان کرتے تھے، میرا خیال ہے، کہ امام مالک کی موت کے بعد مدینہ ویران ہو جائے گا۔

☆ **محدث ابن نہیک:**۔ میں صحت حدیث کے اندر مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

☆ **امام احمد بن حنبل:**۔ آپ سے ایک شخص نے پوچھا کہ اگر کسی کی حدیث وہ زبانی یاد کرنی چاہے تو کس کی کرے؟ جواب دیا، کہ مالک بن انس کی۔

☆ **امام شافعی:**۔ ”اذا ذكر العلماء فمالك النجم لولا مالك وابن عيينة لذهب علم الحجاز“ امام مالک علما کے نزدیک درخشندہ ستارے ہیں، اگر امام مالک اور سفیان بن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز کا علم رخصت ہو جاتا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ١٩٤)

☆ **احمد بن حنبل:**۔ عبداللہ بن احمد کہتے ہیں، کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا ”من اثبت اصحاب زهری قال

"مالك اثبت في كل شي" زہری سے حدیث بیان کرنے میں ان کا کون سا تلمیذ زیادہ پختہ ہے فرمایا امام مالک ہر فن میں پختہ ہیں۔ (ایضا)

☆ **ابن وہب:** ۔"لو لا مالك و الليث لضللنا" اگر امام مالک اور لیث رہنمائی نہ کرتے تو ہم گم کردہ راہ ہوجاتے۔

(ایضا)

☆ **سفیان بن عیینہ:** ۔ جب انہیں امام مالک کی وفات کا علم ہوا تو گہرے رنج کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "ماترك على ظهر الارض مثله" امام مالک نے روئے زمین پر اپنے مثل نہیں چھوڑا۔ (ایضا)

☆ **یحیٰ بن معین:** ۔"مالك احب الي في نافع من ايوب و عبيد الله" حضرت نافع سے حدیث بیان کرنے میں مجھے امام مالک ایوب اور عبیداللہ سے زیادہ محبوب ہیں۔ (ایضا)

☆ **امام نسائی:** ۔"ماعندی بعد التابعين انبل من مالك واجل منه ولا اوثق ولا آمن على الحديث منه ولااقل رواية عن الضعفاء" میرے نزدیک تابعین کے بعد امام مالک سے زیادہ دانش منداور ان سے بزرگ اور ان سے زیادہ ثقہ اور ان سے زیادہ حدیث میں مامون اور ضعیف راویوں سے کم روایت کرنے والا کوئی نہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۸)

☆ **عبدالرحمٰن بن مہدی:** ۔"ما رايت رجلا اعقل من مالك" میں نے کسی کو امام مالک سے بڑا اعقل مند نہیں دیکھا۔ (ایضا)

☆ **شاہ ولی اللہ:** ۔امام مالک ان لوگوں میں سے تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں سب سے زیادہ پختہ وضابط تھے اور اسناد میں سب سے زیادہ ثقہ تھے۔

☆ **ابن خلکان:** ۔"امام دار الهجرت و احد ائمة الاعلام" وہ امام دارالہجرت ائمہ اعلام میں تھے۔

(وفیات الاعیان ج ۲ص ۳۰۰)

☆ **اوزاعی:** ۔امام مالک استاذ العلما، عالم حجاز اور مفتی حرمین ہیں۔ (تذکرۃ المحدثین ص ۱۰۳)

☆ **امام شافعی:** ۔"مالك حجة الله تعالىٰ على خلقه بعد التابعين" امام مالک تابعین کے بعد مخلوق پر اللہ کی حجت تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ص ۷)

* * *

مؤطا امام مالک

یہ شہرہ آفاق کتاب امام دارالہجرت کا تصنیفی شاہکار اور تدوین حدیث کے سلسلے کی نہایت اہم زریں کڑی ہے، اس کتاب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، صحابہ و تابعین کے آثار اور فتوے فقہ کے ابواب پر مدون کیے گئے ہیں۔

صحابہ اور کبار تابعین کے دور میں اگرچہ حدیثیں بیشتر سینوں میں محفوظ تھیں اور ان کی باقاعدہ تدوین کا عمل شروع نہیں ہوا تھا، تاہم متفرق طور پر بعض صحابہ کرام اور تابعین عظام نے حدیثی صحیفے مرتب کیے تھے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی کتاب ''الصادقہ'' جو ان کے خاندان میں کئی نسلوں تک محفوظ رہی اور کتب حدیث میں عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو حدیثیں پائی جاتی ہیں، وہ ''الصادقہ'' کی ہی مرویات ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے احادیث نبوی کا ایک صحیفہ مرتب کیا تھا، جس میں دیت، قصاص اور مسلمانوں کے باہمی حقوق کے بارے میں حدیثیں تھیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس، عمرو بن حزم، حضرت ابوہریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سمرہ بن جندب، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس حدیث، فرامین رسالت اور مکاتیب نبوی کے نوشتے تھے۔

تابعین میں ابن شہاب زہری، ہمام بن منبہ کے صحیفے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن پہلی صدی ہجری تک حدیثوں کی کتابت و تدوین کا یہ عمل انفرادی اور متفرق تھا، مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز جب سریر آرائے خلافت ہوئے تو آپ نے اپنے حدود خلافت میں عمال اور علما کو فرامین بھیجے، کہ تم لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث و سنن کو جو لوگوں کے سینوں میں ہیں، سفینوں میں محفوظ کر لو۔ مدینہ کے گورنر قاضی ابوبکر بن حزم کو لکھا:

> **انظر ما كان من حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاكتبه فاني خفت دروس العلم وذهاب العلماء ولا يقبل الا حديث النبي صلى الله عليه وسلم .**

(بخاری کتاب العلم باب کیف یقبض العلم)

احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرو اور جستجو کر کے لکھو کیوں کہ مجھے علم کے مٹنے اور علما کے فنا ہونے کا خوف ہے اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہی قبول کی جائے۔

حافظ ابونعیم نے تاریخ اصفہان میں تحریر فرمایا ہے:

> **ان عمر بن عبدالعزیز کتب الی اھل الآفاق انظروا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجمعوہ** ۔(الحدیث والمحدثون ص ۱۳۸)

> حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام آفاق اسلامی میں یہ حکم نامہ لکھا تھا، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو دیکھ بھال کر جمع کرو۔

تدوین حدیث کی تاریخ میں یہ پہلی اہم کوشش تھی، جو حکومت کی سطح پر کی گئی اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے حدیثوں کے دفاتر نقل کرا کر تمام بلاد اسلامی میں ارسال فرمائے۔ چنانچہ حافظ عبدالبر اندلسی اپنی کتاب جامع بیان العلم میں سعد بن ابراہیم کی روایت نقل کرتے ہیں:

> **امرنا عمر بن عبدالعزیز بجمع السنن فکتبناھا دفترا دفترا وبعث الی کل ارض لہ سلطان دفترا** ۔(جامع بیان العلم ج ا ص ۷۸)

> ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا تو ہم نے الگ الگ دفتروں میں ان کو لکھا تو خلیفہ نے ہر علاقہ میں جس میں آپ کا نائب تھا ایک ایک دفتر بھیجا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے احکام وفرامین نے تدوین حدیث کی جو منظم حرکت عالم اسلام میں پیدا کی، اس کے نتیجہ میں احادیث رسول کے سیکڑوں نسخے مرتب ومدون ہو گئے اور آئندہ کے لیے تدوین حدیث کی راہیں ہموار ہو گئیں، جن پر چل کر دوسری صدی میں تابعین، تبع تابعین اور ائمہ محدثین نے مختلف بلاد وامصار میں احادیث کی جمع وتدوین کا اہم کام کیا۔

۱۳۲ھ میں عالم اسلام میں عظیم سیاسی انقلاب رونما ہوا، زمام اقتدار امویوں کے ہاتھ سے نکل کر عباسیوں کے قبضہ میں آئی اور علمی ماحول میں بھی خوش گوار انقلاب آیا، عباسیوں کا عہد خلافت ابتدا ہی سے علوم وفنون کی اشاعت کا موزوں اور سازگار عہد تھا۔ علم حدیث نے بھی اس عہد میں خاص طور سے ترقی کی۔ محمد ابوزہو لکھتے ہیں:

> **بدأ التدوین فی اواخر عھد بنی امیة علی ماذکرنا ولکن لم یظھر شانہ تمام الظھور الا فی خلافة بنی العباس حول منتصف القرن الثانی** (الحدیث والمحدثون ص ۲۴۵)

> تدوین حدیث کی ابتدا آخر عہد اموی میں ہوئی، لیکن اس کی شان کا کامل ظہور عہد عباسی میں تقریباً دوسری صدی کے نصف میں ہوا۔

اس دور کی تدوینی سرگرمیوں اور کتب حدیث کی خصوصیات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے علامہ محمد الخضری لکھتے ہیں:

حدیث کے لیے یہ دور بہترین دور تھا، کیوں کہ اس میں رواۃ حدیث نے اس کی تصنیف وتدوین کی ضرورت محسوس کی اور اس کی تصنیف کے یہ معنی تھے، کہ ایک ہی قسم کی حدیثیں مثلاً نماز اور روزہ وغیرہ کی حدیثوں کو باہم ایک ہی مسئلہ میں جوڑ دیا

جائے، یہ خیال تمام اسلامی شہروں میں قریب قریب ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوا، یہاں تک کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے تقدم کا شرف کس کو حاصل ہے اور ان کتابوں میں حدیث جیسا کہ ہم کو موطا امام مالک میں نظر آتا ہے صحابہ وتابعین کے اقوال کے ساتھ مخلوط تھی۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص ۲۵۶)

اس دور میں احادیث وسنت کا ذخیرہ پوری دنیائے اسلام میں جہاں جہاں صحابہ اور تابعین نے قیام فرمایا منتشر ہوگیا اس لیے تدوین حدیث کی تحریک کا اثر جن بلاد وامصار میں ہوا وہاں کے محدثین نے زیادہ تر اپنے شہر اور اس سے متعلق مقامات میں پھیلی ہوئی معلومات کو اپنے ذوق ووجدان کے مطابق کتابوں میں جمع کیا اس عہد کے حدیث وسنت کے مدونین کے اسماء ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

مکہ مکرمہ:۔ ابن جریج م ۱۵۰ھ

مدینہ منورہ:۔ ابن اسحاق م ۱۵۱ھ، امام مالک ۱۷۹ھ، ابن ابی ذئب ۱۵۹ھ

بصرہ:۔ ربیع بن صبیح بصری ۱۶۰ھ، سعد بن ابی عروبہ ۱۵۶ھ، حماد بن سلمہ ۱۶۷ھ

کوفہ:۔ سفیان ثوری ۱۶۱ھ، امام اعظم ابوحنیفہ ۱۵۰ھ

شام:۔ امام اوزاعی ۱۵۶ھ

واسط:۔ ہشیم بن بشیر ۱۳۸ھ

یمن:۔ معمر بن راشد ۱۵۳ھ

رے:۔ جریر بن عبدالحمید ۱۸۸ھ

خراسان:۔ عبداللہ بن مبارک ۱۸۱ھ

بغداد:۔ محمد بن حسن شیبانی ۱۸۹ھ، قاضی ابویوسف ۱۸۲ھ

مصر:۔ امام شافعی ۲۰۴ھ

سوال پیدا ہوتا ہے، کہ اس عہد کی تصانیف کیا ہوئیں، ان میں سے بہت تھوڑی کتابیں نقل ہو کر ہم تک پہنچ سکیں۔ ممکن ہے کہ تصنیف وتدوین کے تدریجی ارتقا کی جو روایت چلی آرہی ہے، ان تصانیف کے نایاب ہونے کا سبب بن گئی ہو اس میں چنداں مضائقہ بھی نہیں، اس لیے کہ جو احادیث زہری ودیگر محدثین کی تصانیف میں موجود تھیں وہ اگلے ادوار میں اشاعت پذیر ہونے والی کتب حدیث میں بھی موجود ہیں۔ البتہ ان کی ترتیب وتہذیب کا انداز جداگانہ ہے۔

لیکن متذکرہ بالا محدثین کی کتابوں میں موطا امام مالک، مسند امام شافعی، کتاب الآثار محمد بن حسن شیبانی آج بھی ہماری دسترس میں ہیں اور ان میں سب سے اہم امام دارالہجرت کی موطا ہے۔ امام مالک نے کتاب خلیفہ منصور عباسی کی خواہش پر لکھی، اس نے امام مالک سے درخواست کی تھی، کہ صحیح احادیث ایک کتاب میں درج کردی جائیں، امام صاحب نے اپنی اس

کتاب کا نام مؤطا رکھا مؤطا کا معنی پامال اور ہموار راستہ کے ہیں، کتاب کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے، کہ امام مالک نے کتاب تصنیف فرما کر اپنے شیوخ واساتذہ کی بارگاہوں میں پیش کی ''فواطئوا علیه '' تو انہوں نے اس کی موافقت کی، جس کی بنا پر امام مالک نے کتاب کا نام ''مؤطا'' تجویز کیا۔ امام مالک خود فرماتے ہیں:

عرضت کتبی هذا علی سبعین فقیها من فقهاء المدینة فکلهم واطانی علیه فسمیته المؤطا ۔(الحدیث والمحدثون ص ٢٤٦)

میں نے یہ کتاب مدینہ کے ستر فقہا کو دکھائی، سب نے میری تائید کی، اس لیے میں نے اس کا نام ''مؤطا'' رکھا۔

چوں کہ مدینہ منورہ علوم نبویہ کا مخزن ہے، اکابر صحابہ واجلہ تابعین اس شہر مبارک میں سکونت گزیں تھے اور ان کے علوم وفنون کا سرچشمہ یہی شہر مقدس تھا، چنانچہ امام مالک نے انہیں اساطین حدیث کی مرویات اور ان کے فتووں کو پوری تحقیق اور معیار نقد ونظر پر پرکھ کر اپنی کتاب میں جمع کیا، اس بنا پر یہ صحیفہ درحقیقت صحیح، موثق اور کامل احکام اسلامیہ کا مجموعہ ہے۔

مؤطا میں شامل احادیث کی تعداد میں جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس کی وجہ مؤطا کے نسخہ جات اور اس کی روایت کرنے والوں کا تنوع اور اختلاف ہے۔ احادیث شمار کرنے والوں کو جو نسخہ ہاتھ آیا اسی کے پیش نظر انہوں نے احادیث مندرجہ کی تعداد بتائی۔ امام سیوطی اپنی کتاب تدریب الراوی میں حافظ صلاح الدین علائی کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

امام مالک سے متعدد لوگوں نے مؤطا روایت کی ہے، ان کی روایات میں تقدیم وتاخیر اور کمی بیشی پر مشتمل بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، مؤطا کا جو نسخہ بروایت ابن مصعب منقول ہے، وہ بہت زیادہ اضافہ پر مشتمل ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں کہ ابن مصعب کے نسخہ میں ایک صد احادیث زائد ہیں، جو دوسرے نسخہ جات میں نہیں ہیں، اسی طرح محمد بن حسن کے نسخہ میں ایک سو پچھتر احادیث زائد ہیں، جو ایسی سند کے ساتھ مروی ہیں، جس میں امام مالک شامل نہیں، ان میں تیرہ احادیث امام ابوحنیفہ سے چار قاضی ابو یوسف سے اور باقی دوسروں سے منقول ہیں۔ (تدریب الراوی ص ٣٢)

علما کا قول ہے کہ امام مالک نے مؤطا کی ترتیب وتہذیب میں چالیس سال صرف کیے ہیں، ابتدا میں مؤطا کے اندر دس ہزار حدیثیں تھیں، مگر بار بار کی تنقیح وتہذیب کے دوران امام صاحب کے خامہ تنقید وصحت پسند نے آٹھ ہزار حدیثیں خارج کردیں۔ بقول ابوبکر ابہری آخر میں ایک ہزار سات سو بیس (١٧٢٠) حدیثیں رہ گئیں، جن میں سے مسند اور مرفوع چھ سو (٦٠٠) ہیں مرسل دو سو بائیس (٢٢٢) موقوف چھ سو تیرہ (٦١٣) تابعین کے اقوال وفتاوی دو سو پچاسی (٢٨٥) ہیں۔

(الحدیث والمحدثون ص ٢٤٩)

امام جلال الدین سیوطی نے اپنی شرح مؤطا کے مقدمہ میں امام اوزاعی کا یہ قول نقل کیا ہے:

عرضنا علی مالك المؤطا فی اربعین یوما فقال کتاب الفته فی اربعین سنة اخذتموه فی اربعین یوما ما اقل ما تفقهون ۔(الحدیث والمحدثون ص ٢٤٦)

ہم نے امام مالک کو کتاب مؤطا چالیس دنوں میں سنائی، تو فرمایا، جس کتاب کو میں نے چالیس سال میں مرتب کیا تھا، تم نے چالیس دنوں میں پڑھ لی۔ تم نے اس کے مطالب ومندرجات کس قدر کم سمجھے ہیں۔

مؤطا کے اندر امام مالک کا طرز ترتیب یہ ہے، کہ باب کے شروع میں جو احادیث، اس کے متعلق وارد ہوئی ہیں، وہ بیان کر دیتے ہیں پھر صحابہ وتابعین کے اقوال وآثار ذکر کرتے ہیں، یہ صحابہ وتابعین اکثر وبیشتر اہل مدینہ میں سے ہوتے ہیں، امام مالک شاذ ونادر ہی اہل مدینہ کے سوا کسی اور سے روایت کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے، کہ آپ سفر حج کے علاوہ مدینہ منورہ سے باہر تشریف نہیں لے گئے، بعض اوقات اہل مدینہ کے تعامل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، کبھی کبھی حدیث کے بعض مشکل الفاظ یا جملوں کی شرح وتفسیر بھی فرماتے ہیں۔ (ایضا)

یعد المؤطا اول مؤلف ثابت النسبة من غیر شك ذاع وانتشر فی الاسلام وتناقلته الاجیال جیلا بعد جیل الی یومنا هذا وهو ثابت النسبة الی الامام مالك رضی اللہ عنه وهو یعد الاول فی التالیف فی الفقه والحدیث معا ۔ (مالك ص ۱۸۱)

مؤطا اس لحاظ سے پہلی تصنیف ہے، کہ اس کی نسبت امام مالک کی طرف بلاریب ثابت ہے اور یہ کتاب بلاد اسلامی میں خوب پھیلی اور منتشر ہوئی، لوگ اسے نسلا بعد نسل آج تک نقل کرتے چلے آرہے ہیں، یہ امام مالک کی طرف ثابت النسبت ہے اور حدیث وفقہ میں تالیف ہونے والی یہ پہلی کتاب شمار کی جاتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

تلاش کے بعد پہلے طبقہ کی صرف تین کتابیں ہیں (۱) مؤطا امام مالک (۲) صحیح بخاری (۳) صحیح مسلم۔ امام شافعی نے فرمایا کہ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب مؤطا امام مالک ہے اور تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے، کہ امام مالک اور ان کے موافقین کی رائے کے مطابق مؤطا کی تمام احادیث صحیح ہیں اور غیر موافقین کی رائے کے مطابق اس میں کوئی ایسی مرسل اور منقطع نہیں، کہ جس کی سند دوسرے طرق کے ذریعہ متصل نہ ہوگئی ہو۔ اس لیے یقیناً یہ اس لحاظ سے صحیح ہے۔

امام مالک کے زمانہ میں کثرت سے مؤطات لکھی گئیں، جن میں مؤطا کی احادیث کی تخریج کی گئی اور منقطع احادیث کو منقطع بتایا گیا مثلاً ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، ثوری، معمر وغیرہ کی کتابیں ہیں، جن کے اساتذہ اور امام مالک کے اساتذہ مشترک تھے۔

نیز امام مالک سے ایک ہزار سے زیادہ آدمیوں نے روایت کیا ہے، دور دور کے علاقوں سے لوگوں نے امام مالک سے علم حاصل کرنے کے لیے، اونٹوں پر سفر کیا، جیسا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں پیشین گوئی بھی فرمائی، ان میں بڑے بڑے فقہا بھی ہیں، جیسے کہ امام شافعی، محمد بن حسن، ابن وہب، ابن قاسم وغیرہ اور کبار محدثین بھی ہیں جیسے کہ یحیٰی بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی اور عبدالرزاق وغیرہ۔

ان میں بادشاہ اور حکام بھی ہیں، جیسے کہ رشید اور اس کے دونوں بیٹے، یہ کتاب امام مالک کے زمانہ میں ہی کافی شہرت حاصل کر چکی تھی، حتی کہ تمام دیار اسلام میں اس کی شہرت ہوگئی، پھر ان کے بعد ہر زمانہ میں اس کی شہرت بڑھتی رہی، اس کی طرف التفات زیادہ ہوتا رہا، فقہاے امصار حتی کہ اہل عراق نے بھی بعض امور میں اس کتاب کو بنیاد قرار دیا، علماے حدیث ہمیشہ اس کتاب کی تخریج کرتے رہے، اس کے اشکال کو منضبط کرتے رہے، اس کی فقہ سے بحث کرتے رہے اور اس کے رجال کی تحقیق کرتے رہے کہ جس کی انتہا ہوگئی اور اس کے بعد غور کا کوئی حصہ باقی نہ رہا۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۲۲، ۳۲۱)

اہمیت مؤطا

امام مالک نے جس وقت سے مؤطا تالیف فرمائی علما و فقہا دور دراز کا سفر کر کے مدینہ آتے اور امام دار الہجرت کی بارگاہ عالی میں مؤطا کا درس لیتے، یہاں تک کہ ایک ہزار سے زائد محدثین و فقہا ایسے ہیں، جنہوں نے براہ راست امام دار الہجرت سے مؤطا کا سماع کیا اور ان سے حدیثیں روایت کیں، گویا امام مالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مصداق تھے:

یوشك ان یضرب الناس اکباد الابل فی طلب العلم فمایجدون اعلم من عالم المدینة ۔(جامع الاصول ج۹ ص ۲۴۱)

قال عبدالرزاق هو مالك بن انس ۔

وہ زمانہ کچھ دور نہیں جب لوگ سوختہ جگر اونٹوں پر سوار ہو کر علم کی تلاش کے لیے نکلیں گے اور مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی کو نہ پائیں گے۔

راوی حدیث عبدالرزاق کہتے ہیں کہ اس حدیث میں عالم مدینہ سے مراد امام مالک ہیں۔

مؤطا اپنے مؤلف امام مالک کی حیات ہی میں حد درجہ شہرت و قبول عام کی سند حاصل کر چکی تھی۔ چنانچہ تمام بلاد و امصار اور دور و نزدیک کے رہنے والے اس کی جانب متوجہ ہوگئے تھے، زمانہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا مؤطا کی شہرت و قبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

علما و محدثین کی قدردانی کا یہ عالم تھا، کہ کوئی اس کی احادیث کی تخریج کرتا اور کوئی اس کے متابعات و شواہد تلاش کرتا، بعض علما نے اس کے مشکل الفاظ کی شرح لکھی اور ان کو ضبط کیا، بعض نے اس کے فقہی مباحث کو موضوع سخن بنایا، دیگر علما نے اس کے رجال کے بارے میں داد تحقیق دی، دوسری طرف خلفا اور سلاطین مؤطا کی قدرشناسی کا حق ادا کرتے رہے۔

ابو نعیم حلیۃ الاولیا میں امام مالک سے نقل کرتے ہیں:

شاورنی هارون الرشید ان یعلق المؤطا فی الکعبة ویحمل الناس علی مافیه فقلت لاتفعل فان اصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم اختلفوا فی الفروع وتفرقوا فی البلدان

وکل مصیب فقال وفقك الله يا اباعبدالله . (الحدیث والمحدثون ص ۲۵۳)

خلیفہ ہارون رشید نے مجھ سے مشورہ کیا، کہ مؤطا کو کعبہ میں آویزاں کردیا جائے اور لوگوں کو مامور کیا جائے کہ اس کی پیروی کریں، میں نے کہا، کہ ایسا نہ کیجیے، اس لیے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف شہروں میں بس گئے تھے، اور وہ دین کے فروعی مسائل میں مختلف الرای تھے اور اپنی اپنی جگہ سب درست ہی کہتے تھے، ہارون رشید کہنے لگا ابوعبداللہ! خداوند کریم آپ کو توفیق عطا فرمائے۔

قاضی فاضل نے اپنے بعض خطوط میں لکھا ہے:

ماعلم ان لملك رحلة فی طلب العلم الا للرشيد فانه رحل بولديه الامين والمامون لسماع المؤطا علی مالك وكان اصل المؤطا بسماع الرشيد بخزانة المصريين ثم رحل لسامعه صلاح الدين الايوبی الی الاسكندريه فسمعه علی ابن طاهر بن عوف .

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۲)

مجھے نہیں معلوم کہ کوئی بادشاہ کبھی علم کی تلاش میں نکلا سوائے ہارون رشید کے، خلیفہ ہارون رشید اپنے دونوں بیٹوں امین و مامون کو لے کر مؤطا سننے کے لیے امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، مؤطا کے جس نسخے سے ہارون نے امام مالک سے سماع کیا تھا، وہ مصر کے دارالکتب میں موجود تھا۔ اسی طرح سلطان صلاح الدین ایوبی علی بن طاہر بن عوف سے مؤطا کا درس لینے کے لیے اسکندریہ حاضر ہوئے تھے۔

امام مالک احادیث نبویہ کی سند اور متن میں غور و فکر کے عادی اور اس کی نقل و روایت میں حد درجہ محتاط واقع ہوئے تھے، ائمہ محدثین اس حقیقت کا اعتراف کر چکے ہیں، چوں کہ مؤطا کی تدوین و ترتیب میں چالیس سال کا طویل عرصہ بسر ہوا اور پوری تحقیق و تفتیش، دقت نظر کے ساتھ حدیثوں کا انتخاب عمل میں آیا، اس لیے یہ کتاب نہایت بلند پایہ اور اپنے باب میں عدیم النظیر ہے۔ سلف و خلف کے بھی علما بیان کر چکے ہیں، کہ مؤطا میں مندرجہ تمام احادیث صحیح ہیں، اسی طرح اس کی جملہ اسانید متصل ہیں۔

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

امام مالک کی کتاب ان کے اور ان کے مقلدین کے نزدیک صحیح ہے اور ان کے اس قاعدہ کے مطابق ہے، کہ وہ مرسل و منقطع احادیث سے احتجاج کرنے کے قائل ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہاں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، دیگر علما کا زاویہ نگاہ یہ ہے، کہ مؤطا میں جو مرسل و منقطع احادیث پائی جاتی ہیں، دوسرے طرق سے ان کا متصل ہونا ثابت ہو چکا ہے، اس طرح مؤطا کی تمام احادیث صحیح ہیں، امام مالک کی زندگی ہی میں علما نے احادیث مؤطا کی تخریج کا کام شروع کر دیا تھا اور جو احادیث اس میں مرسل یا منقطع ہیں، ان کا

متصل ہونا بھی ثابت کیا تھا، ان میں وہ اکابر علما بھی شامل ہیں، جنہوں نے امام مالک کے شیوخ سے بذات خود استفادہ کیا تھا، مثلاً سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ وابن ابی ذئب ودیگر علما (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ص ۱۳۳)

پانچویں صدی ہجری کے جید عالم ابن عبدالبر نے اس ضمن میں ایک جامع کتاب مرتب کی ہے، اس میں موصوف نے ان تمام احادیث کا متصل ہونا ثابت کیا ہے، جن کو امام مالک نے بصورت مرسل ومنقطع ومعضل روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں، مؤطا میں جہاں بھی امام مالک بلغنی (مجھے یہ حدیث پہنچی) یا الثقۃ (ایک ثقہ راوی سے روایت ہے) کہتے ہیں اور اس حدیث کو متصلا روایت نہیں کرتے، مؤطا میں ایسی کل اکسٹھ (۶۱) احادیث ہیں، یہ تمام احادیث امام مالک کے علاوہ دوسری اسانید سے متصلا مذکور ہیں، البتہ چار احادیث ایسی ہیں، جن کا متصل ہونا ثابت نہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) انی لا انسی یہ حدیث باب العمل فی السہو میں مذکور ہے۔

(۲) اری اعمار الناس قبله یہ حدیث باب ماجاء فی لیلۃ القدر کتاب الاعتکاف میں ہے۔

(۳) آخر ما اوصانی به رسول الله یہ حدیث کتاب الجامع میں مرقوم ہے۔

(۴) اذا نشأت بحرية ثم تشائمت یہ حدیث باب الاستمطار بالنجوم میں مذکور ہے۔

مگر صحیح یہ ہے، کہ ان مذکورۃ الصدر احادیث اربعہ کا متصل ہونا ثابت ہے، ابن عبدالبر پہلی حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں، کہ وہ معنی کے اعتبار سے صحیح ہے، سفیان کا قول ہے، کہ جب امام مالک ’’بلغنی‘‘ کہتے ہیں تو اس کو اسناد صحیح پر محمول کرنا چاہیے، امام جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تنویر الحوالک میں دوسری حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں، کہ اس مرسل کے شواہد موجود ہیں، جو معنوی اعتبار سے اس کی تائید کرتے ہیں، پھر سیوطی نے وہ شواہد ذکر کیے ہیں، باقی رہی تیسری حدیث تو ترمذی میں اس کی ہم معنی حدیث موجود ہے، چوتھی حدیث کا شاہد امام شافعی نے اپنی کتاب ’’الام‘‘ میں اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سند میں امام مالک نہیں ہیں۔

علمانے ان احادیث اربعہ کو بحث وتمحیص کا مرکز بنایا اور ان کا متصل ہونا ثابت کیا ہے، حافظ ابن صلاح نے ایک مستقل تصنیف میں ان کو موصول قرار دیا ہے، اسی طرح حافظ بن مرزوق المعروف بالخطیب نے احادیث اربعہ کی اسانید کو ایک جداگانہ کتاب میں جمع کیا ہے، حافظ ابن ابی الدنیا نے اپنی کتاب اقلید التقلید میں ان میں سے دو احادیث کو مسند ٹھہرایا ہے، سفیان بن عیینہ کے مندرجہ ذیل قول سے احادیث اربعہ کا دیگر احادیث کی طرح متصل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

امام مالک صرف اس حدیث کو روایت کرتے ہیں جو صحیح ہو آپ ہمیشہ ثقہ راویوں سے حدیثیں روایت کرتے تھے۔

(اضاءۃ الممالک ص ۶۳)

علمائے سلف وخلف کی مندرجہ بالا شہادتوں کی بنا پر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مؤطا میں مندرج تمام احادیث صحیح اور متصل

ہیں۔ امام مالک جیسے جلیل القدر محدث ونقاد اور امام مدینہ عالم اہل حجاز سے اس کے سوا کسی اور بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

مؤطا کے متداول نسخے

مؤطا کے نسخہ جات کی تعداد یوں تو بہت ہے، مگر ان میں سے تیس نسخے مشہور ہیں، ان نسخہ جات میں کمی بیشی اور تقدیم وتاخیر کے اعتبار سے بڑا فرق پایا جاتا ہے، علامہ جلال الدین سیوطی ذکر کرتے ہیں، کہ راویوں سے منقول چودہ نسخے بہت مشہور ہیں، ان چودہ نسخہ جات میں مندرجہ ذیل نسخے شامل ہیں۔

(۱) یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا نسخہ، یحییٰ نے پہلے عبدالرحمٰن سے مؤطا سنی، جو شبطون کے نام سے معروف تھے، پھر دو دفعہ امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مؤطا سنی، مگر کتاب الاعتکاف کے آخر کے تین ابواب نہ سن سکے۔

(۲) مدینہ کے قاضی ابن مصعب احمد بن ابی بکر کا نسخہ، علما کا کہنا ہے، کہ اُن کا مرتب کردہ نسخہ سب سے آخر میں امام مالک کو سنایا گیا تھا۔ مؤطا کے اس نسخے میں دیگر نسخہ جات سے ایک صد احادیث زائد ہیں، جو دوسروں کے نسخے میں نہیں ہیں۔

(۳) امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید امام محمد بن حسن شیبانی کا نسخہ، یہ حدیث میں امام مالک کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے، اس طرح فقہ میں ان کا شمار امام ابوحنیفہ کے بہترین شاگردوں میں ہوتا ہے، ان کے نسخہ میں یحییٰ کے نسخہ کی نسبت بکثرت اضافے ہیں، یہ نسخہ ہندوایران میں طبع ہو چکا ہے اور وہاں اور حرمین میں بہت مشہور ہے۔

صاحب کشف الظنون رقم طراز ہیں:

ابوالقاسم محمد بن حسن شافعی فرماتے ہیں، کہ امام مالک سے مؤطا کے گیارہ نسخے منقول ہیں، یہ قریب المعنی ہیں، ان میں مندرجہ ذیل چار نسخے بہت مشہور ہیں۔

(۱) یحییٰ بن یحییٰ کا نسخہ (۲) مؤطا ابن بکیر (۳) ابن مصعب کا نسخہ (۴) مؤطا بروایت وہب (اضاءۃ المالک ص۴۰، کشف الظنون ج۲ ص۳۷۰)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بستان المحدثین میں مؤطا امام مالک کے متداول سولہ نسخوں کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔

(۱) یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی م۲۰۴ھ (۲) عبداللہ بن وہب ۱۹۷ھ (۳) عبداللہ بن مسلم ۳۲۱ھ (۴) ابن القاسم ۱۹۱ھ (۵) معن بن عیسیٰ ۱۹۸ھ (۶) عبداللہ بن یوسف (۷) یحییٰ بن بکیر ۳۳۱ھ (۸) سعید بن عفیر ۲۲۶ھ (۹) ابومصعب زہری ۲۴۲ھ (۱۰) مصعب بن عبداللہ زبیری (۱۱) محمد بن مبارک صوری (۱۲) سلیمان بردم ۲۲۲ھ (۱۳) یحییٰ بن یحییٰ تمیمی (۱۴) ابوحذیفہ سہمی ۲۵۹ھ (۱۵) سوید بن سعید ۲۴۰ھ (۱۶) محمد بن حسن شیبانی ۱۸۹ھ

امام یحیٰ بن یحیٰ مصمودی رضی اللہ عنہ ۱۵۲ھ صفر ۲۲۶ھ

ابو محمد یحیٰ بن یحیٰ بن کثیر وسلاس بن شملال لیثی اندلسی قرطبی مصمودی کا تعلق اندلس میں بربریوں کے ایک قبیلہ مصمود سے تھا، جس کی بناپر مصمودی مشہور ہوئے۔

قدرت نے یحیٰ کو بے مثال حافظہ اور قوت ادراک کے ساتھ تحصیل علم کے ذوق سے مالا مال کیا تھا، انہوں نے کم سنی ہی سے تحصیل علم کا آغاز کردیا اور سب سے پہلے یحیٰ بن نصر اندلسی سے حدیث کا سماع کیا، پھر طلب علم کے شوق میں کشاں کشاں مدینہ منورہ پہنچے، جہاں امام مالک کا بحر بیکراں موجیں مار رہا تھا، جس کے گرد علم نبوت کے جرعہ خواروں کی بھیڑ جمع رہتی تھی، یحیٰ نے امام مالک کے چشمہ فیض سے خوب تشنگی بجھائی اور پوری مؤطا کا سماع کیا اور پھر مکہ جاکر سفیان بن عیینہ اور مصر میں لیث بن سعد، عبداللہ بن وہب، عبدالرحمٰن بن قاسم سے علم حاصل کیا۔ ان کے نامور اساتذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

امام مالک، زیاد بن عبداللہ، یحیٰ بن مضر، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن وہب، عبدالرحمٰن بن قاسم، قاسم بن عبداللہ بن عمری، ابوضمرہ وغیرہم (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۶۳)

وہ طلب علم میں اس درجہ منہمک رہتے، کہ کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے، خواہ وہ کتنی ہی اہم اور توجہ کو مبذول کرنے والی کیوں نہ ہو، ایک بار وہ امام مالک کے حلقہ درس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ شور اٹھا ہاتھی آگیا ہاتھی آگیا، تمام شرکائے درس اٹھ کر ہاتھی دیکھنے چلے گئے، مگر یحیٰ اپنی جگہ سے نہ اٹھے امام مالک نے پوچھا:

مالك لا تخرج فتراه لانه لايكون بالاندلس ؟فقال انما جئت من بلدی لانظر اليك واتعلم من حديث وعلمك ولم اجئ لانظر الى الفيل ۔ (وفيات الاعيان ج ۳ ص ۲۷۵)

اندلس میں ہاتھی نہیں پایا جاتا پھر تم ہاتھی دیکھنے کیوں نہیں گئے؟ عرض کی، حضور! میں یہاں آپ کا فیض صحبت اٹھانے اور آپ کے علم اور اسوہ سے کچھ حاصل کرنے آیا ہوں، اس لیے نہیں آیا، کہ ہاتھیوں کو دیکھتا پھروں، امام مالک کو ان کا یہ جواب بہت پسند آیا اور اس دن سے ان کو ''عاقل اہل اندلس'' کہنا شروع کردیا۔

فضل وکمال

امام یحیٰ مصمودی نے اپنے وقت کے جلیل القدر مشائخ، محدثین اور فقہا کی بارگاہوں سے کسب علم فرما کر اپنا دامن گوناگوں علمی جواہرات سے بھر لیا تھا، وہ حدیث، فقہ وفتویٰ اور دوسرے علوم وفنون میں کامل ہونے کے ساتھ ساتھ اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کا مجسم پیکر تھے، ان کی جامعیت فضل وکمال کا اعتراف اکابر علما نے اس طرح کیا ہے۔

☆ **ابن عماد حنبلی:**۔ ''وکان اماما كثيرا لعلم كبير القدر وافر الحرمة كامل العقل خير النفس كثير العبادة والعقل' 'وہ (یحیٰ) کثیر العلم عظیم المرتبت اور نہایت ہی محترم وموقر امام تھے، ان کی عقل کامل تھی، نفس بہت نیک اور

اچھا تھا، زیادہ عبادت کرنے والے تھے۔ (شذرات الذہب ج ۲ ص ۴۱)

☆**احمد بن حنبل:۔** ”**لم يعط احد من اهل العلم بالاندلس منذ دخلها الاسلام من الخطوة وعظم القدر وجلالة الذكر ماأعطيه يحيىٰ بن يحيىٰ**“ ’جب سے اندلس میں اسلام داخل ہوا یہاں کے علما میں سے کسی کو وہ جاہ وجلال اور عظمت وبرتری حاصل نہیں ہوئی، جتنی یحییٰ بن یحییٰ (مصمودی) کو حاصل ہوئی۔

☆**ابن بشوال:۔** ”**كان يحيىٰ بن يحيىٰ مجاب الدعوة وكان قد اخذ في نفسه وهيئته ومقعده هيئة مالك**“ ’یحییٰ بن یحییٰ مستجاب الدعوات تھے، وہ وضع قطع اور نشست وبرخاست کے طور طریق میں بالکل امام مالک معلوم ہوتے تھے۔ (ایضا)

☆**ابوولید ابن قرضی:۔** ”**كان امام وقته وواحد بلده**“ ’حضرت یحییٰ امام وقت اور اپنے ملک کے یکتائے زمن تھے۔ (تہذیب ج ۱۱ ص ۲۶۳)

☆**ابن راہویہ:۔** ”**ما رايت مثل يحيىٰ بن يحيىٰ ولا اظنه راى مثل نفسه**“ ’میں نے یحییٰ بن یحییٰ جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا اور میرا خیال ہے کہ خود انہوں نے بھی اپنے جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا ہوگا۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۴)

حدیث

امام یحییٰ کی کلاہ افتخار کا سب سے تابناک جوہر ان کی محدثانہ عظمت تھی، انہوں نے امام مالک اور دوسرے اکابر محدثین سے حدیث کا سماع کیا تھا، جس کی بنیاد پر امام مالک کے اصحاب میں جو عظمت انہیں حاصل ہوئی، وہ کسی کے نصیب میں نہ آئی، ان کی کثرت حدیث اور علوم حدیث میں مہارت کا اعتراف ائمہ فن نے اس طرح کیا ہے:

☆**اسحاق بن راہویہ:۔** ”**ظهر ليحيىٰ بن يحيىٰ نيف وعشرون الف حديث**“ ’امام یحییٰ کی بیان کردہ حدیثیں بیس ہزار سے زیادہ منظر عام پر آئی ہیں۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۴)

☆**حاکم:۔** ”**هو امام عصره بلا مدافعة**“ ’آپ یحییٰ بلانزاع (حدیث میں) اپنے وقت کے امام ہیں۔ (ایضا)

☆**ذہلی:۔** ”**لو اشاء لقلت هو راس المحدثين في الصدق**“ ’میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں وہ صداقت وامانت میں محدثین کے سردار ہیں۔ (ایضا)

☆**حافظ ذہبی:۔** ”**يحيىٰ بن يحيىٰ الامام الحافظ شيخ خراسان**“ ’امام یحییٰ بن یحییٰ نامور حافظ حدیث اور شیخ خراسان ہیں۔ (ایضا)

یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کو ملک اسپین (مغرب) میں وہی علمی عظمت حاصل تھی، جو مشرق میں قاضی ابو یوسف کو حاصل تھی، مشرق میں حنفی قضاۃ کا تقرر قاضی ابو یوسف کے مشورہ سے ہوتا تھا اور اندلس میں فقہائے مالکیہ حضرت یحییٰ کی نشاندہی پر منصب قضا کے لیے منتخب کیے جاتے تھے، جس کی صراحت ابن حزم اندلسی نے ان الفاظ میں کی ہے:

مذهبان انتشرا فی مبدأ امرهما بالرياسة والسلطان مذهب ابی حنيفة فانه لما ولی قضاء ابويوسف يعقوب صاحب ابی حنيفة كانت القضاة من قبله فكان لايولی قضاء البلدان من اقصی المشرق الی اقصی افريقيا الا اصحابه والمنتمين اليه والی مذهبه ومذهب مالك بن انس عندنا فی بلاد اندلس فان يحيیٰ بن يحيیٰ كان مكينا عندالسلطان مقبول القول فی القضاة فكان لايلی قاض فی اقطار بلادالاندلس الا بمشورته واختياره ولايشيرالا باصحابه ومن كان علی مذهبه ۔(وفيات الاعيان ج۳ص۲۷۵)

ریاست وسلطنت کی بنیاد پر دو مذہب آغاز امر ہی میں پھیل گئے نمبر (۱) امام ابوحنیفہ کا مذہب، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسف یعقوب جب قاضی القضاۃ بنائے گئے تو وہی قاضیوں کو مقرر کرتے جو بلاد مشرق سے لیکر افریقہ تک حنفی فقہا ہی کو قاضی بناتے (جس کی بدولت فقہی حنفی کی اشاعت ہوتی) (۲) امام مالک کا مذہب اندلس میں اشاعت پذیر ہوا اس لیے کہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی (تلمیذ امام مالک) اندلس کے اندر بادشاہ کے نزدیک بڑی شان وعظمت کے حامل تھے قضاۃ کی تقرری میں سلطان آپ ہی کی بات کو۔۔۔ سمجھتا اور بلاد اندلس میں قاضیوں کا تقرر آپ ہی کے مشورہ اور اختیار سے ہوتا اس سلسلے میں یحییٰ اپنے ہم مذہب فقہا کی تقرری کا مشورہ دیتے۔

فقہائے اندلس میں آپ کو اتنا بلند مقام حاصل تھا، کہ آپ کے خلاف لوگ لب کشائی کی جرأت نہیں کرتے تھے، اندلس کے بادشاہ عبدالرحمٰن بن حکم نے ماہ رمضان میں اپنی کنیز پر نظر ڈالی، اس کی محبت غالب آئی اور وہ اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکا، صحبت کا مرتکب ہو گیا بعد میں ندامت ہوئی تو فقہا کو حکم شرعی دریافت کرنے کے لیے طلب کیا جماعت فقہا میں یحییٰ بن یحییٰ بھی تھے، انہوں نے مسئلہ سن کر حکم دیا ’’**يكفر ذلك بصوم شهر متتابعين** ‘‘ کفارے میں دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے جائیں، جب یحییٰ نے فتویٰ دیا، تمام فقہا خاموش رہے جب بادشاہ کے دربار سے نکلے، انہوں نے عرض کیا، اے یحییٰ آپ نے امام مالک کے مذہب پر فتویٰ کیوں نہیں دیا؟ کیوں کہ وہ اس صورت میں عتق، اطعام اور صیام تینوں میں اختیار دیتے ہیں، تو یحییٰ نے فرمایا اگر ان بادشاہوں پر یہ دروازہ کھول دیا جائے تو ان کے لیے آسان ہو جائے گا کہ روزانہ کسی باندی سے روزے کی حالت میں وطی کر بیٹھیں گے اور غلام آزاد کر دیں گے، اس بنا پر میں نے اس کے لیے سخت حکم تجویز کیا تا کہ اس کے لیے آئندہ وطی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ (ایضا)

مؤطا امام مالک (نسخہ مصمودی) امام مالک کے سیکڑوں تلامذہ نے مؤطا کی نقل وروایت کی، مگر مؤطا کے قابل ذکر سولہ نسخے علمی دنیا میں متداول ومشہور ہوئے، جنمیں امام محمد بن حسن شیبانی کی مؤطا اور یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کا نسخہ کئی زاویوں سے دوسرے نسخوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

مصمودی کی مؤطا کو امام محمد کی مؤطا پر اس لیے فوقیت حاصل ہے، کہ انہوں نے مؤطا کی سماعت امام مالک کی زندگی کے آخری سال میں کی اور مؤطا کی تمام وکمال مرویات کو اپنی کتاب میں محفوظ کرلیا، اس طرح امام مصمودی کی مؤطا ہی پر مؤطا امام مالک کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس طرح امام مصمودی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ مؤطا امام مالک کی نقل وروایت ہے، اگرچہ بعض لوگوں نے مؤطا امام محمد کو مصمودی کی مؤطا پر فوقیت دی ہے، مگر دونوں کتابیں اپنی جداگانہ خصوصیات کی وجہ سے کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

محدث زاہد الکوثری لکھتے ہیں:

اس دور میں مؤطا کی مشہور ترین روایت اہل مشرق میں امام محمد بن حسن کی روایت ہے اور اہل مغرب میں یحییٰ اللیثی کی روایت۔ پہلی روایت کا امتیاز یہ ہے، کہ اس میں اہل عراق نے مؤطا میں مدونہ جن احادیث اہل حجاز کو لیا ہے اور جن کو دوسرے دلائل کی بنا پر جو امام محمد اپنی مؤطا میں لائے ہیں نہیں لیا ہے، ان کا بیان ہے اور یہ چیز ان لوگوں کے لیے نہایت مفید ہے، جو اہل مدینہ اور اہل عراق کے اجتہادی مسائل اور فریقین کے دلائل کا باہم موازنہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری روایت مؤطا کی تمام روایتوں میں اس حیثیت سے ممتاز ہے، کہ وہ تین ہزار کے قریب امام مالک کے ان اجتہادی مسائل پر مشتمل ہے، جن کا تعلق فقہ کے مختلف ابواب سے ہے اور یہ دونوں روایتیں دنیا کے کتب خانوں میں شرقاً وغرباً نہایت کثرت سے موجود ہیں۔

(مقالات الکوثری ص۷۹، ۸۰)

آج دنیا کے اندر مؤطا کا جو نسخہ موجود ہے وہ یحییٰ مصمودی کا روایت کردہ نسخہ ہے۔

شروح مؤطا

متعدد علما نے مؤطا کی شرحیں لکھی ہیں، ان میں سے مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں۔

(۱) حافظ ابو عمر بن عبد البر قرطبی متوفی ۴۶۳ھ آپ نے مؤطا کی دو شرحیں لکھی ہیں، ایک کا نام **التمهيد لما في المؤطا من المعاني والاسانيد** ہے، اس کو امام مالک کے شیوخ کے اسما کے مطابق بترتیب حروف تہجی مرتب کیا ہے۔ ایسی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی، ابن حزم کہتے ہیں، کہ فقہ الحدیث کے موضوع پر میرے علم میں اس جیسی کتاب اور کوئی نہیں اور اس سے بہتر کتاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ابن عبد البر کی دوسری شرح کا نام **كتاب الاستذكار في شرح مذاهب علماء الامصار** ہے، یہ مؤطا کی بہترین شرح ہے۔ ابن عبد البر بہت لائق مصنف تھے۔

(۲) جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ آپ کی شرح کا نام **كشف المغطى في شرح المؤطا** ہے، پھر موصوف نے اس کا اختصار **تنوير الحوالك** کے نام سے کیا ہے یہ کتاب مصر سے تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

(۳) محمد بن عبدالباقی زرقانی مصری مالکی متوفی ۱۰۱۴ھ ان کی شرح متوسط ہے اور تین جلدوں میں ہے۔

(۴) مولانا عبدالحی بن محمد لکھنوی ہندی ولادت ۱۲۶۴ھ آپ کی شرح کا نام **التعلیق الممجد علی مؤطا الامام محمد** ہے، یہ شرح ہندو پاک میں طبع ہو چکی ہے۔

(۵) مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی نے جن کا نام قطب الدین احمد بن عبدالرحیم ہے، مؤطا کی دو شرحیں تحریر کیں، آپ کا وصال ۱۱۷۶ھ ہے ایک شرح فارسی زبان میں لکھی اس کا نام **المصفی** ہے، یہ صرف احادیث و آثار کی شرح ہے، امام مالک کے اقوال اور بلاغات اس میں حذف کر دیے ہیں، اس شرح میں آپ نے مجتہدانہ انداز تحریر اختیار کیا ہے۔ دوسری شرح عربی میں ہے، اس کا نام **المسوی** ہے اس میں اختلاف مذاہب پر اکتفا کیا گیا ہے، کسی حد تک مشکل الفاظ کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۳۷۰، مفتاح السنۃ ص ۲۷، الانتقاء ص ۵)

(۶) ابوالولید سلیمان الباجی المتوفی ۴۷۴ھ انہوں نے مؤطا کی تین شرحیں لکھی ہیں:

(۱) **المنتقی** (۲) **الایماء** (۳) **الاستیفاء**۔

(۷) شیخ زین الدین عمر حلبی نے **الانتقاء** تصنیف کی۔ (ابن عبدالبر کی تمہید کا اختصار)

(۸) ابن ابی صفرہ نے **شرح مؤطا** تصنیف کی۔

(۹) القاضی ابوعبداللہ بن الحاج نے بھی **شرح مؤطا** لکھی۔

(۱۰) ابوالولید بن العود نے بھی **شرح مؤطا** لکھی۔

(۱۱) ابوالقاسم بن الجد الکاتب نے بھی **شرح مؤطا** لکھی۔

(۱۲) ابوالحسن الاشبیلی نے بھی **شرح مؤطا** لکھی۔

(۱۳) ابوعمر الطلیطلی نے بھی **شرح مؤطا** لکھی۔

(۱۴) قاضی ابوبکر بن العربی المغربی المتوفی ۵۴۶ھ نے القبس نام سے شرح لکھی ہے۔

(۱۵) ابومحمد عبداللہ بن محمد بطلیموسی المتوفی ۵۲۱ھ نے **المقتبس** نامی شرح تصنیف کی۔

(۱۶) ابوالولید بن صفار نے **الموعب** نام کی شرح لکھی۔

(۱۷) یحییٰ بن مزین نے **المستقصی** شرح مؤطا لکھی۔

(۱۸) محمد ابن زمنین نے **شرح القرب** تصنیف کی۔

(۱۹) ابوبکر بن سابق الصقلی نے **شرح المسالك** لکھی۔

(۲۰) قاضی محمد بن سلیمان بن خلیفہ نے **شرح مؤطا** نامی شرح تصنیف کی۔

(۲۱) سری زادہ حنفی مفتی مکہ نے **شرح مؤطا** لکھی۔ (مقدمہ مؤطا امام محمد از مولانا عبدالحی)

(۲۲) شیخ علی قاری حنفی نے بھی شرح مؤطا تصنیف کی۔ (ایضا)

(۲۳) شیخ الاسلام حنفی دہلوی ۱۲۱۵ھ نے "المجلی" نامی شرح مؤطا لکھی، جو نہایت محققانہ شرح ہے، خاص مصنف کا نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے، پہلے صفحہ پر "الفصل الکبیر" مادہ تاریخ درج ہے۔

مختصرات مؤطا

مندرجہ ذیل علمائے کرام نے مؤطا کو مختصر کیا اور اس کا خلاصہ لکھا۔

(۱) امام ابو سلیمان خطابی متوفی ۲۸۸ھ

(۲) امام ابو الولید الباجی متوفی ۴۷۴ھ

(۳) ابن رشیق القیروانی متوفی ۴۵۶ھ

(۴) ابن عبد البر متوفی ۴۶۳ھ ان کی کتاب کا نام الاقصی فی مسند الموطاو مرسلہ ہے

(۵) ابو القاسم عبد الرحمٰن الغافقی الجوہری المتوفی ۳۸۵ھ ان کی مختصر چھ سو چھیاسٹھ مسند احادیث پر مشتمل ہے۔ (الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱، کشف الظنون ج ۲ ص ۳۷۰)

* * *

فقہ واجتہاد

امام مالک جلیل القدر محدث اور مایہ ناز فقیہ ومجتہد تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں بے کراں قوت حفظ وضبط کے ساتھ ذہانت وطباعی، ملکہ، حقائق رسی اور قوت فقہ واجتہاد سے سرفراز فرمایا تھا۔ انہوں نے مدینہ منورہ کے عظیم فقہا سے یہ علم حاصل کیا تھا، تحصیل فقہ کے لیے حضرت ربیعہ رائی کی بارگاہ میں سب سے پہلے زانوے تلمذ تہہ کیا تھا، جن کے بارے میں امام صاحب خود کہا کرتے تھے:

ذهب حلاوة الفقه منذ مات ربيعة ۔ (تهذيب التهذيب ج۳ص ۲۳۴)

جب سے ربیعہ کی وفات ہوئی، علم فقہ کی چاشنی جاتی رہی۔

دوسرے شیخ حدیث وفقہ ابن شہاب زہری تھے، ان کے بارے میں مطرف بن عبداللہ امام صاحب کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

مادركت بالمدينة فقيها محدثا غير واحد فقلت من هو فقال ابن شهاب الزهری ۔

(طبقات ابن سعد ج۲ ص ۳۸۹)

میں نے ایک شخص کے علاوہ مدینہ میں کوئی فقیہ، محدث نہیں پایا، میں نے پوچھا وہ کون ہیں؟ کہا کہ ابن شہاب زہری۔

امام صاحب نے فطری ذہانت، ذوق علم اور فقہ کی بصیرت، اجتہادی قوت کی بدولت سترہ سال کی عمر میں ہی دینی علوم وفنون میں کمال پیدا کرلیا تھا۔ اسی زمانے میں مدینہ منورہ کی ایک نیک خاتون نے وفات پائی، جب غسل دینے والی عورت اسے غسل دینے لگی، تو اس نیک بخت مردہ عورت کی شرمگاہ پر ہاتھ رکھ کر یہ کہا، یہ فرج کس قدر زنا کار تھی، کہتے ہیں فوراً اس کا ہاتھ فرج پر اس طرح چپک گیا، کہ خود اس عورت اور دوسروں نے بھی ہاتھ جدا کرنے کی حتی المقدور سعی وکوشش کی، مگر فرج (شرمگاہ) سے اس کا ہاتھ جدا نہ ہوا، جب ہاتھ جدا کرنے کی ساری تدبیریں رائگاں گئیں تو لوگوں نے شہر مدینہ کے علما وفقہا کی بارگاہوں میں حاضر ہوکر مسئلے کا حل اور تدبیر دریافت کی، تمام علما وفقہا اس کے جواب سے عاجز رہے، جب امام دارالہجرت کی بارگاہ میں لوگ حاضر ہوئے اور اس پیچیدہ ومشکل مسئلہ کا حل پوچھا تو آپ نے اس راز کی حقیقت کو اپنے ذہن رسا اور کامل فہم

وبصیرت سے دریافت کر کے یہ فرمایا، کہ اس غسل دینے والی کو حد قذف (یعنی وہ سزا جو شریعت نے زنا کی تہمت لگانے والے کے لیے مقرر فرمائی ہے) جاری کی جائے۔ آپ کے ارشاد کے مطابق غسل دینے والی عورت کو اسی درے لگائے گئے تو ہاتھ فرج سے فوراً جدا ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد امام مالک کی امامت وریاست لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو گئی۔ (بستان المحدثین ص ۱۵)

اساتذہ اور شیوخ کی اجازت سے اسی عمر میں مسند افتا پر جلوہ افروز ہوئے۔ خود فرماتے ہیں:

ماافتیت حتی شهد لی سبعون انی اهل لذلك (تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۹۴)

جب تک ستر علمانے میرے بارے میں شہادت نہیں دے دی کہ میں افتا کا اہل ہوں میں نے فتویٰ نہیں دیا۔

امام صاحب اپنے بہت سے شیوخ واساتذہ کی زندگی ہی میں فتویٰ دینے لگے تھے۔ ایوب سختیانی کا بیان ہے، کہ میں حضرت نافع کی زندگی میں مدینہ گیا، اس وقت امام مالک کا حلقہ درس وافتا قائم تھا۔

ابن منذر کا بیان ہے کہ نافع اور زید بن اسلم کی زندگی ہی میں امام مالک فتویٰ دینے لگے تھے۔

مصعب کے بقول امام مالک کا حلقہ درس نافع کی زندگی ہی میں ان کے حلقہ درس سے بڑا تھا، فقہ واجتہاد میں آپ کی عبقری شان یہ تھی، کہ مرکز علم وفضل مدینہ منورہ میں لوگوں کا مرجع بن گئے تھے اور حکومت کی طرف سے انہیں فتویٰ دینے کی اجازت کا اعلان کیا جاتا تھا۔

ابن وہب کہتے ہیں، کہ میں نے ایک منادی کو سنا کہ وہ اعلان کر رہا تھا:

لا یفتی الناس الا مالك بن انس و ابن ابی ذئب (وفیات الاعیان ج ۲ ص ۳۰۰)

امام مالک اور ابن ابی ذئب کے علاوہ کوئی عالم لوگوں کو فتویٰ نہ دے۔

ان ہی کا بیان ہے، کہ میں نے ۱۴۰ھ میں حج کیا تو سنا کہ منادی کرنے والا کہہ رہا تھا، کہ مالک اور ابن ابی ذئب اور عبدالعزیز ماجشون کے علاوہ کوئی فتویٰ نہ دے۔ ظاہر ہے حج کے موقع پر پوری دنیائے اسلام کے علما، فقہا، محدثین عوام وخواص مکہ میں جمع ہوا کرتے تھے، مگر صرف متذکرہ بالا تین فقہا ہی کو مسائل شرعیہ بیان کرنے کا مجاز قرار دیا گیا۔ جس سے ان اشخاص کی فقہی عبقریت کا اظہار ہوتا ہے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی آپ کو تمام فقہا پر فوقیت دیتے تھے۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے:

وکان عبدالرحمن بن مهدی لایقدم علی مالك احدا ۔ (ج ا ص ۱۹۴)

عبدالرحمٰن بن مہدی امام مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔

امام مالک کی فقہی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے، کہ خود ان کے شیوخ ان سے فتویٰ پوچھنے آتے تھے۔ امام مالک کہتے ہیں:

قل رجل كنت اتعلم منه مامات حتى يجيئني ويستفتيني ۔ (وفیات الاعیان ج۲ ص۲۰۰)

میرے اساتذہ میں بہت کم لوگ ایسے ہیں، جنہوں نے مرنے سے پہلے میرے پاس آ کر مجھ سے فتویٰ نہ پوچھا ہو۔

امام صاحب فرماتے ہیں، ایک بار میں عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے پاس گیا، اس نے حرام وحلال سے متعلق چند سوالات پوچھے، آخر میں کہا، واللہ آپ کا علم اور آپ کی عقل سب لوگوں سے زیادہ ہے، میں نے کہا، امیرالمومنین بخدا ایسا نہیں ہے، بولا کیوں نہیں ایسا ہی ہے، آپ اپنی قابلیت کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں:

لئن بقيت لاكتبن قولك كما يكتب المصاحف ولابعثن به الى الآفاق فاحملهم عليه ۔

(تذکرۃ ج۱ ص۱۹۵)

میں اگر زندہ رہا، تو آپ کی فقہ کو قرآن حکیم کی طرح لکھوا کر اطراف میں بھیجوں گا اور اس کے مطابق عمل کرنا لوگوں پر واجب کر دوں گا۔

اگرچہ حکومت وقت نے امام مالک کو مستند فقیہ تسلیم کر لیا تھا اور مدینہ میں ان کے علاوہ کسی اور کو فتویٰ دینے کی اجازت نہ تھی اور موسم حج میں جب مصر وشام، ایران وعراق اور عرب کے تمام بلاد وامصار سے عوام وخواص کے ساتھ فقہائے اسلام بھی تشریف لاتے تو امام مالک، ابن ابی ذئب اور ماجشون کے علاوہ کسی کو حکم شرعی بیان کرنے کی اجازت نہ ہوتی۔ حکومت وقت کی حق شناسی اور عزت افزائی کے باوجود امام مالک حکومت کی منشا کے خلاف اپنی حریت رائے اور اعلان حق وصداقت میں ذرا بھی تامل نہ کرتے اور حکومت کے جبر وتشدد کی ہرگز پروا نہ کرتے۔

اگر کوئی شخص زبردستی مجبور کیا جائے، کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے اور اس نے خوف زدہ ہو کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی، تو امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی، لیکن امام مالک اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں، کہ طلاق واقع نہ ہوگی (حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے **لاطلاق ولاعتاق فی اغلاق** یعنی حالت جبر واکراہ میں طلاق وعتاق نہیں)

والی مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے امام صاحب کو حکم دیا، کہ وہ یہ فتوئی نہ دیں، لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لیے کوڑوں کی سزا تک گوارہ کی۔

فتویٰ دینے میں احتیاط

امام صاحب اگرچہ فقہ میں درجہ اجتہاد پر فائز تھے، مگر فقہی استفسارات کے جواب میں حد درجہ احتیاط سے کام لیتے، وہ کہا کرتے میرے لیے یہ امر انتہائی گراں بار ہے، کہ مجھ سے حلال وحرام کے بارے میں سوال کیا جائے، میں نے اپنے شہر مدینہ میں ایسے علما وفقہا کو دیکھا ہے، کہ جن کے نزدیک موت فتویٰ دینے سے بہتر تھی، اور اب میں اپنے زمانہ والوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ فقہ وفتویٰ کے بارے میں خواہش ظاہر کرتے ہیں، اگر ان کو یقین ہو جائے، کہ کل اس کا انجام کیا ہوگا تو اس سے باز

آجائیں، حضرت عمر اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما خیار صحابہ میں سے تھے ان کے سامنے سائل آتے تو صحابہ کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کے بعد فتویٰ دیا کرتے تھے اور ہمارے زمانہ والوں کے لیے فتویٰ دینا فخر کا سبب ہے، اسی لیے ان کو اس کے مطابق علم دیا جاتا ہے اور وہ حقیقی علم سے محروم رہتے ہیں، ہمارے اسلاف کا یہ طریقہ نہیں تھا، کہ وہ کہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام بلکہ وہ کہتے تھے، میں اس بات کو مکروہ سمجھتا ہوں اور اس بات کو پسند کرتا ہوں کیوں کہ حلال وحرام وہ چیزیں ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے حلال وحرام بتایا۔ (ترتیب المدارک ج ۱ ص ۱۴۵)

امام صاحب جن فقہی مسائل میں تحقیق تک نہ پہنچ جاتے ان کے بارے میں اگر سوال کیا جاتا تو نہایت متانت اور کشادہ پیشانی کے ساتھ ’’لا ادری‘‘ فرماتے۔ امام کے شاگرد ابن وہب کہتے ہیں، کہ اگر میں امام مالک کی ’’لا ادری‘‘ لکھا کرتا تو کتنی تختیاں بھر جاتیں۔ (تزئین الممالک ص ۱۴)

خالد بن خراش کا بیان ہے، کہ میں نے امام صاحب سے چالیس مسائل معلوم کیے، تو صرف پانچ کا جواب دیا۔

ہشیم بن جبیل کہتے ہیں کہ میرے سامنے امام صاحب سے اڑتالیس مسائل دریافت کیے گئے تو تینتیس میں کہا، کہ ’’لا ادری‘‘ میں نہیں جانتا ہوں۔ عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں، کہ ہم لوگ امام صاحب کے یہاں تھے، ایک شخص نے آ کر کہا، کہ عبداللہ! میں چھ ماہ کی مسافت طے کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں میرے شہر والوں نے چند مسائل دریافت کرنے کے لیے مجھے خاص طور سے آپ کے پاس بھیجا اس کے بعد اس نے مطلوبہ مسائل دریافت کیے، امام صاحب نے سن کر کہا، کہ ’’لا احسن‘‘ یعنی ان کے بارے میں تحقیق نہیں ہے، یہ جملہ سن کر وہ آدمی سخت حیرت میں پڑ گیا اور بولا، کہ میں اپنے شہر والوں کو کیا جواب دوں گا؟ امام صاحب نے کہا، کہ تم ان سے کہنا کہ مالک نے کہا، کہ وہ ان کے متعلق تحقیق نہیں رکھتے ہیں۔

(تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۱۸)

امام صاحب فرماتے ہیں کہ اکثر وبیشتر میں ایک مسئلہ کی تحقیق کے لیے پوری رات جاگتا ہوں اور ایک مسئلہ میں دس سال سے غور کر رہا ہوں، مگر آج تک صحیح فیصلہ نہیں کر سکا۔ (ترتیب المدارک ج ۱ ص ۱۴۴)

ابن ابی اویس کہتے ہیں، کہ ایک بار امام صاحب نے فرمایا، کہ کبھی کبھی ایسا مسئلہ پیش آ جاتا ہے، کہ خواب حرام ہو جاتا ہے، ابن ابی اویس نے کہا آپ کی بات تو لوگوں کو نقش فی الحجر کی طرح تسلیم ہوتی ہے، پھر آپ یہ کیوں مشقت برداشت کرتے ہیں، امام صاحب جواب دیتے ہیں، کہ ابن ابی اویس اس حال میں تو مجھ کو اور کاوش کرنی چاہیے۔ (الرواوی عن عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز العمری ص ۳۱)

اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہوتی اور کوئی اصلاح کر دیتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے، ایک شخص نے پوچھا، کہ کیا وضو میں پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرنا چاہیے؟ امام نے فرمایا ’’**لیس ذلک علی الناس**‘ ابن وہب امام کے شاگرد بیٹھے تھے، مجلس کے بعد انہوں نے کہا، کہ تخلیل کی ایک حدیث میرے پاس ہے، امام نے سن کر کہا، ’’**حدیث حسن**‘‘ پھر اس کے بعد ہمیشہ فتویٰ اس کے موافق دیا۔ (الرواوی عن ابن ابی وہب ص ۳۷)

نفاذ فقہ مالکی میں احتیاط

عہد بنو امیہ اور بنو عباس کے ابتدائی ادوار میں اسلامی بلاد و امصار کے لیے جو قاضی مسائل شرعیہ کے حل اور نزاعی مقدمات کے فیصلوں کے لیے مقرر کیے جاتے تھے، وہ قرآن و سنت، صحابہ اور تابعین کے اقوال اور اپنی فقہی بصیرت کی روشنی میں حکم شرعی بیان کیا کرتے تھے، جس کا اثر اور نتیجہ یہ ہوتا، کہ ایک ہی قسم کے مقدمے میں قاضیوں کے فیصلے مختلف ہو جاتے، اس طرح نزاع و خصومت کی صورت اور بھی نازک ہو جاتی، جس کی بنا پر خود خلفا، امرا اور دانشوروں کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ بات پیدا ہونے لگی تھی، کہ اگر ان نزاعی فیصلوں کے تدارک کی بروقت کوشش نہیں کی گئی، تو کہیں قانون اسلامی کا شیرازہ منتشر نہ ہو جائے اور بعد میں ان پر قابو پانا از بس دشوار ہو جائے، اس لیے ان کے ذہن و دماغ میں یہ خیال پوری قوت و شدت کے ساتھ ابھر رہا تھا، کہ ملت اسلامیہ کے لیے قرآن و سنت اور اجماع کے اصولوں پر ایک ایسا قانون وضع کر لیا جائے، جس کی روشنی میں نظام سلطنت بحسن و خوبی انجام پا سکے اور فیصلہ مقدمات کی اختلافی و نزاعی صورتوں کا انسداد ہو سکے اور چوں کہ یہ اہم کام حکومت وقت کی سرپرستی کے بغیر ممکن نہیں تھا، اس لیے خلیفہ منصور کے ایک رکن سلطنت ابن المقفع نے خلیفہ کے سامنے اپنی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا:

خلیفہ اہل علم کی ایک کونسل بنائے، جس میں ہر نقطہ نظر کے علما پیش آمدہ مسائل پر اپنا اپنا علم اور خیال پیش کریں، پھر خلیفہ خود ہر مسئلہ پر اپنا فیصلہ دے اور وہی قانون ہو اور اس اہم امر پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا تھا ”**واعمقها اثرا في حياة المسلمين**“ یعنی مسلمانوں کی زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالنے والا عنصر یہی اسلامی قانون ہے۔

خلیفہ منصور اس تجویز کو بروئے کار لانے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا، کیوں کہ اس مشورہ میں خلیفہ ہی کو آخری حکم کا درجہ دیا گیا تھا اور وہ اپنی علمی لیاقت اور پوزیشن سے مطمئن نہیں تھا اسے خوب اچھی طرح معلوم تھا، کہ منصب خلافت کے باوجود شرعی امور و احکام میں مسلمان اس کے فیصلوں کو حرف آخر سمجھ کر قبول نہ کریں گے، لیکن ابن المقفع کی اس رائے پر وہ ضرور قائم رہا، کہ اسلامی قانون مدون ہو جانا چاہیے اور اسے حدود خلافت میں نافذ بھی کر دیا جائے، اس کام کے لیے اس کی نظر امام دار الہجرت حضرت مالک بن انس پر پڑی، چنانچہ ۱۴۸ھ میں جب حج کے لیے حرمین شریفین پہنچا تو اس نے امام مالک سے خواہش کی، کہ اگر آپ اجازت دیں تو تمام مسلمانوں کو آپ کی فقہ پر جمع کر دیا جائے۔ ۱۶۳ھ میں دوبارہ حج کو گیا تو پھر درخواست کی:

اے ابو عبداللہ! آپ علم فقہ کو ہاتھ میں لیجیے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدون کر ڈالیے، عبداللہ بن عمر کے تشددات، عبداللہ بن عباس کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعود کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجیے جو خیر الامور اوسطها کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہ کے متفق علیہ مسائل کا مجموعہ ہو، اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی، تو ان شاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے اور اس کو تمام مملکت کے اندر جاری کر کے اعلان کر دیں گے، کہ کسی حال میں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ (ماہنامہ چراغ راہ قانون اسلامی نمبر ج۲ ص۴۹۰)

اگرچہ حضرت امام مالک پر یہ تحریک اثر انداز ہوئی اور اسی کے تحت انہوں نے موطا مرتب کرکے کسی حد تک اس اجتماعی ضرورت پوری ہو، مگر وہ اس پر کسی حال میں راضی نہ ہوئے کہ پوری مملکت کے لیے یہی واحد کتاب قانون قرار ہو جائے۔ منصور جو امام مالک کو "اعقل الناس واعلم الناس" مانتا تھا، اس کے اصرار کے جواب میں امام مالک نے عذر میں یہ دلیل دی کہ:

امیر المومنین! آپ ہرگز ہرگز ایسا نہ کیجیے۔ دیکھیے مسلمانوں کے پاس مختلف علما کے اقوال پہلے ہی سے پہنچ چکے ہیں، وہ حدیثیں سن چکے ہیں اور روایتیں روایت کر چکے ہیں اور ان کو اپنا دین بنا چکے ہیں۔ پس جس علاقے کے لوگوں نے جو مسلک اختیار کر لیے ہیں ان کو انہی کے حال پر چھوڑ دیجیے۔ (ایضاً)

کتنی خدا ترس اور محتاط تھی یہ، کہ دینیات علم کے دائرے میں جن احکام کو امام نے اپنی جگہ تحقیق کر کے صحیح سمجھ کر موطا میں جمع کیا تھا، ان کا بزور اقتدار مختلف الخیال لوگوں پر ٹھونسا جانا پسند نہ کیا۔ انہوں نے فقہ و قانون کے دائرے میں ہر ایک کے لیے اختلاف کا حق باقی رکھنا چاہا۔ پھر یہ دیکھیے کہ کتنے بڑے اعزاز اور مفاد کو رضائے الٰہی کے لیے ٹھکرا دیا۔ وہ تقریر اور وہ علم کیا ہوا جس کا سکہ جبر و قہر سے چلے اور جو محض اپنی لیاقت و قابلیت کے زور سے دلوں کو مسخر نہ کرے۔ اور امام مالک کا علم اقتدار کی تائید کے بغیر دلوں کو مسخر کرتا چلا گیا اور موطا جسے شاہ ولی اللہ "اصح کتب الفقه واشهرها واقدمها واجمعها" (کتب فقہ میں سے صحیح ترین، مقدم ترین اور جامع ترین) قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "امروز هیچ کتاب از کتب فقه اقوی از موطا نیست" وہ قصیدہ سعدون کے اس شعر کا مصداق بن کے رہی۔

ودع للموطأ كل علم تريده
فإن الموطأ الشمس والعلم كوكب

دوسرے سارے علم کو موطا پر نثار کر دے، کیوں کہ دوسرے سارے علم ستارے ہیں اور موطا سورج ہے۔

منصور کے بعد مہدی نے بھی اس کوشش کو جاری رکھا، مگر آپ نے قبول نہ کیا۔

مہدی کے بعد ہارون نے پھر یہ مسئلہ اٹھایا اور امام مالک سے اجازت چاہی کہ موطا کو خانہ کعبہ پر آویزاں کر دیا جائے۔ اس نے امام مالک کے گھر جا کر تلامذہ کی صف میں بیٹھ کر موطا کا سماع کیا۔

یہ منازل تھیں جنہیں ہارون نے اس غایت سے سر کیا کہ حکومت کے ہاتھ میں مدینۃ الرسول کے مسلّم اور معتمد علیہ محدث و فقیہ کی مرتب کردہ کتاب قانون آ جائے۔ اقتدار کوچہ علم میں سر کے بل چل کر پہنچا، مگر امام اپنی سوچی سمجھی ہوئی دلیل کی بنا پر موطا کو اقتدار کے ہاتھ میں دینے پر تیار نہ ہوئے۔

* * *

فقہ مالکی کے اصول استنباط

حضرت امام مالک نے فقہائے سبعہ سے حدیث وفقہ کی تعلیم پائی پھر مشرق ومغرب سے آنے والے طالبان علوم کو احادیث رسول اور ان کی روشنی میں فقہ وفتاوی کی تعلیم دیتے رہے۔ اگر آپ کسی مسئلہ کا جواب حاصل کردہ احادیث میں نہ پاتے، تو اس کی شبیہ سے فتویٰ دیتے، اپنے علم میں اس کی شبیہ بھی نہ پاتے تو اجتہاد کرتے اور کتاب وسنت کی نص، مضمون، اشارہ اور مفہوم سے حکم کا استخراج کرتے۔ نصوص کا موازنہ فرماتے، سنت کا کتاب سے موازنہ کرتے، موافق نص نہ پاتے تو استنباط حکم میں قیاس کا سہارا لیتے، مصلحت پیش نظر ہوتی، تو ایسی مصلحت کے مطابق فتویٰ دیتے، جو شارع علیہ السلام کی نص کے مخالف نہ ہو۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، فتاوائے صحابہ، قیاس اور مصالح مرسلہ فقہ مالک کے اصل مآخذ ہیں

امام مالک نے جن اصولوں پر اپنے مذہب کی بنا رکھی اور جن کی بنیاد پر فروعی احکام کا استخراج کیا اور استنباط مسائل میں جن کا لحاظ رکھا ان کو مدون نہ فرمایا، مگر پھر بھی انہوں نے اپنے بعض فتاوے، مسائل، احادیث متصلہ، منقطعہ، مرسلہ اور بلاغات کی تدوین کا اشارہ فرمایا، اگرچہ اس کا طریقہ نہ بیان کیا، مثلاً موطا میں بیان کیا، کہ انہوں نے حدیث مرسل، حدیث منقطع اور بلاغات کو اخذ کیا ہے، لیکن اخذ کا طریقہ نہیں بیان کیا ہے، اس لیے کہ انہوں نے اسناد کے قابل بحث گوشوں میں کرید نہ کی اور اس لیے کہ وہ ثقہ راویوں ہی سے حدیث بیان کیا کرتے تھے، یہی وجہ ہے، کہ آپ کی کامل توجہ ایسے شخص کی طرف ہوتی تھی، جو بالمشافہ آپ سے حدیث بیان کرتا، ظاہر ہے، جب راوی اپنے نفس، عقل اور فقہ کے اعتبار سے ثقہ تھے تو سلسلہ سند میں بحث کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

امام مالک نے اہل مدینہ کے عمل کا طریقہ اخذ اور اس کے دواعی کو صراحتاً بیان کیا ہے، چنانچہ ان کی موطا اخذ بالقیاس پر مشتمل ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں، کہ حضرت امام مالک نے مفقود کی اس بیوی کو جس نے دوسرے سے نکاح کرلیا ہو اور مفقود دوبارہ اس کے پاس لوٹ آیا ہو اس عورت پر قیاس کیا ہے، جس کے شوہر نے اسے طلاق رجعی دی اور اس سے رجعت کرلیا، لیکن بیوی کو طلاق معلوم ہو رجعت کا علم نہ ہو اور اس نے اسی مشتبہ حالت میں دوسرا نکاح کرلیا ہو۔

یوں ہی موطا میں ایسی چیزیں ملیں گی، جو امام مالک کے اصول استنباط کی طرف مشیر ہیں، اگرچہ ان اصولوں کی توضیح وتوجیہ نہیں کی گئی ہے، مثلاً قیاس کی علت کے ضوابط اور اس کے مراتب وغیرہ بیان نہیں ہوئے ہیں۔

فقہاے مالکیہ نے فقہ مالکی سے متعلق وہی کام کیا، جو فقہاے حنفیہ نے فقہ حنفی کے سلسلے میں انجام دیا، چنانچہ انہوں نے فروع کی طرف اعتنا کرتے ہوئے اس کا تتبع کیا اور فروع کے ذریعہ ایسے امور متخرج کیے، جو فقہ مالکی کے استنباط کے صحیح اصول بن سکیں، انہوں نے ان اصول مستنبطہ کو اس طور پر مرتب کیا، کہ یہ امام مالک کے اصول ہیں مثلا کچھ ایسے اصول بنائے ”مالك ياخذ بمفهوم المخالفة“ ”مالك ياخذ بفحوى الخطاب“ ”مالك ياخذ بظاهر القرآن“ ”مالك يقول في العموم كذا و كذا“ حالاں کہ درحقیقت یہ اقوال امام مالک سے منقول نہیں ہیں، بلکہ یہ ان فروع سے متخرج ہیں، جو آپ سے منقول ہیں یا آپ کے بعد کے علماے مالکیہ نے جنہیں بیان کیا ہے، ان اصول سے ہٹ کر فقہ مالکی میں استدلال ممکن نہیں، یہی مذہب مالک کے اصول ہیں انہیں اپنانا ضروری ہے، کیوں کہ یہ علماے مالکیہ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں، اس بنیاد پر کہ یہ اصول امام مالک سے منقول نہیں رد نہیں کیے جا سکتے، ہاں وہ اصول جو امام مالک کے نا قابل تردید اقوال صریحہ ثابتہ منقولہ کے مخالف ہوں اور بعض ہی فروع پر منطبق ہوں اکثر پر منطبق نہ ہو سکیں ان کا ضرور رد کیا جائے گا اور یہ معاملہ ہر اس اصول کے ساتھ ہوگا جو کسی امام کی طرف منسوب ہو اور اس کے قول منقول کے مخالف ہو، ایسے اصول کتب مالکیہ اور تعلیقات علماے مالکیہ میں بکھرے پڑے ہیں، مالکیہ ہر قاعدہ کے تحت کہتے ہیں ”رای فيها مالك كذا“ ان کا یہ قول فروع مالکیہ کا حاصل ہوتا ہے۔ قرافی کی کتاب ”التنقیح“ کا مطالعہ کیجیے انہوں نے قاعدہ اور معا امام مالک کی جمہور کے موافق یا مخالف رائے ذکر کی ہے۔ ایسے ہی آرا کے مجموعے مذہب مالکی کے اصول کہلائے۔

قرافی نے ”تنقیح“ میں فقہ مالکی کے مندرجہ ذیل گیارہ اصول ذکر کیے ہیں۔

(۱) قرآن (۲) سنت (۳) اجماع (۴) اجماع اہل مدینہ (۵) قیاس (۶) قول صحابی (۷) مصلحت مرسلہ
(۸) عرف و عادات (۹) سد ذرائع (۱۰) استصحاب (۱۱) استحسان

ذیل میں اب ہم مذکورہ بالا اصول سے متعلق قدرے تفصیلی گفتگو کریں گے۔

کتاب

حضرت امام مالک کتاب اللہ کو دین کی اصل اور شریعت کا منبع قرار دیتے ہیں، وہ درپیش مسائل میں سب سے پہلے قرآن سے استنباط کرتے ہیں، امام مالک نے اپنے ہم عصر علما کی طرح قرآن کے لفظا و معنی ہونے یا صرف معنی ہونے یا اپنے مابعد لوگوں کی طرح اس کے مخلوق ہونے میں کوئی جدال نہیں کیا، وہ چاہتے تھے، کہ دین کے مسائل کو جدل کا اکھاڑا نہ بنایا جائے، ان کا اعتقاد تھا، کہ جس شخص نے قرآن میں کسی سے جدل کیا اس نے جبریل کے لائے ہوئے قرآن اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب میں عیب نکالا۔

حضرت امام مالک کا خیال تھا، کہ قرآن کلی طور پر شریعت پر مشتمل ہے، وہ حدیث رسول کو قرآن کی تفسیر و بیان قرار دیتے تھے، وہ کہتے تھے، قرآن کی تفسیر وہی بیان کرے، جو عربی زبان کا عالم، عرب کے مختلف لہجوں کا عارف، اور عربیوں کے اسالیب

کلام سے واقف ہو، وہ قرآن کی تفسیر میں اسرائیلی روایات کے داخل کرنے کو مکروہ جانتے تھے، اور اسرائیلی روایات بیان کرنے والے کی روایت کو معتمد نہیں مانتے تھے۔

ان کے نزدیک قرآن بلا جدل لفظ و معنی کا نام ہے، اسی وجہ سے انہوں نے نماز میں قرآن کے ترجمے کو جائز قرار نہیں دیا ہے اور نہ ترجمے کی سماعت پر سجدہ تلاوت کو واجب قرار دیا ہے، محض ترجمہ کو وہ قرآن کی تفسیر گمان کرتے ہیں۔

حضرت امام مالک قرآن کریم کی نص، ظاہر، مفہوم موافق، مفہوم مخالف سے استدلال کرتے ہیں اور استدلال میں نص کو ظاہر پر ظاہر کو مفہوم موافق پر مفہوم موافق کو مفہوم مخالف پر مقدم کرتے ہیں۔

سنت

حضرت امام مالک سنت رسول کو دوسرا مصدر شرعی قرار دیتے ہیں، جو چیز کتاب اللہ میں منصوص نہیں ہوتی ہے، یا کتاب اللہ میں جس امر کا اجمالی حکم مذکور ہوتا ہے، سنت رسول کو اس کے لیے حجت و بیان خیال کرتے ہیں، وہ قرآن کریم کے ظاہر کو ظاہر سنت پر ترجیح دیتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اس آیت کریمہ:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً (النحل آیت ٨)

کی وجہ سے گھوڑے کو حرام قرار دیا ہے، جب کہ بعض احادیث میں بصراحت اس کی حلت مذکور ہے۔ ہاں! اگر کوئی دوسرا امر بھی سنت کا موید ہو تو ایسی صورت میں ظاہر سنت کو ظاہر کتاب پر مقدم کرتے ہیں جیسے آیت کریمہ

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ (النساء آیت ٢٤)

سے ظاہر ہے کہ پھوپھی بھتیجی کو نکاح میں جمع کیا جا سکتا ہے، جب کہ صریح سنت میں پھوپھی بھتیجی کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت مذکور ہے، یہاں اجماع اس سنت کا موید ہے، کہ "جمع بين المرأة وعمتها" حرام ہے، لہٰذا امام مالک نے پھوپھی اور بھتیجی کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے۔

حضرت امام مالک قبول روایت میں بہت شدت برتتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کا سلسلہ اسناد قوی ترین سلسلہ اور بقول بعض محدثین "السلسلة الذهبية" یعنی سونے کی کڑی ہے۔ آپ فرماتے تھے، چار شخصوں سے علم نہ لیا جائے (١) بیوقوف (٢) ہوا پرست سے جو بدعتی ہو (٣) جھوٹے سے جو لوگوں کی باتوں میں جھوٹ گڑھتا ہے، اگرچہ حدیث رسول میں جھوٹ نہ بولے (٤) اور ایسے شیخ سے جو فضیلت، صلاح اور عبادت رکھتے ہوں، مگر یہ نہ جانیں کہ کون حدیث بیان کی جائے کون نہ بیان کی جائے۔

آپ کے اس قول سے ظاہر ہے، کہ رجال حدیث میں کون کون سی شرطیں پائی جانی چاہئیں، چنانچہ ان کے نزدیک عدالت شرط ہے، وہ غیر عادل سے حدیث قبول نہیں کرتے، مجہول سے حدیث قبول نہیں کرتے، احمق تقی سے حدیث قبول نہیں کرتے، ایسے عابد سے حدیث قبول نہیں کرتے جو امور کو صحیح میزان پر نہ تول سکے، ایسے فرقے کے لوگوں سے حدیث قبول نہیں

کرتے جو بدعتی ہو کیوں کہ ممکن ہے، کہ وہ رسول اللہ کی طرف کسی ایسی بات کو منسوب کر دیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کہی ہو، ایسے شخص سے حدیث قبول نہیں کرتے، جو حدیث کے معنی و مفہوم، غایت و مقصود سے واقف نہ ہو اور یہ نہ جانتا ہو کہ کیا روایت کرے کیا نہ کرے؟

فتاوائے صحابہ

حضرت امام مالک اپنے ابتدائی زمانہ تعلیم ہی سے صحابہ کرام کے قضایا، فتاوی اور ان مسائل کے احکام کی طرف راغب تھے، جن کا انہوں نے استنباط کیا تھا، خصوصاً حضرت عبداللہ بن عمر کے فتاوی کی تحصیل کا شوق حرص کی حد تک پہنچا ہوا تھا، چنانچہ دوپہر کی کڑی دھوپ میں ابن عمر کے شاگرد خاص حضرت نافع کی راہ تکتے تاکہ ان سے حضرت عبداللہ بن عمر کے اقوال معلوم کریں، اسی طرح حضرت عمر بن خطاب کے قضایا کی معرفت کے بھی حریص تھے، انہوں نے مدینہ کے فقہائے سبعہ کی فقہ حاصل کی، اپنے اخلاف کو حدیث رسول کے ساتھ صحابہ کرام کے اختلاف، معارف، فتاوے اور ان کے قضایا کی تعلیم دی، حیات مالک کے تتبع کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، کہ جس منہاج علم پر انہوں نے مسائل کا استخراج اور احکام کا استنباط کیا اس میں حدیث رسول کے ساتھ صحابہ کے اقضیہ و فتاوی بھی ہیں۔

حضرت امام مالک کی شہرۂ آفاق کتاب ''مؤطا'' کے مطالعہ سے آشکار ہوتا ہے، کہ آپ نے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کے فتاوی اور قضایا سے بھی اس کتاب کو مزین کیا ہے اور احادیث رسول کی طرح ان فتاوی کو دین کی اصل قرار دے کر قابل عمل بتایا ہے، ذیل میں دو مثالیں ملاحظہ ہوں!

(۱) ان عمر بن الخطاب قال فی رجل اسلف رجلا طعاما علی ان یعطیه ایاه فی بلد آخر فکره ذلك عمر بن الخطاب وقال فاین الحمل یعنی حملانه ۔

وتری من هذا ان مالکا منع ذلك النوع من الشروط اعتمادا علی فتویٰ عمر هذه ۔

مؤطا میں ہے مالک کے پاس خبر پہنچی کہ عمر بن خطاب نے مکروہ قرار دیا ہے، کہ کوئی شخص کسی کو اناج کے لیے اس شرط پر پیشگی رقم دے کہ بائع دوسرے شہر میں اس کو اناج سپرد کر دیگا حضرت عمر نے فرمایا کہ اس کی بار برداری کی اجرت کہاں ہے؟

امام مالک نے حضرت عمر کے اس فتویٰ پر اعتماد کرتے ہوئے اس شرط سے منع فرمایا ہے۔

(۲) مؤطا میں ہے مالک کے پاس خبر پہنچی، کہ ایک شخص عبداللہ بن عمر کے پاس آیا اور کہا اے ابوعبدالرحمٰن! میں نے ایک شخص کو قرض دیا اور یہ شرط لگائی کہ وہ اس سے افضل مجھے دے، تو عبداللہ بن عمر نے کہا، یہ ربا ہے تو اس نے کہا، اے ابوعبدالرحمٰن! آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ عبداللہ بن عمر نے کہا، قرض کی تین صورتیں ہیں (۱) وہ قرض جس کے ذریعہ تم اللہ کی خوشنودی چاہو، تو تمہارے لیے اس کی رضا ہے (۲) وہ قرض جس کے ذریعہ تم اپنے دوست کی خوشنودی چاہو (۳) وہ قرض

جس کے ذریعہ تم طیب کو خبیث کے بدلے لو، تو یہ ربا ہے۔ اس نے کہا، اب میرے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟ اے ابو عبدالرحمٰن! انہوں نے کہا، میرا خیال ہے، تم عہد نامہ چاک کر دو، اگر وہ تمہیں اسی کے مثل ادا کرے جیسا کہ تم نے پہلے اسے دیا تھا، یا اس سے حقیر دے تو اسے لے لو تمہیں اس کا اجر ملے گا اگر وہ بطیب خاطر اس سے افضل دے تو یہ شکریہ ہے، جو اس نے تیرے لیے ادا کیا اور تیرے لیے اس کا اجر ہے کہ تو نے انتظار کیا۔

امام مالک نے اس نظریہ پر عمل کیا اور فرمایا، کہ جس نے قرض میں اپنے عطیہ سے زیادہ یا اچھا ادا کرنے کی شرط لگائی، تو یہ قرض باطل ہے اور مقروض جو ادا کرے قرض دینے والا اسے لے لے اور بہتر یہ ہے کہ مدت مقررہ تک رکا رہے، مدت ختم ہونے کے بعد لے تا کہ شرط باطل ہو جائے۔

یوں تو ائمہ اربعہ فتاوائے صحابہ پر اعتماد رکھتے تھے، لیکن صحابہ کے فتاوی اور قضایا کو جو اہمیت امام مالک اور احمد بن حنبل دیتے تھے وہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک حاصل نہ تھی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل نے فتاوائے صحابہ کو اپنے اجتہاد کا رکن قرار دیا ہے اور ان پر اپنی فقہ کی تخریج کی ہے، انہوں نے کسی قید اور عدد وغیرہ کی شرط کے بغیر فتاوائے صحابہ کو قابل عمل سمجھا ہے، صحابہ میں اختلاف رائے کی صورت میں اکثر کی رائے پر عمل کیا ہے۔

امام مالک اقوال صحابہ کو مصدر فقہ، حجت اور سنت نبویہ کا ایک شعبہ مانتے تھے، یہی وجہ ہے کہ خبر آحاد کے مقابلہ میں قول صحابہ کو ترجیح دیتے اور خبر کو چھوڑ دیتے، چنانچہ اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں!

(۱) حالت احرام میں پچھنا لگوانے سے متعلق حضرت عبداللہ بن عمر کا قول ہے "ان المحرم لا یحتجم من غیر ضرورۃ" محرم بغیر ضرورت پچھنا نہ لگوائے، حضرت امام نے اس پر اعتماد کیا اور ابن عمر کے اس قول کو مندرجہ ذیل خبر واحد پر ترجیح دی:

امام شافعی کی کتاب "الام" میں ہے میں نے امام شافعی سے محرم کے لیے پچھنا لگوانے کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے کہا، وہ پچھنا لگوائے اور سر نہ منڈائے اور بغیر ضرورت کے پچھنا نہ لگوائے، میں نے کہا اس کی کیا دلیل ہے فرمایا، ہمیں مالک نے عن یحییٰ بن سعید عن سلمان بن یسار خبر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام میں پچھنا لگوایا تو میں نے کہا، کہ ہم تو کہتے ہیں، کہ پچھنا نہ لگوائے مگر جب کہ ضرورت ہو اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو امام مالک بھی یہی فرماتے ہیں۔

(الام ج ۷ ص ۱۹۶)

اس موقع پر امام مالک نے عبداللہ بن عمر کے قول کو لیا اور دوسری روایت ترک کر دی حالاں کہ خود اس کے راوی بھی حضرت مالک ہی ہیں، ایک روایت کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرنا اسی بنیاد پر ہے کہ ابن عمر کا قول ان کے نزدیک سنت ہے۔

(۲) دوران حج محرم کے لیے احرام کھولنے سے پہلے خوشبو لگانے سے متعلق حضرت امام مالک سند متصل سے روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو لگاتے تھے، لیکن انہوں نے اپنی اس خبر کے برخلاف اس کے مکروہ ہونے کا فتویٰ دیا

ہے اور اس سلسلے میں حضرت عمر کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے احرام کھولنے سے پہلے خوشبو لگانے سے منع فرمایا ہے، یہ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عمر سنت رسول کے سچے ناقل ہیں۔

یہاں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ امام مالک قول صحابی کو خبر رسول پر مطلقاً ترجیح دیتے تھے، بلکہ آپ کے پاس دو مختلف روایتیں آتیں تو ان میں سے اوثق واصدق کو لے لیتے اور دوسری کو رد کر دیتے تھے۔

اجماع

یوں تو ائمہ اربعہ نے اجماع کا اعتبار کیا ہے، لیکن امام مالک نے اس کا اعتبار دیگر ائمہ سے بڑھ چڑھ کر کیا ہے، وہ اجماع کے ذریعہ حجت پیش کرتے ہیں اور اس کے ذریعہ فتویٰ دینے کو سند قرار دیتے ہیں، آپ مؤطا کا مطالعہ کریں، تو بہت سی جگہوں پر نظر آئے گا، کہ امام مالک نے قضیہ سے متعلق حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے "**انہ الامر المجتمع علیہ**" یہ ایسا امر ہے، جس پر اجماع ہے۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) امام مالک نے مؤطا میں علاتی بھائی بہنوں کی میراث سے متعلق تحریر فرمایا:

الامر المجتمع عليه عندنا ان ميراث الاخوة للاب اذا لم يكن معهم احد من بني الاب والام كمنزلة الاخوة للاب والام سواء ذكرهم كذكرهم وانثاهم كانثاهم لايشركون مع بني الام في الفريضة التي شركهم فيها بنو الاب والام لانهم خرجوا من ولادة الام التي جمعت اولئك .

یعنی ہمارے نزدیک اجماعی امر ہے، کہ علاتی بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ حقیقی بھائی بہن میں سے کوئی نہ ہو، تو ان کی میراث کا مسئلہ حقیقی بھائی بہن کی طرح ہے، علاتی بھائی بہن، حقیقی بھائی بہن کی منزل میں ہوں گے، علاتی بھائی بہن اس حصے میں اخیافی بھائی بہن کے شریک نہ ہوں گے، جس میں حقیقی بھائی بہن اخیافی بھائی بہن کے شریک ہیں، اس لیے کہ علاتی بھائی بہن اس ماں کی ولادت سے خارج ہیں، جس میں وہ سب جمع ہیں۔ (مؤطا شرح زرقانی ج۲ ص۲۶۷)

(۲) مؤطا میں اس بیع سے متعلق جس میں جملہ عیوب سے براءت کی شرط لگائی گئی ہو، امام مالک لکھتے ہیں:

الامر المجتمع عليه عندنافي من باع عبدا اووليدة اوحيوانا بالبراء ة فقد برئ من كل عيب فيما باع الا ان يكون علم في ذلك فكتمه فان كان علم عيبا فكتمه ينفعه تبرأ ته وكان ماباع مردودا عليه .

ہمارے نزدیک یہ اجماعی امر ہے، کہ اگر کسی نے غلام، باندی یا کوئی جانور اس شرط کے ساتھ بیچا، کہ مبیع ہر عیب سے پاک ہے، تو وہ مبیع کے عیب سے بری ہو جائے گا، لیکن اگر اس نے عیب جانتے ہوئے، چھپایا تو کتمان

عیب براءت میں اس کے لیے مفید نہ ہوگا اور مبیع کو لوٹا دیا جائے گا۔ (مؤطا شرح زرقانی ج ۳ ص ۸)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے ظاہر ہے، کہ امام مالک اجماع سے دلیل پیش کرتے ہیں اور اس کی طرف ''المجتمع علیہ عندنا'' سے اشارہ کرتے ہیں، امام مالک کے اس قول کی مراد ترتیب المدارک ص ۳۴ میں اس طرح بیان کی گئی ہے ''وما كان فيه الامر المجتمع عليه فهو مااجتمع عليه قول اهل الفقه و العلم ولم يختلفوا فيه'' یعنی وہ مسئلہ جس میں امر مجتمع علیہ ہے وہ ہے، جس پر اہل علم وفقہ کا قول متفق ہے اور اس میں انہوں نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ شرح التنقیح میں اس تعلق سے مرقوم ہے، امر مجتمع علیہ اس امت کے اہل حل وعقد کا کسی امر میں متفق ہونا ہے، اتفاق سے ہماری مراد قول یا فعل یا اعتقاد میں اشتراک ہے اور اہل حل وعقد سے مراد احکام شرعیہ کے مجتہدین ہیں۔

مذکورۃ الصدر دونوں عبارتوں سے مفہوم ہوتا ہے، کہ اجماع اہل علم وفقہ اور مجتہدین کے اتفاق کا نام ہے، قرافی نے ''تنقیح الاصول'' میں اجماع کو عمل اہل مدینہ سے الگ مستقل حجت شمار کیا ہے، امام غزالی نے ''المستصفی'' میں فرمایا ہے، کہ اجماع اہل مدینہ کا اجماع ہے، شیخ علیش نے بھی اپنے فتاوی میں تصریح فرمائی ہے، کہ:

ان مالكا يعتبر اتفاق اهل المدينة اجماعا يكون حجة .

امام مالک اجماع اہل مدینہ کے اتفاق کو قرار دیتے ہیں۔

بہرکیف امام مالک نے اجماع کو حجت قرار دیا ہے اور ان مسائل میں جن میں قابل اعتماد نص نہ ملی یا ایسی نص ملی، جو محتاج تفسیر تھی یا آیت کا ظاہر احتمال وتخصیص کا قابل تھا، ان میں اجماع کو دلیل شرعی بنایا ہے۔

عمل اہل مدینہ

حضرت امام مالک اہل مدینہ کے عمل کو فقہی مصدر سمجھتے اور اپنے فتاوی میں ان پر کامل اعتماد کرتے، عمل اہل مدینہ امام مالک کی فقہ کا پانچواں اصول ہے، انہوں نے لیث بن سعد کے پاس ایک خط لکھا، جس میں انہیں اہل مدینہ کے عمل کی ترغیب دی اور اس کے ترک پر تنبیہ فرمائی، ذیل میں اس خط کا ایک حصہ ہم نقل کرتے ہیں، یہ خط تعامل اہل مدینہ پر ان کے اعتماد وواثق کا بین ثبوت ہے۔ لکھتے ہیں:

اللہ آپ پر رحم فرمائے معلوم ہو کہ مجھے خبر ملی ہے، کہ آپ لوگوں کو مختلف ایسے فتاوی دیتے ہیں، جو ہمارے نزدیک لوگوں کے مسلک کے خلاف اور جس شہر (مدینہ) میں ہم ہیں، اس کے عمل کے مخالف ہوتے ہیں، آپ اپنے شہر والوں میں امانت، فضیلت اور علوئے مرتبت رکھتے ہیں، وہ لوگ آپ کے محتاج ہیں، آپ کے قول پر انہیں اعتماد ہے، آپ کے لیے مناسب ہے، کہ اس کا اتباع کریں، جس کی پیروی میں نجات کی امید ہے، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز میں ارشاد فرماتا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ ۔ (التوبہ: ۹/۱۰۰)

اور فرماتا ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۔ (الزمر ۳۹/۱۸، ۱۷)

بے شک لوگ اہل مدینہ کی پیروی کرنے والے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی وہاں قرآن نازل ہوا وہیں پر حلال کو حلال اور حرام کو حرام کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان تشریف فرما ہوتے، وہ لوگ وحی وتنزیل کے دوران بارگاہ رسول میں حاضر رہتے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم انہیں حکم دیتے وہ حکم مانتے، شریعت کی باتیں بتاتے وہ اتباع کرتے، یہاں تک کہ سرکار پردہ فرما گئے اور اللہ کی رحمت وبرکت اور صلوۃ وسلام نے انہیں ڈھانپ لیا پھر آپ کے بعد آپ کی امت اپنے درپیش معاملہ میں نازل ہونے والی کتاب کی پیروی کرنے لگی لوگوں کو جو علم تھا، اس پر عمل کیا اور جو معلوم نہ ہوا اس کے بارے میں سوال کیا، پھر لوگوں نے جسے اپنے زمانے کے لیے مسائل میں اجتہاد میں اقوی پایا، اس کے قول کو اختیار کیا اگر کسی مخالف نے ان کی مخالفت کی یا اس سے اقوی واولی شخص نے کوئی بات کہی تو پہلے کے قول کو ترک کر دیا۔ (المدارک ص ۴۴)

امام مالک کے اس خط سے ظاہر ہے، کہ آپ اہل مدینہ کے قول کو لازم الاختیار سمجھتے تھے اور ان کے علاوہ کے قول کو جو ان کے قول وعمل کا مخالف ہوتا، ترک کر دیتے تھے، اس کی وجہ انہوں نے خود بیان کی، کہ وہ بارگاہ رسول کے حاضر باش، عہد رسول سے قریب، حیات رسول کے چشم دید اور سنت رسول سے واقف تھے، اس لیے وہ اسلام اور سنت رسول کریم کو زیادہ جانتے تھے، ان کے قول پر عمل سنت رسول پر عمل کا درجہ رکھتا ہے۔

حضرت امام مالک کا اعتماد عمل اہل مدینہ پر اس قدر بڑھا ہوا تھا، کہ بعض اوقات اہل مدینہ کے عمل کو خبر آحاد پر مقدم کرتے اور فرماتے یہی مشہور رائے اہل مدینہ کا معمول ہے اور یہی مشہور ومنقول سنت ہے۔ سنت مشہورہ خبر آحاد پر مقدم ہوتی ہے، یہ تنہا امام مالک کا مسلک نہ تھا، بلکہ آپ سے پہلے دوسرے چند علما اس منہج پر عمل کر چکے تھے، امام مالک کے استاذ حضرت ربیعہ رائی کہتے ہیں:

الف عن الف خير من واحد عن واحد ۔

ہزار کی ہزار سے روایت ایک کی ایک کی روایت سے بہتر ہے۔

امام مالک کا بیان ہے:

متعدد اہل علم اور تابعین ایسی حدیثیں بیان کرتے، جن سے ہم ناواقف ہوتے، لیکن عمل ان کے خلاف ہو رہا تھا، میں نے محمد بن ابوبکر عمرو بن حزم کو دیکھا، وہ قاضی تھے، ان کے بھائی عبداللہ کثیر الحدیث اور سچے مرد تھے، میں نے سنا، کہ جب محمد کسی ایسے قضیہ کا فیصلہ کرتے جس سے متعلق حدیث وارد ہوتی اور وہ حدیث ان کی قضا کی مخالف ہو جاتی، عبداللہ ان پر عتاب فرماتے اور کہتے کیا اس سلسلے میں یہ حدیث نہیں آئی ہے؟ محمد کہتے، کیوں نہیں عبداللہ کہتے تو پھر آپ اس کے ذریعہ فیصلہ کیوں نہیں فرماتے اس پر محمد کہتے:

فاین الناس عنه یعنی ان ماجمع علیه الصلحاء بالمدینة فالعمل به اقوی ۔

لوگوں کا کیا ہوگا، یعنی مدینہ کے صلحانے جس پر اتفاق کرلیا ہے، اس پر عمل اقوی ہے۔

معلوم ہوا، کہ خبر آحاد پر عمل اہل مدینہ کو ترجیح دینے کا مسلک امام مالک کا ایجاد کردہ نہیں ہے، بلکہ آپ سے پہلے اہل علم اور تابعین بھی اس مسلک پر عمل پیرا ہو چکے ہیں، لیکن چوں کہ اوروں کی بہ نسبت امام مالک نے عمل اہل مدینہ پر اعتماد زیادہ کیا ہے اور اسے اپنے فتاوی میں بکثرت بطور حجت پیش کیا ہے اور آپ کے بعض فتاوی خبر واحد کے خلاف مدون ہیں، اس لیے لوگوں نے آپ کو احتجاج بعمل اہل مدینہ کا موجد خیال کرلیا ہے، حالاں کہ آپ اس میں متبع ہیں۔

قیاس

حضرت امام مالک پچاس سال سے زائد عرصہ تک افتا میں مشغول رہے، زمین کے مشرق سے مغرب تک حاجت مند استفتا کے لیے آپ کی بارگاہ کا قصد کرتے، دن بدن ختم نہ ہونے والے نت نئے مسائل رونما ہوتے، ایسی صورت میں ضرورت تھی، فہم نصوص اور ان کے معانی قریبہ و بعیدہ کی معرفت کی، تاکہ ایسے مسائل جن کا حل ظاہر نص، سنت مشہورہ اور فتاوائے صحابہ میں موجود نہ ہو ان کا شرعی حکم معلوم ہوسکے، چنانچہ اس مقصد خیر کے لیے امام مالک جیسے فقیہ کے لیے ضروری ہوگیا، کہ قیاس کا سہارا لیں۔

قیاس فقہ اسلامی میں کسی ایسے امر کو جس کا حکم منصوص نہ ہو کسی علت جامعہ مشترکہ کی وجہ سے دوسرے ایسے امر کے ساتھ لاحق کرنے کا نام ہے، جس کا حکم منصوص ہو ان دونوں امروں میں تماثل کی وجہ سے ایک کے حکم کی معرفت دوسرے کے حکم کی معرفت کو لازم کرتی ہے۔

قیاس کی تعلیم خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، چنانچہ مروی ہے، کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رسول میں عرض کی، یارسول اللہ! میں ایک بڑا کام کرگیا، میں نے روزے کی حالت میں بوسہ لے لیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، تمہارا کیا خیال ہے، اگر تم نے بحالت روزہ پانی سے کلی کرلی، حضرت عمر نے عرض کی، میں اس میں کوئی حرج نہیں جانتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”فصُمْ“ تو تم روزہ پورا کرلو۔ (مالک ص ۲۹۴)

دیکھا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کی حالت میں کلی کرنے اور بوسہ لینے کے درمیان ربط بیان کیا اور دونوں کی مماثلت پر تنبیہ فرما کر دونوں کے حکم کو مساوی قرار دیا، کہ جس طرح محض کلی سے روزہ نہیں جاتا، محض بوسہ سے بھی روزہ نہ ٹوٹے گا۔

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جن مسائل کو نصوص ظاہرہ میں نہ پایا، استخراج احکام کے لیے انہیں بعض دوسرے نصوص پر اشیائے متماثلہ کے اندر حکم میں تساوی کی وجہ سے محمول کیا، چنانچہ علامہ مزنی لکھتے ہیں:

الفقهاء من عصر رسول الله صلی الله علیه وسلم الی یومنا استعملوا المقایس فی جمیع

الاحکام فی امر دینهم واجمعوا علی ان نظیر الحق حق ونظیر الباطل باطل فلایجوز لاحدِ انکار القیاس لانه تشبیه بالامور والتمثیل علیها ۔ (مالك ص۲۹۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اب تک فقہا نے دینی معاملات کے اندر تمام احکام میں قیاس کا استعمال کیا ہے اور اس بات پر اتفاق کیا ہے، کہ حق کی نظیر حق اور باطل کی نظیر باطل ہے، لہٰذا کسی کے لیے قیاس سے انکار جائز نہ ہوگا کیوں کہ قیاس امور کی تشبیہ اور ان کی تمثیل ہے۔

امام مالک اس مسلک صحابہ کے راہ رو تھے، علت پائے جانے میں اشیا کے تماثل کے وقت حکم میں ان کے درمیان تساوی کو اختیار کرتے، مالکیوں نے اتفاق کیا ہے، کہ آپ قیاس کا سہارا لیتے تھے، ہم دیکھتے ہیں، کہ بعض مسائل جن کے احکام فتاوائے صحابہ میں موجود ہیں ان پر آپ نے بعض دوسرے مسائل کو قیاس کیا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو!

حضرت امام مالک نے مفقود شوہر جس کی موت کا حکم لگا دیا گیا اور اس کی بیوی نے وفات کی عدت گزار کر دوسرے شخص سے شادی کر لی، پھر مفقود کا زندہ ہونا معلوم ہوگیا، تو اس کی بیوی کے حال کو اس عورت کے حال پر قیاس کیا ہے، جس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی اور اپنی بیوی کو طلاق کے بارے میں بتا دیا پھر رجعت کر لی اور رجعت کا علم بیوی کو نہ ہوا اور بیوی نے عدت گزارنے کے بعد دوسرے سے شادی کر لی، حضرت امام مالک نے مفقود کی بیوی کے حال کو مطلقہ پر اس لیے قیاس کیا کہ مطلقہ کے بارے میں حکم دیا ہے، کہ وہ دوسرے شوہر کی بیوی ہے، اگر چہ اس نے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو، علت جامعہ کی بنیاد پر امام مالک نے مفقود کی بیوی کو اس پر قیاس کر کے فرمایا، کہ وہ دوسرے شوہر کی بیوی ہے، اگر چہ اس نے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ (مؤطا ج۳ ص۵۷)

حضرت امام مالک کے مذکورہ بالا قیاس کی اساس دونوں کے حالوں کے درمیان مماثلت ہے، بایں طور کہ ان دونوں نے شرعی طریقے پر ثابت شرعی علم کی بنیاد پر حسن نیت کے ساتھ شادی کی، لیکن اس کے بعد اس کی خطا ظاہر ہوئی اور اس کے ظہور سے پہلے خطا کی معرفت کا کوئی طریقہ نہ تھا، مفقود کی بیوی نے حکم شرعی کی اساس پر شادی کی اور مطلقہ نے طلاق اور انتہائے عدت کی بنا پر شادی کی، مفقود کی بیوی کے لیے اس کی زندگی کی معرفت کا کوئی راستہ نہ تھا اور مطلقہ کے لیے رجعت کی معرفت کی کوئی راہ نہ تھی، اس طرح دونوں کے حال متماثل تھے، اس مماثلت کی وجہ سے دونوں پر حکم بھی ایک لگایا گیا۔

حضرت امام مالک تماثل پائے جانے پر قرآن وسنت میں منصوص احکام اور فتاوائے صحابہ، اجماع، عمل اہل مدینہ میں مذکور امور پر قیاس کر کے مسائل کا استنباط فرماتے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ قیاس کے ذریعہ مستنبط مسائل پر بھی قیاس کرتے تھے، چنانچہ ابن رشد لکھتے ہیں:

اذاعلم الحکم فی الفروع صار اصلا وجاز القیاس علیه بعلة اخری مستنبطة منه ایضا فثبت الحکم فیه فصار اصلا وجاز القیاس علیه الی مالا نهایة له ۔

جب حکم فروع میں معلوم ہوتو وہ اصل ہوگا اس پر اس سے مستنبط ہونے والی دوسری علت کی وجہ سے قیاس جائز ہوگا اور اس میں حکم ثابت ہوگا وہ بھی اصل ہوجائے گا اور اس پر بھی قیاس جائز ہوگا یہ سلسلہ لانہایہ تک جاری ہوگا۔ (المقدمات ج۱ص۲۲)

استحسان

استحسان ایسی دلیل شرعی کو کہتے ہیں، جو قیاس جلی کی مخالف ہوتی ہے، جس میں تعامل ناس اور لوگوں کے اجماع کی وجہ سے قیاس کو ترک کردیا جاتا ہے، اس کا مقصود لوگوں سے مضرت کو دور کرنا، دفع حرج اور پاس مصلحت ہے، اگر کوئی ایسا امر درپیش ہو، کہ شریعت سے اس کے جواز کا ثبوت نہ ملتا ہو اور عدم جواز کی صورت میں لوگوں کا نقصان اور مصلحت کا فقدان ہو تو ایسی صورت میں امام مالک قیاس کو چھوڑ کر استحسان پر فتویٰ دیتے ہیں، وہ فقیہ وقت اور امام دار الہجرت تھے، دین کی روح سے انہیں کامل واقفیت تھی، دین لوگوں کے دنیاوی واخروی مصالح کے پیش نظر آیا تھا، لہٰذا استحسان پر عمل اور قیاس کے ترک کو دین کا مغز اور فقہ دین کی اصل قرار دیتے تھے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۔(حج۸۷)

اور دین میں تم پر حرج نہیں رکھا۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۔(بقرہ۱۸۵)

اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں۔ رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ’’لاضرر ولا ضرار‘‘ نہ خود مشقت میں مبتلا ہو اور نہ دوسروں کو مشقت میں ڈالو۔

خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے فتاوی اور قضایا میں بھی استحسان کی مثال موجود ہے، چنانچہ مسئلہ ہے، کہ حقیقی بھائیوں کو تعصیب (عصبہ ہونے) کی بنیاد پر میراث ملتی ہے، اگر ورثہ میں تقسیم میراث کے بعد کچھ بھی نہ بچے، جو بطور عصبہ انہیں مل سکے، تو ایسی صورت میں حضرت عمر نے استحسان پر عمل کیا ہے۔ اس کی مثال ملاحظہ ہو!

میت نے شوہر، ماں، دو اخیافی بھائی اور دو حقیقی بھائی چھوڑے، تو قیاس کے مطابق اس صورت میں شوہر کو نصف، ماں کو سدس، اخیافی بھائیوں کو ثلث اور حقیقی بھائیوں کو کچھ بھی نہ ملے گا، حالاں کہ وہ بھی ماں کی اولاد ہیں، ماں کے ذریعہ میت کے قریبی رشتے دار ہیں، یہ ایک عجیب بات ہوتی، اگر انہیں میراث سے کچھ بھی نہ دیا جاتا اور اخیافی بھائیوں کو ثلث مل جاتا اسی وجہ سے حضرت عمر نے اولاد ام کا اعتبار کرکے اخیافی بھائیوں کے ثلث میں ان حقیقی بھائیوں کو بھی شریک کیا، حضرت عمر کے اس فتویٰ کی دلیل استحسان ہے۔ (مالک ص۲۰۳)

دین کی اسی روح کے اقتضا کے پیش نظر امام مالک استحسان پر فتویٰ دیتے تھے، آپ استحسان کو ’’تسعة اعشار العلم‘‘ سمجھتے تھے، چنانچہ شاطبی ’’الموافقات‘‘ میں اصبغ سے نقل کرتے ہیں، کہ انہوں نے کہا:

سمعت ابن القاسم يقول ويروى عن مالك انه قال تسعة اعشارا لعلم الاستحسان ۔ (الموافقات ج۴ ص ۱۱۸)

میں نے ابن قاسم کو فرماتے ہوئے سنا، کہ وہ حضرت مالک سے روایت کرتے ہیں، کہ انہوں نے فرمایا، علم کے دس حصوں میں سے نو حصے استحسان ہیں۔

ذیل میں ہم چند مسائل لکھتے ہیں، جن میں امام مالک نے استحسان پر فتویٰ دیا ہے:

(۱) قرض جو اصل میں ربا ہے، اس لیے کہ وہ مقررہ مدت تک درہم سے درہم کے مبادلے کا نام ہے، اسے امام مالک نے مباح قرار دیا ہے، اس لیے کہ اس کی اباحت ہی میں لوگوں کے لیے آسانی اور گنجائش ہے، اگر ربا کا اعتبار کر کے اس کی اصل ''منع'' پر باقی رکھتے تو لوگ حرج میں پڑ جاتے۔

(۲) لوگوں کے ستر کو دیکھنا حرام ہے، دوا علاج کے لیے دیکھنا امام مالک نے حلال قرار دیا ہے، کیوں کہ اگر حلت کا فتویٰ نہ دیا جاتا، بلکہ اصل قاعدے حرمت کا اعتبار کیا جاتا تو لوگوں کے لیے حرج لازم آتا، لہٰذا استحساناً اباحت کا فتویٰ دیا۔

(۳) قاعدہ شرعیہ ہے، کہ گواہ غیر عادل ہو تو اس کی گواہی قبول نہ کی جائے گی، لیکن امام مالک نے اس شہر میں جہاں کوئی عادل نہ پایا جاتا ہو استحسان پر عمل کرتے ہوئے شاہد غیر عادل کی گواہی قبول فرمانے کا حکم دیا ہے، کیوں کہ اگر اصل قاعدہ پر فتویٰ دیتے تو لوگوں کو مشقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ (مالک ص ۳۰۴، ۳۰۳)

استصحاب

کسی چیز کو اس کی پہلی حالت پر رکھنا اس کے خلاف دلیل نہ پائے جانے کی وجہ سے استصحاب کہلاتا ہے، بالفاظ دیگر ماضی میں کسی چیز کے جواز یا عدم جواز کے حکم کا بطور دوام و استمرار اس وقت تک باقی رہنا جب تک کہ اس کا حکم بدلنے والی کوئی دلیل نہ پائی جائے، جیسے اسباب ملکیت میں سے کسی سبب مثلاً بیع یا میراث وغیرہ کے ذریعے کسی کے لیے ملکیت ثابت ہو جائے تو یہ ثبوت ملکیت مستمر ہوگا حتیٰ کہ اس کو زائل کرنے والی کوئی دلیل قائم ہو جائے۔

حضرت امام مالک نے استصحاب کو فقہی استنباط کی ایک اصل اور حجت قرار دیا ہے اور متعدد مسائل میں استصحاب کو دلیل بنایا ہے، ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں!

(۱) کوئی شخص مفقود ہو گیا اور اب یہ نہیں معلوم کہ زندہ ہے یا مر گیا، تو ایسی صورت میں امام مالک فرماتے ہیں، کہ اسے اس وقت تک اس کی پہلی حالت ''حیات'' میں مانا جائے گا اور اسے زندوں کا حکم دیا جائے گا، جب تک کہ اس کی وفات پر کوئی دلیل نہ پائی جائے یا ایسی نشانیاں قائم ہو جائیں، جن کی بنیاد پر اس کے مرنے کا غالب ظن ہو جائے اور قاضی اس کی وفات کا حکم لگا دے، اس کے فقد (گم ہونا) اور موت کے حکم کے درمیانی عرصہ میں بھی اسے زندوں ہی کے حکم میں رکھا جائے گا، زندوں کے حکم میں رکھنے کا مطلب یہ ہے اس کے مورث کی میراث سے اسے حصہ دیا جائے گا اور اس کی جائداد اس کے ورثہ پر تقسیم نہ

ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

(۲) کسی نے شکار پر تیر چلایا، شکار پانی میں بھاگا، پھر اسے پانی میں ڈوبا ہوا پایا گیا، تو ایسی صورت میں امام مالک فرماتے ہیں، کہ یہ شکار حرام ہے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وان وجدته غریقا فلا تاکله فانك لاتدری الماء قتله ام سهمك ۔

اگر تم اسے ڈوبا ہوا پاؤ تو اسے نہ کھاؤ کیوں کہ تم نہیں جانتے کہ پانی نے اسے ہلاک کیا ہے یا تمہارے تیر نے۔ امام مالک فرماتے ہیں، کہ اصل ذبائح میں تحریم ہے اور یہاں شک ہے کہ مبیح (حلال کرنے والی) شرط پائی گئی یا نہیں لہٰذا اصل پر باقی رکھتے ہوئے جانور کو حرام گردانا جائے گا۔

(۳) کسی کو شک ہوا، کہ اسے حدث لاحق ہوا ہے یا نہیں؟ تو امام مالک فرماتے ہیں، کہ وہ اس وقت تک نماز نہ پڑھے جب تک کہ دوسرا وضو نہ کرلے کیوں کہ بقائے طہارت بھی یہاں پائی جاتی ہے اور بقائے ذمہ صلوۃ بھی، یہاں دوسری بقا کو ترجیح دیں گے، اس لیے کہ شک کی بنیاد پر اس کے لیے نماز نہ پڑھنا اولی ہے۔

مصالح مرسلہ

اسلامی قانون اور فقہ میں بندوں کی مصلحت کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہے، جس چیز میں منفعت نظر آئی، اسے جائز قرار دیا گیا اور جس میں مضرت پائی گئی، اس سے روک دیا گیا، یہی وجہ ہے، کہ آپ دیکھتے ہیں، کہ ایک ہی چیز کسی حالت میں مصلحت نہ ہونے کی وجہ سے ممنوع ہوتی ہے اور وہی شی دوسری صورت میں مصلحت کے پیش نظر جائز ومباح ہوتی ہے، چنانچہ اس کی زندہ مثال مقررہ مدت تک درہم کا درہم سے مبادلہ ہے، کہ اگر یہ بطور بیع وفروخت ہو تو ممنوع ہے اور اگر بطور قرض ہو تو جائز ہے۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے مصلحت کا ثبوت ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (البقرہ، ۱۷۹)

دوسرے مقام پر ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (مائدہ، ۹۱)

حدیث پاک میں ہے:

لایقضی القاضی وهو غضبان ۔

دوسری حدیث میں ہے:

کل مسکر حرام ۔

ایک اور حدیث میں مصلحت کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

القاتل لا یرث .

صحابہ کرام اور خلفاے راشدین بھی مصلحت کو دلیل شرعی سمجھتے تھے، چنانچہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد بہت سے ایسے امور انجام دیے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جن کا وجود نہ تھا، انہوں نے قرآن کریم کو مصحف میں جمع کردیا، جب کہ حضور کے زمانہ میں قرآن مصحف میں مکتوب نہ تھا، انہوں نے اس لیے ایسا کیا، کہ مصلحت قرآن کے جمع وتدوین کی مقتضی تھی، اگر قرآن کو جمع نہ کیا جاتا، تو خوف تھا، کہ حفاظ قرآن صحابہ کے مرنے کے بعد لوگ قرآن کو بھول جاتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً پانی ملا ہوا دودھ گرادیا تا کہ پانی ملانے والے کی تادیب ہو اور لوگ پانی نہ ملائیں وغیرہ وغیرہ۔

حضرت امام مالک نے صحابہ کے اسی مسلک پر چلتے ہوئے ''مصالح مرسلہ'' کو ایک مستقل دلیل شرعی اور دینی اصل قرار دیا ہے اور آپ کے متعدد فتاویٰ مصالح مرسلہ کی رعایت کے ساتھ صادر ہوئے ہیں، ذیل میں ہم دو مثالیں پیش کرتے ہیں:

(۱) حضرت امام مالک نے مفضول کی بیعت کو جائز قرار دیا ہے، مفضول وہ شخص ہے، جس سے بہتر شخص پائے جانے کے باوجود اس کو خلیفہ بنادیا گیا ہو، مفضول کی بیعت کے اس جواز میں مصلحت یہ ہے، کہ اگر اس کو باطل قرار دے دیا جائے تو بہت سے امور میں فساد اور خلل واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ دنیا میں لوگوں کے منافع کے غارت ہونے کا خوف ہے اور ایک بہت بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر ایسے شخص کی بیعت نہ کی جائے تو ایک ساعت میں ایسے مظالم رونما ہوجائیں کئی سالوں میں جو رونما نہ ہوسکیں۔

(۲) جب بیت المال خالی ہوجائے یا لشکر کی ضرورتیں درپیش ہوں اور بیت المال میں بقدر کفایت مال نہ ہو تو حضرت امام مالک نے بادشاہ اسلام کے لیے جائز قرار دیا ہے، کہ وہ مالداروں پر اتنا وظیفہ مقرر کرے، جسے وہ کافی خیال کرے، یہاں تک کہ بقدر کفایت مال جمع ہوجائے، بادشاہ کے لیے مناسب ہے، کہ یہ وظیفہ غلہ کٹنے اور پھلوں کے توڑنے کے زمانے میں وصول کرے تا کہ اغنیا کے دلوں میں یہ وحشت پیدا نہ ہو کہ وظیفہ کے لیے انہیں کیوں خاص کیا گیا۔ اس میں مصلحت یہ ہے، کہ اگر امام عادل ایسا نہ کرے تو اس کی شوکت باطل ہوجائے گی، اس کے دیار میں فتنوں کا بازار گرم ہوجائے گا اور دشمن اس پر استیلا کے لیے معرکہ آرائی پر تل جائے گا۔

سد ذرائع

ذرائع ذریعہ کی جمع ہے، جس کا معنی وسیلہ ہے، سد ذرائع کو امام مالک نے اپنے فقہی اصول میں شمار کیا ہے، اس کا مطلب دفع ذرائع ہے، لہٰذا جو چیز حرام کا وسیلہ ہے وہ حرام ہے، مثلاً زنا حرام ہے، اجنبی عورت کی شرمگاہ کو دیکھنا زنا کا ذریعہ ہے لہٰذا وہ بھی حرام ہے، اگرچہ امام مالک کا سد ذرائع پر بہ نسبت فتح ذرائع کے عمل زیادہ ہے، پھر بھی فتح ذرائع سد ذرائع ہی

کی طرح دلیل شرعی ہے، فتح ذرائع سے مراد جس کی طلب میں مصلحت ہو اسے مطلوب بنانا، لہٰذا واجب کا ذریعہ واجب ہوگا مثلاً جمعہ فرض ہے، تو اس کے لیے سعی فرض ہوگی، سعی کے لیے ترک بیع بھی فرض ہوگا۔

قرآن وحدیث سے ذرائع کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۔ (البقرہ ۱۰۴)

مسلمانوں کا قصد ان کے قول ''راعنا'' سے حسن تھا، لیکن یہود نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے کا ذریعہ بنالیا تھا، لہٰذا مسلمانوں کو اس سے روک دیا گیا۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''احتکار'' سے منع فرمایا، احتکار کا مطلب ہے، غلہ روک کر رکھنا تاکہ قیمت بڑھ جائے تو اسے فروخت کریں، احتکار سے اس لیے منع فرمایا، کہ یہ لوگوں پر تنگی کا ذریعہ اور ان کی ضروریات کو روکنے کا وسیلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جس احتکار میں مسلمانوں کا ضرر نہیں وہ درست ہے، مثلاً زینت وغیرہ کے سامان میں احتکار جائز ہے، کیوں کہ یہ ضروریات سے نہیں۔

حضرت امام مالک کی فقہ کے مطالعے سے آشکار ہوتا ہے، کہ انہوں نے بہت سے مسائل میں ذرائع کا بطور دلیل شرعی اعتبار کیا ہے اور ذرائع پر متعدد فتوے دیے ہیں، ذیل میں ہم دو مثالیں پیش کرتے ہیں:

(۱) کسی تاجر کا دوسرے شخص کے مقابلے میں اپنا سامان کم قیمت پر فروخت کرنا مباح ہے، مگر جب مقابل کے نقصان کی نیت ہو تو یہ عمل حرام ہے، کیوں کہ اس کا یہ فعل ذریعہ حرام ہوگا کہ اپنے دوسرے بھائی کو ضرر پہنچانا چاہتا ہے، اور مسلمان بھائی کو ضرر پہنچانا حرام ہے۔

(۲) کسی کو بطور رشوت مال دینا حرام ہے، لیکن اگر کسی کو اس نیت سے رشوت پر مال دے کہ وہ شخص جس معصیت کا ارادہ رکھتا ہے، اس کا مرتکب نہ ہو تو اس کا یہ فعل جائز ہے، کیوں کہ اس میں طلب مصلحت ہے اس لیے کہ معصیت کا ضرر بطور رشوت مال دینے کے ضرر سے شدید ہے۔

عادات وعرف

عرف ایسا امر ہے، جس پر لوگوں کی جماعت اپنی زندگی میں متفق رہی ہو، عادت وہ عمل جو افراد یا جماعتوں سے بتکرار صادر ہو کسی امر کی جب کوئی جماعت عادت بنالے تو وہ امر عرف ہو جاتا ہے، حضرت امام مالک نے عرف وعادت کو فقہی اصل قرار دیا ہے اور جس مسئلہ میں نص قطعی نہ ہو اس میں عرف وعادت کا بطور دلیل شرعی اعتبار کیا ہے، یوں تو مذہب حنفی میں بھی عرف وعادت معتبر ہے، لیکن اس سے کہیں زیادہ معتبر مذہب مالکی میں ہے کیونکہ فقہ مالکی نے استدلال کے لیے مصالح و ستون کی منزل میں رکھا ہے اور بلاشبہ ایسے عرف کی رعایت جس میں کوئی فساد نہ ہو ایک طرح کی مصلحت ہے، کسی فقیہ کے لیے مناسب نہیں کہ اسے ترک کرے بلکہ اس کو اختیار کرنا ضروری ہے، امام مالک نے تو عرف کو وہ درجہ دیا ہے کہ اگر قیاس

عرف کا مخالف ہو تو وہ عرف کو ترجیح دیتے ہیں۔

ذیل میں قرافی کی کتاب ''الفروق'' سے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں، جن میں حضرت امام مالک نے عرف کا اعتبار کیا ہے۔

(۱) اگر کسی نے ایسی زمین خریدی جس میں درخت ہو یا عمارت تعمیر کی گئی ہو تو زمین کی بیع میں درخت اور عمارت دونوں داخل ہوں گے۔

(۲) کسی نے گھر خریدا، تو گھر کی بیع میں اس کی سیڑھی، دروازے اور کپڑا لٹکانے کی کھونٹیاں، رسیاں اور لکڑیاں بھی داخل ہوں گی۔

(۳) دو شخصوں نے بطور شرکت عقد بیع کیا اور اس بیع میں حصے کو مطلق رکھا تو ایسی صورت میں دونوں نصف نصف کے شریک ہوں گے۔

(الفروق للقرافی ج۳ ص۲۸۷) (ماخوذ از مالک حیاتہ وعصرہ محمد ابوزہرہ مصری ص۲۲۷ تا ۳۶۴)

* * *

فقہ مالکی کے اہم ناشرین

حضرت امام مالک پوری زندگی جوار رسالت سے جدا نہیں ہوئے، انہوں نے فریضہ حج کے علاوہ کبھی مدینہ منورہ سے باہر قدم نہیں نکالا، اس بنا پر انہوں نے دوسرے ائمہ متقدمین ومحدثین کی طرح اسلامی بلاد وامصار کے طول وطویل سفر اپنی ضرورت یا لوگوں کی خواہش پر ہرگز نہ کیے، اس کے باعث آپ کی علمی، فقہی جامعیت اور کمال کا یہ حال تھا، کہ لوگ دور دراز شہروں ملکوں سے مدینۃ الرسول کا سفر کر کے امام مالک سے فقہ وحدیث کا درس لینے اور مسائل شرعیہ دریافت کرنے کی غرض سے حاضر ہوا کرتے تھے، تلامذہ کے ذیل میں ان کا اجمالی ذکر آچکا ہے، امام مالک سے ان کی مؤطا اور ان کے فقہی واجتہادی اقوال وآرا انہیں مستند، معتبر شاگردوں کے ذریعے پورے بلاد اسلامی میں مشتہر ہوئے، آپ کی فقہ دو طریقوں سے منظر عام پر آئی۔

(الف) مؤطا کے وہ نسخے جنہیں امام مالک نے قلمبند کرایا اور جن کی ان سے بلاد اسلامی میں روایت کی گئی، احادیث واخبار کے علاوہ مؤطا آپ کے فقہی اقوال وآرا کا مجموعہ ہے۔

(ب) امام مالک کے وہ ارشد تلامذہ جنہوں نے آپ کی بارگاہ سے فیض حاصل کیا، فتوے پوچھے، مسائل کا حل دریافت کیا، انہیں سینوں میں محفوظ کیا اور اپنے اپنے اماکن ودیار میں جا کر ان کی اشاعت کی، چوں کہ امام مالک کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ظاہر ہے ان میں سے اکثر نے فقہ مالکی کو اختیار کیا اور اس کے مطابق فتویٰ بھی دیا، لیکن ان سب کا احاطہ ممکن نہیں، اس لیے چند اہم اور خاص تلامذہ کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے اور ان کے مختصر احوال ہدیۂ قارئین کیے جاتے ہیں۔

(۱) عبداللہ بن وہب ۱۲۵ھ تا ۱۹۷ھ

آپ حسب ونسب کے اعتبار سے بربری ہیں، اور ولاءً قرشی ہیں، مصر کے باشندے تھے، پہلے لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری سے حدیث پڑھی، اس کے بعد امام دار الہجرت سے اس طرح وابستہ ہو گئے، کہ بیس سال تک آپ کی خدمت سے جدا نہ ہوئے اور پورے انہماک واشتغال کے ساتھ امام مالک کے بحر علم سے ان کے وصال تک آسودہ ہوتے رہے اور علم وفقہ کے اس مقام تک پہنچے، کہ امام مالک نے انہیں فقیہ مصر کا لقب عطا کیا، آپ کی علمی شان کے بارے میں امام اصبغ کا قول ہے:

ابن وهب اعلم اصحاب مالك بالسنن والآثار الا انه روى عن الضعفاء .

ابن وہب امام مالک کے شاگردوں میں سب سے بڑے سنن وآثار کے عالم تھے، مگر انہوں نے ضعیف راویوں سے بھی روایت کیا ہے۔

امام احمد فرماتے تھے: ابن وہب کو قدرت نے عقل، دین، صلاح سب کچھ دیا تھا، وہ حدیث کی صحت کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔

امام مالک کی وفات کے بعد مؤطا کے سماع کے لیے سب سے پہلے تشنگان علوم نبوی انہیں کی طرف متوجہ ہوئے، خود امام یحییٰ نے جو مؤطا کے متداول نسخے مرتب کیے ہیں، اس کا ایک حصہ کا امام مالک سے سماع نہیں کر سکے تھے ان سے پورا کیا۔

امام مالک کے مشہور شاگرد سحنون کا بیان ہے، کہ ابن وہب نے پورے سال کو تین کاموں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا، جس میں چار ماہ درس وتدریس کے لیے مخصوص تھے، ان کو یہ فخر بھی حاصل تھا، کہ خود ان کے اساتذہ میں لیث اور امام مالک نے ان سے روایتیں کی ہیں۔

آپ کے چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:
عبدالرحمٰن بن مہدی، یحییٰ بن یحییٰ، عبداللہ بن یوسف، علی بن مدینی، یحییٰ بن بکیر، احمد بن صالح، اصبغ بن فرج، سحنون، احمد بن سعید دارمی۔

(۲) امام عبدالرحمٰن بن قاسم

ابو عبداللہ عبدالرحمٰن بن قاسم بن خالد بن جنادہ مصر کے باشندے تھے، ولادت ۱۲۸ھ میں ہوئی، طلب علم کا شوق بچپن ہی سے تھا، جس کے لیے رحلت وسفر کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور مال ودولت خرچ کرنے میں بھی کوتاہی نہ کی، دیگر شیوخ واساتذہ کے علاوہ امام مالک سے خصوصی استفادہ کیا، خود بیان کرتے ہیں، ایک شب عالم خواب میں مجھے خبر دی گئی، کہ تمہیں علم سے اس قدر شغف وانہاک ہے، تو عالم آفاق کی صحبت اختیار کرو، میں نے پوچھا، وہ عالم آفاق کون ہے؟ بتایا گیا امام مالک، چنانچہ اس غیبی اشارہ کے بعد وہ امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورے بیس سال تک اپنے سینے کو مالکی علوم کا گنجینہ بنانے میں مصروف رہے، امام صاحب سے انہوں نے بیس کتابوں کا سماع کیا تھا۔ (شذرات الذہب ج۱ ص ۳۲۹)

امام مالک کے علاوہ عبدالرحمٰن بن شریح، بکر بن مضر، نافع بن ابی نعیم، یزید بن عبدالملک سفیان بن عیینہ سے تحصیل علم کیا۔

آپ سے کسب علم کرنے والے مشہور تلامذہ یہ ہیں:
سعید بن عیسی، محمد بن سلمی، حارث بن مسکین، سحون بن سعید، عبدالرحمٰن بن ابی الغمر، محمد بن عبداللہ، عیسیٰ بن حماد۔ (تہذیب ج۶ ص ۲۵۳)

امام دار الہجرت کی تعلیم وتربیت نے آپ کو فقہ میں کمال عطا کر دیا تھا، اور وہ فقہ مالکی کا سرچشمہ بن گئے تھے، چنانچہ فقہ مالکی کی تدوین کا اساسی پتھر انہوں نے ہی رکھا اور اس فقہ کو عام کرنے کی سعی بلیغ فرمائی۔ (ایضا)

ایک مرتبہ امام مالک سے ابن وہب اور ابن قاسم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا، ابن وہب عالم ہیں اور ابن قاسم فقیہ۔

ابن حبان لکھتے ہیں:

کان حبرا فاضلا ممن تفقه علی مالك وفرع علی اصوله وذب عنها ونصر من افتحلها ۔(ایضا)

ابن قاسم بڑے عالم وفاضل تھے اور فقہ مالکی کے متبع علما میں سے تھے جنہوں نے اس مذہب کے فروع متعین کیے اور اس کی طرف سے ہمیشہ دفاع اور اس کے متبعین کی ہمیشہ حمایت کرتے رہے۔

ان کے ہم پایہ معاصر عبداللہ بن وہب کا قول ہے:

ان عرفت هذالشان يعني فقه مالك فعليك ابن القاسم فانه انفرد به ۔(مالک ص۲۰۵)

اگر فقہ مالکی میں مہارت پیدا کرنا چاہو تو ابن قاسم کی صحبت اختیار کرو کیوں کہ وہ اس میں منفرد اور یکتا ہیں

موطا امام مالک کے معتبر راوی ہیں۔ امام نسائی فرماتے ہیں:

لم يرو واحد المؤطا عن مالك اثبت من ابن القاسم وليس احد من اصحاب مالك عندی مثله ۔

عبدالرحمٰن بن قاسم سے زیادہ ثبت کسی شخص نے امام مالک سے موطا کی روایت نہیں کی اور نہ ہی اصحاب مالک میں اس پایہ کا کوئی تھا۔ (تہذیب التہذیب ج۶ ص۲۵۳)

خلیلی کہتے ہیں:

وهواول من حمل المؤطا الی مصر :

وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مصر میں موطا پہنچائی۔

فقہ مالکی کی مشہور ترین ضخیم کتاب ''المدونۃ الکبری'' انہیں کی تالیف ہے، جو ان کے لائق شاگرد سحنون کے واسطہ سے مروی ہے، اس کتاب کے متعلق زرکلی کا قول ہے:

وهومن اجل الكتب المالكية ۔ یہ مذہب مالکی کی عظیم ترین کتابوں میں ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابن قاسم نے امام مالک کے زمانہ میں مدینہ سے واپس آ کر اپنے شیخ کے مجتہدات وفقہیات کو کتابی شکل میں جمع کرنا شروع کیا تھا۔

آپ زہد وتقویٰ میں بھی امتیازی شان رکھتے تھے، سلاطین وامرا کے تحائف ہرگز قبول نہ کرتے، اور نہ ان سے تقرب کو پسند کرتے تھے، وہ خود کہتے تھے:

لیس فی قرب الولاۃ ولا فی الدنو منہم خیر ۔

حاکموں کے قرب میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

۷/صفر شب جمعہ ۱۹۱ھ مصر میں وفات فرمائی۔

(۳) امام اشہب بن عبد العزیز

ولادت ۱۵۰ھ میں ہوئی، آپ مصر کے رہنے والے تھے، پہلے لیث بن سعد، یحییٰ بن ایوب اور ابن لہیعہ سے اکتساب علم کے بعد امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث وفقہ کا مدت دراز تک سماع کرتے رہے اور وہ اس مقام تک پہنچ گئے، کہ فقہ مالکی کے اہم اور معتبر ناقل بن گئے۔ ابو عبد اللہ خزاعی لکھتے ہیں:

کان لاشہب ریاسۃ فی البلاد ومال جزیل وکان من انظر اصحاب مالک رضی اللہ عنہ ۔

(ابن خلکان ج۱ص ۱۲۷)

اشہب کو مصر میں علمی اور مالی ریاست حاصل تھی اور مالک کے صاحب نظر وبصیرت تلامذہ میں سے تھے۔

امام شافعی فرماتے ہیں:

ما رایت افقہ من اشہب وقد انتہت الیہ ریاسۃ الفقہ فی مصر ۔(مالک ص ۲۰۷)

میں نے اشہب سے بڑا کسی کو فقیہ نہیں دیکھا اور مصر میں فقہ کی ریاست ان پر مکمل ہوئی۔

امام اشہب نے ابن قاسم کے علاوہ امام مالک کے فقہی آرا اور مجتہدات کو ایک کتاب میں مدون فرمایا۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں:

کتاب جلیل کبیر کثیرا لعلم ۔ انتہائی عظیم الشان اور کثیر العلم کتاب ہے۔

آپ کی وفات ۲۰۴ھ میں ہوئی۔

(۴) امام اسد بن فرات بن سنان

ابو عبد اللہ اسد بن فرات بن سنان آپ کا خاندان بنو سلیم بن قیس کے آزاد کردہ غلاموں میں سے تھا، آبائی وطن نیشاپور (خراسان) تھا، آپ بطن مادر میں تھے، کہ والد نے حران میں رخت اقامت ڈالا، جہاں ۱۴۲ھ میں اسد پیدا ہوئے، آبائی پیشہ سپہ گری تھا، والد کے ساتھ قیروان اور تیونس میں بھی قیام رہا، تیونس ہی میں قرآن حکیم کی تلاوت مکمل کی، انہیں دنوں والد نے خواب میں دیکھا، کہ ان کی پشت پر گھاس اگی ہوئی ہے اور اسے مویشی چر رہے ہیں، علمائے تعبیر نے بتایا، کہ یہ لڑکا

آئندہ علم وفضل کا مالک ہوگا اور تشنگان علم اس کے چشمہ فیض سے شاد کام ہوں گے۔

تیونس ہی میں امام اسد کو طلب علم کا ذوق پیدا ہوا اور وہاں کے شیخ علی بن زیاد کے حلقہ درس سے وابستہ ہو گئے، جہاں پہلی بار مؤطا امام مالک کا درس لیا، ۱۷۲ھ میں تکمیل علم کے لیے دیار مشرق کا رخ کیا اور مدینہ منورہ پہنچ کر امام مالک کے حلقہ درس میں شریک ہوئے۔

چوں کہ قاضی اسد ہر مسئلہ کی تحقیق کے لیے بحث ونظر اور قیل وقال کے عادی تھے اور امام مالک طبعاً قیل وقال پسند نہ فرماتے تھے، سہل وسادہ طریقہ پر روایات کی روشنی میں جوابات دیتے، جس کی بنا پر تلامذہ اپنے خدشات پیش نہ کرتے، لیکن جب قاضی اسد شریک درس ہوئے، تو امام مالک کے تلامذہ میں ابن قاسم وغیرہ نے آپ کے ذریعہ اپنے خدشات امام مالک کی خدمت میں پیش کرنے شروع کیے، بالآخر امام صاحب نے انہیں روک دیا، امام مالک کی خدمت میں سبقاً سبقاً مؤطا کی تکمیل کے بعد آپ نے مزید طلب علم کے لیے عراق کا رخ کیا، عراق میں امام محمد بن حسن شیبانی کے حلقہ درس میں شامل ہوئے، امام محمد آپ پر خصوصی توجہ فرماتے اور مالی اعانت بھی فرمایا کرتے تھے۔

۱۷۹ھ میں امام مالک کا انتقال ہوا، سانحہ ارتحال کی خبر پہنچی، تو قاضی اسد امام محمد کے حلقہ درس ہی میں تھے،، امام محمد نے فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون ایک مصیبت ہے کہ اس سے بڑھ کر دوسری مصیبت نہیں۔

امام دار الہجرت کے وصال کے بعد لوگ مؤطا کی حدیثیں سننے کے لیے ان کے تلامذہ کے گرد جوق در جوق جمع ہونے لگے، اسد بن فرات بھی انہیں تلامذہ مالک میں ہیں، جن کے حلقہ درس میں سامعین مؤطا کا ازدحام ہوتا، چنانچہ قاضی اسد کو یہ شرف حاصل ہے، کہ امام محمد اور قاضی ابو یوسف نے آپ سے مؤطا کا درس لیا۔

مشرق میں حدیث وفقہ کی تحصیل کے بعد قاضی اسد مصر آئے، وہاں امام مالک کے شاگرد ابن وہب، اشہب اور ابن قاسم کے حلقہائے درس قائم تھے، قاضی اسد نے عبدالرحمٰن بن قاسم کی خدمت اختیار کی، وہ ان کی فقہ، علمی جلالت اور زہد وورع سے اس قدر متاثر تھے، کہ انہوں نے ایک دن مسجد میں بآواز بلند یہ کہا، حضرات! اگر مالک بن انس کا انتقال ہو چکا ہے، تو یہ دوسرا امام مالک ہمارے سامنے موجود ہے، یہ کہتے ہوئے ابن قاسم کی طرف اشارہ کیا اور پھر بالالتزام روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، اس کے بعد قاضی اسد کا یہ دستور ہو گیا، کہ وہ ابن قاسم سے روزانہ فقہی مسائل پر سوالات کرتے، وہ جوابات دیتے اسد سوال وجواب دونوں کو بترتیب لکھتے جاتے، عبدالرحمٰن بن قاسم اپنے جوابوں میں امام مالک کے فتاوی بیان کرتے ان پر احادیث سے دلیل لاتے اور قیاس ورائے سے ان جوابوں کی صحت کے ثبوت بہم پہنچاتے، یہاں تک کہ انہوں نے ان جوابوں کے املا کرانے میں روزانہ کے تین ختموں کے معمول میں سے ایک ختم کو ترک کر دیا، اس طرح یہ سوال وجواب ساٹھ اجزا میں مدون ہو گئے اور یہی کتاب دنیا میں فقہ مالکی کی اولین کتاب ہے، اسد نے اس مجموعہ کو اپنے نام پر ''الاسدیہ'' سے موسوم کیا۔

قاضی اسد مصر سے قیروان (افریقہ) پہنچے، تو وہاں سے اسدیہ کی ایک نقل عبدالرحمٰن بن قاسم کے پاس مصر بھیجی، قیروان میں آپ کا وسیع حلقہ درس قائم ہوا، جہاں مؤطا اور اسدیہ کے درس کے لیے طالب علموں کا ہجوم رہتا، امام مالک سے بیک واسطہ احادیث لینے اور الاسدیہ کی روایت اور سماع کے لیے افریقہ اور مغرب کے جلیل القدر علما نے اسد کی بارگاہ میں زانوے تلمذ تہہ کیا اور چند ہی دنوں میں الاسدیہ کی روایت سارے افریقہ اور مغرب میں پھیل گئی۔

۲۱۲ھ میں بحری بیڑوں کے ذریعہ قاضی اسد کی قیادت میں اسلامی لشکر نے صقلیہ فتح کیا اور اگلی پیش رفت میں زخمی ہوئے، جس کے صدمے سے ۲۱۳ھ میں آفتاب علم صقلیہ کی زمین میں غروب ہوگیا۔

(۵) عبدالعزیز بن ماجشون

عبدالعزیز بن ماجشون مدینہ میں پیدا ہوئے، اندازہ کیا جاتا ہے، کہ انہوں نے اپنے والد اور چچا سے علم حاصل کیا اور امام مالک سے فقہ کا درس لیا۔ ابن خلکان لکھتے ہیں:

تفقه على الامام مالك وعلى والده عبدالعزيز وغيرهما (ج ۲ ص ۷۹)

تحصیل علم کے بعد مدینہ منورہ میں انہوں نے اپنا ایک الگ حلقہ درس قائم کیا اور ۱۴۸ھ تک یہیں رہے پھر بغداد منتقل ہوگئے، عبداللہ بن وہب کا بیان ہے:

میں نے ۱۴۸ھ میں حج کیا تو ایک منادی یہ اعلان کر رہا تھا:

لایفتی الناس الا مالك وعبدالعزيز ابو سلمه .

امام مالک اور عبدالعزیز ابوسلمہ کے علاوہ کوئی دوسرا فتویٰ نہ دے۔

قاضی یحییٰ بن اکثم فرمایا کرتے تھے، کہ عبدالملک ایک سمندر ہیں، جس کو ڈول گندا نہیں کرسکتا۔

مصعب زبیری کہتے تھے:

كان مفتی اهل المدينة فی زمانه .(تهذيب ج ٦ ص ۴۰۸)

وہ اپنے زمانے میں اہل مدینہ کے مفتی تھے۔

ان کے ممتاز تلامذہ یہ ہیں:

عبدالرحمٰن بن مہدی، ابونعیم علی بن الجعد، یحییٰ بن بکیر، احمد بن یونس، زہیر بن معاویہ، لیث بن سعد، عبداللہ بن وہب، وکیع بن الجراح، ابوداؤد طیالسی، عبداللہ بن صالح، بشر بن فضل، یزید بن ہارون، منصور بن سلمہ وغیرہ۔

(تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۴۳۶)

(۶) امام یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی

آپ کا تذکرہ نسخہ مؤطا کے ذیل میں آچکا ہے۔

شمائل وخصائل

حلیہ ولباس

رنگ سفید مائل بہ سرخی، قد لمبا، سر بڑا، آنکھیں روشن اور بڑی بڑی، بہت وجیہ اور دلکش شخصیت کے مالک تھے، ڈاڑھی دراز۔ بڑے خوش پوش تھے، زیادہ تر لباس سفید ہوتا۔ عدن، خراسان، مرو اور طراز کے عمدہ کپڑے استعمال کرتے تھے، انگوٹھی میں سیاہ نگینہ ہوتا، جس میں ''حسبنا اللہ ونعم الوکیل'' کندہ تھا۔ عمدہ خوشبو اور عطریات استعمال کرتے، عام طور سے خوش حالی کا اظہار کرتے تھے، تاکہ علمی شان میں حرف نہ آئے، غذا عمدہ ہوتی، روزانہ گوشت کا التزام فرماتے، پھلوں میں کیلا زیادہ پسند فرماتے، جس کی خوبی کے بارے میں وہ خود ہی فرماتے:

لاشئ اشبه بثمر الجنة منه لاتطلبه فی شتاء ولا صیف الا وجدته ۔

کیلا سب سے زیادہ جنتی پھل کے مشابہ ہے اور جاڑا اور گرمی ہر موسم میں دستیاب ہو جاتا ہے۔

ذہبی نے اجمالاً تحریر کیا ہے:

کان مالك رجلا طویلا جسیما عظیم الهامة ابیض الراس واللحیة اشقر اضلع عظیم اللحیة عریضها وکان لایحفی شاربه ویراه مثله ۔ (تاریخ ذہبی ج ۳ ص ۳۱۹)

ابوزہرہ نے لکھا ہے:

کان مالك یلبس الثیاب العدنیة والخراسانیة والمصریة الغالیة الثمن ۔ (مالك ص ۵۰)

وکان له ذوق فی الطعام یحسن تخیر انواعه وکان یعجبه الموز ۔ (ایضاً)

اخلاق وکردار

امام مالک کا دامن فضل وکمال کے ساتھ اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کے سدابہار پھولوں سے مالا مال تھا، عقائد واعمال میں سلف صالحین کا کامل نمونہ تھے، عبادت وریاضت آپ کا معمول، اخلاق وایثار اور خدمت دین، آپ کا شیوہ تھا، ہر قدم اتباع سنت میں اٹھتا اور ہر عمل اسوہ حسنہ کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا، وہ عمل صالح کا پیکر تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے، اکثر فرمایا کرتے، کہ جو شخص چاہتا ہے، کہ اس کا قلب روشن ہو موت کی سختی سے نجات ہو، قیامت کے شدائد سے محفوظ

رہے، اس کا باطنی عمل ظاہری عمل سے زیادہ ہونا چاہیے۔

ذوق عبادت وتلاوت

امام صاحب ہر ماہ کی پہلی رات کو پوری رات عبادت کرتے تھے، دیکھنے والے سمجھتے تھے، کہ آپ اس ماہ کا استقبال وافتتاح عبادت سے کررہے ہیں، صاحبزادی فاطمہ بیان کرتی ہیں، کہ امام صاحب ہر رات اپنا وظیفہ ”نوافل وغیرہ“ پورا کرتے تھے اور جمعہ کی رات میں پوری رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

ابن وہب کہتے ہیں، امام مالک کی بہن سے پوچھا گیا، کہ گھر کے اندر امام مالک کی مشغولیت کیا تھی؟ تو جواب دیا ”المصحف والتلاوۃ“ (تاریخ ذہبی)

مغیرہ کا بیان ہے، کہ ایک مرتبہ رات گئے میں امام صاحب کے پاس سے گزر رہا تھا، وہ الحمد للہ کے بعد سورہ ”الھکم التکاثر“ پڑھ رہے تھے، میں ٹھہر گیا، امام صاحب جب ”لتسألن یومئذ عن النعیم“ پر پہنچے تو دیر تک روتے رہے اور یہی آیت دہراتے رہے، ان کا یہ حال دیکھ کر میں وہیں رہ گیا، صبح ہوتے ہوتے رکوع کیا، میں وضو کرکے مسجد میں گیا، دیکھا، کہ امام صاحب اسی حال میں ہیں اور ان کے چہرے پر نور چمک رہا ہے۔

امام صاحب نوافل میں طویل رکوع وسجود کرتے تھے، کوڑے کی سزا کے بعد لوگوں نے عرض کیا، کہ آپ ہلکی نماز پڑھیں، فرمایا، کہ بندے کو چاہیے، کہ اللہ کے لیے جو عمل کرے، اچھی طرح کرے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”لِیَبْلُوَنَّکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنَ عَمَلاً“۔

امام صاحب کے اخفاے حال کا یہ عالم تھا، کہ اپنے رومال کو تہہ کرکے رکھتے تھے اور نماز کے وقت اسی پر سجدہ کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے، کہ میں ایسا اس لیے کرتا ہوں، کہ میری پیشانی پر سجدے کا نشان نہ پڑے، جس کو دیکھ کر لوگ سمجھیں، کہ میں قیام لیل کرتا ہوں۔

فرماتے تھے، کہ اگر مجھے معلوم ہوجائے، کہ میرے قلب کی اصلاح گھوڑے پر بیٹھنے سے ہوجائے گی، تو میں اس پر جاکر ضرور بیٹھوں گا، امام صاحب نفل عبادت تنہائی میں کرتے تھے، تاکہ کوئی نہ دیکھ سکے اور ان کی بزرگی کا شہرہ نہ ہو۔

(ترتیب المدارک ج ۱ ص ۱۸۰)

عشق رسول

امام صاحب کی ذات جملہ صوری ومعنوی محامد واخلاق کا مجموعہ تھی، مکارم اخلاق کا سرچشمہ محبت رسول ہے، امام مالک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ عشق تھا، وہ ذات رسول کے ساتھ آپ کے متعلقات کا بھی حد درجہ احترام ملحوظ رکھتے، دیار حبیب سے اس درجہ انس تھا، کہ حج کے علاوہ کبھی مدینہ سے جدا ہونا گوارہ نہ کرتے، وہ فرمایا کرتے تھے، کہ مجھے مدینہ طیبہ کی مٹی سے بھی خوشبو آتی ہے اور تین دن میں ایک بار بیت الخلا جاتے اور فرماتے، کہ مجھے بار بار جاتے شرم آتی

ہے، قضائے حاجت کے لیے حرم مدینہ سے باہر جاتے، امام مالک سرزمین طیبہ میں کبھی سواری پر نہ چلتے۔ ابن خلکان لکھتے ہیں:

كان مالك لايركب في المدينة مع ضعفه و كبر سنه ويقول لا اركب في مدينة فيها جثة رسول الله صلى الله عليه وسلم مدفونة ۔ (وفيات الاعيان ج٢ص ٣٠٢)

امام مالک باوجود ضعف وکبرسنی کے مدینہ طیبہ میں کبھی سوار نہ ہوتے تھے اور فرماتے تھے، کہ جس ارض مقدس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر مدفون ہو اس میں سوار ہونا شان محبت وادب کے خلاف ہے۔

امام شافعی کا بیان ہے، کہ میں نے ایک مرتبہ امام صاحب کے دروازے پر عمدہ عمدہ خراسانی گھوڑے اور مصر کے خچر دیکھے، میں نے ان کے متعلق دریافت کیا، تو فرمایا، کہ یہ سب تم کو ہبہ کرتا ہوں، میں نے کہا، کہ کم از کم ایک تو رکھ لیں، اس پر کہا، کہ ”انا استحی من الله ان اطأ تربة نبي الله بحافر دابة“ مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم معلوم ہوتی ہے، کہ اللہ کے رسول کی سرزمین کو چوپایہ کے پیروں سے روندوں۔

کسی حال میں مدینۃ الرسول کو چھوڑنا گوارا نہ تھا، خلیفہ وقت کے حکم پر بھی اسے صاف اور دوٹوک جواب دے دیا، حسین بن عروہ کا بیان ہے، کہ خلیفہ ہارون رشید عباسی ایک بار مدینہ آیا اور امام صاحب کی خدمت میں پانچ سو دینار بھیجے، جب حج سے فارغ ہو کر دوبارہ مدینہ آیا، تو امام صاحب کے پاس پیغام بھیجا، کہ امیر المومنین کی خواہش ہے، کہ مالک بغداد تک اس کے ہم سفر رہیں، امام صاحب نے اس کے جواب میں قاصد سے کہا، کہ تم جا کر کہہ دو کہ وہ تھیلی مہر بند رکھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ ”والمدينة خير لهم لو كانو يعلمون“ یعنی مدینہ لوگوں کے حق میں بہتر ہے، اگر وہ اس کو جانیں، یہ جواب سن کر ہارون رشید اپنے ارادہ سے باز آگیا۔ (تقدمۃ الجرح والتعدیل ص۳۰،۲۹)

مصعب بن عبداللہ کا بیان ہے، کہ جب امام صاحب کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہوتا تھا، تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا اور سرنگوں ہو جاتے تھے اور کہتے تھے، کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے، اگر تم لوگ دیکھتے تو میری حالت پر تعجب نہ کرتے، محمد بن منکدر سید القرا تھے، ہم لوگ ان سے کوئی حدیث معلوم کرتے تو وہ رونے لگتے تھے، میں ایک مدت تک ان کے یہاں آیا گیا ہوں اور ہمیشہ ان کو تین حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں پایا ہے، نماز میں مشغول رہتے یا روزہ سے ہوتے یا تلاوت میں مصروف رہتے تھے، حدیث رسول باوضو بیان کرتے تھے۔

حق گوئی وبے باکی

حق گوئی وبے باکی امام صاحب کا طرہ امتیاز تھا، وہ جابر امرا اور خلفا کے روبرو حق بات کہنے سے باز نہ رہتے، بلکہ ان لوگوں سے ملنے کا بنیادی مقصد ان کی تنبیہ اور ان کے سامنے کلمہ حق کا اعلان کرنا ہوتا، ان سے پوچھا گیا، آپ اہل دول سے کیوں ملتے ہیں، تو فرمایا، کہ ”يرحمك الله فاين التكلم بالحق“ ان کے یہاں نہیں، تو کہاں حق بات کہی جائے گی؟ حق گوئی کے نتیجے میں آپ پر شاہی عتاب ہوا، مگر حق وصداقت کی راہ میں آپ کے قدموں میں لغزش نہ آئی، امام صاحب کے حاسدوں نے

ایک مرتبہ ابو جعفر منصور کے پاس جا کر کہا، کہ مالک! آپ لوگوں کی بیعت کو جائز نہیں سمجھتے ہیں اور عباسی خلافت کے منکر ہیں، یہ سن کر ابو جعفر منصور غصہ ہوا اور امام صاحب کے کپڑے اتروا کر کوڑے مارے اس میں آپ کا ہاتھ اکھڑ گیا اور بڑی زیادتی کی۔

(ابن خلکان ج۲ ص ۳۰۱)

اوصاف وعادات

امام مالک ان تمام اوصاف جمیلہ اور اخلاق حمیدہ کے جامع تھے، جو صحابہ اور تابعین میں موجود تھے اور جن کے حاملین کی ذات اسلامی تعلیمات کا اسوہ اور نمونہ تھی، امام صاحب کے مکان واقع وادی عقیق کے دروازے پر ''ماشاء اللہ'' لکھا تھا، بعض لوگوں نے اس کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے بتایا، کہ قرآن حکیم میں ایک واقعہ کے ضمن میں ہے، کہ ''لَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰهُ'' (الکہف ۱۸/۳۹) اور باغ بھی گھر ہے۔

دوسرا مکان مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا تھا، جس میں کرایہ پر قیام پذیر تھے، ایک مرتبہ خلیفہ مہدی نے آپ سے ذاتی مکان کے بارے میں پوچھا، تو کہا، کہ مجھ سے بیان کیا گیا ہے، کہ ''ان نسب المرء داره'' یعنی آدمی کا نسب اس کا مکان ہے۔ حضرت ابن مسعود کے مکان کی نسبت کافی ہے، آپ کا مکان نہایت صاف ستھرا، سجا سجایا رہتا تھا، عمدہ عمدہ گدے، تکیے اور فرش رکھے اور بچھے رہتے تھے، آپ کا کاشانہ شاہانہ دربار معلوم ہوتا تھا، کپڑے نہایت نفیس اور قیمتی ہوتے تھے، فرماتے تھے، کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تحدیث نعمت اور اس کا عملی شکریہ ہے، ایک مرتبہ کسی نے کہا، کہ آپ کے گھر میں تصویر ہے، امام صاحب نے کہا، کہ اب تک میں نے اس کو نہیں دیکھا ہے، پھر مخاطب سے کہا، کہ تم اس کو مٹا دو۔

مدینہ منورہ میں سواری پر چلنا خلاف ادب سمجھتے تھے، مگر مدینہ منورہ کے باہر سواری کرتے تھے، ابوالسمح کا بیان ہے، کہ میں نے امام صاحب کو ایک عمدہ خچر پر سوار دیکھا ہے، جس پر نہایت نفیس زین تھی، اس کے اوپر کپڑا تھا، خادم پیچھے پیچھے چل رہا تھا، اسی حال میں وادی عقیق والے مکان کے دروازے تک گئے، خورد ونوش کا انتظام نہایت اعلیٰ تھا، امام صاحب کے بھانجے اسماعیل بن ابواویس کہتے ہیں، کہ روزانہ دو درہم کا گوشت خریدا جاتا تھا، اس میں ناغہ نہیں ہوتا تھا، اس کے لیے بعض اوقات سامان فروخت کرنا پڑتا تھا، اپنے باورچی سلمہ کو حکم دیتے تھے، کہ جمعہ کے دن کھانا زیادہ تیار کرے، مشروبات میں گرمی کے ایام میں شکر اور جاڑوں میں شہد استعمال کرتے تھے۔

امام صاحب کو کیلا بہت مرغوب تھا، کہتے تھے، کہ اس پھل پر نہ مکھی بیٹھتی ہے، نہ گندا ہاتھ لگتا ہے، جنت کے پھلوں کے مشابہ ہے، سردی گرمی ہر موسم میں ملتا ہے یہ جنت کے پھل کی خصوصیت ہے یعنی ''اكلها دائم'' بال بچوں اور گھر والوں کے ساتھ بہترین اخلاق سے پیش آتے تھے، کہا کرتے تھے، کہ اس میں تمہارے رب کی مرضی، تمہارے مال میں زیادتی اور تمہاری عمر میں درازی ہے، جیسا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ کی روایت سے معلوم ہوا ہے۔

کثیر الصمت اور قلیل الکلام تھے، کھل کر نہیں ہنستے تھے، بلکہ مسکراتے تھے، امام صاحب کے پاس چار سو دینار تھے، اسی

سے تجارتی کاروبار کرتے تھے اور اسی کی آمدنی سے تمام ضروریات زندگی پوری کرتے تھے، ایک مرتبہ تین ہزار دینار پیش کیے گئے، تو قبول نہ کیا، نہ مکان بنوایا اور نہ تجارت میں لگایا۔

یحییٰ بن یحییٰ مصمودی اندلسی نے امام صاحب سے تحصیل علم کے بعد ایک سال ان کی خدمت میں رہ کر اسلامی آداب سیکھے، ان کا بیان ہے، کہ میں نے امام مالک کے عادات وشمائل سیکھنے کے لیے قیام کیا، کیوں کہ یہ صحابہ اور تابعین کے اخلاق وشمائل ہیں، اسی لیے امام صاحب کو عاقل کہا جاتا تھا۔ (ترتیب المدارک ج١)

* * *

حکیمانہ اقوال

علمائے حق جس طرح اپنی سیرت و کردار کو صلاح و تقویٰ کے سانچے میں ڈھال کر فلاح دارین کے مستحق بنتے تھے، ان کی خواہش بھی ہوتی، کہ سارا اسلامی معاشرہ اسی رنگ و آہنگ میں ڈھل جائے اور ہر مسلمان اخلاق و کردار کے ذروہ بلند پر متمکن ہو جائے، چنانچہ وہ لوگوں کی اخلاقی خامیوں کو بیان کرتے، انہیں ترک کرنے کی ہدایت فرماتے اور ایسے حکیمانہ نصائح فرماتے، جن کی روشنی میں اخلاق و کردار کی اساس سنواری جا سکے۔

امام مالک نے بھی علما اور عوام کی صلاح و فلاح کے لیے اپنے بیش قیمت اقوال لوگوں کے سامنے پیش کیے، تا کہ ان پر عمل پیرا ہو کر لوگ کامیاب زندگی بسر کر سکیں، ذیل میں کچھ اقوالِ زریں ہدیہ ناظرین ہیں:

☆ اہل علم کی تین قسمیں ہیں (۱) جو عالم اپنے علم پر عمل کرتا ہے، اس کے بارے میں فرمان الٰہی ہے ''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا '' (فاطر: ۳۵/۲۸) (۲) جو عالم علم حاصل کر کے دوسروں کو نہ سکھائے، اس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے، ''اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْھُدٰی '' (البقرہ: ۲/۱۵۹) (۳) جو عالم دوسروں کو تو سکھائے خود عمل نہ کرے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''اِنْ ھُمْ اِلَّا کَالْاَنْعَامِ'' (الفرقان: ۲۵/۴۴)۔

☆ زبیری کہتے ہیں، کہ میں نے امام صاحب سے کہا، کہ جب میں لوگوں کو امر بالمعروف کرتا ہوں، تو ان میں سے کچھ لوگ میری بات مان لیتے ہیں اور کچھ لوگ مجھے تکلیف دیتے ہیں، میری برائی کرتے ہیں اور میرے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں، ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے، امام صاحب نے کہا، کہ اگر تم کو ڈر ہے اور تم سمجھتے ہو کہ لوگ تمہاری بات نہیں مانیں گے، تو ان کو چھوڑ دو اور دل میں ان کی برائی سے بیزاری رکھو، اس میں تمہارے لیے گنجائش ہے اور جس شخص سے تم کو گزند کا خطرہ نہ ہو اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اور اس کو حکم خداوندی پر عمل سمجھ کر کرو، ایسی صورت میں تم خیر ہی دیکھو گے، خاص طور سے جب تم میں اس معاملہ میں نرمی ہو، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون کو حکم دیا، کہ فرعون سے نرم بات کریں، ایسی صورت میں سننے والا تمہاری بات دھیان سے سنے گا۔

☆ باطل سے قرب میں ہلاکت ہے، باطل بات میں حق سے دوری ہے، دین اور شرافت میں خرابی کے بعد ملنے والی دنیا میں خیر نہیں ہے، اگرچہ کتنی ہی زیادہ ہو۔ (ترتیب المدارک ج ۱ ص ۱۸۷، ۱۹۰)

☆ مجھے معلوم ہوا ہے، کہ قیامت میں جن باتوں کا سوال انبیا سے کیا جائے گا، ان ہی باتوں کا سوال علما سے کیا جائے گا۔

☆منافقوں کی مثال مسجد میں ایسی ہی ہے، جیسے چڑیا پنجرے میں ہو کہ جوں ہی اس کا دروازہ کھلا چڑیا اڑ گئی۔

☆علم دین کثرت روایت سے نہیں آتا ہے، بلکہ وہ نور ہے، جس کو اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتا ہے، تحصیل علم بہت خوب ہے، البتہ تم دیکھو گے، کہ اس بارے میں صبح سے شام تک کیا کرنا ہے، اس کو اختیار کرو۔

☆ایک مرتبہ امام صاحب نے مطرف سے پوچھا، کہ میرے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں، مطرف نے بتایا، کہ دوست تعریف کرتے ہیں اور دشمن برائی کرتے ہیں، امام صاحب نے کہا، کہ لوگوں کا یہی حال ہے، کہ دوست اور دشمن دونوں ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم کو لوگوں کی زبان درازی سے محفوظ رکھے۔

☆اس امت کا آخری طبقہ اسی بات سے صلاح وفلاح پا سکتا ہے، جس سے اس کا پہلا طبقہ کامیاب ہوا ہے۔

☆معاصی کی ابتدا کبر، حسد اور کنجوسی سے ہوتی ہے۔

☆تم جس چیز سے چاہو کھلواڑ کرو، مگر اپنے دین سے کھلواڑ نہ کرو۔

☆اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس کے بارے میں بحث کرنا بدعت ہے۔

☆اگر تم کو دو باتوں میں شک اور تردد ہو، تو جو بات تمہارے زیادہ موافق ہو، اسی کو اختیار کرو۔

☆تم علم سے پہلے حلم حاصل کرو۔

☆جو شخص اپنی باتوں میں سچائی اختیار کرے گا، اپنی عقل سے آخری عمر تک مستفید ہوتا رہے گا اور دوسرے لوگوں کی طرح بڑھاپے میں اس کو نسیان اور بکواس سے نجات رہے گی۔

☆اللہ کا ادب قرآن میں ہے، اس کے رسول کا ادب سنت اور حدیث میں ہے اور صالحین کا ادب فقہ میں ہے۔

سفرآخرت

امام صاحب کی عمر ۸۱/ سال ہوچکی تھی، ضعف وناتوانی نے جسم میں بسیرا کرلیا تھا، باہر آنا جانا ترک ہوچکا تھا، مگر اس حال میں بھی مؤطا کا درس کسی نہ کسی طرح جاری رہا وفات سے بائیس روز قبل بستر علالت پر پڑ گئے مرض روز بروز تخی اختیار کرتا رہا، لوگوں کو آپ کی یہ حالت دیکھ کر یقین ہو چکا تھا، کہ اب امام دارالہجرت اس دنیا میں چند ہی روز کے مہمان ہیں، ان کی جدائی کا غم علما اور شاگردوں کے لیے سوہان روح تھا، جب وقت آخر ہونے کا یقین ہوگیا، تو مدینہ کے تمام علما وامرا آخری دیدار کے لیے جمع ہو گئے، یحییٰ اندلسی کا بیان ہے، کہ مجھے تو اپنی محرومی کا رونا ہی تھا، وہ لوگ بھی جو مدتوں امام کی ملازمت کا شرف حاصل کر چکے تھے، وہ بھی رو رہے تھے، تلامذہ کے علاوہ حدیث وفقہ کے ۱۶۰/ علما مودب باچشم گریاں آس پاس بیٹھے تھے، جسم کی حرارت آہستہ آہستہ سرد ہو رہی تھی، آنکھوں سے آنسو جاری تھے، قعنبی جو امام کے شاگرد رشید ہیں، اسی وقت حاضر ہوئے اور رونے کا سبب دریافت کیا، آپ نے فرمایا، میں نہ رووں تو کون روئے، اے کاش مجھ کو میرے ہر قیاسی فتوے کے بدلے ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا، گریہ جاری تھا، لب متحرک تھے، کہ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا، اب اسی طرح اردگرد طلبہ علما کا ہجوم تھا، لیکن صدر نشین بزم حیات جاوید کے بستر پر آرام کر رہا تھا۔

صحیح روایت کے مطابق ۱۱/ ربیع الاول ۱۷۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

جنازہ میں خلقت کا ہجوم تھا، والی مدینہ عبداللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ پا شریک تھا اور نعش اٹھانے والوں میں وہ خود بھی شامل تھا، جنت البقیع میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

عمر بن سعد انصاری نے اس وقت یہ شعر کسی کو خواب میں پڑھتے سنا۔

لقد اصبح الاسلام زعزع رکنه   غداة ثوی الهادی لدی ملحد القبر
امام الهدی مازال للعلم صائنا   علیه سلام الله فی آخر الدهر

اسلام کے ستون ہل گئے، جس صبح کو رہنما قبر میں آسودہ ہوا وہ ہدایت کا پیشوا اور علم کا ہمیشہ محافظ رہا، اس پر تا قیامت خدا کا سلام ہے۔

امام کا غم ۳۲۲ سال کے بعد بھی پاک دلوں سے کم نہ ہوا تھا، ابو محمد جعفر قاری بغدادی المتوفی ۵۰۰ھ نے امام کا مرثیہ کہا۔

سقى جدثا ضم البقيع بمالك   من المزن مرعاد السحاب مبراق
امام مؤطاه الذى طبقت به   اقاليم فى الدنيا فساح وافاق
اقام به شرع النبى محمد له   حذر من ان يضام واشفاق
له سند عال صحيح وهيبة   فللكل منه حين يرويه اطراق
واصحاب صدق كلهم علم فسل   بهم انهم ان انت ساءلت حذاق
ولو لم يكن الا ابن ادريس وحده   كفاه الا ان السعادة ارزاق

بجلی اور کڑک کے ساتھ برسنے والے بادل اس قبر کو سیراب کریں، جو مالک کو اپنے آغوش میں لیے ہے۔ وہ امام جس کی وہ مؤطا ہے، جس پر دنیا کے وسیع ملکوں اور گوشوں نے اتفاق عام کیا ہے۔ وہ جس نے اپنی مؤطا کے ذریعہ پیغمبر کی شریعت کو قائم کیا اور جس کا اس کو ڈر تھا، کہ اس شریعت پر کہیں ظلم نہ ہو۔ اس کی سند بلند اور صحیح ہے اور اس میں ہیبت ہے جب وہ اس کی روایت کرتے ہیں تو سب بغور سنتے ہیں۔ ان کے بہت شاگرد رشید ہیں، جن میں ہر ایک جبل علم تھا، تو تو ان سے سوال کر اگر تو سوال کرے گا تو وہ ماہرین ہیں۔ اگر امام شافعی کے سوا کوئی اور ان کا شاگرد نہ ہوتا تو بھی ان کے لیے فخر کافی تھا، ہاں خوش بختی بھی روزی ہے۔ (ابن خلکان ترجمہ مالک بن انس)

اولاد واحفاد

ابن حزم نے لکھا ہے، کہ امام مالک کے دو لڑکے یحییٰ اور محمد تھے اور دونوں محدثین کے نزدیک ضعیف تھے، ان کے ایک پوتے احمد بن یحییٰ بن مالک تھے اور تین چچا تھے، اویس، ابوسہل، نافع اور ربیع۔ یہ تینوں مالک بن ابوعامر نافع کے لڑکے تھے۔

(جمہرۃ انساب العرب ص ۴۳۶)

* * *

امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس شافعی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نقوشِ حیات

نام ونسب

اسم گرامی محمد، کنیت ابوعبداللہ، لقب ناصر الحدیث، شافعی، جداعلی کی طرف نسبت ہے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

محمد بن ادریس بن عباس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن مطلب بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۵۷)

امام شافعی کا سلسلہ نسب عبد مناف پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے مل جاتا ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

انما بنو هاشم وبنو المطلب شئ واحد (وشبك بين اصابعه) لم يفارقونا في جاهلية ولا في اسلام (مناقب لابن ابی حاتم الرازی ص ۱۲۴)

بے شک بنو ہاشم اور بنو المطلب ایک ہی ہیں، (حضور نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو پیوست کیا) وہ لوگ نہ تو عہد جاہلیت میں ہم سے جدا ہوئے اور نہ عہد اسلام میں۔

والدہ کا نام فاطمہ بنت عبداللہ بن حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب ہے، مگر خطیب بغدادی اور قاضی عیاض نے لکھا ہے، کہ ان کی والدہ قبیلہ بنو ازد سے تھیں، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الازد جرثومة العرب (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۵۸)

یعنی ازد عرب کے عنصر ہیں۔

حافظ شمس الدین ذہبی لکھتے ہیں:

كانت ام الشافعي ازدية (تاریخ ذہبی ج ۲، ص ۳۰۷)

امام شافعی کی والدہ قبیلہ ازد سے تعلق رکھتی ہیں۔

محققین کے نزدیک یہی قول درست ہے۔

خاندان

امام شافعی کے جداعلی سائب بن عبید مطلبی جو بدر میں گرفتار ہوئے تھے، زرفدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کی، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صورتاً مشابہت رکھتے تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا، مرتبہ صحابیت پر فائز ہوئے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

كان السائب بن عبيد المطلبی احد من اسريوم بدر من المشركين و كان يشبه بالنبی صلی الله عليه وسلم (تاریخ ذہبی ج۲، ص۳۰۶)

سائب بن عبید مطلبی بدر کے دن قید ہونے والے مشرکین میں سے ہیں اور وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے تھے۔

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں تحریر کیا ہے، طاہر بن عبداللہ طبری کہتے ہیں:

شافع ابن السائب الذی ينسب الشافعی اليه قد لقی النبی صلی الله عليه وسلم وهو مترعرع واسلم ابوه السائب يوم بدر فانه كان صاحب راية بنی هاشم فاسر وفد انفسه ثم اسلم فقيل له لم لم تسلم قبل ان تفتدی فقال ماكنت احرم المومنين طمعا لهم فی ۔

(تاریخ بغداد ج۲ ص۵۸)

شافع بن سائب جن کی طرف شافعی کی نسبت کی جاتی ہے، انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، جب کہ وہ نوخیز تھے، ان کے باپ سائب نے بدر کے دن اسلام قبول کیا، وہ جنگ بدر میں کفار کی طرف سے بنوہاشم کے علم بردار تھے، وہ گرفتار کر لیے گئے، تو انہوں نے اپنا فدیہ ادا کیا پھر اسلام لائے، ان سے پوچھا گیا، زرفدیہ دینے سے پہلے آپ نے اسلام قبول کیوں نہیں کیا؟ جواب دیا، میں نے مسلمانوں کو ان کے حق سے محروم کرنا پسند نہیں کیا۔

ایک بار سائب بن عبید بیمار پڑے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے گئے، شافع بن سائب نے اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مراہقت کے زمانہ میں شرف ملاقات پایا ہے، آپ نے ان کو دیکھ کر فرمایا:

من سعادة المرء ان يشبه اباه ۔(اصابہ ج۳ ص ۲۱)

آدمی کی سعادت مندی ہے کہ وہ باپ کے مشابہ ہو۔

بیہقی فرماتے ہیں:

فالسائب بن عبيد صحابی وابنه شافع صحابی واخوه عبدالله السائب صحابی ۔

(الاصابہ فی معرفۃ الصحابۃ ج۳ ص۶۰)

سائب بن عبید صحابی ہیں اور ان کے بیٹے شافع صحابی ہیں، اور ان کے بھائی عبداللہ بن سائب صحابی ہیں۔

عثمان بن شافع تابعین میں شمار ہوتے تھے۔

امام صاحب کے والد ادریس بن عباس مدینہ منورہ کے قریب ایک قصبہ "تبالہ" کے رہنے والے تھے، پھر مدینہ منورہ چلے آئے، معاشی کش مکش کی وجہ سے شام پہنچے اور عسقلان میں سکونت پذیر ہوئے۔

ولادت

امام شافعی کی ولادت غزہ (شام) کے اندر ۱۵۰ھ میں ہوئی، ایک قول یہ بھی ہے، کہ ولادت عسقلان (شام) میں ہوئی، بعض روایتوں میں ہے، کہ ولادت یمن میں ہوئی، علامہ ابن خلکان تحریر فرماتے ہیں، کہ غزہ میں ولادت کا قول زیادہ صحیح ہے۔

ومولده سنة خمسين ومائة وقد قيل انه ولد فى اليوم الذى توفى فيه الامام ابو حنيفة وكانت ولادته بمدينة غزة وقيل بعسقلان وقيل باليمن والاول اصح

(ابن خلکان ج۲ص۳۱۲)

امام شافعی کے والد کا انتقال آپ کی ولادت سے پہلے یا کچھ روز بعد ہوا۔ ولادت سے پہلے آپ کی والدہ نے یہ خواب دیکھا:

كان المشترى خرج من فرجها حتى انقض بمصر ثم وقع فى كل بلد ومنه شطية .

مشتری ستارہ میرے جسم سے نکلا اور مصر میں گرا، جس کی روشنی ہر شہر میں پہنچی۔

معبروں نے خواب کی تعبیر بیان کی، کہ ام شافعی کے بطن سے ایک بے نظیر بچہ پیدا ہوگا، جس کا علم مصر سے تمام شہروں میں عام ہوگا۔ (تاریخ ذہبی ج۲، ص۳۷)

مکہ مکرمہ میں آمد

امام شافعی کی والدہ در یتیم کو غزہ سے مکہ مکرمہ لائیں، جب کہ وہ دو سال کے تھے۔ ذہبی لکھتے ہیں:

ولد بغزة سنة خمسين ومائة وحمل الى مكة وهو ابن سنتين . (تاريخ ذهبى ج ٢، ص٣٠٥)

امام شافعی سے دوسری روایت ہے:

ولدت باليمن فخافت امى على الضيعة وقالت الحق باهلك فتكون مثلهم فانى اخاف ان تغلب على نسبك فجهزتنى الى مكة فقدمتها وانا يومئذ ابن عشر (اوشبيها بذلك) فصرت الى نسيب لى وجعلت اطلب العلم فيقول لى لاتشتغل بهذا واقبل على ماينفعك فجعلت لذتى فى هذا العلم وطلبه حتى رزقنى الله منه مارزق .

(مناقب لابن ابی حاتم الرازی ص۲۲)

میں یمن میں پیدا ہوا، والدہ کو اندیشہ ہوا، کہ کہیں یمن میں میرا نسب ضائع نہ ہو جائے تو کہا تم اپنے خاندان

سے مِل جاؤ، تاکہ ان کے مانند ہو جاؤ، مجھے ڈر ہے، کہ کہیں تمہارا نسب مغلوب نہ ہو جائے، انہوں نے مجھے سفر مکہ کے لیے آمادہ کیا، تو میں مکہ آیا، جب کہ میری عمر تقریباً دس سال تھی، تو میں اپنے ایک رشتے دار سے ملا اور میں علم حاصل کرنے لگا، وہ مجھ سے کہتا، تم اس میں منہمک نہ ہو اور اس علم کی طرف توجہ کرو جو تمہیں فائدہ پہنچائے، تو میں نے اس علم کی تحصیل میں دلچسپی پیدا کی، یہاں تک کہ اللہ نے مجھے یہ علم عطا کیا۔

پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ دو سال کی عمر میں مکہ آئے اور دوسری روایت سے پتہ چلتا ہے، کہ دس سال کی عمر میں مکہ تشریف لائے، ان دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح ممکن ہے، کہ والد کے وصال کے بعد ان کی والدہ غزہ سے پہلے مکہ لائیں، تاکہ خاندان سے ان کا تعارف کرادیں اور ان کی طرف ان کی نسبت قائم کردیں، پھر وہ اپنے شیر خوار بچے کو اپنے میکے یمن لے کر چلی گئیں، تاکہ ان کی پرورش و پرداخت ہو سکے، جب دس سال کی عمر ہوئی تو انہیں دوبارہ مکہ بھیج دیا تاکہ اپنے خاندان کی تہذیب و شرافت اور علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہوں۔

تحصیل علم اور اس کے لیے اسفار

جب نوشت و خواند کے لائق ہوئے، والدہ نے تعلیم کے لیے مکتب میں بیٹھا دیا، مفلسی کی وجہ سے ماں کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے، کہ معلم کی فیس ادا کی جاتی، جس کی بنا پر معلم آپ کی طرف متوجہ نہ ہوتا، فطرت سلیم اور اخاذ طبیعت کے مالک امام شافعی استاذ کی بے رخی سے دل برداشتہ نہ ہوئے، بلکہ جب استاذ دوسرے بچوں کو پڑھاتا، استاذ کی باتیں حفظ کر لیتے اور استاذ کی عدم موجودگی میں وہی سبق دوسرے بچوں کو پڑھانے لگتے، معلم نے جب آپ کا طریقہ دیکھا، تو ذوق علم اور قوت حفظ و ضبط سے کافی متاثر ہوا، معلم نے غور کیا اور دیکھا، کہ شافعی اس کے حق میں اس اجرت سے کہیں زیادہ مفید ہے، جس کی وہ آرزو رکھتا ہے، معلم نے اس اجرت کا مطالبہ ترک کر دیا، آپ کی تعلیم اسی طرح چلتی رہی، یہاں تک کہ سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کر لیا، خود فرماتے ہیں:

حفظت القرآن وانا ابن سبع سنين وحفظت المؤطا وانا ابن عشر سنين ۔

(تاریخ بغداد ج۲ ص۶۳)

میں نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور دس سال کی عمر میں مؤطا یاد کر لی۔

امام شافعی فرماتے ہیں:

كانت نهمتی فی شيئين فی الرمی وطلب العلم فنلت من الرمی حتی كنت اصيب من عشرة عشرة ۔ (تہذیب التہذیب ج۹ ص۲۴)

بچپن میں میری ساری توجہ دو باتوں کی طرف تھی، تیر اندازی اور تحصیل علم، تیر اندازی میں مجھے اتنی مہارت ہو گئی تھی، کہ دس میں دسوں نشانے صحیح بیٹھتے۔

تقریباً دس سال کی عمر میں مکہ مکرمہ آئے، جہاں علوم ومعارف کے چشمے جاری تھے اور علم وعرفان کے نور سے حرم الٰہی جگمگا رہا تھا، امام صاحب یتیم تھے، تنگدستی دامن گیر تھی، مگر تحصیل علم کا شوق انہیں کشاں کشاں علما ومشائخ کی درس گاہوں تک لے گیا، قبیلہ ہذیل میں رہ کر عربیت اور شعر وادب کی تعلیم پائی، اسی زمانہ میں ایک ماہر انساب کے پاس تعلیم حاصل کرنے گئے، تو اس نے کہا، پہلے کوئی ذریعہ معاش پیدا کرو پھر علم سیکھنا، لیکن تحصیل علم کی دھن کے پکے امام اگر کسب معاش میں الجھتے تو پھر تحصیل علم یکسوئی کے ساتھ ممکن نہ تھی، اس لیے آپ فلاکت وافلاس کی حالت ہی میں اس طرح طلب علم کرتے رہے، کہ کاغذ خریدنے کے لیے پیسہ نہ ہوتا، تو ہڈیوں، ٹھیکریوں اور کھجور کے پتوں پر علوم ومعارف کے شہ پارے تحریر فرماتے، بیان کرتے ہیں:

> **كنت اجالس العلماء واحفظ الحديث والمسئلة وكان منزلنا بمكة في شعب الخيف وكنت انظر الى العظم يلوح فاكتب فيه الحديث والمسئلة وكان لنا جرة قديمة فاذاامتلأ العظم طرحته في الجرة ۔** (مناقب ابوحاتم رازی ص ۲۴)
>
> میں علما کی مجلسوں میں شریک ہوتا تو احادیث ومسائل یاد کرتا ہمارا گھر مکہ کے اندر شعب الخیف میں تھا، میں ہڈیاں جمع کرتا اور ان پر حدیثیں اور مسئلے لکھ لیا کرتا، ہمارے پاس ایک پرانا گھڑا تھا، جب ہڈیاں زیادہ ہوجاتیں، تو ان کو گھڑے میں رکھ دیتا۔

مسلم بن خالد زنجی رضی اللہ عنہ (م ۱۸۰ھ) کی بارگاہ میں

امام شافعی تحصیل فقہ کے لیے حضرت مسلم بن خالد زنجی کے حلقہ درس سے وابستہ ہوئے اور ان سے فقہ وحدیث کی تعلیم پائی، مسلم بن خالد زنجی بڑے جوہر شناس تھے، امام صاحب کی ذکاوت وذہانت اور قوت حفظ کی وجہ سے بے حد مانوس ہوگئے، کامل تین برس تک ان سے فقہ وحدیث کی تکمیل کی، انہیں کی مجلس میں اکثر وبیشتر امام مالک کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا، اس لیے آپ کو امام مالک کی خدمت میں حاضری کا شوق پیدا ہوا۔

امام شافعی نے فقہ وفتاوی کی تعلیم ابتدا میں مسلم بن خالد زنجی سے حاصل کی اور اس میں ایسا درجہ کمال حاصل کیا، کہ استاذ نے ۱۸ سال کی عمر میں افتا کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ابوحاتم رازی لکھتے ہیں:

> **عن مسلم بن خالد انه قال لمحمد بن ادريس الشافعي وهو ابن ثمان عشرة سنة افت يا ابا عبدالله فقد آن لك ان تفتي ۔** (ایضاً ۴۰)
>
> مسلم بن خالد زنجی سے روایت ہے، کہ انہوں نے محمد بن ادریس شافعی سے کہا، جب کہ وہ اٹھارہ سال کے تھے اے ابوعبداللہ! فتویٰ دو اب تمہارے فتویٰ دینے کا وقت آگیا۔

امام مالک کی خدمت میں

امام مسلم بن خالد زنجی کی مجلس میں امام مالک کا ذکر خیر بار بار ہوتا، جس کی بنیاد پر انہیں امام مالک سے سماع حدیث کا ذوق پیدا ہوا، شوق علم کو اس واقعہ نے مزید تقویت بخشی:

بیان کرتے ہیں، کہ اس زمانہ میں آل زبیر کے ایک صاحب میرے پاس سے گزرے اور کہنے لگے، کہ یہ بات مجھے بہت گراں گزر رہی ہے، کہ تم اس فصاحت اور ذکاوت کے ہوتے ہوئے، تفقہ سے محروم رہو اور تم کو دینی سیادت حاصل نہ ہو، میں نے کہا، کہ تحصیل فقہ کے لیے کس کے پاس جاؤں؟ انہوں نے کہا ''**هذا مالك سيد المسلمين اليوم**'' امام شافعی نے تنگ حالی کے باوجود مدینہ منورہ کے سفر کا حتمی فیصلہ کرلیا، انہوں نے ایک شخص سے مؤطا امام مالک مستعار لی اور اسے نو راتوں میں حفظ کرلیا، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ساتھ امام مالک کے فقہی مجتہدات سے بھی قدرے روشناس ہوگئے، پھر وہ حاکم مکہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس سے ایک خط امیر مدینہ اور ایک خط امام مالک کے نام حاصل کیا، پھر وہ مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے، سفر کی داستان اس طرح بیان کرتے ہیں:

میں نے مکہ کو چودہ سال کی عمر میں چھوڑا، جب کہ میری مونچھیں بھی نمودار نہیں ہوئی تھیں، مقام ابطح سے ذی طوی کے لیے نکلا، تو میرے جسم پر دو یمنی چادریں تھیں، میں نے جس قافلہ کو دیکھا، اس کو سلام کیا، وہ میرے سلام کا جواب دیتے، ایک قافلے سے بوڑھا شخص میری طرف بڑھا اور کہا، میں اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، کہ آپ ہمارے کھانے میں شریک ہوں، میں نے بلا تکلف دعوت قبول کرلی اور کھانے میں شریک ہوگیا، کھانے کے بعد بوڑھے نے پوچھا، کہ کیا تم مکی ہو؟ میں نے کہا ہاں! مکی ہوں، بوڑھے نے پوچھا، کیا تم قریشی ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، میں نے بوڑھے سے دریافت کیا، اے چچا! آپ نے مجھے کس طرح پہچانا؟ اس نے کہا، شان وشوکت، لباس اور کھانے کے انداز سے میں نے شیخ سے پوچھا، تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا، میں مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کا باشندہ ہوں، میں نے پوچھا، مدینہ منورہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول سے فتویٰ دینے والے سب سے بڑے عالم کون ہیں؟ جواب دیا، مالک بن انس! میں نے امام مالک کی زیارت کا شوق ظاہر کیا، شیخ نے کہا، اللہ تیرے شوق میں اضافہ کرے، پھر اس نے ایک خاکستری اونٹ سواری کے لیے پیش کیا، میں سوار ہوا اور اس قافلے کے ساتھ آٹھ دن میں مدینہ منورہ پہنچا۔ (سیرت امام شافعی ص ۱۸)

مدینہ منورہ میں

مدینہ پہنچ کر امام شافعی والی مدینہ سے ملے اور امیر مکہ کے دونوں خطوط اس کے حوالے کیے، امیر مدینہ نے خط پڑھنے کے بعد کہا:

يا فتى ان مشيتني من جوف المدينة الى مكة حافيا راجلا اهون على من المشى الى باب مالك بن انس ۔

اے نوجوان! امیر مدینہ سے مکہ تک پیدل ننگے پاؤں جانا زیادہ آسان ہے، اس کام سے کہ میں مالک بن انس کے دروازے تک جاؤں۔

امام شافعی نے کہا اللہ امیر کی اصلاح فرمائے، آپ کسی کے ذریعہ امام مالک کو طلب فرمالیں اور میرے بارے میں سفارش کر دیں، امیر مدینہ نے کہا، کیا ہی اچھا ہو، کہ ہم خود ہی آپ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کے دروازے پر اتنی دیر بیٹھیں، کہ وادی عقیق کی گرد ہمیں آلودہ کر دے، پھر اندر جانے کی اجازت ملے، بہر حال عصر کے بعد امیر مدینہ اپنے خدم وحشم کو لے کر نکلا، میں بھی ساتھ تھا، ہم سب وادی عقیق میں پہنچے، جہاں امام صاحب کا مکان تھا اور اجازت چاہی، اندر سے باندی نے کہا، شیخ کہتے ہیں، کہ اگر آپ کو مسائل معلوم کرنے ہیں، تو ایک کاغذ پر لکھ کر بھیج دیں، میں جواب دے دوں گا، امیر مدینہ نے کہا، ایک ضرورت کے سلسلے میں امیر مکہ نے ایک خط لکھا ہے باندی یہ سن کر اندر گئی پھر ایک کرسی لے کر باہر آئی جسے بچھا دیا، اس کے بعد امام مالک باہر تشریف لائے ان کی شخصیت وقار اور تمکنت ظاہر تھی، دراز قد مسنون اللحیہ تھے کرسی پر بیٹھ گئے، تب امیر مدینہ نے امیر مکہ کا خط دیا، امام نے خط لے کر پڑھنا شروع کیا، اور سفارشی عبارت پر پہنچے، تو خط پھینک دیا اور کہا:

یاسبحان اللہ ! وصار علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوخذ بالوسائل ؟

سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم وسیلوں اور سفارشوں سے حاصل کیا جانے لگا؟

میں نے دیکھا، کہ امیر مدینہ امام صاحب سے بات کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا، تو میں نے خود آگے بڑھ کر کہا، میں مُطّلِبی آدمی ہوں اور میں نے اپنی داستان بیان کی، امام صاحب نے باتیں سن کر تھوڑی دیر میری طرف دیکھا اور نام پوچھا، میں نے کہا، میرا نام محمد ہے امام صاحب نے کہا:

یا محمد ! اتق اللہ و اجتنب المعاصی فانه سیکون لك شان من الشان ۔

(الشافعی حاشیه ص ۲۰)

محمد! اللہ سے خوف پیدا کرو اور گناہوں سے بچو کیوں، کہ آئندہ تم بہت باحیثیت انسان ہو گے۔

پھر ارشاد فرمایا، تم کل آنا اور اپنے ساتھ کسی آدمی کو لانا، جو تمہارے لیے مؤطا کی قرأت کرے میں نے عرض کیا، خود ہی میں مؤطا کی قرأت کروں گا۔

امام مالک کی درس گاہ میں مؤطا کا درس

چوں کہ اسلامی ملکوں میں فقہا و محدثین کے درس کے دو طریقے مروج تھے۔

(۱) شیخ کسی اونچی جگہ بیٹھ جاتا، تلامذہ صف بستہ ہو کر اس کے گرد بیٹھ جاتے اور شیخ خود پڑھتا جاتا یا روایت بیان کرتا جاتا جسے طلبہ قلم بند کر لیا کرتے۔

(۲) اکثر شیوخ کا طریقہ یہ تھا، کہ وہ اپنی احادیث، فتاوی وتعلیقات کو خود ہی لکھ لیتے تھے اور کسی ذہین سمجھدار طالب علم

کو دے دیتے تھے، جب درس شروع ہوتا تو شاگرد اس کتاب کو پڑھتا جاتا اور شیخ اس کی وضاحت کرتا، یہی طریقہ امام مالک کے درس کا بھی تھا، ابن حبیب، معن بن عیسیٰ، یحییٰ اکثر مؤطا پڑھنے والے تھے، یہی وجہ ہے، کہ صحیح بخاری میں یحییٰ حدثنا و اخبرنا کے بجائے یہ کہتے ہیں ”**قرأت علی مالك**“ یعنی میں نے امام مالک کے سامنے پڑھا، امام شافعی اپنے سفرنامے میں مدینہ منورہ کی حاضری اور امام مالک سے ملاقات کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

آٹھویں دن نماز عصر کے بعد مدینہ میں، ہمارا داخلہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں نماز پڑھی، پھر قبر شریف کے قریب حاضر ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام پیش کیا، یہیں امام مالک دکھائی دیے، ایک چادر کی تہبند باندھے ہوئے تھے، دوسری چادر اوڑھے تھے اور بلند آواز سے حدیث روایت کر رہے تھے، مجھ سے نافع نے ابن عمر کے واسطے سے اس قبر کے مکین سے روایت کیا ہے، یہ کہہ کر انہوں نے زور سے اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور قبر شریف کی طرف اشارہ کیا، یہ نظارہ دیکھ کر امام مالک بن انس کی ہیبت مجھ پر چھا گئی اور جہاں جگہ ملی، وہیں بیٹھ گیا، امام مالک حدیث روایت کرنے لگے، میں نے جلدی سے زمین پر پڑا ہوا ایک تنکا اٹھا لیا، مالک جب کوئی حدیث سناتے، تو میں اسی تنکے کو اپنے لعاب دہن سے تر کر کے اپنی ہتھیلی پر لکھ لیتا، امام مالک میری یہ حرکت دیکھ رہے تھے، مگر مجھے خبر نہ تھی، آخر مجلس ختم ہوگئی اور امام مالک منتظر رہے، کہ سب کی طرح میں بھی اٹھ جاتا ہوں یا نہیں، میں بیٹھا ہی رہا، تو امام مالک نے مجھے اشارے سے بلایا، میں قریب پہنچا تو کچھ دیر غور سے مجھے دیکھتے رہے، فرمایا، تم حرم کے رہنے والے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں میں حرم کا باشندہ ہوں پوچھا مکی ہو میں نے کہا ہاں! کہنے لگے، قرشی ہو؟ میں نے کہا، جی ہاں! فرمانے لگے سب اوصاف پورے ہیں، مگر تم میں ایک بے ادبی بھی ہے، میں نے عرض کیا، آپ نے میری کون سی بے ادبی دیکھی ہے، کہنے لگے، میں رسول اللہ کے کلمات طیبات سنا رہا تھا اور تم تنکا لیے اپنے ہاتھ پر کھیل رہے تھے، میں نے جواب دیا، کاغذ پاس نہیں تھا، اس لیے آپ سے جو کچھ سنتا تھا اسے لکھتا جاتا تھا، اس پر امام مالک نے میرا ہاتھ دیکھا اور فرمایا، ہاتھ پر تو کوئی تحریر نہیں ہے، میں نے عرض کیا، ہاتھ پر لعاب کا اثر باقی نہیں رہتا، لیکن آپ نے جتنی حدیثیں سنائی ہیں، مجھے سب یاد ہو چکی ہیں، امام مالک کو تعجب ہوا، کہنے لگے سب نہیں ایک ہی حدیث سنا دو، میں نے فوراً کہا ہم سے مالک نے نافع مولیٰ ابن عمر کے واسطے سے اس قبر کے مکین سے روایت کیا ہے اور مالک ہی کی طرح میں نے بھی ہاتھ پھیلا کر قبر شریف کی طرف اشارہ کیا، پھر وہ پوری پچیس حدیثیں سنا دیں، جو انہوں نے مجلس کے خاتمے تک سنائی تھیں۔

اب سورج ڈوب چکا تھا، امام مالک نے نماز پڑھی، پھر میری طرف اشارہ کر کے غلام سے کہا، اپنے آقا کا ہاتھ تھام لو اور مجھ سے فرمایا، اٹھو غلام کے ساتھ میرے گھر جاؤ، میں نے انکار نہیں کیا، اور اٹھ کھڑا ہوا امام مالک جو مہربانی مجھ سے کرنا چاہتے تھے، میں نے بخوشی قبول کر لیا، جب گھر پہنچا، تو غلام ایک کوٹھری میں مجھے لے گیا اور کہنے لگا گھر میں قبلے کا رخ یہ ہے، یہ پانی کا لوٹا ہے اور بیت الخلا ادھر ہے کچھ دیر بعد امام مالک تشریف لائے، غلام بھی ساتھ تھا، اس کے ہاتھ میں ایک خوان تھا، مالک نے خوان لے کر فرش پر رکھ دیا، پھر مجھے سلام کیا اور غلام سے کہا، ہاتھ دھلاؤ، غلام برتن لیے میری طرف بڑھا، مگر مالک

نے ٹوکا، جانتا نہیں، پہلے میزبان کو ہاتھ دھونا چاہیے اور کھانے کے بعد مہمان کو، مجھے یہ بات پسند آئی اور اس کی وجہ دریافت کی، امام مالک نے جواب دیا، میزبان کھانے پر مہمان کو بلاتا ہے، اس لیے پہلے ہاتھ بھی میزبان کو ہی دھونا چاہیے اور کھانے کے بعد آخر میں اس لیے ہاتھ دھوتا ہے، کہ شاید اور کوئی مہمان آجائے تو کھانے میں میزبان اس کا بھی ساتھ دے سکے۔

اب امام مالک نے خوان کھولا، اس میں دو برتن تھے، ایک میں دودھ تھا، دوسرے میں کھجوریں، مالک نے بسم اللہ پڑھی اور میں نے بھی بسم اللہ پڑھی اور ہم نے کھانا کھالیا، مگر مالک جانتے تھے، کہ کھانا کافی نہیں ہے، کہا، اے ابوعبداللہ! ایک مفلس وقلاش فقیر دوسرے فقیر کے لیے جو کچھ پیش کرسکتا تھا، یہی تھا، میں نے عرض کیا، وہ معذرت کیوں کرے، جس نے احسان کیا ہے، معذرت تو قصوروار کرتا ہے۔

کھانے کے بعد امام مالک مکہ والوں کے حالات پوچھتے رہے اور جب رات زیادہ ہوگئی، تو اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا، اب تم آرام کرو، میں تھکا ہوا تو تھا، ہی لیٹتے ہی بے خبر سوگیا، پچھلے پہر دروازے پر دستک ہوئی اور آواز آئی، خدا کی تم پر رحمت ہو، ''نماز'' میں اٹھ بیٹھا، کیا دیکھتا ہوں، خود امام مالک ہاتھ میں لوٹا لیے کھڑے ہیں، مجھے بڑی شرمندگی ہوئی، مگر وہ کہنے لگے، ابوعبداللہ! کچھ خیال نہ کرو، مہمان کی خدمت فرض ہے، میں نماز کے لیے تیار ہوگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں امام مالک کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی، اندھیرا بہت تھا، کوئی کسی کو پہچان نہ سکتا تھا، سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ کے تسبیح وذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے، یہاں تک کہ پہاڑیوں پر دھوپ نمودار ہوگئی، امام مالک کل جس جگہ بیٹھے تھے، اسی جگہ آج بھی جابیٹھے اور اپنی کتاب مؤطا میرے ہاتھ میں دے دی، میں نے کتاب سنانا شروع کیا اور لوگ لکھنے لگے۔

میں امام مالک کے گھر آٹھ مہینے رہا، پوری مؤطا مجھے حفظ ہوگئی، مجھ میں اور امام مالک میں اس قدر محبت ہوگئی تھی، کہ انجان آدمی دیکھ کر کہہ نہیں سکتا تھا، کہ مہمان کون ہے؟ اور میزبان کون؟ پھر وہ مؤطا کی قرأت کرتے رہے اور کچھ دنوں میں اس سے فراغت پالی، امام صاحب فرماتے ہیں، مؤطا کی قرات کے دوران امام مالک کی ہیبت سے جب میں پڑھنا بند کردیتا امام صاحب میری خوبی قرات اور حسن اعراب کو پسند فرماتے اور ارشاد ہوتا ''یافتی زد'' 'اے جوان اور پڑھو! یہاں تک کہ میں نے چند دنوں میں مؤطا کی قرات کرلی۔ (امام شافعی ص ۲۰)

مؤطا کی قرات کے بعد بھی شیخ کی مجلس سے ان کی وابستگی قائم رہی اور وہ امام جلیل سے ان فقہی مسائل کی تحصیل کرتے رہے وہ ارشاد فرمایا کرتے:

امام شافعی نے امام دار الہجرت سے خوب فیض حاصل کیا اور ان کے علمی احسانات کے معترف رہے فرمایا کرتے تھے:

مالك معلمي واستاذي ومنه تعلمنا العلم وما احد امن علي من مالك وجعلت مالكا حجة فيما بيني وبين الله ۔

مالک میرے معلم اور میرے استاذ ہیں، میں نے علم ان سے سیکھا ان سے زیادہ مجھ پر کسی کا احسان نہیں ہے،

میں نے ان کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنالیا ہے۔ (الدیباج المذہب ص ۲۲۸)

امام صاحب کی دقیقہ رسی

امام محمد بن جریر طبری سے روایت ہے، کہ جب امام شافعی مدینہ منورہ میں تکمیل علوم کر چکے تو واپسی سے پہلے ایک دن آپ امام مالک کے حلقہ درس میں شریک ہوئے، وہاں ایک شخص آیا اور امام مالک سے عرض کیا میں قمریوں کا تاجر ہوں، میں نے ایک شخص کے ہاتھ قمری فروخت کی اور یہ بھی کہا کہ قمری خوب بولتی ہے، تھوڑی دیر کے بعد جس نے قمری خریدا تھا، واپس آیا اور کہنے لگا، کہ یہ قمری تو نہیں بولتی، اس دوران میری اور اس کی بحث شروع ہوگئی، دوران بحث میری زبان سے یہ جملہ نکل گیا، کہ میری قمری کبھی خاموش نہیں رہتی، اگر رہے تو میری بیوی کو طلاق ہے، اب فرمایئے میری بیوی کو طلاق تو نہیں ہوئی، امام مالک نے جواب دیا، تیری بیوی کو طلاق ہوگئی، وہ شخص رنجیدہ گھر واپس چلا گیا، امام شافعی خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیے، تھوڑی دور پہنچ کر اس شخص کو آواز دے کر روکا اور پوچھا، تیری قمری اکثر بولتی ہے یا اکثر چپ رہتی ہے؟ اس نے کہا وہ اکثر بولتی ہے، کبھی کبھی خاموش بھی رہتی ہے، امام شافعی نے کہا، مطمئن رہو، تمہاری بیوی کو طلاق نہیں ہوئی، یہ جواب دے کر پھر امام مالک کے حلقہ میں آکر شریک ہوگئے، وہ سائل پھر واپس آیا اور امام مالک سے کہا، جناب والا! میرے مسئلے میں پھر غور فرمایئے، امام مالک نے پھر وہی جواب دیا، سائل نے کہا، کہ آپ کے حلقے میں یہ نوجوان شخص شریک ہے، اس نے ابھی مجھے مطمئن کردیا، کہ طلاق نہیں ہوئی، اس پر امام مالک کو غصہ آیا اور فرمانے لگے، کہ کثرت وقلت کی یہاں کیا بحث ہے؟ امام شافعی نے جواب دیا، کہ آپ ہی نے مجھ سے بواسطہ عبیداللہ بن زیاد روایت بیان فرمائی ہے، کہ فاطمہ بنت قیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا، یارسول اللہ معاویہ اور ابوجہم نے مجھے شادی کا پیغام بھیجا ہے، فرمایئے، کہ میں کس سے نکاح کروں؟ آپ نے فرمایا، معاویہ تو تنگ دست ہے اور ابوجہم کبھی کاندھے سے لکڑی ہی نہیں اتارتا، حالاں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے تھے، کہ ابوجہم سوتا بھی ہے اور دوسری حاجتوں میں بھی مصروف رہتا ہے، میں نے اندازہ کیا، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشائے مبارک یہ تھا، کہ وہ اکثر کاندھے پر لکڑی رکھے رہتا ہے، اس بنا پر میں نے اس کو یہ فتویٰ دیا، کہ قمری چوں کہ اکثر بولتی ہے اس لیے طلاق نہیں ہوئی۔

امام مالک نے سائل سے فرمایا، ہاں! بھائی جاؤ! واقعی طلاق نہیں ہوئی، شافعی کا استدلال معقول ہے، امام شافعی کی اس دقیقہ سنجی نے امام مالک سے کہلوادیا کہ اب تم میں فتویٰ دینے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، امام مالک اور دیگر محدثین وفقہائے مدینہ نے متفقہ طور پر آپ کو فتویٰ دینے کی اجازت عطا فرمائی۔

بنی ہذیل میں آمد

امام شافعی امام دارالہجرت کی خدمت سے ان کی وفات تک وابستہ رہے، مگر ان کی اجازت سے دوسرے بلاد وامصار کا سفر بھی کرتے رہے، مؤطا کی قرأت سے فراغت اور آپ کے فقہی کمالات کی خوشہ چینی کے بعد والدہ محترمہ کی زیارت کے لیے

مکہ مکرمہ تشریف لائے، وہاں سے اپنے نانیہال یمن گئے، قبیلہ ہذیل تمام قبائل عرب میں اپنی زبان کی شستگی اور فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا، اس قبیلہ میں رہ کر مختلف علوم وفنون کی تکمیل کی، تیراندازی، فن لغت، فن تاریخ، علم انساب، فن نحو، عروض، علم فراست ان سب علوم وفنون میں اس قدر کمال پیدا کیا، کہ ناموران عرب نے آپ کو ماہر فن اور امام وقت تسلیم کیا۔

تیراندازی عرب سپاہیانہ زندگی کا خاص جوہر تھا اور ایک مسلمان کے لیے غازی بننا ضروری تھا، امام شافعی اس فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے، عمرو بن سواد امام صاحب سے روایت کرتے ہیں:

كانت نهمتي في شيئين في الرمي وطلب العلم فنلت من الرمي حتى كنت اصيب من عشرة عشرة وسكت عن العلم فقلت له انت والله في العلم اكبر منك في الرمي .

(مناقب لابن حاتم الرازی ص ۲۴)

اور مجھے (شافعی کو) دو چیزوں میں شغف تھا، تیراندازی اور طلب علم، میں نے تیراندازی میں ایسا کمال پیدا کیا، کہ دس تیروں میں تمام تیر نشانے پر بیٹھتے، آپ علم کے بارے میں خاموش رہے، میں (عمرو بن سواد) نے کہا، خدا کی قسم! آپ تیراندازی کی بہ نسبت علم میں کہیں زیادہ کمال رکھتے ہیں۔

یمن کی امارت

امام شافعی امام دار الہجرت اور دوسرے ائمہ فن سے کسب علم وفن کے بعد جب مکہ پہنچے، تو ان کے فضل وکمال کا چرچا عام ہو چکا تھا، اسی زمانہ میں امیر یمن مکہ آیا، عمائدین قریش نے اس سے گفتگو کی اور میری اہلیت بیان کی تا کہ وہ مجھے یمن لے جائے، لیکن میرے پاس سفر کے اخراجات کے لیے رقم موجود نہ تھی، مجبوراً میں نے اپنی والدہ کی ایک چادر سولہ دینار میں رہن رکھی اور سامان سفر مہیا کیا، یمن پہنچ کر امیر نے مجھے ایک مقام پر مقرر کیا، میں نے پوری ذمے داری کے ساتھ وہ خدمت انجام دی، تو اس نے میری کارکردگی سے مطمئن اور خوش ہو کر مجھے جزوی منصب قضا پر فائز کر دیا۔

مقدمات کے فیصلوں میں حد درجہ محتاط تھے، کسی کا اثر قبول نہ کرتے اور تحقیق وتفتیش کا جو نظام قائم کیا، اس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

كنت بنجران وبها بنو الحارث بن (عبدالمدان) وموالى ثقيف فجمعتهم فقلت اختاروا سبعة نفر منكم فمن عدلوه كان عدلا ومن جرحوه كان مجروحا فجمعوا لى سبعة منهم فجلست للحكم فقلت للخصوم تقدموا فاذا شهد الشاهد عندى التفت الى السبعة فان عدلوه كان عدلا وان جرحوه قلت زدنى شهودا فلما اتيت على ذلك جعلت اسجل واحكم . (ادب الشافعی ومناقبه ج ۱ ص ۳۱)

میں نجران میں تھا اور بنی حارث بن عبدالمدان اور ثقیف کے موالی بھی وہیں تھے، میں نے ان کو جمع کیا اور کہا،

اپنے میں سے سات لوگوں کو منتخب کرلو، تو یہ لوگ جسے عادل قرار دیں، عادل ہوگا اور جسے مجروح گردانیں مجروح ہوگا، انہوں نے میرے لیے سات لوگوں کو جمع کیا، میں فیصلہ کرنے کے لیے بیٹھا، تو میں نے مخاصمین سے کہا، آگے بڑھو، جب کوئی گواہ میرے پاس گواہی دیتا تو میں ساتوں کی طرف متوجہ ہوتا، اگر وہ اسے عادل قرار دیتے تو عادل ہوتا اور اگر اسے غیر عادل بتاتے تو میں کہتا دوسرے گواہوں کو پیش کرو، جب میں اس حال تک پہنچتا تو میں دستاویز لکھواتا اور فیصلہ کرتا۔

چند دنوں کے بعد امیر نے مزید ترقی دی اور میں نے اس کارکردگی میں اچھی خاصی شہرت حاصل کرلی، اس زمانہ میں یمن سے عمرہ کرنے والوں کا وفد رجب میں مکہ آیا اور ان لوگوں نے میرا تذکرہ یہاں نہایت اچھے انداز میں کیا، جس کی وجہ سے مکہ مکرمہ میں تعریف ہونے لگی۔

جب میں یمن سے مکہ آیا اور ابن ابی یحییٰ، ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ سمعانی مدنی اسلمی متوفی ۱۸۴ھ کی خدمت میں پہنچا اور سلام کرکے بیٹھ گیا، انہوں نے سخت لہجے میں مجھے ڈانٹا اور کہا، کہ تم لوگ ہماری مجلس درس میں حاضر ہوتے ہو اور جب کسی کو کوئی منصب مل جاتا ہے تو وہ اس میں مصروف ہوجاتا ہے، اس طرح کی اور بھی باتیں کہیں، میں ان کے یہاں سے چلا آیا، اس کے بعد سفیان بن عیینہ کے پاس گیا، میں نے ان کو سلام کیا، انہوں نے خندہ پیشانی سے مرحبا کہا، محبت سے پیش آئے اور کہا، کہ ہم کو تمہارے امیر ہونے کی اطلاع مل گئی تھی، تم نے وہاں رہ کر علم دین کی اشاعت نہیں کی اور اللہ کی طرف سے تم پر جو ذمے داری تھی اس کو پورے طور پر انجام نہیں دیا، اب وہاں نہ جانا، سفیان بن عیینہ کی نصیحت میرے لیے ابن ابی یحییٰ کی باتوں سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔ (جامع بیان العلم ج۱ص۹۸)

* * *

ابتلا و آزمائش

شہادت حسین ۶۱ھ کے بعد آل فاطمہ اور بنو ہاشم کے ساتھ مسلمانوں کی ارادت و عقیدت بڑھی اور اموی خلفا کے خلاف نفرت و عداوت عام ہونے لگی، حضرت علی کے صاحبزادے محمد ابن حنفیہ امام منتخب کیے گئے، مختار بن ابی عبید ثقفی نے انتقام حسین کے لیے علم اٹھایا، اسے عراق اور خراسان میں کامیابی حاصل ہوئی، قیام حکومت کے بعد اس کے رویے سے خود غرضی اور زمانہ سازی کے آثار نمایاں ہونے لگے، نیز اس کے باطل معتقدات کی بنا پر علویوں میں بیزاری پیدا ہونے لگی، عبدالملک بن مروان نے ۶۸ھ میں مختار کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور زوال پذیر اموی حکومت کی بنیادیں از سر نو مستحکم کیں، مگر یہ اموی خلفا علویوں اور ہاشمیوں کے اثرات کو ختم کرنے کے درپے رہے، ادھر محمد ابن حنفیہ کی وفات ۸۱ھ کے بعد ابو ہشام عبداللہ علوی، ان کے بعد محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس اس لیے نامزد کیے گئے، کہ علاقہ شام میں کوئی ہاشمی نہ تھا، اس بنا پر خلافت کا ادعا خاندان علوی سے منتقل ہو کر خاندان عباس میں آ گیا، محمد بن علی کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا، ان کی جگہ ان کے بیٹے ابراہیم بن محمد امام تسلیم کیے گئے، ابراہیم، مروان اموی کے ہاتھ گرفتار ہو کر مارے گئے، شیعان عباسی نے اس غم میں سیاہ کپڑے پہنے، ابراہیم کے بعد ابو العباس سفاح بنو ہاشم کے سرخیل ہوا، ۱۳۲ھ میں یہ کامیاب ہوا اور اس طرح اموی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

عباسیوں نے امویوں سے خوب انتقام لیا زندوں کے قتل کے ساتھ مردوں کی ہڈیاں قبروں سے نکال کر نذر آتش کیں، لیکن اقتدار حاصل ہونے کے بعد وہ علویوں کے درپردہ دشمن بن گئے، ادھر عباسیوں کا انداز حکمرانی اور نظام خلافت علویوں کے معیار کے مطابق کھوٹا رہا، خلیفہ منصور نے فاطمی و علوی سادات کی بیخ کنی شروع کر دی، آخر تنگ آ کر انہیں سادات میں سے ۱۴۵ھ میں محمد نفس ذکیہ نے مدینہ میں علم خود مختاری بلند کیا، اکثر لوگوں نے ان کا ساتھ دیا، لیکن تقدیر نے ساتھ نہ دیا، بڑی بہادری سے میدان جنگ میں لڑ کر شہید ہو گئے، ان کے بھائی ابراہیم بھی ان کے بعد شہید ہو گئے، ۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور مہدی اس کا جانشین ہوا، مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات پائی، اس کی جگہ موسیٰ ملقب بہ ہادی تخت نشیں ہوا، ایک برس خلیفہ رہا، پھر ۱۷۰ھ میں ہارون رشید خلیفہ ہوا، اس زمانے میں عبداللہ بن حسن بن حسین بن علی نے ہارون کے مظالم سے تنگ آ کر مقابلہ کی تیاریاں کیں، غرضیکہ عباسیوں کا دور بھی سادات کے لیے موجب عتاب و تکلیف ہی رہا۔

امام شافعی جس زمانے میں نجران (یمن) کے والی تھے، مقدمات کے فیصلے شریعت اسلامیہ کی روشنی میں بیرونی اثر اور دباؤ

سے آزاد ہو کر فرمایا کرتے تھے، آپ کا مقدمات کے فیصلوں میں یہ طریقہ تھا، کہ بطور پنچ سات معتمد اشخاص کی ایک کمیٹی بنا دیتے اور لوگوں کے معمولی نزاعات کا خاتمہ اس کمیٹی کے ذریعہ ہو جاتا۔ حق وانصاف کی اس روش سے نجران کے مخصوص لوگوں میں گرانی پیدا ہوگئی اور وہ آپ کے دشمن بن گئے، دوسری طرف یمن میں آپ بہت ہر دل عزیز تھے اور وہاں کے باشندے آپ کی طلاقت لسان، حسن بیان، قوت استدلال، خوش خلقی، عالی نسبی اور جامعیت علم سے بے حد متاثر تھے، آپ دوسرے عمال کو بھی ہمیشہ رشوت، ظلم، جانبداری اور کسی اثر کی وجہ سے فیصلہ کرنے سے روکتے رہتے تھے، در پردہ آپ کے خلاف سازشوں میں حصہ لینے والے ایسے بدنفس عمال بھی تھے، مطرب جو ایک عامل کی حیثیت رکھتا تھا، اس نے بصیغہ راز ہارون رشید کو ایک عریضہ لکھا، کہ اگر آپ یمن کی خیر چاہتے ہیں، تو محمد بن ادریس شافعی کو نکالیے اور سزا دیجیے، اس شخص کا یہاں بہت اثر ہے اور ہر ملک میں سادات کا خاندان پھر خلافت کا خواب دیکھ رہا ہے اور شافعی چوں کہ خود ہاشمی ہے، اس لیے قرینہ یہ ہے کہ ان کی اعانت بھی در پردہ سادات کو حاصل ہے، جب یہ خط ہارون رشید کو ملا، تو آپے سے باہر ہو گیا، فوراً میر منشی کو بلوایا اور حماد بربری کے نام بصیغہ راز فرمان لکھوایا، کہ محمد بن ادریس شافعی اور تمام سادات کو گرفتار کر کے فوراً دار الخلافت بھیج دو، چنانچہ حماد نے تعمیل کی، یمن کے تمام سادات اور امام شافعی کو گرفتار کر کے ہارون رشید کے پاس ”رقہ“ بھیج دیا، رشید نے حکم دیا، کہ دس دس سیدوں کو روزانہ قتل کرتے رہو، چنانچہ رشید کے سامنے روزانہ دس سید شہید کیے جاتے، جب آپ کی باری آئی، آپ نے ایسی موثر اور پردرد تقریر فرمائی، جس سے رشید کانپ اٹھا اور اس نے آپ کے قتل کے حکم کو منسوخ کرتے ہوئے حراست میں رکھے جانے کا حکم صادر کیا۔

اسی دوران امام شافعی کے ایک علمی مباحثہ کی تفصیل ہارون رشید کے گوش گزار ہوئی، جس سے خوش ہو کر اس نے آپ کو آزاد کر دیا اور پانچ سو درہم عطا کیے۔

حافظ ابن کثیر اختصار کے ساتھ رقم طراز ہیں:

آپ نے یمن کے علاقے میں نجران کی عدالت سنبھالی، پھر ان لوگوں نے آپ کا مقابلہ کیا اور رشید کے پاس آپ کی چغلی کی، کہ آپ خلافت کے خواہاں ہیں، پس آپ کو پابجولاں ایک خچر پر بغداد لایا گیا اور آپ ۱۸۴ھ میں تیس سال کی عمر میں بغداد آئے اور رشید سے ملاقات کی، آپ نے اور محمد بن حسن نے رشید کے سامنے مناظرہ کیا اور محمد بن حسن نے آپ کی تعریف کی، رشید پر واضح ہو گیا، کہ آپ اس بات سے بری ہیں، جو آپ کی طرف منسوب کی گئی اور محمد بن حسن نے آپ کو اپنے یہاں اتارا اور حضرت ابو یوسف اس سے ایک سال قبل فوت ہو چکے تھے اور بعض کہتے ہیں، کہ دو سال قبل فوت ہو چکے تھے اور محمد بن حسن نے آپ کی عزت کی اور امام شافعی نے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر ان سے لکھا، پھر رشید نے آپ کو دو سو دینار دیے اور بعض نے پانچ سو دینار بیان کیے۔ (ابن کثیر اردو ج۱۰ ص۷۶۴)

بعض مصنفین نے امام محمد بن حسن شیبانی اور امام ابو یوسف پر یہ بے بنیاد الزام لگایا ہے، کہ انہوں نے خلیفہ ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر برانگیختہ کیا تھا، امام شافعی کی رقہ میں آمد ۱۸۴ھ میں ہوئی، اس سے قبل ہی قاضی ابو یوسف رحلت فرما چکے

تھے، جس کی صراحت ابن کثیر نے کی ہے، امام محمد بن حسن شیبانی منصب قضا پر فائز ضرور تھے، لیکن انہوں نے امام شافعی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا، بلکہ جب انہیں امام شافعی کی قید و بند کا علم ہوا، تو آپ کی رہائی کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

جب امام شافعی ہارون کے سامنے پیش کیے گئے اور خلیفہ نے آپ سے سوالات کیے، اس وقت امام محمد بھی دربار میں پہنچ چکے تھے، امام شافعی نے کہا، کہ میں علوی نہیں بنی مطلب سے ہوں اور پھر میرا مشغلہ بھی علمی ہے، آپ کے قاضی صاحب بھی ان امور سے واقف ہیں، ہارون نے کہا، اچھا آپ محمد بن ادریس ہیں، امام شافعی نے کہا، جی ہاں! پھر خلیفہ نے امام محمد سے پوچھا، کیا بات یہی ہے، جس طرح یہ کہتے ہیں؟ انہوں نے کہا، بے شک ایسا ہی ہے، علم میں ان کا پایہ بہت بلند ہے، جو شکایت ان کے بارے میں بیان کی گئی ہے، وہ بے بنیاد ہے، ان کی شان ایسے الزامات سے بالاتر ہے، خلیفہ نے کہا، کہ اچھا تو آپ ان کو ساتھ لے جایئے میں ان کے بارے میں غور کروں گا۔ امام شافعی فرماتے ہیں، کہ امام محمد مجھ کو ساتھ لے گئے اور اس طرح میری گلوخلاصی کے باعث ہوئے۔

امام ابو یوسف اور امام محمد پر یہ صریح بہتان ہے، کہ انہوں نے ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر ابھارا، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس الزام کی تردید فرمائی ہے۔

> **واما الرحلة المنسوبة الى الشافعي المروية من طريق عبدالله بن محمد البلوى فقد اخرجها الآبرى والبيهقي وغيرهما مطولة ومختصرة وساقها الفخر الرازى فى مناقب الشافعي بغير اسناد معتمدا عليها وهى مكذوبة وغالب مافيها موضوع وبعضها ملفق من روايات ملفقة واوضح مافيها من الكذب قوله فيها ان ابايوسف ومحمد بن الحسن حرضا الرشيد على قتل الشافعي وهذا باطل من وجهين احدهما ان ابايوسف لما دخل الشافعي بغداد كان مات ولم يجتمع به الشافعي والثاني انهما كانا اتقىٰ الله من ان يسعيا فى قتل رجل مسلم الخ** (توالى التاسيس ص ۷۱)

امام شافعی کی رحلت جو عبداللہ بن محمد بلوی کے طریق سے منقول ہے، اس کو آبری اور بیہقی وغیرہ نے مطول و مختصر نقل کیا ہے اور امام فخر الدین رازی نے بھی مناقب شافعی میں اس پر اعتماد کرتے ہوئے، بغیر سند کے بیان کر دیا، حالاں کہ یہ روایت جھوٹی ہے، اس کا اکثر حصہ موضوع اور من گھڑت ہے اور کچھ حصے ادھر ادھر کی روایتوں کے چند ٹکڑے جوڑ کر بنائے گئے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ واضح جھوٹ یہ ہے، کہ امام ابو یوسف اور امام محمد نے ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر ابھارا اور یہ دو وجہ سے باطل ہے، ایک تو یہ کہ جس وقت امام شافعی بغداد آئے اس وقت امام ابو یوسف وفات پا چکے تھے، دوسرے یہ کہ یہ دونوں اس بات سے بہت بالاتر تھے کہ کسی مسلمان کے قتل ناحق کی سعی کریں۔ ان کا خوف الٰہی منصب عالی جلالت قدر اور جو کچھ

ان کے دین وتقویٰ کے بارے میں مشہور ومعروف ہے وہ قطعاً اس کے منافی ہے۔

والذی تحرر لنا با لطرق الصحیحةان قدوم الشافعی بغداد اول ما قدم کان سنة اربع وثمانین ومائة وکان ابویوسف قدمات قبل ذلك بسنتین وانه لقی محمد بن الحسن فی تلك القدمة وکان یعرفه قبل ذلك من الحجاز واخذ عنه ولازمه

(توالی التاسیس بمعالی ابن ادریس ص ۷۱)

طرق صحیحہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ امام شافعی کی بغداد تشریف آوری پہلی مرتبہ ۱۸۴ھ میں ہوئی اور امام ابو یوسف اس سے دو سال پہلے ۱۸۲ھ میں سفرآخرت فرما چکے تھے، البتہ اس مرتبہ امام محمد سے ملاقات ہوئی اور وہ ان کو قبل ازیں حجاز ہی سے جانتے تھے، امام محمد سے انہوں نے علم حاصل کیا بلکہ ان کی خدمت میں رہ پڑے۔

نیز اس روایت کے راوی عبداللہ بن محمد علوی بلوی کے متعلق علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں نقل کیا ہے، کہ دارقطنی نے اس کے متعلق یہ کہا، کہ حدیث گڑھا کرتا تھا اور ابوعوانہ نے بھی اس کی ایک حدیث موضوع کو نقل کیا ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۲، ص ۶۵)

وقال الحافظ وهو صاحب رحلة الشافعی طولها ونمقها وغالب ماورده فیها مختلق ۔(لسان المیزان ج ۳ ص ۳۳۸)

یہ شخص رحلۃ الشافعی کا مولف ہے اور بہت طول طویل قصے بنا سنوار کر اس نے لکھے ہیں، اس کا اکثر حصہ ایجاد بندہ اور موضوعات پر مشتمل ہے۔

حافظ ابن حجر کی اس تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی، کہ ۱۶۴ھ یا ۱۷۱ھ کی رحلت اور اس کے متعلق جتنے واقعات ہیں وہ سب افسانے ہیں اس لیے کہ ۱۸۴ھ سے پہلے ان کی آمد ثابت نہیں۔

اسی طرح بعض لوگوں نے جو یہ لکھا ہے، کہ امام شافعی پر امام ابو یوسف اور امام محمد حسد کرتے تھے، یہ بھی صریح جھوٹ ہے، غور فرمایئے کہ امام شافعی کا تو ابھی طالب علمی کا زمانہ تھا اس وقت تک ان میں کوئی امتیازی شان یا تفوق کی کوئی چیز ہی پیدا نہ ہوئی تھی، جس پر یہ ائمہ حسد کرتے، یہی وجہ ہے، کہ امام شافعی نے جو نسخہ مؤطا امام مالک سے روایت کیا تھا، وہ متداول ہی نہ ہوا، کیوں کہ وہ ان کے ابتدائی دور کی چیز تھی، اور وہ مدینہ سے مکہ پھر یمن چلے گئے تھے، جہاں عرصہ تک وہ علمی مشاغل سے گویا کنارہ کش رہے، پھر اگر امام شافعی اس وقت بھی محسود ہو گئے تھے، تو حاسد کے دامن میں کیوں پناہ لی اور ان سے علم کیوں حاصل کیا، سچی بات یہ ہے کہ یہ اکابر ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے، آپس میں بہترین تعلقات تھے بڑے نے ہمیشہ شفقت کا معاملہ کیا، یہاں تک کہ تاریخ میں موجود ہے، کہ ایک مرتبہ امام محمد ہارون رشید کے یہاں جا رہے تھے، دروازے پر امام شافعی کو دیکھا

تو کہا، آج بادشاہ کے یہاں نہ جائیں گے، امام شافعی نے عرض کیا میں پھر کبھی آجاؤں گا، امام محمد نے کہا نہیں، سواری سے اترے اوران کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے گئے اور امام شافعی نے ادب واحترام اور توقیر کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔

راحۃ القلوب میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا نے حضرت زبدۃ العارفین خواجہ فریدالدین گنج شکر کا قول ذکر کیا ہے، کہ جب امام محمد سوار ہو کر کہیں جاتے تھے، تو امام شافعی ان کی رکاب کے ساتھ پیدل چلتے تھے، حافظ ذہبی نے اپنی تاریخ کبیر میں ابوعبید سے نقل کیا ہے، کہ میں نے امام شافعی کو دیکھا کہ امام محمد نے ان کو پچاس اشرفیاں دیں اور اس سے پہلے پچاس دے چکے تھے اور کہا کہ اگر آپ کو علم حاصل کرنا ہے، تو میرے ساتھ رہیے، یہ بھی فرمایا، کہ اس رقم کے لینے میں کوئی تامل وتکلف نہ کریں، امام شافعی نے کہا، کہ اگر آپ میرے نزدیک ان لوگوں میں سے ہوتے جن سے مجھے تکلف برتنا چاہیے تو یقیناً میں آپ کی امداد قبول نہ کرتا۔ اس واقعہ سے بھی ان کے خصوصی تعلقات کا ثبوت ملتا ہے۔ خود امام شافعی سے منقول ہے:

> **وکان محمد بن الحسن جید المنزلۃ عند الخلیفۃ فاختلف الیہ وقلت ھو اولی من جھۃ الفقہ فلزمتہ وکتبت عنہ وعرفت اقاویلھم وکان اذاقام ناظرت اصحابہ فقال لی بلغنی انک تناظرھم فناظرنی فی الشاھد والیمین فامتنعت فالح علی فتکلمت معہ فرفع ذالک الی الرشید فاعجبہ ووصلنی** ۔(توالی التاسیس ص ۶۹)

> امام محمد کی خلیفہ کے یہاں بڑی قدر ومنزلت تھی میں امام محمد کے پاس آمد ورفت کرنے لگا اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کرلیا، کہ یہ فقہ میں اس وقت سب سے بہتر ہیں، بس میں تو انہیں کا ہو کر رہ گیا، ان کی کتابیں نقل کیں اور ان حضرات کے نظریات واقوال پر مطلع ہوا اور جب امام مجلس سے چلے جاتے تھے تو میں ان کے اصحاب سے بحث ومباحثہ بھی کرتا تھا امام محمد نے ایک روز فرمایا، کہ مجھے معلوم ہوا تم مباحثہ کرتے ہو آؤ آج میرے ساتھ بھی شاہد ویمین کے مسئلہ پر بحث کرو مجھ کو ادب مانع ہوا انکار کیا تو بڑے اصرار سے مجھے مجبور کیا تو میں نے اس مسئلہ میں گفتگو کی تو اس معاملہ کا ذکر رشید سے کیا تو اس نے پسند کیا اور اپنے پاس آمد ورفت کا موقع دیا اس طرح اس سے، خصوصی تعلق قائم ہو گیا۔

ورود بغداد اور امام محمد سے شرف تلمذ

امام شافعی دارالخلافہ بغداد پہنچے، اس وقت بغداد اسلامی علوم وافکار کا مرکز بنا ہوا تھا، امام شافعی نے امام اعظم ابوحنیفہ کے تلمیذ رشید امام محمد بن حسن شیبانی کی خدمت میں حاضر ہو کر علم فقہ کی تکمیل کی اور ان کی خدمت میں رہ کر فقہ حنفی کے اصول استنباط، اسلوب اجتہاد کو ازبر کیا، امام شافعی کے فقہی مجتہدات کی اساس اور بنیاد امام محمد کی تعلیم وتدریس سے استوار ہوئی، فقہی نکتہ سنجی، دقیقہ رسی کے جوہر اسی درسگاہ میں کھلے، جس کا اعتراف خود امام شافعی کو بھی تھا:

> **انی لاعترف الاستاذیۃ علی لما لک ثم لمحمد بن الحسن** ۔(اخبار ابی حنیفہ واصحابہ ص ۱۲۴)

> میں امام مالک پھر امام محمد کے استاذ ہونے کو تسلیم کرتا ہوں۔

امام صاحب نے امام محمد سے اپنی شاگردی اوران کی استاذی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

سمعت من محمد بن الحسن رحمه الله اقر بعير ۔(جامع بیان العلم ج۱ص۹۹)

میں نے محمد بن حسن سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے۔

یہ بھی فرماتے ہیں، کہ اگر لوگ فقہا کے بارے میں انصاف سے کام لیں، تو ان کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے محمد بن حسن جیسا فقیہ نہیں دیکھا ہے۔ (اخبار ابی حنیفہ واصحابہ ص۱۲۴)

امام شافعی کا ارشاد ہے:

مارایت اعقل ولا افقه ولا ازهد ولا اورع ولا احسن نطقا ولا ایرادا من محمد بن الحسن ۔**(تهذیب الاسما امام نووی)**

میں نے امام محمد سے بڑھ کر عاقل، فقیہ، زاہد، متقی، خوش تقریر اور بحث ونقد کرنے والا نہیں دیکھا۔

میں نے محمد بن حسن سے ایک اونٹ کے برابر حدیثیں لکھی ہیں، اگر وہ نہ ہوتے، تو علم میں میری زبان اتنی نہ کھلتی، تمام اہل علم فقہ میں اہل عراق کے عیال اور اہل عراق اہل کوفہ کے عیال ہیں اور اہل کوفہ امام اعظم کے عیال ہیں، میں نے محمد بن حسن سے زیادہ فصیح وبلیغ آدمی نہیں دیکھا، جب میں ان کو قرآن پڑھتے ہوئے سنتا تھا، تو معلوم ہوتا تھا، کہ گویا قرآن ان کی زبان میں اترا ہے، میں نے جس عالم سے کوئی فقہی وعلمی سوال کیا، محمد بن حسن کے علاوہ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے، میں نے محمد بن حسن سے زیادہ کتاب اللہ کا جاننے والا کوئی نہیں دیکھا، گویا ان پر قرآن نازل ہوا ہے۔

امام محمد بن حسن اپنے اس لائق، فائق تلمیذ رشید کا لحاظ ہی نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کا حد درجہ احترام بھی کرتے تھے، اور علمی تعاون کے ساتھ بوقت ضرورت مادی ومالی تعاون بھی فرماتے تھے، ابوعبید راوی کا بیان ہے، کہ میں نے امام محمد بن حسن کی مجلس درس میں امام شافعی کو دیکھا ہے کہ انہوں نے امام محمد سے ایک مسئلہ دریافت کیا اور امام محمد کا جواب امام شافعی کو بہت پسند آیا، جسے انہوں نے لکھ لیا، امام محمد نے ان کی اس علمی حرص کو دیکھ کر ایک سو درہم دیا اور فرمایا، کہ "**الزم ان تشتهی العلم** " اگر علم کی خواہش ہے، تو یہاں رہ جاؤ، اس واقعہ کے بعد میں نے امام شافعی کو کہتے ہوئے سنا ہے، کہ اگر امام محمد نہ ہوتے تو میری زبان علم میں نہ کھلتی۔

امام صاحب کہتے ہیں، کہ میں نے محمد بن حسن کی کتابوں پر ساٹھ دینار خرچ کر کے ان کو حاصل کیا اور ان کے ہر مسئلہ کے پہلو میں دلیل کے لیے حدیث لکھی۔ (ترتیب المدارک ص۳۹۲)

امام محمد اپنے شاگرد کی از حد قدر ومنزلت کرتے، چنانچہ ابوحسن زیادی فرماتے ہیں:

مارایت محمد بن الحسن یعظم احدا من اهل العلم تعظیمه للشافعی ولقد جاءه یوما فلقیه وقد رکب محمد بن الحسن فرجع محمد الی منزله وخلا به یومه الی اللیل ولم

یاذن لاحد علیه ۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۳۱۲)

محمد بن حسن کو میں نے اہل علم کی اتنی زیادہ تعظیم کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جتنی تعظیم وہ شافعی کی کیا کرتے تھے، ایک دن محمد بن حسن کہیں جانے کے لیے سواری پر بیٹھ گئے تھے، اسی دوران شافعی آ گئے، محمد بن حسن فوراً سفر ملتوی کر کے گھر آئے اور رات گئے تک ان کے ساتھ رہے اور اس دوران کسی تیسرے شخص کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی۔

امام شافعی امام محمد کی خدمت سے روانہ ہونے لگے، تو اجازت کے لیے باریاب ہوئے، وہ خود فرماتے ہیں:

میں نے سفر کی اجازت چاہی، فرمانے لگے، میں اپنے کسی مہمان کو جانے کی اجازت نہیں دیتا، پھر کہا، میرے پاس مال و دولت موجود ہے، اس میں سے آدھا تم لے لو، میں نے جواب دیا، یہ بات میرے مقاصد اور ارادے کے خلاف ہے، میری خوشی صرف سفر میں ہے، اس پر انہوں نے اپنے صندوق کی سب نقدی منگائی تین ہزار درہم نکلے، وہ سب میرے حوالے کر دیے اور میں نے بلاد عراق و فارس کی سیاحت شروع کر دی، لوگوں سے ملتا جلتا رہا۔ (جامع بیان العلم ص ۲۶۸)

حجام کی بدسلوکی اور امیر کا احترام

امام شافعی عراق سے نکلے، ان کی رحلت و سفر کا مقصد طلب علم تھا، منزلیں طے کرتے ہوئے حران پہنچے، جمعہ کا دن تھا، غسل کے لیے حمام پہنچے، چوں کہ سفر کی وجہ سے بال الجھ گئے تھے، ایک حجام سے بال ترشوانے لگے، اسی دوران حمام میں کوئی امیر آ گیا، حجام اس کے بال تراشنے کے لیے چلا گیا، اس سے فرصت پا کر پاس آیا امام صاحب کہتے ہیں:

میں نے بال درست کرانے سے انکار کر دیا، مگر جب حمام سے جانے لگا، تو میرے پاس جو دینار موجود تھے، ان میں سے اکثر حجام کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا، یہ لے لو، مگر خبردار کسی پردیسی کو حقیر نہ سمجھنا، حجام نے بڑی حیرت سے مجھے دیکھا، فوراً حمام کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی اور لوگ مجھے ملامت کرنے لگے، کہ اتنی بڑی رقم حجام کو کیوں دے دی، یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں، کہ شہر کا ایک اور امیر آدمی حمام سے نکلا اس کے سامنے سواری حاضر کی گئی، میں بھیڑ کے سامنے تقریر کر رہا تھا، اس کے کان میں بھی پڑ گئی، سوار ہو چکا تھا، لیکن اتر پڑا اور مجھ سے کہنے لگا، آپ شافعی ہیں؟ میں نے اقرار کیا، تو امیر نے سواری کی رکاب میرے سامنے کر دی اور عاجزی سے کہنے لگا، برائے خدا سوار ہو جائیے، میں سوار ہو گیا، غلام سر جھکائے آگے آگے چل رہا تھا، یہاں تک کہ امیر کا گھر آ گیا، تھوڑی دیر میں خود امیر بھی آ پہنچا اور بڑی خوشی ظاہر کی پھر دستر خوان بچھ گیا اور ہمارے ہاتھ دھلائے گئے، مگر میں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، امیر نے پوچھا کیوں کیا بات ہے؟ میں نے جواب دیا، کھانا مجھ پر حرام ہے، جب تک یہ نہ بتا دو، کہ تم نے مجھے پہچانا کیسے؟ کہا، بغداد میں آپ نے جو کتاب لکھ کر سنائی تھی، اس کے سننے والوں میں میں بھی تھا، اس طرح آپ میرے استاذ ہیں، یہ سن کر میں نے کہا، علم دانش مندوں کا کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے، پھر میں نے ایسی خوش دلی سے کھانا کھایا، کہ خدا جانتا ہے، اپنے جیسے اہل علم کے ساتھ کھانے ہی میں وہ خوشی نصیب ہو سکتی ہے، میں تین دن اس

شخص کا مہمان رہا، چوتھے دن اس نے کہا، حران کے اطراف میں میرے چار گاؤں موجود ہیں، اور یہ گاؤں ایسے ہیں، کہ پورے علاقے میں ان کی نظیر نہیں، آپ یہیں رہ جائیں، تو سب گاؤں آپ کی خدمت میں ہدیہ ہیں، میں نے جواب دیا، کہ سب گاؤں مجھے دے دو گے تو تمہاری گزر بسر کیسے ہوگی؟ کہنے لگا، آپ وہ صندوق دیکھ رہے ہیں، ان میں چالیس ہزار درہم موجود ہیں، اس رقم سے کوئی تجارت کرلوں گا، میں نے کہا، لیکن خود مجھے یہ منظور نہیں، میں نے اپنا وطن محض تحصیل علم کے لیے چھوڑا ہے، نہ کہ دولت کمانے کے لیے، وہ کہنے لگا، کہ یہ تو سچ ہے، مگر مسافر کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے، گاؤں نہ سہی نقد ہی قبول کرلیجیے، اس پر میں نے چالیس ہزار کی وہ پوری رقم لے لی، اسے خدا حافظ کہا، اور حران سے اس حال میں روانہ ہوا، کہ آگے پیچھے باربردار جانور تھے، راستے میں اصحاب حدیث ملے ان میں احمد بن حنبل، سفیان بن عیینہ اور اوزاعی بھی تھے، میں نے ہرایک کو اس قدر دیا جتنا اس کے مقدر میں تھا۔ (جامع بیان العلم ص ۲۷۳)

پھر امام مالک کی بارگاہ میں

امام شافعی دیار و امصار کی سیاحت کرتے ہوئے، شہر رملہ پہنچے، جہاں انہیں ایک شخص کے ذریعے امام مالک کے حالات اور ان کی خوش حالی کا حال معلوم ہوا، زیارت کا شوق بڑھا، کرایہ پر سواری لی اور حجاز کی سمت روانہ ہوئے، ستائیس دن بعد مدینۃ الرسول میں حاضر ہوئے، عصر کے بعد مسجد نبوی میں داخل ہوئے، امام شافعی ملاقات کے احوال اس طرح بیان کرتے ہیں:

میں نے دیکھا، کہ لوہے کی کرسی مسجد میں رکھی ہوئی ہے، کرسی پر بیش بہا قباطی معر کا تکیہ رکھا ہوا ہے اور تکیہ پر لکھا ہوا ہے، ”**لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ**“ میں ابھی یہ دیکھ ہی رہا تھا، کہ مالک بن انس باب النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آتے ہوئے دکھائی دیے، پوری مسجد عطر سے مہک اٹھی، امام مالک کے ساتھ چار سو یا اس سے زیادہ شاگردوں کا مجمع تھا، چار آدمی ان کے جبے کا دامن اٹھائے چل رہے تھے، امام مالک اپنی مجلس میں پہنچے، تو بیٹھے ہوئے، سب آدمی کھڑے ہوگئے، امام مالک کرسی پر بیٹھ گئے اور جراح عمد کا ایک مسئلہ پیش کیا، مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے قریب کے آدمی کے کان میں کہا، اس مسئلے کا جواب یہ ہے، اس شخص نے میرا بتایا ہوا جواب اونچی آواز سے سنا دیا، مگر امام مالک نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ کی اور شاگردوں سے جواب کے طالب ہوئے، شاگردوں کے سب جواب غلط تھے، امام مالک نے کہا تم غلطی پر ہو، پہلے ہی آدمی کا جواب صحیح ہے، یہ سن کر وہ جاہل بہت خوش ہوا، امام مالک نے دوسرا مسئلہ پیش کیا، جاہل میری طرف دیکھنے لگا، میں نے پھر جواب بتا دیا، اس دفعہ بھی امام مالک کے شاگرد صحیح جواب نہ دے سکے، اور اس جاہل کی زبانی میرا ہی جواب ٹھیک نکلا، جب تیسرے مسئلے پر بھی یہی صورت پیش آئی، تو امام مالک اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا، یہاں آؤ، وہ جگہ تمہاری نہیں ہے، آدمی امام مالک کے پاس پہنچا، تو انہوں نے سوال کیا، تم نے مؤطا پڑھی ہے؟ جاہل نے جواب دیا، نہیں، امام مالک نے پوچھا، ابن جریج کے علم پر تمہاری نظر ہے، اس نے پھر کہا، نہیں، امام مالک نے پوچھا، جعفر صادق سے ملے ہو؟ کہنے لگا نہیں، امام مالک کو تعجب ہوا، کہنے لگے، پھر یہ علم تمہیں کہاں سے ملا؟ جاہل نے جواب دیا، میری بغل میں ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا، اور وہی مجھے مسئلے کا جواب بتاتا تھا، امام مالک نے میری طرف گردن

پھیری دوسروں کی گردنیں بھی اٹھ گئیں، امام مالک نے اس جاہل سے کہا جاؤ اور نوجوان کو میرے پاس بھیج دو، میں امام مالک کے پاس پہنچا اور اسی جگہ بیٹھ گیا جہاں سے جاہل اٹھا تھا، وہ بڑے غور سے مجھے دیکھتے رہے پھر فرمایا، شافعی ہو؟ میں نے عرض کی جی ہاں! شافعی ہوں امام مالک نے مجھے سینے سے لگالیا، پھر کرسی سے اتر پڑے اور کہا، علم کا جو باب ہم شروع کر چکے ہیں تم اسے پورا کرو، میں نے حکم کی تعمیل کی اور جراح عمد کے چار سو مسئلے پیش کیے، مگر کوئی آدمی جواب نہ دے سکا۔

سورج غروب ہوا، ہم نے مغرب کی نماز پڑھی، امام مالک مجھے اپنے گھر لے گئے، وہاں پرانے کھنڈر کی جگہ نئی عمارت کھڑی تھی، میں بے اختیار رونے لگا، یہ دیکھ کر امام مالک نے کہا، ابوعبداللہ! تم روتے کیوں ہو؟ شاید سمجھ رہے ہو، کہ میں نے دنیا پر آخرت کو تج دیا ہے، میں نے جواب دیا، جی ہاں! یہی اندیشہ دل میں پیدا ہوا تھا، کہنے لگے، تمہارا دل مطمئن رہے، تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، یہ جو کچھ دیکھ رہے ہو ہدیہ ہے، خراسان سے مصر سے دنیا کے دور دراز گوشوں سے ہدیوں پر ہدیے چلے آرہے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرمالیتے تھے اور صدقہ رد کر دیتے تھے، میرے پاس اس وقت خراسان اور مصر کے اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑوں کے تین سو خلعت موجود ہیں، غلام بھی اتنے ہی ہیں اور معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے، اب یہ سب میری طرف سے تمہارے لیے ہدیہ ہے، صندوقوں میں پانچ ہزار دینار رکھے ہیں، اس کی سالانہ زکوۃ نکالتا ہوں اس میں سے بھی آدھی رقم تمہاری ہے، میں نے کہا، دیکھیے، آپ کے بھی وارث موجود ہیں اور میرے بھی وارث زندہ ہیں، آپ نے جو کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے، اس کی تحریر ہو جانا چاہیے، تحریر سے میری ملکیت مسلم ہو جائے گی، اگر میں مرگیا تو سارا مال آپ کے وارث نہ لے سکیں گے، بلکہ میرے وارثوں کو بھی ملے گا، اسی طرح خدانخواستہ اگر آپ کی وفات ہوگئی تو بھی یہ آپ کے وارثوں کا نہیں، میرا ہو جائے گا۔

یہ سن کر امام مالک مسکرائے اور فرمایا یہاں بھی علم ہی سے کام لیتے ہو، میں نے جواب دیا، علم کے استعمال کا اس سے بہتر موقع اور کون ہوسکتا ہے، امام مالک نے رات ہی میں تحریر مکمل کر دی۔

نماز فجر با جماعت ادا کرنے کے بعد ہم گھر لوٹے، میں نے دیکھا، کہ دروازے پر خراسانی گھوڑے اور مصری خچر کھڑے ہیں، گھوڑوں کی کونچیں بڑی حسین تھیں بے اختیار منہ سے نکل گیا ایسے خوب صورت پاؤں تو میں نے کبھی نہیں دیکھے، امام مالک نے فرمایا، یہ تمام سواریاں تمہارے لیے ہیں، میں نے عرض کی کم از کم ایک جانور تو اپنے لیے رہنے دیجیے، فرمایا، مجھے خدا سے شرم آتی ہے، کہ اس زمین کو میری سواری اپنی ٹاپوں سے روندے، جس کے نیچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے ہیں، یہ سن کر مجھے یقین ہوگیا، کہ دولت کی اس بہتات میں بھی امام مالک کا تقویٰ بدستور باقی ہے۔ (ایضا)

مراجعت وطن

امام مالک کی بخشش وعطا سے مالا مال ہو کر امام شافعی مکہ پہنچے، شہر میں داخلے سے پہلے ہی ایک عورت ملی اور اس نے کہا، تم یہ ساری دولت لے کر مکہ میں اس لیے داخل ہو رہے ہو، تاکہ اپنے چچیرے بھائیوں پر فخر کرو امام صاحب نے پوچھا تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ کہنے لگی، اعلان کر دو، کہ بھوکے آئیں اور کھائیں اور پیدل آئیں اور سواری لے جائیں اور ننگے آئیں اور کپڑا

پہن جائیں، اس طرح دنیا میں بھی تیری آبرو بڑھے گی اور آخرت کا ثواب اپنی جگہ رہے گا۔

امام شافعی کہتے ہیں، میں نے بڑھیا کی اس نصیحت پر عمل کیا، اس واقعہ کی شہرت دور دور تک پھیلی، امام مالک نے بھی سنا اور ہمت افزائی کی، کہلا بھیجا، کہ جتنا دے چکا ہوں اتنا ہی ہر سال تمہیں بھیجتا رہوں گا۔

مکہ میں میرا داخلہ اس حال میں ہوا، کہ ایک خچر اور پچاس دینار کے سوا اس دولت میں سے کچھ باقی نہ تھا، جو ساتھ آئی تھی، راہ میں اتفاق سے کوڑا میرے ہاتھ سے گر پڑا، ایک کنیز نے جس کی پیٹھ پر مشک تھی، لپک کے اٹھالیا اور میری طرف بڑھایا، میں نے اس کے لیے پانچ دینار نکالے یہ دیکھ کر بڑھیا نے کہا یہ تو کیا کر رہا ہے؟ میں نے کہا، عورت کو انعام دینا چاہتا ہوں، بڑھیا نے کہا، جو کچھ تیرے پاس ہے سب دے دے۔

میں نے یہی کیا، اور مکہ میں پہلی رات بسر کرنے سے پہلے ہی مقروض ہو گیا، لیکن امام مالک میرے پاس وہ سب بھیجتے رہے، جو مدینے میں انہوں نے مجھے دیا تھا، گیارہ برس تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر جب امام مالک کا انتقال ہو گیا، تو حجاز کی سرزمین مجھ پر تنگ ہو گئی اور میں مصر چلا آیا، یہاں خدا نے عبداللہ بن حکم کو میرے لیے کھڑا کر دیا اور وہ میری تمام ضرورتوں کے کفیل ہو گئے۔

* * *

اہم شیوخ واساتذہ

خداوند تعالیٰ نے امام شافعی کو قوت اخذ واستنباط، ذہن رسا، شعور کامل، فکر بلیغ، نظر عمیق، پختہ بصیرت، دوررس فکر، فصاحت لسان، بلاغت بیان کے ساتھ تحصیل علم وفضل کا بے کراں شوق عطا فرمایا تھا، انہوں نے تنگ حالی اور فاقہ مستی کی سختیاں جھیلتے ہوئے کسب علم کے میدان میں قدم رکھا، پورے انہماک وخلوص کے ساتھ تحصیل علم کی ڈگر پر استقامت کے ساتھ چلتے رہے، اپنے زمانے میں مروج ہر علم وفن کی جستجو کو شیوہ حیات بنالیا اور اس دور کے تمام مکاتب علم وفن کے ہر چشمہ صافی سے علمی پیاس بجھائی اور علوم ومعارف کے بحر زخار سے علم وفضل کے موتی چنے، طلب علم کی حرص انہیں اسلامی بلاد وامصار میں پھراتی رہی اور وہ علم وفضل کے ساتھ سیر وسیاحت کے تجربات ومشاہدات سے بھی مالا مال ہوتے رہے، ان کے شیوخ واساتذہ کی تعداد یوں تو بہت ہے، لیکن وہ ارباب کمال شیوخ جو فقہ وفتاوی اور حدیث وسنت کے جامع تھے اکیس ہیں:

(۱) مکی شیوخ: ۔ سفیان بن عیینہ، مسلم بن خالد زنجی، سعید بن سالم قداح، داؤد بن عبدالرحمٰن عطار، عبدالحمید بن عبدالعزیز ابی رواد۔

(۲) مدنی شیوخ: ۔ مالک بن انس، ابراہیم بن سعد انصاری، عبدالعزیز بن محمد دراوردی، ابراہیم بن ابی یحییٰ اسامی، محمد بن ابی سعید بن ابی فدیک، عبداللہ بن نافع صائغ۔

(۳) یمنی شیوخ: ۔ مطرف بن مازن، ہشام بن یوسف، عمر بن ابی سلمہ، یحییٰ بن حسان،

(۴) عراقی شیوخ: ۔ وکیع بن جراح، ابواسامہ حماد بن اسامہ، اسماعیل بن علیہ، عبدالوہاب بن عبدالمجید، امام محمد بن حسن شیبانی۔

امام محمد بن حسن شیبانی ان جلیل القدر شیوخ میں ہیں، جن سے امام شافعی نے ان کی کتابیں سنیں اور ان سے حدیثیں روایت کیں اور آپ ہی کی درسگاہ سے اہل عراق کی فقہ حاصل کی۔

امام شافعی کے مزید اساتذہ مقری اسماعیل بن قسطنطین مکی، محمد بن علی بن شافع مکی، عبدالوہاب ثقفی، ابوحمزہ حاتم بن اسماعیل، اسماعیل بن جعفر، محمد بن خالد جندی، عطاف بن خالد مخزومی بھی ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج۹ ص۲۴)

(۱) مسلم بن خالد زنجی رضی اللہ عنہ

ابوعبداللہ مسلم بن خالد زنجی بن فروہ بن مسلم بن سعد بن جرجن ۱۰۰ھ میں شام میں پیدا ہوئے، پوری زندگی مکہ میں بسر کی، علم وفضل، زہد وعبادت اور ورع وتقویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، فقہ میں اپنے وقت کے امام تسلیم کیے جاتے تھے، امام شافعی نے انہیں کے فیضان صحبت سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور پندرہ سال کی عمر میں ان سے افتا کی اجازت حاصل کرلی تھی۔ ابن حجر نے لکھا ہے:

ومنه تعلم الشافعی الفقه قبل ان یلقی مالکا۔ (تہذیب التہذیب ج۷ ص۱۲۹)

امام مالک کی ملاقات سے پہلے امام شافعی نے ان سے فقہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔

ذہبی لکھتے ہیں:

هو الذی اذن للشافعی فی الافتاء۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۲۳۵)

مسلم زنجی ہی نے امام شافعی کو فتویٰ دینے کی اجازت دی تھی۔

۱۸۰ھ میں بمقام مکہ ہارون الرشید کے زمانے میں وفات پائی۔

(۲) سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ

محدث حرم امام ابومحمد سفیان بن عیینہ بن ابی عمران میمون ہلالی ۱۰۷ھ میں بمقام کوفہ پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب علم وثروت شخص تھے، انہوں نے اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی، سات سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تو حدیثوں کی کتابت شروع کرادی گئی، پندرہ سال کی عمر میں باقاعدہ تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے، حجاز جاکر ابن شہاب زہری، عمرو بن دینار مکی کی مجلس درس سے وابستہ ہوئے، کوفہ آکر وہاں کے اہل علم سے استفادہ کیا۔

قدرت نے ابن عیینہ کو بلا کا حافظہ اور ذکاوت عطا کی تھی۔ وہ خود کہتے ہیں:

ماکتبت شیئا حفظته۔ (تاریخ بغداد ج۹ ص۱۸۲)

میں نے کسی چیز کو نہیں لکھا جو مجھے یاد ہوگئی۔

ابن عیینہ علم تفسیر وعلم حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ امام شافعی فرماتے ہیں:

لولا مالك وسفیان لذهب علم الحجاز۔ (تہذیب التہذیب ج۴ ص۱۰۵)

امام مالک اور سفیان بن عیینہ نہ ہوتے، تو حجاز کا علم ختم ہوجاتا۔

امام عجلی کہتے ہیں: **کان حسن الحدیث یعد من حکماء اصحاب الحدیث۔** (ایضا)

وہ عمدہ حدیثوں والے تھے اور دانشور محدثین میں شمار کیے جاتے تھے۔

امام شافعی فرماتے ہیں: **مارایت احدا من الناس فیه جزالة العلم مافی ابن عیینة ومارایت احدا**

الف عن الفتیا منه ۔ (ایضا)

میں نے علم کی جتنی پختگی امام ابن عیینہ میں دیکھی، کسی میں نہیں دیکھی اور میں نے ان سے زیادہ فتویٰ سے گریز کرنے والا کوئی عالم نہیں دیکھا۔

ابن خلکان رقم طراز ہیں:

کان اماما عالما ثبتا حجة زاهدا ورعا مجمعا علی صحة حدیثه وروایته ۔

(وفیات الاعیان ج۱ص۲۷۷)

وہ امام، عالم، ثبت، حجت، زاہد اور پرہیز گار تھے حدیث کی صحت اور روایت میں متفق علیہ تھے۔

حدیث میں جو بات ابن عیینہ کو معاصرین میں ممتاز کرتی ہے، وہ حدیث کا فہم، تفسیر حدیث کا ملکہ اور وثوق واعتماد ہے۔

بیس بائیس سال کی عمر میں مسعر بن کدام کی خواہش پر حلقہ درس قائم کیا، ابن عیینہ کا حلقہ درس بہت وسیع تھا، ایام حج میں جب عالم اسلام کے لوگ حرمین شریفین حاضر ہوتے تو ان کے حلقہ درس میں بڑا ازدحام ہوتا تھا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

فقد کان خلق یحجون والباعث لقاء ابن عیینة فیزدحمون علیه فی ایام الحج ۔

(تاریخ بغداد ج۶ص۱۷۵)

ایک مخلوق حج کے لیے جاتی تھی، کہ ابن عیینہ سے سماع حدیث کا موقع ملے گا، لوگ ایام حج میں ان کے گرد ہجوم کرتے۔

امام شافعی نے ان کے حلقہ درس میں شرکت کی، وہ فرماتے ہیں:

میں نے امام مالک کے یہاں احکام کی تمام احادیث تیس حدیثوں کے علاوہ پائیں اور ان تیس احادیث میں سے چھ کے علاوہ سب کو سفیان بن عیینہ کے یہاں پایا۔ (تقدمۃ الجرح والتعدیل ص۳۳)

جمادی الاخری ۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

(۳) اسماعیل بن علیہ رحمۃ اللہ علیہ

ابو بشر اسماعیل بن ابراہیم معروف بابن علیہ بمقام بصرہ ۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے، گھر پر قرآن پڑھا، پھر والدہ محدث عبدالوارث کی خدمت میں لے گئیں اور کہا، یہ میرا بیٹا ہے، اسے آپ اپنی خدمت میں رکھیں، تاکہ آپ جیسا عالم وفاضل ہوجائے، عبدالوارث نے ہونہار اسماعیل کو اپنا شاگرد خاص بنالیا اور اپنے ساتھ علما ومحدثین کی مجلسوں میں لے جاتے، اس طرح انہوں نے بصرہ کے ممتاز شیوخ سے علم حاصل کیا۔

ابن علیہ نے علم وفن کے شہ پاروں کو اپنے دامن میں جمع کر لیا تھا، اور وہ جملہ علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، ان کا خاص میدان علم حدیث تھا، انہوں نے پوری عمر اپنے حافظے پر اعتماد کیا، قلم وقرطاس کے رہین منت نہ بنے۔

زیاد بن ایوب کہتے ہیں:

مارایت لابن علیة کتابا قط (تذکرہ ج ۱ ص ۳۹۶)

میں نے کبھی ابن علیہ کے پاس کوئی کتاب نہیں دیکھی۔

یونس بن بکیر کہتے ہیں:

ابن علیة سید المحدثین (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۴۱)

ابن علیہ محدثین کے سردار ہیں۔

احمد بن حنبل کہتے ہیں:

الیہ المنتھیٰ فی التثبت بالبصرة فاتنی مالک فاخلف اللہ علی سفیان وفاتنی حماد بن زید فاخلف اللہ علی اسماعیل بن علیة . (ایضا)

ابن علیہ بصرہ میں تثبت میں ممتاز تھے، مالک نے وفات پائی، تو اللہ نے میرے لیے سفیان کو ان کا جانشین بنایا اور حماد بن زید نے وفات پائی، تو اللہ نے ابن علیہ کو میرے لیے ان کا قائم مقام بنایا۔

امام شافعی نے اس خرمن علم وفن سے بھی خوشہ چینی کی تھی۔

ابن علیہ کی وفات ذوقعدہ ۱۹۳ھ میں ہوئی۔

(۴) امام عبداللہ بن نافع صائغ

ابو محمد عبداللہ بن نافع مدینہ منورہ کے باشندے تھے، بنی مخزوم سے نسبت ولا کی بنا پر مخزومی مشہور ہوئے۔

علم وفضل میں آپ کا شمار کبار اتباع تابعین میں ہوتا ہے، امام مالک کے تلمیذ رشید تھے، زمانہ دراز تک امام صاحب کے دامن فیض سے وابستہ رہنے کی وجہ سے ان کے فقہی افکار وخیالات کے مخزن بن گئے تھے، چنانچہ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں:

کان قد لزم مالکا لزوما شدیدا وکان لا یقدم علیه احدا .

انہوں نے امام مالک کا ساتھ شدت کے ساتھ پکڑا، حتی کہ ان کو کسی پر فوقیت نہ دیتے تھے۔

آپ امام مالک کی طرح حدیث وفقہ کے جامع بن گئے تھے، اگرچہ آپ کا فقہی پہلو زیادہ نمایاں ہوا، تاہم وہ حدیث میں بھی بڑی شان کے مالک تھے۔

امام شافعی نے آپ کی بارگاہ سے بھی کسب فیض کیا تھا۔

ماہ رمضان ۲۰۶ھ میں بمقام مدینہ وفات پائی۔

نوٹ: امام شافعی کے اہم ترین شیوخ امام مالک، امام محمد بن حسن شیبانی اور امام وکیع بن الجراح کے تذکرے گذشتہ صفحات میں آچکے ہیں۔

جامعیت فضل وکمال

لمام شافعی کو قدرت نے ذہن رسا، حفظ قوی، فہم وفراست، باریک بینی اور ژرف نگاہی کی دولت سے سرفراز کیا تھا، انہوں نے اسی خداداد استعداد علم کے ساتھ تحصیل علم کے میدان میں قدم رکھا، نامساعد حالات اور صبر آزما مشکلات میں بھی علوم وفنون کی تحصیل سے کبھی غافل نہ رہے، ساتھ ہی ساتھ مکہ، مدینہ، یمن اور عراق کے شیوخ واساتذہ کی بارگاہوں سے کسب فیض کا موقع میسر آتا رہا اور سفرِ علم کی تکمیل بغداد میں امام محمد بن حسن شیبانی کی صحبت میں ہوئی، امام شافعی تعبیر رویا، قیافہ شناسی، ایام عرب، اشعار عرب، نحو، عربیت، تیراندازی، شہ سواری، شاعری، فصاحت وبلاغت، قرآن وحدیث، فقہ واجتہاد اور انساب میں کمال رکھتے تھے۔ آثار صحابہ، اختلاف اقاویل علما نیز تمام علوم وفنون کے جامع تھے، ایک مجتہد مطلق کے لیے جو علمی خصوصیات اور تبحر ناگزیر ہے، ان سے وہ مالا مال تھے۔

جوانی ہی میں ان کی عالمانہ عظمت مشہور ہو چکی تھی اور علمائے فن آپ کی حذاقت علم، قوت فیصلہ کے معترف ہو گئے تھے، چنانچہ مسلم بن خالد زنجی نے اٹھارہ انیس سال کی عمر میں فتویٰ دینے کی اجازت دے دی تھی، امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے فرمایا، کہ شافعی صاحب فہم وفراست جوان ہے، اشعار وعربیت کے مشہور عالم اصمعی کا بیان ہے، کہ میں نے بدوی شعرا کے اشعار کی تصحیح قریش کے جوان سے کی ہے، جس کو محمد بن ادریس کہتے ہیں، سفیان بن عیینہ کہتے ہیں، کہ شافعی اپنے زمانے کے جوانوں میں سب سے افضل ہیں اور جب ان کے یہاں تفسیر اور رویا کی کوئی بات آتی تھی، تو کہتے تھے، کہ اس جوان یعنی شافعی سے معلوم کرو۔

> كتب عبدالرحمن بن مهدى الى الشافعى وهو شاب ان يضع له كتابا فيه معانى القرآن ويجمع الاخبار فيه حجة الاجماع وبيان الناسخ والمنسوخ من القرآن والسنة فوضع له كتاب الرسالة . (تاریخ ذہبی ج ۲ ص ۳۱۱)
>
> عبدالرحمٰن بن مہدی نے امام شافعی کو ان کی جوانی میں لکھا، کہ آپ میرے لیے ایک کتاب لکھیں، جس میں اجماع کی حجیت اور قرآن وحدیث کے ناسخ ومنسوخ کا بیان ہو، تو امام شافعی نے اپنی مشہور کتاب ''الرسالہ'' تصنیف کی۔

بشر مریسی نے حج سے واپسی کے بعد کہا:

رایت شابا من قریش بمکۃ ماخاف علی مذھبنا الا منہ یعنی الشافعی ۔ (تاریخ ذہبی ج۲ص۳۱۱)

میں نے مکہ میں ایک قریشی نوجوان کو دیکھا ہے، میں اپنے مذہب پر ان سے ڈرتا ہوں یعنی امام شافعی۔

ملت بیضا کے اکابر علما و مشائخ، فقہا و محدثین نے آپ کے تبحر علمی کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

☆**زعفرانی:۔** ”فما کان مثلہ الا مثل الیھود فی ابن سلام“ ”علم میں امام شافعی کا کوئی مثل نہیں، جس طرح علمائے یہود میں عبد اللہ بن سلام کا کوئی مثل نہیں۔ (تہذیب التہذیب ج۹ص۲۵)

☆**ابوعبید:۔** ”مارایت رجلا اعقل من الشافعی“ ”میں نے امام شافعی سے بڑا عقلمند شخص نہیں دیکھا۔ (ایضا)

☆**قتیبہ:۔** ”الشافعی امام“ ”شافعی امام ہیں۔ (ایضا)

☆**ابوثور:۔** ”من زعم انہ رای مثل محمد بن ادریس فی علمہ وفصاحتہ وثباتہ وتمکنہ ومعرفتہ فقد کذب“ ”جو خیال کرتا ہے، کہ اس نے علم، فصاحت، ثبات، تمکن اور معرفت میں امام محمد بن ادریس شافعی کا مثل دیکھا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ (ایضا ص۲۶)

☆**احمد بن سیار مروزی:۔** ”لو لا الشافعی لدرس الاسلام“ ”اگر شافعی نہ ہوتے تو اسلام مٹ جاتا۔ (ایضا ص۲۷)

☆**ابوحاتم:۔** ”فقیہ البدن صدوق“ ”فقیہ اور صدوق ہیں۔ (ایضا)

☆**ایوب بن سوید:۔** ”ماظننت انی اعیش حتی اری مثلہ“ ”میں نہیں گمان کرتا، کہ اگر میں مزید زندہ رہوں، تو امام شافعی کا مثل دیکھ سکوں گا۔

☆**یحیٰی بن سعید قطان:۔** ”مارایت اعقل و لاافقہ من الشافعی وانا ادعو اللہ لہ اخصہ بہ وحدہ فی کل صلوۃ“ ”میں نے امام شافعی سے بڑھ کر عقل مند اور فقیہ نہیں دیکھا اور میں ہر نماز میں خاص طور پر ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔ (ایضا)

☆**قاسم بن سلام:۔** ”مارایت رجلا قط اکمل من الشافعی“ ”میں نے کبھی کسی شخص کو امام شافعی سے بڑھ کر کامل العلم نہیں پایا۔ (وفیات الاعیان ج۲ص۳۱۲)

☆**امام احمد بن حنبل:۔** ”کان الشافعی کالشمس للدنیا وکالعافیۃ للبدن مابت منذ ثلاثین سنۃ الا وانا ادعو للشافعی واستغفر لہ“ ”امام شافعی دنیا کے لیے سورج کے مانند تھے اور وہ ایسے تھے جیسے جسم کے لیے عافیت (صحت) ہوا کرتی ہے، تیس سال گزر گئے، کہ میں ہمیشہ شافعی کے لیے دعا کرتا ہوں اور ان کے لیے مغفرت طلب کرتا ہوں۔ (ایضا)

☆**علامہ ابن خلکان:۔** ”وکان الشافعی کثیر المناقب جم المفاخر منقطع القرین اجتمعت فیہ من

العلوم بکتاب اللہ وسنۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم وکلام الصحابۃ وآثارھم واختلاف اقاویل العلماء وغیر ذلک من معرفۃ کلام العرب واللغۃ والعربیۃ والشعر ’’امام شافعی کثیر المناقب اور بہت سارے مفاخر کے جامع منقطع القرین، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، صحابہ کے کلام وآثار اور علما کے مختلف فیہ اقوال اور اس کے علاوہ کلام عرب کی معرفت، لغت، عربیت، شعر جیسے علوم وفنون ان میں جمع ہو گئے۔ (ایضا)

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں، ایک دن میرے استاذ امام احمد بن حنبل نے مجھے مکہ میں فرمایا ’’تعال حتی اریک رجلا لم تر عیناک مثلہ فاقامنی علی الشافعی‘‘ آؤ میں تم کو ایک ایسا انسان دکھاؤں کہ اس جیسا انسان آج تک تمہاری آنکھوں نے نہیں دیکھا، پھر مجھے امام شافعی کی خدمت میں لے گئے۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۲۹)

☆ **یونس بن عبد الاعلی:۔** اگر تمام لوگوں کی عقل شافعی کی عقل میں ضم کر دی جائے تو لوگوں کی عقل کا پتہ نہیں چلے گا۔

(ائمہ اربعہ ص ۱۷۱)

☆ **ابن عبد الحکم:۔** ’’ان کان احد من اھل العلم حجۃ فالشافعی حجۃ فی کل شیٔ‘‘ اگر کوئی اہل علم حجت ہے تو امام شافعی ہر چیز میں حجت ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۷)

☆ **یحیٰی بن اکثم:۔** ’’کان الشافعی رجلا قرشی العقل والفھم والذھن صافی العقل والفھم والدماغ سریع الاصابۃ ولو کان اکثر سماعا للحدیث لاستغنی امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہ عن غیرہ من الفقھا‘‘ امام شافعی ایسے انسان تھے، جو فی الحقیقت عقل، فہم، ذہن میں قریشی تھے، روشن عقل وفہم اور دماغ رکھتے تھے تیز دماغ زود فہم تھے، اگر وہ سماع حدیث ہی کی طرف توجہ کرتے، تو امت مسلمہ ان کے علاوہ دوسرے فقہا سے بے نیاز ہو جاتی۔

(تاریخ ذہبی ج ۲ ص ۳۱۳)

☆ **مامون:۔** ’’قد امتحنت محمد بن ادریس فی کل شیٔ فوجدتہ کاملا‘‘ میں نے امام محمد بن ادریس کا امتحان لیا، تو ساری چیزوں میں انہیں کامل پایا۔ (ایضا ص ۳۱۴)

☆ **ابوثور:۔** ’’ما رایت مثل الشافعی ولا رای ھو مثل نفسہ‘‘ میں نے امام شافعی کا مثل نہیں دیکھا اور نہ انہوں نے خود اپنا مثل کسی کو دیکھا۔ (ایضا ص ۳۱۵)

علما ومشائخ کے نزدیک امام شافعی حد درجہ مقدس ومحترم تھے، وہ ان کی ارادت وعظمت میں رطب اللسان ہونے کے ساتھ ساتھ بارگاہ الٰہی میں ان کے حق میں دعائیں بھی کیا کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل علما میں سب سے زیادہ امام شافعی کے معترف تھے، ابوداؤد سلیمان بن اشعث کا قول ہے ’’ما رایت احمد بن حنبل یمیل الی احد میلہ الی الشافعی‘‘ میں نے احمد بن حنبل کو سب سے زیادہ امام شافعی سے محبت کرنے والا پایا۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ٦٦)

اسی بناپر اپنی دعاؤں میں احمد بن حنبل امام شافعی کو یاد کیا کرتے تھے، وہ خود فرماتے ہیں ’’ستة ادعو لهم سحرا احدهم الشافعي‘‘ میں چھ آدمیوں کے لیے صبح کے وقت دعا کرتا ہوں، ان میں ایک شافعی بھی ہیں۔ (ایضا)

امام احمد کے بیٹے عبداللہ نے ان سے پوچھا، اے والد بزرگوار شافعی میں کیا بات ہے؟ کہ آپ اکثر ان کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں تو انہوں جواب دیا ’’یابنی کان الشافعي کالشمس للدنیا ‘‘ اے میرے بیٹے! امام شافعی دنیا کے لیے سورج کی طرح ہیں۔ (ایضا)

حارث بن سریج بقال کہتے ہیں، میں نے یحییٰ قطان کو کہتے ہوئے سنا ’’انا ادعو الله للشافعي اخصه به‘‘ میں خصوصیت کے ساتھ امام شافعی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ (تاریخ ذہبی ج ۲، ص ۳۱۴)

ابوبکر بن خلاد کہتے ہیں ’’انا ادعو الله في دبر صلوتي للشافعي‘‘ میں ہر نماز کے بعد امام شافعی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ (ایضا)

* * *

حلقہ درس اور اشاعت علم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''اللھم اھد قریشا فان عالمھا یملأ طباق الارض علما '' خدایا تو قریش کو ہدایت دے، کیوں کہ ان کا ایک عالم روئے زمین کو علم سے بھر دے گا۔

علامہ ابونعیم عبدالملک بن محمد نے اس حدیث کا مصداق امام شافعی کو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ اس حدیث میں قریش کے جس عالم کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اس کا مصداق امام عبداللہ شافعی رضی اللہ عنہ ہیں۔ (ملخصا تہذیب التہذیب ج۹ ص۲۴)

بلا ریب عہد شافعی سے لے کر آج تک ان کا علمی فیضان جاری ہے اور ان کے مکتب فقہ وحدیث کے تعلیم یافتہ اصحاب نے ان کے علم وفضل کی میراث کو دنیا والوں پر تقسیم کیا اور آج تک یہ فیضان جاری ہے اور ان کے اس خواب کی سچی تعبیر ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں، میں نے ایک شب خواب میں حضرت علی کو دیکھا انہوں نے مجھے سلام کر کے مصافحہ کیا اور اپنی انگوٹھی اتار کر مجھے پہنادی، میں نے اس خواب کا تذکرہ اپنے چچا سے کیا، تو انہوں نے کہا، حضرت علی کا مصافحہ عذاب سے امان ہے اور انگشتری کی تعبیر یہ ہے کہ دنیا میں جہاں تک حضرت علی کا نام پہنچا ہے تمہارا نام بھی وہاں تک پہنچے گا۔ (ایضا)

امام شافعی نے جملہ علوم وفنون متداولہ میں کمال پیدا کرنے کے بعد علمائے سلف کی روایت کے مطابق حلقہ درس قائم کیا اور اپنے چشمہ علم سے دنیا کو خوب خوب سیراب کیا، ان کی مجلس درس سب سے پہلے بغداد میں قائم ہوئی، پھر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے اور وہاں سے عمر کے آخری سالوں میں مصر چلے گئے، ان تینوں مقامات میں ان کے علمی کمال کا شہرہ ہوا اور حلقہ درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد ایک ایک وقت میں سات سات سو ہوا کرتی تھی، عام طالب علموں کے علاوہ علما وشیوخ کی بھی خاصی تعداد مجلس درس میں حاضر رہتی تھی، حسن بن محمد زعفرانی کہتے ہیں، کہ قیام بغداد کے زمانے میں امام شافعی کی مجلس میں ادبا اور کتاب حاضر ہو کر ان سے فصاحت وبلاغت اور حسن بیان سنتے تھے، میں کیا کسی نے ان کے دور میں ان جیسا عالم نہیں دیکھا۔

ابوالفضل زجاج کہتے ہیں، کہ جس وقت امام شافعی بغداد میں تشریف لائے وہاں کی جامع مسجد میں چالیس، پچاس علمی اور درسی حلقے جاری تھے اور امام صاحب ایک ایک حلقہ میں بیٹھ کر حاضرین سے کہتے تھے قال اللہ وقال الرسول اور وہ لوگ قال اَصحابنا کہتے تھے نتیجہ یہ ہوا، کہ کچھ دنوں کے بعد مسجد میں ان کے حلقہ کے علاوہ کوئی حلقہ باقی نہیں رہ گیا، خود امام صاحب کہتے

ہیں، کہ میں بغداد میں ناصر الحدیث کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۸۶)

آپ کی مجلس درس کا نظام الاوقات یہ تھا، صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک فقہ کا درس دیتے، پھر حدیث کا درس شروع ہوتا، اس کے بعد مجلس وعظ ہوتی، پھر مذاکرات علمی ہوا کرتے ظہر کے بعد ادب، شعر و شاعری، عروض، نحو، لغت کا درس ہوتا رہتا، پھر عصر تک گھر پر آرام فرماتے، عصر سے لے کر مغرب تک ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔

امام احمد حلقہ درس میں

امام شافعی ۱۸۴ھ کے بعد ۱۹۵ھ میں بغداد تشریف لائے اور دو سال قیام رہا، اسی دوران بغداد میں حلقہ درس قائم ہوا اور امام احمد بن حنبل ان کے حلقہ درس میں شامل ہوئے، وہ امام شافعی کی بارگاہ میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ حاضر ہوتے اور تعلیم حاصل کرتے، ایک مرتبہ یحیٰی بن معین نے امام احمد کے صاحبزادے صالح سے کہا، کہ آپ کے والد کو شرم نہیں آتی ہے، میں نے ان کو شافعی کے ساتھ اس حال میں دیکھا ہے، کہ شافعی سواری پر چل رہے ہیں اور آپ کے والد رکاب تھامے ہوئے پیدل چل رہے ہیں، صالح نے یحیٰی بن معین کی یہ بات اپنے والد امام احمد سے بیان کی، تو انہوں نے کہا، کہ ان سے کہہ دو، کہ اگر آپ فقیہ بننا چاہتے ہیں، تو شافعی کی سواری کی دوسری رکاب تھام لیں۔ (ترتیب المدارک ج ۱ ص ۳۸۷)

دوسری روایت میں صالح کا بیان ہے، کہ میرے والد صاحب کو امام شافعی کی سواری کے ساتھ جاتے ہوئے یحیٰی بن معین نے دیکھا، تو ان کے پاس کہلا بھیجا، کہ ابو عبداللہ! آپ شافعی کی سواری کے ساتھ چلنے کو پسند کرتے ہیں؟ والد نے اس کے جواب میں کہا، کہ ابوزکریا! اگر آپ سواری کی بائیں جانب چلتے تو زیادہ فائدے میں رہتے۔ (تاریخ بغداد ج ۲ ص ۶۶)

حسن بن محمد زعفرانی کہتے ہیں، کہ امام صاحب بغداد آئے، تو ہم چھ طلبہ ان کے درس میں آنے جانے لگے، احمد بن حنبل، ابوثور، حارث بقال، ابوعبدالرحمٰن شافعی، میں اور ایک اور طالب علم اور ہم جو کتاب بھی امام شافعی کے یہاں پڑھتے تھے، احمد بن حنبل حاضر رہتے تھے۔ (ایضا ص ۶۸)

امام شافعی نے جس ایثار و اخلاص اور انہماک کے ساتھ علم طلب کیا تھا، اسی نہج پر اس دولت لازوال کو اپنے شاگردوں کے سینوں میں منتقل کر دینے کا جذبہ رکھتے تھے، چنانچہ اپنے ایک شاگرد ربیع سلیمانی مرادی کے حق میں فرمایا "یا ربیع لو امکننی ان اطعمك العلم لاطعمتك" اے ربیع! اگر میرے بس میں ہوتا، کہ میں تم کو علم کھلا دوں تو ضرور کھلا دیتا۔ (ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۳)

تدریس و تعلیم میں معلم کے لیے طلبہ کی نفسیات، افتادِ طبع کا درک بڑی اہمیت رکھتا ہے، امام شافعی اپنے شاگردوں کی نفسیات، قبول علم کی صلاحیت اور ان کی طبیعت و مزاج کے رمز شناس تھے، چنانچہ انہوں نے کبھی کبھی اس بات کا اظہار بھی کیا، بغداد سے جاتے ہوئے امام احمد بن حنبل کے بارے میں فرمایا، کہ ان جیسا پاکباز متقی، فقیہ اور عالم کسی کو نہ چھوڑا۔

اپنے تلمیذ خاص مزنی کے بارے میں کہا کہ "المزنی ناصر مذهبی" اور دوسرے شاگرد ربیع مرادی کے بارے میں

فرمایا "الربیع روایتی"

ایک مرتبہ کہا، کہ تین علما زمانہ کے عجائب میں سے ہیں، ایک عربی شخص جو ایک کلمہ بھی ٹھیک طریقہ سے ادا نہیں کرتا، یہ ابو ثور ہے، دوسرا عجمی شخص ہے، جو ایک کلمہ میں بھی غلطی نہیں کرتا ہے، یہ حسن زعفرانی ہے اور تیسرا چھوٹا شخص، جب وہ کوئی بات کہتا ہے، تو بڑے علما اس کی تصدیق کرتے ہیں، یہ احمد بن حنبل ہیں۔

ایک مرتبہ کہا، کہ میں نے دو آدمیوں سے زیادہ کسی کو عقل مند نہیں دیکھا، احمد بن حنبل اور سلیمان بن داؤد ہاشمی۔

(مناقب الامام احمد بن حنبل، ابن جوزی ص ۱۰۸)

بغداد کے حلقہ درس میں امام صاحب کی کتابیں حسن زعفرانی پڑھا کرتے تھے اور طلبہ ان کو لکھتے تھے، امام شافعی حدیث وفقہ میں تبحر کے باوجود احمد بن حنبل اور عبدالرحمٰن بن مہدی سے کہتے تھے، تم لوگ مجھ سے زیادہ حدیث کا علم رکھتے ہو، صحیح حدیث ہو تو مجھے بتانا میں اس کو اختیار کروں گا۔ (ترتیب المدارک ج ۱ ص ۳۹۰)

ربیع مرادی کا بیان ہے، کہ امام صاحب کے انتقال کے وقت میں حاضر تھا، ان کے پاس بویطی مزنی اور ابن عبدالحکم بھی موجود تھے، امام صاحب نے ہماری طرف دیکھ کر فرمایا:

اما انت یا ابایعقوب فستموت فی حدیدك واما انت یامحمد فترجع الی مذهب ابیك واما انت یاربیع فانت انفعهم لی فی نشر الکتب واما انت یامزنی فسیکون لك بمصر هنات وهنات ولتدرکن زمانا تکون ذلك اقیس ذلك الزمان قال الربیع فکان کما قال۔

اے ابو یعقوب (بویطی) تم لوہے کی زنجیر اور بیڑی میں انتقال کرو گے اور اے مزنی تمہارے لیے مصر میں چہ میگوئیاں ہوں گی، مگر آگے چل کر تم اپنے زمانہ کے سب سے بڑے فقہی قیاس کرنے والے ہو گے، اور تم اے محمد! (ابن عبدالحکم) امام مالک کے مذہب کو اختیار کر لو گے اور مجھ سے کہا، کہ اے ربیع! تم میری کتابوں کی نشر واشاعت میں میرے حق میں مفید و نافع ہو گے، اے ابو یعقوب! اٹھو اور میرا حلقہ درس سنبھالو، ربیع مرادی کہتے ہیں، کہ امام صاحب کی وفات کے بعد ہم میں سے ہر ایک وہی ہوا جو امام صاحب نے کہا تھا (جیسے وہ باریک پردے کے پیچھے غیب کو دیکھ رہے تھے)۔ (ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰۳)

امام شافعی کا ملت اسلامیہ پر اتنا بڑا احسان ہے، جس کے شکریے سے عہدہ برآ ہونا از بس دشوار ہے، امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں "**ما احد مس محبرة ولا قلما الا وللشافعی فی عنقه منة**" جس کا دوات قلم سے تعلق ہے، اس کی گردن پر امام شافعی کا احسان ہے۔ (تاریخ ذہبی ج ۲، ص ۳۱۵)

ابو اسماعیل ترمذی کا بیان ہے، میں نے اسحاق بن راہویہ کو کہتے ہوئے سنا:

کنا بمکة والشافعی بها واحمد بن حنبل بها فقال لی احمد ابن حنبل یا ابایعقوب جالس

هذاالرجل يعنى الشافعى قلت ما اصنع به وسنه قريب من سننا اترك ابن عيينة والمقبرى فقال ويحك ان ذاك يفوت وذا لايفوت فجالسته ۔ (آداب الشافعی ومناقبہ ج ا ص ۴۳)

ہم مکہ میں تھے شافعی واحمد بن حنبل بھی وہیں تھے، تو مجھ سے احمد بن حنبل نے کہا، اے ابو یعقوب! اس شخص یعنی شافعی کی مجلس میں بیٹھو، میں نے کہا، میں ان سے کیا حاصل کرسکتا ہوں، جب کہ وہ میرے ہم عمر ہی ہیں، کیا میں ابن عیینہ اور مقبری کو چھوڑ دوں، تو کہا، تم پر افسوس ہے، ان کی تلافی ہوسکتی ہے، مگر اس کی تلافی نہیں ہوسکتی، تو میں شافعی کے حلقہ درس میں بیٹھ گیا۔

۱۹۷ھ میں بغداد سے مکہ تشریف لے گئے اور وہاں حرم کعبہ میں مجلس درس قائم کی، اس مجلس درس کے اہم شاگردوں میں سلیمان بن داؤد ہاشمی اور ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی اور موسیٰ بن ابو جارود مکی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

* * *

قیام مصر

۱۹۸ھ میں بغداد آئے اور چند ماہ قیام کے بعد ۱۹۹ھ میں مصر تشریف لے گئے، جب امام شافعی نے سفر مصر کا ارادہ کیا تو یہ اشعار کہے۔

لقد اصبحت نفسی تتوق الی مصر
ومن دونہا قطع المہامۃ والقفر
فواللہ ماادری اللفوز والغنی
اساق الیہا ام اساق الی القبر

میرا دل مصر جانے کا مشتاق ہے، حالاں کہ اس سفر میں بڑی دشوار گزار وادیاں اور چٹیل میدان حائل ہیں۔
خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں اطمینان واستغنا کے لیے جا رہا ہوں یا قبر میں جانے کے لیے۔

امام شافعی مشکلات سفر برداشت کرتے ہوئے مصر پہنچے وہاں انہوں نے حلقہ درس قائم کیا، علما اور طالبان علم کا مرجع ومرکز بنے، فوز وکامرانی نصیب ہوئی، دولت واستغنا سے مالا مال ہوئے، خوش حال زندگی کے ایام دیکھے اور یہیں ۲۰۴ھ میں وفات پائی، مسجد عمر و بن عاص کے گوشے میں سپرد خاک کیے گئے، اس طرح امام صاحب کی دونوں باتیں پوری ہوئیں، وہاں مستغنی ہوئے اور فوت بھی ہوئے۔

مصر میں عبداللہ بن عبدالحکم سے تعلقات

امام شافعی جب مصر تشریف لائے اور وہیں مستقلاً رحل اقامت ڈال دیا، تو اس غریب الوطنی میں جو شخصیت آپ کی مالی امداد اور آپ کی علمی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہی، وہ مصر کے مشہور عالم مالکی فقیہ عبداللہ بن عبدالحکم ہیں، جو امام شافعی کی علمی وفقہی عبقریت سے بہت متاثر تھے اور ان کے اعزاز واحترام کو ہر حال میں برقرار رکھنے کی کوشش کرتے، سعید بن عبداللہ بن عبدالحکم مصری کا بیان ہے، جس وقت امام شافعی ہمارے یہاں مصر میں آئے، سخت قلت اور افلاس میں تھے، میرے بھائی محمد نے بعض مالداروں سے پانچ سو دینار وصول کیے اور والد صاحب نے پانچ سو دینار دیے، امام صاحب کو ابن عبدالحکم سے مصر میں خاص تعلق تھا، حتی کہ انہیں کے وہاں وفات پائی، روزانہ صبح کو ان کے یہاں تشریف لے جاتے،

اگر وہ نہ ہوتے تو دریافت کر کے ان کے پاس جاتے تھے، امام شافعی روزانہ ان کے یہاں سے مالک کی کتابوں کے دو جز لے جاتے تھے اور دوسرے دن ان کو واپس کر کے دوسرے جز لے جاتے تھے۔

ابن عبد البر کا بیان ہے، کہ عبد اللہ بن عبد الحکم اور ان کے دونوں لڑکوں نے امام شافعی سے حدیث کی روایت کی اور ان کی کتابیں لکھیں اور اپنے لڑکے محمد کو امام صاحب کے حوالے کر دیا۔

محمد بن عبد اللہ کا بیان ہے، کہ میں جن دنوں امام صاحب کے یہاں زیادہ آنے جانے لگا، مالکی مسلک کے علما ہمارے والد صاحب کے پاس جمع ہوئے اور کہا، کہ ابو محمد آپ کے صاحبزادے شافعی کے یہاں آتے جاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں، کہ یہ بات مالکی مسلک سے بیزاری کی وجہ سے ہے، ان لوگوں کی بات سن کر والد صاحب نے ان کو نرمی سے سمجھایا، کہ یہ لڑکا ابھی نوجوان ہے، اس کو علما کے مختلف اقوال معلوم کرنے اور ان میں غور وفکر کرنے کا شوق ہے اور تنہائی میں مجھ سے کہتے تھے، کہ تم ان کے یہاں جاتے رہو، اگر اس شہر سے نکل کر باہر جاؤ گے اور کسی مسئلہ میں امام مالک کا قول اشہب کی روایت سے بیان کرو گے تو تم سے پوچھا جائے گا اشہب کون ہے؟ اس کے بعد میں نے امام شافعی کی معیت وصحبت اپنے اوپر لازم کر لی والد کی بات میرے دل میں رہی اور جب میں مصر سے عراق گیا، تو وہاں کے قاضی نے اپنے ہم نشینوں کے سامنے ایک مسئلہ میں بات کی، میں نے اثنائے گفتگو قال اشہب عن مالک کہا، قاضی نے پوچھا اشہب کون ہے؟ یہ کہہ کر حاضرین مجلس کی طرف متوجہ ہوا اور ان میں سے ایک شخص نے کہا، اس کو اشہب اور ابلق کا علم نہیں ہے۔

امام صاحب بھی اپنے اس شاگرد رشید کے ساتھ بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے تھے، مزنی کا بیان ہے، کہ ہم لوگ امام شافعی سے حدیث کے سماع کے لیے جاتے تو پہلے ان کے دروازے پر بیٹھتے تھے پھر اندر آنے کی اجازت ملتی تھی اور محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم آتے تو بالا خانہ پر چلے جاتے اور دیر تک امام صاحب کے پاس رہتے، بعض اوقات ان کے ساتھ کھانا کھاتے، اس کے بعد امام صاحب نیچے آ کر ہم لوگوں کو درس دیتے تھے، فراغت کے بعد محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم اپنی سواری پر جانے لگے تو امام صاحب دیر تک ان کو دیکھتے رہے اور تمنا کرتے کہ میرا بھی ایسا ہی کوئی لڑکا ہوتا۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۳۰)

امام صاحب ان کے مکان پر جایا کرتے تھے ان کے بھائی سعید بن عبد اللہ کا بیان ہے، کہ بسا اوقات امام صاحب سواری پر ہمارے یہاں آتے اور مجھ سے کہتے، کہ محمد کو بلاؤ میں ان کو لے کر آتا تو ان کے ساتھ جاتے اور دیر تک رہتے اور وہیں قیلولہ کرتے تھے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۳۰۰)

امام شافعی نے مصر ہی میں بغداد کے مدونہ فقہ (جسے کتاب قدیم یا قول قدیم کہتے ہیں) پر نظر ثانی کی اور اس میں ترمیم وتنسیخ کے بعد کتاب جدید مدون فرمائی جسے قول جدید سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

تلامذہ

ابن حجر عسقلانی آپ کے تلامذہ کی تعداد ۶۰۰ بتاتے ہیں، ربیع بن سلیمان فرمایا کرتے تھے کہ میں نے آپ کے دروازے پر سات سو سواریاں دیکھی ہیں، ان پر لوگ دور دور سے حدیث وفقہ سیکھنے آیا کرتے تھے، آپ کے شاگردوں کی تعداد متعین نہیں۔ یہاں کچھ اہم تلامذہ کے نام درج کیے جاتے ہیں:

بغداد کے حلقہ درس کے چار اہم تلامذہ:۔ زعفرانی، ابوثور، احمد بن حنبل اور کرابیسی۔

مصر کے فیض یافتہ شاگردوں میں چھ نام اہم ہیں، جنہوں نے فقہ شافعی کی نشر واشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مزنی، ربیع جیزی، ربیع مرادی، بویطی، حرملہ، یونس بن عبدالاعلی۔

ان اہم شاگردوں کے علاوہ کچھ اور قابل ذکر تلامذہ کے اسما یہ ہیں:

سلیمان بن داؤد ہاشمی، ابوبکر عبداللہ بن زبیر حمیدی مکی، ابراہیم بن منذر حزامی، ابراہیم بن خالد، ابوطاہر بن سراج، عمرو بن سواد عامری، ابوالولید موسیٰ بن ابی الجارود مکی، ابویحییٰ محمد بن سعید بن غالب عطار، ابوعبید، احمد بن سنان واسطی، محمد بن عبداللہ بن عبد الحکم، ہارون ایلی۔ (تہذیب التہذیب ج۹ ص۲۳)

◆ ◆ ◆

علم و فضل

قرآن اور فہم قرآن

امام شافعی عربی زبان وادب، لغت، شاعری اور اسالیب نثر کے رمز شناس تھے، انہوں نے لفظ و معنی، احکام و قصص، عبر ونصائح ہر پہلو اور ہر زاویے سے قرآن حکیم کا مطالعہ فرمایا تھا، اعجاز بیان، قرآنی احکام اور تعلیمات کے اسرار ورموز کو سمجھنے کی بلیغ کوشش کی تھی، انہوں نے بحیثیت مجتہد وفقیہ قرآن کی آیات احکام کو خوب سمجھا تھا، وہ تفسیر قرآن اور تاویل قرآن کے نہج سے آشنا تھے۔

فہم قرآن اور اس کے ضوابط سے متعلق آپ کی مشہور کتاب ''احکام القرآن'' ہے، احکام القرآن میں ہے: قرآن مجید میں جن احکام کی پابندی مسلمانوں پر لازم کی گئی ہے، ان کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) عقائد جس میں توحید، رسالت، کتب سابقہ انبیا علیہم السلام حشر ونشر وقرآن پر ایمان لانا فرض ہے۔

(۲) عبادات جن کا ادا کرنا بھی فرض ہے، ان کی حیثیتیں یہ ہیں، ایک وہ معاملہ ہے، جو خدا اور بندے کے درمیان ہے، جیسے نماز روزہ زکاۃ مالی اور تمدنی عبادت ہے، حج بدنی اور تمدنی ہے، یہ چاروں ایمان کے بعد بنیاد اسلام ہیں اور یہ ایمان میں داخل ہیں۔

بندوں کے باہمی معاملات ان کی دو حیثیتیں ہیں ایک قوانین تحفظ، دعوت اسلام وجہاد دوسرے قوانین معاشرت جیسے نکاح، طلاق اور وراثت کے احکام۔

(۳) قوانین معاملات باہمی یعنی بیع اجارہ وغیرہ۔

(۴) قوانین تعزیری یعنی حدود وقصاص

قرآن مجید کے احکام کو کس طرح سمجھنا چاہیے، آپ اکثر اس جملہ کا اعادہ فرماتے رہتے تھے، کہ مجھے اس شخص پر حیرت ہے، جو لغت عرب، ایام عرب سے ناواقف ہونے کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر کرنے کی جرأت کرتا ہے، کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت حاصل نہیں کر سکتا، بایں طور کہ اس کا نفس قرآنی وعدوں پر مطمئن ہو جائے، وعید سے لرز جائے، وحدانیت اور رسالت کے حقائق سے صحیح آشنا ہو سکے، تا آنکہ وہ اس کے معانی کو سمجھنے کی اہمیت پیدا نہیں کر لیتا۔ اس کے طریقہ ہائے بیان کی حلاوت محسوس نہیں کر لیتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی پر اور ان وقائع پر جن کے لحاظ و مناسبت سے نزول قرآن ہوا ہے باخبر نہیں ہو جاتا۔

ظلم سے کیا مراد ہے؟

لغات اور کلام عرب اور ان باتوں پر عبور ہو جانے کے بعد سب سے بالا تر موہبت باری تعالیٰ ہے، جس کا نام نور بصیرت ہے، فرماتے ہیں قرآن مجید کی اس آیت کو سمجھنا چاہیے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمٰنَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۔ (الانعام:۸۲/۶)

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، انہیں کے لیے امن ہے اور وہی سیدھے راستے پر ہیں۔

یہاں پر اگر ظلم کے لغوی معنی لیے جائیں، تو الا ماشاء اللہ کوئی نہیں بچ سکتا۔

صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے کون ہے، جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو، آپ نے فرمایا یہاں ''ظلم'' سے مراد شرک ہے، اس حدیث نے لغت میں یہ اضافہ کیا کہ ظلم کے معنی وضع الشی فی غیر محلہ یعنی کسی شے کا استعمال بے محل کرنا ظلم ہے، اس لیے اس کا مقصد یہ ہے، کہ ایمان بجائے خود وہ قوت ہے جس میں بجز توحید کے اور کچھ نہ ہو اور شرک کا اختلاط وضع الشی فی غیر محلہ کا صحیح مصداق ہوا۔

قرآن کی تفسیر میں امام شافعی کا درجہ

امام یونس بن عبدالاعلیٰ فرماتے ہیں، امام شافعی اس خوبی سے قرآن مجید کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے، گویا آپ نزول قرآن کے وقت موجود تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں، کہ قرآن کریم میں کوئی کلمہ نہیں، جس کا مطلب محاورہ عرب کے لحاظ سے میں نہ جانتا ہوں، فہم قرآن کی ایک مثال آخرت میں رویت باری تعالیٰ کی نسبت صحابہ کرام کا اتفاق ہے، آیت ''**کلا انهم عن ربهم یومئذ لمحجوبون**'' بے شک کافر اپنے رب سے اس دن محجوب رہیں گے۔

امام شافعی فرماتے ہیں، کہ ناراضگی کی بنا پر ایک قوم کا محجوب ہونا دلالت کرتا ہے، کہ رضا مندی کی وجہ سے دوسری قوم اس کو دیکھے گی، اس سے بڑھ کر آپ کا یہ قول ہے، کہ خدا کی قسم! اگر محمد بن ادریس (شافعی) کو اس بات کا یقین نہ ہوتا کہ میعاد میں اپنے رب کو دیکھے گا، تو دنیا میں اس کی عبادت نہ کرتا، یہ صرف رب العالمین کے کلام کا نمونہ ہے جو آپ نے کہا ورنہ اللہ تعالیٰ بذاتہ مستحق عبادت ہے۔

اہل سنت کا اجماع ہے، کہ عام مومنین کو رویت باری نصیب ہوگی جیسا کہ حدیث میں ہے:

انکم سترون ربکم کما ترون القمر لیلة البدر (اتحاف السہر ۃ:۶۴/۴)

تم قریب میں اپنے رب کو دیکھو گے جیسا کہ چودہویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔

معتزلہ کہتے ہیں، کہ تم قریب میں اپنے پروردگار کی رحمت کو دیکھو گے، معتزلہ کا یہ قول خلاف اجماع ہے۔

امام شافعی تجوید و قرأت کے فن میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کی قرأت سے قلب و روح وجد میں آجاتے، امام

مالک ان سے اکثر و بیشتر قرآن سنا کرتے تھے۔

خود امام شافعی فرماتے ہیں، کہ امام مالک کے سامنے قرأت پڑھنے والا بڑا قابل ہوتا تھا، آپ نے مجھے حکم دیا، کہ تم پڑھا کرو میں کچھ پڑھ کر خاموش ہو جاتا، تو آپ فرماتے، کہ ابھی اور پڑھو میری خوش الحانی آپ کو بے حد پسند تھی، آپ قرآن شریف کو خوش الحانی اور عرب کے تمام لہجوں میں پڑھتے تھے، جب آپ امامت فرماتے تو لوگوں کے رونے کی آوازیں بلند ہو جاتیں تو آپ کو رکوع کر دینا پڑتا اور جب آپ کسی مجلس میں قرآن شریف پڑھتے تو لوگوں کی ہچکیاں بندھ جاتیں اور بہت سارے لوگ بے خود ہو کر گر جاتے، امام رازی فرماتے ہیں، آپ کی قرأت کی سند کا سلسلہ چار واسطوں کے بعد سید القراء ابی بن کعب اور ان کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔

حدیث

امام شافعی ابتدا ہی سے حدیث کے حفظ وضبط کی طرف مائل تھے، مکہ کے شیوخ حدیث کی بارگاہوں میں حدیث کا سماع کرتے، ایک روایت کے مطابق جب امام مالک کی خدمت میں حاضری اور طلب علم کا شوق پیدا ہوا، تو نو راتوں میں پوری مؤطا حفظ کر لی، امام مالک کی بارگاہ میں مؤطا کی زبانی قرأت کی، اس بے نظیر قوت حفظ وضبط اور بے کراں جذبہ طلب حدیث نے انہیں بہت بڑا حافظ الحدیث بنا دیا تھا، امام مالک، سفیان بن عیینہ اور امام محمد بن حسن شیبانی جیسے اساطین علم سے کسب فیض نے انہیں بحر علم بنا دیا تھا، وہ صرف حافظ الحدیث ہی نہیں تھے، بلکہ حدیث کے معانی و مفاہیم، راویوں کے حالات و کوائف اور حدیث کی صحت و سقم کے زبردست عالم تھے، انہوں نے ضبط و نقل روایت کے علاوہ جمع روایات، تنقید احادیث، اصول روایت اور امتیاز مراتب کے قواعد مرتب کیے، خدمت حدیث میں ان کا پایہ بہت بلند ہے، محدثین نے ان کے حفظ وضبط، ثقہ اور حجت ہونے کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

☆ **امام نسائی:۔** ''کان الشافعی عندنا احد العلماء ثقة ماموناً'' امام شافعی ہمارے نزدیک ثقہ مامون علما میں سے ایک ہیں۔ (تہذیب ج ۹ ص ۲۷)

☆ **ابوداؤد:۔** ''لیس للشافعی حدیث اخطأفیه' 'امام شافعی کے پاس کوئی ایسی حدیث نہیں، جس میں انہوں نے خطا کی ہو۔ (ایضا)

☆ **ابوزرعہ رازی:۔** ''ماعند الشافعی حدیث غلط'' امام شافعی کے پاس کوئی ایسی حدیث نہیں، جس میں خطا ہو۔ (ایضا)

☆ **حافظ ذہبی:۔** ''وکان حافظا للحدیث بصیرا بعلله لا یقبل منه الا ما ثبت عنده ولو طال عمره لازداد منه' ' آپ حدیث کے حافظ اور اس کے علل کو خوب جاننے والے تھے، صرف وہی حدیث قبول کرتے جو آپ کے نزدیک درجہ صحت کو پہنچ جاتی تھی، اگر کچھ دن اور زندہ رہتے تو اس فن میں آپ کے کمال میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۰)

علم حدیث پر امام شافعی کے عظیم احسانات کا اعتراف ائمہ فن نے اس طرح کیا ہے:

☆**ابوحاتم رازی:۔** ''لولا الشافعی لکان اصحاب الحدیث فی عمی'' اگر امام شافعی نہ ہوتے تو اصحاب حدیث تاریکی میں رہتے۔ (مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۱۹)

☆**زعفرانی:۔** ''کان اصحاب الحدیث رقودا حتی جاء الشافعی فایقظھم فتیقظوا'' حدیث والے سوئے ہوئے تھے، امام شافعی آئے انہیں بیدار کیا تو وہ بیدار ہوئے۔ (وفیات الاعیان ج ۲ ص ۳۱۲)

☆**محمد بن حسن:۔** ''ان تکلم اصحاب الحدیث یوما بلسان الشافعی'' اصحاب حدیث ہمیشہ امام شافعی ہی کی زبان میں کلام کریں گے۔ (توالی التاسیس ص ۵۴)

☆**امام احمد بن حنبل:۔** ''ان اللہ یقبض للناس فی کل رأس مائۃ سنۃ من یعلمھم السنن وینفی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکذب فنظرنا فاذا فی رأس المائۃ عمر ابن عبدالعزیز وفی رأس المائتین الشافعی'' بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے ہر صدی کے سرے پر ایسے شخص کو بھیجے گا جو لوگوں کو سنن کی تعلیم دے گا اور رسول اللہ کی طرف منسوب جھوٹ کی نفی کرے گا، میں نے جب اس پر غور کیا تو دیکھا پہلی صدی کے آخر میں عمر بن عبدالعزیز ہوئے اور دوسری صدی کے آخر میں امام شافعی ہوئے۔ (جنہوں نے علم سنت کو عام کیا۔ (تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۵)

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں، ہمیں مجمل، مفصل اور ناسخ و منسوخ اور حدیث کا علم نہیں ہوا جب تک ہم امام شافعی کی مجلس میں نہ بیٹھے۔

ابراہیم ہروی نے کہا، میں نے احمد سے شافعی کے بارے میں پوچھا، تو انہوں نے کہا، ''حدیث صحیح ورای صحیح'' ان کی حدیث صحیح ہے اور ان کی رائے صحیح ہے۔ (تاریخ ذہبی ج ۲، ص ۳۱۵)

☆**قتیبہ:۔** ''مات الثوری ومات الورع مات الشافعی فماتت السنن'' سفیان ثوری نے انتقال کیا، تو ورع و تقویٰ ختم ہوگیا، امام شافعی نے وصال کیا تو سنن مٹ گئے۔ (تاریخ ذہبی ج ۲، ص ۳۱۴)

ایک دفعہ امام شافعی حرم شریف میں تشریف فرما تھے اور آپ کے اطراف لوگوں کا ہجوم تھا آپ فرما رہے تھے، اے عراق والو! اے شام والو! اگر کسی حدیث کے باری میں کچھ پوچھنا چاہتے ہو تو مجھ سے دریافت کر لو امام احمد کے ساتھ اسحاق بھی تھے، انہوں نے فرمایا، کہ چلو اس نوجوان سے حضور کی ایک حدیث کا مطلب معلوم کریں، امام احمد نے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا ''مکنو االطیور فی او کارھم '' رات کے وقت پرندوں کو اپنے گھونسلوں سے نہ اڑاؤ۔ اس پر امام شافعی نے فرمایا، کہ اہل عرب قبل اسلام جب رات کے وقت سفر کرتے تو پرندوں سے شگون (فال) لیتے وہ پرندوں کو اڑاتے اگر پرندہ دائیں طرف اڑ جاتا تو اپنا سفر کامیاب سمجھتے اور بائیں طرف اڑتا تو وہ سفر نہ کرتے، لہٰذا حضور نے ارشاد فرمایا، کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں، ہر کام اللہ کے بھروسے پر ہونا چاہیے، پرندوں کو اپنے گھونسلوں میں رہنے دو، یہ سن کر امام اسحاق نے فرمایا، اگر ہمارا سفر

عراق سے حجاز تک صرف اس حدیث کی شرح کے لیے ہوتا تو بھی کامیاب ہوتا، بے شک اس نوجوان کا دعویٰ سچا ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں، کہ کسی نے امام شافعی سے ایک مسئلہ دریافت کیا، تو آپ نے جواب دے کر دلیل میں ایک حدیث پیش کی تو اس شخص نے آپ سے کہا، کہ کیا آپ اس حدیث پر عمل کرتے ہیں، اس پر آپ کو بہت غصہ آیا اور فرمایا، کیا تم نے مجھے کبھی کنیسا سے نکلتے دیکھا یا میرے گلے میں زنار کو دیکھا ''**اذا اصح الحديث فهو مذهبى**'' جو صحیح حدیث ہو وہی میرا مذہب ہے۔

ابراہیم بن محمد شافعی کا بیان ہے، ہم ابن عیینہ کی مجلس درس میں تھے، وہاں امام شافعی بھی موجود تھے، ابن عیینہ نے یہ حدیث بیان کی:

> **ان النبى صلى الله عليه وسلم مربه رجل فى بعض الليل وهو مع امرأته صفية فقال تعال هذه امرأتى صفية فقال سبحان الله يا رسول الله قال ان الشيطان يجرى من الانسان مجرى الدم ۔**
>
> ایک رات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے کوئی شخص گزرا اور سرکار اپنی زوجہ حضرت صفیہ کے ساتھ تھے، حضور نے فرمایا، آؤ، یہ میری بیوی صفیہ ہے، اس نے کہا، سبحان اللہ! یا رسول اللہ! سرکار نے فرمایا، شیطان خون کی طرح انسان کی رگوں میں دوڑتا ہے۔
>
> ابن عیینہ نے امام شافعی سے کہا، اس حدیث کا مطلب کیا ہے؟ شافعی نے جواب دیا:
>
> **ان كان القوم اتهموا النبى صلى الله عليه وسلم كانوا بتهمتهم اياه كفارا لكن النبى صلى الله عليه وسلم ادب من بعده فقال اذ كنتم هكذا فافعلوا هكذا حتى لايظن بكم ظن السوء لا ان النبى صلى الله عليه وسلم يتهم وهو امين الله عز وجل فى ارضه ۔**
>
> اگر لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت لگائیں، تو تہمت لگانے کی وجہ سے کافر ہو جائیں، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والی نسلوں کی تعلیم کے لیے فرمایا، جب تم اس حالت میں ہو، تو ایسا کرو تاکہ تمہارے متعلق بدگمانی نہ ہو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم متہم نہیں کیے جا سکتے، کیوں کہ وہ روئے زمین پر اللہ کے امین ہیں۔

یہ سن کر ابن عیینہ نے کہا، ''**جزاك الله خيرا يا اباعبدالله مايجيئنا منك الا كل نحبه** '' شافعی! آپ کو اللہ تعالیٰ بہترین جزا عطا فرمائے میں جو چاہتا تھا آپ نے وہی فرمایا۔ (آداب الشافعی ومناقبہ ص ۶۹، ۷۰)

امام شافعی پوری زندگی حدیث وسنت کا تفحص کرتے رہے اور اس شعبہ علم پر حاوی ہو گئے، ان کی جامعیت اور کمال فی السنۃ کے لیے یہ ایک بات کافی ہے، خود فرماتے ہیں ''**انفقت على كتب حسن ستين دينارا ثم تدبرتها فوضعت**

الی جنب کل مسئلة حدیثا ’’محمد بن حسن شیبانی کی کتابیں حاصل کرنے کے لیے میں نے ساٹھ دینار خرچ کیا، پھر میں نے ان کتابوں میں مندرج مسائل پر غور وفکر کیا، تو میں نے ہر مسئلے کے پہلو میں ایک حدیث درج کر دی۔

(تاریخ ذہبی ج ۲، ص ۳۱۳)

اسی کمال حدیث کی بنا پر انہیں بغداد میں ’’ناصر الحدیث‘‘ کے نام سے یاد کیا گیا۔

امام سخاوی نے فتح المغیث میں لکھا ہے، کہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں، کہ میں نے مؤطا امام مالک کو ان کے شاگردوں سے دس بار سنا تھا، جو حفاظ حدیث تھے، لیکن جب امام شافعی سے ملاقات ہوئی تو پھر اس کا اعادہ کیا اور میں نے ان کو سب سے بہتر پایا۔

محدثین اس اسناد کو سلسلۃ الذہب کہتے ہیں ’’**عن احمد عن شافعی عن مالك عن نافع عن ابن عمر**‘‘

فن مناظرہ

امام شافعی محدث وفقیہ ہونے کے ساتھ خداداد عقل وشعور کی بنا پر احقاق حق کے لیے مناظرے کی کامل صلاحیت رکھتے تھے، انہوں نے اپنے مخالفین سے فقہی امور میں کامیاب بحث ومناظرہ کیا۔ ہارون بن سعید فرماتے ہیں:

لو ان الشافعی ناظر علی هذا العمود الذی من حجارة بانه من خشب لغلب لاقتداره علی المناظرة۔

اگر امام شافعی اس پتھر کے ستون کو لکڑی کا ثابت کرنے کے لیے مناظرہ فرمائیں، تو وہ اپنی قدرت مناظرہ کی بنا پر غالب آ جائیں گے۔

محمد بن عبد الحکم کا بیان ہے ’’**لو رایت یناظرك لظننت انه سبع یاکلك**‘ ’اگر تم سے امام شافعی مناظرہ کریں تو تم خیال کرو گے کہ وہ بھیڑیے کی طرح تم کو کھا جائیں گے۔

ذیل میں امام شافعی کے چند مناظروں کی روداد اجمالاً تحریر کی جاتی ہے۔

تارک صلوٰۃ کے بارے میں امام احمد اور امام شافعی کے درمیان مناظرہ ہوا، امام شافعی نے فرمایا، اے احمد! کیا تم تارک صلوٰۃ کو کافر قرار دیتے ہو؟ آپ نے فرمایا، ہاں! امام شافعی نے فرمایا، پھر وہ مسلمان ہونا چاہے تو کیا کرے؟ امام احمد نے جواب دیا ’’لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ‘‘ کی گواہی دے، امام شافعی نے فرمایا، کہ وہ تو ’’لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ‘‘ کا ہمیشہ قائل ہے، امام احمد نے کہا، تو وہ نماز پڑھنے سے مسلمان ہوگا، امام شافعی نے فرمایا ’’**صلوة الكافر لا یصح ولا یحكم بالاسلام بها**‘‘ کافر کی نماز تو ہوتی ہی نہیں پھر اس کی نماز کے ذریعے اسلام کا حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے؟ اس کے بعد امام احمد خاموش ہو گئے اور سکوت اختیار فرمایا۔ (سیرت شافعی ص ۱۲۳)

امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں، میں یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل مکہ میں ساتھ ہی گئے اور ساتھ ہی ایک جگہ

رہتے تھے، امام احمد کا یہ معمول تھا، کہ وہ اپنا اکثر وقت امام شافعی کی صحبت میں صرف کرتے رہتے اور میں امام احمد کی صحبت کو غنیمت سمجھتا تھا، ایک دن امام احمد نے مجھ سے فرمایا، اے ابو یعقوب! تم امام شافعی کی مجلس میں میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے، میں نے کہا، جب یہاں امام شافعی کے شیوخ موجود ہیں، جیسے سفیان بن عیینہ تو پھر ان کو چھوڑ کر ایسے شخص کے پاس جو عمر میں بھی ہم سے کچھ ہی زیادہ ہے، آپ کیوں لے چلتے ہیں؟ امام احمد نے فرمایا، خدا تمہیں نیک توفیق عطا فرمائے، بھائی! شافعی کا علم پھر کہاں سے حاصل ہوگا؟ بالآخر ان کے فرمانے سے میں ان کی مجلس میں حاضر ہوا اور دوسرے لوگوں سے مخاطب ہو کر میں نے کہا، مکہ مکرمہ کے مکانوں کا کرایہ وصول کرنا جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ امام شافعی مخاطب ہوئے، میں نے ان پر بھی چند اعتراضات کیے، جب میں خاموش ہوا، تو شافعی نے مجھ سے فرمایا، کیا تم مجھ سے مناظرہ کرنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا، جی ہاں! امام شافعی نے فرمایا، سنو! خدا فرماتا ہے ’’**للفقراء الذين اخرجوا من ديارهم**‘ ‘ان بے کسوں کے لیے جو اپنے گھروں سے نکالے گئے، اس آیت میں خدا نے مکہ کے مہاجرین کو ان کے گھروں کا مالک بیان فرمایا ہے، پس اس آیت سے ثابت ہوتا ہے، کہ مکہ والے اپنے گھروں کے مالک ہیں اور بغیر کرایہ کے کسی کو ان مکانوں میں تصرف کا حق نہیں ہے، مالک کو حق بیع حاصل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا تھا ’’**من اغلق بابه فهو آمن ومن دخل دار ابی سفيان فهو آمن**‘ ‘جو اپنا دروازہ بند کرلے اس کو امن حاصل ہے اور جو ابو سفیان کے گھر میں پناہ لے اس کو امن حاصل ہے، اب غور کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کو ان کے گھروں کا مالک قرار دیا ہے اور سنو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے مکہ تشریف لائے، تو کسی شخص نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ مکہ مکرمہ میں کہاں ٹھہریں گے، آپ نے فرمایا ’’**بل ترك لنا عقيل دارا** ‘‘عقیل نے ہمارے لیے گھر کہاں چھوڑے (سب بیچ دیے) امام اسحاق نے جواب دیا، کہ مگر عطا، حسن، ابراہیم اور مجاہد وغیرہم تابعین نے تو مکہ کے مکانوں کا بلا معاوضہ استعمال مباح قرار دیا۔ امام شافعی نے حاضرین سے پوچھا یہ کون شخص ہے، لوگوں نے کہا، اسحاق بن راہویہ فرمایا تم وہی اسحاق ہو جنہیں خراسان والے فقیہ کہتے ہیں میں نے کہا، جی ہاں! امام شافعی نے فرمایا، کاش تمہارے سوا اور کوئی ہوتا تو میں اس کے کان کھنچواتا، میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے اور تم کہتے ہو کہ عطا اور طاؤس وغیرھم نے یہ کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے سامنے ان کے اقوال کی کیا حقیقت ہے، امام اسحاق نے پھر سوچ کر جواب دیا، کہ اچھا ان کے اقوال جانے دیجیے، قرآن کی اس آیت کا مطلب کیا ہے، ’’**سواء العاكف فيه والباد** ‘‘اس میں مقیم اور مسافر دونوں برابر ہیں، امام شافعی نے فرمایا، بھائی یہ حکم خاص مسجد حرام کے متعلق ہے امام اسحاق یہ سن کر خاموش ہوئے اور پھر آپ کے فضل وکمال وتبحر کے معترف اور آپ کی مجلس میں حاضر ہونے لگے۔

امام شافعی کا فتویٰ تھا، کہ اگر کوئی مسلم غلام کسی کافر کو امن دے دے تو وہ امن قابل اعتبار ہے، اس پر آپ دو دلیلیں بیان فرمایا کرتے تھے، ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ مسلمانوں کا ذمہ ایک ہی ہے، ان میں کوئی ادنیٰ شخص بھی کسی کو امن

دے دے تو تمام مسلمانوں کو اس کی تعمیل کرنی چاہیے، امام شافعی فرماتے ہیں، کہ اگر غلام مسلمان کو ادنی مسلمان ہی سمجھ لیا جائے تو یہ حدیث کافی ہے، دوسرے حضرت عمر کے زمانے میں ایک مسلمان غلام نے کافروں کو امن دے دیا تھا، تو آپ نے اس غلام کے قول کے مطابق امن کو بحال رکھا اس پر ایک حنفی فقیہ نے آپ پر اعتراض کیا کہ غلام کا خون آزاد کے خون کے برابر نہیں ہوتا، امام شافعی نے فرمایا، تمہاری زبان سے یہ بات اس لیے پسندیدہ نہیں کہ تم غلام کے بدلے آزاد کا قصاص روا رکھتے ہو۔

فن ادب ولغت

امام شافعی نے قبیلہ ہذیل میں رہ کر ادب ولغت، فصاحت وبلاغت اور شعر وسخن میں جو ادراک وتبحر حاصل کیا، وہ ان کی حیات علمی کا درخشاں باب ہے، وہ خود فرماتے ہیں:

اقمت فی بطون العرب عشرین سنة آخذ اشعارها ولغاتها وحفظت القرآن فما علمت انه مربی حرف الا وقد علمت المعنی فیه ماخلا حرفین احدا هما دشها ۔

(تاریخ ذہبی ج۲، ص ۳۰۸)

میں عرب کے اندر بیس سال تک رہا، میں عربی اشعار اور لغات کی معرفت حاصل کرتا رہا اور قرآن حکیم (تفسیر ومعانی کے کے ساتھ) یاد کیا، میں نے قرآن کے تمام حروف والفاظ کے معانی جان لیے دو لفظوں کے علاوہ ان میں ایک ''دشھا'' ہے۔

امام شافعی کی ادبیات شناسی اور فنون شعر ولغت میں کمال کا اعتراف وقت کے عظیم ناقدین شعر وادب اور ماہرین لسانیات نے دل کھول کر کیا ہے:

امام ادب ولغت مبرد کہتے ہیں: امام شافعی کا قول لغت میں حجت ودلیل ہے۔

جاحظ کہتے ہیں: میں نے امام شافعی کی تحریر سے بہتر کسی کی تحریریں نہیں دیکھی، وہ عبارت کیا لکھتے ہیں موتی پروتے ہیں۔

ابو العباس تغلب فرماتے ہیں: امام شافعی لغت کا خزانہ ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان سے لغات کے معانی ومقاصد حاصل کیے جائیں۔

امام لغت ابو منصور ازہری کہتے ہیں: امام شافعی کو اس علم میں کمال کا تبحر حاصل ہے۔ انہوں نے امام شافعی کے محض محاورات کی شرح لکھی ہے اور دیباچہ کتاب میں اعتراف کیا ہے، کہ ان کے مثل ادب ولغت اور جاہلیت کے استعاروں کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔

ماہر لغت امام ابو سلیمان حناطی بیان کرتے ہیں: امام صاحب کی زبان شیریں اور تحریر دل آویز ہے اور بے مثل محاورات اس طرح استعمال کرتے ہیں، جن کو ہر شخص استعمال نہیں کرسکتا۔

فخر عربیت ولغت علامہ زمخشری تحریر کرتے ہیں: امام شافعی ممتاز علما میں ہیں، شریعت کے امام اور مجتہدین کے سرتاج

ہیں، ان کا کلام اس کا مستحق ہے، کہ اس پر غور کیا جائے، وہ صحت پر مبنی ہوتا ہے، اس میں کبھی کسی غلطی کا امکان ہی نہیں ہوسکتا، وہ کلام عرب کے ماہر اور بڑی وسیع معلومات کے حامل ہیں اتنی اعلی قابلیت کے مالک ہیں جن پر لغت کی تشریح مخفی نہیں رہ سکتی۔

امام رازی فرماتے ہیں، کہ ماہرین لغت متفق ہیں، کہ امام شافعی اس فن میں بھی سرتاج ائمہ لغت ہیں اور یہ اس طرح تواتر سے ثابت ہے، جس طرح حاتم کی سخاوت اور حضرت علی کی شجاعت مسلم ہے اسی طرح امام شافعی علم وادب لغت اور نحو میں ممتاز ترین فرد ہیں۔

☆**بشر مریسی:۔** ''کان لسانه ینظم الدر'' ان کی زبان موتی پروتی تھی۔ (مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۹)

☆**ابن ہشام نحوی:۔** ''طالت مجالسنا للشافعی فماسمعت منه لحنه قط ولا کلمة غیرها احسن منها'' (معجم الادباج ۶ ص ۳۸۸)

میں بہت دنوں تک امام شافعی کی صحبت میں رہا، میں نے کبھی ان سے زبان کی غلطی نہیں سنی اور نہ کوئی ایسا کلمہ سنا جس سے بہتر دوسرا کلمہ کہا جا سکتا ہو۔

☆**ابن ہشام صاحب المغازی:۔** ''کان الشافعی حجة فی اللغة'' امام شافعی لغت میں حجت تھے۔

☆**ابن ہشام نحوی:۔** ''وکان ممن توخذ عنه اللغة'' امام شافعی ان لوگوں میں سے ہیں، جن سے لغت کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ (تاریخ ذہبی ج ۲ ص ۳۱۶)

☆**احمد بن ابی سریج:۔** ''مارایت احدا افوه ولا انطق من الشافعی'' میں نے امام شافعی سے زیادہ کسی کو قادر الکلام اور قوت گویائی کا مالک نہیں دیکھا۔ (ایضا)

☆**یونس بن عبدالاعلی:۔** ''ماکان الشافعی الا ساحرا ماکناندری مایقول اذا قعدنا حوله وکان الفاظه سکر'' امام شافعی جادو بیان تھے، جب ہم ان کے گرد بیٹھتے تو ان کی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے ایسا محسوس ہوتا کہ ان کے الفاظ میں نشہ کی کیفیت ہے۔ (ایضا)

شاعری

امام شافعی فطری شاعر تھے، شاعری عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، پھر امام شافعی نے شعر وادب کی طرف خصوصی توجہ کی، عرب شعرا کے کلام کا مطالعہ ان کی شاعری کے لیے سرمشق ثابت ہوا، آپ کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک ہے، بے ساختگی، برجستگی، سلاست وروانی اثر آفرینی کلام شافعی کی نمایاں خصوصیتیں ہیں آپ کی فصاحت وبلاغت، زبان دانی کے جوہر، پیرایۂ نظم میں خوب نمایاں ہوتے، فقہ وحدیث کے کمال نے آپ کی شاعرانہ عظمت کو لوگوں کی نگاہوں سے تقریباً چھپا دیا۔

امام شافعی فی البدیہہ اشعار کہتے، جو ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ انہوں نے شعر گوئی کے لیے اپنے قیمتی اوقات صرف نہیں کیے، بلکہ ضرورت ہوئی تو ارتجالا شعر موزوں کیے۔ ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں!

ابوالقاسم بن ازرق فرماتے ہیں، کہ میں آپ کے پاس گیا اور عرض کیا اے ابوعبداللہ! (امام شافعی کی کنیت) کیا آپ ہمارے ساتھ انصاف کا فیصلہ نہیں فرمائیں گے کہ آپ کے لیے تو یہ فقہ ہے، جس کے فوائد پر آپ فائز ہیں اور ہمارے لیے یہ شاعری ہے، لیکن آپ اس شاعری میں بھی دخل دینے لگے ہیں یا تو آپ (شاعری) ہمارے لیے چھوڑ دیجیے اور میں چند اشعار لایا ہوں، اگر آپ اسی طرح پر اشعار کہہ دیں، تو میں شاعری سے توبہ کرلوں گا (شاعری چھوڑ دوں گا) اگر آپ یہ نہ کرسکیں، تو پھر آپ اس (شاعری) سے رجوع کرلیں، آپ نے فرمایا، اپنے اشعار پڑھو تو میں نے اپنا یہ کلام سنایا۔

مُا ھمتی الا مقارٔعة العدی   خلق الزمان وھمتی لم یخلق
والناس اعینھم الیٰ سلب الغنی   لاینظرون الی الجحیٰ والاولق
لکن من رزق الجحیٰ حرم الغنی   ضدان مفترقان ای تفرق
لو کان بالحیل الغنی لوجدتنی   بنجوم اقطار السماء تعلق

میری ہمت تو صرف دشمنوں سے لڑنے کی ہے، زمانہ پرانا ہوگیا مگر میری ہمت پرانی نہیں ہوئی۔
لوگوں کی آنکھیں دولتمندی کو حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہیں، وہ عقلمندی اور بے وقوفی کو نہیں دیکھتے۔
لیکن جس کو عقلمندی نصیب ہوئی وہ دولت مندی سے محروم ہے، یہ دونوں کس قدر الگ الگ ضد ہیں۔
اگر دولت مندی تدبیروں سے حاصل ہوتی تو آپ مجھ کو پاتے، آسمان کے کناروں میں ستاروں سے میرا تعلق ہوتا۔
امام شافعی نے جواب میں فرمایا تم نے بتکلف یہ اشعار کہے تھے، میں فی البدیہہ کہتا ہوں۔

ان الذی رزق یسار فلم ینل   حمدا ولا اجرالغیر مؤفق
فالجدید فی کل امر شاسع   والجد یفتح کل باب مغلق
فاذا سمعت بان محروما اتی   ماء لیشربه ففاض فصدق
واحق خلق اللہ بالھم امرء   ذوھمة یبلی بعیش ضیق
ومن الدلیل علی القضاء وکونه   یؤس اللبیب وطیب عیش الاحمق

جس کو خوش حالی ملی اور اس نے توفیق نہیں پائی، خدا کی حمد کی اور ناشکری کی تو یقیناً وہ بدنصیب ہے۔
پس نصیب ہر مشکل کام کو آسان کردیتا ہے اور نصیب ہر بند دروازے کو کھول دیتا ہے۔
جب تم یہ سنو کہ کوئی بدنصیب پانی کے پاس پینے کے لیے گیا تو پانی نیچے اتر گیا تو اس کی تصدیق کرلو۔
اللہ کی مخلوق میں ہمدردی کا زیادہ مستحق آدمی وہ ہمت والا ہے جو تنگ زندگی میں بھی بہادری دکھاتا ہے۔
اور یہ قضاوقدر کے حق ہونے کی دلیل ہے کہ عقلمند تنگ زندگی گزارتا ہے اور کم عقل راحت کی زندگی گزارتا ہے۔
ابوالقاسم نے کہا اس کے بعد اب میں شعر نہیں کہوں گا

مبرد نے کہا کہ امام شافعی عظیم شاعر، بڑے ادیب فقہ اور قرآن کریم کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ آپ کے اشعار کو جمع کیا جائے تو ایک ضخیم دیوان تیار ہو جائے گا، ذیل میں آپ کے چند اشعار قارئین کے استفادہ کے لیے نقل کیے جا رہے ہیں۔

شهدت بان الله لا بشئ غيره — واشهد ان البعث حق واخلص
وان عرى الايمان قول مبين — وفعل زكى قد يزيد وينقص
وان ابا بكر خليفة ربه — وكان ابو حفص على الخير يحرص
واشهد ربى ان عثمان فاضل — وان عليا فضله متخصص
ائمة قوم يهتدى بهداهم — لحا الله من اباهم يتنقص
فما لعتاة يشهدون سفاهة — وما لسفيه لا يحيص ويحرص

میں گواہی دیتا ہوں، کہ اللہ کے سوا کوئی چیز (لائق عبادت) نہیں اور میں صدق دل سے گواہی دیتا ہوں کہ دوبارہ اٹھایا جانا حق ہے۔

اور بے شک ایمان کا مدار قول مبین ہے (کلمۂ توحید کا اقرار) اور عمل صالح ہے وہ کبھی بڑھتا ہے اور کبھی گھٹتا ہے۔

اور بے شک سیدنا ابوبکر صدیق اپنے رب کے خلیفہ ہیں اور سیدنا ابوحفص عمر نیکی پر حریص (اور بہت چاہنے والے) ہیں۔

اور میں اپنے رب کو گواہ بناتا ہوں کہ سیدنا عثمان صاحب فضیلت ہیں اور یقیناً سیدنا علی مرتضی خصوصی فضیلت کے حامل ہیں۔

یہ قوم کے امام ہیں کہ ان کی ہدایت سے ہدایت ملتی ہے اللہ تعالیٰ لعنت کرے اس آدمی پر جو ان کا انکار کرتا ہے اور عیب جوئی کرتا ہے۔

پس ان بے ادبوں کو کیا ہو گیا ہے، کہ وہ اپنی بے وقوفی کی گواہی دے رہے ہیں اور اس بے وقوف کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ (اپنی بے راہ روی) سے ہٹتا نہیں (بلکہ) اور حرص کرتا ہے۔

حضرت امام شافعی حضرت محمد بن حسن شیبانی کی ان کے علم کی بنا پر تعظیم فرماتے تھے، حضرت امام نے آپ سے چند کتابیں عاریتاً طلب کیں، لیکن امام محمد نے اس کی تکمیل نہیں کی تو آپ نے اس موقع پر امام محمد کی تعریف میں درج ذیل اشعار لکھ کر بھیج دیے، تو امام محمد نے آپ کی خواہش سے زائد کتابیں روانہ فرمائیں۔

قل للذى لم تر عينا — من راه مثله

ومن كان من راه   قد راى من قبله
العلم ينهى اهله   ان يمنعوه اهله
لعله يبذله   لاهله لعله

کہہ دیجیے کہ جو آنکھیں اس کو دیکھتی ہیں وہ اس جیسی کسی شخصیت کو نہیں دیکھیں اور جس نے اس کو دیکھا ہے گویا وہ اس سے پہلے کے (ائمہ) کو دیکھا ہے۔ علم علما کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ اہل حضرات (یعنی طلب کرنے والوں) سے علم کو روک دیں۔ امید ہے کہ وہ اس کے اہل کو عنایت کریں گے۔

فقیہ ابن عبد الحکم بیمار ہو گئے تھے تو حضرت امام شافعی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور یہ اشعار ارشاد فرمائے۔

مرض الحبيب فعدته   فمرضت من حذرى عليه
شفى الحبيب فعادنى   فشفيت من نظرى اليه

محبوب بیمار ہوا تو میں اس کی عیادت کے لیے گیا اور اس پر اندیشہ کر کے خود میں بیمار پڑ گیا۔
محبوب اچھا ہو گیا تو وہ میری عیادت کے لیے آیا اس کو دیکھنے سے مجھے شفا ہو گئی۔

اذا حار امرك فى معنيين   ولم تدرى حيث الخطا والصواب
فخالف هواك فان الهوى   يقود النفوس الى مايعاب

جب تیرا معاملہ دو چیزوں کے درمیان پریشان ہو، غلط اور صحیح کو نہ پہچان سکے۔ تو خواہش نفس کی مخالفت کر کیوں کہ خواہش نفس انسان کو عیب دار چیزوں کی طرف لے جاتی ہے۔

* * *

فقہ واجتہاد

امام شافعی فقہ واجتہاد میں کامل درک رکھتے تھے، انہوں نے امام ابن جریج فقیہ مکہ کی کتابیں ان کے تلامذہ سے حاصل کی تھیں، امام دار الہجرت مالک بن انس کی فقہ براہ راست ان سے حاصل کی، اور امام اعظم ابوحنیفہ کی فقہ ان کے شاگرد رشید امام محمد بن حسن شیبانی سے حاصل کی، امام اوزاعی کی فقہ ان کے شاگرد عمر بن ابی سلمہ سے اور لیث بن سعد کی فقہ ان کے شاگرد یحیٰی بن حسان سے حاصل کی۔ اس طرح آپ نے مکہ، مدینہ اور کوفہ کے جلیل القدر فقہا کا علم حاصل کر کے اس علم میں بصیرت پیدا کر لی۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں ”کان الفقہ قفلا علی اہلہ حتی فتحہ اللہ بالشافعی“ فقہ فقیہوں کے لیے ایک قفل تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے امام شافعی کے ذریعہ کھولا۔ (معجم الادباج ۶ ص ۳۸۹)

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں ”الشافعی امام ما احد تکلم بالرای الا والشافعی اکثر ہم اتباعا واقلہم خطأ“ امام شافعی امام ہیں، جن لوگوں نے بھی رائے وقیاس سے کام لیا ہے، امام شافعی ان سب سے زیادہ متبع سنت اور خطا کا کم ارتکاب کرنے والے ہیں۔ (تذکرہ ج ا ص ۳۳۰)

امام شافعی نے اپنے فقہی مسلک اور اپنے فقہی مسائل کا استخراج واستنباط بغداد ہی میں شروع کر دیا تھا، قاضی عیاض لکھتے ہیں:

> وسمع المؤطا من مالک وسر بہ مالک ثم سار الشافعی الی العراق فلزم محمد بن الحسن وناظرہ علی مذہب اہل المدینۃ وکتب کتبہ ورتب ہناک قولہ القدیم وہو کتاب الزعفرانی۔ امام شافعی نے امام مالک سے مؤطا کا سماع کیا، جس سے امام مالک خوش ہوئے، پھر امام شافعی عراق جا کر محمد بن حسن کے یہاں رہ گئے، اہل مدینہ کے مذہب کے بارے میں ان سے بحث ومذاکرہ کر لیا اور امام محمد کی کتابیں لکھیں اور وہیں اپنا قول قدیم مرتب کیا جو زعفرانی کی کتاب میں ہے۔ (ترتیب المدارک ص ۳۸۵)

امام شافعی نے فقہائے حجاز وعراق کے اصول وفروع کو سامنے رکھ کر درمیانی راہ اختیار کی وہ قرآن کے ظواہر کو حجت مانتے ہیں، پھر سنت رسول سے استدلال کرتے ہیں، یہاں تک کہ خبر واحد کو بھی قابل عمل قرار دیتے ہیں، تعامل اہل مدینہ کو بھی

تسلیم کرتے ہیں، پھر اجماع کو حجت مانتے ہیں، آخر میں اس قیاس پر عمل کرتے ہیں، جس کی تائید کتاب وسنت سے ہوتی ہے، امام شافعی کے مندرجہ ذیل قول سے ان کے فقہی مسلک کی وضاحت ہوتی ہے:

> **ان القاضی والمفتی لا یجوز ان یقضی او یفتی حتی یکون عالما بالکتاب وما قال اھل التاویل فی تاویلہ وعالما بالسنن والآثار وعالما باختلاف العلماء حسن النظر صحیح الاود ورعا مشاورا فیما اشتبہ علیہ ۔ (جامع بیان العلم ج۲ ص ۸۲)**

> قاضی اور مفتی کے لیے فیصلہ کرنا اور فتویٰ دینا اس وقت تک جائز نہیں ہے، جب تک کہ وہ کتاب اللہ، اس کی تفسیر سنن وآثار اور اختلاف علما کا علم نہ رکھتے ہوں، ان میں حسن نظر، صحیح فہم، اور تقویٰ ساتھ ہی مشتبہ مسائل میں مشورہ کرنے والے ہوں۔

ان کے فقہی مسلک کی اساس صحیح حدیث پر قائم تھی، وہ کہا کرتے تھے ''**واذا صح الحدیث فھو مذھبی**'' (صفۃ الصفوۃ لابن جوزی ۲۱۴)

اقوال قدیمہ وجدیدہ

امام شافعی نے اپنے فقہی اقوال وآرا کو بغداد میں مرتب کرنا شروع کیا اور یہ عمل قیام مکہ کے دوران بھی جاری رہا، اس طرح قیام مصر سے پہلے انہوں نے اپنے فقہی مسلک پر جو مسائل جمع کیے انہیں قول قدیم سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کے راوی ابو علی حسن بن محمد زعفرانی، ابوثور ابراہیم بن خالد، احمد بن حنبل اور حسین بن علی کرابیسی ہیں، جب مصر آئے تو اپنے اقوال وآرا پر نظر ثانی کی اور اپنے مسائل مستنبطہ کو از سر نو مدون کیا، جنہیں اقوال جدیدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کے راوی وترجمان چھ تلامذہ ہیں، ابوابراہیم، اسماعیل بن یحییٰ مزنی، ربیع بن سلیمان مرادی، ربیع بن سلیمان داؤد جیزی، ابویعقوب یوسف بن یحییٰ بویطی، ابوحفص حرملہ بن یحییٰ، یونس بن عبدالاعلی۔

علم اصول فقہ

اصول فقہ کی تدوین امام شافعی کا بہت بڑا کارنامہ ہے، وہ اس فن کے مدون اول کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔

اسنوی کہتے ہیں ''**ان الشافعی ھو اول من صنف فی اصول الفقہ بالاجماع**'' امام شافعی نے بالاتفاق اصول فقہ میں سب سے پہلے کتاب تصنیف کی۔ (شذرات الذہب ج۳ ص۱۰)

بدرالدین زرکشی کہتے ہیں، کہ امام شافعی پہلے شخص ہیں، جنہوں نے اصول فقہ میں کتاب تصنیف کی، اس فن میں انہوں نے کتاب الرسالہ، کتاب احکام القرآن، اختلاف الحدیث، ابطال الاستحسان کتاب اجماع العلم اور کتاب القیاس لکھ کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ (البحرالمحیط)

فقہ شافعی کے اصول استنباط

امام شافعی سے پہلے فقہا و مجتہدین نے استنباط مسائل کے حدود متعین نہیں کیے تھے، وہ شریعت کے معانی اس کے غایات واحکام کے مقاصد اور نصوص کے اغراض ومطالب کی معرفت کے لیے اپنی فہم وفراست پر اعتماد کرتے تھے، امام شافعی نے دیکھا، استنباط کے لیے علما کے درمیان جدل ومناظرہ برپا ہے، تو انہوں نے حدود ورسوم وضع کیے اور اصول فقہ منضبط کیے، امام فخر الدین رازی آپ کے اس کارنامے کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> **اعلم ان نسبة الشافعي الى علم الاصول كنسبة ارسطو الى علم المنطق و كنسبة الخليل بن احمد الى علم العروض الخ ۔**
>
> امام شافعی کی طرف علم اصول کی نسبت ایسی ہی ہے، جیسی ارسطو کی طرف علم منطق کی نسبت اور خلیل بن احمد کی طرف علم عروض کی نسبت۔

اس لیے کہ لوگ ارسطو سے پہلے اپنی طباع سلیم سے استدلال کرتے تھے، حدود وبراہین کی ترتیب کی کیفیت کا کوئی قانون نہ تھا، لامحالہ ان کے کلمات میں تشویش واضطراب پائے جاتے تھے، کیوں کہ طبیعت جب تک کسی قانون کلی کا سہارا نہیں لیتی، کامیاب نہیں ہوتی، جب ارسطو نے یہ مشاہدہ کیا، تو ایک مدت تک لوگوں سے کنارہ کش رہا اور علم منطق کا استخراج کیا اور مخلوق کے لیے منطق کا قانون کلی وضع کیا، ایسے ہی خلیل سے پہلے شعرا اشعار نظم کیا کرتے تھے، ان کا پورا اعتماد محض طبیعت پر ہوتا تھا، خلیل نے شعر کے مفاسد ومصالح کی معرفت کے لیے علم عروض کا استخراج اور ایک قانون کلی وضع کیا، اسی طرح امام شافعی سے پہلے لوگ اصول فقہ کے مسائل میں گفتگو، استدلال اور اعتراضات کرتے تھے، لیکن ان کے پاس دلائل شریعت کے معارضات وترجیحات کی معرفت کے لیے کوئی ایسا قانون کلی نہ تھا، جس کی طرف رجوع کیا جاتا، امام شافعی نے علم اصول فقہ وضع کیا اور مخلوق کو ایک ایسا قانون کلی دیا، شریعت کے مراتب کی معرفت میں جس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ اصول فقہ کی نسبت امام شافعی کی طرف کرنا صحیح ہے اور وہی اس علم کے واضع ہیں۔ (شافعی ص ۱۶۲)

امام شافعی مندرجہ ذیل پانچ اصول کا بالترتیب اعتبار کرتے ہیں:

(۱) کتاب وسنت ثابتہ:۔ امام شافعی سنت کو کتاب کے ساتھ ایک ہی درجہ میں رکھتے ہیں، اس لیے کہ سنت کتاب کے

مجملات کی تفصیل بیان کرتی ہے، لیکن سنت اگر خبر آحاد ہو، تو وہ نہ قرآن کے مرتبہ میں ہے اور نہ قرآن کے معارض ہے۔

(۲) اجماع:۔ اجماع سے امام شافعی کی مراد ان فقہا کا اجماع ہے، جن کو علم خاصہ دیا گیا ہے۔

(۳) صحابی کا وہ قول جو اس کی ایسی رائے ہو کہ کسی نے اس کی مخالفت نہ کی ہو۔

(۴) اختلاف صحابہ:۔ امام شافعی اختلاف صحابہ کا اعتبار کرتے ہیں اور ایسے صحابہ کے قول پر عمل کرتے ہیں، جن کا قول کتاب وسنت سے قریب تر ہو۔

(۵) قیاس:۔ امام شافعی نے ایسے قیاس کا اعتبار کیا ہے، جو مذکورہ بالا چاروں اصول سے بالترتیب مستنبط ہو۔

امام شافعی ان اصولوں کو اپنی کتاب ''الام'' میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

للعلم طبقات شتى الاولى الكتاب والسنة اذا ثبتت ثم الثانية الاجماع فيما ليس فيه كتاب ولا سنة والثالثة ان يقول بعض اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم قولا ولانعلم له مخالفا منهم والرابعة اختلاف اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم فى ذلك والخامسة القياس على بعض الطبقات ولايصار الى شئ غير الكتاب والسنة وهما موجودان وانما يوخذ العلم من اعلى ۔ (كتاب الام ج۷ ص۴۶)

کتاب وسنت

امام شافعی نے کتاب وسنت دونوں کا اعتبار علم شریعت کے ایک ہی درجے میں کیا ہے، بلکہ ان ہی دونوں کو اس شریعت کا واحد مصدر قرار دیا ہے، کیوں کہ ان کے علاوہ دوسرے اصول سے استدلال انہی دونوں پر محمول اور ان ہی کی روح سے ماخوذ ہیں، اگرچہ بظاہر وہ ان سے مستنبط نہیں۔

قرآن وسنت کا ایک ہی درجہ کیوں؟

سوال پیدا ہوتا ہے، کہ امام شافعی سے پہلے کے فقہا اور ان کے بعد کے علمائے اصول نے سنت کو کتاب کے درجے سے نیچے رکھا ہے، خود امام شافعی نے بعض جگہوں پر سنت کو کتاب کے مرتبے میں نہیں رکھا ہے؟ اس کا جواب یوں دیا جائے گا، کہ کتاب وسنت دونوں اللہ کے کلام ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى'' نیز قرآن میں اللہ نے رسول کی اطاعت فرض کی ہے اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے، ''مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ'' گویا جس نے قول رسول کو قبول کیا، اس نے اللہ کے قول کو قبول کیا، معلوم ہوا، کہ کتاب وسنت دونوں کا ایک ہی درجہ ہے، بعض صحابہ کے اقوال سے بھی امام شافعی کے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے، عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے

لعن الله الواشمات والمستوشمات والمنتمصات والمنقلجات للحسن المغيرات خلق الله ۔ (اتحاف المهرة ج۱۰ ص۳۸۱)

یہ حدیث صحیح بنی اسد کی ایک عورت نے سنی تو عبداللہ بن مسعود سے اس حدیث کے بارے میں استفسار کیا انہوں نے فرمایا، میں ایسوں پر کیوں نہ لعنت کروں جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اور ان پر لعنت کا حکم قرآن میں موجود ہے، اس عورت نے کہا، میں نے پورا قرآن پڑھ لیا، مگر یہ کہیں نہیں پایا، عبداللہ بن مسعود نے فرمایا اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو ضرور پالیتی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔

رہا امام شافعی کا بعض مقامات پر سنت کو کتاب کے درجہ میں نہ رکھنا تو اس کے لیے عرض ہے کہ امام شافعی نے تمام احادیث کریمہ کو درجہ کتاب میں نہیں رکھا ہے، ان کے نزدیک درجہ کتاب میں وہی احادیث ہیں، جن کے طرق آیات متواترہ قاطعہ کے درجے میں ہیں، احادیث آحاد، احادیث متواترہ یا احادیث مستفیضہ مشہورہ کے درجے میں نہیں، تو وہ آیات قرآنیہ قاطعہ کے درجے میں کیسے ہوسکتی ہیں، امام شافعی نے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے سنت کو ثابتہ سے مقید کیا ہے، لکھتے ہیں:

المرتبة الاولى الكتاب والسنة اذا ثبتت ۔

قرآن کے خاص وعام

امام شافعی نے قرآن میں وارد ہونے والے عام کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) عام ظاہر جس سے عام ظاہر یعنی اس کے سیاق کے مفہوم میں جو کچھ بھی داخل ہو مراد ہو، جیسے: ''**اَللّٰهُ خٰلِقُ كُلِّ شَیْءٍ**'' (سورہ زمر ۶۲) اس آیت کے بیان عموم میں امام شافعی کہتے ہیں، کہ زمین وآسمان کی ہر چیز ذی روح اور درخت وغیرہ کو اللہ نے پیدا کیا ہے۔

(۲) عام ظاہر جس سے عام مراد ہو اور اس میں خصوص داخل ہو جیسے: ''**حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَیَاۤ اَهْلَ قَرْیَةِ اِسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا**'' (سورہ کہف ۷۷) یہ آیت اس بات کا فائدہ دیتی ہے، کہ استطعام اہل قریہ میں سے ہر فرد سے تھا، اور ابا بھی ان میں سے ہر ایک کی طرف سے تھا، لیکن اہل قریہ میں سے کچھ وہ افراد ہیں جن سے استطعام کیا گیا تھا اور ان سے ابا بھی واقع ہوا تو اس اعتبار سے خصوص بھی داخل ہے غرضیکہ آیت میں عموم معتبر اور خصوص مقصود ہے۔

(۳) عام ظاہر جس سے خاص مراد ہو جیسے: ''**اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اَنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ**'' (آل عمران: ۱۷۳/۳) سیاق آیت اشارہ کرتا ہے، کہ مراد بعض ناس ہے اور محال ہے، کہ کلمہ ناس سے جمیع ناس مراد ہو، آیت میں پہلا الناس مخبر اور دوسرا الناس مخبر عنہ ہے ظاہر ہے مخبر مخبر عنہ کا غیر ہے تو لامحالہ قائل بعض ناس اور جامع بھی بعض ناس ہے اور بعض ناس خاص ہے معلوم ہوا کہ عام ظاہر سے خاص مردا ہے۔

امام شافعی جب تک کہ کوئی ایسی چیز نہیں پاتے، جو عام کے اندر تخصیص پیدا کرے عام پر عمل کرتے ہیں، اگر دلیل تخصیص پاتے ہیں تو خاص کا اعتبار کرتے ہیں، ان کے نزدیک عام میں تخصیص نص قرآن، اور اثر حدیث سے ہوتی ہے، یہی

حنفیہ بھی کہتے ہیں، لیکن حنفیہ نے عام کو ایسی قوت دی ہے، جو امام شافعی نے نہیں دی ہے، چنانچہ ان کے نزدیک لفظ عام کی دلالت عموم پر ظنی ہوتی ہے اور حنفیہ کے نزدیک قطعی۔ امام شافعی عام کو ظنی مانتے ہیں خبر واحد بھی ظنی ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ قرآن کے عام کی تخصیص خبر واحد کے ذریعہ جائز قرار دیتے ہیں اور حنفیہ کے نزدیک عام قطعی ہے اور خبر واحد ظنی لہٰذا خبر واحد کے ذریعہ قرآن کے عام کی تخصیص جائز نہیں ہوگی کیوں کہ ظنی قطعی کو خاص نہیں کر سکتا۔

قرآن کا بیان

امام شافعی نے بیانِ قرآن کی دو قسمیں ذکر کی ہیں:

(۱) ایسا بیان جو مجمل کی تفصیل یا معنی محتمل کی تعیین میں سنت کا محتاج نہ ہو جیسے: ''یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُون اَیَّامًا مَّعْدُودَات'' (سورہ بقرہ ۱۸۳) پھر آگے فرمایا ''شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِی اُنْزِلَ فِیهِ الْقُرْآنُ هُدیً لِلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰی والْفُرْقَان فَمَنْ شَهِدَ مِنْکُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ'' (سورہ بقرہ ۱۸۵) امام شافعی فرماتے ہیں، کہ یہ آیت کریمہ نص ہے کہ ایام معدودات سے مراد شہر رمضان ہے ایام صوم اور شہر صوم کے بیان کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

(۲) ایسا بیان جو سنت کا محتاج ہو، امام شافعی نے اس کی جو مثالیں پیش کی ہیں ان کے پیش نظر اس بیان کو تین قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(الف) سیاق دو احتمال رکھے سنت ان دونوں میں سے کسی ایک کو متعین کرے جیسے ارشاد باری ''فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَهُ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَیْهِمَا اَن یَّتَرَاجَعَا'' (سورہ بقرہ ۲۳۰) تو اللہ کا ارشاد ''حتی تنکح زوجا غیره'' احتمال رکھتا ہے، کہ شوہر اول کے غیر کا محض عقد کر لینا اور عورت کے ساتھ دخول نہ کرنا شوہر اول کی خاطر اس عورت کو حلال کرنے کے لیے کافی ہے اور یہ بھی احتمال رکھتا ہے، کہ وہ عورت شوہر اول کے لیے اس وقت حلال نہ ہو جب تک کہ شوہر ثانی اس کے ساتھ دخول نہ کر لے، یہ دونوں احتمال اس لیے پیدا ہوئے کہ اسم نکاح اصابت اور عقد دونوں معنی میں واقع ہے، لیکن ایک عورت کے شوہر نے اسے تین طلاق دے دی اور دوسرے آدمی نے اس سے شادی کر لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا ''لا تحلین له حتی تذوقی عسیلته ویذوق عسیلتك'' یعنی جب تک وہ شخص تیرے ساتھ دخول نہ کرے گا تو اپنے شوہر اول کے لیے حلال نہیں، یہاں پر سنت نے دو معانی محتملہ عقد و دخول میں سے ایک (دخول) کو متعین کیا۔

(ب) قرآن مجمل ہو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفصیل ذکر کی ہو، چنانچہ اکثر فرائض مجمل ہیں اور حدیث ان کی تفصیل مثلاً ''اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا'' قرآن میں اوقات نماز، طریقہ نماز، تعداد رکعات، نماز کے فرائض، واجبات، سنن و مستحبات وغیرہ احکام نماز کا بیان نہیں، اس سلسلے میں قرآن مجمل ہے اور حدیث

اس کی مکمل تفصیل ہے، یہی معاملہ زکوۃ، حج روزہ وغیرہ کا ہے۔

(ج) قرآن عام ہو اور سنت نے اس کے خصوص کو بیان کیا ہو مثلاً آیات میراث کے ظاہر سے مفہوم ہوتا ہے، کہ وارثین عام ازیں کہ مورث کے دین سے مختلف ہوں یا متحد مورث کے قاتل ہوں یا غیر قاتل وارث ہوں گے اور سنت نے بیان کیا ہے کہ مسلم کا وارث غیر مسلم نہیں ہوسکتا اور قاتل کے لیے میراث نہیں نیز قرآن کے عام سے ظاہر ہے کہ وصیت خواہ کتنی ہی مقدار میں کیوں نہ ہو ورثہ میں تقسیم میراث پر مقدم ہوگی، سنت نے بیان کیا، کہ وہی وصیت میراث پر مقدم ہے جو تہائی سے زیادہ نہ ہو۔

حجیت حدیث

عہد امام شافعی میں تین طرح کے منکرین حجیت حدیث پائے جاتے تھے، حضرت امام نے ان کی سخت تردید کی اور اپنے رسالہ ''الام'' میں دلائل کے ذریعہ ہر ایک کا ناطقہ بند کر کے حجیت حدیث ثابت کی، ذیل میں بطور اختصار تینوں مذاہب اور ان کی تردید میں امام شافعی کی ایک ایک دلیل مذکور ہے:

(۱) پہلی جماعت جملہ احادیث کی حجیت سے انکار کرتی ہے، امام شافعی نے ان کی تردید اس طور پر کی، کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول کو ملایا اور ایمان بالرسول رسول کے اقوال، افعال اور تقریرات کی طاعت کو واجب کرتا ہے، لہٰذا سنت نبویہ کو اس شرع کریم کا مصدر ماننا واجب ہوگا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ '(سورہ نور ۶۲) اس آیت سے بصراحت ایمان بالرسول کا جزء ایمان واسلام ہونا ثابت ہے اور ظاہر ہے ثمرہ ایمان اتباع ہے، پس حدیث کا اتباع واجب ہوگا، یہ بات عقل سے بعید ہے، کہ رسول پر ایمان واجب ہو اور ان کے افعال، اقوال اور تقریرات کا اتباع واجب نہ ہو، بایں قدر حدیث کی حجیت ثابت ہے۔

(۲) دوسرے گروہ کا کہنا ہے، کہ اگر حدیث قرآن کا بیان نہ ہو تو وہ قابل احتجاج نہیں، امام شافعی نے اس گروہ کو ضال تو نہ شمار کیا اور نہ ان کی بصراحت تردید کی، پھر بھی پہلے مذہب والوں کی تردید میں جو دلائل ذکر کیے ہیں وہی ان کی تردید کے لیے کافی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ حدیث جس میں نص قرآنی نہ ہو ایسے رسول سے ثابت ہے جن کی طاعت واتباع فرض ہے، مخالف قرآن نہیں ہوسکتی، اس حدیث کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس حدیث میں ایسا حکم بیان کیا گیا ہے، جو قرآن میں منصوص نہیں ہے۔

(۳) تیسرا مذہب یہ ہے کہ خبر آحاد قابل احتجاج نہیں، امام شافعی نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''نضر الله عبدا سمع مقالتی فحفظها ووعاها واداها فرب حامل فقه غير فقيه ورب حامل فقه الى من هو افقه منه'' (اتحاف المہرۃ ج۲ص۱۲۸)

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے حفظ وجمع اور دوسروں تک اس کو پہنچانے کی دعوت دی تو ہر وہ شخص جس

سے یہ چیزیں صادر ہوں عام ازیں کہ وہ تنہا ہو یا ایک جماعت دعوت نبی کا مجیب ہوگا، پس معلوم ہوا کہ ہر حدیث نبی اگرچہ وہ ایک ہی راوی سے مروی ہو جب کہ راوی ثقہ عادل ضابط ہو حجت ہے۔

امام شافعی نے کتاب اللہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے سنت کے پانچ مقامات بیان کیے ہیں (۱) سنت قرآن کے مجمل کا بیان ہے (۲) سنت بیان ہے کہ قرآن کے عام سے عام مراد ہے یا خاص (۳) جو فرائض قرآن میں بیان کیے گئے ہیں سنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی سے ان پر بیان احکام میں اضافہ کیا ہے (۴) جو حکم قرآن میں منصوص نہیں سنت نے اس کو بیان کیا ہے اور یہ نص قرآنی پر زیادتی نہیں (۵) منسوخ پر ناسخ کے ذریعہ استدلال۔

اجماع

امام شافعی نے کتاب وسنت کے بعد اجماع کا مرتبہ مقرر کیا ہے، اجماع کے ہوتے ہوئے قیاس کا اعتبار نہیں کرتے اور جیسے پانی کی موجودگی میں تیمّم جائز نہیں نص کتاب وسنت کی موجودگی میں اجماع سے استدلال درست قرار نہیں دیتے۔

اجماع کے حجت ہونے کی دلیل سلیمان بن یسار کی حدیث ہے، کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مقام جابیہ میں خطبہ دیا، کہ جیسے میں تمہارے درمیان کھڑا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا میرے صحابہ کی تکریم کرو پھر ان کے بعد والوں کی پھر ان کے بعد والوں کی پھر کذب ظاہر ہوگا یہاں تک آدمی بغیر مطالبہ قسم کھائے گا اور بغیر مطالبہ گواہی دے گا، تو جسے وسط جنت خوش کرتا ہو وہ جماعت کو لازم پکڑے اس لیے کہ شیطان اکیلے کے ساتھ ہے اور دو شخص سے دور ہے، مرد عورت کے ساتھ تنہائی نہ اختیار کرے کیوں کہ شیطان ان کا تیسرا ہے، جسے اس کی نیکی اچھی لگے اور برائی بری تو وہ مومن ہے۔

اس حدیث میں جماعت کو لازم پکڑنے ((ملازمت جماعت)) کا حکم دیا گیا ہے، جس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ جماعت کے جسموں کو لازم کرلو اور دلوں کو ترک کردو کیوں کہ مسلمین وغیر مسلمین، اتقیا وفجار کے اجسام اجتماعی طور پر پائے جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ تحلیل، تحریم اور طاعت میں اسی مسلک کو اختیار کرو جس پر جماعت گامزن ہے، بہرحال یہ حدیث اجماع کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

امام شافعی کی اجماع سے مراد علمائے عصر کا کسی امر پر اجتماع ہے، ایسا اجماع جو کسی ایک شہر کے علما سے ثابت ہو امام شافعی کے نزدیک معتبر نہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے شیخ حضرت امام مالک کے اجماع اہل مدینہ کے قول کی تردید کی ہے، اجماع اہل مدینہ کی دو طرح تردید کرتے ہیں (۱) اجماع کسی ایک شہر کے علما کا کسی امر پر اجتماع کا نام نہیں، بلکہ سارے بلاد اسلامیہ کے علما کا اجتماع ضروری ہے (۲) وہ مسائل جن پر امام مالک نے اہل مدینہ کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے، ہر قضیہ میں اہل مدینہ کا اختلاف موجود ہے، بلکہ بعض قضیوں میں تو اکثر اہل مدینہ کا اختلاف ہے علاوہ ازیں عام علمائے بلاد اسلامیہ بھی اس

سے مختلف ہیں۔

امام شافعی نے اجماع سکوتی کا اعتبار نہیں کیا ہے، اجماع سکوتی یہ ہے کہ کوئی اہل اجتہاد عالم کوئی رائے قائم کرے اس کے زمانے کے علما اس سے واقف ہوں اور کوئی اس کا انکار نہ کرے، امام شافعی نے اسے غیر معتبر اس لیے قرار دیا ہے کہ اجماع کے لیے شرط یہ ہے کہ کسی امر پر تمام علما کی رائے متفق ہو۔

اقوال صحابہ واختلاف صحابہ

امام شافعی نے اقوال صحابہ کو مصدر شرعی قرار دیا ہے، وہ صحابی کے ایسے قول سے استدلال کرتے ہیں، جس میں اختلاف نہ ہو، اختلاف کی صورت میں کسی ایک کا قول اختیار کرتے ہیں، بعض لوگوں نے گمان کیا ہے، کہ امام شافعی نے اپنے مذہب قدیم میں تو قول صحابی کو اختیار کیا ہے، مگر مذہب جدید میں وہ قول صحابی کو نہیں لیتے حالاں کہ سچ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مذہب قدیم وجدید دونوں میں قول صحابی کو اختیار کیا ہے اور اسے قیاس پر مقدم رکھا ہے۔

امام شافعی کے نزدیک جب کتاب وسنت موجود ہوں تو ان کے ترک کا کوئی عذر مسموع نہ ہوگا، ان کا اتباع ضروری ہوگا، ان کی عدم موجودگی میں اقوال صحابہ یا کسی قول صحابی کی طرف رجوع کریں گے، بصورت اختلاف پہلے ابوبکر وعمر اور عثمان کے قول کی طرف رجوع کریں گے کیوں کہ ان کی تقلید زیادہ محبوب ہے، پھر جب ان کے درمیان اختلاف ہو تو کتاب وسنت سے اقرب قول کو اختیار کریں گے، اقرب پر دلالت نہ ہو سکے تو جس کے دلائل قوی ہوں، اس کو اختیار کریں گے، خلفاے راشدین کے قول پر عمل اس لیے ضروری ہے، کہ وہ امام المسلمین ہیں اور امام کا قول اختیار کیا جائے گا، ان کا اتباع ان کے مابعد علما کی اتباع سے اولیٰ ہے، خلفاے راشدین کا قول نہ ملے تو صحابہ میں اسی طرز پر کہ جس کا قول کتاب وسنت سے اقرب ہے اختیار کیا جائے گا، اگر کسی کا قول دلائل سے اقرب نہ ثابت ہو سکے تو اکثر صحابہ نے جسے اختیار کیا ہو اسے لیا جائے گا، اگر اکثر کا علم نہ ہو سکے تو ان میں سے جو قول ارجح ہو اسے اختیار کریں گے، چنانچہ آیت کریمہ ''وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوْءٍ'' میں قروء کے معنی کی تعیین میں صحابہ کا اختلاف ہے، حضرت عائشہ صدیقہ، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر وغیرہ نے قروء سے مراد طہر لیا ہے اور صحابہ کی ایک جماعت نے قروء سے مراد حیض لیا ہے، امام شافعی نے طہر کی مراد کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لغت، سنت اور قرآن سے قروء کا معنی طہر متعین ہے، کیوں کہ حیض کا لغوی معنی رحم کا خون پھینکنا ہے طہر میں رحم خون کو روک دیتا ہے، تو طہر کا معنی ہوگا خون روکنا پس لغت میں قروء کا معنی طہر ہونا اولیٰ ہے، رہا قرآن وسنت تو ارشاد باری ہے ''إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ'' اور حضرت عمر نے جب عبداللہ بن عمر کو حالت حیض میں طلاق دلا دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجوع کا حکم دیا اور فرمایا جب وہ طاہرہ ہو تو بغیر جماع کیے اسے طلاق دو اور فرمایا'' فتلك العدة التي امر الله ان تطلق بها

النساء'' اس قول میں حضور نے قرآن کی تفسیر بیان کی کہ عدت طہر ہے، حیض نہیں۔

قیاس

کسی ایسے امر کو جس کا حکم منصوص نہ ہو علت مشترکہ کی وجہ سے ایسے امر کے ساتھ لاحق کرنا جس کا حکم معلوم ہو قیاس کہلاتا ہے، امام شافعی نے قیاس کو اصل شرعی مانا ہے، وضوح وخفاے علت کی نسبت سے امام شافعی نے قیاس کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(۱) فرع حکم میں اصل سے اولیٰ ہو جیسے والدین کو مارنے کی حرمت، جو مستفاد ہے ارشاد باری ''وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ'' سے، پس جب اف کہنا ممنوع ہے تو مارنا بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا۔

(۲) فرع حکم میں اصل کے مساوی ہو یعنی رتبہ میں نہ اس سے کم ہو نہ زیادہ جیسے ارشاد ربانی ہے ''فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ'' (نساء۲۴) پس اگر غلام بھی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے کوڑے کی حد واجب ہو جائے تو اس کو اس تنصیف میں باندی پر قیاس کریں گے۔

(۳) فرع کی علت حکم میں اصل سے ضعیف ہو۔

قیاس کی یہ تینوں قسمیں بالترتیب ایک دوسرے سے اقوی واضعف ہیں، چنانچہ قسم اول، ثانی سے اقوی اور ثانی ثالث سے اقوی ہے، یوں ہی قسم ثالث ثانی سے اضعف اور ثانی، اول سے اضعف ہے۔

امام شافعی نے کچھ ایسے نصوص ذکر کیے ہیں، جن پر قیاس درست نہیں اور وہ ہر وہ نص ہے جس میں حکم اللہ کی طرف سے منصوص ہو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی سنت بنالی ہو مثلا اللہ کا ارشاد ہے:

''إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ''

پس بتقاضاے حکم عام پیر کا دھلنا ایک رکن وضو ہوگا پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفین پر مسح کرلیا تو اس نص عام کے حکم میں تخفیف ہوگئی، پس عمامہ اور قفازین کو خفین پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا، کیوں کہ حکم یہاں پر نص عام سے مستثنیٰ ہے جس نص عام میں استثنا ہو اس پر قیاس درست نہیں ہوتا۔

امام شافعی ہر شخص کے لیے قیاس درست نہیں مانتے بلکہ قیاس کرنے والے کے لیے مندرجہ ذیل شرطیں لگاتے ہیں:

(۱) قائس لسان عرب کا عالم ہو کیوں کہ یہ دین عربی ہی میں نازل ہوا لہٰذا ہر مجتہد کا حق ہے کہ عربی کا عالم ہو۔

(۲) قائس کو کتاب اللہ کے احکام فرض وادب، ناسخ ومنسوخ، احکام عامہ وخاصہ کا علم ہو۔

(۳) قائس سنن، اقوال سلف اور لوگوں کے اجماع واختلاف کا عالم ہو۔

(۴) اتنا صحیح العقل اور حسن التقدیر ہو کہ مشتبہ کو امتیاز دیکر اس کا حکم ثابت کرسکے۔

امام شافعی نے اسی قیاس کو درست قرار دیا ہے، جو قیاس قرآن وسنت میں منصوص حکم سے ماخوذ ہو کیوں کہ اصل اسلامی کو انہوں نے کتاب وسنت میں منحصر مانا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے ”اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ، مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ“ ان آیتوں سے مستفاد ہے، کہ اصل دین صرف کتاب وسنت ہیں، پس اجتہاد بالرای کے لیے ضروری ہوگا، کہ وہ کتاب وسنت سے مشتق ہو، تو قیاس بھی انہیں پر ہوگا، جس نے ایسی رائے پیش کی، جو ان دونوں پر محمول نہیں، اس نے زیادتی کی اور اپنے نفس کی پیروی کی حالاں کہ اس کو نفس کے اتباع کا حکم نہیں بلکہ کتاب وسنت کے اتباع کا حکم ہے۔ (ماخوذ از شافعی از ص ۱۶۲ تا ۲۷۶، ابوزہرہ مصری)

* * *

ناشرین فقہ شافعی

امام شافعی کے فیض تعلیم وتربیت سے جو خوش نصیب علما درجہ امامت پر فائز ہوئے، ان میں سے چند اہم وارشد تلامذہ کے مختصر حالات وکمالات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں، جن کے ذریعے اسلامی ملکوں میں فقہ شافعی کی ہمہ گیر اشاعت ہوئی۔

(۱) حسن بن محمد زعفرانی بغدادی

ابوعلی حسن بن محمد بن صباح زعفرانی بغدادی تقریباً ۱۷۰ھ میں بغداد سے قریب ایک بستی ''زعفرانیہ'' میں پیدا ہوئے جس کی بنا پر زعفرانی مشہور ہوئے، وہ خود فرماتے ہیں، جب امام شافعی کی مجلس میں میں نے کتاب ''الرسالۃ'' کی قرأت کی، تو امام شافعی نے دریافت کیا، تم عرب کے کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں عرب نہیں ہوں، زعفرانیہ دیہات کا رہنے والا ایک دیہاتی ہوں، امام شافعی یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا، کہ تب تو تم اس گاؤں کے گل سرسبد ہو۔

(تاریخ بغداد ج ۷ ص ۴۰۷)

زعفرانی نے اپنے وقت کے جلیل القدر فقہا ومحدثین سے کسب فیض کیا تھا، ان میں سفیان بن عیینہ، عبدہ بن حمید، عبدالوہاب ثقفی، وکیع بن جراح، ابن عطا، ابن علیہ، عفان بن مسلم، یحییٰ بن عباد، شبابہ بن سوار، سعید بن سلیمان واسطی اور یزید بن ہارون وغیرہ ہیں، لیکن ان میں سب سے اہم شخصیت امام شافعی کی ہے۔

۱۹۵ھ میں جب امام شافعی نے بغداد کے اندر حلقہ درس قائم کیا، تو زعفرانی نے اس مجلس کی حاضری کو لازم کرلیا اور امام شافعی سے تیس رسالوں پر مشتمل ان کی کتاب پڑھی اور اس کا املا کیا، بعد میں یہ رسالے کتاب البغدادی یا کتاب قدیم کے نام سے مشہور ہوئے، امام شافعی کی مجلس درس میں زعفرانی ہی قرأت کرتے تھے جب کہ وہ شرکائے درس میں سب سے کم سن تھے۔

وہ کہتے ہیں میرے علاوہ کسی نے جرأت نہ کی حالاں کہ میں سب سے نوعمر تھا اور میرے چہرے پر ابھی خط سبزہ تک کا ظہور نہیں ہوا تھا، بعد میں اس واقعے کو یاد کرکے وہ فرماتے ''وانی لاتعجب من انطلاق لسانی وجسارتی بین یدیہ''، یعنی اب میں خود امام شافعی کے حضور اس جسارت لسانی پر تعجب کرتا ہوں۔ (تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۶۰)

دو برس میں انہوں نے امام شافعی سے اتنا فیض حاصل کیا اور علم فقہ میں اس قدر مہارت وقابلیت پیدا کرلی، کہ امام شافعی کے مصر تشریف لے جانے کے بعد وہ عراق میں ان کے طرز استدلال اور طریقہ اجتہاد کے نمایاں ترین ترجمان ونمائندہ ہوگئے۔

امام شافعی آپ پر پورا اعتماد کرتے تھے، جب ۱۹۸ھ میں دوبارہ بغداد آئے تو کرابیسی نے ان کی کتابوں کی اجازت طلب کی، لیکن امام شافعی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا، کہ زعفرانی کی کتابیں لو اور ان کو لکھ لو میں ان کتابوں کی اجازت تم کو دیتا ہوں۔

(الانتقاء ص ۶۷)

امام شافعی زعفرانی کی عربی دانی اور فصاحت کے سب سے زیادہ معترف تھے، امام مزنی کہتے ہیں، امام شافعی نے ایک مرتبہ فرمایا، میں نے بغداد میں ایک غیر عربی کو پایا، اس کی زبان دانی اور حسن فہم پر مجھے اتنا ہی اعتماد ہے جتنا کسی عربی الاصل پر ہوسکتا ہے، بسا اوقات تو گمان یہ ہوتا کہ اصلاً وہ عربی ہے اور میں نبطی و عجمی ہوں، کسی نے دریافت کیا، کہ حضرت! اس درجہ کامل و ماہر کون ہے؟ فرمایا، زعفرانی۔ (طبقات کبری ج ۱ ص ۲۵۰)

امام زعفرانی حدیث و فقہ کے علاوہ وقت کے امام، فصاحت و بلاغت میں یکتا اور عربی زبان پر کامل دستگاہ رکھتے تھے، علما نے ان کی علمی جلالت کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔

☆ **امام نسائی:۔** ثقہ ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۸۰)

☆ **امام سبکی:۔** امام جلیل، فقیہ، محدث، فصیح، بلیغ اور ثقہ ہیں۔

☆ **امام ماوردی:۔** قدیم فقہ شافعی کے اہم راوی احمد بن حنبل، ابوثور، کرابیسی اور زعفرانی ہیں، ان میں زعفرانی کا شمار اثبت راوی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ (طبقات کبری ج ۱ ص ۲۵۱)

☆ **امام یافعی:۔** وہ ذہین ترین عالم ہیں، انہیں حدیث و فقہ میں کامل دستگاہ حاصل ہے۔ (مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۱۸۲)

شعر و سخن کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، کبھی کبھی فی البدیہہ اشعار کہتے، ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اجد بین المحبین جدال وقتال　　فاذا ما اریا من ذاك فالحب محال
لایطلب حب اذاما لم یکن فیه جدال　　وبامتناع من حبیب عنده عزالوصال

امام زعفرانی کے حلقہ درس سے بڑے بڑے علما و محدث پیدا ہوئے، ان کی جلالت علم کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے، کہ امام مسلم کے علاوہ صحاح ستہ کے تمام مولفین آپ کے چشمہ علم سے فیضیاب ہوئے، ان کے علاوہ زکریا ساجی، ابن خزیمہ، ابوعوانہ اسفرائنی، محمد بن مخلد، ابوسعید ابن الاعرابی نے کسب فیض کیا۔

(تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۸۰)

رمضان ۲۶۰ھ میں وفات پائی

(۲) ابوثور ابراہیم بن خالد بغدادی

ابوعبداللہ ابراہیم بن خالد بن یمان کلبی ملقب بہ ابوثور ۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے، یہ بغداد کے باشندے تھے، انہوں نے سفیان بن عیینہ، ابن علیہ، عبید بن حمید، ابومعاویہ، وکیع، معاذ بن معاذ، عبدالرحمن بن مہدی اور یزید بن ہارون جیسے ائمہ کبار سے

کسب علم کیا۔

ابتدا میں فقہ حنفی کی تحصیل کی اور امام محمد کی مجلس کے حاضر باش تھے، امام شافعی جب بغداد آئے، تو خدمت میں پہنچے، ان کی شخصیت اور تبحر علمی سے اس درجہ متاثر ہوئے، کہ تلامذہ کی صف میں داخل ہو گئے اور وہ امام شافعی کی کتاب قدیم کے راوی بن گئے، آپ کی جلالت شان کا اعتراف ائمہ دین نے اس طرح کیا ہے:

☆**احمد بن حنبل:**۔ ”وعندی کسفیان الثوری“ ان کا مرتبہ میرے نزدیک سفیان ثوری کی طرح ہے۔ (طبقات ابن ہدایہ ص ۶)

☆**امام نسائی:**۔ یہ ثقہ مامون اور فقہا میں سے ایک فقیہ ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۷۳)

☆**ابن حبان:**۔ یہ فقہ، علم وفضل اور تورع میں دنیا کے اماموں میں سے ایک امام ہیں۔ (ایضا)

☆**امام ذہبی:**۔ انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، احادیث سے فروعی احکام استنباط کیے اور سنت پر اعتراضات کرنے والوں کے جواب دیے۔ (ایضا)

امام ابوثور محدث اور بلند پایہ فقیہ تھے، وہ صرف فقہ شافعی کے ناقل اور راوی ہی نہیں تھے، بلکہ اجتہادی شان بھی رکھتے تھے، ابن خلکان کے بقول مسلک شافعی کے قائل اور آخر تک اس پر عامل رہے، لیکن امام یافعی، امام نووی اور ابن ندیم کے نزدیک امام ابوثور مستقل مسلک فقہ رکھتے تھے، وہ کسی کے مقلد نہیں تھے، ذہبی نے ”الامام المجتهد“ لکھا ہے، ان کے اندر فقہ کی باریک بینی، جزئیات رسی اور قوت استنباط امام محمد بن حسن شیبانی کی بارگاہ سے حاصل ہوئی تھی، جس کا اثر ان پر پوری زندگی قائم رہا، حدیث کی بہ نسبت فقہ کا رنگ ان پر گہرا تھا، امام احمد بن حنبل سے ایک مرتبہ کسی مسئلہ کے متعلق استفسار کیا گیا تو انہوں نے سائل سے کہا، کہ یہ مسئلہ میرے علاوہ کسی اور سے پوچھو، فقہا سے پوچھو، ابوثور سے دریافت کرو۔ (طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۸۳)

ابوعبداللہ حاکم کہتے ہیں، امام ابوثور اپنے زمانے میں اہل بغداد کے واحد مفتی وفقیہ تھے، ساتھ ہی ائمہ حدیث میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ (ایضا)

امام نووی کا بیان ہے ابوثور حدیث وفقہ کے علوم کے جامع ہیں، ان کی امامت وجلالت ثقاہت وبراءت پر سب بیک زبان متفق ہیں۔ (تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۲۰۰)

امام تقی الدین سبکی نے آپ کی قوت استدلال اور فقہی دقیقہ رسی کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔

ایک مجلس میں یحییٰ بن معین، ابوخیثمہ اور خلف بن سالم جیسے نامور محدثین موجود تھے اور ایک خاتون کے استفسار کے جواب میں خاموش اور متردد تھے، امام ابوثور نے آتے ہی خوبی کے ساتھ مسئلے کو حل کر دیا اور ساری مجلس سے داد تحسین حاصل کی۔

(طبقات کبریٰ ج ۱ ص ۲۸۳)

امام ابوثور سے کسب علم کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے، ان میں بعض اہم نام یہ ہیں:

امام مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی، ابوحاتم رازی، ابوالقاسم لغوی، قاسم بن زکریا، محمد بن اسحاق، ادریس بن عبدالکریم، ابن جنید اور عبید بن محمد بزاز۔

آپ نے صفر ۲۴۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

(۳) حسین بن علی کرابیسی بغدادی

ابوعلی حسین بن علی کرابیسی بغدادی، بغداد کے رہنے والے تھے، حدیث میں شبابہ سوار، عمرو بن ہیثم، معن بن عیسیٰ، اسحاق بن یوسف، یعلی، محمد، یزید بن ہارون اور یعقوب بن ابراہیم کے شاگرد تھے۔ انہوں نے مکتب حنفی سے فقہ وفتاوی کی تحصیل کی، ابتدا میں وہ اسی مکتب فقہ کے قائل اور اس کے مبلغ تھے، مگر امام شافعی جب بغداد آئے اور ان سے ملاقات کی، تو ان کی علمیت اور تفقہ سے کافی متاثر ہوکر، ان کے حلقہ درس سے وابستہ ہوگئے اور ان کے بغدادی تلامذہ میں نمایاں مقام حاصل کرلیا، قول قدیم کے چار راویوں میں سے ایک راوی کی حیثیت سے شہرت پائی، وہ امام شافعی سے حد درجہ الفت رکھتے تھے، ان کے سلسلے میں کسی کی ادنیٰ غفلت کو بھی گوارہ نہ کرتے تھے۔

تمام تذکرہ نگار متفق ہیں، کہ کرابیسی جلیل القدر امام، فقہ وحدیث کے جامع، متکلم اہل سنت، نہایت ذی علم وفہم اور فقہ واصول فقہ، حدیث اور علم رجال میں ایک متبحر عالم تھے، نہایت محتاط، ثقہ، حافظ اور صدوق تھے۔

کرابیسی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، امام سبکی نے کتاب المقالات کا ذکر کیا ہے، جس میں فرق باطلہ کا ذکر ہے، یہ کتاب متکلمین کا مرجع تھی، دوسری کتاب شہادات کے مسائل پر تھی۔

امام عسقلانی لکھتے ہیں، کہ فقہ اور اصول فقہ میں ان کی کتابوں کی تعداد بہت ہے، ان کی تصنیفات ان کے وسیع مطالعہ اور فہم وادراک کا مظہر ہیں، علامہ ابن عبدالبر نے ان کی کتابوں کی تعداد دوسو بتائی ہے۔ آپ کی مزید چند کتابیں یہ ہیں۔

کتاب الجرح والتعدیل، کتاب المدلسین، کتاب الاملۃ، کتاب القضاء۔

۲۴۵ھ یا ۲۴۸ھ میں وفات پائی۔

(۴) یوسف بن یحییٰ بویطی

ابویعقوب یوسف بن یحییٰ بویطی مصر میں بوصیر سے قریب بویطا نامی بستی کے باشندے تھے، جس کی طرف نسبت کرتے ہوئے بویطی کہلائے، بویطی نے جب آنکھ کھولی، تو مصر علم وفضل کا گہوارہ بن چکا تھا اور وہاں امام لیث بن سعد، بشر بن بکر، حمید اللہ بن یوسف، شعیب بن لیث اور اسد بن موسیٰ جیسے نامور محدثین موجود تھے، ان سے اکتساب فیض کرنا قرین قیاس ہے، لیکن امام بویطی نے امام شافعی سے پہلے جس شیخ کبیر سے حدیث وفقہ کی کثیر روایت حاصل کی وہ امام عبداللہ بن وہب ہیں، جو حدیث وفقہ کے جامع تھے، ان سے تلمذ اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ بویطی میں حدیث وفقہ کی ہم آہنگی کا شعور پیدا ہوا اور اس شعور

کی تکمیل امام شافعی کی مجلس درس میں ہوئی۔

امام شافعی جب مصر تشریف لائے، تو بویطی ان کے حلقہ درس کے حاضر باشوں میں شامل ہوگئے، پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ امام شافعی کے علم کو اپنے سینے اور سفینے میں محفوظ کیا، اس طرح وہ امام شافعی کے اکبر اصحاب کی صف میں شامل ہوگئے، چار سالہ قیام مصر کے دوران انہوں نے امام شافعی کی ہم نشینی کو اپنے اوپر لازم کرلیا، بقول امام سبکی ''اختص بصحبتہ'' وہ امام شافعی کی صحبت کے ہوکے رہ گئے، اور ان کی تعلیم و تربیت سے اس درجہ فیض یاب ہوئے کہ جب امام شافعی کے سامنے جانشینی کا مسئلہ آیا اس وقت ان کے اہم تلامذہ مزنی، ربیع ابن عبدالحکیم کی موجودگی میں نگاہ انتخاب امام بویطی پر پڑی اور جب امام شافعی کا وقت وصال قریب آیا تو انہوں نے وصیت کی کہ ان کے حلقہ کی مسند نشینی اور قائم مقامی بویطی کریں گے۔

(تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۶۴)

امام شافعی نے زندگی ہی میں ان کو عملاً اپنا جانشیں مقرر کردیا تھا، وہ اسطرح کہ مسائل و استفتا کے جواب دینے میں ان سے فرماتے، کہ ان کا جواب تم دو، اکثر مسائل وہ امام بویطی کی جانب منتقل کردیتے اور ان کے جوابات سے مطمئن ہوکر ان کی تصویب اور تصدیق بھی فرماتے، اس طرح امام بویطی کی فکری و ذہنی تربیت فرما کر اپنا کامل جانشیں بنانا چاہتے تھے، کبھی ان کے حسن استدلال سے متاثر ہوکر فرماتے، ابو یعقوب لسانی بویطی میری زبان ہیں، بویطی کے ہم درس امام ربیع مرادی فرماتے ہیں:

کان ابو یعقوب من الشافعی بمکان مکین ۔(تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۰۱)

بویطی کا امام شافعی کے نزدیک اونچا درجہ تھا۔

چنانچہ رجب ۲۰۴ھ میں جب امام شافعی نے رحلت کی، تو بویطی ان کے حلقہ درس کے صدر نشیں بنے وہ قولاً فعلاً امام شافعی کے جانشین ہوگئے۔

اس سلسلے میں ایک معمولی تنازع بھی ہوا، ابن عبدالحکیم جو مالکی عالم تھے، امام شافعی سے فقہ حاصل کر کے شافعی ہوگئے تھے، انہوں نے مسند درس کا استحقاق ظاہر کیا، اس کشمکش کے موقع پر امام شافعی کے قدیم مکی شاگرد حمیدی موجود تھے، انہوں نے فرمایا ''امام شافعی نے مجھ سے خود فرمایا تھا، کہ میری مجلس کا حقدار بویطی سے بڑھ کر کوئی نہیں اور نہ میرے اصحاب میں ان سے زیادہ صاحب علم کوئی ہے'' اس پر ابن عبدالحکیم نے کہا، کہ آپ نے غلط بات کہی، تو امام حمیدی نے کہا، ''**کذبت انت وابوك وامك**'' غلط بات تو تم نے اور تمہارے باپ ماں نے کہی، اس سخت بات سے ابن عبدالحکیم بہت ناراض ہوئے اور شافعی مسلک کو خیرآباد کہہ کر سابقہ مسلک کی ترویج میں لگ گئے، امام بویطی اپنے استاذ سے حد درجہ عقیدت و محبت رکھتے تھے، اور ہمیشہ ان کا ذکر وردِ زبان رہتا، وہ اکثر کہا کرتے تھے، کہ میں نے بہتوں کو دیکھا، لیکن بخدا کسی بھی صنف علم میں امام شافعی کے ہم پلہ تو کیا کچھ کم تر بھی نہ پایا، جو لوگ بھی ورع و تقویٰ میں حیثیت رکھتے ہیں، ان میں سب سے ممتاز میں نے امام شافعی کو پایا۔

(تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۸۵)

وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ ہم نے امام شافعی کی صحیح قدر تو اس وقت جانی جب اہل عراق کو دیکھا کہ وہ امام صاحب کی خوبیوں کا ذکر اس کثرت اور عقیدت سے کرتے ہیں، کہ ہم اس کا نصف بھی نہیں کرتے۔

جامع عمرو بن عاص میں جہاں امام شافعی درس و تدریس کی مسند کو زینت بخشتے تھے، امام بویطی کا فیضان علم اسی رونق سے جاری رہا، دور دراز سے شائقین علم آتے اور امام بویطی کے ہاتھوں امام شافعی کی میراث کی دولت اپنے اپنے علاقوں میں لے جا کر عام کرتے ۲۲۷ھ میں جب واثق باللہ خلیفہ ہوا، تو اس کے حکم پر امام بویطی کو پابند زنجیر و سلاسل کر کے بغداد لایا گیا اور معتزلہ کے برخلاف عقیدہ خلق قرآن قبول نہ کرنے پر قید میں ڈال دیا گیا، جہاں یہ مرد صالح حق گوئی، حق پرستی کی پاداش میں چار سال تک قید و بند کی صعوبتیں اور طوق و سلاسل کی گراں باریاں برداشت کرتا رہا، بالآخر ۲۳۲ھ بروز دوشنبہ طائر روح قفس عنصری سے آزاد ہو گیا اور اس مرد حق پرست نے امام احمد بن حنبل کے بعد عزیمت و بسالت کی درخشاں مثال قائم کر دی اور امام شافعی کی پیشین گوئی حرف بحرف صادق آئی:

اما انت یا ابا یعقوب فستموت فی حدیدك. (طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۳۹)

اے ابو یعقوب بویطی! تمہارا وقت موعود آئے گا اور تم بیڑیوں میں ہو گے۔

آپ کے ارشد تلامذہ میں ابراہیم بن اسحاق حربی، محمد بن اسماعیل ترمذی، ابو قاسم احمد بن ابراہیم، قاسم بن ہاشم، قاسم بن مغیرہ، احمد بن منصور ہادی اور امام الائمہ ابن خزیمہ جیسے نامور محدثین و فقہا ہیں۔

علمی جلالت شان کے ساتھ وہ نہایت متقی، پرہیز گار اور عابد شب زندہ دار تھے، ان کا دن درس و تدریس اور اذکار میں گزرتا رات کے وقت وہ قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتے ان کا معمول تھا، کہ روزانہ ایک ختم قرآن کیا کرتے وہ بہت رقیق القلب تھے، اکثر آنسو رواں رہتے۔

(۵) ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی

ابو ابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی ۱۷۵ھ میں مصر میں پیدا ہوئے، مصر ان دنوں علم و فضل کا گہوارہ بن چکا تھا، مزنی علما و فضلا کے آستانوں پر جا کر تحصیل علم کر رہے تھے، چنانچہ علی بن معبد، نعیم بن حماد کی خصوصی شاگردی اختیار کی، امام شافعی مصر پہنچے تو ان کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اور مزنی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی وابستگی اور تعلق خاطر اس درجہ بڑھا، کہ وہ خصوصی حلقہ نشینوں کے زمرے میں داخل ہو گئے، امام شافعی کے فیض علم نے انہیں کتاب و سنت کے رموز سے واقف اور فقہی بصیرت کا حامل بنا دیا، اجتہاد و استدلال کی نئی راہیں ان پر منکشف ہوئیں اور انہوں نے امام شافعی کے علم و اجتہاد کو دور دور تک پھیلا دیا اور نہ صرف مصر بلکہ سارے بلاد اسلامیہ میں فقہ شافعی کی اشاعت و ترویج کا عام ذریعہ بن گئے، ان کے بارے میں بجا طور پر کہا جاتا ہے:

اکبر اصحابنا علما و اعلم بالمعنی الشافعی الذی مهد مذهب و لین کلام الشافعی۔

وہ ہمارے اصحاب میں علم کے لحاظ سے سب سے برتر اور امام شافعی کے شاگردوں میں عالم ترین شخص تھے، جنہوں نے شافعی مسلک کی راہ ہموار کی اور کلام شافعی کو آسان بنادیا۔

ابن خلکان رقم طراز ہیں:

وهو امام الشافعين واعرفهم بطرقه وفتاواه وماينقله عنه .

وہ شوافع کے امام، شافعی کے فقہی طریقوں، ان کے فتاوی اور ان کے منقولات کے سب سے بڑے عالم ہیں۔

ابتدا ہی میں امام شافعی کو مزنی کی قوت استدلال، صلاحیت، استحضار، دقیقہ سنجی، نکتہ رسی، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی فطری اور خداداد صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا تھا اس لیے اپنی ساری توجہ ان کی فقہی صلاحیتوں کی ترویج وترقی پر مرکوز کردی، چار سال کی تعلیم وتربیت کے بعد امام شافعی نے اپنے شاگرد کے بارے میں فرمایا:

هذا لوناظر الشيطان لغلبه وقطعه وهو ناصر مذهبی .

یہ اگر شیطان سے مناظرہ کریں، تو اس پر غالب آجائیں اور اسے ختم کردیں یہ میرے مسلک کے ناصر ومددگار ہیں۔

امام شافعی نے اپنی وفات کے وقت امام مزنی کے بارے میں فرمایا تھا:

یامزنی فسیکون لك بمصر هنات هنات وانك تدرکن زماناتکون اقیس ذلك الزمان .

(طبقات سبکی ج۱ص۲۳۹)

اے مزنی بہت جلد تمہارے لیے مصر میں خوش گواریاں ہوں گی اور وہ زمانہ ضرور پاؤ گے جس میں تم سب سے بڑے فقیہ ہوگے۔

ربیع کا بیان ہے جیسا فرمایا ویسا ہی ہوا۔

امام مزنی اپنے محترم استاذ کی علمیت اور جامع کمال شخصیت کے پوری عمر معترف رہے، کہا کرتے تھے:

لووزن عقل الشافعی بعقل نصف اهل الارض رجع . (مرآۃ الجنان ج۲ص۱۹)

اگر امام شافعی کی عقل کو زمین کے آدھے لوگوں کی عقل سے وزن کیا جائے تو امام صاحب کی عقل زیادہ وزنی ثابت ہوگی۔

امام شافعی کے بعد ان کی مجلس درس پر فائز ہوئے، آپ سے کسب علم کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے، جن میں انماطی، عبدان بن محمد، ابوبکر فاسی، ابراہیم بلدی، ابن خزیمہ اور طحاوی، زکریا ساجی، ابن حوصہ، ابن ابی حاتم مشہور ہیں۔

آپ محدث وفقیہ ہونے کے ساتھ بہت بلند پایہ مصنف بھی تھے، ان کی مصنفات میں جامع کبیر، جامع صغیر، مختصر المختصر، المنثور، المسائل المعتبرہ، الترغیب فی العلم، کتاب الوثائق، کتاب العقارب، نہایۃ الاختصار وغیرہ مشہور ہیں۔

مختصر المزنی سب سے اہم کتاب ہے، جو فقہ شافعی کی ترویج و اشاعت میں بلند مقام رکھتی ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں:

انه زينة مذهبكم وعمدة اصلكم وقائدة طريقكم ومؤللكم حين تختلفون ومرجعكم حين تضطربون ومفزعكم حين تضرب امواج الآراء ويتناضل فى محافل الفقهاء.

(طبقات الکبری ج ا ص ۱۱)

یہ کتاب تمہارے مسلک کی زینت، تمہارا بنیادی ستون اور سنگ میل ہے، تمہارے اختلافی مسائل میں تاویل گاہ ہے اور تمہارے پیچیدہ مسائل میں مرجع ہے، جب مختلف راویوں کا ہجوم اور فقہا کی محفلوں میں منازعہ ہو تو تمہارے لیے جائے پناہ ہے۔

اس کتاب کی بہت ساری شرحیں لکھی گئیں۔

۲۶ رمضان المبارک ۲۶۴ھ میں وفات پائی۔

(۶) ربیع بن سلیمان مرادی

ابو محمد ربیع بن سلیمان بن عبد الجبار مرادی ۱۷۴ھ میں پیدا ہوئے، بنو مراد سے نسبت ولا کی بنا پر مرادی کہلائے، ان کے خاندان کے لوگ عرصہ دراز سے مصر میں مقیم تھے، اس لیے وہ خالص مصری ہو گئے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ذوق و شوق کے ساتھ علم حدیث کی تحصیل شروع کی اور مصر کے مقتدر علما و محدثین سے کسب فیض کیا، ان کے اہم شیوخ حدیث عبد اللہ بن وہب، عبد اللہ بن یوسف، ایوب بن سوید، یحیٰی بن حسان، اسد بن موسی، بشر بن بکر اور شعیب بن لیث ہیں، ابن وہب سے خصوصی تعلق کی بنا پر صاحب ابن وہب کہلائے، یہ ربیع کی خوش نصیبی ہے کہ ابن وہب جیسے جلیل القدر محدث کی شاگردی حاصل ہوئی۔

ابن وہب کے متذکرہ بالا اساتذہ حدیث و فقہ کے جامع تھے، ان سے تلمذ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ امام مرادی حدیث و فقہ کا ذوق رکھتے تھے اور اپنے دور کے کلامی علما سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف فقہا و محدثین کی درسگاہوں سے واسطہ رکھا یہی وجہ ہے، کہ حدیث و فقہ کی جامعیت ان کے حصے میں آئی، اس میں بھی حدیث کا رنگ غالب تھا، جس نے امام مرادی کے فکر و شعور میں ایسے رجحانات پیدا کیے جو انہیں امام شافعی کے مکتب فکر سے قریب لانے اور ان کے طرز استدلال و اجتہاد کو قبول کرنے میں زیادہ معاون اور سازگار ثابت ہوئے۔

۱۹۸ھ میں جب امام شافعی مصر تشریف لائے، تو ربیع عمر کی پختگی اور شعور کامل کے ساتھ دوسرے اہم طلبہ کی صف میں شامل ہو کر امام شافعی کے حلقہ درس سے وابستہ ہو گئے، کہا جاتا ہے، کہ مصر سے پہلے بغداد میں ربیع نے امام شافعی سے ملاقات کی تھی اور ان کے علم و تفقہ سے بے حد متاثر ہوئے تھے، مصر میں ربیع امام شافعی کے سایہ کی طرح ان کے رفیق و قرین رہے، اور وہ جذبۂ اخلاص و عقیدت کے ساتھ امام شافعی کی ہر خدمت کو اعزاز سمجھتے رہے، خود امام شافعی بھی ان خدمات کے معترف تھے، وہ کہا

کرتے تھے، میری جتنی خدمت ربیع نے کی اتنی کسی نے نہیں کی۔

اسی بے لوث خدمت نے انہیں مقام محبوبیت پر فائز کر دیا، امام شافعی نے ایک بار فرمایا:

انت فی حل مالی کله .

تمہیں میرے سارے مال میں اختیار ہے۔

اسی طرح حصول علم کے لیے بھی امام شافعی کا دروازہ ان کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا اور شاگرد کا ذوق علم دیکھ کر امام نے فرمایا تھا، اے ربیع! اگر علم کھلانے والی چیز ہوتی تو میں تمہیں کھلا کر رہتا۔ (انتقاء ص ۹۴)

آپ کے وثوق علم اور قوت حفظ وضبط کی بنا پر امام شافعی نے فرمایا تھا:

الربیع روایتی و احفظ اصحابی ۔(طبقات کبری، طبقات الفقهاء)

ربیع میرے راوی اور سب شاگردوں سے زیادہ حافظہ والے ہیں۔

ربیع اگر کچھ دنوں کے لیے حلقہ درس میں حاضر نہ ہوتے تو امام شافعی غیر حاضری کے ایام کے درس کا ان کے لیے اعادہ فرماتے۔

امام شافعی نے رحلت کے وقت امام ربیع کے بارے میں فرمایا تھا:

انت انفعهم لی فی نشر الکتب ۔(طبقات سبکی ج ۱)

تم ان لوگوں میں میری کتابوں کی نشر و اشاعت میں سب سے زیادہ مفید ہو گے۔

امام شافعی کی وفات کے بعد امام بویطی ان کے جانشین ہوئے لیکن مسئلہ خلق قرآن میں انکار خلق قرآن پر قید کر دیا گیا اور پس دیوار زنداں وفات پائی، پھر امام ربیع اس حلقہ درس کے صدر نشیں ہوئے، استاذ کا ادب اس درجہ تھا، کہ ان کی نشستگاہ پر کبھی نہ بیٹھے، وقت کے ساتھ آپ کا حلقہ درس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا، امام مزنی اپنی تصانیف اور امام ربیع اپنے درس سے فقہ شافعی کی ترویج و اشاعت میں روز افزوں اضافہ کرنے لگے۔

امام نووی فرماتے ہیں:

صارت الرواحل تشتد الیه من اقطار الارض لسماع کتب الشافعی ۔ (تہذیب الاسماء ج ا ص ۱۸۸)

لوگ دور دراز سے ان کے پاس امام شافعی کی کتابوں کے سماع کے لیے حاضر ہونے لگے۔

محمد بن احمد بغدادی کا بیان ہے، کہ ایک روز ہم امام ربیع کی خدمت میں حاضر تھے، تو ان کے دروازے پر تقریباً نو سو مسافر تھے جو دور دور سے امام شافعی کی کتابوں کی سماعت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ (ایضا)

امام ربیع کی مجلس ودرس سے ہزاروں افراد نے فیض پایا، آپ کے بعض اہم تلامذہ یہ ہیں:

ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابوزرعہ، ابوحاتم، عبدالرحمٰن بن ابی حاتم، ابن خزیمہ، محمد بن جریر طبری، زکریا ساجی،

طحاوی، محمد بن زیاد نیشاپوری، ابونعیم، ابوبکر محمد بن احمد خلالی، محمد بن نصر مروزی، ابویعقوب اسفرائنی، نوح بن منصور۔

آپ کی تصانیف میں کتاب الامالی، اور مختصر ربیع کا ذکر جلال الدین سیوطی نے کیا ہے۔

شوال ۲۷۰ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

(۷) حرملہ بن یحییٰ

امام ابوحفص حرملہ بن یحییٰ تجیبی مصری ۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے، آپ کے جدامجد حرملہ بن عمران جلیل القدر تبع تابعی تھے، امام حرملہ کو قدرت نے قوی حافظہ، فہم وشعور اور ذوق علم کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا، چنانچہ انہوں نے اساطین علم سے کسب فیض کیا، جن میں عبداللہ بن وہب، ایوب بن سوید، بشر بن بکر تنیسی اور ابوعبداللہ شافعی ہیں، آپ نے ابن وہب سے ایک لاکھ حدیثیں لکھی تھیں، وجہ یہ ہوئی کہ عبداللہ بن وہب کو مصر کے عہدہ قضا کی پیش کش کی گئی جسے وہ ناپسند کرتے تھے، حاکم اور عوام سے بچنے کے لیے وہ ڈیڑھ سال تک امام حرملہ کے گھر میں روپوش رہے، یہ سنہرا موقع تھا، جس سے حرملہ نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان سے ایک لاکھ حدیثیں سن کر املا کیں اور وہ ابن وہب کی روایتوں کے سب سے بڑے ناقل وراوی بن گئے۔

یحییٰ بن معین کہتے ہیں، مصر میں ایک بزرگ حرملہ رہتے ہیں، جو ابن وہب کی احادیث سب لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۲ص ۳۵۷)

ابوعمرو کندی کا قول ہے، مصر میں ابن وہب سے لکھنے والا ان (حرملہ) سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ (ایضا)

احمد بن صالح مصری کا بیان ہے، ابن وہب نے ایک لاکھ بیس ہزار حدیثوں کی تدوین کی ان میں سے نصف میرے پاس ہیں اور امام حرملہ کے پاس وہ سارا ذخیرہ موجود ہے۔ (طبقات ابن شیبہ ج۱ص۱۱)

امام شافعی جب مصر تشریف لائے حرملہ ان کے دامن فضل وکمال سے وابستہ ہوگئے اور شیخ کی تعلیم وتربیت نے انہیں فقہ وفتاوی کا رمز شناس بنادیا اور جلیل القدر محدث ہونے کے باوصف ان کا شمار عظیم فقہائے شافعیہ میں ہوتا ہے، انہوں نے فقہ شافعی میں ایسے مباحث اور مسائل نقل کیے ہیں جن کو امام ربیع مرادی نے بھی بیان نہیں کیا تھا، بعض رسالے ایسے ہیں جن کی امام شافعی سے سماعت میں وہ اور امام ربیع شریک ہیں، مگر روایت میں امام حرملہ منفرد ہیں۔ (طبقات کبری ج۲ص۳۱)

امام شافعی کے انتقال کے بعد جب عبدالعزیز بن عمران مصری امام حرملہ کے پاس گئے تو انہوں نے ان کے پاس امام شافعی کی ساری کتابیں دیکھیں جو تعداد میں ستر کے قریب تھیں ان میں سے بعض رسالے ایسے بھی تھے، جو امام شافعی کے اقوال پر مشتمل نہیں تھے، لیکن وہ ان کے آراوافکار کے مطابق تھے، امام حرملہ نے ان کتابوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہی میرا سرمایہ ہیں، ان میں سے کچھ کتابوں کی تو میں نے خود سماعت کی ہے اور بعض کو اور طرح سے حاصل کیا ہے۔

(تہذیب ج۲ص۲۳۰)

امام حرملہ سے کسب فیض کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے ان میں امام مسلم، امام ابن ماجہ، ابوزرعہ رازی، ابوحاتم رازی، حسن بن سفیان قزوینی، بقی بن مخلد، ابن قتیبہ عسقلانی مشہور ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۴۵۷)

آپ نے المبسوط اور المختصر تصنیف فرمائی، امام شافعی سے جو کتابیں اور رسالے نقل کیے ہیں، ان میں کتاب الشروط، کتاب السنن، کتاب الابل والغنم اور کتاب الشجاع وغیرہ ہیں۔

آپ کا وصال بمقام مصر ۲۴ رشوال ۲۴۳ھ میں ہوا۔

(۸) امام یونس بن عبدالاعلیٰ

ابوموسیٰ یونس بن عبدالاعلیٰ بن موسیٰ صدفی ۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے، انہوں نے اپنے وقت کے ائمہ حدیث وفقہ اور قرا سے حدیث وفقہ اور قرأت وتجوید کا علم حاصل کیا، ان میں سفیان بن عیینہ، ولید بن مسلم، ابن وہب، معن بن عیسیٰ، ابوضمرہ، امام شافعی، ورش مشہور ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۳۸۲)

امام صدفی نے حدیث وفقہ کے ساتھ علم قرأت میں بھی کمال حاصل کیا تھا، قرأت نافع انہیں سے ماخوذ ہے، جس کو انہوں نے امام تجوید ورش سے حاصل کیا تھا، امام ورش کے علاوہ مقلاب بن شیبہ، علی بن دحیہ، نافع اور علی بن اکشبہ اور قالون سے بھی علوم قرأت کی تحصیل کی، قرأۃ حمزہ بھی ان سے نقل کی ہے۔ (وفیات الاعیان ج۳ ص۴۸)

امام صدفی سے روایت کرنے والوں میں امام مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوبکر بن زیاد، ابن ابی حاتم، ابوطاہر مدینی مشہور ہیں (تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۳۸۲)

آپ کی جلالت شان کا اعتراف اکابر ملت نے کیا ہے:

☆ **امام شافعی:۔** میں نے مصر میں یونس سے زیادہ عقلمند کوئی آدمی نہیں دیکھا۔

☆ **یحییٰ بن حسان:۔** یہ اسلام کا ایک رکن ہیں۔

☆ **ابوحاتم ونسائی:۔** ثقہ ہیں۔ (ایضا)

امام یونس صدفی علم وفضل کے ساتھ زہد وورع اور عبادت وتقویٰ میں بھی امتیازی شان رکھتے تھے، ابن خلکان نے کثیر الورع متین الدین لکھا ہے۔

ابن حجر نے عارف عالم، متقی، فاضل، شریف، اور عاقل کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

امام صدفی نے امام شافعی کے متعدد فقہی آرا کو نقل کیا ہے۔

ان کی وفات ربیع الثانی ۲۶۴ھ میں بمقام مصر ہوئی۔

شمائل وخصائل

مبدأ فیاض نے امام شافعی کو حسن صورت، حسن سیرت، بے پناہ فہم وفراست اور شعور ودانش، اخلاص، ایثار، صبر وقناعت، توکل واستغنا، زہد وورع، خشیت الٰہی اور حب رسول کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا۔

ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں:

لقد آتى الله الشافعي حظا من المواهب يجعله في الذروة الاولى من قادة الفكر وزعماء الآراء ۔ (الشافعی ص ۳۴)

اللہ تعالیٰ نے امام شافعی کو ایسے مواہب عطا کیے تھے، جنھوں نے ان کو قائدین فکر اور زعمائے عقل ودانش کی سب سے بلند چوٹی پر فائز کر دیا تھا۔

حلیہ

آپ دراز قد، موزوں اندام، گورے، خوبصورت، بارعب آدمی تھے، ہاتھ بہت لمبے، پیشانی کشادہ، بھویں ابھری ہوئیں، دانت چھوٹے کشادہ، ناک لمبی، عارض ابھرے ہوئے نہ تھے، ڈاڑھی متوسط، عمر کے آخر میں مہدی کا خضاب استعمال کرتے تھے۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

كان الشافعي طويلا نبيلا جسيما يخضب بالحناء خفيف العارض قال المزني مارايت احسن وجها من الشافعي وكان ربما قبض على لحيته فلا تفضل عن قبضته ۔

فصاحت وبلاغت کے ساتھ قدرت نے حسن صوت کی دولت سے بھی بہرہ مند فرمایا تھا، آپ کی آواز میں بے پناہ کشش اور تاثیر تھی، جب بولتے منہ سے پھول جھڑتے، کچھ پڑھتے تو سننے والا ہمہ تن گوش ہو جاتا اور کیفیت الحان میں ڈوب جاتا، خواہش ہوتی، کہ شافعی پڑھتے رہیں اور وہ ان کے حسن صوت سے محظوظ ہوتا رہے۔

امام مالک کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مؤطا کی قرأت کی تو مالک آپ کی آواز کی تاثیر اور حسن ادا کی وجہ سے قرات سننے میں منہمک رہے۔ (الشافعی ص ۳۴)

جب آپ قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے، تو سامعین پر اس درجہ رقت طاری ہوتی، کہ وہ بے اختیار ہو کر گریہ وبکا کرنے

لگتے۔

بحر بن نصر بیان کرتے ہیں:

كنا اذا اردنا ان نبكي قلنا بعضنا لبعض قوموا بنا الى هذا الفتى المطلبي نقرأ القرآن فاذا اتيناه استفتح القرآن حتى يتساقط الناس بين يديه ويكثر عجيجهم بالبكاء فاذا راى ذلك امسك عن القرأة من حسن صوته . (تاريخ بغداد ج ٢ ص ٦٤)

جب ہم رونے کی خواہش کرتے، تو ہم میں بعض بعض سے کہتا، تم لوگ اس مطلبی جوان شافعی کے پاس چلو، ہم قرآن کی تلاوت کریں، جب ہم ان کے پاس آتے، وہ قرآن کی تلاوت شروع کرتے یہاں تک کہ لوگ ان کے سامنے گر جاتے اور ان کی گریہ وزاری کا شور بڑھ جاتا، جب ان کی یہ حالت دیکھتے خوش الحانی کے ساتھ قرأت بند کر دیتے۔

ابوالولید بن جارود کا بیان ہے:

ما رايت احدا الا و كتبه اكثر من مشاهدته الا الشافعي فان لسانه كان اكثر من كتابه .

میں نے سب کو دیکھا، کہ اس کی کتاب اس کے مشافہہ سے بڑھ کر ہے، مگر شافعی کہ ان کی زبان ان کی کتاب سے بڑھ کر ہے۔

جب امام شافعی کی کتابیں جودت تعبیر اور فکر کی حسن تصویر کے لحاظ سے احسن اور اجود تھیں تو ان کے بالمشافہ کلام کا کیا حال ہوگا، جو عبارت میں بلند، اشارے میں مکمل، ادائیگی میں اقوی اور بیان میں فصیح ہے۔ ان کی جودت بیان اور ندرت ادا کو دیکھتے ہوئے ابن راہویہ نے ''خطیب العلماء'' کا خطاب عطا فرمایا۔

فہم وفراست

خدائے علیم وقدیر نے امام شافعی کو ذہانت وفراست کا کمال عطا فرمایا تھا، جودت فکر، شعور عقل، بصیرت ودانائی اوج کمال پر تھی۔ آپ کی فہم ودانش، عقل وآگہی پر علمائے ملت کا اتفاق ہے۔

☆**ابوعبید:۔** ''ما رايت رجلا اعقل من الشافعي'' میں نے شافعی سے زیادہ عقلمند آدمی نہیں دیکھا۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۵)

☆**یحیٰ بن سعید:۔** ''ما رايت اعقل ولا افقه من الشافعي وانا ادعو الله له اخصه به وحده في كل صلوة'' میں نے امام شافعی سے بڑھ کر عقلمند اور فقیہ نہیں دیکھا اور میں ہر نماز میں خاص طور پر ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔

☆**اسحاق بن راہویہ** سے پوچھا گیا، امام شافعی نے یہ کتابیں کیسے لکھیں، جب کہ ان کی عمر کم تھی، انہوں نے جواب دیا'' جمع الله تعالىٰ له عقله لقلة عمره'' اللہ تعالیٰ نے ان کو قلت عمر کے باوجود عقل کامل عطا فرمائی تھی۔ (ایضا)

☆**ہارون بن سعید ایلی:۔** اگر شافعی پتھر کے ان ستونوں کو لکڑی کا ثابت کرنا چاہیں، تو کر سکتے ہیں۔

(ترتیب المدارک ج۱ص۳۸٦)

☆**یونس بن عبدالاعلی:۔** ''**لو جمعت امة ماوسعهم عقل الشافعی**'' 'اگر تمام لوگوں کی عقل شافعی کی عقل میں ضم کردی جائے، تو لوگوں کی عقل کا پتہ نہ چلے۔ (تاریخ ذہبی ص۳۱۳)

امام شافعی کی زندگی کے بہت سے واقعات ہیں، جن سے ان کی عقل وشعور کا تفوق اور مومنانہ فراست جھلکتی ہے۔

امام حمیدی فرماتے ہیں، کہ میں اور امام شافعی مکہ سے باہر گئے ابطح میں ہم کو ایک شخص ملا میں نے امام شافعی سے کہا، کہ آپ فراست سے بتائیے، کہ اس شخص کا ذریعہ معاش کیا ہے، آپ نے فرمایا، کہ یہ شخص بڑھئی یا درزی معلوم ہوتا ہے، میں نے اس شخص سے جا کر دریافت کیا کہ تم کام کیا کرتے ہو، اس نے کہا، کہ میں پہلے بڑھئی کا کام کرتا تھا، اب درزی کا کام کر رہا ہوں۔

امام شافعی اور امام محمد مسجد حرام میں تھے، ایک شخص حرم میں داخل ہوا، امام محمد نے کہا، میں فراست سے پہچانتا ہوں وہ (نجار) بڑھئی ہے اور امام شافعی نے دیکھ کر کہا کہ میرے خیال میں وہ (حداد) لوہار ہے، دونوں نے اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا میں پہلے حداد تھا اور اب بڑھئی کا کام کرتا ہوں۔

ربیع کہتے ہیں، جامع مسجد میں میرا بھائی امام شافعی کے سامنے سے گزرا تو امام شافعی نے فرمایا، ربیع! یہ تو تمہارا بھائی ہے، میں نے کہا جی ہاں! حالاں کہ اس سے پہلے آپ نے کبھی میرے بھائی کو نہیں دیکھا تھا۔

امام بیہقی نے مزنی سے روایت کی ہے، کہ میں جامع مسجد میں امام شافعی کے ساتھ تھا اتفاقاً ایک شخص آیا اور وہ سوئے ہوئے آدمیوں میں سے کسی کو تلاش کر رہا تھا، امام شافعی نے ربیع سے فرمایا، کہ آپ جائیے اور اس تلاش کرنے والے سے کہیے کہ تمہارا حبشی غلام جس کی آنکھ خراب ہے، گم ہو گیا ہے؟ ربیع نے اس شخص سے کہا، وہ شخص ربیع کے ساتھ آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا بتائیے، میرا غلام کہاں؟ آپ نے فرمایا، وہ تو قید خانہ میں ہے، وہ قید خانہ پہنچا، تو واقعی وہاں مل گیا، مزنی نے امام شافعی سے عرض کیا، آپ نے تو ہم کو تعجب میں ڈال دیا، فرمائیے کہ یہ کیا قصہ ہے، آپ نے فرمایا، کہ جب یہ ڈھونڈنے والا مسجد میں آیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کسی بھاگے ہوئے کو ڈھونڈ رہا ہے، پھر یہ اس حصہ مسجد میں گیا جہاں سیاہ فام حبشی سو رہے تھے، میں نے بغور دیکھا، کہ یہ بائیں آنکھ والوں پر گہری نظر ڈال رہا ہے، اس لیے میں نے سمجھ لیا کہ اس کا بائیں آنکھ کے عیب والا کالا غلام بھاگا ہے، مزنی نے ان باتوں کو سن کر آپ سے پوچھا، کہ یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ جیل خانہ میں ہے، فرمایا، یہ میرا تجربہ ہے، کہ جب غلام بھوکا ہوتا ہے، تو چوری کرتا ہے، اگر پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو زنا کرتا ہے، اس لیے میں نے سمجھ لیا کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک ضرور ہے۔ چنانچہ یہی واقعہ نکلا۔

آپ کی والدہ ماجدہ نہایت امانت دار تھیں، اکثر لوگ اپنی امانتیں ان کے پاس رکھواتے تھے، ایک دفعہ دو اشخاص نے

کپڑوں سے بھرا ہوا ایک صندوق آپ کے پاس بطور امانت رکھوا دیا، کچھ دنوں کے بعد ایک شخص آ کر صندوق لے گیا، پھر کچھ عرصہ کے بعد دوسرے شخص نے آ کر صندوق طلب کیا تو انہوں نے کہا کہ میں تمہارے ساتھی کو دے چکی ہوں، وہ آ کر لے گیا ہے اس نے کہا، کہ جب ہم دونوں نے رکھوایا تھا، تو پھر تم نے میری غیر موجودگی میں اسے کیسے دے دیا، یہ سن کر آپ کی والدہ کو بہت ندامت ہوئی، اسی وقت امام شافعی گھر آئے اور والدہ نے سارے حالات بیان کر دیے، اس پر آپ نے فرمایا، کہ اے شخص! تمہارا صندوق موجود ہے، لیکن تم اکیلے کیسے آئے ہو، تم اپنے ساتھی کو لاؤ اور امانت لے جاؤ یہ جواب سن کر وہ حیران ہو گیا۔

ایک دفعہ خلیفہ ہارون رشید اور اس کی بیوی زبیدہ میں کسی بات پر تکرار ہو گئی زبیدہ نے ہارون سے کہا تم جہنمی ہو، اس پر ہارون رشید نے کہا، کہ اگر میں جہنمی ہوں تو تجھ پر طلاق یہ کہہ کر ہارون اور زبیدہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، دل پر بڑا ملال رہا اور علما کو بلا کر مسئلہ دریافت کیا، کہ میں جہنمی ہوں یا جنتی؟ اور علما تردد میں تھے، کہ کس طرح خلیفہ کو جنتی یا جہنمی قرار دیں، بالآخر کسی نے بھی جواب نہیں دیا، امام شافعی کم سنی کے باوجود ان علما کے ساتھ تشریف رکھتے تھے، چنانچہ آپ نے فرمایا، اگر اجازت ہو تو میں اس کا جواب دوں، اجازت ملنے کے بعد آپ نے خلیفہ سے فرمایا، کہ آپ کو میری ضرورت ہے یا مجھے آپ کی، خلیفہ نے فرمایا مجھے آپ کی ضرورت ہے، آپ نے فرمایا کہ تم تخت سے اتر کر نیچے آ جاؤ، کیوں کہ علما کا مرتبہ تم سے بلند تر ہے، چنانچہ ہارون نے نیچے اتر کر آپ کو تخت پر بٹھایا، پھر آپ نے ہارون سے سوال کیا کہ کیا تمہیں کبھی ایسا بھی موقع ملا ہے، کہ تم گناہ پر قادر ہونے کے باوجود محض خوف الٰہی سے باز رہے، تو ہارون نے قسم کھا کر کہا، ہاں ایسے مواقع بھی آئے ہیں تو اس پر امام شافعی نے فرمایا کہ تم جنتی ہو، اس پر علما نے دلیل طلب کی تو آپ نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”**واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى فان الجنة هى الماوىٰ**“ جو اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑے ہونے سے ڈرے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکتا رہے اس کا ٹھکانہ جنت ہے، یہ جواب سن کر علما نے بہت تعریف کی اور فرمایا، کہ جس کا کم سنی میں یہ عالم ہو تو خدا جانے جوانی میں اس کے کیا مراتب ہوں گے۔

امام حمیدی روایت کرتے ہیں، میں نے امام شافعی سے سنا، میں کتب فراست کی تلاش میں یمن گیا، یہاں تک کہ اس فن کی کتابیں لکھیں اور جمع کیں اور میں ان کتابوں کو لے کر واپس آیا، دوران سفر ایک آدمی ملا، جس کی آنکھیں نیلی، پیشانی ابھری ہوئی اور اصلاً ڈاڑھی کے بال نہ تھے، میں نے اس سے پوچھا، کیا رات گزارنے کے لیے کوئی مکان ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا، جب کہ اس کے صفات علم قیافہ کی رو سے خبیث ترین شخص پر دلالت کرتے تھے، اس نے مجھے اپنے مکان میں ٹھہرایا، میں نے دیکھا، کہ وہ بہت نیک انسان ہے، میرے لیے رات کا کھانا لایا اور خوشبو پیش کیا، میرے جانور کو چارا دیا، سونے کے لیے گدا اور لحاف دیا، میں رات بھر سوچتا رہا، کہ فراست و قیافہ کی ان کتابوں کو کیا کروں، جب کہ میں اس آدمی میں عملاً یہ عمدہ صفات دیکھ رہا ہوں، میں نے فیصلہ کیا، ان کتابوں کو ضائع کر دوں گا، جب صبح ہوئی، میں نے غلام سے کہا، زین لگاؤ، اس نے زین درست کی اور میں گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پاس گیا اور اس سے کہا، جب تم مکہ آؤ اور ذی طوی میں پہنچو، تو محمد بن ادریس

شافعی کے یہاں ٹھہرو، اس شخص نے مجھ سے کہا، کیا میں تمہارے باپ کا غلام ہوں؟ میں نے کہا نہیں! اس نے کہا، کیا میرے پاس تیرا کچھ مال ہے؟ میں نے کہا، نہیں، پھر اس نے کہا، گزشتہ رات میں نے تمہارے قیام وطعام کے تکلفات کس لیے کیے؟ میں نے کہا، وہ تکلفات کیا ہیں؟ اس نے جواب دیا، میں نے تمہارے لیے دو درہم میں کھانا اور دو درہم میں شوربا خریدا، تین درہم، عطر اور تیرے گھوڑے کے لیے دو درہم کا چارہ اور گدے اور لحاف کا کرایہ دو درہم میں نے کہا، اے غلام! اسے گیارہ درہم دے دو، پھر پوچھا کیا کچھ اور باقی رہ گیا ہے، کہا گھر کا کرایہ کہ میں نے تمہارے لیے گنجائش پیدا کی اور خود تنگی میں رہا، تو میں ان کتابوں پر اپنے دل میں رشک کرنے لگا پھر میں نے پوچھا، اس کے بعد بھی کچھ باقی رہ گیا ہے اس نے کہا جاؤ اللہ تم کو رسوا کرے اس لیے کہ میں نے تم سے زیادہ برا شخص کسی کو نہیں دیکھا۔ (آداب ومناقب الشافعی ص۳۰-۱۲۹)

امام شافعی کا قیافہ اس بدذات شخص کے حق میں درست نکلا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله" 'مومن کی فراست سے ڈرو اس لیے کہ وہ نور الٰہی سے دیکھتا ہے، یہی فراست امام شافعی کو ودیعت ہوئی تھی اور آپ اپنے نور باطن سے حقیقت حال دریافت کرلیا کرتے تھے۔

خلوص وللّٰہیت

جملہ مکارم اخلاق کی بنیاد اخلاص وللّٰہیت ہے، خلوص نیت کے بغیر ہر عمل رائیگاں اور ہر کوشش بے سود ہے، امام شافعی اخلاص وللّٰہیت کا پیکر تھے، ان کا ہر عمل دنیاوی آلودگی اور حرص وطمع سے پاک تھا، کیوں کہ وہ حق ومعرفت کی طلب میں حد درجہ مخلص تھے، حقائق تک رسائی میں صادق النظر تھے، انہوں نے صرف اللہ کے لیے علم حاصل کیا تھا اور اس کی طلب میں صراط مستقیم پر گامزن ہوئے، حقائق کی تلاش میں جو شخص مخلص ہوتا ہے، اس کے قلب میں نور معرفت ڈال دیا جاتا ہے اور اس کا نفس صافی ہو جاتا ہے اس پر اشیا کی حقیقتیں روشن ہو جاتی ہیں، وہ عقل سلیم اور فکر مستقیم کا مالک ہو جاتا ہے، پھر اس کی زبان وقلم سے صادق التعبیر اور مستقیم الفکر باتیں نکلتی ہیں اور اس کی رائے قوی اور تعبیر غلطیوں سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

امام شافعی کا یہ اخلاص پوری زندگی کے تمام ادوار میں ان کے اعمال وافکار کا احاطہ کیے ہوئے ہے، یہی اخلاص اور للّٰہیت ان کے اندر جرأت ایمانی اور قوت فیصلہ عطا کرتی ہے، جب ان کی رائے دوسرے فقہا کے افکار وخیالات سے متصادم ہوتی ہے، تو ایسی صورت میں وہ اپنی رائے کا اعلان پوری جرأت وبے باکی کے ساتھ کرتے ہیں۔

امام مالک کی علمی جلالت وعظمت اور احترام وعقیدت کے باوجود بعض مقامات پر ان کی فقہی آرا سے اختلاف کیا اور اپنے استاذ امام محمد بن حسن شیبانی سے مسائل فقہیہ میں بحث ومناظرہ کیا۔

توکل وقناعت

امام شافعی کا دامن اخلاق حرص وطمع کے غبار سے کبھی آلودہ نہیں ہوا، انہوں نے جاہ ومنصب اور زر ومال کی طمع میں عزت

نفس کا کبھی سودا نہیں کیا، وہ ایک مخلص اور بے لوث معلم اور مجتہد کی شان استغنا کے ساتھ زندگی کے لیل ونہار بسر کرتے رہے، کبھی مرفہ الحالی اور کثرت مال کی تمنا نہیں کی، جو میسر آیا، اس پر صبر وشکر کے ساتھ زندگی بسر کی، فرماتے ہیں:

ما شبعت منذ ست عشرة سنة الا مرة لان الشبع يثقل البدن و يزيل الفطنة ويجلب النوم ويضعف عن العبادة ۔ (تاریخ ذهبی ج ۲ ص ۳۲۲)

میں نے سولہ سال سے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا، اس لیے کہ پیٹ بھر کھانا بدن کو بوجھل بناتا ہے اور دل کو سخت کر دیتا ہے، ذہانت کو ختم کر دیتا ہے، نیند کو لاتا ہے، آدمی کو عبادت میں سست کر دیتا ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں، میں نے بیس سال سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا، میں نے طمع ولالچ کو کبھی پاس نہ آنے دیا اس کی بدولت مجھے ہمیشہ آرام ملا اور اسی وجہ سے ہمیشہ میری عزت ذلت سے محفوظ رہی۔

فرمایا کرتے تھے، حرص وطمع وہ برائی ہے، جس سے نفس کی دنائت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، خصوصاً ایسی حرص جس میں بخل کی آمیزش بھی ہو اسی کو ’’شح‘‘ کہتے ہیں، قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اس کی مذمت آئی ہے، خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی وجہ سے ہوتی ہے، کہ گھر کا مالک زیادہ نہیں چاہتا اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں، شوہروں کو مال سے محبت ہوتی ہے اور بیویاں لالچ سے زیادہ مانگتی ہیں، اس سے خانگی تعلقات میں کشمکش ہو جاتی ہے اور گھر روحانی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

فرماتے تھے، قرآن کی اس آیت کو اچھی طرح سمجھو، جس میں مسلمانوں کا وصف یہ ہے، کہ دوسروں کی ضرورت اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (حشر)

اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ خود ان کی ضرورت ہو اور جنہیں دل کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔

ہارون رشید نے آپ کو عہدہ قضا کی پیش کش کی، فرمایا، مجھے تو اس عہدے سے معاف ہی رکھیے۔

قناعت کے بارے میں آپ فرماتے ہیں:

من رضی بالقنوع زال عنه الخضوع ۔

جو شخص قناعت پر راضی رہے، تو اس کو دوسروں کے سامنے عاجزی کی ضرورت نہیں۔

نیز فرماتے ہیں:

افلست ثلاث مرات فكنت ابيع قليلي وكثيري حتى حلي ابنتي و زوجتي و لم ارهن

قحط ۔ (تاریخ ذہبی ج ۲ ص ۳۲۲)
میں تین مرتبہ مفلس ہوا، میں اپنا چھوٹا بڑا مال بیچ دیا کرتا تھا، یہاں تک کہ اپنی بیٹی اور بیوی کے زیورات بھی بیچ دیا کرتا تھا، مگر کبھی رہن نہیں رکھا۔

اس سے معلوم ہوا، کہ سخت سے سخت ضرورت پر بھی آپ نے قرض لینا گوارہ نہ کیا۔

سخاوت

جود وسخا کتاب اخلاق کا درخشندہ باب ہے، امام شافعی اس وصف میں امتیازی شان رکھتے تھے، وہ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیتے، فیاضی کا یہ وصف انہیں کبھی بالکل تہی دست کر دیتا، مگر ان کی پیشانی پر شکن تک نہ آتی، ابو ثور کا بیان ہے:

ما كان الشافعي يمسك الشيء من سماحته ۔ (تاریخ ذہبی ج ۲ ص ۳۲۳)

امام شافعی اپنی سخاوت وفیاضی سے کچھ نہیں روکتے تھے، یعنی سب کچھ خرچ کر دیتے۔

امام شافعی طلب کرنے والوں کو ان کی ضرورت سے زیادہ عطا فرمایا کرتے تھے، ربیع کا بیان ہے، ایک شخص نے امام شافعی کو ایک رقعہ دیا، جس میں لکھا ہوا تھا، میں بقال ہوں، میرے پاس صرف ایک درہم ہے اور میں نے شادی کی ہے، لہٰذا آپ میری امداد کریں، امام نے مجھ سے کہا، اسے تیس دینار دے دو اور میری طرف سے معذرت طلب کر لو، میں نے عرض کیا، اس کے لیے دس درہم ہی کافی ہیں، تو آپ نے فرمایا ”**ویحك اعطیه**“ تم پر افسوس ہے اسے دے دو۔ (ایضا)

اگر کوئی شخص امام شافعی کو محبت وعقیدت سے نذرانہ پیش کرتا تو اس کو رد نہیں کرتے تھے، تاہم فیاضی طبع کی بنا پر اس کو پاس رکھتے بھی نہیں تھے، بارہا ایسا ہوا کہ خلیفہ ہارون رشید کی دعوت پر دربار میں گئے، اس نے اشرفیوں کی تھیلیاں نذر کیں اور آپ واپسی میں دونوں ہاتھوں سے ان اشرفیوں کو تقسیم کرتے ہوئے چلے گئے، یہاں تک کہ جب گھر پہنچے، تو آپ کے پاس اس نذرانے میں سے ایک درہم بھی نہیں رہتا تھا۔

حمیدی کہتے ہیں:

قدم علينا الشافعي من صنعاء فضربت له الحنيمة ومعه عشرة آلاف دينار فجاء قوم فسالوه فلما قلعت الحنيمة ومامعه منها شئ ۔(ذہبی ج ۲ ص ۳۲۴)

امام شافعی جب صنعا سے مکہ مکرمہ میں آئے تو آپ کے پاس دس ہزار دینار تھے، آپ نے ایک جگہ خیمہ نصب کر کے قیام فرمایا، لوگوں کو پتہ چلا تو مختلف اطراف سے بے شمار لوگ ملاقات کے لیے حاضر ہوئے، جن میں بہت سے لوگ ضرورت مند بھی تھے، حمیدی کہتے ہیں، کہ جب آپ لوگوں کی ملاقات سے فارغ ہوئے تو آپ کے پاس ایک دنیار بھی باقی نہیں رہا تھا۔

ربیع کہتے ہیں، کہ ایک روز امام شافعی کے پاس صرف ایک دینار تھا اور ان کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اپنی ضرورت بیان کی آپ نے وہ دینار اٹھا کر اسے دے دیا، حاضرین مجلس میں سے کسی نے کہا، آپ اس شخص کو ایک یا دو درہم دے دیتے اور باقی اپنی ضروریات کے لیے رکھ لیتے فرمایا، مجھ سے کوئی شخص ایسی کسی چیز کا سوال کرے جو میرے پاس ہو اور میں اس کو نہ دوں مجھے اس سے شرم آتی ہے۔ (حلیۃ الاولیاء ج ۹ ص ۱۳۰)

مزنی کہتے ہیں، کہ میں نے امام شافعی سے بڑھ کر کوئی فیاض شخص نہیں دیکھا، ایک شب میں ان کے ساتھ مسجد سے ان کے گھر تک آیا، میں کسی شرعی مسئلہ میں ان سے گفتگو کر رہا تھا، اتنے میں ایک غلام آیا اور کہنے لگا، میرے آقا نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ تھیلی نذر کی ہے، آپ نے وہ تھیلی رکھ لی تھوڑی دیر بعد ایک شخص آیا اور اس نے کہا، میری بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے اور ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، آپ نے وہ تھیلی اٹھا کر اسے دے دی۔ (ایضاً ص ۱۳۲)

یحییٰ بن علی امام شافعی سے روایت کرتے ہیں، آپ فرماتے تھے، کہ کرم اور سخاوت دنیا اور آخرت میں انسان کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے ہیں، مگر یہ کہ وہ شخص کسی گمراہی کا شکار ہو جائے۔ العیاذ باللہ (ایضاً ص ۱۳۵)

امام شافعی کہتے ہیں، ہرثمہ میرے پاس آیا اور امیر المومنین کا سلام پیش کیا اور کہا ”قد امر لك بخمسة آلاف دينار“ امیر نے آپ کے لیے پانچ ہزار دینار کا حکم فرمایا ہے، راوی کا بیان ہے، آپ کے پاس وہ دینار لائے گئے، حجام کو بلایا، اس نے آپ کے بال بنائے تو اسے پچاس دینار دے دیے، مابقیہ کو مختلف تھیلیوں میں رکھا اور انہیں قریشیوں میں تقسیم کر دیا، یہاں تک کہ آپ کے پاس سو دینار باقی بچے۔ (تاریخ ذہبی ج ۲، ص ۳۲۴)

ربیع کا بیان ہے، ایک بار دراز گوش پر سوار ہو کر امام شافعی موچیوں کے محلے سے گزرے، آپ کا کوڑا گر گیا تو ایک لڑکے نے اسے اٹھایا اور کوڑے کو اپنی آستین سے پونچھا اور امام صاحب کو دے دیا، آپ نے اپنے غلام سے فرمایا ”اعطيه تلك الدنانير“ یہ بچے ہوئے دینار اس بچے کو دے دو، ربیع کہتے ہیں، مجھے معلوم نہیں وہ دینار نو تھے یا سات۔ (ایضاً ص ۳۲۳)

ربیع کہتے ہیں، میں نے شادی کی تو امام شافعی نے پوچھا تم نے مہر کتنا رکھا؟ میں نے عرض کیا تیس دینار جن میں چھ دینار ادا کر دیا تو انہوں نے مجھے چوبیس دینار دیے۔ (ایضاً ص ۳۲۴)

ایک شخص نے آپ کے کرتے کا تسمہ درست کیا تو اس کو ایک دینار دیا او معذرت کی کہ میرے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

جب کوئی شخص سوال کرتا اور ان کے پاس کچھ نہ ہوتا، تو ان کا چہرہ مارے شرم کے متغیر ہو جاتا۔

ایک مرتبہ حمام میں غسل کے لیے گئے تو اس کے مالک کو بہت سا مال دے دیا۔ (ترتیب المدارک ج ۱ ص ۳۹۱)

ابن عبد الحکم فرماتے ہیں ”كان الشافعي اسخى الناس بمايجد“ امام شافعی مال خرچ کرنے میں سب سے سخی تھے۔ (ذہبی ج ۲، ص ۳۲۴)

تواضع

فرماتے تھے کہ تواضع کا حکم اس لیے دیا گیا ہے، تا کہ کوئی شخص اپنی قوت و دولت کا بیجا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور غیر مستطیع لوگوں کا دل دکھے، چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، خدا نے مجھ پر وحی نازل فرمائی کہ خاکساری اختیار کروں تا کہ کوئی شخص کسی پر ظلم نہ کر سکے اور کسی کو کسی کے مقابلہ میں فخر کرنے کی جرأت نہ پیدا ہو، تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوش گوار لطافت پیدا کرنا ہے۔

آپ نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کی تواضع کے لیے ایک کنیز کو مقرر کر رکھا تھا وہ حلوا بنانے میں کمال رکھتی تھی، آپ اس سے حلوا بنوا کر اکثر و بیشتر ملنے جلنے والوں کو کھلاتے اور انتہائی محبت آمیز لہجہ سے گفتگو فرماتے، احباب کو کھلا کر بہت خوش ہوتے تھے۔

ربیع کہتے ہیں:

دخلت عليه وهو مريض فذكر ما وضع من كتبه لوددت ان الخلق تعلمه لم ينسب الى منه شئ ابدا (مناقب الشافعى للرازى ص ۹۱)

میں امام شافعی کے پاس حاضر ہوا، وہ مریض تھے، ان کی کتابوں کا ذکر کیا گیا تو فرمایا، میں چاہتا ہوں، کہ لوگ انہیں پڑھیں اور ان میں سے کچھ میری طرف منسوب نہ کیا جائے۔

حرملہ بن یحییٰ کہتے ہیں:

سمعت الشافعى يقول وددت ان كل علم اعلمه تعلمه الناس اوجر عليه ولا يحمدونى۔

(ایضاص ۹۲)

میں نے امام شافعی کو فرماتے ہوئے سنا، میں چاہتا ہوں کہ ہر علم جو میں جانتا ہوں لوگ اسے سیکھیں، اس پر مجھے اجر ملے گا اور لوگ میری تعریف نہ کریں۔

امام صاحب کے رشتہ دار ابو محمد اپنی ماں کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کرتے ہیں، محمد بن ادریس شافعی دن کے وقت سوئے ہوئے تھے، کہ ان کے پاس ہماری دایہ پہنچی، جس کے ساتھ دودھ پینے والا بچہ تھا، وہ بیٹھ کر میری عثمانی ماں سے گفتگو کرنے لگی، اثنائے گفتگو بچہ رونے لگا، دایہ کو یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں امام شافعی بیدار نہ ہو جائیں، جس کی وجہ سے اس نے اپنا ہاتھ بچہ کے منہ پر رکھ دیا اور فوراً وہاں سے نکل پڑی، مگر دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی بچہ مضطرب ہو گیا میری ماں کا بیان ہے، کہ جب امام شافعی بیدار ہوئے تو میری عثمانی ماں نے ان سے کہا، اے ابن ادریس! آج تو آپ نے ایک جان کو ہلاک کر دیا ہوتا، امام شافعی کا چہرہ سرخ ہو گیا، پوچھا، وہ کیسے؟ تو اس نے واقعہ سے باخبر کیا، اسی وقت امام شافعی نے قسم کھائی کہ وہ دیر تک قیلولہ نہیں کریں گے، جب کبھی وہ قیلولہ کرنے کا ارادہ کرتے تو چکی ان کے سر کے پاس گھمائی جاتی۔ (ایضاص ۱۰۱)

آپ انتہائی حق پسند تھے، آپ سے اکثر مناظرات ومباحثات ہوتے رہتے تھے، آپ فریق کو جواب بڑی نرمی وخندہ پیشانی سے دیتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے، میں نے کبھی کسی شخص سے اپنی بڑائی یا اظہار فضیلت کی بنا پر مباحثہ نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اعلاے کلمۃ الحق کا مقصد سامنے رہا۔

جھوٹ بولنے سے سخت نفرت تھی، فرماتے ہیں، میں نے مدت العمر کبھی جھوٹی بات نہیں کہی، نہ کسی معاملہ میں جھوٹی یا سچی قسم کھائی، اپنی تصانیف کے متعلق فرمایا کرتے تھے، خدا کرے کہ قوم ان کو سمجھے اور ان پر عمل کرے۔

احترام اکابر

علم وفضل، زہد وتقویٰ میں بلند مقام پر متمکن ہونے کے باوجود آپ اکابر علما وشیوخ واساتذہ کا حد درجہ احترام کرتے، ان کا نام ادب سے لیتے اور ان کی مدح وثنا میں رطب اللسان ہوتے۔

کسی نے آپ کے سامنے امام اعظم کا ذکر کیا، تو فرمایا، سنو! لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کی اولاد ہیں، کسی شخص نے امام سفیان بن عیینہ اور امام مالک کے بارے میں پوچھا، تو فرمایا، اگر یہ دونوں حضرات نہ ہوتے تو حجاز سے علم حدیث ناپید ہوجاتا، جب امام مالک کا کوئی قول نقل کرتے تو فرماتے ”ھذا قول استاذنا الامام مالك “ یہ ہمارے استاذ امام مالک کا قول ہے، کسی نے پوچھا، آپ نے امام مالک جیسا آدمی دیکھا ہے، فرمایا ہماری کیا حقیقت ہے، جو علم اور عمل میں ہم سے زیادہ ہیں، وہ بھی کہتے رہے، کہ امام مالک جیسا آدمی ہم نے نہیں دیکھا، صحابہ کرام کے متعلق فرماتے ہیں، ”الصحابة فوقنا فی کل علم واجتهاد وورع وعقل“ صحابہ ہم سے علم واجتہاد اور عقل وورع میں بڑھے ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ پوچھا گیا، کسی شخص نے کعبہ تک پیدل جانے کی نذر مانی اور پھر اس نذر کو وہ پورا نہ کرسکا تو کیا کرے؟ فرمایا قسم کا کفارہ ادا کرے اور ہم سے بہتر شخص حضرت عطا بن ابی رباح نے بھی یہی کہا ہے۔

عبادت وریاضت اور زہد وتقویٰ

امام شافعی علم وعمل کے جامع تھے، ان کی زندگی صلاح وتقویٰ کے زیور سے آراستہ تھی، عبادت وریاضت آپ کا محبوب مشغلہ تھا، ربیع کا بیان ہے

> **كان الشافعی قد جزأ اللیل ثلاثة اجزاء اللیل الاول یکتب والثانی یصلی والثلث الثالث ینام۔** (صفة الصفوة ج ۲ ص ۴۷۴)
>
> امام شافعی نے رات کے تین حصے کر لیے تھے، ایک حصے میں لکھتے، دوسرے حصے میں نماز پڑھتے اور تیسرے حصے میں سوجاتے۔

حافظ ذہبی فرماتے ہیں یہ روایت صحیح ہے، جو دلالت کرتی ہے اس امر پر کہ آپ کی پوری رات عبادت میں گزرتی کیوں کہ کتابت علم بھی عبادت ہے اور جسم کے حق میں نیند بھی عبادت ہے۔

ربیع فرماتے ہیں:

كان للشافعي في رمضان ستون ختمة لا يحسب منها مايقرأ في الصلاة .(ايضا)

امام شافعی رمضان میں ساٹھ ختم کرتے تھے، یہ تلاوت نماز کے علاوہ ہوتی۔

آپ کے زہد وورع کا یہ عالم تھا، کہ خلاف شرع امور سے سخت اجتناب کرتے، حارث بن سریج کہتے ہیں، میں امام شافعی کے ساتھ ہارون رشید کے خادم کے پاس گیا، اس کے مکان میں دیباج کا فرش بچھا ہوا تھا، جب امام شافعی نے چوکھٹ پر قدم رکھا اور فرش کو دیکھا تو واپس ہو گئے اور مکان میں داخل نہیں ہوئے، خادم نے آپ سے کہا، تشریف لایئے، آپ نے فرمایا "**لايحل افتراش هذا**" دیباج کا فرش بچھانا جائز نہیں ہے، یہ سن کر خادم اٹھا یہاں تک کہ دوسرے مکان میں داخل ہوا، جس میں ارمنی فرش بچھا ہوا تھا، امام شافعی اس گھر میں داخل ہوئے، پھر خادم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا، "**هذا حلال وذاك حرام هذا احسن من ذلك واكثر ثمنا منه**" یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے، یہ اس سے کہیں خوبصورت اور قیمتی ہے۔ یہ سن کر خادم مسکرایا اور خاموش ہو گیا۔ (مناقب الشافعی للرازی ص ۱۰۴)

خوش خلقی اور بے تکلفی

امام صاحب زندہ دل بزرگ اور خوش مزاج عالم تھے، اپنے طلبہ اور متعلقین کی خاطر داری و دلداری کرتے تھے اور ان کے ساتھ بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے تھے، فرمایا کرتے تھے:

اهين لهم نفسي لاكرامهم بها
ولن تكرم النفس التي لاتهينها

میں خود کو طلبہ کے سامنے ان کے احترام کرنے کی وجہ سے بے حیثیت رکھتا ہوں، اور جو خاکساری نہیں کرے گا اس کی تعظیم نہیں کی جائے گی۔

ایک مرتبہ طلبہ نے کسی بات پر اصرار کیا، تو آپ نے ان سے کہا، کہ تم لوگ ایسا نہ کرو کہ میں تم سے وہی بات کہوں جو ابن سیرین نے ایک اصرار کرنے والے سے کہی تھی:

انك ان كلفتني مالا اطيق سائك ما سرك مني من خلق .

اگر تم مجھ کو ایسی بات پر مجبور کرو گے، جس کی طاقت میں نہیں رکھتا تو جو میری عادت تم کو خوش کرتی تھی، وہی ناخوش کر دے گی۔

اپنوں سے بے تکلفی کا یہ حال تھا، کہ ان کے شاگرد رشید زعفرانی امام صاحب کا کھانا ابتدا میں اپنے گھر تیار کراتے تھے اور امام صاحب کی پسند کی کھانے کی قسمیں خادمہ کو لکھ کر دے دیتے تھے، ایک دن امام صاحب نے خادمہ کو بلا کر کھانے کی فہرست دیکھی اور اس میں اپنی پسند کے ایک کھانے کا اضافہ کر دیا، جب کھانا دستر خوان پر آیا، تو ایک نیا کھانا دیکھ کر زعفرانی کو

تعجب ہوا، کہ میری مرضی کے بغیر یہ کھانا کیسے آیا، خادمہ کو بلا کر فہرست دیکھی، تو امام صاحب کے قلم سے اس کا اضافہ تھا، اس بے تکلفی اور یگانگت سے زعفرانی کو اس قدر خوشی ہوئی کہ باندی کو اسی وقت آزاد کر دیا۔ بویطی کا قول ہے:

انما كان الشافعي ليتبع اخلاق رسول الله صلى الله عليه وسلم (ترتیب المدارک ص ۳۹۳)

شافعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کی اتباع کرتے تھے۔

ایک مرتبہ امام شافعی، یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل مکہ گئے ایک ہی جگہ یہ سب حضرات ٹھہرے، رات میں امام شافعی اور یحییٰ بن معین لیٹ گئے اور احمد بن حنبل نماز پڑھنے لگے، صبح کو امام شافعی نے کہا کہ رات میں نے مسلمانوں کے لیے دو سو مسائل حل کیے، یحییٰ بن معین سے پوچھا کہ آپ نے کیا کیا؟ انہوں نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو سو حدیثوں کو کذاب راویوں سے محفوظ کیا ہے، احمد بن حنبل سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا، کہ میں نے نوافل میں ایک ختم قرآن پڑھا ہے۔

(مناقب الامام ص ۲۸۷)

اتباع سنت

امام شافعی کی پوری زندگی اطاعت رسول اور اتباع سنت سے عبارت ہے، ان کا ہر قدم سنت رسول کے نہج پر اٹھتا، وہ حدیث و سنت کو اپنا مذہب قرار دیتے ہیں، ان کا قول ہے:

اذا صح الحديث فهو مذهبي . (تاریخ ذهبی ج ۲ ص ۳۲۱)

حرملہ کہتے ہیں:

قال الشافعي كل ماقلت فكان من رسول الله صلى الله عليه وسلم خلاف قولي مما صح فهو اولى ولا تقلدوني . (تاریخ ذهبی ج ۲ ص ۳۲۱)

امام شافعی نے کہا جو حکم بھی میں نے دیا ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے خلاف ہو تو حدیث اولیٰ ہے، میرے قول کی تقلید نہ کرو۔

ربیع کا بیان ہے:

سمعت الشافعي يقول اذا وجدتم في كتابي خلاف سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم فقولوا بها ودعوا ماقلته . (ايضا)

میں نے امام شافعی کو فرماتے ہوئے سنا، کہ جب تم میری کتاب میں سنت رسول کے خلاف دیکھو تو سنت کو اختیار کرو اور میرے قول کو چھوڑ دو۔

ایک شخص نے امام شافعی سے کہا، ابو عبداللہ! کیا ہم اس حدیث پر عمل کریں، فرمایا:

متى رويت عن رسول الله حديثا صحيحا ولم آخذ به فاشهدكم ان عقلي قد ذهب . (ایضا)

جب میں صحیح حدیث رسول روایت کروں اور اس پر عمل نہ کروں تو میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میری مت ماری گئی۔

حمیدی کہتے ہیں:

روی الشافعی یوما حدیثا فقلت اتاخذ به فقال رایتنی خرجت من کنیسة او علی زنار حتی اذا سمعت عن رسول الله صلی الله علیه وسلم حدیثا لا اقول به ۔ (ایضا)

امام شافعی نے ایک دن حدیث بیان کی، تو میں نے کہا، کیا آپ اس پر عمل کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا، کیا تم نے مجھے بت خانے سے نکلتے دیکھا یا میرے گلے میں زنار دیکھی، کہ کوئی حدیث صحیح مجھے معلوم ہو اور میں اس پر عمل نہ کروں؟

ربیع بن سلیمان مرادی کا بیان ہے، کہ ایک شخص نے امام شافعی سے کسی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا، کہ اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ یہ احادیث مروی ہیں، سائل نے عرض کیا، اے ابوعبداللہ! کیا آپ اس کے قائل بھی ہیں؟ تو یہ سن کر امام شافعی کانپ اٹھے اور ارشاد فرمایا:

یا هذا ای ارض تقلنی ای سماء تظلنی اذا رویت عن رسول الله صلی الله علیه وسلم حدیثا فلم اقل به نعم علی السمع والبصر ۔ (صفة الصفوہ ج ۲ ص ۴۷۵)

اے شخص! کون سی زمین مجھے پناہ دے گی اور کون سا آسمان مجھے اپنی حفاظت میں رکھے گا اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث روایت کروں اور اس پر فتویٰ نہ دوں۔

* * *

حکیمانہ وادیبانہ اقوال

امام صاحب علم وفضل، عقل وفہم، حدیث وفقہ، شعروادب، انساب وایام میں امتیازی مقام ومرتبہ کے مالک تھے، ان کو شعروادب اورلغت وعربیت کا خاص ذوق تھا، اشعار کہتے تھے، مگر چوں کہ علما کے لیے شاعری کو مناسب نہیں سمجھتے تھے، اس لیے دینی علوم کے مقابلہ میں اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ خود کہتے ہیں:

ولولا الشعر بالعلماء یزری
لکنت الیوم اشعر من لبید

اگر شعر علما کے لیے عیب نہ ہوتا، تو میں آج لبید بن ربیعہ سے بڑا شاعر ہوتا۔

نیز فرماتے ہیں، کہ میں نے عربی شعروادب اورلغت کو دین میں تعاون کے لیے حاصل کیا ہے، امام صاحب کے حکیمانہ اقوال میں عربی ادب وانشا کی حلاوت ہے اوران میں حکمت ودانش کے ساتھ فصاحت وبلاغت کی چاشنی بھی ہے۔

☆ ایک شخص نے ان سے کہا، کہ فرمایئے کیا حال ہے، آپ نے جواب دیا۔

کیف اصبح من یطلبه الله بالقرآن والنبی صلی الله علیه وسلم بالسنة والحفظة بما ینطق وشیطان بالمعاصی والدهر بصروفه والنفس بشهواتها والعیال بالقوت وملك الموت یقبض روحه .

اس کی حالت کیا ہوگی، جس سے اللہ تعالیٰ قرآن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنت کا، محافظ فرشتے گفتگو کا شیطان گناہوں کا، زمانہ اپنے مصائب کا، نفس اپنی خواہشوں کا، اہل وعیال روزی کا اور ملک الموت قبض روح کا مطالبہ کرتا ہے۔

☆ ایک شخص کی خوبیاں یوں بیان کی ہیں:

اما والله لقد کان یملأ العیون جمالا والآذان بیانا .

واللہ وہ شخص آنکھوں کو حسن وجمال سے اور کانوں کو فصاحت وبلاغت سے بھر دیتا ہے۔

(ترتیب المدارک ج۱ص۲۹۴)

☆تحصیل علم کے بارے میں فرمایا:

لا یطلب هذا العلم احد بالمال وعز النفس فیفلح ولکن من طلبه بذلة النفس وضیق العیش وحرمة العلم افلح ۔ (جامع بیان العلم ج۲،ص۹۸)

یہ علم دین کوئی شخص مالداری اور عزت نفس سے حاصل کر کے کامیاب نہیں ہوسکتا، البتہ جو شخص نفس کی ذلت، فقر ومحتاجی اور علم کی حرمت کے ساتھ اس کو حاصل کرے گا وہ کامیاب ہوگا۔

☆مفتی ومجتہد اگر غلطی بھی کرے گا تو حسن نیت کی وجہ سے عنداللہ ماجور ہوگا، امام صاحب کہتے ہیں۔

ومن قال بقوله یوجر. ولکنه لا یوجر علی الخطأ فی الدین لم یوجر به احد وانما یوجر لارادته الحق الذی اخطأه ۔

جو عالم فتویٰ دے گا اجر پائے گا البتہ دین میں غلطی پر اجر نہیں ملے گا، اس کی اجازت کسی کو نہیں ہے اور ثواب اس لیے ملے گا، کہ جو غلطی اس نے کی ہے اس میں اس کی نیت برحق تھی۔

☆ایک موقع پر فرمایا، کہ

الطبع ارض والعلم بذر ولایکون العلم الا بالطلب فاذا کان الطبع قابلا زکا مربع العلم وتفرعت معانیه ۔

طبیعت زمین ہے اور علم بیج ہے اور علم طلب سے ملتا ہے جب طبیعت قابل ہوگی تو علم کی کھیتی لہلہائے گی اور اس کے معانی اور مطالب شاخ درشاخ پھیلیں گے۔

☆ایک مرتبہ طرز استدلال کے بارے میں فرمایا، کہ

احسن الاحتجاج ماشرقت معانیه احکمت مبانیه وابتهجت له قلوب سامعیه ۔

بہترین استدلال وہ ہے جس کے معانی روشن اور اصول مضبوط ہوں اور سننے والوں کے دل خوش ہوجائیں۔

☆طلب حاجت کے لیے امام صاحب کی یہ دعا علما کے درمیان مجرب ہے اور اس کی قبولیت مشہور ہے:

اَللّٰهُمَّ یَا لَطِیْفُ اَسْأَلُكَ اللُّطْفَ فِیْمَا جَرَتْ بِهِ الْمَقَادِیْرُ ۔

☆اس دعا کے پڑھنے سے گم شدہ چیز مل جاتی ہے۔

استعینوا علی الکلام بالصمت وعلی الاستنباط بالفکر ۔

گفتگو کے لیے خاموشی سے مدد حاصل کرو اور استنباط مسائل کے لیے غور وفکر سے کام لو۔

☆ **من وعظ اخاه سرا فقد نصحه وزانه ومن وعظ علانیة فقد فضحه وخانه ۔**

جو آدمی اپنے بھائی کو تنہائی میں نصیحت کرتا ہے، تو وہ اس کے ساتھ خیر خواہی اور اصلاح کرتا ہے، اور جو اعلانیہ

نصیحت کرتا ہے، تو وہ اس کو رسوا کرتا ہے اور اس کے ساتھ خیانت کرتا ہے۔

☆ **اظلم الناس لنفسه من تواضع من لا يكرمه ورغب في مودة من لا ينفعه وقبل مدح من لا يعرفه .**

اپنے آپ پر سب سے بڑا ظلم کرنے والا شخص وہ ہے جو تواضع سے پیش آتا ہے، اس آدمی کے ساتھ جو اس کی عزت نہیں کرتا اور محبت کرنا چاہتا ہے اس آدمی سے جو اس کے لیے فائدہ مند نہیں ہے، اور ہر اس آدمی کی تعریف قبول کر لیتا ہے، جس کو یہ نہیں جانتا۔

☆ **من غلبت عليه شدة الشهوة لحب الدنيا لزمته العبودية لاهلها .**

جس آدمی پر دنیا کی محبت میں خواہش نفس غالب آجائے تو اس کو دنیا داروں کی غلامی ضروری ہو جاتی ہے۔

☆ **من رضي بالقنوع زال عنه الخضوع .**

جو شخص قناعت پر راضی رہے گا تو اس کو دوسروں کے سامنے عاجزی کی ضرورت نہیں۔

☆ **راس التعبد تقليل الطعام .**

عبادت کی اصل کم کھانا ہے۔

☆ **اعلم ان من صدق الله نجا ومن اشفق على دينه سلم من الردى ومن زهد في الدنيا قرت عيناه بما يراه من ثواب الله تعالیٰ غدا .**

جانو! جو شخص اللہ تعالیٰ سے راست بازی کا معاملہ کرتا ہے، وہ نجات پاتا ہے اور جو اپنے دین کے بارے میں ڈرتا ہے، وہ ہلاکت سے محفوظ رہتا ہے اور جو دنیا میں زہد (بے رغبتی) اختیار کرتا ہے، کل (قیامت میں) اس کی دونوں آنکھیں اللہ تعالیٰ کے ثواب کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوں گی۔

☆ **من كان فيه ثلاث خصال فقد استكمل الايمان من امر بالمعروف وائتمر ونهى عن المنكر وانتهى حافظ على حدود الله .**

جس آدمی میں تین باتیں ہوں گی، یقیناً اس کا ایمان کامل ہو جائیگا (۱) نیکی کا حکم دے اور خود عمل کرے (۲) برائی سے روکے اور خود بھی رکے (۳) اور اللہ تعالیٰ کے حدود کی حفاظت کرے، (احکام کی پابندی کرے)

☆ **كن في الدنيا زاهدا وفي الآخرة راغبا واصدق الله تعالیٰ في جميع امورك تنج في الناجين .**

دنیا سے زہد اور آخرت کی رغبت کرنے والا بن جا اور اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ راست بازی

اختیار کر، نجات پانے والوں کے ساتھ تجھے نجات ملے گی۔

☆ **من اطاع الله تعالىٰ بالعلم نفعه سره .**

جو کوئی علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا اس کے باطن کو نفع دے گا۔

☆ **مامن احد الا و له محب و مبغض فاذا كان كذالك فكن مع اهل الطاعة لله عز وجل .**

ہر ایک کے لیے ایک دوست ہے اور ہر ایک کے لیے دشمن اور جب ایسا ہے تو تم اللہ بزرگ و برتر کی اطاعت کرنے والوں کے ساتھ رہو۔

☆ **التمكن درجة الانبياء ولايكون التمكن الا بعد المحنة فاذا امتحن صبر واذا صبر مكن .**

تمکین انبیا کا درجہ ہے تمکین کا درجہ آزمائش کے بعد حاصل ہوتا ہے، جب (بندہ) کو آزمایا جاتا ہے، تو صبر کرتا ہے اور جب صبر کرتا ہے تو تمکین کے درجہ پر فائز ہوتا ہے۔

☆ **اظلم الظالمين لنفسه الذى اذاارتفع جفا اقاربه وانكر معارفه واستخف بالاعراف وتكبر على ذوى الفضل .**

اپنے نفس پر سب سے بڑا ظالم وہ شخص ہے، جو بلندی پر پہنچتا ہے، تو اپنے رشتہ داروں پر ظلم کرتا ہے احسانات کا انکار کرتا ہے اور شریف لوگوں کو ہلکا سمجھتا ہے، صاحب فضیلت حضرات پر تکبر کرتا ہے۔

☆ **كيف يزهد فى الدنيا من لايعرف قدر الآخرة و كيف يخلص من الدنيا من لا يحلو من الطمع الكاذب و كيف يسلم من لا يسلم الناس من لسانه ويده و كيف ينال الحكمة من لا يريد بقوله وجه الله عزوجل .**

وہ شخص دنیا سے کیسے بے رغبت رہے گا، جو آخرت کی قدر نہیں جانتا اور وہ شخص دنیا سے کیسے چھٹکارا پائے گا جو جھوٹی حرص سے خالی نہیں ہوتا اور وہ شخص کیسے سلامت رہے گا جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ سلامت نہ رہیں، وہ آدمی حکمت کو کیسے پا سکے گا، جس کا مقصد اپنی گفتگو سے اللہ بزرگ و برتر کی رضامندی نہ ہو۔

☆ **من احب ان يفتح الله على قلبه نور الحكمة فعليه بالخلوة وقلة الاكل وترك مخالطة السفهاء وبغض العلماء الذين ليس معهم دين ولا ادب .**

جو یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نور حکمت اس کے دل پر کھولے وہ خلوت اختیار کرے، کم کھائے اور احمقوں کی صحبت ترک کر دے اور ان علما سے احتیاط کرے جن کے پاس نہ ادب ہے نہ تہذیب ہے۔

تصانیف

امام شافعی ان اکابر محدثین ومجتہدین میں سے ہیں، جنہوں نے اپنے رشحات قلم کے ذریعہ اپنے علم وفضل، افکاروآرا، فقہ وفتاوی دنیاے علم وفضل کے لیے یادگار چھوڑے۔

بچپن میں آپ نے ایک کتاب ''الرسالہ'' لکھی، جوآپ کی مشہور ومعروف کتاب ہے۔

ابن ندیم نے لکھا ہے، کہ فقہ میں امام صاحب کی ایک مبسوط کتاب ہے، جس کو ان سے ربیع بن سلیمان مرادی اور زعفرانی نے روایت کیا ہے، یہ کتاب فلاں فلاں کتابوں پر مشتمل ہے، پھر تقریباً ایک سو چار کتب کے نام درج کیے ہیں۔

(الفہرست ص ۲۹۵)

امام صاحب کی ان کتابوں کے مجموعہ کا نام ''کتاب الام'' ہے

اس کے علاوہ مسند شافعی وغیرہ ہیں۔

آپ کے حسن تصنیف کی شہادت بڑے بڑے ادبا اور صاحب طرز انشاپرداز دیتے تھے، جس کی آپ کو مطلق ضرورت نہ تھی، آپ کا مقام ومرتبہ اس سے بہت بلند ہے، جاحظ نے لکھا ہے:

نظرت فی کتب الشافعی فاذا در منظوم لم ار احسن تالیفا منه ۔(تهذیب التهذیب ج۹ ص ۲۹)

میں نے شافعی کی کتابیں دیکھی ہیں، وہ پروئے ہوئے موتی ہیں، ان سے بہتر مصنف میں نے نہیں دیکھا۔

امام شافعی نے اپنے علوم وفنون کی امانت جس فراخ دلی سے اپنے تلامذہ کو تفویض کی اسی طرح اپنے گراں بہا علمی تجربات اور فنی افکار، فقہی آرا کو کتابوں میں مرتب فرمادیا، آپ کا تصنیفی ذوق عنفوان شباب ہی سے پروان چڑھنے لگا تھا، جو اخیر عمر تک باقی رہا، اور آپ کے قلم سے بیش بہا علمی وفنی جواہر پارے عالم شہود میں آئے، آپ کی کثرت تصانیف پر لوگوں کو بڑی حیرت ہوا کرتی تھی۔

اسحاق بن راہویہ سے پوچھا گیا، کہ امام شافعی نے اتنی زیادہ کتابیں کیسے لکھیں، جب کہ ان کی عمر مختصر تھی، آپ نے فرمایا

جمع الله تعالیٰ له عقله لقلة عمره (تهذیب التهذیب ج۹ ص ۲۶)

قلت عمر کے باوجود اللہ نے ان پر عقل وعلم کو جمع کردیا تھا۔

آپ کی چند کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب الام:۔ یہ کتاب امام شافعی کے مذہب جدید کی اہم تصنیف ہے، جو پندرہ جلدوں میں ہے، جس میں شامل رسائل کی تعداد مجموعی طور پر ایک سو پچاس ہے اس کو امام شافعی کے شاگرد رشید ربیع بن سلیمان مرادی اور زعفرانی نے روایت کیا ہے۔

(۲) الرسالہ:۔ یہ کتاب اصول فقہ میں ہے، جسے آپ نے امام جرح وتعدیل عبدالرحمٰن بن مہدی کی خواہش پر لکھا، عبدالرحمٰن بن مہدی نے جب اس کو پڑھا تو بے ساختہ فرمایا:

ما ظننت ان اللہ خلق مثل ھٰذا الرجل ۔(مراۃ الجنان ج ۲ ص ۱۸)

(۳) مسند شافعی:۔ یہ کتاب احادیث مرفوعہ پر مشتمل ہے، جن کو خود امام شافعی اپنے تلامذہ کے روبرو سند کے ساتھ روایت کرتے تھے، یہ امام صاحب کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ کتاب الام اور مبسوط میں جو احادیث ربیع بن سلیمان اور مزنی سے مروی ہیں ابوجعفر محمد بن مطر نے ان کا انتخاب مسند شافعی کے نام سے کر دیا ہے۔

(۴) کتاب الحجہ:۔ امام صاحب کے قول قدیم کی کتابوں میں مشہور ہے، جو بغداد کے آخری قیام کے زمانہ میں تصنیف کی تھی۔

(۵) کتاب احکام القرآن (۶) اختلاف الحدیث (۷) ابطال الاستحسان (۸) کتاب اجماع العلم (۹) کتاب القیاس (۱۰) کتاب المبسوط (۱۱) مسند امام شافعی (۱۲) اختلاف مالک والشافعی (۱۳) کتاب العلل وغیرہ۔

* * *

مرض الموت اور وفات

ایک دن فیتان بن ابی السمح مالکی مصری سے آپ کا مباحثہ ہوا، فیتان نے خلاف تہذیب گفتگو شروع کی اور گستاخی کی، معاملہ امیر کی عدالت تک پہنچا، امیر مصر نے فیصلہ کیا اور فیتان کو سزا دے دی، فیتان موقع کی تاک میں تھا، ایک روز اندھیرے میں رات کے وقت موقع پا کر سر پر ایک بڑی آہنی کنجی دے ماری، جس کی وجہ سے سر پھٹ گیا، زیادہ خون نکل جانے کی وجہ سے صاحب فراش ہو گئے، مرض الموت کا سلسلہ شروع ہوا، امام شافعی کی وجہ سے مصر میں فقہ مالکی کے متبعین کا دائرہ تیزی کے ساتھ سمٹ رہا تھا، جس کی بنا پر مالکی علما آپ سے بغض وعناد رکھنے لگے، چنانچہ اشہب بن عبدالعزیز فقیہ مالکیہ کا مستقل کام یہ تھا، کہ وہ آپ کے لیے بددعا کرتے رہے، محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم کہتے ہیں، میں نے امام شافعی سے عرض کیا، میں نے خود دیکھا ہے، کہ اشہب سجدہ میں پڑا ہوا یہ دعا کر رہا ہے:

اللهم امت الشافعي والا يذهب علم مالك

اے اللہ! امام شافعی کو موت دے دے ورنہ امام مالک کا مذہب ختم ہو جائے گا۔

حرملہ بن یحییٰ کہتے ہیں، اس پر امام شافعی نے یہ اشعار پڑھے۔

تمنی رجال ان اموت وان امت　　فتلك سبيل لست فيها باوحد
فقل للذی يبغی خلاف الذی مضی　　تهيا لاخری مثلها فكان قد
وقد علموا لو ينفع العلم عندهم　　لئن مت ما الداعی علی بمخلد

مخالف لوگ چاہتے ہیں، کہ میں مر جاؤں اور اگر میں مر جاؤں، تو یہ ایسا راستہ ہے، کہ میں اس راہ میں تنہا نہیں ہوں۔ تو اس آدمی سے کہہ دو جو تقدیر کے خلاف چاہتا ہے، کہ اس کے مثل کوئی دوسرا راستہ تلاش کرو۔ اگر علم ان کو نفع دے سکتا ہے، تو وہ جانتے ہیں، کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے خلاف یہ دعا کرنے والا بھی ہمیشہ نہیں رہے گا۔

چنانچہ یہ بھی منقول ہے، کہ امام شافعی کے انتقال کے اٹھارہ دن بعد اشہب کا بھی انتقال ہو گیا۔

ربیع بن سلیمان مرادی فرماتے ہیں، میں نے امام شافعی کی وفات سے پندرہ روز قبل خواب دیکھا، کہ حضرت آدم علیہ

السلام کی موت ہوئی، اور جنازہ اٹھائے جانے کی تیاری تھی، صبح کو بعض اصحاب سے اس کی تعبیر دریافت کی تو جواب ملا کہ یہ دنیا کے بہت بڑے عالم کی موت کی خبر ہے، تھوڑے ہی دن گزرے تھے، کہ امام شافعی نے وفات پائی۔

۳۰؍رجب یوم پنج شنبہ ۲۰۴ھ کو عصر کے وقت آپ کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی، امام مزنی اس وقت پاس بیٹھے تھے، انہوں نے عرض کیا:

كيف امسيت يا استاذ الاستاذين ؟

اے استاذوں کے استاذ! کیسا مزاج ہے؟

فرمانے لگے:

اصبحت من الدنيا راحلا والاخوان مفارقا ولكأس المنية شاربا وبسوء افعالي ملاقيا وعلى الله واردا ولا والله لاادرى ان روحي يصير الى الجنة فاهنيها او الى النار فاعزيها ۔

(صفۃ الصفوۃ ج۲ ص ۴۷۶)

آج میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں اور اپنے بھائیوں سے جدا ہونے والا ہوں اور اپنے برے اعمال کی سزا پانے والا ہوں اور خدا کی بارگاہ میں پیش ہونے والا ہوں، موت کا جام پینے والا ہوں، خدا کی قسم مجھے یہ خبر نہیں کہ آیا میری روح جنت میں جائے گی اور میں اسے مبارک باد دوں یا دوزخ میں جائے گی جہاں مجھے اس کی تعزیت کرنی پڑے گی۔

اس کے بعد آپ نے مغرب کی نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر لیٹے تھے، کہ نزع کی کیفیت شروع ہوگئی، آپ نے فرمایا، سنو مصر میں جو مشہور عابد ادریس ہیں، ان سے جا کر کہہ دو کہ میری مغفرت کی دعا کریں، پھر آپ نے بالحاح وزاری خدا کی بارگاہ میں یہ دعا کی:

اليك اله الخلق ارفع رغبتي　　ان كنت يا ذالمن والجود مجرما
ولما قساقلبي وضاقت مذاهبي　　جعلت الرجامني بعفوك سلما
وما زلت ذاعفو عن الذنب　　ولو لاك ما يقوى با بليس عابد
فكيف وقد اغوى صفيك آدما　　فان تعف عني تعف عن متمرد
ظلوم عشوم لا يزائل ماشما　　وان تنقم مني فلست بآئس
ولو دخلت نفسي بجر مي جهنما　　فجرمي عظيم من قديم وحادث
و عفوك يا ذا لعفوا على واجسما　　تعاظمني ذنوبي فلما قرنته
بعفوك ربي كان عفوك اعظما

اے رحم وکرم فرمانے والے! میں اگرچہ گنہ گار ہوں، لیکن تیری بارگاہ میں بھیک مانگنے حاضر ہوا ہوں، جب میرا دل سخت ہو گیا اور میرے سب راستے بند ہو گئے تو میں نے اپنی امید کو تیرے آستانہ کرم تک پہنچنے کا زینہ بنایا، تو نے لغزشوں اور گناہوں کو ہمیشہ ہی معاف فرمایا ہے اور تو اپنے کرم وانعام کی وجہ سے ہمیشہ درگزر فرماتا رہے گا، اگر تیرا کرم شریک حال نہ ہوتا تو کوئی عابد ومتقی شیطان کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکتا اور کیوں کر ٹھہرتا، جب کہ اس نے تیرے منتخب بندے آدم علیہ السلام تک کو لغزش دیدی، الٰہی اگر تو میری لغزشیں معاف فرمادے، تو تو ایک بڑے سرکش ظالم ونافرمان کو معاف فرمائے گا، جو رات دن گناہ کرتا رہتا ہے، اگر تو انتقام لے پھر بھی میں تجھ سے ناامید نہیں ہو سکتا، خواہ میں اپنے اعمال کی وجہ سے جہنم میں ہی کیوں نہ داخل کیا جاؤں، میری خطائیں شروع سے آخر تک بہت بڑی ہیں، لیکن اے غفور ورحیم! تیرا کرم وبخشش تو ان سے کہیں زیادہ ہے، میں نے اپنے گناہوں کو بڑا سمجھ رکھا تھا، مگر جب تیرے کرم وبخشش سے مقابلہ کیا تو اے میرے رب! تیرا کرم ہی بہت بڑا ہے۔

پھر عشا کی نماز پڑھی، اور نماز سے فارغ ہو کر لیٹے ہی تھے، روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر خلد بریں پہنچ گئی۔

ربیع بن سلیمان کہتے ہیں:

توفی الشافعی لیلة الجمعة بعد العشاء الآخرة آخر یوم من رجب ودفناه یوم الجمعة فانصرفنا فراینا هلال شعبان سنة اربع ومأتین ۔(صفۃ الصفوۃ ج۲ ص۴۷۶)

امام شافعی کا انتقال رجب کی آخری تاریخ شب جمعہ عشا کے بعد ہوا، ہم نے جمعہ کے دن انہیں دفن کیا، جب ہم واپس ہوئے تو ہم نے شعبان ۲۰۴ھ کا چاند دیکھا۔

تجہیز وتدفین

انتقال کے بعد امام مزنی نے آپ کو غسل دیا، جنازہ شب جمعہ ہی کو تیار کر لیا گیا تھا، لیکن اتنے بڑے عظیم المرتبت وامام الائمہ کی موت کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، اس لیے جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ سب سے پہلے آپ کے جنازے پر حضرت سیدہ نفیسہ بن حسن بن زید بن حسن بن علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے نماز پڑھی، سری بن عبدالحکم نے نماز جنازہ پڑھائی اور ہزاروں سوگواروں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔

آپ کو قاہرہ کے باہر قبرستان "قرافۃ الصغری" میں جو جبل مقطم کے پاس ہے، دفن کیا گیا، اس وقت مزار پاک جدید قاہرہ کے جنوب میں اور قدیم قاہرہ کے مشرق میں تھوڑے فاصلے پر ایک گنبد میں واقع ہے، صبح سے شام تک ہزاروں عقیدت مند زائرین زیارت اور فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔

انتقال کے کچھ دنوں بعد خیال پیدا ہوا، کہ ان کی نعش کو بغداد منتقل کیا جائے، قبر کھودی جا رہی تھی کہ اندر سے اتنی تیز

خوشبو مہکنے لگی کہ لوگوں کے حواس باختہ ہو گئے اور ارادہ ترک کر دیا گیا۔

وفات کے بعد مبشرات

ربیع بن سلیمان فرماتے ہیں، میں نے امام شافعی کو خواب میں دیکھا، عرض کیا، فرمائیے کیا ہوا، جواب دیا:

اجلسنی علی کرسی من ذهب ونثر علی اللؤلو الرطب۔ (صفۃ الصفوۃ ج۲ ص۴۷۶)

ربیع! خدا نے مجھے اپنے انعام سے بخش دیا، سونے کی کرسی پر بٹھا کر فرشتوں سے مجھ پر عمدہ موتی نثار کرائے۔

محمد بن مسلم کہتے ہیں، کہ جب امام ابوزرعہ کا انتقال ہوا، تو میں نے خواب میں ان کو دیکھا، پوچھا، کیسے خدا نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا، فرمایا، کہ ابوعبداللہ اور ابوعبداللہ اور ابوعبداللہ کے ساتھ رکھو میں نے پوچھا یہ کون ہیں، کہا پہلے ابوعبداللہ امام مالک دوسرے ابوعبداللہ امام شافعی، تیسرے ابوعبداللہ احمد بن حنبل۔ (توالی التاسیس)

ابو بیان اصفہانی کا بیان ہے:

رایت النبی صلی اللہ علیه وسلم فی النوم فقلت یارسول اللہ محمد بن ادریس الشافعی ابن عمك هل نفعته بشیٔ او خصصته بشیٔ فقال نعم سألت اللہ ان لایحاسبه فقلت بما ذا یارسول اللہ قال انه كان یصلی علی صلوة لم یصل بمثل تلك الصلوٰة احد فقلت وماتلك الصلوة یارسول اللہ قال كان یصلی علی اللهم صل علی محمد كلما ذكره الذاكرون وصل علی محمد كلما غفل عنه الغافلون۔ (صفۃ الصفوۃ ج۲ ص۴۷۵)

میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا یارسول اللہ! آپ کے ابن عم محمد بن ادریس شافعی کو آپ نے کچھ نفع پہنچایا؟، یا ان کو کوئی خصوصیت عطا کی؟، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں! میں نے خدا کی بارگاہ میں عرض کیا، کہ ان سے حساب نہ لے، میں نے عرض کیا، کس وجہ سے یارسول اللہ؟ فرمایا شافعی مجھ پر ایسا درود پڑھتے تھے، جو ان سے پہلے کسی نے نہیں پڑھا، میں نے عرض کی، یارسول اللہ وہ درود کیا ہے، فرمایا وہ یہ درود پڑھا کرتے تھے: **اللهم صل علی محمد كلما ذكره الذاكرون وصل علی محمد كلما غفل عنه الغافلون۔**

مرثیے

آپ کی وفات پر تقریباً ستر افراد نے مرثیے کہے ہیں، مشہور و ممتاز نحوی ابن درید کا مرثیہ بے حد مشہور ہے، جس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

الم تر آثار ابن ادریس بعده　　　دلائلها فی المشكلات لوامع

معالم یفنی الدھر وھی خالد　　وتنخفض الاعلام وھی روافع
مناھج فیھا للھدی متصرف　　موارد فیھا للرشاد شوارع
ظواھرھا حکم ومستنبطاتھا　　لما حکم التفریق منہ جوامع

کیا تم نے محمد بن ادریس کی وفات کے بعد ان کی نشانیاں نہیں دیکھیں، ان کی دلیلیں مشکل سے مشکل مسئلوں کے حل میں چمک رہی ہیں۔ یہ ان کی ایسی یادگاریں ہیں، کہ دنیا کے فنا ہونے تک ہمیشہ باقی رہیں گی، جھنڈے سرنگوں ہو جائیں گے اور یہ بلند رہیں گے۔ وہ ایسے راستے ہیں، جن پر ہدایت کی حکمرانی ہے اور ایسی گھاٹی ہے، جس میں راست روی ہی کا راستہ ہے۔ ان کے احکام ظاہر ہیں اور ان کے استنباط جامع ہیں۔

ربیع بن سلیمان مرادی فرماتے ہیں، ہم امام شافعی کی موت کے بعد ان کے حلقہ درس میں کچھ دیر کے لیے بیٹھے تو ایک اعرابی ہمارے پاس آیا، اس نے ہم سے سلام کیا پھر کہا:

این قمر ھذہ الحلقہ وشمسھا ؟

اس مجلس کا چاند اور سورج کہاں ہے؟ ہم نے کہا، ان کا وصال ہو گیا تو وہ خوب رویا پھر کہا:

رحمہ اللہ وغفرلہ فلقد کان یفتح ببیانہ منغلق الحجۃ وینسد علی خصمہ واضح المحجۃ ویغسل من العار وجوھا مسودۃ ویوسع بالرای ابوابا منسدا ثم انصرف ۔

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۴۷۶)

خدا ان پر رحم فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے، وہ مغلق اور پیچیدہ حجت کو اپنے بیان سے واضح فرماتے، واضح حجت کے ذریعے اپنے خصم پر غالب آتے، سیاہ چہروں سے عار دھوتے تھے اور اپنی رائے سے بند دروازوں کو کھول دیتے، پھر وہ شخص چلا گیا۔

اولاد واحفاد

امام شافعی کی حرم محترم حمدہ حضرت عثمان کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے، حمدہ بنت نافع بن عیینہ بن عمر بن عثمان بن عفان۔

ایک باندی تھی، جس کا نام دنانیر تھا۔

امام صاحب کی اولاد کے بارے میں ابن حزم نے لکھا ہے، کہ آپ کے دو صاحبزادے تھے، ایک ابوالحسن محمد جو قنسرین اور عواصم کے قاضی تھے، انہوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، دوسرے عثمان تھے، جنہوں نے امام احمد بن حنبل سے علم حاصل کیا، ان سے بھی اولاد کا سلسلہ نہیں چلا۔ (جمہرۃ انساب العرب ص ۷۳)

اور سبکی نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے، کہ امام صاحب کے دو صاحبزادے تھے، ایک قاضی ابو عثمان محمد اور

دوسرے ابوالحسن محمد، ابوعثمان سب سے بڑے تھے، امام صاحب کی وفات کے وقت مکہ میں تھے، انہوں نے اپنے والد امام صاحب، سفیان بن عیینہ، عبدالرزاق، احمد بن حنبل سے روایت کی ہے، جزیرہ وغیرہ کے قاضی تھے، حلب میں بھی عہدہ قضا پر رہے، ان کی تین اولاد تھی؛ عباس، ابوالحسن جن کا بچپن میں انتقال ہوا اور ایک لڑکی فاطمہ جس سے اولاد کا سلسلہ نہیں چلا، ابوعثمان کا انتقال جزیرہ میں ۲۴۰ھ میں ہوا، دوسرے صاحب زادے ابوالحسن محمد دنانیر نامی باندی کے بطن سے تھے، وہ بچپن میں اپنے والد یعنی امام صاحب کے ساتھ مصر آگئے تھے وہیں شعبان ۲۳۱ھ میں انتقال کیا۔

(طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج۲ص۷۱تا۷۳)

امام صاحب کی ایک صاحبزادی زینت ہیں، جن کے بطن سے ابومحمد احمد بن محمد بن عبداللہ بن عباس بن عثمان بن شافع پیدا ہوئے، اپنے والد کے ذریعہ اپنے نانا امام شافعی سے روایت کی تھی، کہتے ہیں، کہ آل شافع میں امام صاحب کے بعد ان کے مثل کوئی عالم پیدا نہیں ہوا، ان کو اپنے نانا کی برکت حاصل تھی۔ (ایضاً ج۲ص۱۸۶)

* * *

حضرت امام احمد بن حنبل

﴿رضی اللہ تعالیٰ عنہ﴾

نقوشِ حیات

خاندان

امام احمد بن حنبل خالص عرب تھے، ان کا نسبی تعلق عرب کے مشہور قبیلہ شیبان سے تھا، جو نزار بن معد بن عدنان کے واسطہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرہ نسب سے ملتا ہے، یہ قبیلہ اپنی بہادری و جانبازی، شجاعت و بسالت کے لیے پورے عرب میں مشہور تھا، عہد جاہلیت اور عہد اسلام دونوں میں کثرت اور عظمت و وقار کے لحاظ سے نمایاں رہا، بصرہ اور اس کے صحراؤں میں قبیلہ شیبان کے پڑاؤ تھے، دور جاہلیت میں ان لوگوں کی سکونت عراق کے قرب و جوار میں تھی، حضرت عمر بن خطاب کے حکم سے عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے ۱۴ھ میں شہر بصرہ آباد کیا جو ابتدا میں فوجی چھاؤنی کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں مختلف عرب قبائل بکثرت آباد ہوئے، ان میں بنی شیبان بن ذہل کی ایک شاخ مازن بھی تھی، جس سے امام احمد بن حنبل کا نسبی و خاندانی تعلق تھا، روایت ہے کہ امام احمد بن حنبل جب بصرہ تشریف لاتے تھے، تو قبیلہ مازن کی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، حضرت امام سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا، یہ میری آبائی مسجد ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل کا خاندان (باپ اور ماں دونوں طرف سے) اس شہر میں آ کر بس گیا تھا، آپ کے جد اعلیٰ عبدالملک بن سوادہ بن ہند کا شمار بنو شیبان کے سربرآوردہ لوگوں میں ہوتا تھا، عرب قبائل ان کے پاس آ کر ٹھہرتے تھے اور وہ بڑی سیر چشمی اور اولوالعزمی سے فرائض میزبانی انجام دیتے تھے:

> **كانت اسرة احمد واسرة امه تنزل بتلك المدينة وباوديتها اذكان جدهما عبدالملك بن سوادة بن هند من وجوه بني شيبان ينزل عليه قبائل العرب فيضيفهم ۔** (ابن حنبل ص ۱۶)

حضرت امام احمد کا خاندان اگرچہ بصرہ میں سکونت گزیں ہو گیا تھا، مگر اس کے افراد دوسرے بلاد و امصار میں بھی منتقل ہوتے رہے، چنانچہ آپ کے دادا حنبل بن ہلال نے خراسان میں بود و باش اختیار کر لی اور اپنی شجاعت اور سیاسی بصیرت کی بنا پر ترقی کرتے کرتے امویوں کے عہد میں سرخس کے گورنر ہو گئے، جب عباسی تحریک سرگرم ہوئی، تو آپ اس کے پرجوش حامی بن گئے جس کی بنا پر آپ کو اذیتیں جھیلنی پڑیں:

> **وكان واليا على سرخس في العهد الاموى ولما لاحت عاون دعاتها وانضم الى صفوفهم حتى اوذى في هذاالسبيل ۔** (مناقب لابن الجوزی ص ۲۱)

امام احمد کے والد بزرگوار محمد بن حنبل سپاہی پیشہ انسان تھے، عربوں کے نزدیک صاحب سیف وتبر ہونا فضیلت کی بات تھی، ابن جوزی کہتے ہیں:

کان ابوہ فی زی الغزاۃ

آپ کے والد سپاہانہ لباس میں ملبوس رہتے۔

اصمعی کہتے ہیں:

ابوعبداللہ احمد بن حنبل کان ابوہ قائدا (مناقب لابن الجوزی ص ۴۲)

ابوعبداللہ احمد بن حنبل کے والد فوج میں کمانڈر تھے۔

ابواحمد سپاہیانہ لباس میں ہوں یا فوجی دستہ کے کمانڈر دونوں صورتوں میں ان کا عسکری ہونا ثابت ہوتا ہے، جب کہ شرفائے عرب صنعت وحرفت اور کاشتکاری کی بہ نسبت سپاہیانہ زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔

عباسی تحریک سے امام احمد کے خاندان کا گہرا لگاؤ تھا، مگر جب عباسیوں کا اقتدار قائم ہوا، تو اس خاندان کو گورنری یا حکومت کے اونچے عہدے نہیں ملے، تاہم اس خاندان کا رابطہ عباسی خلفا سے قائم رہا، جب عباسی خلیفہ بغداد سے باہر ہوتے تو آپ کے چچا بغداد کے حالات عمال کو بتاتے، تاکہ وہ خلیفہ تک پہنچا دیں، لیکن امام احمد ان باتوں میں ہرگز دلچسپی نہ لیتے، ایک بار ایسا ہوا کہ خلیفہ مقام رقہ میں مقیم تھا، داؤد بن بسطام نے امام احمد کے چچا کی طرف مخاطب ہو کر کہا، ہمیں آج کی خبریں نہیں ملیں، حالاں کہ میری خواہش ہے کہ انہیں امیر المومنین کی خدمت لکھ بھیجوں، امام احمد کے چچا نے یہ سن کر کہا، خبریں تو میں نے اپنے بھتیجے احمد کے ہاتھ آپ کے پاس بھیج دی تھیں، اب امام احمد داؤد بن بسطام کی خدمت میں حاضر کیے گئے، وہ ابھی بالکل نوعمر اور کم سن تھے، چچا نے پوچھا، کیا میں نے تمہارے ہاتھ خبریں نہیں بھیجی تھیں، کہ والی تک پہنچا دو، امام احمد نے جواب دیا، ہاں! دی تو تھیں، چچا نے پوچھا، پھر تم نے وہ خبریں پہنچائی کیوں نہیں؟، امام احمد نے فوراً کہا، میں نے انہیں پانی میں پھینک دیا تھا، والی یہ سن کر افسوس کرنے لگا، اس نے کہا:

ھذا غلام یتورع فکیف نحن (مناقب لابن الجوزی ص ۴۵)

یہ صاحب ورع لڑکا ہے، ہم اس کے ساتھ کوئی سختی نہیں کر سکتے۔

امام احمد خلفا، امرا سے کسی قسم کے تعلق کو بچپن ہی سے ناپسند کرتے تھے اور یہ شان استغنا دم آخر تک قائم رہی۔

امام ابن حنبل کے نانا کا شمار بنو شیبان کے ممتاز لوگوں میں ہوتا تھا، وہ نہایت کریم الطبع سخی اور فراخ حوصلہ بزرگ تھے، عربوں کے لیے ان کے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا، عرب قبائل ان کے مہمان ہوا کرتے تھے، وہ نہایت خوشی اور سیر چشمی کے ساتھ ان کی ضیافت کیا کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبل کو ددھیال اور ننھیال سے شجاعت، حق پرستی، حق گوئی اور خصائل حمیدہ وراثت میں حاصل ہوئے تھے،

عزت نفس، قوت وعزم، صبر وتحمل، مکارہ اور مصائب کو انگیز کرنے کی عادت انہیں اپنے خاندان سے ملی تھی، ان کا ایمان راسخ اور قوی تھا، جب بھی آفات وابتلا کا نزول ہوتا تو ان کی یہ خصوصیتیں مزید ابھر جاتی تھیں۔

نام ونسب

آپ کی کنیت ابو عبداللہ، نام احمد، سلسلہ نسب یہ ہے:

احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن اسد بن ادریس بن عبداللہ بن عبداللہ بن انس بن عوف بن قاسط بن مازن بن شیبان بن ذہل بن ثعلبہ بن عکابہ صعب بن علی بن بکر بن وائل بن قاسط بن ہنب بن افصی بن دعمی بن جدیلہ بن اسد بن ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان الشیبانی المروزی الاصیل۔ (وفیات الاعیان ج ۱ ص ۴۰)

ابن جوزی نے مناقب میں عدنان کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام تک سلسلہ نسب اس طرح پہنچایا ہے:

عدنان بن اد بن ادد بن الھمیسع بن حمل بن النبت بن قیذار بن اسماعیل بن ابراہیم الخلیل علیہ السلام۔

(مناقب ابن الجوزی ص ۳۸)

ابن خلکان لکھتے ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے کہ ابن حنبل بنی مازن بن ذہل بن شیبان بن ثعلبہ بن عکابہ سے تعلق رکھتے ہیں، جب کہ یہ غلط ہے:

لانہ من بنی شیبان بن ذھل لا ذھل بن شیبان وذھل بن ثعلبة المذکور ھو عم ذھل بن شیبان ۔ (ایضا)

ولادت

امام احمد کے والدین مرو سے بغداد منتقل ہوئے تو آپ شکم مادر میں تھے، پھر بغداد آئے یہیں ربیع الاول ۱۶۴ھ میں آپ پیدا ہوئے۔ امام صاحب خود کہتے ہیں:

ولدت فی ربیع الاول سنة اربع وستین ومأة ۔(تاریخ ذھبی ج ۱ ص ۶۳)

بعض تذکرہ نگاروں نے کہا ہے، کہ آپ کی ولادت مرو ہی میں ہوئی تھی اور شیر خوارگی کے دور میں بغداد آئے۔

یتیمی

امام صاحب بچے ہی تھے، کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

ویذکر انہ لم یر اباہ ولا جدہ (ابن حنبل ص ۱۷)

وہ بیان کرتے ہیں، کہ انہوں نے نہ اپنے والد کو دیکھا اور نہ دادا کو۔

مشہور ہے، کہ امام صاحب کے والد نے ۳۰ رسال کی عمر میں وفات پائی، جب کہ آپ شیر خوار بچے تھے، اس دریتیم کی

پرورش ان کی بلند حوصلہ والدہ نے فرمائی۔ صالح بن احمد کہتے ہیں:

وجئ بابی حمل من مرو فتوفی ابوہ محمد شابا ابن ثلاثین سنة فولیت ابی امه ۔

(تاریخ ذہبی ج۱ص۶۴)

میرے والد بزرگوار مرو سے لائے گئے ان کے باپ محمد جوانی ہی میں تیس سال کی عمر میں وفات پا گئے، تو ان کی والدہ نے ان کی سرپرستی کی۔

والدہ نے عسرت وتنگ دستی کے باوجود ان کی تعلیم وتربیت کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، امام صاحب بھی اپنی مشفق والدہ سے حد درجہ ارادت واحترام کا برتاؤ کرتے اور ان کے حکم سے سرتابی نہ کرتے، ۱۸۶ھ میں دریائے دجلہ میں زبردست سیلاب آیا تھا، اس وقت امام صاحب کی عمر بائیس سال تھی ان ہی ایام میں ملک رے کے محمد جریر بن عبدالحمید بغداد آئے، امام صاحب کے ساتھی حدیث کی روایت کے لیے اس سیلاب میں ان کے یہاں پہنچے مگر امام صاحب اس لیے نہ جا سکے کہ والدہ نے اجازت نہیں دی۔

اسی طرح جب امام صاحب صبح کو اندھیرے میں کسی محدث کے یہاں جانا چاہتے تھے، والدہ محترمہ غایت شفقت ومحبت کی وجہ سے جانے نہیں دیتی تھیں، خود بیان کرتے ہیں:

کنت ربما اردت البکور فی الحدیث فتاخذ امی بثیابی وتقول حتی یوذن الناس او حتی یصبحوا وکنت ربما بکرت فی مجلس ابی بکر بن عیاش وغیرہ ۔ (مناقب الامام احمد ص ۵۰)

بسا اوقات میں منہ اندھیرے طلب حدیث کے لیے جانا چاہتا تھا، مگر میری ماں میرے کپڑے پکڑ کر کہتی تھی، کہ صبح ہونے دو اس کے باوجود میں بسا اوقات منہ اندھیرے ہی ابوبکر بن عیاش کی مجلس درس میں پہنچ جاتا تھا۔

ان روایتوں کی روشنی میں واضح ہوتا ہے، کہ امام صاحب کی والدہ ماجدہ زیادہ دنوں تک زندہ رہیں اور ہونہار فرزند کی تعلیم وتربیت پورے انہماک کے ساتھ جاری رکھی۔

ابتدائی تعلیم

امام صاحب جب نوشت وخواند کے قابل ہوئے تو شفیق والدہ نے انہیں مکتب میں بٹھا دیا، اسی زمانہ میں آپ کی ذہانت وذکاوت، نیک نفسی اور عظمت کردار کا شہرہ ہونے لگا تھا، ابوعفیف راوی کا بیان ہے:

کان فی الکتاب معنا وھو غلیم ونعرف فضله ۔

احمد بن حنبل مکتب میں ہمارے ساتھ تھے، وہ اس وقت بہت چھوٹے تھے، اور ہم طلبہ ان کی بزرگی سے واقف تھے۔

ابوسراج کا بیان ہے، کہ میرے والد احمد بن حنبل کے حسن سیرت اور شرافت پر تعجب کر کے کہتے تھے کہ میں اپنے بچوں

کی تعلیم وتربیت پر بہت دولت خرچ کرتا ہوں، ان کے لیے معلم ومودب مقرر کرتا ہوں تا کہ وہ علم وفن حاصل کریں، مگران کو کامیاب نہیں پار ہا ہوں اور یہ احمد بن حنبل یتیم لڑکا ہے، دیکھو کیسا اچھا چل رہا ہے۔

طلب حدیث اور علمی اسفار

امام احمد کا عنفوان شباب تھا، مکتب کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حدیث وفقہ کی تعلیم کا آغاز کیا اور سب سے پہلے قاضی ابو یوسف کے حلقہ درس میں زانوے تلمذ تہہ کیا، خود فرماتے ہیں:

اول من كتبت عنه الحديث ابويوسف ۔(مناقب الامام لابن الجوزی ص ۴۶)

میں نے سب سے پہلے امام ابو یوسف سے حدیثیں لکھیں۔

بغداد کے اندر طلب حدیث وفقہ کے لیے انہوں نے ایک مدت بسر کی، ۱۷۹ھ میں انہوں نے با قاعدہ طلب حدیث کا آغاز کیا اور ایک عرصہ دراز (۱۸۶ھ) تک یہ سلسلہ جاری رہا، وہ جو کچھ سنتے اسے قلم بند بھی کر لیتے، سات سال کی اس مدت میں امام صاحب بغداد سے باہر تشریف نہیں لے گئے، اس زمانے میں شیوخ وعلماے بغداد سے کسب فیض کرتے رہے، مختلف فقہی مسائل وامور ومعاملات کے سلسلے میں فتاواے ماثورہ اور صحابہ وتابعین کے فیصلے ازبر کرتے رہے، یہ مدت انہوں نے اس طرح نہیں گزاری کہ کبھی اس عالم کے دروازے پر دستک دی ہو، کبھی دوسرے کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے ہوں، بلکہ ان کا معمول اور طریقہ یہ رہا، کہ علما میں سے کسی ایک عالم کو انہوں نے چن لیا اور ایک مدت تک خواہ وہ طویل ہو یا قصیر اس سے کسب فیض کرتے رہے، یہاں تک کہ اس سے تمام کام کی باتیں حاصل کر لیں، مثال کے طور پر بغداد کے نامور امام حدیث ہشیم بن بشیر بن ابی حازم الواسطی م ۱۸۳ھ سے طلب علم کی کیفیت صالح بن احمد امام احمد سے روایت کرتے ہیں:

طلبت العلم وانا ابن ست عشرة سنة واول سماعی من هشيم سنة تسع وسبعين وكان ابن المبارك قدم فی هذه السنة وهی آخر قدمة قدمها وذهبت الى مجلسه فقالوا قد خرج الى طرطوس وتوفی سنة احدى وثمانين وكتبت عن هشيم سنة تسع وسبعين ولزمنا سنة ثمانين واحدى وثمانين وثنتين وثلاث ومات فی سنة ثلاث وثمانين كتبنا عنه كتا ب الحج نحوا من الف حديث وبعض التفسير وكتاب القضاء وكتبا صغارا قلت يكون ثلاثة آلاف قال اكثر وجاء نا موت حماد بن زيد ونحن على باب هشيم ويملی علينا الجنائز فقالوا مات حماد بن زيد وسمعت من عبدالمومن بن عبدالله بن خالد ابی الحسن العبسی سنة ثنتين وثمانين قبل موت هشيم ۔ (مناقب ابن جوزی ص ۴۸)

میں نے طلب علم کا آغاز سولہ سال کی عمر میں کیا، ہشیم سے حدیث کی سماعت کی ابتدا ۱۷۹ھ میں کی عبداللہ بن مبارک اسی سال بغداد آئے تھے اور ان کا یہ آخری سفر بغداد تھا، میں ان کی مجلس میں پہنچا، تو لوگوں نے بتایا، کہ

وہ طرطوس چلے گئے اور انہوں نے ۱۸۱ھ میں وفات پائی اور میں نے ہشیم سے ۱۷۹ھ میں لکھنا شروع کیا اور ان سے ان کی وفات ۱۸۳ھ تک وابستہ رہا، ہم نے ان سے کتاب الحج کے سلسلے میں تقریباً ایک ہزار حدیثیں لکھیں اور اس کے علاوہ کچھ تفسیر بھی، کتاب القضا اور کچھ مختصر کتابیں تحریر کیں، صالح نے پوچھا، کہ تین ہزار؟ جواب دیا، اس سے زیادہ، ہمارے پاس حماد بن زید کی خبر وفات آئی، اس وقت ہم ہشیم کے آستانہ پر تھے اور ہشیم ہم کو جنائز کے متعلق حدیثیں املا کرا رہے تھے، لوگوں سے کہا، حماد بن زید کی وفات ہوگئی اور میں نے ہشیم کی وفات سے پہلے ۱۸۲ھ میں عبدالمومن بن عبداللہ بن خالد ابوالحسن عبسی سے حدیث کی سماعت کی۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ امام احمد نے چار سال تک حضرت ہشیم کی بارگاہ سے علم حاصل کیا، اس دوران عبدالمومن بن عبداللہ عبسی سے بھی حدیثیں سنیں، عبداللہ بن مبارک سے تحصیل علم کے لیے گئے، لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔

امام احمد نے جب حدیث وفقہ کی تعلیم کا آغاز کیا، اس وقت محدثین کرام بلاد اسلامی کے چپہ چپہ میں پھیلے ہوئے تھے، چنانچہ بصرہ، کوفہ، مکہ، مدینہ، مصر، شام میں اکابر فقہا ومحدثین کی بڑی تعداد موجود تھی، ان کا وطن بغداد خلافت عباسیہ کا پایہ تخت ہونے کے ساتھ ساتھ علم وفضل کی راجدھانی بھی تھا، جہاں محدثین، مفسرین، مجتہدین اور ہر شعبہ علم وفن سے تعلق رکھنے والے ہزاروں شیوخ واساتذہ موجود تھے، بغداد کا ہر محلّہ بلکہ اس کا ہر کوچہ قال اللہ وقال الرسول کے دلنواز نغموں سے گونج رہا تھا۔

امام احمد کا شوق طلب علم بغداد تک محدود نہ رہا، بلکہ انہوں نے یہاں کے شیوخ ومحدثین سے طلب علم کے بعد دوسرے اسلامی دیار وامصار کے محدثین سے کسب علم کا تہیا کرلیا اور اس سلسلے میں دور دراز شہروں کے سفر کیے، چنانچہ انہوں نے کوفہ، بصرہ، یمن، شام، رے، حجاز، عراق، جزیرہ عبادان کا سفر کیا اور وہاں کے شیوخ حدیث کی بارگاہوں میں حاضری دی۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں:

رحل الکوفة والبصرة ومکة والمدینة والیمن والشام والجزیرة ۔ (تاریخ بغداد ج۴ ص۴۲۱)

امام احمد اپنے تعلیمی اسفار کا اجمالاً تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مات ھشیم سنة ثلاث وثمانین وخرجت الی الکوفة فی تلك الایام ودخلت البصرة سنة ست وثمانین ثم دخلتھا سنة تسعین وسمعت من علی بن ھاشم سنة تسع وسبعین ثم عدت الیه المجلس الآخر وقدمات وھی السنة التی مات فیھا مالك ۔ (ایضا)

ہشیم نے ۱۸۳ھ میں وفات پائی، تو میں انہیں دنوں کوفہ گیا اور بصرہ گیا پھر میں ۱۹۰ھ میں بصرہ گیا اور میں نے ۱۷۹ھ میں علی بن ہاشم سے سماع کیا پھر میں دوبارہ ان کی مجلس میں گیا ان کا انتقال ہو چکا تھا، اسی سال امام مالک کا بھی انتقال ہوا۔

سفر کی مزید تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں، ابومجاہد علی بن مجاہد کابلی سے حدیث کی روایت کی، اسی سال ملک رے کا

سفر کیا، ۱۸۶ھ میں بصرہ کا پہلا سفر کیا اور ۱۸۷ھ میں مکہ مکرمہ سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر ہوا، ہمارے مکہ پہنچنے سے کچھ پہلے فضیل بن عیاض کا انتقال ہو چکا تھا، اس سال میں نے پہلا حج کیا، ابراہیم بن سعد سے بھی حدیث لکھی اور ان کے پیچھے کئی بار نماز پڑھی، ۱۸۶ھ کے آخری عشرہ میں عبادان گیا، اسی سال معتمر بن سلیمان کے یہاں گیا، ۱۹۸ھ میں ہم لوگ یمن میں عبد الرزاق کے یہاں تھے، وہیں سفیان بن عیینہ، عبدالرحمٰن بن مہدی اور یحییٰ بن سعید قطان کی وفات کی خبر ملی، ۱۹۴ھ میں بصرہ میں سلیمان بن حرب اور ابو النعمان عارم اور ابو عمر خوضی سے حدیث کا سماع کیا، اگر میرے پاس پچاس درہم ہوتے تو میں جریر بن عبدالحمید کے یہاں رے جاتا، میرے بعض ساتھی گئے مگر میں نہیں جاسکا، کوفہ گیا تو ایسے مکان میں ٹھہرا جس میں اینٹ کا تکیہ تھا، وہاں مجھے بخار آ گیا تو والدہ کے پاس واپس چلا آیا، میں والدہ کی اجازت کے بغیر کوفہ گیا تھا، پانچ بار بصرہ گیا، پہلی بار رجب ۱۸۶ھ میں وہاں جا کر معتمر بن سلیمان سے سماع کیا دوسری بار ۱۹۰ھ میں، تیسری بار ۱۹۴ھ میں، اس وقت غندر کا انتقال ہو چکا تھا، تو یحییٰ بن سعید کے یہاں چھ ماہ قیام کیا، ان کے یہاں سے واسط میں یزید بن ہارون کی خدمت میں پہنچا، جب ان کو معلوم ہوا کہ میں یزید بن ہارون کے یہاں گیا ہوں تو کہا، کہ وہ واسط میں یزید بن ہارون کے یہاں کیا کریں گے؟ (مطلب یہ تھا، کہ احمد بن حنبل یزید بن ہارون سے علم میں آگے ہیں)۔ (مناقب ابن جوزی ص ۵۲۵ ملخصا)

ابراہیم بن ہاشم کا بیان ہے کہ جریر بن عبدالحمید رے سے بغداد آئے اور بنی مسیّب میں ٹھہرے جب وہاں سے مشرقی بغداد میں آئے تو دریائے دجلہ میں بڑا خطرناک سیلاب آ گیا، میں نے احمد بن حنبل سے کہا، کہ ہم اس پار چل کر جریر بن عبدالحمید سے حدیث کا سماع کریں، انہوں نے کہا، کہ میری ماں مجھے اجازت نہیں دیتی ہے اور میں نے تنہا جا کر جریر سے پڑھا۔ (یہ سیلاب ۱۸۶ھ میں آیا تھا، اس وقت ہارون رشید کی طرف سے سندی بن شاہک بغداد کا حاکم تھا، اس نے دجلہ پار کرنے سے لوگوں کو روک دیا تھا۔) (مناقب ابن جوزی ص ۵۱)

یعقوب بن اسحاق بن اسرائیل کا بیان ہے کہ میرے والد اور احمد بن حنبل نے طلب علم میں بحری سفر کیا اور سمندر میں کشتی ڈوب گئی، تو ایک جزیرے میں اتر گئے۔

صاحبزادے عبداللہ کا بیان ہے، کہ میرے والد نے پیدل طرطوس کا سفر کیا تھا:

خرج ابی الی طرطوس ماشیا علی قدمیہ ۔ (ایضا ص ۵۲)

امام صاحب بیان کرتے ہیں، کہ میں یمن میں ابراہیم بن عقیل کے پاس پہنچا، وہ سخت مزاج عالم تھے، ان تک رسائی مشکل تھی، ان کے دروازے پر دو ایک دن پڑا رہا، تب ان کے پاس پہنچ سکا، انہوں نے مجھ سے دو حدیثیں بیان کیں، حالاں کہ ان کے پاس وہب بن منبہ کی روایت سے حضرت جابر کی بہت سی حدیثیں تھیں، مگر ان کی درشتی مزاج کی وجہ سے ان کو ان سے سن نہ سکا اور نہ ان کے شاگرد اسماعیل بن عبدالکریم سے کیوں کہ ابراہیم بن عقیل زندہ تھے۔

خشنام بن سعد نے ایک مرتبہ امام صاحب سے دریافت کیا، کہ کیا یحییٰ بن یحییٰ امام تھے؟ امام صاحب نے کہا، کہ وہ

میرے نزدیک امام تھے، اگر میرے پاس سفر خرچ ہوتا تو میں ان کے یہاں سفر کر کے جاتا۔

سفر حج

امام احمد نے تعلیمی اسفار کے دوران ہی پانچ حج کیے، حج وزیارت کے پاکیزہ مقصد کے ساتھ سفر حجاز کے دوران علما ومشائخ سے کسب علم وفضل بھی مطمح نظر تھا، وہ خود فرماتے ہیں:

حججت خمس حج منها ثلاث راجلا وانفقت فی احدی هذه الحجج ثلاثين درهما ولو كان عندی خمسون درهما لخرجت الى جرير بن عبدالحميد ۔ (تاریخ ذہبی ج۱ص۶۵)

میں نے پانچ حج کیے ان میں تین حج پا پیادہ اور ان میں سے ایک حج میں صرف تیس درہم خرچ کیے، اگر میرے پاس پچاس درہم ہوتے تو میں جریر بن عبدالحمید کے پاس (سماع حدیث کے لیے) ضرور جاتا۔

ایک سفر حج میں میں راستہ بھول گیا سرگردانی وپریشانی جب زیادہ بڑھی تو حدیث نبوی کا یہ ٹکڑا:

یاعباد الله دلونا على الطريق

پڑھنا شروع کیا، اس کی برکت ظاہر ہوئی اور میں نے راستہ پالیا۔

طلب علم کے دوران مصائب ومشکلات

تنگ دستی اور فلاکت کے باوجود شوق علم نے انہیں اسلامی دیار وامصار کے سفر پر آمادہ کیا، یوں بھی سفر مشقتوں سے عبارت ہے اور زاد سفر مفقود ہو یا بقدر کفایت نہ ہو تو دشواریاں اور مصائب قدم قدم پر مبتلائے آزمائش کرتے ہیں، طلب علم کا جذبہ صادق اور صبر واستقامت کی خوگر طبیعتیں ہی نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

چنانچہ امام احمد کا والہانہ جذبہ علم مصائب وآلام کی سختیوں پر ہمیشہ غالب آیا، رحلت وسفر کی ہر مصیبت انہوں نے جھیلی اور علم کے گنجہائے گراں مایہ اپنے دامن میں سمیٹ لیے۔

صالح کہتے ہیں:

عزم ابی علی الخروج الی مكة ورافق يحيىٰ بن معين فقال ابی نجح ونمضى الى صنعاء الى عبدالرزاق ۔ قال فمضينا حتى دخلنا مكة فاذا عبد الرزاق فی الطواف وكان يحيى يعرفه فطفنا ثم جئنا الى عبد الرزاق فسلم عليه يحيىٰ وقال هذا اخوك احمد بن حنبل وقال حياه الله انه ليبلغنی عنه كلام اسربه ثبته الله على ذلك ثم قال لينصرف فقال يحيىٰ الا ناخذ عليه الموعد فابى احمد وقال لم اغير النية فی رحلتی او كما قال ثم سافر الى اليمن لاجله وسمع منه الكتب واكثر عنه فی المخطوط كلاما ۔ (تاریخ ذہبی ج۱ص۱۶۶)

میرے والد نے مکہ جانے کا عزم کیا اور یحییٰ بن معین ان کے رفیق سفر ہوئے تو میرے والد نے کہا، ہم حج بھی

کریں گے اور صنعا (یمن) عبدالرزاق کے پاس جا کر سماعِ حدیث کریں گے، آپ نے فرمایا، ہم چلے یہاں تک کہ مکہ پہنچ گئے، اچانک عبدالرزاق طواف کرتے ہوئے مل گئے اور یحییٰ بن معین انہیں پہچانتے تھے، ہم نے طواف کیا، پھر ہم عبدالرزاق کے پاس آئے تو ابن معین نے انہیں سلام کیا اور کہا یہ آپ کے بھائی احمد بن حنبل ہیں، عبدالرزاق نے فرمایا، اللہ انہیں زندہ رکھے، بے شک ان کی جانب سے مجھ تک ایسی بات پہونچی ہے کہ جس کے سبب انہیں قید کر دیا جائے گا، اللہ انہیں اس پر ثابت قدم رکھے، پھر آپ واپس جانے کے لیے کھڑے ہوئے تو یحییٰ بن معین نے کہا کیا ہم ان سے سماعِ حدیث کا وعدہ نہ لے لیں، احمد بن حنبل نے انکار کیا اور کہا میں نے ان کے پاس جانے کے سلسلے میں اپنی نیت نہیں بدلی یا جیسا فرمایا پھر آپ نے سماعِ حدیث کے لیے یمن کا سفر کیا اور ان سے کتابیں سنیں اور بہت زیادہ حدیثیں روایت کیں۔

امام احمد نے یمن کا سفر بڑی بے سروسامانی میں کیا، اگر وہ چاہتے تو مکہ ہی میں عبدالرزاق سے سماعت حدیث کر سکتے تھے، مگر انہیں اس آسانی کے بجائے سفر کی مشقت عزیز تھی، ان کا یقین تھا، کہ جو چیز مشقت سے حاصل کی جاتی ہے، وہ پائیدار ہوتی ہے، چنانچہ وہ یمن اس طرح پہنچے کہ راستے میں ساربانوں کی حمالی کرتے اور یمن کے دوران قیام بھی محنت اور مزدوری سے اسباب معیشت فراہم کرتے اور پورے انہماک سے طلب حدیث کرتے رہے۔

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں، کہ احمد بن حنبل نے عبدالرزاق کے یہاں سے چلتے وقت خرچہ ختم ہو جانے کی وجہ سے ساربانوں کے یہاں مزدوری کی، خود عبدالرزاق کا بیان ہے، کہ احمد بن حنبل ہمارے یہاں تقریباً دو سال مقیم رہے، ان کی مشکلات دیکھ کر میں نے کہا، کہ ابوعبداللہ! ہمارے ملک یمن میں تجارت نہیں ہے اور نہ ہی کسب و معیشت کی فراوانی ہے، یہ دینار ہیں، ان کو قبول کر لیں، مگر انہوں نے قبول نہیں کیا، یہ واقعہ یاد کر کے عبدالرزاق رو دیا کرتے تھے۔

احمد بن ابراہیم دورقی کا بیان ہے، کہ احمد بن حنبل عبدالرزاق کے یہاں سے مکہ آئے تو میں نے ان کو بہت تھکا ماندہ پایا، میں نے کہا، ابوعبداللہ! آپ نے اس سفر میں بڑی مشقت برداشت کی ہے، جسم پر تھکن کے آثار ظاہر ہیں، انہوں نے جواب دیا، کہ ہم نے عبدالرزاق سے جو علمی و دینی استفادہ کیا ہے، اس کے مقابلہ میں یہ مشقت بہت معمولی ہے، ہم نے ان سے الزہری عن سالم عن عبداللہ عن ابیہ اور الزہری عن سعید بن المسیب عن ابی ہریرۃ کی سند سے حدیثیں لکھیں۔

امام صاحب واسط میں یزید بن ہارون کے یہاں سخت سردی کے زمانہ میں گئے، مالی مشکلات درپیش ہوئیں تو اپنا جبہ ایک ساتھی کو دیا تا کہ اس کو فروخت کر دے، اس نے یزید بن ہارون سے اس کا تذکرہ کیا، انہوں نے دو سو درہم بھجوائے، مگر امام صاحب نے یہ کہہ کر قبول نہیں کیا، کہ میں ضرورت مند اور مسافر ہوں مگر اپنے کو اس طرح کے ہدایا و عطایا کا عادی بنانا پسند نہیں کرتا ہوں۔

جس زمانہ میں امام صاحب مکہ مکرمہ میں سفیان بن عیینہ سے تحصیل علم کر رہے تھے، ان کے کپڑے وغیرہ چوری

ہوگئے، جب اس کا پتہ چلا، تو پوچھا، کہ میری الواح کا کیا ہوا، جن میں حدیثیں لکھی ہیں، لوگوں نے بتایا کہ وہ طاق میں محفوظ ہیں، اس حادثہ کی وجہ سے کئی دن مجلس درس میں حاضر نہیں ہوئے اور پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ ان کے جسم پر دو پرانے کپڑے ہیں، اس کے بعد ایک ساتھی سے ایک دینار قرض لے کر کپڑا خریدا۔ (تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ تا ۳۸)

اپنی تنگ حالی کے باوجود امام احمد نے ان تمام اسلامی بلاد و امصار کا سفر کیا جو علم و فضل کا گہوارہ تھے، وہاں کے شیوخ حدیث سے علم حدیث کے زر و جواہر حاصل کیے۔

کوفہ میں قیام کے دوران تکلیف و مشقت کا یہ حال تھا، کہ آپ سر کے نیچے تکیہ کے بجائے اینٹ رکھتے تھے، خود فرماتے ہیں:

خرجت الی الکوفة فکنت فی بیت وتحت راسی لبنة ۔(مناقب ص ۴۹)

میں گھر میں جب سوتا تھا، تو سر کے نیچے تکیہ نہ ہونے کی وجہ سے اینٹ رکھتا تھا۔

تحصیل علم کا بے کراں شوق

طلب علم کے لیے امام احمد نے بغداد سے نکل کر اقالیم اسلامیہ کا چکر لگایا، نہ وہ محنت سے گھبرائے اور نہ تکان سے پریشان ہوئے، وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کے بعد بھی سیر نہیں ہوتے، بلکہ ان کی علمی پیاس بڑھتی ہی جاتی، وہ کتابوں کا پلندہ پیٹھ پر لادے ہوئے ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا بے تکان سفر کرتے اور شب و روز علمی زر و جواہر کی جستجو کرتے۔

ایک مرتبہ ان کے ایک شناسا نے انہیں حالت سفر میں دیکھا اور احادیث کی حفظ و روایت اور کتابت کی کثرت دیکھ کر اعتراض کرتے ہوئے کہا، اتنا کچھ حفظ کر لیا، اتنی کچھ روایت کر لی، پھر بھی حالت یہ ہے، کہ آج کوفہ کا سفر درپیش ہے، تو کل بصرہ، آخر کب تک اور کہاں تک یہ سلسلہ جاری رہے گا؟ جب انسان تیس ہزار حدیثیں لکھ لے تو کیا اس کے لیے کافی نہیں؟ امام صاحب خاموش رہے، پھر انہوں نے کہا ساٹھ ہزار؟ آپ خاموش رہے، پھر انہوں نے کہا، ایک لاکھ؟ وہ ان سے ان کا مبلغ علم معلوم کرنا چاہتے تھے، احمد بن منیع کہتے ہیں، ہم نے اس طرح پتا چلایا، تو معلوم ہوا، احمد نے تین لاکھ حدیثیں بہز بن اسد اور عفان سے لکھیں۔ (مناقب ص ۵۲)

امام صاحب کی شہرت، مقبولیت کا دور عروج تھا، آپ کے علم و تقویٰ کا ڈنکا چار سو بج رہا تھا، ایک شخص نے دیکھا، کہ آپ ہاتھ میں دوات، قلم لیے کسی محدث کی درس گاہ میں جا رہے ہیں، اس نے کہا، کہ ابو عبداللہ! آپ علم کے اس بلند مقام پر پہنچ چکے ہیں اور امام المسلمین ہیں، پھر بھی پڑھنے جا رہے ہیں؟ امام صاحب نے جواب دیا، ”مع المحبرة الی المقبرة“ دوات کے ساتھ قبرستان تک۔ (ایضاً ص ۵۵)

محمد بن اسماعیل صائغ کا بیان ہے:

کنت اصوغ مع ابی ببغداد فمر بنا احمد بن حنبل وھو یعدو ونعلاہ فی یدہ فاخذ ابی ھکذا بمجامع ثوبہ فقال یا اباعبداللہ! لا تستحیی الی متی تعدو ومع ھؤلاء الصبیان ؟ قال الی الموت ۔ (مناقب الامام احمد ص ۵۶)

میں اپنے والد کے ساتھ بغداد میں سونا ڈھالنے کا کام کررہا تھا، اسی زمانے میں امام احمد بن حنبل ہمارے سامنے سے اس حال میں گزرے، کہ دونوں جوتے ہاتھ میں تھے اور دوڑ رہے تھے، میرے والد نے بڑھ کر ان کے کپڑے پکڑ لیے اور پوچھا، کہ ابوعبداللہ! کب تک طالب علمی کروگے؟ آپ کو ان بچوں کے ساتھ دوڑتے ہوئے شرم بھی نہیں آتی؟ امام احمد نے اس کے جواب میں صرف اتنا کہا اور چلتے بنے ”الی الموت“ یعنی موت تک۔

وکیع بن جراح عام طور سے رات گئے، احمد بن حنبل کے یہاں آتے تھے اور دونوں حضرات حدیث کا مذاکرہ کرتے تھے، ایک رات وکیع آئے اور احمد بن حنبل کے دروازہ کے دونوں بازو پکڑ کر کھڑے ہوگئے، اندر سے احمد بن حنبل آئے اور دونوں حضرات دروازہ پر حدیث کا مذاکرہ کرنے لگے، وکیع نے کہا، کہ میں آپ کے سامنے سفیان بن عیینہ کی احادیث رکھتا ہوں، احمد بن حنبل نے کہا، کہ بیان کرو، چنانچہ وکیع نے سفیان بن سلمہ بن کہیل کے سلسلہ سند کی احادیث پیش کیں اور احمد بن حنبل نے بتایا، کہ یہ حدیثیں اس طرح مجھے یاد ہیں، پھر احمد بن حنبل نے وکیع سے کہا، کہ آپ کو سلمہ بن کہیل کی حدیثیں یاد ہیں؟ اسی طرح دونوں طلبہ حدیث رات بھر دروازے پر کھڑے کھڑے احادیث کے بارے میں بحث ومذاکرہ کرتے رہے اور صبح ہوگئی۔ (طبقات الشافعیہ ج۲ ص۲۸)

شیوخ واساتذہ کا احترام

امام احمد نے تحصیل علم کے دوران اور بعد میں بھی اپنے شیوخ واساتذہ کا بھرپور احترام کیا، ان کی بارگاہوں میں ادب واحترام اور نیازمندی کا طریق اختیار کرتے۔

یحیٰی بن معین نے ایک مرتبہ بغداد میں امام احمد بن حنبل کو دیکھا، کہ امام شافعی کی سواری کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں، تو ان کے صاحبزادے سے کہا، کہ تمہارے باپ کو شرم نہیں آتی، کہ شافعی کی سواری کے ساتھ چل رہے ہیں، صاحبزادے نے امام صاحب سے ذکر کیا تو فرمایا، کہ یحیٰی بن معین سے کہہ دو، کہ تم اس شخص کے بائیں طرف چلو تو تمہیں علم آجائے گا۔

ادریس بن عبدالکریم خلف سے روایت کرتے ہیں، کہ احمد بن حنبل ابوعوانہ کی حدیث سننے کے لیے میرے یہاں آئے، میں نے بہت چاہا، کہ ان کا اعزاز واحترام کروں، مگر انہوں نے کہا، کہ ”**لا اجلس الا بین یدیك امرنا ان نتواضع لمن نتعلم منہ**“ میں آپ کے سامنے ہی بیٹھوں گا، کیوں کہ ہم کو حکم دیا گیا ہے، کہ جس سے علم حاصل کریں ان کے سامنے تواضع اختیار کریں۔

اسحاق شہید کا بیان ہے، کہ میں دیکھتا تھا، کہ یحییٰ بن سعید قطان نماز عصر کے بعد مسجد کے منارہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور ان کے سامنے علی بن مدینی، شاذ کونی، عمرو بن علی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین وغیرہ کھڑے کھڑے حدیث کا سماع کرتے تھے، نماز مغرب تک اسی حال میں رہتے تھے، ان میں کوئی کسی سے بیٹھنے کو نہیں کہتا تھا، بلکہ ہیبت اور تعظیم کی وجہ سے سب لوگ کھڑے رہتے تھے۔

قتیبہ بن سعید کہتے ہیں، کہ میں احمد بن حنبل کی ملاقات کے لیے بغداد گیا، وہ یحییٰ بن معین کے ساتھ میرے پاس آئے اور ہم نے حدیث کا مذاکرہ کیا، جب تک یہ مجلس جاری رہی، احمد بن حنبل میرے سامنے کھڑے رہے، جب میں کہتا، ابوعبداللہ! اپنی جگہ بیٹھ جایئے تو کہتے تھے ''**لاتشتغل بی انما ارید ان اخذ العلم علی وجهه**'' آپ میرا خیال نہ کریں، میں چاہتا ہوں کہ علم کو اس کے طریقہ اور ادب کے ساتھ حاصل کروں۔

عمرو الناقد کا بیان ہے، کہ ہم لوگ وکیع بن جراح کی مجلس میں تھے، اسی وقت احمد بن حنبل بھی آ کر خاموشی سے بیٹھ گئے، میں نے کہا، کہ ابوعبداللہ! شیخ آپ کا احترام کرتے ہیں، آپ ان سے باتیں کیوں نہیں کرتے؟ احمد بن حنبل نے کہا ''**وان کان یکرمنی فینبغی لی ان اجله**'' اگر وہ میری تعظیم کرتے ہیں، پھر مجھے بھی ان کی تعظیم کرنی چاہیے۔

(مناقب الامام احمد ص ۸۲، ۸۳)

امام شافعی کے ساتھ تعلق خاطر

یوں تو امام احمد اپنے تمام شیوخ و اساتذہ کا حد درجہ احترام کرتے تھے، مگر امام شافعی سے انہیں خصوصی تلمذ حاصل تھا اور ان کا سب سے زیادہ احترام اور خیر کے ساتھ تذکرہ کرتے تھے، ابن خلکان نے لکھا ہے:

> **وکان من اصحاب الامام الشافعی رضی اللہ تعالیٰ عنهما وخواصه ولم یزل مصاحبه الی ان ارتحل الشافعی الی مصر وقال فی حقه خرجت من بغداد وما خلفت بها اتقی ولا افقه من ابن حنبل** ۔ (وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۶، ۱۷)
>
> امام احمد بن حنبل امام شافعی کے تلامذہ اور خواص میں سے تھے، وہ ان کے ساتھ برابر رہے، یہاں تک کہ شافعی مصر چلے گئے اور ان کے بارے میں شافعی نے کہا، کہ میں بغداد سے اس حال میں نکلا ہوں، کہ احمد بن حنبل سے زیادہ متقی اور زیادہ فقیہ کسی کو نہیں چھوڑا۔

خود امام صاحب کہتے ہیں، کہ شافعی کی مجلس میں بیٹھنے کے بعد میں نے حدیث کے ناسخ اور منسوخ کو پہچانا، ایک مرتبہ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ نے پوچھا، کہ شافعی کون تھے، میں دیکھتا ہوں، کہ آپ ان کے لیے بہت زیادہ دعا کرتے ہیں؟ امام صاحب نے بتایا، کہ بیٹے! شافعی دنیا کے لیے آفتاب اور بدن کے لیے صحت کے مانند تھے، کیا ان دونوں چیزوں کا بدل ہوسکتا ہے؟ میں تیس سال سے شافعی کے حق میں دعا اور استغفار کرتا ہوں، ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں دوات اور کاغذ ہے، اس

کی گردن پر شافعی کا احسان ہے۔

محفوظ بن ابو توبہ بغدادی کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ میں نے احمد بن حنبل کو مسجد حرام میں امام شافعی کے درس میں دیکھا اور کہا، کہ ابو عبداللہ! یہ سفیان بن عیینہ مسجد کے ایک گوشہ میں حدیث کا درس دے رہے ہیں، احمد بن حنبل نے جواب دیا، کہ یہ (شافعی) نہیں ملیں گے اور وہ (سفیان بن عیینہ) مل جائیں گے۔

امام شافعی پہلی بار ۱۹۵ھ میں بغداد گئے اور دو سال تک مستقل طور سے وہاں رہے، پھر دوسری بار ۱۹۸ھ میں گئے اور چند ماہ رہ کر مصر چلے گئے، امام احمد نے اس دوران امام شافعی سے بھرپور استفادہ کیا، اس سے قبل مکہ میں امام احمد نے امام شافعی سے استفادہ کیا تھا۔

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں، کہ ہم سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر تھے اور عمرو بن دینار کی حدیث لکھ رہے تھے، اتنے میں احمد بن حنبل آئے، مجھ سے انہوں نے کہا، ابو یعقوب اٹھو! میں ایسا شخص دکھاؤں جسے تمہاری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، میں اٹھ کھڑا ہوا، وہ مجھے لے کر زم زم کے پاس پہنچے، یہاں ہم دیکھتے کیا ہیں، کہ ایک شخص ہے جو سفید کپڑوں میں ملبوس ہے، چہرہ روشن اور تابناک، فراست ہویدا، ذکاوت آشکارا احمد نے مجھے ان کے پہلو میں بٹھا دیا اور کہا، اے ابو عبداللہ! یہ ہیں اسحاق بن راہویہ حنظلی، انہوں نے مجھے مرحبا کہا، دعا دی، میں نے ان سے کچھ پوچھا، انہوں نے مجھے کچھ بتایا، میری نظر میں ان کا ایسا علم آیا جو میرے لیے بہت مرغوب اور پسندیدہ ثابت ہوا، جب ہمیں بیٹھے بیٹھے دیر ہوگئی، تو میں نے کہا، ہمیں اس آدمی کے پاس کیوں نہیں لے چلتے، جس کا ذکر کیا تھا؟ احمد نے کہا، یہی تو ہیں وہ شخص، میں نے کہا، سبحان اللہ! میں ایسے شخص کے پاس سے اٹھ کر آیا ہوں، جو کہتا تھا، ہم سے زہری نے روایت کی، میں نے تو یہی خیال کیا تھا، کہ آپ مجھ کو ایسے شخص کے پاس لے جائیں گے جو زہری کے مثل ہوگا، یا کم از کم اس کے قریب قریب تو ہوگا اور تم ہمیں اس نوجوان کے پاس لے آئے، احمد نے جواب دیا، اے ابو یعقوب! اس شخص سے فیض حاصل کرو، کہ میری آنکھوں نے اس جیسا کوئی اور شخص نہیں دیکھا، وہ امام شافعی تھے۔ (امام احمد بن حنبل ص ۷۸)

شیوخ و اساتذہ کی نظر میں

امام احمد طلب علم کے حریص ہونے کے باوجود تہذیب و شائستگی کا پیکر تھے، ان کی عظمت شان اور برگزیدہ شخصیت کا اعتراف ان کے اساتذہ کو بھی تھا، ابن علیہ کی بارگاہ میں کسب علم کے لیے تیس سال کی عمر میں پہنچے، شیخ اور ان کے خاندان کے افراد امام احمد کا حد درجہ احترام کرتے۔

ایک مرتبہ ابن علیہ کی درس گاہ میں کسی طالب علم نے کوئی بات کہی جس پر تمام طلبہ ہنس پڑے، حلقہ درس میں امام احمد بن حنبل بھی موجود تھے، ابن علیہ نے طلبہ پر سخت برہم ہوتے ہوئے کہا، کہ یہاں احمد بن حنبل موجود ہیں اور تم لوگ ہنس رہے ہو۔ (مختصر تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۰۰)

یزید بن ہارون کے یہاں امام صاحب طلب علم کے لیے گئے تو وہ ان کی بہت زیادہ تعظیم کرتے تھے، حتیٰ کہ ایک مرتبہ امام صاحب بیمار پڑ گئے تو یزید بن ہارون ان کی عیادت کے لیے آئے اور سواری بھیجی۔ (ایضا)

ایک مجلس درس میں یزید بن ہارون نے کوئی تفریحی بات کہی احمد بھی حاضر تھے، انہوں نے اس بات پر کھانس دیا، یزید بن ہارون نے کہا، کون؟ حاضرین نے احمد بن حنبل کا نام لیا تو کہا، کہ اگر معلوم ہوتا کہ یہاں احمد بن حنبل موجود ہیں تو میں ہنسی کی بات نہ کرتا۔ (احمد بن حنبل ص ۸۰)

ابوبکر بن ابی عون اور محمد بن ہشام کہتے ہیں:

راينا اسمعيل بن علية اذا اقيمت الصلاة قال ها هنا احمد بن حنبل قولوا له يتقدم ۔

(مناقب ص ۹۶)

ہم نے اسماعیل بن علیہ کو دیکھا جب نماز کی اقامت کہی جاتی فرماتے یہاں احمد بن حنبل موجود ہیں ان سے کہو وہ آگے بڑھیں (امامت کریں)

احمد بن شیبان فرماتے ہیں:

ما رايت يزيد بن هارون لاحد اشد تعظيما منه لاحمد بن حنبل و لا رايته اكرم احدا اكرامه لاحمد بن حنبل و كان يقعده الى جنبه اذا حدثنا و كان يوقر احمد بن حنبل و لا يمازحه و مرض احمد بن حنبل فركب اليه يزيد بن هارون وعاده ۔ (مناقب ص ۹۵)

میں نے یزید بن ہارون کو امام احمد سے بڑھ کر کسی کی تعظیم کرتے ہوئے نہیں دیکھا، اور نہ ان سے بڑھ کر کسی کا احترام کرتے دیکھا اور وہ احمد کو اپنے پہلو میں بٹھاتے جب ہم سے حدیث بیان کرتے اور وہ امام احمد بن حنبل کی توقیر کرتے ان کے سامنے ہنسی مذاق کی باتیں نہ کرتے امام احمد بیمار ہوئے تو یزید بن ہارون ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔

شجاع بن مخلد بیان کرتے ہیں:

كنت عند ابى الوليد الطيالسى فورد على كتاب احمد بن حنبل فسمعته يقول ما بالمصرين يعنى البصرة و الكوفة احد احب الى من احمد بن حنبل و لا ارفع قدرا فى نفسى منه ۔ (ایضا ص ۱۰۰)

میں ابوالولید طیالسی کے پاس تھا، تو ان کے پاس احمد بن حنبل کا خط آیا، میں نے ان کو کہتے ہوئے سنا کہ مصرین یعنی کوفہ اور بصرہ میں کوئی شخص ہمارے نزدیک احمد بن حنبل سے زیادہ محبوب نہیں اور نہ ہی ان سے بڑھ کر میرے دل میں کسی کی قدر و منزلت ہے۔

شیوخ واساتذہ

امام احمد نے بغداد ہی کے شیوخ حدیث اور علما سے کسب فیض پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بغداد سے نکل کر حجاز، شام، بصرہ، کوفہ، رے، یمن کے مقتدر شیوخ حدیث سے استفادہ کیا، بعض ائمہ حدیث جن سے وہ کسب علم کرنا چاہتے تھے، مگر ان کی وفات کی بنا پر ان سے سماع حدیث نہ کر سکے، جن میں امام مالک، عبداللہ بن مبارک، حماد بن زید کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، امام احمد کو اس بات کا شدید احساس تھا، کہ وہ اپنے وقت کے ان جلیل القدر علما کے سامنے زانوے تلمذ تہہ نہ کر سکے لیکن اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس نقصان کی تلافی بوجہ احسن فرمادی چنانچہ فرمایا کرتے تھے:

فاتنی مالك فاخلف علی سفیان بن عیینة وفاتنی حماد بن زید فاخلف اللہ علی اسمعیل بن علیة ۔ (مناقب لابن الجوزی ص ۳۱)

امام مالک وفات پاگئے (میں ان سے کسب فیض نہ کر سکا) تو اس کی تلافی سفیان بن عیینہ سے ہوگئی، حماد بن زید سے نہ مل سکا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ اسماعیل بن علیہ سے کسب فیض کا موقع دیا۔

امام احمد بن حنبل نے اپنے زمانہ کے تقریباً تمام اجلہ علمائے فن اور محدثین سے اکتساب فیض کیا، امام ابن جوزی نے اپنی کتاب ''مناقب امام احمد'' میں تیس صفحات پر امام صاحب کے شیوخ کی فہرست حروف تہجی پر مرتب کی ہے۔

خطیب بغدادی نے کچھ اہم شیوخ کے نام تحریر کیے ہیں:

اسماعیل بن علیہ، ہشیم بن بشیر، حماد بن خالد خیالی، منصوز بن سلمہ خزاعی، مظفر بن مدرک، عثمان بن عمر بن فارس، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، ابوسعید مولی بنی ہاشم، محمد بن یزید واسطی، یزید بن ہارون واسطی، محمد بن ابوعدی، محمد بن جعفر غندر، یحییٰ بن سعید قطان، عبدالرحمٰن بن مہدی، بشر بن مفضل، محمد بن بکر برسانی، ابوداؤد طیالسی، روح بن عبادہ، وکیع بن جراح، ابومعاویہ ضریر، عبداللہ بن نمیر، ابواسامہ، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سلیم طائفی، محمد بن ادریس شافعی، ابراہیم بن سعد زہری، عبدالرزاق بن ہمام صنعانی، ابوقرہ موسیٰ بن طارق، ولید بن مسلم، ابومسہر دمشقی، ابوالیمان علی بن عیاش، بشر بن شعیب بن ابوحمزہ۔

خطیب بغدادی لکھتے ہیں'' **وخلق سواھم یطول ذکرھم ویشق احصاء اسمائھم**

(تاریخ بغداد ج۴ص۔۴۱۲-۱۳)

ان کے علاوہ بہت سے لوگوں سے روایت کی ہے جن کا ذکر کرنا طوالت کا باعث ہے، ان کے ناموں کا شمار مشکل ہے۔

امام احمد نے اگرچہ بہت سے محدثین وفقہا کی بارگاہوں میں حاضری دی اور ان سے دامن علم کو مالا مال کیا، مگر ان میں سب سے اہم اور عظیم دو شخصیتیں ہیں، جو حدیث وفقہ میں بہت اونچا مقام رکھتی تھیں اور امام احمد کی شخصیت میں حدیث وفقہ کا امتزاج انہیں دونوں کی صحبتوں کا رہین منت ہے۔ وہ حافظ ہشیم واسطی اور امام شافعی کی ذات بابرکات ہے۔

(الف) امام ہشیم بن بشیر حازم ۱۰۴ھ تا ۱۸۳ھ یہ وہ جلیل القدر محدث ہیں، جنہوں نے عمرو بن دینار، امام زہری، قاضی ابوشیبہ اور دیگر ائمہ حدیث سے کسب علم کیا، آپ کو ابن عمر و اور ابن عباس کے آثار میں بڑا درک تھا، ہشیم کے گرد بغداد میں تشنگان علوم نبویہ کا ازدحام رہتا تھا، ان کی عظمت شان یہ تھی، کہ حضرت امام مالک جیسے جلیل القدر محدث آپ کے رواۃ میں شامل تھے۔ حماد بن زید کہتے ہیں:

مارایت فی المحدثین انبل من هشیم و کان بعض المحدثین ذوی القدم الثابتة یفضله علی امام الحدیث سفیان الثوری ولقد اثنی علیه مالك بن انس رضی الله عنه ونفی ان یکون بالعراق عالم بالحدیث سواه .

محدثین میں میں نے ہشیم سے زیادہ بلند پایہ کوئی اور شخص نہیں دیکھا، بعض محدثین تو انہیں امام الحدیث سفیان ثوری پر بھی فضیلت دیتے ہیں، امام مالک بن انس بہت زیادہ ان کی تعریف کرتے تھے، وہ اسے تسلیم ہی نہیں کرتے تھے، کہ عراق میں ہشیم کے علاوہ کوئی عالم حدیث ہے، وہ فرماتے تھے:

وهل با لعراق احد یحسن ان یحدث الا ذاك الواسطی (یعنی هشیما) (تاریخ بغداد ج۱۴ ص۹۲)

کیا واسطی سے بڑھ کر بھی عراق میں کوئی محدث ہے۔

امام احمد نے تقریباً پانچ سال ہشیم کی بارگاہ سے کسب علم کیا، آپ کی طبیعت اور مزاج پر ان کا بڑا گہرا اثر پڑا، کیفیت یہ تھی، کہ ان کی جلالت وہیبت کے باعث ساری مدت طالب علمی میں دو ایک مرتبہ سے زیادہ کوئی بات نہیں پوچھی۔

حافظ ہشیم نے طلب علم میں بڑے دکھ جھیلے تھے اور بہت مشقتیں اٹھائی تھیں، احمد نے ان سے صرف علم حدیث ہی نہیں حاصل کیا تھا، بلکہ راہ علم میں مشقتوں کا جھیلنا اور تکلیفوں کا اٹھانا بھی سیکھا تھا۔

امام احمد کی سیرت وشخصیت پر سب سے زیادہ اثر انداز جو ذات ہوئی وہ ہشیم ہی کی ذات گرامی تھی، وہ جو کچھ استاذ کی زبان سے سنتے تھے اسے ازبر کر لیتے تھے، چنانچہ وہ خود فرمایا کرتے تھے:

حفظت کل شیء من هشیم وهشیم حی قبل موته .

میں نے ہشیم سے جو کچھ سیکھا، وہ سب ان کی زندگی میں ازبر کر لیا۔

(ب) امام شافعی ۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ امام احمد نے حافظ ہشیم سے حدیث زیادہ سیکھی اور فقہ کم، ضروری تھا، کہ اس کوتاہی کی تلافی وہ کسی دوسری شخصیت کی بارگاہ فضل وکمال میں حاضر ہوکر کرتے، ہشیم کے انتقال کے بعد امام احمد جب مکہ پہنچے تو انہیں اس عہد کے جلیل القدر مجتہد وفقیہ امام شافعی کے حلقہ درس میں شریک ہونے کا موقع ملا امام شافعی بغداد سے امام محمد بن حسن شیبانی سے فقہ حنفی سیکھ کر مکہ آئے تھے اور فقہ شافعی کے طریقہ استنباط واصول وضع کرنے میں لگے ہوئے تھے، امام احمد نے امام شافعی سے استماع کے بعد خود ہی تصریح کی ہے، وہ امام شافعی کی فقہی ژرف نگاہی سے متاثر تھے، نہ کہ ان کی روایت حدیث سے، امام اسحاق بن راہویہ سے بھی اسی طرح کی روایت مروی ہے، انہوں نے احمد سے کہا، اس شخص سے کچھ حاصل کرو، میری آنکھوں نے اس جیسا کوئی دوسرا آدمی نہیں دیکھا۔

(ا) ہشیم بن بشیر ۱۰۴ھ تا ۱۸۳ھ

ہشیم نام اور ابومعاویہ کنیت تھی، نسب نامہ یہ ہے: ہشیم بن بشیر بن ابی حازم القاسم بن دینار۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۵۹)

بنوسلیم کے غلام تھے، اس لیے سلمی کہلاتے ہیں اور واسطی وطن کی طرف نسبت ہے۔

ہشیم ۱۰۴ھ میں بمقام واسط پیدا ہوئے، پھر ایک عرصہ کے بعد مرکز علم وفن بغداد منتقل ہو گئے تھے اور آخر عمر تک وہیں رہے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۵۸)

بعض علما کا خیال ہے، کہ وہ بخاری الاصل تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۵۹)

ابتدا میں مقامی علما سے مستفید ہوئے، اس کے بعد تشنگی علم نے دور دراز ممالک کے چشموں تک پہنچایا اور وہاں انہوں نے ممتاز اور کبار فضلا کے معدن فضل وکمال سے اپنے ذہن ودماغ کو مالا مال کیا، چنانچہ مکہ میں انہوں نے امام زہری اور عمرو بن دینار سے سماع حاصل کیا، ہشیم کے والد اموی خلیفہ حجاج بن یوسف ثقفی کے باورچی تھے، پھر اس کے بعد تجارت کا پیشہ اختیار کرلیا تھا، ان کی خواہش تھی، کہ ہشیم بھی ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹائیں اس لیے وہ ان کو طلب علم سے روکتے تھے، لیکن وہ ان کے علی الرغم تحصیل علم میں ہمہ تن مشغول رہے۔

اتفاق سے ایک مرتبہ ہشیم سخت بیمار پڑ گئے، قاضی واسط ابوشیبہ کو اس کی اطلاع ہوئی، تو وہ اپنے تلامذہ اور عوام کے ایک جم غفیر کے ہمراہ عیادت کو تشریف لائے، بشیر بن ابی حازم کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آسکتا تھا، کہ قاضی وقت ان کے غربت کدہ کو کبھی اپنی تشریف آوری سے زینت بخشیں گے، اس لیے وہ اپنے اس غیر متوقع اعزاز پر فرط مسرت سے بے قابو ہو گئے اور اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

ابلغ من امرك ان جاء القاضی الی منزلی لا امنعك بعد هذا الیوم من طلب الحدیث۔

(طبقات ابن سعد ج ۷ ص ۱۸۴)

تمہاری وجہ سے قاضی میرے گھر تشریف لائے آج کے بعد میں تمہیں طلب حدیث سے نہ روکوں گا۔

علم وفضل کے اعتبار سے ہشیم بلند مرتبہ حفاظ حدیث میں تھے، متعدد تابعین کرام سے صحبت اور کسب فیض کا شرف حاصل تھا، حفظ واتقان اور عبادت وللّٰہیت میں بھی درجہ کمال پر فائز تھے، بغداد میں اپنے زمانہ کے رئیس المحد ثین تھے، اسی بنا پر ''محدث بغداد'' ان کا لقب ہی پڑ گیا تھا، علامہ ذہبی انہیں ''**الحافظ احد الاعلام**'' لکھتے ہیں۔ (میزان الاعتدال ج۱ ص۲۵۷)

حافظ ابن کثیر رقم طراز ہیں ''**کان هشيم من سادات العلماء**'' (البدایہ والنہایہ ج۱۰ ص۱۸۳)

ان کا حافظہ اتنا قوی تھا، کہ بیس ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ (مرآۃ الجنان ج۱ ص۳۹۳)

حافظ ذہبی نے تذکرہ میں ''**الحافظ الكبير محدث العصر**'' لکھ کر ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۲۲۵)

انہوں نے تحصیل علم کے لیے بہت سے دور دراز ملکوں کا سفر کیا اور پھر حدیث میں انہیں اتنا عبور ہو گیا تھا، کہ اساتذہ عصر میں شمار کیے جانے لگے، علامہ ابن سعد نے ''**كان ثقة كثير الحديث حجة**'' کے الفاظ سے ان کے کمال فنی کو سراہا ہے۔ (طبقات ابن سعد ج۷ ص۶۱)

چوں کہ ہشیم نے بصرہ، بغداد، کوفہ اور مکہ نیز دوسرے شہروں میں حلقہ درس قائم کیا تھا، اس لیے ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

ہشیم بڑے قوی الحفظ تھے، ابن قطان کا بیان ہے، کہ میں نے سفیان ثوری اور شعبہ کے بعد ہشیم سے زیادہ حافظہ رکھنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ (مرآۃ الجنان ج۱ ص۳۹۳)

امام الجرح والتعدیل عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے، کہ ہشیم کا مرتبہ حفظ حدیث میں امام ثوری سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

(العبر ج۱ ص۲۸۶)

عبداللہ بن مبارک جو ہشیم کے شاگرد خاص تھے، بیان کرتے ہیں، کہ مرور وقت کی بنا پر بہت سے محدثین کا حافظہ آخر عمر میں متاثر ہو جایا کرتا تھا، لیکن ہشیم کی قوت حفظ پر وقت کی پرچھائیں بھی نہ پڑ سکی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۲۲۹)

ان کے بارے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی ایسی منامی بشارتیں بھی منقول ہیں، جو یقیناً ہشیم کے علوے مرتبت اور جلالت شان کا ایک بڑا ثبوت ہیں۔

اسحاق الزیادی سے مروی ہے، کہ میں بغداد میں ہشیم کی صحبت میں برابر آیا جایا کرتا تھا، وہیں ایک ثقہ شخص نے بیان کیا، کہ ایک شب اس نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، آپ نے دریافت فرمایا، کہ تم لوگ کس سے حدیث کا سماع کرتے ہو؟ عرض کیا کہ ہمیں ہشیم بن بشیر سے کسب فیض کی سعادت نصیب ہے، اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا، شخص موصوف نے اپنی بات دوبارہ عرض کی، یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا:

نعم اسمعوا من هشيم فنعم الرجل من هشيم .

ہاں ہاں ٹھیک ہے ہشیم سے سماع کرو کیوں کہ وہ بہت ہی اچھا آدمی ہے۔

مشہور بزرگ معروف الکرخی بیان کرتے ہیں، کہ مجھے ایک شب حالت منام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی، میں نے دیکھا، کہ آپ ہشیم سے فرما رہے ہیں:

یا ھشیم جزاك الله تعالیٰ من امتی خیرا :

اے ہشیم تمہیں اللہ تعالیٰ میری امت کی طرف سے جزاے خیر دے۔

(۲) امام محمد بن جعفر غندر ۱۹۳ھ

محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت اور غندر لقب تھا۔ (مرأۃ الجنان ج ۱ ص ۴۴۳)

ہذیل بن مدرکہ سے نسب ولار رکھنے کے باعث ہذلی اور وطن کی طرف منسوب ہو کر بصری کہلاتے ہیں، لیکن غندر کے لقب سے زیادہ مشہور ہوئے۔

علم و فضل کے اعتبار سے شیخ غندر بلند مرتبہ اور جلیل القدر حفاظ حدیث میں تھے، امام شعبہ کے دامن فیض سے کامل بیس سال تک وابستہ رہے، اس طویل صحبت نے فضائل و کمالات میں اپنے استاذ کا جانشیں بنا دیا اور اسی بنا پر مرویات شعبہ کے باب میں ان کا پایہ باتفاق علما سب سے بلند ہے، چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

احد الاثبات المتقنین و لا سیما فی شعبة ۔ (میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۶)

وہ ارباب اتقان میں سے تھے، بالخصوص امام شعبہ کے باب میں ان کا تثبت مسلم تھا۔

حدیث رسول کی تحصیل انہوں نے امام شعبہ کے علاوہ سعید بن ابی عروبہ، معمر بن راشد، ابن جریج، ہشام بن حسان، سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ وغیرہ سے کی تھی، خود ان سے مستفیض ہونے والوں میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی، ابو بکر بن ابی شیبہ، قتیبہ، عثمان بن شیبہ اور ابو بکر بن خلاد کے نام نمایاں ہیں۔

(تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۹۲)

تمام علما اس بات پر متفق ہیں، کہ شیخ غندر کی مرویات حجت اور قابل قبول ہیں، علامہ ابن کثیر رقم طراز ہیں:

کان ثقة جلیلا حافظا متقنا ۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۲۴)

وہ ثقہ جلیل المرتبت حافظ اور صاحب اتقان تھے۔

اتقان، تثبت اور ثقاہت ان کے نمایاں جوہر تھے، ایسے شیوخ حدیث کم ہی ہیں، جن کی مرویات پر کسی نے جرح کی جرأت نہ کی ہو، بلاشبہ ان ہی مستثنیات میں امام غندر بھی ہیں، ابن معین کا بیان ہے کہ بعض معاصر علما نے شیخ غندر کی مرویات میں خامی نکالنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ ناکام رہے اور برملا اعتراف عجز کیا، کہ "ما وجدنا شیئا" ہم کو کچھ نہیں ملا۔

(میزان الاعتدال)

امام الجرح والتعدیل عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے:

غندر فی شعبة اثبت منی ۔(ایضا)

غندر امام شعبہ کے باب میں مجھ سے زیادہ تثبت رکھتے ہیں۔

امام غندر ان علمائے متقنین میں سے تھے، جن کی کتاب یعنی مجموعہ روایات اپنی صحت وثقاہت کی وجہ سے سند کا مقام رکھتی ہے، چنانچہ ابن معین فرماتے ہیں:

کان من اصح الناس کتابا ۔(العبر فی خبر من غبر ج۱ ص ۳۱۱)

امام وکیع ان کو صحیح الکتاب کہا کرتے تھے، عبدالرحمٰن بن مہدی کا ارشاد ہے، ہم لوگ امام شعبہ کی زندگی ہی میں غندر کے خزینہ روایات سے استفادہ کرنے لگے تھے۔

(۳) امام یحییٰ بن سعید قطان ۱۲۰ھ تا ۱۹۸ھ

حافظ الحدیث امام جرح وتعدیل یحییٰ بن سعید قطان بصرہ کے باشندے تھے، وہیں ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے، نسبی تعلق احرار عرب سے تھا، آپ کے دادا فروخ بنوتمیم کے آزاد کردہ غلام تھے، اسی نسبت سے تمیمی کہے جاتے ہیں، یحییٰ قطان نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، وہ قال اللہ وقال الرسول کے غلغلوں سے معمور تھا، قدرت نے انہیں حفظ وضبط کی بے مثال قوت سے نوازا تھا، وہ بے شمار احادیث کے حافظ تھے، کتاب سامنے رکھ کر حدیث بیان نہ کرتے تھے، بڑے بڑے ائمہ حدیث آپ کی قوت حفظ وضبط کے قائل تھے۔

سلیمان بن اشعث نے ایک دفعہ امام احمد سے پوچھا، کیا یحییٰ آپ کو اپنے حافظہ سے روایت سناتے تھے؟ فرمایا ہم نے ان کے پاس کتاب نہیں دیکھی اور وہ ہماری کتاب کی طویل طویل حدیثیں پڑھ دیا کرتے تھے۔

بعض اوقات محدثین امتحان کی غرض سے حدیثوں کو گڈمڈ کر کے ان کے سامنے بیان کرتے، یحییٰ بن سعید بلاتامل سقم روایت اور تدلیس کی نشاندہی کر کے حدیث کو صحیح صحیح بیان فرمادیا کرتے تھے۔

ابن مہدی کا بیان ہے، کہ ایک بار مجھ سے حضرت سفیان نے فرمایا، کہ تم کوئی ایسا آدمی لاؤ جس سے میں حدیث میں مذاکرہ کروں، یہ حضرت یحییٰ بن سعید کو لے کر پہنچ گئے، دونوں میں دیر تک مذاکرہ حدیث ہوتا رہا، جب یحییٰ گھر تشریف لے گئے، تو سفیان نے مجھ سے کہا، کہ ابن مہدی! میں نے تم سے کوئی انسان لانے کو کہا تھا، لیکن تم بجائے انسان کے ایک جن لے آئے، حافظ ذہبی واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اندھش سفیان من حفظه ۔(تذکرہ ج۱ ص ۲۷۶)

سفیان ثوری نے حضرت یحییٰ کے غیر معمولی حافظہ سے مرعوب ہو کر یہ فرمایا تھا۔

یحییٰ بن سعید نے اس غیر معمولی قوت حفظ کے ساتھ علم حدیث کی تحصیل کی تھی، اور وقت کے اکابر مشائخ حدیث سے

تحصیل علم کر کے اپنے دامن کو خوب خوب بھر لیا تھا۔

علم حدیث میں یحییٰ بن سعید کو امتیازی شان حاصل تھی، وہ درجہ امامت پر فائز تھے، عراق میں حدیث کا عام رواج انہیں کی ذات سے ہوا، انہوں نے رواۃ کی تنقید اور جرح وتعدیل کا خاص اہتمام کیا، پھر جو راوی ثقہ ثابت ہوئے ان کی مرویات کو رائج کیا اور جو لوگ ضعیف ثابت ہوئے ان کو ترک کر دیا۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

مارایت احدا اقل خطأ من یحییٰ بن سعید،

میں نے یحییٰ بن سعید سے کم خطا کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔

عجلی فرماتے ہیں:

کان تقی الحدیث لا یحدث الا عن ثقة ۔(تذکرہ ج۱ص۲۷۵)

یحییٰ کی حدیثیں صاف ستھری ہوتی تھیں اور وہ بجز ثقات کے کسی اور سے روایت نہیں کرتے تھے۔

حضرت شعبہ سے وہ بہت قریب تھے، کامل بیس سال تک ان کی خدمت میں رہے اور ہر روز زیادہ سے زیادہ ان سے تیرہ حدیثیں سنتے، شیخ کی بارگاہ سے اس طویل وابستگی کا نتیجہ یہ ہوا، کہ وہ اتنے بڑے محدث ہوگئے، کہ کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تو خود حضرت شعبہ ان کو حکم مقرر کرتے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی نے یحییٰ بن سعید قطان سے دو ہزار حدیثیں اپنے ذخیرہ حدیث میں شامل کر لی تھیں، جنہیں وہ ان کی زندگی ہی میں دوسروں سے روایت کرتے تھے۔ ائمہ حدیث نے آپ کی بلند پایہ محدثانہ شخصیت کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

☆**علی بن مدینی:**۔ ''ما رایت اثبت من یحییٰ القطان''، میں نے یحییٰ بن سعید قطان سے زیادہ پختہ کار کسی کو نہیں دیکھا۔(تہذیب ج۱۱ص۱۹۱)

☆**احمد بن حنبل:**۔ ''مارات عینای مثله''، میری آنکھوں نے یحییٰ بن سعید کا مثل نہیں دیکھا۔ ''کان الیه المنتهیٰ فی التثبت بالبصرة...... لا واللہ ماادرکنا مثله'' بصرہ میں تثبت فی الحدیث ان پر ختم تھا...... خدا کی قسم ہم نے ان کا مثل نہیں پایا۔

☆**ابوزرعہ:**۔ ''کان من الثقات الحفاظ'' یحییٰ ثقات حفاظ حدیث میں تھے۔(تہذیب ج۱۱ص۱۹۲)

☆**ابوحاتم:**۔ ''حجة حافظ''(ایضا)

☆**نسائی:**۔ ''ثقة ثبت مرضی''(ایضا)

یحییٰ بن سعید قطان محض کثیر الروایہ محدث ہی نہ تھے، بلکہ وہ جرح وتعدیل، نقد حدیث اور اسماء الرجال کے امام بھی تھے

اوراس فن میں انہوں نے بڑا درک اور کمال حاصل کر لیا تھا، حفظ حدیث اور تحدیث روایت سے کہیں زیادہ اہم کام یہ ہے، کہ راویان حدیث کے احوال وکوائف کا صحیح علم رکھا جائے، ان کی قوت وضعف ان کے عقیدہ ومسلک ان کی دیانت وتقویٰ سے متعلق جملہ معلومات محفوظ رکھی جائیں اور پھر سلسلہ سند میں راویوں کی ترتیب یاد رکھی جائے تاکہ تدلیس سے سند حدیث کو بچایا جاسکے، امام یحیٰی بن سعید نے یہ کام بڑی ذمہ داری اور حزم واحتیاط کے ساتھ انجام دیا۔ ابن منجویہ کا بیان ہے:

كان من سادات اهل زمانه حفظا وورعا وفهما وفضلا ودينا وعلما وهو الذى مهد لاهل العراق رسم الحديث وامعن فى البحث عن الثقات وترك الضعفاء ۔

(تہذیب التہذیب ج۱۱ص۱۹۳)

وہ اپنے زمانہ میں حفظ وورع، عقل، فضل، دین اور علم کے سردار تھے، انہوں نے اہل عراق کے لیے حدیث کی بساط بچھائی اور ثقہ راویوں کے قبول کرنے اور ضعیف راویوں کے ترک کردینے میں انہوں نے کافی غور وخوض کیا اور تلاش وتفتیش کی۔

امام جرح وتعدیل ابن مدینی کہتے ہیں:

ما رايت اعلم بالرجال من يحيىٰ القطان ولا رايت اعلم بصواب الحديث والخطأ من ابن مهدى فاذا اجتمعا فى ترك رجل تركته واذا اخذ عنه احدهما حدثت عنه ۔ (ایضاص۱۹۱)

میں نے یحیٰی بن سعید سے زیادہ علم رجال کا اور عبدالرحمٰن بن مہدی سے زیادہ حدیث کی خطا وصواب کا جاننے والا کسی کو نہیں دیکھا، چنانچہ یہ دونوں جس راوی کو ضعیف قرار دیتے ہیں اس کو ترک کردیتا ہوں اور جن رواۃ سے یہ روایتیں قبول کرلیتے ہیں میں بھی قبول کرلیتا ہوں۔ (ایضا)

امام یحیٰی قطان کے تبحر علمی اور کمال فن کی بنا پر امت کے اکابر ان کا حد درجہ احترام کیا کرتے تھے، خلیل کہتے ہیں، وہ کسی اختلاف کے بغیر مسلم امام تھے اور بصرہ میں امام مالک کے اصحاب میں سب سے زیادہ جلیل القدر تھے۔

ظاہری شکل وصورت کے لحاظ سے وجیہہ نہ تھے، دیکھنے میں ایک معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے، لیکن ان کی علمی تمکنت اور وقار کا یہ عالم تھا، کہ وہ عصر کی نماز سے فارغ ہوکر مسجد ہی میں ٹیک لگا کر بیٹھتے اور ان کا حلقہ درس قائم ہوتا تو بڑے بڑے اساطین علم حدیث جن میں علی بن مدینی امام احمد بن حنبل، یحیٰی بن معین جیسے اکابر شامل ہوتے تھے، باادب کھڑے ہوکر ان سے حدیث کے متعلق استفسارات کرتے رہتے تھے۔ (تہذیب ج۱۱ص۱۹۲)

ابن عمار کہتے ہیں:

كنت اذا نظرت الى يحيىٰ بن سعيد ظننت انه لا يحسن شيئا كان يشبه النجار فاذا تكلم انصت له الفقهاء ۔ (تذكره ج ١ ص ٢٧٥)

جب میں یحییٰ قطان کو دیکھتا تو بظاہر وہ ایک بڑھئی معلوم ہوتے تھے، میرا خیال تھا، کہ یہ کسی مسئلہ کی نسبت کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکیں گے، لیکن جب وہ تقریر شروع کرتے تھے، تو بڑے بڑے فقہا خاموش ہوکر اسے سنتے تھے۔

(۴) حضرت امام عبدالرحمٰن بن مہدی ۱۳۵ھ تا ۱۹۸ھ

اسم گرامی عبدالرحمٰن، ابوسعید کنیت والد کا نام مہدی تھا، یہ قبیلہ ازد کے مولیٰ تھے، آپ کے خاندان میں موتیوں کا کاروبار ہوتا تھا اس لیے لولوی بھی مشہور ہیں، آپ غلامان اسلام سے ہونے کے باوجود علم و فضل میں اتنے ممتاز ہوئے، کہ یحییٰ بن معین اور یحییٰ بن سعید قطان کے ہم پلہ سمجھے جاتے ہیں اور زمرہ تبع تابعین میں امامت فی الحدیث کا درجہ رکھتے ہیں۔

آپ کی ولادت بمقام شہر بصرہ ۱۳۵ھ میں ہوئی، جو اس وقت علم و فضل کا مرکز تھا، چوں کہ بصرہ میں مختلف قوم و نسل کے لوگ آباد تھے اور اس اختلاط سے ایک بری رسم جو بصرہ میں قائم ہوئی وہ پند و موعظت کی مجلسوں میں قصہ گوئی کا عام رواج تھا، قصہ گو واعظوں کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی، چنانچہ ابن مہدی نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں، تو انہیں قصہ گویوں کی صحبت اختیار کرلی، ابوعامر عقدی کہتے ہیں، کہ وہ قصّاص کے پاس جایا کرتے تھے، ایک دن میں نے ان سے کہا، کہ ان قصہ گویوں کی صحبت سے تمہارے ہاتھ کچھ نہ آئے گا، چنانچہ میری یہی نصیحت ان کو علم حدیث کی طرف مائل کرنے کا سبب بن گئی، پھر یہ طلب اتنی بڑھی کہ بصرہ سے سیکڑوں میل دور دیار نبی (مدینہ منورہ) پہنچے اور امام مالک کے حلقہ درس میں شریک ہوکر علم کی پیاس بجھائی۔ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۰)

ابن مہدی نے بڑے ذوق اور انہماک سے تابعین اور تبع تابعین کے حلقہ درس سے خوب خوب استفادہ کیا۔

ابن مہدی نے وقت کے جلیل القدر ائمہ فن کی بارگاہوں سے علم حدیث کا جو حظ وافر اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا، اس نے ان کو وقت کا امام اور مرجوعۂ خلائق بنا دیا تھا، علم حدیث میں آپ کی بلند پایہ شخصیت کا اعتراف وقت کے بڑے بڑے ائمہ حدیث نے کیا ہے۔

☆ **احمد بن حنبل:۔** ”مارایت بالبصرۃ مثل یحییٰ بن سعید وبعدہ عبدالرحمن وعبدالرحمن افقہ الرجلین ...... اذا اختلف وکیع وعبدالرحمن فعبدالرحمن اثبت لانہ اقرب عہدا بالکتاب“ میں نے بصرہ میں یحییٰ بن سعید اور ان کے بعد عبدالرحمٰن بن مہدی جیسا عالم نہیں دیکھا، عبدالرحمٰن یحییٰ سے بڑے فقیہ تھے، جب وکیع اور عبدالرحمٰن اختلاف کریں، تو عبدالرحمٰن زیادہ پختہ کار ہیں، کیوں کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں حدیث کا سرمایہ تازہ بہ تازہ جمع کیا ہے۔ (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۵۱)

☆ **علی بن مدینی:۔** ”کان عبدالرحمن بن مہدی اعلم الناس ...... لو حلفت بین الرکن والمقام لحلفت باللہ انی لم ار احدا قط اعلم بالحدیث من عبدالرحمن بن مہدی ...... ماشبہت علم عبدالرحمن

بالحدیث الا بالسحر، 'عبدالرحمٰن بن مہدی لوگوں میں سب سے بڑے عالم تھے...... اگر میں رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان کھڑا ہو کر قسم کھاؤں تب بھی یہی کہوں گا کہ میں نے ان سے بڑا عالم حدیث کوئی نہیں دیکھا...... حدیث کے بارے میں عبدالرحمٰن کا علم جادو کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ایضا)

☆**ابو حاتم:۔** ''ھو اثبت اصحاب حماد بن زید وھو امام فقه اثبت من یحییٰ بن سعید واتقن من وکیع وکان یعرض حدیثه علی الثوری' 'وہ حماد بن زید کے اصحاب میں اثبت اور ثقہ امام تھے، یحییٰ بن سعید سے اثبت اور وکیع سے اتقن تھے اور وہ ثوری کے سامنے حدیث بیان کرتے تھے۔ (ایضا)

☆**ابن حبان:۔** ''کان من الحفاظ المتقنین واھل الورع فی الدین ممن حفظ وجمع وتفقه وصنف وحدث وابی الروایة الا عن الثقات' 'وہ متقن حفاظ حدیث میں تھے اور دین میں صاحب تقویٰ یہ ان علما میں تھے، جنہوں نے علم حدیث حفظ کیا اور جمع کیا، تفقہ پیدا کیا، کتابیں لکھیں، حدیث بیان کی اور انہوں نے غیر ثقہ لوگوں سے روایتیں قبول نہیں کیں۔ (ایضا)

امام ابن مہدی حفظ وضبط میں بھی یکتائے روزگار تھے، جو سنتے یاد رکھتے اور مجال نہیں کہ اس میں کوئی غلطی یا خطا واقع ہو جائے، اسی بنا پر لوگ ان کی مہارت حدیث کو جادو سے تعبیر کرتے تھے، محمد بن یحییٰ کہتے ہیں، میں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کے ہاتھوں میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی، میں نے ان سے جو کچھ سنا ہے، وہ اپنی یاد سے روایت کرتے تھے۔

(تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۷)

امام ابن مہدی اس بات کی کوشش کرتے، کہ روایت باللفظ کریں، اسماعیل بن اسحاق القاضی کا بیان ہے، کہ علی بن مدینی غایت درجہ محتاط تھے، ایک دن انہوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی کا امتحان لینے کی غرض سے ان کے سامنے کوئی حدیث خلط ملط کر کے پیش کی، لیکن انہوں نے فوراً پہچان لیا اور کہا، کہ یہ حدیث فلاں شخص سے اس طرح مروی ہوگی، بعد میں ہم نے اس کی تحقیق کی تو واقعی وہ حدیث اسی طرح نکلی۔ (تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۴۵)

قواریری کہتے ہیں:

املی علی ابن مهدی عشرین الف حدیث حفظا ۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۳۰۲)

امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے مجھے بیس ہزار احادیث زبانی املا کرائیں۔

شب و روز کی ممارست اور صحیح قوت فیصلہ کی وجہ سے ان میں تنقید حدیث کا ایک ایسا ملکہ پیدا ہو گیا تھا، کہ وہ بیک نظر صحیح کو سقیم سے جدا کر لیتے۔

عبیداللہ بن سعید کہتے ہیں، میں نے امام عبدالرحمٰن بن مہدی کو فرماتے سنا:

لایجوز ان یکون الرجل اماما حتی یعلم مایصلح مما لایصلح ۔ (ایضا)

کسی شخص کو جب تک وہ صحیح اور غیر صحیح احادیث میں تمیز نہیں کر سکتا، امامت کا درجہ دینا جائز نہیں۔

علم حدیث میں ان کا شماران اساطین امت میں ہوتا ہے، جن کے ذریعہ فن اہل ہوس کی دست برد سے محفوظ و مامون رہا، وہ جرح وتعدیل کے امام تھے، انہیں صحیح وسقیم احادیث کا ملکہ حاصل تھا، نعیم بن حماد نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے دریافت کیا:

کیف تعرف الکذاب قال کما یعرف الطبیب المجنون ۔(ایضا)

آپ حدیث میں جھوٹے کو کیسے معلوم کر لیتے ہیں، فرمایا جیسے طبیب دیوانے کو معلوم کر لیتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل فرماتے تھے، ابن مہدی جس شخص کی روایت قبول کر لیں سمجھو کہ وہ حجت ہے۔

(تاریخ بغداد ج۱۰ص۲۴۳)

جرح وتعدیل اور معرفت رجال میں آپ کا مرتبہ بہت بلند تھا، راویوں کی معرفت کا ملکہ فطری تھا، براوی کی گفتگو ہی سے اس کی حیثیت کا پتہ لگا لیتے تھے اور طبیب حاذق کی طرح اس کی صحت وضعف کو معلوم کر لیتے۔

ابن مہدی نے جس لگن اور ذہانت کے ساتھ علم کی تحصیل کی تھی اس کا لازمی نتیجہ تھا، کہ آپ ابتدا ہی سے مرجوعہ خلق بن گئے تھے، لوگ دین ودنیا کے مسائل اور حدیث کے حصول کے لیے آپ کی بارگاہ میں جوق در جوق حاضر ہوا کرتے تھے، ایوب بن متوکل کا بیان ہے:

کنا اذاارد نا ان ننظر الی الدین و الدنیا ذھبنا الی دار عبدالرحمن بن مھدی ۔

(تذکرہ ج۱ص۳۰۲)

ہمیں جب کبھی کسی دینی ودنیاوی معاملہ میں غور کرنے کی ضرورت ہوتی تھی، ہم عبدالرحمٰن بن مہدی کے گھر چلے جاتے تھے۔

ابن مہدی کے پاس احادیث نبوی کا بہت بڑا سرمایہ موجود تھا اور ان کے پاس حدیثوں اور سندوں کی جانچ کا معیار بھی موجود تھا، وہ اصول روایت ودرایت میں امتیازی شان رکھتے تھے، جو شخص دین کی روح اور ماخذ فقہ سے کامل آگاہ ہو اس کے تفقہ فی الدین میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے، ابن مہدی امام حدیث ہونے کے ساتھ بڑے فقیہ بھی تھے، امام احمد بن حنبل جو خود بڑے محدث اور عظیم فقیہ تھے فرماتے ہیں، بصرہ میں دو غیر معمولی عالم پیدا ہوئے ایک یحییٰ بن سعید دوسرے عبدالرحمٰن بن مہدی مگر تفقہ میں ابن مہدی کا پلہ بھاری تھا۔

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

کان عبدالرحمن فقیھا بصیرا بالفتویٰ عظیم الشان ۔(تذکرہ ج ۱ ص ۳۰۳)

امام عبدالرحمٰن بن مہدی عظیم الشان فقیہ اور بلند پایہ مفتی تھے۔

علی بن مدینی کہا کرتے تھے، مدینہ منورہ کے فقہائے سبعہ کے فتاوے کا امام زہری پھر امام مالک اور ان کے بعد

عبدالرحمٰن کو سب لوگوں سے زیادہ علم تھا۔ (ایضا)

(۵) امام ابوداؤد طیالسی م ۲۰۴ھ

اسم گرامی سلیمان، ابوداؤد کنیت ہے، سلسلہ نسب یہ ہے: سلیمان بن داؤد بن جارود۔ آپ فارسی الاصل ہیں۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۲۷۰)

ولادت ۱۳۳ھ میں ہوئی اور وہ آل زبیر قریشی کے مولیٰ تھے، یہی وجہ ہے، کہ فارسی، بصری، طیالسی کی نسبت سے یاد کیے جاتے تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور نسبت طیالسی ہے، یہ طیالسہ کی جانب منسوب ہے، جو طیلسان کی جمع ہے، یہ ایک قسم کی چادر ہوتی تھی، جسے اہل عرب دستار کے اوپر اوڑھا کرتے تھے۔

ابوداؤد نے جب بصرہ میں آنکھ کھولی، تو وہ فروغ علم کا سنہری دور تھا، اسلامی بلاد وامصار میں علوم وفنون کے دھارے چل رہے تھے، آپ نے اپنے ذوق وشوق اور فطری حفظ وضبط کی مدد سے مروجہ علوم وفنون حاصل کیے، طلب علم کی خاطر بغداد، اصفہان اور دوسرے مراکز علم کا سفر بھی کیا، ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں ''کتبت عن الف شیخ'' میں نے ایک ہزار شیوخ سے حدیثیں لکھی ہیں۔ (تہذیب ج ۴ ص ۱۶۲)

امام ابوداؤد نے اپنے زمانہ کے متداول علوم وفنون سیکھے، مگر انہیں علم حدیث میں اتنا کمال حاصل ہوا، کہ وہ امامت کے درجہ پر فائز ہو گئے، ان کا حافظہ بہت قوی تھا، تحصیل حدیث کے لیے جس غیر معمولی قوت حفظ وضبط کی ضرورت ہوتی ہے، قدرت نے یہ ملکہ وافر مقدار میں آپ کو ودیعت فرمایا تھا اور وہ اس وصف میں اپنے معاصرین سے بدرجہا برتر تھے۔

☆ فلاس وعلی بن مدینی:۔ ''ما رایت احفظ منه'' میں نے ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۳۲۱)

☆ عمرو بن شیبہ:۔ ''کتبوا عن ابی داؤد من حفظه اربعین الف حدیث'' محدثین نے ان سے چالیس ہزار حدیثیں زبانی لکھیں۔ (ایضا)

عدالت وثقاہت میں ان کا مرتبہ کافی بلند تھا، علمائے جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے:

☆ عبدالرحمٰن بن مہدی:۔ ''هو اصدق الناس'' وہ لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۲۷۰)

☆ ابومنذر نعمان:۔ وہ معتمد ثقہ تھے۔

☆ ابن معین:۔ ابوداؤد اصدق ہیں اس لیے وہ مجھے زیادہ پسند ہیں۔

☆ امام احمد بن حنبل:۔ وہ ثقہ اور صدوق تھے۔

☆ خطیب:۔ ''کان حافظا مکثرا ثقة ثبتا'' ابوداؤد حافظ مکثر الروایہ معتمد اور پختہ کار تھے۔

(تہذیب ج ۴ ص ۱۶۲)

امام ابوداؤد محض حافظ الحدیث اور بڑے ناقل ہی نہ تھے، بلکہ احادیث کی پرکھ میں بھی مہارت رکھتے تھے، بندار کا بیان

ہے، وہ حفظ اور معرفت حدیث کے لحاظ سے نہایت برتر تھے، امام وکیع حدیث میں ابوداؤد کی غیر معمولی واقفیت اور تمیز کی بنا پر ان کو جبل العلم کہتے تھے، یحییٰ بن معین ان کو عبدالرحمٰن بن مہدی سے بھی زیادہ صاحب علم اور حدیثوں کا واقف کار بتاتے ہیں، ان کے شیخ امام شعبہ کو ان کے علم وتمیز پر اتنا اعتماد تھا، کہ اپنی عدم موجودگی میں ان کو مسند درس پر رونق افروز ہونے کی اجازت دے دیتے تھے۔

کتب حدیث میں مسانید کے جو مجموعے مشہور ہیں، ان میں مسند ابوداؤد طیالسی کو خاص اہمیت حاصل ہے، وہ دوسرے مسانید پر تقدیم کی فضیلت رکھتی ہے، بعض علمائے اسلام نے اس کو سب سے قدیم مسند قرار دیا ہے، محدث حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے، علمائے اسلام میں عبیداللہ موسیٰ اور ابوداؤد طیالسی نے سب سے پہلے تراجم رجال پر مسانید مرتب کیے۔

(الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۵۲)

مسند گیارہ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں بڑی حد تک مسانید کے تمام اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہے

(۶) حافظ اکبر امام عبدالرزاق ۱۲۶ھ تا ۲۱۱ھ

اسم گرامی عبدالرزاق، ابوبکر کنیت، سلسلہ نسب یہ ہے: عبدالرزاق بن ہمام بن نافع۔ یمن کے پایہ تخت صنعاء کے رہنے والے تھے آپ کے والد ہمام ثقہ تابعین میں شمار ہوتے تھے، ابتدا میں اپنے والد اور مقامی شیوخ سے علم حاصل کیا، تجارت کے لیے اسلامی بلاد وامصار کے سفر کیے اور وہاں کے شیوخ سے استفادہ کیا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

رحل فی تجارة الی الشام ولقی الکبار ۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۳۳۱)

وہ تجارت کی غرض سے شام جاتے اور وہاں کے کبار علما کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

غیر معمولی قوت حفظ وضبط کے مالک تھے، ابراہیم بن عباد زہری کا بیان ہے، کہ ان کو سترہ ہزار حدیثیں یاد تھیں۔

(الاعلام ج ۴ ص ۵۱۹)

امام عبدالرزاق نے بیس سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ میں مہارت پیدا کر لی تھی، انہوں نے مشہور امام فن معمر بن راشد کی بارگاہ میں کامل سات سال گزارے تھے، خود کہتے ہیں ”**جالست معمرا سبع سنین**“ (تذکرہ ج ۱ ص ۳۳۱) ان کے زمانے میں امام معمر کی مرویات کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا۔ امام احمد کہتے ہیں ”**کان عبدالرزاق یحفظ حدیث معمر**“ (ایضا)

عبدالرزاق بن ہمام علم وفن میں امتیازی شان رکھتے تھے، تبحر علمی، مہارت فن، قوت حفظ وضبط میں نہایت بلند مقام پر فائز تھے، ان کے علم وفضل کا اعتراف ارباب علم نے اس طرح کیا ہے:

☆ **خیرالدین زرکلی:** ”**من حفاظ الحدیث الثقات**“ وہ ثقہ حفاظ حدیث میں سے تھے۔

☆ **حافظ ذہبی:** ”**احد الاعلام الثقات**“ وہ بڑے ثقہ عالم تھے۔ (تذکرہ ج ۱ ص ۳۳۱)

☆ **ہشام بن یوسف:۔** ’’کان عبدالرزاق اعلمنا و احفظنا‘ ‘عبدالرزاق ہم میں سب سے بڑے عالم اور حافظ الحدیث تھے۔ (تہذیب ج۶ص ۲۷۹)

☆ **احمد بن صالح** کہتے ہیں میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا ’’رایت احدا احسن حدیثا من عبدالرزاق قال لا‘‘ کیا آپ نے کسی کو عبدالرزاق سے عمدہ حدیث والا پایا؟ انہوں نے جواب دیا نہیں!۔ (ایضا)

☆ **ابوزرعہ** کا بیان ہے میں نے امام احمد سے پوچھا ’’من اثبت فی ابن جریج عبدالرزاق او البرسانی قال عبدالرزاق ‘‘ابن جریج کے باب میں عبدالرزاق اثبت ہیں یا برسانی؟ انہوں نے کہا، عبدالرزاق۔ (ایضا)

ماہرین علم حدیث امام عبدالرزاق کی صداقت وعدالت پر متفق ہیں، ان کے ثقہ وعادل ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ ان کی احادیث صحاح ستہ میں مرقوم ہیں۔

امام عبدالرزاق کے فضل وکمال کا شہرہ سن کر اقصاے عالم سے تشنگان علم کا ہجوم سیل رواں بن کر ان کے پاس آنے لگا اور شہر صنعا قال اللہ وقال الرسول کے نغموں سے معمور ہو گیا، ان کے استاذ معمر بن راشد نے پیشین گوئی کی تھی ’’اما عبد الرزاق فان عاش فخلیق ان تضرب الیہ اکباد الابل ‘‘اگر عبدالرزاق کی زندگی رہی تو لوگ دور دراز مقامات سے سفر کر کے اس کے گرد ہجوم کریں گے۔ (تہذیب ج۶ص ۲۷۹)

یہ پیشین گوئی حرف بحرف حقیقت ہو کر رہی، مورخین کا بیان ہے، کہ عہد رسالت کے بعد کوئی شخصیت اتنی مرجوعِ خلائق اور پر کشش ثابت نہ ہو سکی۔ علامہ یافعی نے آپ کو ’’المرتحل الیہ من الآفاق‘‘ لکھا ہے یعنی وہ شخص جس کے پاس لوگ مختلف اطراف واکناف سے آتے تھے۔ (مراۃ الجنان ج۲ص ۵۲)

ابن اثیر لکھتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے پاس اس قدر کثرت سے لوگ نہیں آئے جتنے ابن ہمام کے پاس آئے۔ (اللباب فی تہذیب الانساب ج۲ص ۶۱)

امام عبدالرزاق متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے، مگر ان کی اکثر کتابیں امتداد زمانہ کی وجہ سے ناپید ہو چکی ہیں، بعض کے نام یہ ہیں: جامع یا سنن عبدالرزاق، کتاب السنن فی الفقہ، کتاب المغازی، تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، مصنف عبدالرزاق، یہ کتاب نہایت اہم اور مشہور کتاب ہے، اس میں حدیثوں کو ابواب فقہ پر ترتیب دیا گیا ہے، ابوبکر بن ابی شیبہ کی مصنف اگرچہ مجموعی حیثیت سے زیادہ اہم اور وقیع ہے، لیکن قدامت کے لحاظ سے وہ بھی اس مصنف سے کم پایہ ہے، مصنف عبدالرزاق کی خصوصیت یہ ہے، کہ اس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں، امام احمد کے اہم شیوخ اسماعیل بن علیہ سفیان بن عیینہ وکیع بن جراح اور یزید بن ہارون رضی اللہ عنھم کے تذکرے گزشتہ صفحات میں آچکے ہیں۔

* * *

مسند درس حدیث وافتا

امام صاحب کے زمانے میں علم حدیث کا فن اپنے تمام مصادر کے ساتھ بروئے کار آچکا تھا، اس عہد میں اتصال فکری بھی کامل ہو چکا تھا، نیز علوم متفرقہ اور دین کے علوم میں ایک تعلق اور رشتہ پیدا ہو چکا تھا، ان میں سے متعدد علوم وفنون میں امام احمد نے درک حاصل کیا اور جس علم وفن کو زیادہ مفید سمجھا اس میں گہری دلچسپی لی، فصل جب پک گئی، تب اسے کاٹا، درخت کی جڑیں جب اچھی طرح زمین میں تہہ نشیں ہوگئیں، شاخیں ہری بھری ہوگئیں، تب برگ وبار لانے کا وقت آیا، لوگوں نے یہ منظر دیکھا اور مسرور ہوئے۔

یہ وہ وقت تھا، جب امام احمد تحدیث وافتا کی مسند پر متمکن ہوئے، حافظ ابن جوزی فرماتے ہیں:

ان احمد لم ینصب نفسه للحدیث والفتویٰ الا بعد ان بلغ الاربعین ۔ (ابن حنبل ص ۳۰)

امام احمد نے جب تک زندگی کی چالیس منزلیں نہ طے کرلیں، حدیث وافتا کی مسند پر نہ بیٹھے، چنانچہ اس سلسلہ میں یہ حکایت بیان کی جاتی ہے، کہ

امام احمد کا ایک معاصر ۲۰۳ھ میں بسلسلہ طلب حدیث ان کے پاس پہنچا، لیکن انہوں نے حدیث بیان کرنے سے انکار کردیا، اس کے بعد وہ امام عبدالرزاق بن ہمام کے پاس یمن گیا، پھر ۲۰۴ھ میں بغداد واپس آیا، تو دیکھا، کہ امام احمد حدیث بیان کررہے ہیں اور لوگ ان پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ (ایضا)

چالیس سال کی پختہ عمر اور حدیث وفقہ میں کامل درک ووثوق حاصل کرنے کے بعد ہی انہوں نے یہ ذمہ دار منصب اختیار کیا، ان کے حزم واحتیاط کا یہ عالم تھا، کہ اپنے اساتذہ کی زندگی میں ان کی مرویات کا درس نہ دیتے، ایک مرتبہ ان کے کسی معاصر نے استدعا کی کہ وہ کوئی ایسی حدیث روایت کریں، جو امام عبدالرزاق سے سنی ہو، لیکن انہوں نے انکار کردیا، کیوں کہ حافظ عبدالرزاق اس وقت زندہ تھے۔

تحدیث وافتا کی مسند پر چالیس سال کی عمر سے قبل رونق افروز نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا، کہ امام احمد حدیث وسنت کی پیروی کو ہر معاملے میں ضروری قرار دیتے تھے، ان کی اتباع رسول کا یہ عالم تھا، کہ جب وہ پچھنا لگواتے تو حجام کو ایک دینار دیتے تھے، کیوں کہ حدیث میں ہے:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم احتجم واعطی اباطیبة دینارا ۔ (بخاری کتاب البیوع)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنا لگوایا اور ابوطیبہ کو ایک دینار عطا فرمایا۔

امام احمد چھوٹے چھوٹے معاملات میں اتباع سنت کا التزام فرماتے، تو مناسب یہ تھا، کہ وہ اس امر جلیل میں بھی اتباع رسول کے فرض سے پوری طرح عہدہ برآ ہوں۔ ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں:

> **لقد بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الاربعین وبلغ رسالۃ ربہ فی ھذہ السن ولم یرسلہ اللہ رحمۃ للناس الا فیھا فلا بد ان احمد المتبع المقتدی استحییٰ ان یجلس للفتیا والحدیث الا بعد ان بلغ الاربعین وبعد ان تکامل نموہ فی الجسم والروح۔** (ابن حنبل ص ۳۱)
>
> حضور صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں دعوت اسلام کے لیے مبعوث ہوئے، پس ضروری تھا، کہ چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے امام احمد بھی مسند درس وافتا پر بیٹھنے سے اجتناب کرتے یعنی جب تک جسم وروح کا نمو مکمل نہ ہو جائے۔

حجاج بن شاعر کا بیان ہے، کہ میں نے ۲۰۳ھ میں احمد بن حنبل کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے حدیث بیان کرنے کی گزارش کی، انہوں نے انکار کردیا، اس کے بعد میں عبدالرزاق صنعانی کے پاس یمن چلا گیا، ۲۰۴ھ میں وہاں سے لوٹ کر بغداد آیا، تو دیکھا، کہ احمد بن حنبل نے درس شروع کردیا تھا اور لوگوں کی بھیڑ ان کے یہاں جمع تھی، اس وقت ان کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی۔

مسند درس وافتا پر فائز ہونے سے قبل ہی امام احمد کے علم وفضل، زہد وورع کا ڈنکا بلاد اسلامیہ کے اندر بجنے لگا تھا، لہٰذا جب انہوں نے مجلس درس قائم کی، تو بلاد اسلامیہ کے تشنگان علوم جوق در جوق آپ کے گرد جمع ہونے لگے، حاضرین درس کی تعداد بعض رواۃ کے مطابق پانچ ہزار نفوس کے قریب تھی، جن میں پانچ سو تلامذہ وہ تھے، جو درس کو لکھ لیا کرتے تھے، یہ نقل وکتابت کرنے والے لوگ ان کے گروہ تلامذہ کے خاص خاص افراد تھے۔ اس کثرت کے پیش نظر امام احمد نے اپنا حلقہ درس بغداد کی جامع مسجد میں قائم کیا تھا، مسجد کے علاوہ مخصوص حلقہ درس ان کے گھر پر بھی قائم ہوتا، جس میں ان کے صاحبزادگان اور مخصوص تلامذہ شریک ہوتے۔

امام احمد کی مجلس درس میں طالبان علوم نبویہ کے علاوہ کچھ لوگ حصول برکت کے لیے بھی شریک درس ہوتے، کچھ لوگ وعظ وپند سننے کی غرض سے حاضر ہوتے، کچھ لوگ اس امام کے حالات وکوائف جاننے والے سیرت وکردار کو دیکھنے کے لیے حاضر ہوتے، ان کا ایک معاصر کہتا ہے:

> **اختلفت الی ابی عبداللہ احمد بن احمد اثنتی عشرۃ سنۃ وھو یقرأ المسند علی اولادہ فما کتبت منہ حدیثا واحدا وانما کنت امیل الی ھدیہ واخلاقہ وآدابہ۔**

(المناقب لابن الجوزی ص ۲۱۰)

میں بارہ سال تک ابوعبداللہ احمد بن حنبل کی خدمت میں حاضر رہا، وہ مسند اپنی اولاد کو پڑھایا کرتے تھے، میں نے اس میں سے ایک حدیث بھی نہیں لکھی، مجھے ان کی جس چیز سے غیر معمولی شغف تھا، وہ تھے، ان کے اخلاق وآداب اور سیرت وکردار۔

علم حدیث وفقہ میں آپ کا فیضان سیل رواں کی طرح اتنا بڑھا، کہ بے شمار طالبان حدیث نے اپنے دامن کو مالا مال کرلیا۔

امام صاحب اپنے شاگردوں کو حدیث میں سند عالی کی ہدایت کرتے اور اس کو اسلاف کی سنت بتاتے تھے، وہ کہتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ ان سے حدیث سن کر کوفہ سے مدینہ جاتے تھے اور حضرت عمر سے ان کو سنتے تھے، حصول علم کے سلسلے میں ریا سے بچنے کی زیادہ سے زیادہ تاکید کرتے، فرماتے تھے، کہ دوات کا اظہار ریا میں داخل ہے، اس سے لوگ سمجھیں گے، کہ یہ حدیث لکھتا پڑھتا ہے۔

جب بغداد سے باہر ہوتے جہاں رہتے، استفادہ کرنے والوں کی ایک بھیڑ ان کے گرد جمع ہوجاتی۔ نوح بن حبیب کہتے ہیں:

رایت احمد فی مسجد الخیف سنة ۱۹۸ ھ مستندا الی المنارة فجاء ہ اصحاب الحدیث فجعل یعلمهم الفقه والحدیث ویفتی الناس ۔ (تهذیب ج ۱ ص ۶۴)

میں نے امام احمد کو ۱۹۸ھ میں (بمقام منیٰ) مسجد خیف میں دیکھا، منارہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے، تو ان کے پاس اصحاب حدیث آئے، وہ انہیں حدیث وفقہ کی تعلیم دینے لگے اور لوگوں کو فتویٰ بتانے لگے۔

امام احمد اپنے طلبہ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے اور ان کے آرام وآسائش کا پورا خیال رکھتے

امام صاحب کی مجلس خالص علمی ہوتی، دوسرا موضوع زیر بحث ونظر نہ آتا اور نہ لایعنی باتیں کی جاتیں، ابوداؤد بجستانی کہتے ہیں، میں نے دوسو ماہرین سے استفادہ کیا، لیکن ان میں امام احمد بن حنبل کے مثل کوئی نہ تھا، وہ کبھی دنیاوی کلام نہ کرتے، جب گفتگو کرتے، تو موضوع سخن کوئی علمی مسئلہ ہی ہوتا۔

امام احمد کی عام مجلس درس نماز عصر کے بعد منعقد ہوتی، شاید انہوں نے یہ وقت اس لیے مقرر کیا تھا، کہ لوگوں کو اس وقت مشاغل حیات سے فرصت ہوا کرتی ہے، لہٰذا عام طور پر لوگوں کو حلقہ درس میں شرکت کا موقع مل جاتا، یہ وقت چوں کہ انتشار واضطراب سے مہلت اور صفائی نفس کا وقت ہے، اس وقت حدیث وافتا سے متعلق جو باتیں سننے میں آتی ہیں، انہیں نفس انسانی بشاشت اور مسرت کے ساتھ قبول کرتا ہے، لہٰذا یہ باتیں دل کی گہرائی میں اتر جاتی ہیں۔

امام احمد کی مجلس درس کی اہم خصوصیتیں یہ تھیں:

(۱) آپ کے حلقہ درس میں تواضع اور اطمینان نفس کے ساتھ وقار وسکون کی کیفیت طاری رہتی تھی، وقار وطمانیت کا یہ

دبدبہ حلقہ درس ہو یا عام مجلس ہر جگہ قائم رہتا تھا، امام صاحب نہ مذاق کرتے نہ لہو ولعب کی باتیں پسند کرتے، ان کی مجلس میں آمد ورفت رکھنے والا ہر شخص آپ کے اس انداز سے باخبر ہوتا، چنانچہ حاضرین مجلس لغو اور لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے، امام کے شیوخ واساتذہ بھی اس بات کا لحاظ رکھتے اور امام صاحب کی موجودگی میں مزاح کی باتوں سے گریز کرتے۔

(۲) امام احمد جو بات کہتے، تحقیق کے ساتھ کہتے، درس حدیث میں جن احادیث کا درس دیتے، پہلے ان کی تحقیق کر لیتے، ان کتابوں کا مطالعہ کرتے، جن میں چھان پھٹک کر حدیثیں مدون کی تھیں، جب وہ کسی قول کو حدیث نبوی قرار دیتے، تو یہ بات اس وقت تک نہ کہتے، جب تک کتابوں میں دیکھ کر اطمینان نہ کر لیتے، تاکہ نقل وبیان میں کسی قسم کی امکانی غلطی کا اندیشہ نہ رہے۔

(۳) وقار وتمکنت حلقہ درس کی اہم خصوصیت تھی، وہ طلب کے بغیر حدیث بیان نہ کرتے، جب تک کوئی بات پوچھی نہ جائے گفتگو کا آغاز نہ فرماتے، تاریخ ذہبی میں مروزی جو امام صاحب کے ساتھی تھے، ان کی مجالس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> لم ار الفقير في مجلس اعز منه في مجلس ابي عبدالله كان مائلا اليهم مقصرا عن اهل الدنيا وكان فيه حلم لم يكن بالعجول بل كان كثير التواضع تعلوه السكينة والوقار اذا جلس مجلسه بعدالعصر لايتكلم حتى يسأل ۔ (تاريخ ذهبي ج ۱ ص ۹۲)
>
> کسی مجلس میں میں نے امام ابوعبداللہ کی مجلس سے زیادہ کسی کم مایہ اور فقیر شخص کو معزز اور ممتاز نہیں دیکھا، وہ دنیا والوں سے میل جول کم رکھتے تھے، حلیم اور بردبار تھے، عجلت کو پسند نہیں کرتے تھے، کثیر التواضع تھے، سکینہ اور وقار ان کی سرشت تھی، اپنی مجلس میں جب عصر کے بعد تشریف فرما ہوتے، تو اس وقت تک خاموش رہتے تھے، جب تک ان سے سوال نہ کیا جائے۔

امام احمد جب مسجد تشریف لے جاتے، تو اپنی کتاب ”کتاب الایمان“ اور ”کتاب الاشربہ“ ساتھ لے جاتے، اس خیال سے کہ لوگ جب مسائل دریافت کریں تو ان کا جواب احادیث نبوی کی روشنی میں دیا جائے، ”کتاب الایمان“ اس لیے ساتھ رکھتے، کہ وہ ایسا زمانہ تھا، جب عقائد میں اضطراب اور کجی وناہمواری کے اسباب پیدا ہو چکے تھے اور ”کتاب الاشربہ“ اس لیے ساتھ رکھتے، کیوں کہ ان دنوں حرام مشروبات کی کثرت ہو گئی تھی اور مختلف قسم کی شرابیں رواج پا رہی تھیں، محتاط اور خدا ترس لوگ خائف رہتے تھے، کہ مبادا بے سمجھے بوجھے حرام کے مرتکب ہو جائیں اور، مشروب حرام کا گھونٹ حلق سے اتار لیں، یہ سمجھتے ہوئے، کہ ان چیزوں کا شمار طیبات میں ہے، جنہیں خدائے بزرگ وبرتر نے حلال فرما دیا ہے۔

ابوحاتم کا بیان ہے:

> اتيت احمد بن حنبل في اول ما التقيت به في سنة ثلاث عشرة ومأتين واذا هو قد اخرج

معه الى الصلوة كتاب الاشربة و كتاب الايمان فصلى فلم يساله احد فرده الى بيته و اتيته يوما آخر فاذا هو قد اخرج الكتابين فظننت انه يحتسب في اخراج ذلك ۔ لان كتاب الايمان اصل الدين و كتاب الاشربة يفرق الناس عن الشر فان اصل كل شر من السكر ۔

(تاریخ ذہبی بحوالہ ابن حنبل ص ۳۴)

میں ۲۱۳ھ میں پہلی بار امام احمد سے ملا، تو میں نے دیکھا، کہ وہ گھر سے مسجد کے لیے نکلے اور ان کے پاس "کتاب الاشربہ" اور "کتاب الایمان" تھی، انہوں نے نماز پڑھی، تو کسی نے ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا، تو اسے گھر لوٹا دیا اور دوسرے دن ان کے پاس آیا، تو وہ آج بھی دونوں کتابیں لے کر باہر تشریف لائے، میں نے گمان کیا، کہ وہ کتابوں کو ثواب کی نیت سے لے کر چلتے ہیں، "کتاب الایمان" اصل دین ہے، "کتاب الاشربہ" میں وہ مسائل ہیں جو آدمی کو شر سے روکتے ہیں، اس لیے کہ ہر شر اور فتنہ کی جڑ نشہ ہے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا، کہ ابن حنبل بغیر سوال کے مسائل بیان نہ کرتے اور مسائل حدیث کی روشنی میں ذکر فرماتے اپنی قوت حفظ وضبط کے باوجود محض حافظہ پر اعتماد کرتے ہوئے، حدیث کی روایت نہ کرتے۔

ان کے صاحبزادے عبداللہ بیان کرتے ہیں:

ما رايت ابى حدث عن حفظه من كتاب الا باقل من مائة حديث ۔ (حلیۃ الاولیاج ۹ ص ۱۶۵)

میں نے اپنے والد کو بغیر کتاب کے صرف یادداشت کی بنا پر حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا، سوائے کچھ حدیثوں کے جن کی تعداد سو سے کم ہوگی۔

امام احمد اپنے شاگردوں کو بھی کتاب سے روایت کرنے کی تاکید فرماتے تھے، کہ کہیں وہ گمرہی کے موجب نہ ہو جائیں، چنانچہ امام علی بن مدینی کتاب دیکھے بغیر کوئی روایت نہ کرتے۔ وہ فرماتے تھے:

ان سيدى احمد بن حنبل امرنى لا احدث الا من كتاب ۔

میرے سردار احمد بن حنبل نے مجھے حکم دیا ہے، کہ بغیر کتاب دیکھے روایت نہ کروں۔

علی بن مدینی امام احمد کے حافظہ کے بارے میں کہتے ہیں:

ليس في اصحابنا احفظ من ابى عبدالله ۔

ہمارے اصحاب میں ابوعبداللہ سے زیادہ قوت حفظ وضبط والا کوئی نہ تھا۔

مجلس درس میں مسائل فقہیہ زیر بحث آتے اور آپ اپنے فقہی آرا ذکر فرماتے، جنہیں بعض تلامذہ لکھ لیا کرتے، لیکن امام احمد کو یہ بات ناپسند تھی، کہ حدیث کے علاوہ ان کے اقوال وآرا ضبط تحریر میں لائے جائیں، وہ حدیث مدون کرتے اور اس کا حکم اپنے تلامذہ کو دیتے، لیکن اپنے فتووں کی ترتیب وتدوین خود بھی نہیں کرتے اور شاگردوں کو اس سے منع فرماتے، وہ کتاب وسنت کے علاوہ

دوسروں کے اقوال وآرا مدون کرنے کو ناپسند سمجھتے تھے، ایک بار آپ سے کہا گیا، کہ آپ کے بعض شاگردوں نے آپ کے کچھ مسائل روایت کیے ہیں اور ان کو خراسان میں پھیلا دیا ہے، یہ سن کر آپ نے فرمایا:

اشهدوا عني رجعت عن ذلك كله ۔

تم لوگ گواہ رہنا، میں نے ان تمام مسائل سے رجوع کرلیا ہے۔

آپ کے پاس ایک خراسانی شخص کچھ کتابیں لے کر آیا، ان کتابوں میں ایک کتاب پر آپ کی نظر پڑی، تو اس میں اپنا کلام پایا، یہ دیکھ کر آپ کو غصہ آگیا اور آپ نے کتاب پھینک دی۔

تلامذہ

امام احمد کے خرمن علم سے استفادہ کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد ہے، جن میں پورے عالم اسلام کے طالبان علم شامل ہیں، امام احمد کی علمی جلالت تھی، کہ ان سے اصاغر واصحاب ہی نے کسب علم نہیں کیا، بلکہ اکابر وشیوخ نے بھی ان سے حدیثوں کی روایت کی، جن میں عبدالرزاق صنعانی، اسماعیل بن علیہ، وکیع بن جراح، عبدالرحمٰن بن مہدی، محمد بن ادریس شافعی، معروف کرخی، علی بن مدینی، جیسے حضرات شامل ہیں، ان کے علاوہ اہم تلامذہ یہ ہیں:

امام بخاری، امام ابوداؤد، امام مسلم، اسود بن عامر شاذان، یحیٰ بن آدم، یزید بن ہارون، قتیبہ، داؤد بن عمرو، خلف بن ہشام، احمد بن ابی حواری، یحیٰ بن معین، حسین بن منصور، زیاد بن ایوب، ابوقدامہ سرخسی، محمد مالک۔

امام صاحب کے دونوں صاحبزادے صالح اور عبداللہ، چچازاد بھائی حنبل بن اسحاق، حسن صباح، بزار، محمد بن اسحاق صاغانی، عباس بن محمد دوری، محمد بن عبیداللہ مناوی، ابوزرعہ رازی، ابوحاتم رازی، ابوبکر الاثرم، ابوبکر مروزی، یعقوب بن شیبہ، احمد بن ابی خزیمہ، ابوزرعہ دمشقی، ابراہیم مزنی، دوسی بن ہارون، عبداللہ بن محمد، یحیٰ بن آدم قرشی، یزید بن ہارون، قتیبہ بن سعد، داؤد بن عمرو، خلف بن ھشام، محمد بن دوارمی، حسین بن منصور، زیاد بن ایوب، رحیم ابوقدامہ سرخسی، محمد بن رافع، محمد بن یحیٰ بن ابی سمینہ، حرب کرمانی، بقی بن مخلد، شاہین بن سمیدع، جیش بن سندی، ابوبکر سندی، خواتیمی وغیرہ۔

(تاریخ بغداد ج ۴، ص ۴۱۳، تذکرۃ الحفاظ)

ان تلامذہ میں ابوالقاسم بغوی، امام احمد بن حنبل کے آخری شاگرد ہیں:

وآخر من حدث عنه ابو القاسم البغوى ۔(تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۳)

جس نے امام احمد سے آخر میں روایت کی، وہ ابوالقاسم بغوی ہیں۔

فتنہ خلق قرآن اور دور ابتلا و آزمائش

دوسری صدی ہجری کی ابتدا میں مسلمان علما و دانشور یونانی فلسفہ و دانش سے روشناس ہوئے، فلسفہ یونان چند خیالات وقیاسات اور الفاظ کا ایک طلسم تھا، جس نے خام عقلوں کو اپنا گرویدہ بنالیا، جدت پسند طبیعتوں نے بڑی دل جمعی سے یونانی کتابوں کا مطالعہ کیا اور فلاسفہ یونان کے افکار ونظریات سے اس قدر دلچسپی لی، کہ انہوں نے اسلامی عقائد واعمال کو فلسفہ یونان کی روشنی میں عقل کی میزان پر تولنے کی طرح ڈالی، انہوں نے خدائے وحدہ لاشریک کی ہستی اور اس کی صفات کے بارے میں کیمیاوی تجزیہ وتحلیل اور عقلی موشگافیوں کے دروازے کھولے، خداوند تعالیٰ کی لامحدود ذات کی حقیقت کو محدود عقل وشعور کی قیاس آرائیوں سے وہ بھلا کیسے سمجھ سکتے تھے، انہوں نے قرآن وسنت اور اسلاف کی کامل روش کو ترک کرکے فلسفہ یونان کی ڈگر پر جوں جوں قدم آگے بڑھائے، ظنیات وتشکیک کی دلدل میں اترتے چلے گئے اور مسلمانوں میں متکلمین کا ایک ایسا پر جوش عقلیت پرست گروہ پیدا ہوگیا، جس نے یونانی فلسفہ الٰہیات کو اپنا ایمان بنالیا اور دن کی ہر بات کو اسی ناقص معیار پر جانچنے پرکھنے کا شیوہ اختیار کرلیا، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں معتزلہ، جہمیہ، قدریہ، جبریہ، صفاتیہ، مشبہہ، معتزلہ وغیرہ فرقے وجود میں آئے، ان فرقوں کی موشگافیوں کا موضوع ذات وصفات باری، کلام الٰہی، رویت باری، مسئلہ عدل، تقدیر، جبر واختیار جیسے اہم دینی مباحث تھے، ان لوگوں نے اپنی پوری ذہنی کاوش ان مسائل کے لیے وقف کردی اور انہیں کفر وایمان کا معیار بنالیا، ان فرقوں میں معتزلہ سب سے آگے تھے، انہوں نے ذات وصفات باری کو یونانی فلسفہ الٰہیات کی عینک سے دیکھنا اپنا شعار بنالیا اور فلسفہ الٰہیات میں قرآن کے صفت الٰہی ہونے کی نفی کی اور اسے مخلوق قرار دیا، دربار خلافت میں دخل ونفوذ کے بعد انہوں نے اس عقیدے کی بھرپور تبلیغ واشاعت کی، ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں:

> خلق قرآن کا مسئلہ تاریخ معتزلہ سے وابستہ ہے، جونہی معتزلہ کا ذکر آتا ہے، یہ مسئلہ فوراً ذہن میں ابھرنے لگتا ہے، معتزلہ ہی نے اسے خلافت عباسیہ میں اٹھایا اور پھیلایا انہی کے افکار سے متاثر ہوکر عباسی خلفا نے محدثین وفقہا کو جبراً اس کا قائل کرنا چاہا، اور بعض کو آلام وشدائد میں بھی مبتلا کیا، خلفائے ثلاثہ مامون، معتصم اور واثق کے عہدہائے خلافت میں یہ مسئلہ لوگوں کے ذہن پر مسلط رہا اور ان کے نفوس وعقول کی پریشانی کا موجب بنا رہا، اس دور میں آزادی فکر ونظر نے رخت سفر باندھا، نصوص کتاب وسنت کے دائرہ میں محدود رہنے والے اور الفاظ میں احتیاط برتنے والے شدید مصائب وآلام کا شکار

ہوئے، ان کا جرم اس کے سوا کچھ اور نہ تھا، کہ وہ ہر آن کتاب وسنت پر جھکے رہتے تھے، مبادا ان کی فکر ونظر اور عقل وشعور میں کجی اور انحراف واقع ہو جائے اور وہ جادہ مستقیم سے بھٹک جائیں۔ (اسلامی مذاہب)

انہوں نے خلق قرآن کا یہ عقیدہ یہودی ونصرانی فکر وفلسفہ سے اخذ کیا تھا، مامون کے زمانہ میں قاضی احمد بن ابی دؤاد جو عالم وفاضل اور جدید فلسفیانہ افکار سے ہم آہنگ اور بڑا فصیح وبلیغ انسان تھا، رئیس المعتزلین واصل بن عطا کے شاگرد رباح بن علا سلمی کی صحبت میں رہ کر اعتزال کی تعلیم حاصل کی، قاضی ابن ابی دؤاد اپنی قابلیت اور عقلیات میں مہارت کی بنا پر مامون کے دل ودماغ پر چھا گیا، خلق قرآن کی ترویج واشاعت میں مامون کو اس نے اپنا معاون بنا لیا، قاضی ابن ابی دؤاد نے یہ باطل عقیدہ بشر مریسی سے، اس نے جہم بن صفوان سے، اس نے جعد بن درہم سے اس نے ابان بن سمعان سے، اس نے لبید بن اعصم یہودی کے بھانجے اور داماد طالوت سے سیکھا تھا، یہ لبید بن اعصم وہی ہے، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا، کرایا تھا اور تورات کے مخلوق ہونے کا عقیدہ رکھتا تھا، طالوت زندیق وبددین شخص تھا، اس نے سب سے پہلے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ (کامل ابن اثیر ج ۷ ص ۲۲۶)

خلیفہ ہارون رشید کے عہد تک معتزلہ اپنی کاوشیں مخصوص محفلوں تک محدود رکھتے تھے، ان کے اثرات کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہوا تھا، کیوں کہ محدثین وفقہا ان کے باطل عقائد وافکار کی تردید فرما رہے تھے اور خلفا وامرا کی ضد سے یہ فتنہ پرداز محفوظ ومامون نہیں تھے، عہد بنی امیہ میں سب سے پہلے جعد بن درہم نے اعلان کیا، کہ قرآن مخلوق ہے، اسے عید الاضحیٰ کے دن کوفہ میں خالد بن عبد اللہ القسری نے اس جرم کی پاداش میں قتل کر ڈالا، وہ خالد کے سامنے اس حالت میں لایا گیا، کہ اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں، نماز کا وقت آ چکا تھا، خالد نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ دیا، اپنے خطبہ کے آخر میں اس نے کہا:

اذهبوا وضحوا بضحایاکم تقبل فانی ارید ان اضحی الجعد بن درهم فانه یقول ماکلم الله موسیٰ تکلیما ولا اتخذ الله ابراهیم خلیلا تعالیٰ الله عما یقول علوا کبیرا۔

(سراج العیون ص ۱۸۶ بحوالہ ابن حنبل ص ۳۸)

لوگو! جاؤ اپنی اپنی قربانی کے جانور ذبح کرو، میں نے ارادہ کیا ہے، کہ جعد بن درہم کو ذبح کروں گا، اس لیے کہ یہ کہتا ہے، کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے باتیں نہیں کیں، نہ خدا نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست بنایا، خدا اس بات سے بہت بلند ہے، جو یہ کم بخت کہتا ہے۔

پھر خالد منبر سے اترا اور جعد بن درہم کو قتل کر ڈالا۔

جہم بن صفوان بھی اسی طرح کی باتیں کیا کرتا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کی نفی کرتا تھا، اس کا خیال تھا، کہ خدا کلام نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ صفات وحوادث سے منزہ ہے، اس لیے کہتا تھا، کہ قرآن قدیم نہیں مخلوق ہے۔

عصر عباسی میں معتزلہ نے خلق قرآن کے مسئلہ میں بڑی نکتہ آفرینیاں کیں، کچھ فقہا وعلما بھی ان کے ہم نوا بن

گئے، چنانچہ مصری عالم بشر بن غیاث مریسی کا بھی یہی مسلک تھا، بشر کے استاذ قاضی ابو یوسف نے اسے اس عقیدے سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانا، آخر کار قاضی ابو یوسف نے اسے اپنی مجلس سے نکال دیا۔

ہارون رشید کا زمانہ آیا تو معتزلہ نے اپنے بال و پر پھیلانے شروع کر دیے اور کھلے بندوں اپنے عقائد کی ترویج واشاعت میں سرگرم عمل ہو گئے، لیکن ہارون رشید راسخ العقیدہ مسلمان تھا، وہ ان معتزلہ کے ہذیانات کو پسند نہیں کرتا تھا، یہی وجہ تھی، کہ رشید کے عہد خلافت میں معتزلہ اپنے عقائد کے بارے میں کچھ زیادہ پروان نہ چڑھ سکے، بلکہ ایک روایت ہے، کہ معتزلہ کے ایک گروہ کو جو جدل عقائد میں مبتلا تھا، اس نے انہیں قید میں ڈال دیا اور جب بشر بن غیاث کا مقولہ اس تک پہنچا تو اس نے کہا ”وان اظفرنی اللہ اقتلہ“ اگر خدائے تعالیٰ مجھے موقع دے تو میں بشر کو قتل کر کے چھوڑوں گا۔

چنانچہ ہارون رشید کے عہد خلافت میں بشر لوگوں سے روپوش رہا۔

عہد مامون رشید

جب مامون رشید کا زمانہ آیا تو صورت حال میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی، مامون کی ذہنی ساخت معتزلہ سے ملتی جلتی تھی، اس نے معتزلی عالم ابو ہذیل حلاف سے ادیان و مذاہب کی تعلیم حاصل کی تھی، اس لیے وہ معتزلہ سے بہت قریب ہو گیا اور معتزلی دانشوروں نے اس کے دربار میں رسوخ پیدا کر لیا، اہم ملکی مناصب اور وزارت کے عہدوں پر معتزلیوں کا تقرر ہوا، مامون نے عقائد و افکار کی چھان پھٹک کے لیے مجالس بحث و نظر منعقد کیں، تو معتزلی علما پیش پیش تھے، اس لیے یہ لوگ عقلی مباحث میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، مامون معتزلہ سے قریب ہوتا چلا گیا اور اس نے گروہ معتزلہ کے ایک شخص احمد بن ابی دؤاد کو اپنا مشیر خاص اور قاضی القضاۃ مقرر کر لیا اور لطف و کرم کی حد درجہ بارش کی۔

قاضی ابن ابی دواد

فتنہ اعتزال اور خلق قرآن کو خلافت عباسیہ کی پشت پناہی دلانے کا سب سے موثر ذریعہ قاضی ابن ابی دؤاد تھا، جس کی کنیت ابو عبداللہ، نام احمد بن دؤاد بن جریر بن مالک ایادی ہے، جو ۱۶۰ھ میں بصرہ کے اندر پیدا ہوا، ابتدائی نشو و نما اور تعلیم و تربیت بصرہ میں حاصل کی، دمشق میں تعلیم کی تکمیل ہوئی، وہاں سے دار الخلافہ بغداد آیا، وہ بڑا ذہین، دقیقہ سنج، زمانہ ساز ہونے کے ساتھ علم و فضل کے زیور سے بھی آراستہ تھا، حسن کلام اور فصاحت میں بھی کامل تھا، بغداد کے اندر اس نے یحییٰ بن اکثم سے علوم و فنون کی تحصیل کی تھی اور اسی کے ذریعہ دربار خلافت میں رسائی حاصل کی اور وہ مامون کا مقرب بن گیا۔

جب مامون مرنے لگا تو اپنے بھائی معتصم کو وصیت کی، کہ اہم امور اور مسائل دینیہ وملکیہ میں اسے شریک کرے اس نے وصیت کی:

> وابو عبداللہ بن ابی دؤاد فلا یفارقك واشر به فی المشورۃ فی کل امرك فانه موضع لذلك منك۔ (تاریخ طبری ج ۷ ص ۲۱۰، ابن حنبل)

ابوعبداللہ بن ابودؤاد کو اپنے ہر معاملہ میں شریک کار رکھنا کیوں کہ وہ اس کا اہل ہے۔

معتزلہ نے ایوان اقتدار میں جب خوب قدم جما لیے اور مامون کے قلب ودماغ پر حاوی ہو گئے تو انہوں نے حکومت کے زیر سایہ عقیدہ خلق قرآن کی ترویج کا فیصلہ کرلیا اور مامون کو اس بات کے لیے آمادہ کرلیا۔ ۲۱۲ھ میں مامون سے اس عقیدے کا اعلان کرا دیا، پھر علما ومحدثین سے مناظروں کا آغاز ہوا، ابتدائی چند سالوں میں علما اپنی فکر وآرا میں آزاد تھے، ان پر عقیدہ خلق قرآن تھوپنے کے لیے جبر نہیں کیا جاتا، لیکن مامون اور معتزلی علما اس عقیدے کی تبلیغ میں سرگرم رہے اور بہت سے لوگوں کو اپنا حلقہ بگوش بنالیا، انہوں نے دار الخلافہ میں بھی مجلس مناظرہ قائم کی، جو بھی صدائے حق بلند کرتا، اسے عقلیت پرست معتزلی علما کا سامنا کرنا پڑتا، مامون خود اس مجلس میں شریک ہوتا اور عقیدہ خلق قرآن پر مناظرہ کرتا۔

مجلس مناظرہ میں امکانی حد تک اپنے نظریے کی تائید میں دلائل دیتا، تاہم اس نے عقائد وآرا کے اظہار میں لوگوں کو آزاد رکھا اور جن نظریات کو اپنانے کے لیے وہ تیار نہ تھے، انہیں ان کے قبول کرنے پر مجبور نہ کیا، ایوان اقتدار میں بحث ومناظرہ کا مقصد لوگوں کو مرعوب کرنا اور جدت پسند خام طبیعتوں کو عقیدہ خلق قرآن کا حامی بنانا تھا، معتزلہ پر شاہی عنایتیں اور خلیفہ کا قرب خاص دنیاداروں کے لیے تحت الشعور میں قبول دعوت کے امکانات کو وسعت دے رہا تھا، چنانچہ عقیدہ خلق قرآن کی دعوت بالجبر سے پہلے ہی ہزاروں دنیاداروں نے یہ باطل عقیدہ تسلیم کرلیا تھا، ان میں علما وفقہا بھی تھے، دانشور اور عقلا بھی، ان کے اثر ونفوذ سے اسلامی معاشرہ بھی محفوظ نہ رہا، چنانچہ خلق قرآن کا عقیدہ رکھنے والے عروج وارتقا کی منزلوں سے ہمکنار ہو رہے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا، کہ فتنہ خلق قرآن کا سیلاب خس وخاشاک کی طرح اہل حق کو بہا لے جائے گا ایسے نازک دور میں شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ کی عزیمت مآب شخصیت طوفان اعتزال کے سامنے عزیمت واستقامت کی چٹان بن کر نمودار ہوتی ہے۔

شیخ عبدالعزیز کنانی کا جہاد

شیخ عبدالعزیز بن یحییٰ الکنانی مکہ میں تھے، کہ انہوں نے سنا، کہ کس طرح مسلمان بغداد میں ایک سخت مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں، چنانچہ وہ انسداد فتنہ کے لیے بغداد گئے اور بغداد کی جامع رصافہ میں جا پہنچے، جمعہ کی نماز پڑھی، نماز ختم ہوتے ہی ان کا چھوٹا لڑکا جوان کے ساتھ تھا، ایک ستون کے ساتھ کھڑا ہو گیا، شیخ کنانی جو پہلی صف میں اپنے لڑکے قریب ہی تھے، اپنے بیٹے کو پکار کر کہا، کہ اے میرے بیٹے تو قرآن کے متعلق کیا کہتا ہے، بچے نے زور سے جواب دیا ”**کلام اللہ منزل غیر مخلوق**“ اس مکالمے کو سنتے ہی مسجد میں تہلکہ مچ گیا، اتنے میں کوتوال شہر سپاہیوں کی ایک جماعت لے کر مسجد میں پہنچ گیا اور شیخ عبدالعزیز اور ان کے لڑکے کو گرفتار کر کے رئیس اعلیٰ کے دفتر میں لے گیا، پہلے کوتوال نے تفتیشی سوالات کیے، پھر رئیس اعلیٰ عمرو بن مسعدہ نے خود جرح وتفتیش کی۔

شیخ عبدالعزیز کنانی بتاتے ہیں، ان کا سارا حال مامون تک پہنچایا گیا، اس نے مناظرہ کی تیاری کے احکام جاری

کر دیے، یہاں تک کہ مقررہ دن آ گیا، عمرو بن مسعدہ شیخ کو دربار کی طرف لے گیا، ادھر دربار میں امرائے بنو ہاشم کا گروہ، علما وفضلا کی جماعت اور دیگر قضاۃ، ارباب افتا کی جماعت، متکلمین وفقہا، معلمین، وزرا اور ارکان سلطنت حاضر ہوئے۔

جب تمام ارکان وشرکائے مجلس مناظرہ آ چکے، تو شیخ عبدالعزیز کی طلبی ہوئی، شیخ کو کئی دہلیزوں سے گزارا گیا، پھر ایوان ہائے خلافت کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جن میں سے ہر ایوان جاہ وحشم کا آئینہ دار تھا، یہاں تک کہ صاحب الستر یعنی وزیر تشریفات کا ایوان خاص آ گیا، ، حاجب صحن دربار تک لے گیا، صحن کے دونوں جانب کمروں کا ایک سلسلہ تھا، یہاں پہنچ کر حاجب نے شیخ سے کہا، کہ امیر المومنین تک پہنچنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھ لیجیے چنانچہ شیخ نے نماز ادا کی۔

اب پردہ ہٹایا گیا، بہت پر جلال منظر سامنے تھا، خدام بارگاہ نے دونوں طرف سے ہاتھوں اور بازوؤں کو پکڑ لیا، ایک ہاتھ سینے پر تھا، ایک کاندھے پر، گویا ایک مجرم کو سختی اور بے حرمتی کے ساتھ لے جایا جا رہا تھا، مامون نے حکم دیا، اسے چھوڑ دیا جائے، شیخ نے مامون کو سلام کیا، مامون نے جواب دیا اور قریب بلایا، مامون الرشید شیخ کی طرف متوجہ ہوا، نام، خاندان، باپ، دادا، وطن، محلہ وغیرہ کے بارے میں دریافت کرنے کے بعد تقریر کی اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

تمہارا بغداد میں آنا اور جامع رصافہ میں کھڑے ہو کر میرے ایک حکم دینی وشرعی کو توڑنا اور خدا کی صفات میں دوسری چیزوں کو شریک کرنا اور پھر مناظرہ کی خواہش کرنا، یہ تمام حالات میں نے سنے اور اس لیے علمائے دار الخلافہ کو میں نے مدعو کیا ہے۔

شیخ عبدالعزیز کہتے ہیں، کہ شرک کا الزام اور خلق قرآن کا قول باطل سنتے ہی ساری ہیبت میرے دل سے رفع ہو گئی، پھر بادل کی گرج کی طرح شیخ کی آواز گونجی:

امیر المومنین! میں ایک فقیر الحال طالب علم ہوں، میں نے خلیفہ کے ظلم وجبر کی داستان سنی، مجھے معلوم ہوا، کہ حق مظلوم ہو گیا، سنت کی روشنی بجھ گئی ہے، بدعت کی آندھیاں زور وشور سے چل رہی ہیں، جس چیز کا اقرار خدائے تعالیٰ نے امت سے نہیں کرایا، اس چیز کو آج ایک انسان ہر مومن کے لیے شرط قرار دے رہا ہے، جو ہارون الرشید کے گھر پیدا ہوا، اس نے نہ تو تابعین کا زمانہ پایا، نہ اصحاب رسول کو دیکھا، وہ ایک ایسے راز کو کیسے جانتا ہے، جسے صحابہ نے نہ جانا اور جس کے لیے مہبط وحی رسول نے نہ کہا۔

اب شیخ وہ شیخ نہیں تھے، جنہیں عمرو بن مسعدہ نے زیر تفتیش رکھا اور پھر دربار سے پہلے جاہ وجلال دکھایا، اب وہ دوسرے ہی شیخ عبدالعزیز تھے، جنہیں مامون الرشید سے کوئی خوف رہا نہ دربار سے مرعوب ہوئے، ساری مجلس پر سناٹا چھا گیا، شیخ نے مزید کہا:

آہ! تم ہوا کا جھونکا ہو جس سے شریعت کی آگ تو نہ روشن ہو سکی، مگر اس نے سنت کے چراغوں کو گل کر دیا، تم سیلاب خلافت کی وہ رو ہو جو بدعات ومحدثات کے خس وخاشاک کو تو نہ بہا سکے، مگر اس نے حق پرستی کے تناور درختوں کو گرا دیا، اے

مامون بن ہارون تو اب رسول کی جانشینی ہی کا نہیں بلکہ رسول سے زیادہ حق رسالت کا مدعی ہو گیا ہے۔

فوجوں کی قطاریں، چمکتی ہوئی تلواریں اور وردیاں امرا ورؤسا، خدام وحجاب، سب بے بسی کے ساکت مجسمے تھے، جو شیخ کی تقریر کی ہیبت سے دبے جا رہے تھے، تقریر جاری تھی، پھر شیخ نے کہا:

اے امیر المومنین! تو نے کہا تھا، کہ میری خواہش مناظرہ کو پورا کرنے کے لیے آج مجلس منعقد ہوئی ہے، لیکن میں نے دربار میں آتے ہی سب سے پہلی آواز جو سنی، اسی سے معلوم ہو گیا، کہ مناظرہ کرنے والوں کے علم وحجت کا کیا حال ہے؟ ان کے پاس سب سے بڑی دلیل بطلان حق کے لیے یہ ہے، کہ مجھ کو خالق کائنات نے رنگ اور چہرہ اچھا نہ دیا اور میں ان کے نگاہوں میں حسین وجمیل نہیں، اے امیر المومنین! میں تجھ سے پوچھتا ہوں، کہ تمام نقش ونگار جو تیرے دربار اور ایوان میں بنے ہیں، اگر خوش نما نہ ہوتے تو تو ان کی ملامت کرتا یا ان کے صناعوں کے قلموں کو توڑ دیتا ہے؟ کیا انہوں نے میرے جسم وچہرہ پر اعتراض کر کے انہوں نے صناع کائنات پر ملامت نہیں کی؟ کیا یہی توحید ہے، کہ جس کے یہ لوگ مدعی ہیں اور جو کامل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اللہ کے کلام کو مخلوق نہ کہا جائے۔

شیخ کہتے ہیں، کہ میں جب تک تقریر کرتا رہا، مامون اس طرح ٹکٹکی لگائے میری جانب نگراں تھا، گویا وہ ایک پتھر ہے، جس میں نہ تو ارادہ ہے، نہ روح، کئی بار اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، تمام اہل دربار متحیر تھے، کہ مامون جو اس مسئلے پر خون بہانے کا عادی تھا، ساکت وصامت کیوں بیٹھا ہے؟

جب یہ تقریر ختم ہو چکی تو مامون نے جوابی تقریر کی:

اے عبد العزیز! اللہ تجھ پر رحم کرے، تو نے جو کچھ کہا، میں نے سنا، میں اپنے نفس کا احتساب کرتا رہا، میں بندگان خدا پر ظلم نہیں کرنا چاہتا، بلکہ ان کو حق اور توحید کی طرف بلاتا ہوں، بایں ہمہ یقین کر کہ میرا علم میرے غضب پر غالب آئے گا، خدا کی قسم! میں تیری سختی اور درشتی کی وجہ سے اپنا انتقام تجھ سے نہیں لوں گا، مجھ پر ظاہر ہو گیا ہے، کہ تو حق کی غیرت رکھتا ہے، تو نے دین کے لیے اپنا گھر چھوڑا، پس تیری حمیت حق اس کی مستحق ہے، کہ تیری عزت کی جائے، میرا تیرا معاملہ اب حق وباطل کا ہے، پس تو حجت پیش کر اور صاحبان علم وحجت سے مناظرہ کر، اگر تیری حجت تیرے مخالفین پر غالب ہو گئی، تو ہم تیری پیروی کریں گے اور اگر تو حجت نہ لا سکا اور مخالفین برسر حق ہوئے تو پھر تیرے لیے اس کی سزا ہے۔

شیخ نے مناظرہ کے لیے آمادگی ظاہر کی اور مامون نے بشر مریسی رئیس معتزلہ کو حکم دیا، کہ مناظرہ شروع کرو، بشر مریسی اٹھ کر اپنی جماعت سمیت مامون کے قریب آ بیٹھا، پھر طویل مناظرہ شروع ہوا، بخوف طوالت مناظرہ کا آخری مکالمہ نذر قارئین ہے، بشر نے کہا:

میں اپنے تمام دلائل وبراہین کو خود ہی چھوڑ دیتا ہوں، کیوں کہ اس طرح رد وقدح میں کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، میرا سوال یہ ہے، کہ قرآن نے صدہا مقامات پر اللہ خالق کل شی کہا ہے یا نہیں؟

شیخ:۔ ہاں! وہی ہر شی کا خالق ہے۔

بشر:۔ قرآن بھی شی ہے یا نہیں؟

شیخ:۔ پہلے شی کی حقیقت سن لو، پھر جواب مانگو۔

بشر (تیز ہو کر بولا) میں اور کچھ سننا نہیں چاہتا، میرے سوال کا جواب دو! قرآن اشیا میں داخل ہے یا نہیں؟

شیخ:۔ تمہارا طرز سوال ہی غلط ہے، اس میں دھوکا ہے، تم کو چاہیے کہ صبر وضبط کے ساتھ پہلے میری تقریر سن لو۔

اس ردوقدح پر بشر نے مامون سے کہا، ''**ظهر اثر الله وهم كارهون**''

بشر کے گروہ سے ایک اور شخص اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ کر کہا، یا امیر المومنین! **جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔**

بشر نے یہاں تک کہہ دیا، کہ ''**ولكن قعد حمار الشيخ على القنطرة**'' یعنی شیخ کا گدھا پل پر بیٹھ گیا ہے۔

مامون کا بھی بالکل یہی خیال تھا، کہ شیخ بے بس ہو گئے ہیں، تب غضب ناک ہو کر اس نے پہلی بار شیخ سے کہا، عبدالعزیز! سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟

شیخ کہتے ہیں، کہ مامون کے غضب ناک ہوتے ہی، اللہ نے میری مدد کی، کہا، کہ یوں تو بحث میں ایک دھوکا ہے، مگر امیر المومنین کہتے ہیں، میں تو تسلیم کرتا ہوں، کہ قرآن بھی اشیا میں داخل ہے، بشر اچھل پڑا، کہ تمام اشیا اللہ کی مخلوق ہیں، یہ مان کر تم نے تسلیم کر لیا، کہ قرآن مخلوق ہے۔

شیخ نے زور سے کہا، ہرگز نہیں! قرآن کہتا ہے ''وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ'' یعنی خدا اپنی ذات سے تم کو ڈراتا ہے، دوسری طرف قرآن کہتا ہے، ''كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ'' پس اگر اشیا میں داخل ہو کر قرآن مخلوق ہو گیا، تو خدا بھی کل نفس میں داخل ہو کر ذائقۃ الموت ہو گیا، تم جس قاعدے سے خدا کے نفس کو یہاں موت سے بچاتے ہو، میں اسی قاعدے کے تحت قرآن کے لیے لفظ شی کے استعمال کو عام استعمالات سے مستثنیٰ قرار دیتا ہوں۔

شیخ کی اس تقریر کو سن کر محفل دم بخود ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا، گویا یہ الفاظ نہیں ایک بجلی تھی، جو یکا یک کوند گئی، مامون خود عبدالعزیز کے جواب پر وجد کرنے لگا اور پکار پکار کر کہنے لگا، معاذ اللہ! معاذ اللہ! خدا کی ذات موت سے بری ہے۔

مامون الرشید نے حکم دیا، کہ مناظرہ ختم کیا جائے، مامون نے شیخ سے کہا، کہ تیری فضیلت علمی پر تیرے جوابات گواہ تھے، تیری جرأت اور ثابت قدمی تیری فضیلت کا اصلی جوہر ہے، واللہ میں قدر کروں گا اور تیری درشتی و تلخ گوئی کو اپنی قدر دانیوں اور حلم سے تھکا دوں گا، میری طرف سے تیرے لیے امن اور اعزاز و اکرام کا فرمان ہے، تیرا جوہر اس کا مستحق ہے، کہ میری مجلس علم کا ندیم ہو، تو اب مدینۃ السلام میں قیام کر اور ہر بدھ کے دن میری مجلس علمی میں شریک ہو۔

شیخ کہتے ہیں، کہ اس کے بعد مامون رشید نے حکم دیا، کہ دس ہزار درہم میری قیام گاہ پر پہنچا دیا جائے۔

شیخ کہتے ہیں، میں جب دربار سے نکلا، تو تمام لوگوں کو راستوں، دکانوں اور کوٹھوں پر چشم براہ پایا، لوگ منتظر تھے، کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے، جب انہوں نے دیکھا، کہ میں نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس آ رہا ہوں اور مجلس مناظرہ میں کامیاب رہا ہوں، تو ان کی حیرت اور خوشی کی کوئی حد نہ رہی، ارباب حق فتح کی خوشیاں منا رہے تھے اور لوگ مجھ سے مصافحہ کر رہے تھے، یہاں تک کہ راستہ چلنا دشوار ہو گیا، صبح سے شام تک میرا مکان لوگوں سے بھرا رہتا، لوگ سارا قصہ سننے کے لیے آتے تھے۔

دعوت حق اور اقامت دین کا کام کرنے والوں کے لیے کتنا بڑا سبق آموز واقعہ ہے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا، کہ مامون ۲۱۸ھ سے قبل عقیدہ خلق قرآن قبول نہ کرنے والوں پر جبر و استبداد کا پہاڑ توڑنے کا قائل نہ تھا۔

مامون الرشید عقیدہ خلق قرآن کا زبردست حامی و مبلغ ہونے کے باوجود اس عقیدے کو جبر و قوت کے ذریعہ تسلیم کرانا پسند نہ کرتا تھا، چنانچہ ۲۱۲ھ سے لے کر ۲۱۸ھ کے آغاز تک اس نے کسی کو بہ جبر و اکراہ یہ عقیدہ قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، لیکن اس کے حاشیہ نشیں معتزلی علما بالخصوص قاضی احمد بن ابی دؤاد اس فکر میں تھا، کہ عقیدہ خلق قرآن کی جبری دعوت کے لیے مامون کو ہموار کر لیا جائے، چنانچہ اس نے مامون کو اس کام کے لیے شیشے میں اتار لیا، مامون تیار ہو گیا، کہ عقیدہ خلق قرآن تسلیم نہ کرنے والوں پر جبر و تشدد کیا جائے اور حکومت سے تعلق رکھنے والے افراد کی جائدادیں، مناصب ضبط کر لیے جائیں اور اس عقیدے کے منکرین کی شہادت قبول نہ کی جائے۔

مامون کا پہلا خط

ربیع الاول ۲۱۸ھ میں مقام رقہ سے مامون نے بغداد میں اپنے نائب اسحاق بن ابراہیم کے نام یہ خط تحریر کیا:

امابعد! مسلمانوں کے ائمہ اور خلفا پر اللہ کا یہ حق ہے، کہ وہ اس دین کی اقامت میں جسے اللہ نے ان کی حفاظت میں دیا ہے، اور ان مواریث نبوت کے قیام میں جن کا ان کو وارث بنایا ہے، اور اس علم کے اظہار میں جو خدا نے انہیں ودیعت کیا ہے اور اپنی رعایا میں حق و صداقت کے ساتھ عمل کرنے اور اسے خدا کی اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے کوشش سے کام لیں، امیر المومنین خدائے بزرگ و برتر سے اپنے فرائض کی بجا آوری اور انجام دہی میں اس کی رحمت اور توفیق اور عزم صمیم کے طلب گار ہیں۔

امیر المومنین کے علم میں یہ بات آئی ہے، کہ رعیت کا ایک بہت بڑا گروہ جو فکر و نظر اور دانش و بینش سے محروم ہے، جس کے پاس نہ استدلال ہے، نہ ہدایت، نہ علم کا نور، نہ برہان، وہ جمیع اقطار و آفاق مملکت میں ایسے لوگوں پر مشتمل ہے، جو اہل جہالت ہیں، کور چشم ہیں، حقیقت دین اور توحید و ایمان سے ناواقف ہیں، خدا کی کھلی ہوئی نشانیوں سے بے خبر اور اس کے واضح راستے سے لاعلم ہیں، وہ اللہ کا اس کی قدر کے مطابق اندازہ کرنے سے اور اس کی کنہ معرفت سے قاصر ہیں، اپنی بے عقلی، کوتاہ فہمی اور اچھی طرح تفکر و تذکر نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ اللہ اور اس کی مخلوق میں فرق نہیں کر سکتے، اسی وجہ سے انہوں نے اللہ اور

اس کے نازل کیے ہوئے قرآن کو برابر کا سمجھ لیا ہے، ان لوگوں نے اس بات پر اتفاق کر کے یہ دعویٰ کیا ہے، کہ قرآن قدیم ہے، اول ہے، نہ اللہ نے اسے پیدا کیا ہے، نہ اس کی اختراع کی ہے، نہ اسے عالم وجود میں لایا ہے، حالاں کہ اللہ اپنی کتاب میں جو دل کے روگ کی شفا اور مومنین کے لیے رحمت اور راہ ہدایت ہے فرماتا ہے:

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا

پس جس چیز کو اللہ نے بنایا ہے، اسے گویا پیدا بھی کیا ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۔

پھر ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۔

اس آیت کریمہ میں خود اللہ نے یہ خبر دے دی، کہ قرآن میں ایسے واقعات اور قصص بیان کیے گئے ہیں، جو قرآن سے پہلے کے ہیں، اور قرآن ان کے بعد نازل ہوا ہے، پھر وہ فرماتا ہے:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۔

اور جو شے محکم اور مفصل ہوتی ہے، کوئی اسے استحکام بخشنے والا اور تفصیل کرنے والا بھی ہوتا ہے، چنانچہ اپنی کتاب کو محکم کرنے والا اور اس کی تفصیل بیان کرنے والا خود خدا ہے، لہٰذا وہ اس کا خالق اور پیدا کرنے والا بھی ہوا، علاوہ ازیں ان لوگوں نے باطل کو اپنا شعار قرار دے کر لوگوں کو اپنے مسلک کی دعوت دی اور اپنے آپ کو متبع سنت ثابت کرنے کی کوشش کی، حالاں کہ قرآن کریم کی ہر فصل میں ایسے قصے ہیں، جو ان کے قول کو باطل کرنے والے اور ان کے دعوے کی تکذیب کرنے والے ہیں۔

اس کے باوجود یہ لوگ ظاہر یہ کرتے ہیں، کہ صرف یہی اہل حق ہیں، دیندار ہیں اور صاحب جماعت ہیں اور ان کے علاوہ جو لوگ ہیں، وہ باطل پرست ہیں، کافر ہیں، فرقہ پسند ہیں، ایک عرصہ دراز تک یہ لوگوں کو اس طرح ورغلاتے رہے، یہاں تک کہ جہلا ان کے فریب میں آگئے اور وہ لوگ بھی جو اہل کذب و دروغ ہیں، غیر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے اور دین الٰہی کے سوا دوسرے اصولوں کو ماننے والے ہیں، ان کے ہم آہنگ اور ہم عقیدہ اس لیے بن گئے ہیں، کہ اس طرح اس گروہ میں ان کا اعزاز و وقار بڑھ جائے گا اور ریاست و عدالت پر ان کا اثر قائم ہو جائے گا، یہی وجہ ہے، کہ انہوں نے باطل کی خاطر حق کو چھوڑ دیا، خدا سے کنارہ کش ہو کر گمراہی کے گڑھے میں جا پڑے، ان کے ظاہری تزکیہ اور تورع کی وجہ سے ان کی شہادت کو لوگوں نے مان لیا اور ان کے ذریعہ سے احکام الٰہی نافذ ہونے لگے، حالاں کہ نہ ان کا ایمان درست ہے، نہ نسب ٹھیک ہے، نہ دیانت قابل اعتماد ہے، ان کی نیت فاسد ہے، ان کا یقین مجروح ہے، ان کا مقصد و منشا اور غرض و غایت صرف یہ ہے، کہ فریب کاری سے فتنہ و فساد برپا کر دیا جائے، انہوں نے اپنے رب پر افترا پردازی کی ہے، حالاں کہ قرآن کریم میں ان سے عہد واثق

لیا گیا ہے، کہ اللہ کے معاملہ میں صرف حق پر قائم رہیں گے، لیکن انہوں نے اس تعلیم کو مٹا دیا، انہی کے لیے اللہ تعالیٰ کلام پاک میں فرماتا ہے:

> اُولٰئِكَ الَّذِیْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰۤی اَبْصَارَهُم اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۔(محمد:۴۷/۲۳)

ایسے لوگ ہیں، جن پر اللہ نے لعنت کی، پھر ان کو بہرا کر دیا اور ان کی بصارت چھین لی، یہ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے، آیا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

امیر المومنین نے محسوس کیا، کہ یہ لوگ امت کے لیے مضر اور ضلالت کی جڑ ہیں، انہوں نے توحید اور ایمان میں قطع و برید کر دی ہے، یہ جاہل اور جھوٹے ہیں، شیطان ان کی زبان سے بول رہا ہے، ان کی صداقت و شہادت متروک اور مردود ہونے کے قابل ہے، ان کے کسی قول و عمل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، کہ عمل، یقین کے بعد ہے اور یقین اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک حقیقت اسلام سے پوری واقفیت نہ ہو اور خلوص کے ساتھ توحید پر عقیدہ نہ ہو اور جو ان حقائق سے اندھا ہے، وہ اپنے عمل اور شہادت میں اور زیادہ اندھا اور گمراہ ہوگا، جو خدا پر اور اس کی وحی پر جھوٹ بولے، جو خدا کو اور اس کی حقیقت کو نہ پہچانتا ہو، ضروری ہے، کہ اس کی شہادت رد کر دی جائے، کیوں کہ یہ وہ ہے، جس نے اللہ کی گواہی اس کی کتاب پر رد کر دی۔

لہٰذا تم اپنے قاضیوں کو بلاؤ اور انہیں ہمارا یہ خط سناؤ ان کے عقائد کا امتحان لو اور دریافت کرو آیا وہ قرآن کو اللہ کی مخلوق سمجھتے ہیں یا نہیں؟ اور انہیں یہ بتا دو، کہ جس شخص کا ایمان اور توحید کے بارے میں اعتقاد پکا اور سچا نہ ہوگا، امیر المومنین آئندہ اس سے کوئی سرکاری خدمت نہ لیں گے، پس اگر وہ خلق قرآن کو تسلیم کر لیں اور امیر المومنین کے مسلک سے اتفاق کر لیں تو وہ ہدایت اور نجات کے راستے پر گامزن ہیں، پھر تم انہیں حکم دینا، کہ وہ سب کے سامنے اپنے مسلک کو بیان کریں اور جو اس مسلک کو قبول نہ کرے اس کی شہادت ترک کر دی جائے۔

اس کے علاوہ تم اپنے علاقہ کے تمام قاضیوں سے اس مسئلہ کے بارے میں استفسار کرو اور ان کو ہمارا حکم پہنچاؤ اور ان کی نگرانی کرتے رہو، تا کہ جب تک وہ اپنے دین و ایمان میں پکے اور سچے نہ ثابت ہو جائیں احکام الٰہی کو نافذ نہ کرنے پائیں اور امیر المومنین کے اس فرمان کا جو اثر مرتب ہو اس سے اطلاع دینا! (ابن حنبل ص ۴۲، ۴۳)

اس خط سے معلوم ہوا، کہ مامون نے عقیدہ خلق قرآن قبول نہ کرنے والوں کو صرف دو سزائیں دیں (۱) مناصب سے محرومی (۲) عدم قبول شہادت۔

مامون نے اپنے اس خط میں صرف دو قاضیوں کو طلب کر کے عقیدہ خلق قرآن کا اقرار لینے کا حکم دیا، جو لوگ اقرار نہ کریں، ان کی شہادتیں رد کر دی جائیں اور ان کو مناصب قضا سے معزول کر دیا جائے۔

مکتوب الیہ کو یہ بھی حکم دیا گیا تھا، کہ اس کارروائی کا جو اثر ہو اس سے باخبر کیا جائے۔

بغداد کے نائب حاکم اسحاق بن ابراہیم کے نام دوسرا خط

مامون الرشید نے بغداد کے نائب حاکم اسحاق بن ابراہیم کو لکھا، کہ وہ حسب ذیل سات آدمیوں کو اس کی خدمت میں روانہ کرے!

(۱) محمد بن سعید کاتب الواقدی (۲) ابومسلم مستملی یزید بن ہارون (۳) یحیٰی بن معین (۴) زہیر بن حرب ابوخیثمہ (۵) اسماعیل بن داؤد (۶) اسماعیل بن ابی مسعود (۷) احمد بن الدورقی۔

اسحاق نے ان لوگوں کو مامون کی خدمت میں روانہ کر دیا، مامون نے ان کے عقائد کا امتحان لیا اور مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی، ان سب نے اعتراف کر لیا، کہ قرآن کریم مخلوق ہے، اس اعتراف کے بعد مامون نے انہیں مدینۃ السلام (بغداد) واپس بھیج دیا۔

اب اسحاق بن ابراہیم نے انہیں اپنے دارالامارت میں طلب کیا، یہ جو کچھ بغداد میں اعتراف کر آئے تھے، اس کو شہرت دی اور اس کا ذکر فقہا اور محدثین کے سامنے کیا، ان ساتوں اصحاب نے جو کچھ مامون کے سامنے کہا، تھا، وہی یہاں بھی دہرا دیا یعنی قرآن مخلوق ہے، اسحاق نے ان لوگوں کو آزاد کر دیا، اسحاق نے یہ سب کچھ مامون کے حکم کے مطابق کیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد مامون نے اسحاق بن ابراہیم کو ایک اور خط لکھا، جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

امابعد! اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اس زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے اور جنہیں اپنے بندوں کے لیے اس نے اپنا امین چنا ہے، ان کا کام یہ ہے، کہ اس کے دین کو قائم کریں اور جن لوگوں کو اس نے اپنی مخلوق کی نگرانی تفویض کی ہے، انہیں اپنے احکام اور قوانین کے نفاذ اور مخلوق الٰہی میں اپنے عدل کو بروئے کار لانے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

ان لوگوں پر (یعنی خلفا پر) خدا کا حق یہ ہے، کہ وہ پوری طرح اس کا حق ادا کریں اور اپنے فرائض کے ادا کرنے میں اس سے خلوص برتیں اور اس علم و معرفت کی وجہ سے جو خدا نے انہیں عطا کیا ہے، لوگوں کو راہ حق پر گامزن کریں، جو راہ حق سے بھٹک جائے یا بچھڑ جائے اسے پھر راہ راست دکھائیں، اپنی رعایا کی راہ نجات کی طرف رہنمائی کریں، اسے ایمان کے حدود اور اصول سمجھائیں اور وہ راستہ بتائیں، جس پر چل کر وہ کامرانی کی منزل تک پہنچ جائیں جن کے بارے میں اللہ نے، اور مہالک سے محفوظ رہیں، دین کے جو امور مشتبہ اور پنہاں ہوں، انہیں صاف اور واضح کر دیں تاکہ شک دور ہو اور دلیل کی روشنی سب کے لیے نمایاں ہو جائے۔

یہ کام خلفا کو خود انجام دینا چاہیے کیوں کہ یہ خدمت تمام خدمات کی جامع ہے اس میں رعایا کے دینی اور دنیاوی فوائد شامل ہیں، خلفا کو چاہیے کہ اپنی رعایا کو وہ امور یاد دلاتے رہیں، اللہ نے انہیں منصب خلافت دیتے وقت جن باتوں کی بجا آوری کی توقع فرمائی ہے، کہ وہ اپنے پیش روؤں کی طرح بدستور اس خدمت کو انجام دیتے رہیں گے، چنانچہ اس باب میں امیرالمومنین صرف خدائے واحد سے توفیق کے طلب گار ہیں، وہی ان کے لیے کافی اور وافی ہے۔

قرآن کے بارے میں جو عقیدہ پیدا ہوا ہے، اس پر کافی غور وفکر اور تلاش ومطالعہ کے بعد امیر المومنین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، کہ یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے، جس کا اثر دین اسلام اور ملت اسلامیہ پر نہایت مضر پڑے گا، کیوں کہ خدا نے قرآن کو ہمارا امام بنایا ہے، اور ہمارے لیے رسول اکرم کا بھی اثر باقی ہے، لوگوں پر حقیقت امر مشتبہ ہوگئی، چنانچہ وہ خیال کرنے لگے، کہ قرآن مخلوق ہے ہی نہیں، اس طرح انہوں نے خدا کی صفت خلق سے بھی انکار کر دیا، حالاں کہ اسی صفت کی وجہ سے وہ اپنی تمام مخلوقات کے مقابلہ میں نمایاں طور پر علاحدہ اور منفرد ہے، کیوں کہ اس نے صرف اپنی حکمت اور قدرت کاملہ سے کام لے کر بغیر کسی ابتدا اور تقدم کے ہر چیز کو خلق فرمایا اور ایجاد کیا۔

خدا کے سوا ہر چیز مخلوق اور حادث ہے، خالق اور موجد تو صرف ذات باری تعالیٰ ہے، خود قرآن اس حقیقت پر ناطق اور دال ہے، اس باب میں جتنے بھی اختلافات ہوسکتے تھے، قرآن نے ان سب کو مٹا دیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ قرآن کو قدیم ماننے والوں نے عیسائیوں کی تقلید کی ہے، جیسا کہ ان کا دعوی ہے، کہ عیسیٰ بن مریمؑ چوں کہ کلمۃ اللہ ہیں اس لیے مخلوق نہیں ہیں، حالاں کہ اس کے برخلاف قرآن کریم کہتا ہے:

اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا

یعنی ہم نے اس کو عربی قرآن بنایا ہے۔

''بنایا'' کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے، کہ اسے خلق کیا، پیدا کیا، جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہے:

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۔

ہم نے رات کو راحت وآسائش کے لیے اور دن کو معاش کے لیے بنایا۔

ظاہر ہے، یہاں بھی ''بنایا'' کا مطلب یہی ہے، کہ پیدا کیا، اسی طرح قرآن مجید میں آیا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ

ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندگی بخشی۔

یہاں بھی ''جعلنا'' کے معنی ''خلقنا'' ہوسکتا ہے، ان آیات کی رو سے خدا نے قرآن کو بھی مخلوقیت کے اعتبار سے ان چیزوں کے مساوی قرار دے دیا ہے، جن کے بارے میں پیدائش، صنعت اور خلق جیسے الفاظ وارد ہوئے ہیں، اس نے یہ بھی بتا دیا ہے، کہ وہ تنہا (بلا شرکت غیر) ان چیزوں کا خالق ہے۔

اسی طرح خدائے بزرگ وبرتر فرماتا ہے:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ لوح قرآن کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ظاہر ہے کہ محاط مخلوق ہوتا ہے (پس قرآن بھی مخلوق ہوا)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اپنے نبی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔

پھر فرماتا ہے:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے، جن کا قول تھا:

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۔

اور پھر اپنے رسول ہی کے ذریعہ سے ان کے اس قول کی تکذیب کرائی اور اپنے رسول کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا ۔

بتاؤ جو پرنور کتاب موسیٰ لائے تھے وہ کس نے نازل کی تھی۔

ان آیات سے معلوم ہوا، کہ اللہ نے قرآن کو ''ذکر''''ایمان''''نور''''ہدیٰ مبارکا''''عربیا''اور''قصصا'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۔

پھر ارشاد فرمایا:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ ۔

پھر ارشاد ہوا:

قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ ۔

نیز فرمایا:

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۔

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے لیے اول بھی رکھا ہے اور آخر بھی اس کے اول اور آخر کا ہونا اس بات کی دلیل ہے، کہ محدود اور مخلوق ہے، ان جاہلوں نے قرآن کے متعلق اپنے غلط عقیدہ کا اظہار کر کے اپنے دین اور امانت میں بہت بڑا رخنہ ڈال دیا ہے اور اس طرح دشمنان اسلام کے راستہ کو سہل بنا دیا ہے، اپنے الحاد اور بے دینی کا اعتراف کر لیا ہے، کہ اللہ کی ایک مخلوق شے کو اس صفت سے موصوف کرنے لگے، جو صرف خدا ہی کے لیے خاص ہے، انہوں نے قرآن کو خدا سے تشبیہ دی، حالاں کہ مخلوقات ہی آپس میں ایک دوسرے سے مشابہ ہو سکتی ہیں۔

جو لوگ قرآن کریم مانتے ہیں، امیر المومنین کا ان کے بارے میں خیال ہے، کہ نہ وہ دین میں کچھ ورک رکھتے ہیں، نہ یقین و ایمان کی نعمت انہیں حاصل ہے، ایسے لوگوں کے لیے امیر المومنین یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ اب ان کی امانت و عدالت یا

قول وحکایت پر اعتماد کیا جائے، یہ لوگ اب اس قابل نہیں رہے، کہ حکومت رعایا کے امور میں انہیں کوئی ذمہ داری سونپے، اگر چہ ان میں سے بعض لوگ نیک اور درست اطوار کے ہیں، مگر فروع سے کیا ہوتا ہے؟ اصل چیز تو عقائد ہیں، مدح وذم کا انحصار، عقائد کی بھلائی اور برائی پر ہوتا ہے، جو شخص ایمان کے اصل اصول یعنی توحید سے پورے طور پر واقف نہ ہو وہ دوسرے احکام اور اصول سے بدرجہ اولی ناواقف اور جاہل ہوگا، ایسا شخص کسی کو راہ ہدایت کیا دکھا سکے گا، جو خود اندھا اور گمراہ ہو۔

امیر المومنین نے تمہیں جو کچھ لکھا ہے، یہ تم جعفر بن عیسیٰ اور عبدالرحمٰن بن اسحاق کو سنا دو اور ان سے دریافت کرو، کہ قرآن کے بارے میں وہ کیا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ بات خوب اچھی طرح انہیں جتا دو، کہ امیر المومنین اس شخص سے کوئی خدمت نہیں لے سکتے، نہ اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں، جو اخلاص وتوحید کی نعمت سے بہرہ ور نہ ہو اور توحید کا عقیدہ اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتا، جب تک قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کیا جائے۔

پس اگر یہ دونوں امیر المومنین کے ارشاد کو تسلیم کرلیں، تو انہیں حکم دو، کہ فصل خصومات کے وقت جب لوگ اپنے دعاوی کے ثبوت میں شہادتیں پیش کریں، تو ان سے خلق قرآن کے بارے میں دریافت کریں، جو یہ نہ مانتا ہو کہ قرآن مخلوق ہے، اس کی شہادت باطل قرار دیں اور اس کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے وہ دونوں کوئی فیصلہ ہرگز صادر نہ کریں، اگر چہ وہ بظاہر کتنا ہی نیک، پارسا اور متقی ہی کیوں نہ ہو۔

تمہارے ماتحت علاقہ میں جتنے قاضی ہیں، ان سب کو یہ حکم پہنچا دو اور امیر المومنین کو اپنے اقدام وعمل کے نتائج سے مطلع کرو۔ (ابن حنبل ص ۴۴ تا ۴۸)

مامون کے حسب الحکم اسحاق بن ابراہیم نے فقہا، حکام اور محدثین کی ایک جماعت کو طلب کیا، تا کہ ان کے عقیدہ کا امتحان لے، چنانچہ ابوحسان زیادی، بشر بن الولید الکندی، علی بن ابی مقاتل، فضل بن غانم، ذیال بن الہیثم، سجادہ، قواریری، احمد بن حنبل، قتیبہ، سعدویہ الواسطی، علی بن الجعد اسحاق بن ابی اسرائیل ابن الہرش، ابن علیۃ الاکبر، یحییٰ بن عبدالرحمٰن العمری نیز حضرت عمر بن الخطاب کی اولاد سے ایک اور مرد بزرگ جو رقہ کے قاضی تھے، علاوہ ازیں ابونصر التمار، ابو معمر القطیعی، محمد بن حاتم بن میمون، محمد بن نوح المضروب، ابن الفرخان اور ایک اور جماعت جس میں نضر بن شمیل ابن علی بن عاصم، ابوالعوام البزاز، ابن شجاع اور عبدالرحمٰن بن اسحاق وغیرہ شامل تھے، یہ سب لوگ حسب الحکم اسحاق کے دربار میں حاضر ہوئے۔

اسحاق نے ان حضرات کے امتحان کا آغاز اس طرح کیا، کہ مامون کا فرمان دو مرتبہ پڑھ کر سنایا، تا کہ یہ لوگ اس کے مفہوم ومعنی سے اچھی طرح واقف ہو جائیں، پھر اس نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

اسحاق بن ابراہیم نے بشر بن الولید سے پوچھا، قرآن کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

بشر بن الولید:۔ میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنا خیال امیر المومنین کے سامنے ظاہر کر دیا ہے۔

اسحاق بن ابراہیم:۔ لیکن امیر المومنین کے فرمان کے بعد یہ بحث از سر نو زیر بحث آگیا ہے، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔

بشر بن الولید:۔ میں کہتا ہوں، قرآن خدا کا کلام ہے۔

اسحاق بن ابراہیم:۔ میں نے تم سے یہ نہیں پوچھا تھا یہ بتاؤ وہ مخلوق ہے یا نہیں؟

بشر بن الولید:۔ اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔

اسحاق بن ابراہیم:۔ کیا قرآن چیز ہے؟

بشر بن الولید:۔ ہاں وہ ایک شے ہے۔

اسحاق بن ابراہیم:۔ کیا وہ مخلوق بھی ہے۔

بشر بن الولید:۔ اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔

اسحاق بن ابراہیم:۔ میں یہ نہیں پوچھتا، یہ بتاؤ یہاں مخلوق بھی ہے؟

بشر بن الولید:۔ جو کچھ میں نے کہہ دیا ہے، اس پر اضافہ نہیں کر سکتا، میں نے امیر المومنین کے سامنے عہد کیا ہے، کہ اس مسئلہ پر کسی طرح کی گفتگو نہیں کروں گا اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اس کے علاوہ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

یہ سن کر اسحاق بن ابراہیم نے ایک رقعہ اٹھایا،، جو اس کے سامنے رکھا ہوا تھا، سنانے کے بعد اس نے بشر سے دریافت کیا، کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو، کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ واحد اور یکتا ہے، نہ اس سے پہلے کوئی چیز تھی، نہ اس کے بعد کچھ ہے، اس کی مخلوقات میں سے کوئی شے کسی درجہ میں بھی اور کسی طرح بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتی۔

بشر نے جواب دیا، ہاں! میں اس سے اتفاق کرتا ہوں اور میں تو ان لوگوں کو پیٹا کرتا تھا، جن کا عقیدہ اس عقیدہ سے مختلف ہوتا تھا۔

اسحاق نے منشی سے کہا، جو کچھ بشر نے کہا ہے، اسے لکھ لو۔

اب اسحاق، علی بن ابی مقاتل کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا، خلق قرآن کے بارے میں علی! تمہاری کیا رائے ہے؟ علی بن ابی مقاتل نے کہا، ایک سے زائد مرتبہ میں امیر المومنین کو اپنے خیال سے آگاہ کر چکا ہوں، جو کچھ وہ مجھ سے سن چکے ہیں، وہی رائے میری اب بھی ہے۔

پھر اسحاق نے رقعہ کے بارے میں ابن ابی مقاتل کا امتحان لیا، اسے سنا کر پوچھا، کیا اس سے تمہیں اتفاق ہے؟ ابن ابی مقاتل نے کہا، ہاں! اس سے متفق ہوں۔

اسحاق بن ابراہیم:۔ تو یہ بات مانتے ہو، کہ قرآن مخلوق ہے؟

ابن ابی مقاتل:۔ قرآن خدا کا کلام ہے۔

اسحاق بن ابراہیم:۔ میں تم سے یہ نہیں دریافت کرتا۔

ابن ابی مقاتل:۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور اگر امیر المومنین ہمیں کوئی حکم دیں گے تو ہم اسے سنیں گے اور اس کی

اطاعت کریں گے۔

اسحاق نے منشی سے کہا، ابن ابی مقاتل نے جو کچھ کہا ہے، اسے نوٹ کرلو!

اب اسحاق نے ذیال سے بھی یہی سوال کیا، اور انہوں نے بھی وہی جواب دیا، جو علی بن ابی مقاتل نے دیا تھا۔

پھر اس نے ابوحسان زیادی سے دریافت کیا، کہو تمہاری کیا رائے ہے؟ زیادی نے کہا، جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو پوچھو!

اب اسحاق نے مامون کا وہی رقعہ پڑھ کر سنایا اور پوچھا کیا تم اس سے اتفاق رکھتے ہو؟ زیادی نے اقرار کرلیا اور اس کے بعد یہ بھی کہا، جو اس عقیدہ کو نہیں مانتا میرے نزدیک وہ کافر ہے۔

اسحاق نے کہا، تم مانتے ہو، کہ قرآن مخلوق ہے؟

زیادی نے جواب دیا، قرآن کلام الٰہی ہے، خدا ہر شے کا خالق ہے، اس کے سوا ہر چیز مخلوق ہے، امیر المومنین مامون ہمارے امام ہیں، انہی کے ذریعہ سے ہم نے ہر طرح کا علم پایا ہے، وہ جو کچھ سن چکے ہیں، وہ ہم نے نہیں سنا، وہ جو کچھ جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے، اللہ نے ہماری باگ ان کے ہاتھ میں دے دی ہے، وہ حج اور نماز میں ہماری امامت کرتے ہیں، انہی کی خدمت میں ہم اپنے اموال کی زکوٰۃ پیش کرتے ہیں، انہی کے ساتھ ہم جہاد کے معرکوں میں شریک ہوتے ہیں، ہم ان کی امامت کو برحق سمجھتے ہیں، وہ ہمیں جو حکم دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے، وہ ہمیں جس کام سے منع کریں گے ہم، اس سے باز آجائیں گے، وہ جب ہمیں بلائیں گے ہم لبیک کہتے ہوئے ان کی خدمت میں حاضر ہوجائیں گے۔

اسحاق نے یہ باتیں سن کر مزید سوال کیا، یہ ٹھیک ہے، مگر یہ بتاؤ قرآن مخلوق بھی ہے، اس کے جواب میں ابوحسان زیادی نے پھر وہی باتیں دہرادیں جو ابھی کہی تھیں۔

اسحاق نے کہا، لیکن امیر المومنین کا تو اس باب میں یہ ارشاد ہے، اس ارشاد کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

زیادی نے کہا، ہاں! امیر المومنین کا یہ عقیدہ ہوگا، لیکن انہوں نے لوگوں کو یہ حکم تو نہیں دیا ہے، کہ وہ بھی اس عقیدہ کو مان لیں اور نہ انہوں نے اس عقیدہ کی عام دعوت دی ہے اور اگر تم مجھے یہ کہو، کہ امیر المومنین نے تمہیں حکم دیا ہے، کہ میں خلق قرآن کا عقیدہ اختیار کرلوں، تو اگر تم مجھے ایسا حکم دوگے، تو میں اس کے مطابق اپنے عقیدہ کا اظہار کردوں گا، میں تم پر پورا بھروسہ رکھتا ہوں، کہ تم وہی کہوگے، جس کا امیر المومنین نے تمہیں حکم دیا ہے، لہٰذا اگر تم کوئی ایسا حکم مجھ تک پہنچاتے تو میں ضرور اس کی تعمیل کرتا۔

اسحاق نے کہا، بلاشبہ مجھے اس طرح کا کوئی حکم نہیں دیا گیا ہے، کہ میں کوئی بات اس رقعہ کے سوا ان کی طرف سے تم سے کہوں۔

علی بن ابی مقاتل نے کہا، امیر المومنین مامون کا قول خلق قرآن کے بارے میں ایسا ہی ہے جیسا کہ فرائض اور وراثت کے معاملہ میں صحابہ کرام کا اختلاف، لیکن انہوں نے دوسرے کسی شخص کو اپنے اقوال منوانے پر کبھی مجبور نہیں کیا۔

ابوحسان نے کہا، میرے پاس سمع وطاعت کے سوا کچھ نہیں ہے، میں تو بندہ فرمان ہوں، جو حکم ملے گا، اس کی تعمیل کروں گا۔

اسحاق نے اس کے جواب میں کہا، امیر المومنین نے مجھے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے، جس کی میں آپ حضرات سے تعمیل کراؤں، انہوں نے مجھے صرف یہ حکم دیا تھا، کہ میں آپ صاحبان کا امتحان لوں، وہ فرض میں نے ادا کردیا۔

پھر اسحاق امام احمد کی طرف متوجہ ہوا اور کہا، قرآن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

امام احمد:۔ قرآن کلام الٰہی ہے۔

اسحاق بن ابراہیم :۔ کیا وہ مخلوق ہے؟

امام احمد:۔ وہ کلام الٰہی ہے اور میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کو تیار نہیں ہوں۔

پھر اسحاق نے امام احمد کو وہ رقعہ سنایا، جو دوسروں کو سنا چکا تھا اور اس کی تائید چاہی جب وہ اس مقام پر پہنچا "**لا یشبہ شیء فی خلقہ فی معنی من المعانی و وجہ من الوجوہ**" یعنی خدا کی مخلوق میں سے کوئی چیز کسی حیثیت سے اور کسی طرح بھی اس سے مشابہت نہیں رکھتی تو اس پر امام احمد نے فرمایا، میں کہتا ہوں "**لیس کمثلہ شیء وھو السمیع البصیر**" خدا کی طرح کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع وبصیر ہے۔

تو ابن البکاء الاصغر نے اس پر معترض ہوتے ہوئے کہا، خدا تمہاری اصلاح کرے، یہ احمد کہتے ہیں، کہ خدا کان سے سنتا ہے اور آنکھ سے دیکھتا ہے۔

اسحاق نے امام احمد سے دریافت کیا، خدا کے قول سمیع اور بصیر کا کیا معنی ہے؟

امام احمد نے جواب دیا، اس نے اپنا وصف جیسا بیان کیا ہے، وہ ویسا ہی ہے۔

اسحاق نے پوچھا، اس کے معنی کیا ہوئے؟

امام صاحب نے جواب دیا، میں نہیں جانتا، بس وہ ویسا ہی جیسا اس نے اپنا وصف بیان کیا۔

پھر اسحاق نے سب کو فرداً فرداً بلایا اور یہی سوال کیا سب نے جواب میں کہا، قرآن کلام الٰہی ہے، سوائے حسب ذیل حضرات کے:

قتیبہ، عبیداللہ بن محمد بن حسن، ابن علیۃ الاکبر، ابن البکاء، عبدالمنعم بن ادریس، ابن بنت وہب بن منبہ، مظفر بن مرجا اور ایک شخص جو نابینا اور ضعیف تھا، نہ فقیہ تھا، نہ کچھ جانتا تھا، لیکن گھس بیٹھ کر کسی طرح اس مجلس میں پہنچ گیا تھا، اور ایک شخص رقہ کا قاضی جو عمر بن خطاب کی اولاد میں سے تھا اور ابن الاحمر۔

ابن البکاء الاکبر نے اسحاق سے سوال کے جواب میں کہا، قرآن مجعول ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "**انا جعلناہ قرآنا عربیا**"۔

قرآن محدث بھی ہے کیوں کہ خدا خود فرماتا ہے "مایاتیھم من ذکر من ربھم محدث"

اسحاق نے پوچھا، کیا مجعول مخلوق ہے؟ ابن البکاء الاکبر نے کہا، ہاں! ہے، اسحاق نے پھر کہا، پھر تو قرآن مخلوق ہوا؟ انہوں نے جواب دیا، میں مخلوق تو نہیں کہہ سکتا، لیکن یہ کہتا ہوں کہ وہ مجعول (بنایا ہوا) ہے۔

اسحاق نے یہ بیان لکھ لیا۔

ان حضرات کے امتحان سے جب اسحاق فارغ ہوگیا اور ان کے بیانات اس نے نوٹ کر لیے تو ابن البکاء الاصغر نے اعتراض کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی، کہ ان دونوں قاضیوں کو جو امام ہیں، یہ حکم دیں، کہ اپنے خیالات ظاہر کریں تاکہ ان کے خیالات کی دوسروں سے ہم حکایت کر سکیں۔

اسحاق نے جواب دیا، اگر ان دونوں حضرات کی خدمت میں کبھی تم بطور گواہ کے پیش ہوگئے تو خود ہی جان لوگے، ان کے خیالات کیا ہیں؟

اس کے بعد اسحاق نے جملہ حاضرین کے فرداً فرداً خیالات وعقائد قلم بند کیے اور مامون کی خدمت میں ارسال کر دیے، نو دن تک یہ حضرات اسحاق کے پاس مقیم رہے، تاکہ مامون کے پاس سے ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر جواب آئے۔

نو دن کے بعد اسحاق نے ان سب حضرات کو دوبارہ طلب کیا، کیوں کہ اس کے خط کا جواب مامون کے پاس سے آچکا تھا۔

مامون کا تیسرا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اما بعد! امیر المومنین کو تمہارا خط ان کے اس مکتوب کے جواب میں موصول ہوا، جس میں انہوں نے قرآن کے بارے میں ایک بناوٹی اور غلط عقیدہ رکھنے والے لوگوں کا امتحان لینے اور ان کے حالات وکیفیات بیان کرنے کا تمہیں حکم دیا تھا۔

اس خط سے معلوم ہوا، کہ تم نے امیر المومنین کا مکتوب موصول ہونے کے بعد جعفر بن عیسیٰ اور عبدالرحمٰن بن اسحاق کی موجودگی میں مدینۃ السلام (بغداد) کے فقیہوں، محدثوں اور مفتیوں کو سنایا اور پھر ان سے قرآن کے بارے میں ان کا عقیدہ دریافت کیا اور یہ معلوم کیا کہ کون اس بات کا قائل ہے، کوئی چیز بھی کسی طرح خدا سے مشابہت نہیں رکھتی اور یہ کہ قرآن کے بارے میں ان کے خیالات میں کس درجہ اختلافات ہیں، یہ بھی معلوم ہوا، کہ جو شخص خلق قرآن کا قائل نہیں ہے، اسے تم نے علانیہ طور پر درس حدیث اور فتویٰ دینے سے منع کر دیا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا، کہ تم نے دونوں قاضیوں کی طرح سندی اور عباس مولیٰ امیر المومنین کو حسب ایمائے امیر المومنین حکم دے دیا ہے، کہ جو گواہ ان کے سامنے پیش ہوا کریں، ان کے بارے میں وہ اطمینان کر لیا کریں، کہ خلق قرآن کے سلسلہ میں ان کا عقیدہ کیا ہے؟ علاوہ ازیں یہ کہ تم نے اپنے علاقہ کے تمام قاضیوں کو طلب کیا ہے، تاکہ امیر المومنین کے حسب ارشاد تم ان کا بھی امتحان لو۔

خط کے آخر میں تم نے ان تمام لوگوں کے نام لکھ دیے ہیں، جو حاضر تھے اور ان کے خیالات بھی قلم بند کر دیے ہیں، امیر المومنین تمہارے خط کے مفہوم سے پورے طور پر واقف ہوئے اس تمام کاروائی پر وہ خدائے کریم کا شکر بجالاتے ہیں اور اس سے التجا کرتے ہیں، کہ وہ اپنی رحمت اپنے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائے، امیر المومنین خدائے قادر وتوانا سے مستدعی ہیں، کہ اپنی طاعت کی انہیں توفیق دے اور اپنی رحمت سے نیت کی سلامتی کے ساتھ ان کی مدد کرے۔

اپنے خط میں تم نے جن لوگوں سے قرآن کے بارے میں سوال وجواب کی کیفیت لکھی ہے امیر المومنین نے اس پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ بشر بن الولید نے نفی تشبیہ میں جو کچھ کہا اور جس طرح قرآن کے مخلوق ہونے کے بارے میں خاموش رہا اور یہ دعوی کیا کہ وہ اس کے بارے میں امیر المومنین کے سامنے عہد کر چکا ہے، تو واقعہ یہ ہے، کہ بشر نے غلط بیانی سے کام لیا، جھوٹ بولا اور نا قابل تسلیم بات کی ہے، واقعہ یہ ہے، کہ اس کے اور امیر المومنین کے مابین اس سلسلہ میں نہ کوئی گفتگو ہوئی، نہ معاہدہ، نہ مناظرہ، اس کے برعکس بارہا امیر المومنین کے سامنے دعوائے اخلاص کے ساتھ اس نے اپنے اعتقاد کو بیان کیا ہے اور اعتراف کیا ہے، کہ قرآن مخلوق ہے، لہٰذا تم اسے بلاؤ اور جو کچھ امیر المومنین نے لکھا ہے، اسے بتاؤ اور قرآن کے بارے میں صاف صاف اس کے خیالات معلوم کرو، اور اس سے کہو، کہ توبہ کرے، کیوں کہ امیر المومنین کا یہ خیال ہے، کہ جو شخص قرآن کے بارے میں ایسے خیالات رکھتا ہے، وہ کفر صریح اور شرک محض کا ارتکاب کرتا ہے، پس اگر وہ ان خیالات سے توبہ کرلے، تو تم اس کا اعلان کر دینا اور اگر وہ اپنے شرک پر اصرار اور قرآن کے مخلوق ہونے پر انکار کرے تو اس کفر والحاد کی پاداش میں اس کی گردن اڑا دینا اور امیر المومنین کی خدمت میں اس کا سر بھیج دینا۔

اسی طرح ابراہیم بن مہدی کے ساتھ کرنا، بشر کی طرح ان کا بھی امتحان لو، کیوں کہ وہ بھی بشر کی مانند غلط بیانی کرتا رہتا ہے، امیر المومنین تک اس کی غلط بیانیوں کا طومار پہنچ چکا ہے، پس اگر وہ اقرار کرلے، کہ قرآن مخلوق ہے، تو اس کے اس عقیدہ کو بھی مشتہر کر دو اور اسے رہا کر دو، بصورت دیگر اس کی گردن مار دو اور امیر المومنین کی خدمت میں اس کا کٹا ہوا سر بھیج دو۔

رہا علی بن ابی مقاتل، تو اس سے پوچھنا، کہ کیا تو نے امیر المومنین سے یہ بات نہیں کہی، کہ تو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیتا ہے، اور کیا اس نے قرآن کے بارے میں اپنا وہی عقیدہ نہیں بیان کیا، جو امیر المومنین نے اپنا بیان فرمایا تھا۔

اور ذیال بن ہیثم سے کہنا، کہ تو وہ ہے، جو انبار میں کھانا چرایا کرتا تھا، اور امیر المومنین ابوالعباس نے جو خدمت اسے سونپی تھی، کیا وہ مشغلہ اس کے لیے کافی نہیں ہے اور اگر واقعی وہ آثار سلف کی پیروی کرنے والا ہوتا تو کبھی ایمان کے بعد شرک کے راستہ پر نہ جا پڑتا اور احمد بن یزید المعروف بہ ابی العوام نے قرآن کے بارے میں جواب دینا مناسب نہیں سمجھا، اس جاہل کو بتا دینا کہ وہ عقل و دانش کے اعتبار سے ایک طفل کم سواد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، قرآن کے بارے میں اس نے جواب نہیں دیا، لیکن جب وہ تادیب وتعزیر سے دوچار ہوگا، تو جواب دے گا، بہر حال اگر وہ حسب مراد جواب نہ دے تو پھر تلوار سے کام لو۔

اور ہاں احمد بن حنبل کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا، امیر المومنین نے اسے پڑھا، احمد کو بتادو، کہ امیر المومنین اس کے مفہوم ومنشا سے پورے طور پر واقف ہیں، اس مسئلہ میں وہ اس کے جاہلانہ عقیدہ سے مطلع ہوئے، اس کا خمیازہ بہرحال اسے اٹھانا پڑے گا۔

اور فضل بن غانم کو بتادو، کہ ایک سال سے کم کی مدت میں مصر سے اس نے جو روپیہ ناجائز طور پر کمایا، اس کے باعث وہ امیر المومنین سے خائف نہیں ہے، جواب مزید جرم کا ارتکاب کر رہا ہے، حالاں کہ اس حرکت پر مطلب بن عبداللہ سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا، جس شخص کے کردار کی پستی کا یہ عالم ہو اور جو درہم و دینار کا ایسا لالچی ہو اس سے ہرگز یہ بات مستبعد نہیں ہے، کہ وہ اپنا ایمان بھی سیم وزر، اور نفع عاجل کی خاطر بیچ ڈالے، علاوہ ازیں اس نے علی بن ہشام سے اپنا جو عقیدہ بیان کیا تھا، وہ اس سے قطعاً مختلف تھا، جس کا اظہار اب وہ کررہا ہے، لہٰذا اس سے دریافت کرو کہ اس انقلاب خیال میں کیا راز ہے؟۔

اور زیادی کو بتادو، کہ وہ اس شخص کی اولاد میں ہے، جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں سب سے پہلے اختلاف کیا گیا، ظاہر ہے، وہ بھی اپنے باپ ہی کے نقش قدم پر چلے گا، جو جھوٹا مدعی نسب تھا، اسی لیے ابوحسان نے زیادی یا کسی شخص کا مولیٰ بننے سے انکار کردیا، کسی شخص نے بھی اس کا مولیٰ بننا گوارہ نہیں کیا، (بیان کیا جاتا ہے، کہ ایک خاص وجہ سے زیاد کی طرف منسوب کیا گیا تھا۔)

اور جو شخص ابونصر التمار کے نام سے مشہور ہے، اس سے کہہ دو، کہ امیر المومنین کی نگاہ میں جیسی پست اس کی تجارت ہے، ویسی ہی ذلیل اس کی عقل ہے۔

اور فضل بن الفرخان سے کہہ دینا کہ قرآن کے بارے میں یہ عقیدہ اس لیے تو نے اختیار کیا ہے، کہ تو ان امانتوں کو ہضم کرلینا چاہتا ہے، جو عبدالرحمٰن بن اسحاق وغیرہ نے تیری سپردگی میں دی تھیں اور اس امر کا خواہش مند ہے، کہ یہ امانت رکھانے والے کسی طرح ختم ہوں کہ تو تمام مال ومنال پر قبضہ کرے، مگر چوں کہ وہ بہت سن رسیدہ اور بوڑھا ہے، اس لیے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی، البتہ عبدالرحمٰن بن اسحاق سے کہنا، کہ خدا تجھے جزائے خیر سے محروم رکھے، کہ تو نے ایسے شخص کو قوت پہنچائی اور ایسے شخص کے پاس اپنی امانت رکھوائی جو شرک کا معتقد اور توحید سے برگشتہ ہے۔

محمد بن غانم اور ابن نوح اور ابو معمر سے کہو، کہ یہ سود خوار لوگ بھلا توحید کو کیا سمجھ سکتے ہیں، اور امیر المومنین بھلا ان لوگوں کے خلاف جہاد کو کیسے جائز نہ قرار دیں جب کہ کتاب الٰہی (قرآن) میں ان جیسوں کے لیے جہاد کا حکم وارد ہوا ہے، اور یہ تو دوہرے مجرم ہیں، کہ انہوں نے سود خواری کے ساتھ ساتھ شرک کو بھی اپنا شعار بنالیا ہے اور اس طرح اب وہ مثل نصاریٰ کے ہیں۔

اور احمد بن شجاع سے کہہ دینا، کہ کل کی بات ہے، جب علی بن ہشام کے مال میں سے ناجائز طور پر تو نے بھی ابو معمر کے ساتھ حصہ بٹایا تھا لہٰذا معلوم ہوا تیرا دین و مذہب صرف دینار و درہم ہیں۔

سعدویہ الواسطی سے کہنا، کہ خدا اس شخص کو غارت کرے، جو ایک طرف تو حدیث نبوی کی زیب وزینت میں لگا رہتا ہے، اور اس کا جویا رہتا ہے، اس فن میں سیادت کا درجہ حاصل کرلے اور دوسری طرف جب امتحان کا وقت آتا ہے، تو درس حدیث کی مسند پر بھی بیٹھتا ہے اور انکار کے رویہ پر بھی قائم رہتا ہے۔

اور وہ شخص جو سجادہ کے نام سے مشہور ہے، جس کا یہ دعویٰ ہے، کہ اس نے اپنے معاصر حضرات اہل حدیث اور اہل فقہ سے کبھی یہ نہیں سنا، کہ قرآن مخلوق ہے، کہہ دو کہ کھجور کی گٹھلیاں شمار کرنے، اپنے لبادے کی درستگی کرنے اور علی بن یحییٰ وغیرہ کی امانتوں میں تغلب کرنے میں وہ اس قدر مشغول ہے، کہ اس نے توحید کو فراموش کردیا، اس سے دریافت کرو، کہ اگر تو یوسف بن ابی یوسف اور محمد بن الحسن کی صحبت میں واقعی شریک رہا تو کیوں نہیں بتاتا، کہ خلق قرآن کے بارے میں ان لوگوں کا خیال کیا تھا؟

اور قواریری وہ شخص ہے، کہ جب اس کے احوال کی چھان بین کی گئی تو معلوم ہوا، کہ یہ رشوت لیتا رہا ہے، یہ ایسے امور کا مرتکب رہا ہے، جن سے اس کی بے ایمانی، بداخلاقی اور سفاہت عقل ودین پورے طور پر ہویدا اور ظاہر ہے، امیر المومنین کے سمع مبارک میں یہ بات بھی پہنچی ہے، کہ وہ جعفر بن عیسیٰ الحسنی کے معاملات کا وکیل اور مختار ہے، پس تم جعفر بن عیسیٰ سے کہہ دو کہ اس سے الگ تھلگ رہے اس پر بھروسہ نہ کرے اور نہ اسے اپنا امین بنائے۔

اور یحییٰ بن عبدالرحمٰن العمری اگر واقعی حضرت عمر بن خطاب کی اولاد میں سے ہیں، تو ان کا جواب معروف ومعلوم ہے۔

اور محمد بن حسن بن علی بن عاصم اگر اپنے اسلاف کرام کے نقش قدم پر رہروی کر رہے ہوتے تو ہرگز وہ مسلک نہ اختیار کرتے جس کے بارے میں ان کی شہرت ہو رہی ہے اور پھر وہ ابھی نوعمر ہیں، ان کی تعلیم وتربیت پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

امیر المومنین تمہارے پاس ابومسہر کو روانہ کرتے ہیں، انہوں نے قرآن کے بارے میں اس کا امتحان لیا، پہلے تو اس نے جواب دینے سے گریز کیا اور ٹال مٹول کی کوشش کی، مگر جب امیر المومنین نے اس کی گردن قلم کرنے کے لیے تلوار طلب کی تو اس نے گڑگڑا کر خلق قرآن کا اقرار کرلیا، پس اگر وہ اس عقیدے پر قائم ہو تو اس کے عقیدے کو شہرت دو!۔

جن لوگوں کے نام تم نے اپنے مکتوب بنام امیر المومنین میں تحریر کیے ہیں، یا جن کے نام امیر المومنین نے لکھے ہیں، یا جن کا ذکر اس خط میں نہیں بھی کیا ہے، تو اگر یہ اپنے شرک سے باز نہ آئیں اور قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کریں، تو بشر بن الولید اور ابراہیم بن المہدی کے علاوہ سب کو طوق وسلاسل میں اسیر کرکے سرکاری محافظوں کے ساتھ امیر المومنین کی خدمت میں روانہ کردو، یہاں تک کہ وہ لوگ لشکر امیر المومنین میں پہنچ جائیں اور ان لوگوں کی تحویل میں آجائیں، جو اس کام پر مامور کیے گئے ہوں، تاکہ امیر المومنین بہ نفس نفیس ان کا امتحان لیں اور اگر وہ اپنے عقیدے سے رجوع نہ کریں اور تائب نہ ہوں تو ان سب کی گردنیں تلوار سے اڑا دیں، انشاء اللہ ولا قوۃ الا باللہ!

امیر المومنین یہ فرمان دوسرے سرکاری کاغذات کے جمع ہونے کا انتظار کیے بغیر بطور خاص فرض الٰہی سمجھ کر اور اس کے

تقرب کی تمنا میں تم کو روانہ کرتے ہیں اور تمہیں ہدایت کرتے ہیں، کہ اس کا نفاذ فوراً کر دینا اور اس کا جواب بھی اسی طرح بطور خاص امیر المومنین کی خدمت میں ارسال کر دینا، تا کہ وہ جان لیں، کہ تم نے اس سلسلہ میں کیا کیا؟ (ایضاً ص ۴۸ تا ۵۰)

مامون کے خطوط اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں، کہ وہ بتدریج منکرین خلق قرآن کی سزا و عقوبت میں اضافہ کرتا رہا اور آخری خط میں اس کا تشدد نقطہ عروج کو پہنچ گیا، چنانچہ اس نے اہل حق کے لیے سزائے موت تجویز کی۔

اس خط کی وصول یابی کے فوراً بعد اسحاق بن ابراہیم نے مامون کے حکم کی تعمیل کر دی، فقہا و محدثین اور اصحاب فتویٰ کو بلا کر دھمکی دی، کہ اگر انہوں نے خلق قرآن کے عقیدے کو نہ مانا تو انہیں شدید آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا، چنانچہ سب نے بلا روک ٹوک یہ باطل نظریہ تسلیم کر لیا اور اعلانیہ خلق قرآن کے قائل ہو گئے۔

امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح قید و بند میں

اس کڑی آزمائش میں صرف چار علمی شخصیتیں اپنے موقف پر جمی رہیں وہ حکم خداوندی پر قانع رہے، ان کے پایہ ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آئی، وہ چار بزرگ یہ تھے (۱) امام احمد بن حنبل (۲) محمد بن نوح (۳) قواریری (۴) سجادہ۔

ان چاروں کو بیڑیاں پہنا کر قید خانے میں بھیج دیا گیا، جہاں انہوں نے رات گزاری، جب صبح ہوئی، تو سجادہ نے معتزلہ کی دعوت پر لبیک کہہ دی اور وہ بیڑیوں سے آزاد کر دیا گیا، باقی اسی طرح مقید رہے، اگلے دن ان سے خلق قرآن کے بارے میں دریافت کیا گیا، قواریری کا عقیدہ متزلزل ہو گیا اور اس نے نظریہ خلق قرآن قبول کر لیا، اسے بھی آزادی مل گئی، اب صرف دو مردان حق قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے لیے باقی رہ گئے، جنہیں طوق و سلاسل میں جکڑ کر مامون کے پاس روانہ کیا گیا، جو اس وقت طرطوس میں مقیم تھا۔

یہ لوگ کوفہ کے علاقے میں تھے، تو بدوؤں کا ایک غلام جابر بن عامر ان کے پاس آیا اور اس نے سلام کیا اور کہنے لگا، آپ ارباب اقتدار کے پاس جانے والے ہیں، ان کے لیے منحوس نہ بنیں، آج آپ مسلمانوں کے سردار ہیں اور جس بات کی طرف آپ کو دعوت دیتے ہیں، اس کا جواب دینے سے بچیں، ورنہ قیامت کے دن آپ ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے اور اگر آپ اللہ سے محبت کرتے ہیں، تو آپ جس حالت میں ہیں، اس پر صبر کیجیے، آپ کے بعد جنت کے درمیان صرف آپ کا قتل ہونا ہی باقی ہے اور اگر آپ زندہ رہے، تو قابل تعریف حالت میں زندہ رہیں گے۔ (ابن کثیر ج ۱۰ ص ۸۸۵)

امام احمد کا بیان ہے، کہ اس غلام کی گفتگو نے میرے عقیدے اور عزم کو قوت عطا کی، آپ کہتے ہیں:

سمعت كلمة منذ وقعت فى هذا الامر الذى وقعت فيه اقوى من كلمة اعرابى كلمنى فيها فى رحبة طوق قال لى يا احمد ان يقتلك الحق مت شهيدا وان عشت عشت حميدا قال فقوى قلبى ۔ (مناقب ص ۳۹)

جب سے میں اس آزمائش میں مبتلا کیا گیا اس اعرابی کی گفتگو سے زیادہ قوت دینے والی کوئی بات نہیں سنی،

جس نے مجھ سے اسیری کی حالت میں کہا، احمد! اگر حق پر قتل کیے جاؤ گے تو شہید ہو گے اور اگر زندہ رہے تو تمہاری ستائش کی جائے گی۔

احمد کہتے ہیں اس بات نے میرے دل کو مضبوط کر دیا۔

راہ حق کے دونوں باعظمت قیدی جب خلیفہ کی قیام گاہ سے ایک دن کی مسافت پر تھے، تو ایک خادم اپنے آنسو پوچھتے ہوئے حاضر ہوا اور کہنے لگا اے ابو عبداللہ! مجھ پر یہ بات گراں گزرتی ہے، کہ مامون نے ایک تلوار سونتی ہے، جو اس سے پہلے کبھی نہیں سونتی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قرابت داری کی قسم کھا کر کہتا ہے، کہ احمد بن حنبل نے اگر خلق قرآن کے قول کو قبول نہ کیا تو اسے اپنی تلوار سے قتل کر دے گا۔

امام صاحب اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا، اے میرے اللہ! تیرے حلم نے اس فاجر کو فریب دیا ہے، حتی کہ اس نے تیرے اولیا کے ضرب وقتل پر جرأت کی ہے، اے اللہ! اگر قرآن جو تیرا کلام ہے، غیر مخلوق ہے، تو ہمیں اس کی مشقت سے کفایت کر۔

رات کے آخری پہر خبر آئی، کہ مامون مر گیا اور معتصم کو خلیفہ بنا دیا گیا۔ (ابن کثیر ج ۱۰ ص ۸۸۹)

یہ واقعہ جمادالثانی ۲۱۸ھ میں پیش آیا۔

معتصم باللہ کا دور

مامون نے اپنی موت سے پہلے مستقبل کے ہونے والے خلیفہ کو یہ وصیت کی، ابو اسحاق! آیئے میری نصیحت قبول کیجیے اور خلق قرآن کے بارے میں میری ہموار کردہ راہ پر گامزن رہیے۔ (اسلامی مذاہب ص ۲۵۸)

اس وصیت سے اندازہ ہوتا ہے، کہ مامون قرآن کے بارے میں اپنے تشدد پسند نقطہ نظر کا پابند معتصم کو بھی دیکھنا چاہتا تھا، گویا مامون کے اندر اس احساس نے کروٹ لی تھی، کہ خلق قرآن کا مسئلہ ایک واجب الاتباع دین ہے، جس کی پیروی کرنا، اس کی دعوت دینا اور بزور و جبر لوگوں کو اس کا قائل بنانا خلیفہ کے فرائض میں سے ہے، چنانچہ معتصم نے مامون کی وصیت پر حرف بحرف عمل کیا، مزید برآں مامون نے رئیس المعتزلہ قاضی احمد بن دؤاد کے سلسلے میں معتصم کو یہ بھی وصیت کی تھی، ابو عبداللہ بن دؤاد کو سفر و حضر میں ساتھ رکھنا اور ہر مشورہ میں شریک کرنا، وہ اس کے ہر طرح اہل ہیں۔ (ایضاص ۲۵۵)

محمد بن نوح کی وفات

مامون کی موت نے اہل حق کے خلاف تشدد کی کارروائیوں کو سردست موقوف کر دیا، حضرت امام احمد اور محمد بن نوح کو پابہ جولاں بغداد کی طرف روانہ کر دیا گیا، اثنائے راہ مقام عافات میں محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، امام احمد نے نماز جنازہ پڑھائی، صبر و استقامت کے پیکر نورانی کو سپرد خاک کر دیا گیا، امام احمد فرماتے ہیں:

مارایت احدا علی حداثة سنه وقدر علمه اقوم بامر اللہ من محمد بن نوح وانی لارجو ان یکون قد ختم له بخیر ۔ (تاریخ ذہبی ص ۹۸)

میں نے کسی نوعمر صاحب علم کو محمد بن نوح سے زیادہ اللہ کے حکم کو قائم کرنے والا نہیں دیکھا۔

عزیمت کی اس راہ میں امام احمد کی تنہا ذات جو حوالہ زنداں کر دی گئی باختلاف روایت ۲۸ / ماہ یا ۳۰ / ماہ قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار رہے۔

امام احمد معتصم کے دربار میں

معتصم باللہ کے مشیر خاص قاضی احمد بن دؤاد اور مامون کی آخری وصیت کی وجہ سے خلق قرآن کا فتنہ مزید زور و شور کے ساتھ اٹھا اور اہل حق کی آزمائشیں سخت سے سخت ہوگئیں اور حوادث و آلام کا سلسلہ پہلے سے بڑھ گیا، زہاد و عباد، علما و فضلا، محدثین و فقہا اور اہل فتویٰ خصوصی طور پر اس کا شکار ہوئے۔

بغداد پہنچنے کے بعد امام صاحب کو کچھ دنوں مقام یاسریہ میں کرایہ کے ایک مکان میں پھر عام جیل میں رکھا گیا، جہاں آپ بیڑیوں میں رہ کر قیدیوں کی امامت کرتے تھے، رمضان المبارک ۲۱۹ھ میں اسحاق بن ابراہیم کے مکان کے قریب منتقل کیے گئے۔ (تاریخ ذہبی ج ۱ ص ۹۹)

آخر الامر حضرت امام کو پیشی کے لیے بلایا گیا، اسحاق ہی طلبی کا پروانہ لے کر پہنچا، اس نے امام احمد سے کہا:

یا احمد انها نفسك انها لا یقتلك بالسیف انه قد آلیٰ بان لم تجبه ان یضربك ضربا بعد ضرب وان یقتلك فی موضع لایری فیه شمس ولا قمر ۔ (تاریخ ذهبی، ج ۱، ص ۴۳)

اب تم اپنے متعلق خود سوچ لو، خلیفہ تمہیں تلوار سے قتل نہیں کرے گا، وہ اس پر تلا ہوا ہے، کہ اگر تم عقیدہ خلق قرآن پر ہاں نہ کرو تو کوڑے پر کوڑے برسائے گا اور تمہارا خاتمہ ایسی جگہ کرے گا جہاں نہ سورج دکھائی دے نہ چاند۔

پیشی ہوئی، تو سماں یہ تھا، کہ معتصم بیٹھا ہے، قاضی ابن ابی دؤاد پاس موجود ہے اور دربار کے بہت سے لوگ جمع ہیں، صالح بن احمد کی روایت کے مطابق امام پر کوئی ادھر سے سوال کرتا اور وہ اس کا جواب دیتے، کوئی ادھر سے اعتراض کرتا اور وہ اسے رد کرتے، پھر جب کسی شخص کی بات ختم ہو جاتی، تو ابن ابی دؤاد جو امام کی طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھتا تھا، خلیفہ سے کہتا ہے، مگر امیر المومنین خدا کی قسم یہ شخص گمراہ بدعتی ہے، یعنی بحث و کلام فضول ہے، مگر معتصم یہ کہتا، کہ اس سے بات کرو، مناظرہ کرو اور امام کا مطالبہ یہ تھا:

اعطونی شیئا من کتاب اللہ وسنة رسوله حتی اقول به ۔ (ایضا)

میرے سامنے کوئی بات خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں سے لاؤ یہاں تک کہ میں اس کا اقرار کرلوں۔

دراصل امام کا یہ جواب شریعت کے ایک اصل الاصول کا آئینہ دار تو تھا ہی معتزلہ کے نظریات اوران کے مزاج پر ضرب کاری بھی تھا، ہر دور کے عقل پرستوں نے جب بیرونی اثرات کے تحت سوچنا شروع کیا تو آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی عقلیت کو کتاب وسنت کے مقابلے میں بالاتر اتھارٹی بنالیا، ایسے عناصر شریعت کے اصولوں کو مسخ کرنے کے لیے ایک طرف سنت سے بغاوت کا آغاز کرتے ہیں، حدیث نبوی سے روگردانی کرتے ہیں اور پھر قرآن کی آیات سے اپنی پسند کے مفہوم کھینچ کھانچ کر نکال لاتے ہیں، معتزلہ کا مزاج بھی یہی تھا، کہ وہ سنت کو اہمیت نہ دیتے تھے، احادیث کی اسناد و مفہوم میں طرح طرح کے نکتے چھانٹ کر انہیں ساقط الاعتبار اور مشتبہ بنا دیتے اور پھر قرآن کو من مانے معنی پہناتے تھے۔

اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، کہ امام احمد نے فرمایا:

یا امیر المومنین اعطونی شیئا من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتی اقول بہ فیقول ابن ابی دؤاد انت لا تقول الا مافی کتاب اللہ وسنۃ رسول اللہ ؟ فقلت تاولت تاویلا فانت اعلم وما تاولت مایحبس علیہ وما یقید علیہ ۔ (حلیۃ الاولیا ج ۹ ص ۱۹۷)

اے امیر المومنین آپ مجھے اللہ کی کتاب اور سنت رسول سے کوئی چیز پیش کریں تا کہ میں اسے کہوں، اس وقت بن ابی دواد نے کہا اے احمد! تم کتاب وسنت کے سوا کوئی بات نہیں کہتے ہو؟ (وہاں بات سے مراد دلیل تھی، مگر ابن ابی دواد نے امام کے سامنے ہی تحریف کر ڈالی) امام صاحب فرماتے ہیں، تم نے جو کچھ تاویلیں کر لی ہیں تم ان کو خود بہتر طور پر جانتے ہو اور تمہاری تاویل تو وہ ہے جس پر لوگوں کو گرفتار اور قید کیا جا رہا ہے۔

محمد بن ابراہیم البوشنجی بیان کرتے ہیں، میرے بعض اصحاب نے کہا، جب ابن ابی دواد مجبور ہو گیا، تو اس نے بڑی لجاجت سے کہا:

یا امیر المومنین واللہ لئن اجابك لھو احب الی من ماۃ الف دینار وماۃ الف دینار ویعد من ذلك ما شاء اللہ ان یعد ۔ (حلیۃ الاولیا ج ۹ ص ۲۰۱)

اے امیر المومنین اگر یہ شخص مان لے تو یہ بات مجھے سو ہزار دینار اور مزید سو ہزار دینار سے زیادہ مرغوب ہے وہ اپنے جملہ ''سو ہزار دینار'' کی جب تک چاہا تکرار کرتا رہا۔

وقت کا اقتدار اعلیٰ امام صاحب کی استقامت کے سامنے سرنگوں تھا اور بڑی لجاجت سے کہہ رہا تھا:

واللہ لئن اجابنی لاطلقن عنہ بیدی ولارکبن الیہ بجندی ولاطئن عقبہ ۔ (تاریخ ذہبی ج ۱ ص ۱۰۳)

خدا کی قسم اگر احمد میری بات مان لیں تو میں انہیں اپنے ہاتھ سے آزاد کروں گا خود لشکریوں کے ساتھ سوار ہو کر ان کے پاس جاؤں گا اور ان کے پیچھے پیچھے چلوں گا۔

اقتدار کتنا بے بس تھا ایک آزاد حق گو کے سامنے امام کی جان تو لی جا سکتی ہے، لیکن معتصم اپنی ساری سطوت و جبروت کے باوجود ایک بات ان سے منوانے پر قادر نہ تھا، اسی لیے وہ جبر کے ساتھ لجاجت پر اتر آیا تھا۔

امام احمد پر کوڑوں کی برسات

حسن بن محمد بن عثمان نے دواد بن عرفہ کے واسطے سے میمون بن الاصبغ کا مشاہدہ یوں بیان کیا ہے:

میں بغداد میں تھا، میں نے شور وغل سنا، دریافت کیا، کہ یہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا، کہ امام احمد بن حنبل معرض امتحان میں ہیں، تو میں نے اس کے لیے روپیہ لیا اور اسے لے کر کسی ایسے شخص کی طرف چلا، جو مجھے اس مجلس میں پہنچا دے، چنانچہ لوگوں نے مجھے پہنچا دیا، وہاں کیا دیکھا، کہ تلواریں کھنچی ہوئی ہیں، نیزے تنے ہوئے ہیں، زرہیں کسی ہوئی ہیں اور کوڑے تیار رکھے ہیں، پھر انہوں نے مجھے سیاہ رنگ کی قبا پٹی اور تلوار سے آراستہ کیا اور ایسی جگہ ٹھہرایا، کہ میں گفتگو سن سکوں، امیر المومنین نے تخت پر بیٹھ کر امام سے کہا:

وقرابتی من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاضربنك بالسیاط او تقول کما اقول .

رسول اللہ سے قرابت کی قسم دے کر کہتا ہوں، کہ میں تمہیں لازماً کوڑے لگواؤں گا یا تم وہ کہو جو میں کہتا ہوں۔

اس کے بعد جب امام نے تعمیل نہیں کی تو کوڑے برسنے لگے، پہلے کوڑے پر امام نے ”بسم اللہ“ کہی، دوسرے کوڑے پر ”لا حول ولاقوۃ الا باللہ“ پڑھا تیسرے پر کہا ”القرآن کلام اللہ غیر مخلوق“ قرآن کلام الٰہی ہے غیر مخلوق ہے، چوتھے پر کہا ”قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا“ کہہ دو ہم کو کوئی مصیبت نہیں آ سکتی مگر صرف وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے، ایک ایک کر کے ۱۹ کوڑے برس گئے۔

امام احمد پر کوڑوں کی سخت بارش ہوتی رہی، جب بے ہوش ہو جاتے ضرب موقوف کر دی جاتی، ہوش میں آتے تو پھر کوڑے برسنے لگتے امام احمد کہتے ہیں، کہ ایک مرتبہ غش کھا کر گرا، جب ہوش آیا تو میں نے دیکھا، کہ معتصم ابن ابی دواد سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

لقد ارتکبت فی امر ھذا الرجل .

تو نے اس شخص کے معاملے میں زیادتی کی ہے۔

امام احمد کے صبر وضبط نے معتصم کے دل کو تو نرم کر دیا، لیکن قاضی بن ابی دواد کا درباری کردار ملاحظہ کیجیے، وہ مزید ظلم پر ابھارنے کے لیے کہتا ہے:

یا امیر المومنین انه کافر مشرك قد اشرك من غیر وجه فلا یزال به حتی یصرفه عما یرید وقد کان اراد تخلیتی بغیر ضرب فلم یدعه ولا اسحاق بن ابراهیم وعزم حینئذ علی ضربی ۔ (تاریخ ذهبی ص ۱۰۹)

اے امیر المومنین خدا کی قسم یہ شخص کافرِ ومشرک ہے، (نعوذ باللہ) شرک بھی اس نے بلا وجہ کیا ہے اور یہ اس سے باز نہیں آئے گا، جب تک اسے باز نہ رکھا جائے گا امام صاحب خود کہتے ہیں، معتصم کا انداز ایسا تھا، کہ مجھے بے مارے چھوڑ دیتا، مگر ابن ابی دواد اور اسحاق بن ابراہیم نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، اس نے مجھے مارنے کی ٹھان لی۔

اسحاق بن ابراہیم نے سزا کے لیے دلیل دیتے ہوئے کہا، اس شخص کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو یہ بات خلافت کے لیے باعث ننگ وعار ہوگی اور اس سے گزشتہ اور موجودہ خلفا کی عظمت پر حرف آئے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ فرماں رواؤں کو ان کے حواری اور حاشیہ نشیں مطلق العنان اور جبر وتشدد کا عادی بنا دیا کرتے تھے، یہ بات سننے کے بعد معتصم غضب ناک ہوگیا، حالاں کہ وہ نرم طبیعت انسان تھا۔ امام احمد کہتے ہیں:

اس موقع پر اس نے مجھ سے کہا، اللہ تجھ پر لعنت کرے، میں نے تیرے بارے میں خواہش کی، کہ مجھے جواب دے، لیکن تو نے مجھے جواب نہیں دیا، پھر کہنے لگا، اسے پکڑلو، اس کے کپڑے اتار دو اور اسے گھسیٹو، امام احمد بیان کرتے ہیں، مجھے پکڑ لیا گیا اور مجھے گھسیٹا گیا اور میرے کپڑے اتارے گئے اور سزا دینے والوں اور کوڑوں کو لایا گیا میں دیکھ رہا تھا، اور میرے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ موئے مبارک تھے، جو میرے کپڑے میں بندھے تھے، انہوں نے مجھے کپڑوں سے برہنہ کردیا اور میں عتابوں کے درمیان ہوگیا، میں نے کہا اے امیر المومنین اللہ سے ڈریے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ”لا الہ الا اللہ“ کی شہادت دینے والے کا خون صرف تین باتوں میں سے ایک بات کے پائے جانے پر حلال ہوتا ہے اور میں نے وہ حدیث پڑھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، مجھے حکم دیا گیا ہے، کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، حتی کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں اور جب وہ یہ کہہ دیں تو وہ اپنے خون اور اموال مجھ سے محفوظ کرلیں گے، پس آپ کس وجہ سے میرے خون کو حلال کہتے ہیں؟ حالاں کہ میں نے ان میں سے کوئی کام نہیں کیا ہے، اے امیر المومنین! اللہ کے حضور اپنے کھڑے ہونے کو یاد کیجیے، آپ وہاں ایسے ہی کھڑے ہوں گے جیسے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں یوں معلوم ہوا، کہ گویا وہ رک گیا ہے پھر وہ مسلسل اسے کہتے رہے، اے امیر المومنین یہ ضال مضل اور کافر ہے، اس نے مجھے حکم دیا تو میں عتابوں کے درمیان ہوگیا، اور ایک کرسی لائی گئی اور مجھے اس پر کھڑا کیا گیا اور ان میں سے بعض نے مجھے حکم دیا، کہ میں دونوں ہاتھوں سے ایک لکڑی کو پکڑلوں لیکن میں سمجھ نہیں سکا پس میرے ہاتھ الگ الگ ہوگئے اور مارنے والوں کو لایا گیا وران کے پاس کوڑے تھے اور ان میں سے ہر ایک مجھے دو دو کوڑے مارنے لگا اور معتصم اسے کہنے لگا زور سے مار اللہ تیرے ہاتھوں کو قطع کردے اور دوسرے نوکر نے مجھے دو کوڑے مارے پھر تیسرا آگے بڑھا، غرضیکہ انہوں نے مجھے کوڑے مارے اور میں بے ہوش گیا اور کئی بار میری عقل جاتی رہی اور جب مار رک جاتی تو میری عقل واپس آجاتی اور معتصم میرے پاس آکر مجھے ان کے قول کی طرف دعوت دینے لگا، مگر میں نے اسے جواب نہ دیا، پھر وہ دوبارہ میرے پاس آیا مگر میں نے اسے جواب نہ دیا اور وہ کہنے لگے، تو ہلاک ہوجائے، خلیفہ تیرے سر پر کھڑا

ہے، مگر میں نے بات نہ مانی تو انہوں نے دوبارہ مارنا شروع کیا، پھر وہ تیسری بار میرے پاس آیا اور اس نے مجھے بلایا تو میں مار کی شدت سے اس کی بات نہ سمجھ سکا، پھر انہوں نے مارنا شروع کر دیا تو میری عقل جاتی رہی اور میں نے مار کو محسوس نہ کیا اور میرے اس حال نے اسے خوف زدہ کر دیا ور میرے پاؤں سے بیڑیاں کھول دی گئیں۔ یہ ۲۵/ رمضان ۲۲۱ھ کا واقعہ ہے، پھر خلیفہ نے آپ کو رہا کر کے آپ کے اہل کے حوالہ کر دیا۔

شاباص کا بیان ہے:

لقد ضربت احمد بن حنبل ثمانين سوطا لو ضربته فيلا لهدته ۔

میں نے احمد بن حنبل کو اسی کوڑے مارے اگر کسی ہاتھی کو مارتا تو وہ چیخ اٹھتا۔

اس مار کی شدت کا اندازہ اس سے کیجیے، کہ ابو محمد الطفاوی نے امام سے حالات پوچھے تو انہوں نے بتایا، کہ جب مجھے مارا جا رہا تھا، تو ایک لمبی ڈاڑھی والا دبلا شخص آیا اور اس نے مجھے تلوار کا دستہ مارا اس وقت میں نے دل میں کہا، کہ شاید اب راہ نجات کھلی، یہ شخص میری گردن اڑا دے گا اور میں اذیتوں سے نجات پا جاؤں گا۔

ابن سماعہ نے تو معتصم سے کہا بھی، کہ حضور! اس شخص کی گردن مار دیجیے، اس کا خون میری گردن پر۔

ذرا ان خوشامدیوں کی خدا سے بے خوفی ملاحظہ ہو۔

اب ابن ابی دواد پینترا بدلتا ہے اور خالص سیاسی مشورہ دیتا ہے، نہیں امیر المومنین ایسا نہ کیجیے یہ اگر آپ کے محل میں مر گیا تو لوگ کہیں گے کہ مار سہتے سہتے آخر مر گیا، پھر وہ اس کو امام بنا لیں گے اور جس خیال پر وہ قائم ہیں، اس پر اور زیادہ جم جائیں گے، پس بہتر ہے، کہ اس موقع پر اسے رہا کر دیا جائے، پھر اگر وہ آپ کے محل سے باہر مر بھی جائے تو لوگ اس کے معاملے میں شبہات میں رہیں گے، چنانچہ امام کو رہا کر دیا گیا اور ان کے چچا کے حوالہ کر دیا گیا۔

امام احمد کا ایک اور بیان

امام احمد اس عظیم واقعہ صبر و استقامت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

میں جب اس مقام پر پہنچا، جس کا نام باب البستان ہے، تو میرے لیے سواری لائی گئی اور مجھ کو سوار ہونے کا حکم دیا گیا، مجھے اس وقت کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا اور میرے پاؤں میں بوجھل بیڑیاں تھیں، سوار ہونے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے منہ کے بل گرتے گرتے بچا، آخر کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور معتصم کے محل میں پہنچا، مجھے ایک کوٹھری میں داخل کر دیا گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا، آدھی رات کا وقت تھا اور وہاں کوئی چراغ نہیں تھا، میں نے نماز کے لیے مسح کرنا چاہا اور ہاتھ بڑھایا، تو پانی کا ایک پیالا اور طشت رکھا ہوا ملا، میں نے وضو کیا اور نماز پڑھی، اگلے دن معتصم کا قاصد آیا اور مجھے خلیفہ کے دربار میں لے گیا، معتصم بیٹھا ہوا تھا، قاضی القضاۃ ابن ابی دؤاد بھی موجود تھا، اور ان کے ہم خیالوں کی ایک بڑی جمعیت تھی، ابو عبد الرحمٰن الشافعی بھی موجود تھے، اسی وقت دو آدمیوں کی گردنیں بھی اڑائی جا چکی تھیں، میں نے ابو عبد الرحمٰن الشافعی سے کہا، کہ تم کو امام شافعی

سے مسح کے بارے میں کچھ یاد ہے؟ ابن ابی دواد نے کہا، کہ اس شخص کو دیکھو، کہ اس کی گردن اڑائی جانے والی ہے اور یہ فقہ کی تحقیق کررہا ہے، معتصم نے کہا، کہ ان کو میرے پاس لاؤ، وہ برابر مجھے پاس بلاتا رہا، یہاں تک کہ میں اس سے بہت قریب ہوگیا، اس نے کہا، بیٹھ جاؤ، میں بیڑیوں سے تھک گیا تھا اور بوجھل ہورہا تھا، تھوڑی دیر بعد میں نے کہا، کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟ خلیفہ نے کہا، کہو! میں نے کہا:

الی ما دعا اللہ ورسولہ .

اللہ اور اس کے رسول نے کس چیز کی طرف دعوت دی ہے؟

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا، ''لا الہ الا اللہ'' کی شہادت کی طرف، میں نے کہا، تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں پھر میں نے کہا:

> **ان جدك ابن عباس يقول لما قدم وفد عبدالقيس على رسول الله صلى الله عليه وسلم سالوه عن الايمان فقال اتدرون ما الايمان قالوا الله ورسوله اعلم قال شهادة ان لااله الا الله وان محمدا رسول الله واقام الصلوة وايتاء الزكوة وان تعطوا الخمس من المغنم .**
>
> آپ کے جد امجد ابن عباس کی روایت ہے، کہ جب قبیلہ عبدالقیس کا وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو انہوں نے ایمان کے بارے میں آپ سے سوال کیا، فرمایا تمہیں معلوم ہے ایمان کیا ہے، انہوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، کہ ایمان کیا ہے، فرمایا، اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز کی پابندی، زکوۃ کی ادائیگی اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ نکالنا۔

اس پر معتصم نے کہا، کہ اگر تم میرے پیش رو کے ہاتھ میں پہلے نہ آگئے ہوتے تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، پھر عبدالرحمٰن بن اسحاق کی طرف مخاطب ہوکر کہا، کہ میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا، کہ اس آزمائش کو ختم کرو، امام احمد کہتے ہیں، کہ میں نے کہا، اللہ اکبر اس میں تو مسلمانوں کے لیے کشایش ہے، خلیفہ نے علما و حاضرین سے کہا، کہ ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، پھر عبدالرحمٰن سے کہا، کہ ان سے گفتگو کرو!

ایک آدمی بات کرتا اور میں اس کا جواب دیتا، دوسرا بات کرتا اور میں اس کا جواب دیتا، معتصم کہتا، احمد تم پر خدا رحم کرے، تم کیا کہتے ہو؟ میں کہتا:

اعطونی شیئا من کتاب اللہ اوسنة رسول اللہ فاقول بہ .

امیر المومنین! مجھے کتاب اللہ یا سنت رسول میں سے کچھ دکھایئے تو میں اس کا قائل ہوجاؤں، معتصم کہتا، کہ اگر یہ میری بات قبول کرلیں تو میں اپنے ہاتھ سے آزاد کردوں اور اپنے فوج و لشکر کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور ان کے آستانہ پر

حاضر ہوں پھر کہتا، احمد! میں تم پر بہت شفیق ہوں اور مجھے تمہارا ایسا ہی خیال ہے جیسے اپنے بیٹے ہارون کا تم کیا کہتے ہو، میں وہی جواب دیتا، کہ:

اعطونی شیئا من کتاب اللّٰہ وسنۃ رسول اللّٰہ فاقول بہ ۔

جب بہت دیر ہوگئی تو وہ اکتا گیا اور کہا جاؤ اور مجھے قید کردیا اور میں اپنی پہلی جگہ پر واپس کردیا گیا، اگلے دن پھر مجھے طلب کیا گیا اور مناظرہ ہوتا رہا اور میں سب کا جواب دیتا رہا، یہاں تک کہ زوال کا وقت ہوگیا اور جب اکتا گیا تو کہا، کہ ان کو لے جاؤ، تیسری رات کو میں سمجھا، کہ کل کچھ ہو کر رہے گا، میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا اور جس ازار بند سے میں نے بیڑیاں باندھ رکھی تھیں، اس کو اپنے پائجامے میں ڈال لیا، کہ کہیں کوئی سخت وقت آئے اور میں برہنہ ہوجاؤں، تیسرے روز مجھے پھر طلب کیا گیا میں نے دیکھا دربار بھرا ہوا ہے، میں مختلف ڈیوڑھیاں اور مقامات طے کرتا ہوا آگے بڑھا، کچھ لوگ تلواریں لیے کھڑے تھے، کچھ لوگ کوڑے لیے، اگلے دونوں دن کے بہت سے لوگ آج نہیں تھے، جب میں معتصم کے پاس پہنچا، تو کہا، بیٹھ جاؤ! پھر کہا، ان لوگوں سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، لوگ مناظرہ کرنے لگے، میں ایک کا جواب دیتا پھر دوسرے کا جواب دیتا، میری آواز سب پر غالب تھی، جب دیر ہوگئی، تو مجھے الگ کردیا اور ان کے ساتھ تخلیہ میں کچھ بات کہی، پھر ان کو ہٹا دیا اور مجھے بلایا، پھر کہا احمد! تم پر خدا رحم کرے میری بات مان لو میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کروں گا میں نے پہلا سا جواب دیا، اس پر اس نے برہم ہو کر کہا، کہ اس کو پکڑو اور کھینچو اور اس کے ہاتھ اکھیڑ دو، معتصم کرسی پر بیٹھ گیا اور جلادوں اور تازیانہ لگانے والوں کو بلایا جلادوں سے کہا، آگے بڑھو ایک آدمی آگے بڑھتا اور مجھے دو کوڑے لگاتا، معتصم کہتا زور سے کوڑے لگاؤ، پھر وہ ہٹ جاتا اور دوسرا آتا اور دو کوڑے لگاتا، انیس کوڑوں کے بعد پھر معتصم میرے پاس آیا اور کہا:

احمد علام تقتل نفسک انی واللّٰہ علیک لشفیق ۔

کیوں احمد اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو، بخدا مجھے تمہارا بہت خیال ہے۔

ایک شخص عجیف مجھے اپنی تلوار کے دستے سے چھیڑتا اور کہتا، کہ تم ان سب پر غالب آنا چاہتے ہو دوسرا کہتا، کہ اللہ کے بندے خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہوا ہے، کوئی کہتا کہ امیر المومنین آپ روزے سے ہیں اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، معتصم پھر مجھ سے بات کرتا اور میں اس کو وہی جواب دیتا، وہ پھر جلاد کو حکم دیتا، کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ!

میمون بن اصبغ کہتے ہیں:

وکانت تکۃ احمد حاشیۃ ثوب فانقطعت فنزل السراویل الی عانتہ فقلت الساعۃ ینہتک فرمی احمد طرفہ نحو السماء وحرک شفتیہ فما کان باسرع من ان ارتقی السراویل ولم ینزل قال میمون فدخلت علیہ بعد سبعۃ ایام فقلت یا اباعبداللّٰہ رایتک یوم ضربوک قد انحل سراویلک فرفعت طرفک نحو السماء ورایت متحرک شفتیک فای شئ قلت قال

قلت اللهم انی اسئلك باسمك الذی ملأت به العرش ان كنت تعلم انی علی الصواب فلا تهتك لی سترا ۔ (مناقب ص ۴۱۰)

امام احمد کا ازار بند ضرب کی شدت سے ٹوٹ گیا تو پائجامہ آپ کی ناف تک سرک آیا میں نے اس وقت کہا، یہ چیز آپ کو فریاد پر مجبور کرے گی (چوں کہ آپ کے دست و پا بندھے ہوئے تھے) امام احمد نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور اپنے ہونٹوں کو جنبش دی اور پائجامہ جتنی تیزی سے نیچے آ رہا تھا رک گیا، میمون نے کہا، میں اس واقعہ کے سات دن بعد امام احمد کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی اے ابوعبداللہ! جس دن لوگ آپ کو کوڑے مار رہے تھے، میں نے دیکھا، آپ کا ازار بند ٹوٹ گیا تو آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور میں نے آپ کو دیکھا، کہ آپ اپنے ہونٹوں کو حرکت دے رہے ہیں تو آپ نے اس وقت کیا کہا؟ فرمایا میں نے کہا: اے اللہ! تیرے اس اسم پاک کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں، جس کے ذریعہ تو نے عرش کو بھر دیا تو جانتا ہے، کہ میں حق پر ہوں لہٰذا مجھے بے پردہ نہ فرما!۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا:

ان كببناك علی وجهك وطرحنا علی ظهرك بارية ودسناك ۔

ہم نے تم کو اوندھا گرا دیا تم کو روندا۔

امام احمد نے فرمایا:

ماشعرت بذلك

مجھے اس کا مطلق احساس نہیں ہوا، مزید فرماتے ہیں:

واتوا بی بسویق فقالوا لی اشرب وتقیأ فقلت لا افطر ۔

میرے پاس ستو لایا گیا، لوگوں نے کہا، اسے پی لو اور قے کر دو میں نے کہا روزے سے ہوں ابھی افطار نہیں کروں گا۔

امام نے ضعف و نقاہت اور شدید زخم کی حالت میں روزہ مکمل کر لیا، دربار سے اسحاق بن ابراہیم کے گھر لائے گئے ظہر کا وقت آیا تو آپ نے اس حال میں نماز ظہر ادا کی، کہ زخموں سے خون بہہ رہا تھا، فرماتے ہیں:

فتقدم ابن سماعة فصلی فلما انفتل من الصلاة قال لی صلیت والدم یسیل فی ثوبك ؟ فقلت قد صلی عمر وجرحه یثعب دما ۔

ابن سماعہ آگے بڑھا اور نماز پڑھائی جب نماز سے فارغ ہوا تو مجھ سے کہا، تو نے نماز پڑھ لی جب کہ تمہارے جسم سے خون بہہ رہا ہے، میں نے جواب دیا، حضرت عمر نے نماز پڑھی اس حال میں کہ ان کے زخم سے خون

بہہ رہا تھا۔ (تاریخ ذہبی ج۱ص۱۰۸)

رہائی

یہ واقعہ ۲۵/ رمضان ۲۲۰ھ کو پیش آیا۔

امام احمد کو ان کے چچا کے حوالے کیا گیا، گھر لائے گئے جراح نے آ کر مضروب مقامات کا معائنہ کیا مردہ گوشت و پوست کاٹ ڈالے اور مرہم پٹی کی، اس واقعہ کے بعد معتصم احساس ندامت سے دوچار ہوا اور اپنے کرتوت پر افسوس کرتا۔ نفرت وعداوت کی جگہ اس کے دل میں امام صاحب کی عقیدت ومحبت پیدا ہوگئی اور اسحاق بن ابراہیم کو آپ کی خیر وعافیت دریافت کرنے کے لیے روزانہ بھیجتا۔

امام صاحب شفایاب ہوگئے، لیکن سردی کے زمانے میں انگوٹھوں میں تکلیف رہتی یہاں تک کہ گرم پانی سے سینکا جاتا۔
(تاریخ ذہبی ج۱ص۱۱۵)

عبداللہ بن احمد بن حنبل کہتے ہیں، کہ میں اکثر اپنے والد سے یہ سنتا تھا:

رحم اللہ اباالھیثم غفر اللہ لابی الھیثم عفا اللہ عن ابی الھیثم ۔

اللہ ابوالہیثم پر رحم کرے، اللہ ابوالہیثم کو بخش دے اللہ ابوالہیثم کو معاف کرے۔

میں نے پوچھا، یہ ابوالہیثم کون ہے؟ امام صاحب نے فرمایا، تم اسے نہیں جانتے؟ میں نے کہا، نہیں آپ نے فرمایا جس دن کوڑوں کی ضرب کے لیے لوگ مجھے لے جارہے تھے، تو ایک شخص نے میرے دامن کو کھینچا اور مجھ سے کہنے لگا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا، نہیں، کہا میں ابوالہیثم عیار چور راہ زن ہوں:

انی ضربت ثمانیة عشر الف سوط وصبرت فی ذلک علی طاعة الشیطان لاجل الدنیا فاصبر انت فی طاعة الرحمن لاجل الدین قال فضربت ثمانیة عشر سوطا بدل ماضرب ثمانیة عشر الفا ۔(مناقب ص ۱۰۳)

مجھے اٹھارہ ہزار کوڑے لگائے گئے اور میں نے شیطان کی اطاعت میں دنیا کے لیے صبر کیا، تو آپ رحمٰن کی اطاعت میں دین کے لیے صبر کریں، امام احمد کہتے ہیں، مجھے اٹھارہ ہزار کوڑوں کے بجائے اٹھارہ کوڑے مارے گئے۔

واثق باللہ کا دور

معتصم کی موت ۲۰/ ربیع الاول ۲۲۷ھ کو ہوئی، اس کی جگہ واثق باللہ بن معتصم باللہ سریر آرائے خلافت ہوا، اپنے باپ کی طرح وہ بھی خلق قرآن کا قائل ومبلغ تھا اور قاضی ابن ابی دواد کو دربار خلافت میں سابقہ اہمیت وحیثیت حاصل تھی، اس لیے اس دور میں بھی اہل حق آزمائشوں میں مبتلا کیے گئے، لیکن امام احمد سے اس نے کبھی تعرض نہ کیا، ان کی استقامت فی الدین سے

ہمیشہ مرعوب رہا، اسے اندیشہ تھا، کہ اگر امام کسی ایک مقام پر مستقل سکونت گزیں ہو گئے تو ان کی ذات مرجع خلائق بن جائے گی اور لوگوں کا اجتماع خلافت کے لیے مضر ثابت ہوگا، اس لیے اس نے امام کے بارے میں یہ حکم جاری کیا:

لا تجمعن الیك احدا و لا تسکن فی بلد انا فیه ۔

تمہارے پاس کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی اور نہ اس شہر میں اقامت اختیار کرو جہاں ہمارا قیام ہو۔

(ابن حنبل ص ۱۴۶)

امام احمد بن حنبل اس فرمان کی وجہ سے مختلف شہروں میں منتقل ہوتے اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کرتے رہے، لیکن ان کے عزم و حوصلہ اور ثبات و عزیمت نے ایوان اعتزال میں شگاف ڈال دیا تھا، اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو رہی تھیں، واثق باللہ خلق قرآن کا قائل ہونے کے باوجود اہل حق پر تشدد کی کارروائیوں میں معتصم کی طرح پر جوش نہیں تھا، آخر میں تو وہ بالکل ہی ٹھنڈا پڑ گیا، ابن ابی دواد کا اثر اس کے ذہن و دماغ سے زائل ہونے لگا، اس سلسلے میں ایک واقعہ نے واثق کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور قاضی ابن ابی دواد کی عظمتوں کا شیش محل ٹوٹ پھوٹ گیا۔ وہ واقعہ یہ ہے:

ایک بوڑھا قیدی جسے انکار خلق قرآن کریم کے جرم میں سجن و زنداں کی عقوبتوں میں مبتلا کیا گیا تھا، اسے واثق باللہ کے روبرو پیش کیا گیا، شیخ نے دربار میں حاضر ہونے کے بعد کہا:

السلام علیك یا امیر المومنین ۔

واثق نے کہا:

لا سلام اللہ علیك ۔

شیخ نے کہا، اے امیر المومنین معلم نے آپ کی کتنی بری تربیت کی، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا ۔(سورہ نسا ۸۶)

جب تم سے سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر انداز سے جواب دو یا اسی جیسا۔

ابن ابی دواد نے کہا امیر المومنین! یہ شخص بحث کرنا چاہتا ہے، امیر المومنین نے کہا، آپ اس سے مناظرہ کریں، تو ابن ابی دواد نے کہا بڑے میاں! تم قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کیا وہ مخلوق ہے؟ شیخ نے کہا، تم نے انصاف کی بات نہیں کی، سوال تو مجھے کرنا ہے، اس نے کہا، کہ اچھا تو تم کہو؟ شیخ نے پوچھا، کہ یہ جو کچھ تم کہتے ہو، کیا یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم نے اسی طرح سکھایا تھا، یا اس کی تعلیم نہیں دی؟ ابن ابی دواد نے کہا، کہ نہیں سکھایا تھا، شیخ نے کہا، تو پھر کیا تم نے وہ کچھ جان لیا، جو خدا اور رسول نے نہیں سکھایا؟ ابن ابی دواد شرمسار ہو کر چپ ہو گیا، پھر شیخ نے کہا، کہ انہوں نے لوگوں کو اس بات کی طرف دعوت نہیں دی، جس طرف تم دعوت دیتے ہو، پھر کہا، وہ بات کہنا تمہارے لیے کیسے روا ہوئی جس کا انہوں نے اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھا تھا، ابن ابی دواد پر شرم کی وجہ سے خاموشی چھا گئی، واثق نے جب یہ بات سنی تو

اپنی نشست گاہ سے اچھل پڑا اور شیخ کو انعام و اکرام دینا چاہا مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔

مہدی کا بیان ہے:

ثم قام ابی فدخل مجلس الخلوة واستلقی علی قفاه ووضع احدی رجلیه علی الاخری وهو یقول هذا شیٔ لم یعلمه الله النبی صلی الله علیه وسلم ولا ابوبکر ولاعمر ولا عثمان ولا علی ولاالخلفاء الراشدون علمته انت سبحان الله شی علمه النبی صلی الله علیه وسلم وابوبکر وعمر وعثمان وعلی والخلفاء الراشدون ولم یدعوا الناس الیه افلا وسعك ماوسعهم ثم دعا عما را الحاجب فامران یرفع عند القیود ویعطیه اربع مأة دینار ویاذن له فی الرجوع وسقط من عینه ابن ابی دؤاد ولم یمتحن بعد ذلك احدا ۔

(مناقب لابن جوزی ص۴۳۲)

مہدی کہتا ہے، کہ والد آرام گاہ میں داخل ہوئے تو دیر تک اپنے آپ شیخ کے الفاظ کو دہراتے رہے، کہ کیا تمہارے لیے وہ بات جائز ہوگئی، جس کے مجاز وہ نہ تھے۔

شیخ ابوبکر احمد بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں، کہ اس شیخ کا نام ابوعبدالرحمٰن بن محمد بن اسحاق الاذرمی ہے۔ (ایضا)

واثق کی توبہ

مہتدی باللہ کا قول ہے، کہ واثق باللہ نے زندگی کے آخری ایام میں عقیدہ خلق قرآن سے توبہ کرلی تھی۔

ان الواثق مات وقد تاب عن القول بخلق القرآن ۔ (ایضا ص ۴۳۷)

متوکل علی اللہ کا دور اور امام احمد کا اعزاز

واثق کے بعد جب متوکل علی اللہ خلیفہ ہوا، تو اہل حق کی آزمائشوں کا دور ختم ہوگیا کیوں کہ وہ اپنے باپ دادا کی طرح معتزلی نہیں تھا، بلکہ صحیح العقیدہ سنی اور علمائے حق کا حامی و مددگار تھا، اس نے تمام بلاد محروسہ میں اعلان کرایا، کہ کوئی شخص خلق قرآن کے مسئلہ میں گفتگو نہ کرے، اور اس جرم کے تمام ماخوذین کو رہا کر دیا جائے، پھر اپنے نائب اسحاق بن ابراہیم کو خط لکھا، کہ امام احمد کو بغداد سے انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ میرے پاس لاؤ! امام کو اسحاق نے بلایا اور ان کی بڑی تعظیم کی اور سامرہ روانہ کیا، لیکن درمیان میں کچھ ایسے واقعات پیش آگئے کہ امام احمد سے اسحاق خفا ہوگیا اور پھر قدیم عناد لوٹ آیا، جس کے سبب سے امام کو اذیت اٹھانی پڑی تھی، اس نے خلیفہ سے شکایت کی اور خلیفہ نے آپ کو واپس لے جانے کا حکم دیا، امام احمد کو اس واقعہ سے سخت رنج پہنچا اور بغداد واپس آئے۔

ابن ثلجی نے متوکل سے کہا، کہ امام احمد کے تعلقات علوی خاندان سے بہت بڑھ گئے ہیں، اور ان میں کا ایک شخص امام کی خلافت کی بیعت لیتا پھرتا ہے، خلیفہ نے نائب بغداد کو لکھا، کہ امام احمد کے گھر کی تلاشی لی جائے، چنانچہ اس نے ایک رات آپ

کے گھر کا محاصرہ کرلیا اور اس سازش کا حال پوچھا، امام احمد نے فرمایا مجھے اس کا کوئی علم نہیں، میں تو امیر المومنین کی ظاہر و باطن میں اطاعت کرتا ہوں، اور میں اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے توفیق خیر اور حق پر رہنے کی دعا کرتا رہتا ہوں لہٰذا اس سازش میں کسی قسم کی شرکت کیوں روا رکھوں گا؟ لیکن سپاہیوں نے احتیاطاً مکان کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا مگر کچھ بھی نہ ملا اور آپ کی براءت ظاہر ہوگئی۔ خلیفہ کو جب اس کی خبر ملی تو اس نے کہا، کہ لوگ امام کے متعلق بہت نمامی کرتے ہیں، خلیفہ شرمندہ ہوا اور امام کی عزت و حرمت اس کے دل میں نئے سرے سے جاگزیں ہوگئی۔

متوکل نے اپنے ایک حاجب ابو یعقوب بن ابراہیم کی معرفت امام احمد کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے، امام نے لینے سے انکار کردیا، ابو یعقوب نے کہا، مصلحت وقت یہی ہے، کہ آپ اسے قبول کرلیں، ورنہ خلیفہ آپ کی طرف سے پھر رنجیدہ خاطر ہوجائے گا، امام نے قبول تو کرلیا، لیکن عزیزوں کو بلا کر حکم دیا، کہ بغداد اور بصرہ کے افلاس زدہ علما و محدثین کی ایک فہرست تیار کرو اور ساری رقم ان میں تقسیم کردو، یہ کام اسی وقت ہوجانا چاہیے، ورنہ رات کی نیند مجھ پر حرام ہوجائے گی، چنانچہ یہ رقم اہل علم میں رات ہی رات تقسیم کردی گئی اور غربت وافلاس کے باوجود گھر کے لیے کچھ بھی نہ رکھا گیا، صرف آپ کے پوتے نے ایک حقیر سی رقم لے لی، جسے دیکھ کر آپ نے سکوت فرمالیا اور کچھ نہ بولے، متوکل کو جب یہ خبر پہنچی، کہ امام نے اس رقم سے کچھ بھی نہ لیا، وہ اس سلسلے میں استفسار کرنا ہی چاہتا تھا، کہ ایک شخص نے کہا، امیر المومنین احمد نے آپ کا ہدیہ قبول کرنے کے بعد تقسیم کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے، کہ احمد جیسا شخص دینار و درہم لے کر کیا کرتا، انہیں تو صرف دو وقت کی روٹی مل جانی چاہیے، خلیفہ نے کہا، تو سچ کہتا ہے۔

جب عبداللہ بن اسحاق بغداد کا حاکم ہوا، تو متوکل نے اس کو حکم دیا، کہ وہ امام احمد کو میرے پاس لائے، امام صاحب نے بڑھاپے اور ناتوانی کا عذر پیش کیا، خلیفہ نے کہلا بھیجا، کہ میں آپ کے قرب سے برکت حاصل کرنا چاہتا ہوں، تا کہ آپ کی دعا میرے شامل حال ہو، امام اپنے اہل وعیال کے ساتھ بغداد سے نکلے اور دار الخلافہ سامرہ (سر من رائے) پہنچے، خلیفہ نے اعزاز واکرام کیا اور دار الیاخ میں ٹھہرایا، آپ کو معلوم ہوا، کہ یہ مکان جائز ملکیت کا نہیں تو دوسرا مکان کرایہ پر لیا اور وہیں اقامت کی، اعیان واشراف زیارت کے لیے اس طرح آتے کہ اپنی زیب و زینت کے لباس اتار دیتے، خلیفہ نے اس مکان کے لیے اعلیٰ درجہ کے سامان بھیجے اور لذیذ ترین کھانوں کا انتظام کیا اور سمجھتا رہا، کہ امام ان چیزوں سے متمتع ہورہے ہیں، لیکن امام صاحب ان چیزوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ہمیشہ روزے سے رہتے، خلیفہ نے عرض کیا، آپ گزشتہ ایام کے مصائب کی تلافی یہاں کریں اور پھر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درس دیں، امام نے اپنی بیماری اور دانتوں کے ہلنے کی وجہ سے معذرت کرلی۔

شاہی طعام و فواکہ میں سے کچھ بھی استعمال نہ کرتے، متعدد روزوں کے بعد ستو گھول کر نوش فرمالیا کرتے۔

خلیفہ نے عبداللہ بن یحییٰ بن خاقان کے بدست ایک بڑی رقم بھیجی، لیکن امام نے قبول نہیں کیا، تو ان کے صاحب زادوں پر تقسیم کردی گئی۔

پیرانہ سالی میں مسلسل روزہ رکھنے کی وجہ سے ضعف ونقاہت میں اضافہ ہوتا رہا، خلیفہ نے ابن ماسویہ طبیب کو آپ کی دیکھ بھال کے لیے روانہ کیا، اس نے امام صاحب کو دیکھنے کے بعد خلیفہ سے کہا، امام احمد میں اس کے سوا کوئی مرض نہیں، کہ وہ ضرورت کے مطابق غذا استعمال نہیں کرتے اور ان کے سارے مرض کا سبب مسلسل روزہ رکھنا اور عبادت کرنا ہی ہے، کچھ دنوں بعد بغداد جانے کی اجازت ملی، ایک معمولی کشتی پر بغداد پہنچے اور بقیہ زندگی خلیفہ کی اس معیت پر افسوس کرتے رہے، فرمایا، کہ میں اس گروہ سے عمر بھر علاحدہ رہا، لیکن آخری عمر ان کا ساتھ ہو ہی گیا، سفر میں سخت بھوک کے باوجود شاہی زادِ سفر استعمال نہ کیا۔

بعض امرا نے خلیفہ سے شکایت کی، کہ امام احمد آپ کی عطا کردہ اشیا استعمال نہیں فرماتے، متوکل نے جواب دیا، واللہ اگر معتصم دوبارہ زندہ ہو کر امام احمد کے متعلق شکایت کریں تو قبول نہ کروں گا اور اس کی حسن عقیدت برابر قائم رہی، دریافت حال کے لیے آدمی بھیجتا رہا۔

کسی نے متوکل کو ایک خط لکھا، کہ امام احمد آپ کے باپ دادا کو زندیق کہتے ہیں، متوکل نے جواب لکھا، کہ مامون نے لوگوں سے میل جول بہت رکھا، اس لیے لوگ اس کی عقل پر مستولی ہو گئے، یعنی اسے گمراہ کر دیا، اسی طرح میرا باپ معتصم ایک جنگی آدمی تھا، اس کو علم کلام سے کوئی واسطہ نہ تھا، ناحق اس میں پڑ کر خراب ہوا، اور میرا بھائی واثق بے شک زندیق تھا، پھر حکم دیا، کہ اس چغلخور کو سو کوڑے مارے جائیں، عبداللہ بن اسحاق بن ابراہیم نے بجائے سو کے پانچ سو کوڑے مارے، خلیفہ نے اس زیادتی کا سبب پوچھا، تو جواب دیا، کہ دو سو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے اور دو سو آپ کی اطاعت کے لیے ایک سو اس رجل صالح امام احمد بن حنبل پر قذف کے بدلے۔

خلیفہ متوکل کے نام امام احمد کا خط

متوکل کے دل و دماغ میں امام احمد کی عقیدت و عظمت اس درجہ قائم ہو گئی تھی، کہ وہ ان کے خلاف ادنیٰ شکایت بھی سننا گوارہ نہ کرتا تھا، وہ مسئلہ خلق قرآن سے متعلق شرعی اور دینی نقطہ نظر جاننے کا خواہش مند ہوا تو اس نے ایک استفسار امام کی خدمت میں پیش کیا، جس کے جواب میں آپ نے ایک خط تحریر فرمایا۔

صالح بن احمد بن حنبل کا بیان ہے، کہ عبیداللہ بن یحییٰ نے میرے والد کو خط لکھا، جس میں یہ اطلاع دی، کہ امیر المومنین نے مجھ کو حکم دیا ہے، کہ میں آپ کو ایک خط لکھوں، جس میں قرآن کے بارے میں سوال کروں اور یہ استفسار بغرض امتحان ہو، بلکہ بصیرت اور معرفت حاصل کرنے کے لیے ہو، چنانچہ اس کے جواب میں میرے والد نے عبیداللہ بن یحییٰ کو مجھ سے درج ذیل جواب لکھوایا، اس وقت ان کے پاس صرف میں تھا، کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔

اے ابوالحسن! اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کے تمام امور میں تمہارا انجام بخیر کرے اور اپنی رحمت سے تمہاری دنیاوی پریشانیاں دور کر دے، اللہ تم سے راضی ہو تم نے مجھے ایک خط لکھا ہے، جس میں مجھ سے قرآن مجید کے بارے میں سوالوں کے جوابات

طلب کیے ہیں، جن کے سلسلے میں امیر المومنین میری رائے جاننا چاہتے ہیں۔

صورت حال یہ ہے، کہ لوگ باطل امور میں ڈوب کر شدید اختلاف میں مبتلا تھے، حتیٰ کہ خلافت امیر المومنین کو ملی اور امیر المومنین کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمام بدعتوں کو مٹا دیا اور لوگ جس ذلت اور تنگ نظری کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے، وہ تاریک فضا چھٹ گئی اور اللہ تعالیٰ نے وہ صورت حال بدل دی اور اس کا سہرا امیر المومنین کے سر پر ہے، امیر المومنین کے اس کارنامے کی وجہ سے انہیں مسلمانوں کی نظروں میں بہت احترام و مقام حاصل ہو گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے امیر المومنین کے حق میں دعا کرتے ہیں اور میں بھی اللہ کے حضور دست بہ دعا ہوں کہ وہ امیر المومنین کے حق میں مسلمانوں کی بہترین دعائیں قبول فرمالے اور جو کچھ ان دعاؤں میں مانگا گیا ہے، وہ امیر المومنین کے لیے پورا کرے اور ان کے گھر میں برکت عطا فرمائے اور وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں مذکور ہے، کہ آپ نے کہا:

لا تضربوا کتاب اللہ بعضہ ببعض فانہ ذلک یوقع الشک فی قلوبکم۔

کتاب اللہ کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے نہ ٹکراؤ، کہ یہ عمل تمہارے دلوں میں شک پیدا کر دے گا۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے، کہ چند قرا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر بیٹھے باہم گفتگو کر رہے تھے، کہ ان میں سے ایک نے کہا، کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا؟

اس پر دوسرے نے کہا، کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا؟ عبداللہ بیان کرتے ہیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گفتگو سنی تو اس حالت میں باہر تشریف لائے، کہ آپ کا چہرہ مبارک اس قدر سرخ تھا:

کانما فقیٔ فی وجھہ حب الرمان۔

گویا کہ انار کا رس اس پر انڈیل دیا گیا ہو۔

اور فرمایا، کہ کیا تم کو یہی حکم دیا گیا ہے، کہ کتاب اللہ کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے ٹکراؤ، تم سے پہلی امتیں اسی طرز عمل سے گمراہ ہوئی تھیں، تم جو کر رہے ہو یہ انتہائی لاحاصل کام ہے، صحیح طریقہ یہ ہے، کہ یہ دیکھو، کہ تم کو کن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو ان کو کرو۔ اور دیکھو، کہ تم کو کن باتوں سے منع کیا گیا ہے، تو ان سے رک جاؤ۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''**مراء فی القرآن کفر**'' قرآن کے سلسلے میں جھگڑنا کفر ہے۔ اور حضرت ابو جہم جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا، ''**لاتماروا فی القرآن فان مراء فیہ کفر**'' قرآن میں جھگڑا نہ کرو اس لیے کہ قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں، کہ حضرت عمر بن خطاب کے پاس ایک شخص آیا، حضرت عمر اس سے لوگوں

کے بارے میں دریافت کرنے لگے، تو اس نے کہا، کہ ان میں سے بعض لوگوں نے قرآن کا یہ اور یہ حصہ پڑھا ہے، ابن عباس بیان کرتے ہیں، کہ میں نے کہا، کہ بخدا مجھے یہ بالکل ناپسند ہے، کہ یہ لوگ ایک دن میں قرآن کے سلسلے میں اس قدر تیزی اور جلد بازی دکھائیں، ابن عباس بیان کرتے ہیں، کہ حضرت عمر نے مجھے جھڑک دیا اور فرمایا، کہ تم خاموش رہو، چنانچہ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر اس حالت میں آیا، کہ سخت غمزدہ اور دل گرفتہ تھا، ابھی میں اسی حالت میں تھا، کہ ایک شخص آیا اور اس نے مجھے اطلاع دی، کہ امیر المومنین یاد فرمارہے ہیں، چنانچہ جب میں گھر سے نکلا، تو میں نے دیکھا کہ حضرت عمر دروازہ پر کھڑے میرا انتظار فرمارہے ہیں، مجھے دیکھتے ہی آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور تنہائی میں لے جا کر پوچھا اس شخص نے ابھی جو گفتگو کی تھی، اس میں سے تم کو کیا بات بری لگی؟

میں نے عرض کیا، امیر المومنین یہ لوگ جب قرآن کے معاملے میں ایک دوسرے کے مقابلے میں اس قسم کی جلد بازی اور تیزی دکھائیں گے، تو باہم اختلاف کریں گے اور جب اختلاف کریں گے تو جھگڑیں گے اور جب ان میں جھگڑا ہوگا تو مزید اختلاف بڑھے گا اور اس اختلاف کا یہ نتیجہ نکلے گا، کہ ایک دوسرے سے جنگ کریں گے۔

حضرت عمر نے فرمایا، اللہ تمہارے والد سے راضی ہو، بخدا میں یہ حدیث اب تک لوگوں سے چھپاتا رہا، حتی کہ آج تم نے اسے بیان کردیا۔ عن جابر بن عبداللہ قال كان النبي صلى الله تعالىٰ عليه وسلم يعرض نفسه على الناس بالموقف فيقول هل من رجل يحملني الى قومه فان قريشا قد منعوني ان ابلغ كلام ربي ۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زمانہ جاہلیت میں ایام حج میں خود کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور فرماتے کوئی شخص ہے، جو مجھے پناہ دے، کر اپنے قبیلے کے پاس لے چلے تاکہ میں انہیں اپنے رب کا پیغام پہنچا سکوں کیوں کہ قریش نے مجھے اس کام سے روک دیا ہے۔

حضرت جبیر بن نفیر بیان کرتے ہیں، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''انكم لن ترجعوا بشئ مما خرج منه يعني القرآن'' تم ہرگز اپنی کوشش سے کوئی ایسی بات نہیں لاسکتے، جو اس (آپ کی مراد قرآن تھا) کی بات سے بہتر ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں روایت ہے، کہ انہوں نے کہا، ''جردوا القرآن لاتكتبوا فيه شيئا الا كلام الله عز وجل'' قرآن کو ہر قسم کی تحریر سے پاک رکھو، اور اس کے اندر سوائے کلام اللہ کے کچھ نہ لکھو اور حضرت عمر سے مروی ہے، کہ آپ نے فرمایا ''هذا القرآن كلام الله فضعوه مواضعه'' قرآن کلام اللہ ہے لہٰذا اسے اس کا صحیح مقام و مرتبہ دو۔

اور حضرت حسن بصری سے ایک شخص نے کہا، کہ اے ابو سعید میں جب قرآن پڑھتا ہوں اور اس میں تدبر کرتا ہوں تو ایسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، کہ میں مایوس ہوجاتا ہوں اور اپنی نجات کی امید منقطع ہوجاتی ہے، حضرت حسن بصری نے جواب دیا، ''ان القرآن كلام الله واعمال ابن آدم الى الضعف والتقصير فاعمل وابشر'' قرآن اللہ کا کلام ہے، انسان کے اعمال کمزور ہیں اور ناقص ہیں لہٰذا تم عمل کرتے رہو اور امیدوار رحمت رہو۔

فروہ بن نوفل اشجعی کہتے ہیں، کہ میں حضرت خباب جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، کا ہمسایہ تھا، میں ایک دن ان کے ساتھ مسجد سے نکلا، اس حالت میں کہ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا، اور کہہ رہے تھے، اے شخص اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو، لیکن اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی چیز اسے اپنے کلام سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔

اور ایک شخص نے حکم بن عتبہ سے کہا، اصحاب الاغراض جو کچھ کہہ رہے ہیں، ان کو ان باتوں پر کس چیز نے آمادہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا آپس کے جھگڑوں نے۔

اور معاویہ بن قرہ (جن کے والد ان لوگوں میں سے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو چکے ہیں) نے کہا، لوگو! اپنے آپ کو ان جھگڑوں سے دور رکھو، کہ یہ جھگڑے اعمال کو برباد کر دیتے ہیں۔

اور ابوقلابہ جو ان لوگوں میں سے ہیں، جنہوں نے ایک سے زیادہ صحابہ کرام کو دیکھا ہے، کہتے ہیں ”**لاتجالسوا اصحاب الاھواء او قال اصحاب الخصومات فانی لا آمن ان یغمسو کم فی ضلالتھم ویلبسوا علیکم بعض ما تعرفون**“ ان ہوا و ہوس کے بندوں یا آپ نے کہا، ان جھگڑا کرنے والوں کی محفلوں میں مت بیٹھو، کیوں کہ میں اس سے بے خوف نہیں ہوں کہ یہ تمہیں اپنی گمراہی میں گھسیٹ لیں اور تمہارے علم و معرفت میں شبہ و مغالطہ پیدا کر دیں۔

اہل ہوس میں سے دو شخص محمد بن سیرین کے پاس آئے اور کہنے لگے، ہم آپ کو ایک حدیث سناتے ہیں، انہوں نے کہا، نہیں میں نہیں سننا چاہتا، پھر انہوں نے کہا، کہ ہم آپ کو کتاب اللہ کی ایک آیت سنانا چاہتے ہیں، آپ نے فرمایا، نہیں میں نہیں سنوں گا، تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں چلا جاؤں گا، راوی کہتے ہیں، کہ وہ چلے گئے تو کچھ لوگوں نے محمد بن سیرین سے پوچھا، کہ اے ابوبکر! آپ کو کیا نقصان پہنچتا، اگر وہ آپ کو قرآن کی آیت سناتے، تو ابن سیرین نے ان کو جواب دیا، کہ مجھے ڈر ہے، کہ کہیں وہ قرآن کی آیت سناتے وقت اس میں تحریف نہ کر دیں اور وہ اسی طرح میرے حافظے میں اٹک جائے۔

امام محمد کہتے ہیں، کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ قیامت آ جائے گی تب بھی میں ان اہل ہوا و ہوس کی باتیں نہ سنوں۔

ایوب سختیانی سے ایک بدعتی نے کہا، اے ابوبکر میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں یہ سنتے ہی انہوں نے منہ پھیر لیا اور ہاتھ کے اشارے سے کہتے جا رہے تھے، نہیں نہیں آدھی بات بھی نہیں۔

ابن طاؤس نے اپنے بیٹے سے کہا، جب وہ ایک بدعتی سے بات کر رہے تھے، کہ اے بیٹے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لو اور اس کی بات نہ سنو اس کے بعد کہا اور سختی سے اپنے کان بند کر لو!

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا، ”**من جعل دینہ عرضا للخصومات اکثر التنقل**“ جو شخص اپنے دین کو جھگڑوں کا ذریعہ بنا لیتا ہے، وہ موضوع روایات زیادہ بیان کرتا ہے۔

ابراہیم نخعی کا قول ہے، کہ اگر تمہارے پاس لوگوں (اہل ہوس) کی باتوں میں سے کوئی بھی بات نہ پہنچے تو یہ تمہارے اس

فضل کے لیے بہتر ہے جو تمہارے پاس موجود ہے۔

حسن بصری کہا کرتے تھے، کہ "ان پراگندہ خاطر لوگوں کے دل ہوا و ہوس سے آلودہ ہوتے ہیں اور حضرت حذیفہ بن یمان جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں کہتے ہیں "اتقوا اللہ معشر القراء وخذوا طریق من کان قبلکم واللہ لئن استقمتم لسبقتم سبقا بعیدا ولئن ترکتموہ یمینا وشمالا لقد ضللتم ضلالا بعیدا" اے قاریو! اللہ سے ڈرو! اور ان لوگوں کا راستہ اختیار کرو جو تم سے پہلے تھے، اس لیے کہ بخدا اگر تم ان کے طریقے پر قائم رہتے ہو تو تم بہت سبقت لے جاؤ گے اور اگر کہیں تم نے ان کے طریقے کو چھوڑ کر دائیں بائیں انحراف اختیار کر لیا تو یقیناً تم گمراہی میں بہت آگے نکل جاؤ گے یا آپ نے کہا، کہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

میرے والد امام احمد بن حنبل کہتے ہیں، کہ میں نے اس موقع پر سندوں کا ذکر اس لیے چھوڑ دیا ہے، کہ میں اس سلسلے میں قسم کھا چکا ہوں اور اس بات کا امیر المومنین کو بھی پتا ہے، اگر یہ قسم نہ ہوتی تو میں یہاں ہر بات سند کے ساتھ بیان کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ" اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تا کہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ (توبہ)

نیز ارشاد فرمایا "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" خبردار! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ (اعراف)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پہلے خلق کے بارے میں خبر دی ہے، پھر "والامر" فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتائی ہے، کہ "الامر" غیر مخلوق ہے۔

نیز ارشاد ہے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" نہایت مہربان خدا نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے، اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ (الرحمٰن)

اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے، کہ قرآن علم الٰہی کا حصہ ہے۔

فرمایا "وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ" یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو، صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے، جو اللہ نے بتایا ہے ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں ہے۔ (البقرہ)

ارشاد ربانی ہے "وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ" تم ان

اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ ممکن نہیں کہ یہ تمہارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں اور نہ تمہارے لیے یہ ممکن ہے، کہ تم ان کے قبلے کی پیروی کرو، اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے قبلے کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ (البقرہ)

فرمان الٰہی ہے" وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاهُ حُكْماً عَرَبِياً وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَالَكَ مِنَ اللّٰهِ مِن وَّلِي وَّلَا وَاق' 'اس ہدایت کے ساتھ ہم نے فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے، اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے، لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی ومددگار ہوگا اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے بچاسکتا ہے۔ (الرعد)

ان تمام آیتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ قرآن علم اللہ میں سے ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے، کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا وہ قرآن ہے۔

> **وقد روی عن غیر واحد ممن مضی من سلفنا انهم کانوا یقولون القرآن کلام الله لیس بمخلوق وهو الذی اذهب الیه لست بصاحب کلام ولا اری الکلام فی شیٔ من هذا الا ما کان من کتاب الله او فی حدیث عن النبی صلی الله علی وسلم او عن اصحابه او عن التابعین فاما غیر ذلك فان الکلام فیه غیر محمود .**
>
> ہمارے اسلاف میں سے متعدد علما کے بارے میں یہ بات مروی ہے، کہ وہ کہا، کرتے تھے، کہ قرآن مجید کلام اللہ اور غیر مخلوق ہے اور یہی وہ مسلک ہے جو میں نے اختیار کیا ہے، میں نہ تو کلامی ہوں اور نہ علم کلام کے بارے میں کچھ جانتا ہوں مجھے تو صرف وہ معلوم ہے، جو کتاب اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے، یا پھر جو کچھ صحابہ کرام اور تابعین عظام سے مروی ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے، اس کے بارے میں گفتگو کرنا میرے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

امام احمد بن حنبل کے اس تفصیلی مکتوب سے ان کے عقیدہ ومسلک کا اظہار ہوتا ہے اور صحابہ وتابعین کے معتقدات ومعاملات پر کاربند رہنے ہی کو مدار نجات سمجھتے ہیں، مذہبی عقائد کے سلسلے میں بے جا بحث ونظر کو وہ لغو جانتے تھے، یہی وجہ ہے، کہ انہوں نے خط کے شروع میں اخبار واحادیث کو بیان کیا، پھر اپنی بات اس قول پر ختم کی "ولست صاحب کلام ولا اری الکلام فی شیٔ من هذا" میں نہ تو صاحب کلام ہوں اور نہ اس مسئلہ میں کلام کا قائل ہوں۔

اس خط سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) قرآن مخلوق نہیں ہے (۲) قرآن کلام اللہ ہے جو مخلوق نہیں (۳) قرآن امر ہے اور امر مخلوق نہیں (۴) قرآن اللہ کے علم سے ہے اور اللہ کا علم مخلوق نہیں۔

یہ سارے عقائد قرآن وحدیث سے ثابت اور سلف کا مسلک ہیں۔

امام احمد بن حنبل کی عظمت

سجن وزنداں اور کوڑوں کی صبر آزما صعوبتوں میں امام صبر واستقامت کی مضبوط چٹان بنے رہے، آزمائش وابتلا کے طوفان عزیمت کی اس چٹان سے ٹکراتے رہے، ظلم کی آندھیاں چلتی رہیں اور امام کی زبان کلمہ حق دہراتی رہی، بالآخر جبرو استبداد نے اپنی شکست تسلیم کرلی اور امام کی عزت وعظمت میں چار چاند لگ گئے۔

اول تو یہ دیکھیے، کہ عین اس لمحے جب کہ امام پر مار پڑ رہی تھی، اور دربار کے چھوٹے سے چھوٹے ملازموں کے دلوں میں ان کی صداقت ان کے صبر اور ان کی عظمت کردار کا اثر تھا، ابراہیم بن مصعب کوتوال کا بیان ہے، کہ میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل سے بڑھ کر غیر مرعوب نہیں پایا، ہم عمال حکومت ان کی نظر میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔

اس کے بعد یہ دیکھیے کہ علمائے وقت کی نگاہوں میں اس کوڑے کھانے والے کو کیا مرتبہ ملا، وہ حق وباطل کی کسوٹی بن گئے، کہا گیا ہے، کہ جب تم دیکھو، کہ کوئی شخص احمد بن حنبل سے محبت کرتا ہے، تو سمجھ لو کہ صاحب سنت ہے، صمدانی کا قول تھا، کہ ان کے واسطے سے مسلم اور زندیق میں پہچان ہوتی ہے۔

دربار شاہی کی نگاہ میں بھی امام کا احترام غیر معمولی حد کو پہنچا، معتصم کے دل میں ندامت گھر کر گئی تھی، اپنی زیادتی کی تلافی کے لیے اپنا نائب بھیج کر امام کی خیریت معلوم کراتا رہا، خصوصاً جب متوکل کا دور آیا تو نقشہ بالکل بدل گیا، متوکل کا دور بدعت اور ارباب بدعت کے زوال کا دور تھا، اور سنت صحابہ حدیث کے اعزاز وعروج کا، ابن الجوزی کے بقول متوکل اس فکر میں رہتا کہ پچھلے مظالم کی تلافی کرے، ایک بار بیس ہزار سکے بھیجے، پھر ایک لاکھ درہم بھجوائے، امام نے لینے سے انکار کردیا متوکل نے کہلوایا، کہ آپ اگر نہیں لیتے تو لڑکے کو اجازت دیجیے، امام نے کہا، کہ لڑکا اپنی مرضی کا خود مختار ہے، لڑکے (عبداللہ) نے بھی رقم واپس کردی اسحاق بن ابراہیم کے سخت اصرار پر دس ہزار درہم لے لیے، مگر اسی وقت مہاجرین وانصار کی اولاد میں تقسیم کرادیے، فرمایا "ھذا امر اشد علی من ذاك ذاك فتنة الدين وھذا فتنة الدنيا" یہ معاملہ تو میرے لیے اس سے زیادہ سخت ہے، وہ تو دین کا فتنہ تھا، یہ دنیا کا فتنہ ہے، امام کا اتنا اثر متوکل پر تھا، کہ اکثر معاملات میں آپ سے مشورہ لیتا۔

ام متوکل نے ایک مرتبہ اپنے بیٹے سے کہا، کہ میری خواہش ہے، کہ امام احمد کی زیارت کروں، اس کا انتظام کیا گیا، ام متوکل نے پردے کے پیچھے سے امام کو دیکھا پھر کہا، اے بیٹے! اس شخص کو دیکھ کر اللہ اللہ کرو یہ ایسا آدمی نہیں کہ اس چیز (مال اور اقتدار) کی تمنا کرے، جو تمہارے پاس ہے۔

خود بیٹے کا تاثر یہ تھا، اس نے ماں سے کہا، دیکھو سارا گھر کس طرح روشن ہو گیا ہے۔

کبشہ انماری سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلاث اقسم عليهن واحدثكم حديثا فاحفظوه قال ما نقص مال عبد من صدقة ولا ظلم عبد مظلمة صبر عليها الا زاده الله عزا ولافتح عبد باب مسئلة الا فتح الله عليه باب فقر او كلمة نحوها ۔(ترمذی ابواب الزہد ج۲ ص۵۶)

تین چیزیں ایسی ہیں، جن پر میں قسم کھاتا ہوں اور ان کے بارے میں ایک امر بیان کرتا ہوں، جسے تم لوگ محفوظ کرلو (۱) صدقہ کی وجہ سے مال نہیں گھٹتا (۲) بندے پر ظلم کی وجہ سے اس کی عزت نہیں گھٹتی بلکہ اللہ اس کی عزت میں اضافہ کرتا ہے (۳) جس بندے نے اپنے لیے سوال کا دروازہ کھولا اللہ تعالی اس کے لیے فقر کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

حضرت انس سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا اراد الله بعبده الخير عجل له العقوبة فى الدنيا واذا اراد بعبده الشر امسك عنه بذنبه حتى يوافى به يوم القيامة ۔(اتحاف المهره ج۲ ص۴۷)

جب اللہ تعالی کسی بندے کے حق میں خیر کا ارادہ فرماتا ہے، تو اسے دنیا کے اندر عقوبت سے دوچار کرتا ہے، اور جب اللہ کسی بندے سے شر کا ارادہ فرماتا ہے، تو اسے گناہوں میں روک لیتا ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن ان گناہوں کا بدلہ دے گا۔

حضرت انس بن مالک سے مروی ہے:

ان اعظم الجزاء مع عظم البلاء وان الله اذا احب قوما ابتلاهم فمن رضى فله الرضىٰ ومن سخط فله السخط ۔(ترمذی ابواب الزهد ج ۲ ص۵٦)

بڑا ثواب بڑی مصیبت پر ہے، جب اللہ کسی قوم کو محبوب رکھتا ہے، تو اسے آزماتا ہے جو بندہ راضی رہا، تو اللہ بھی اس سے راضی ہوگیا اور جو ناراض ہوا اللہ بھی اس سے ناراض ہوجاتا ہے۔

بشر حافی کہتے ہیں "**ادخل احمد الكير فخرج ذهبا احمر**" امام احمد کو آزمائش کی بھٹی میں ڈالا گیا تو وہ زر خالص بن کر نکلے۔ (ابن کثیر ج۱۰ ص۳۵۰)

علی بن مدینی کہتے ہیں "**ان الله اعز هذا الدين برجلين ليس لهما ثالث ابوبكر الصديق يوم الردة واحمد بن حنبل يوم المحنة**" بے شک اللہ تعالی نے اس دین کو دو لوگوں کے ذریعہ تقویت بخشی، ان دونوں کا کوئی تیسرا شریک نہیں ابوبکر ردت کے دن اور احمد بن حنبل آزمائش کے دن۔ (تاریخ بغداد ج۴ ص۴۱۸)

محمد بن علی بن شعیب اپنے والد کا قول نقل کرتے ہیں، کہ احمد بن حنبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کے مطابق تھے، "**كائن فى امتى ما كان فى بنى اسرائيل حتى ان المنشار ليوضع على فرق راسه ما يصرفه ذلك عن**

دینہ' 'بنی اسرائیل میں جو کچھ ہو چکا ہے، میری امت میں بھی ہوگا، حتی کہ کسی کے سر پر آرا چلایا جائے گا، مگر یہ عمل بھی اس کو اس کے دین سے برگشتہ نہ کر سکے گا۔ (ایضا)

امام احمد اس حدیث رسول کے مصداق ہیں۔

سلمہ بن شبیب کہتے ہیں "کنا عندا حمد بن حنبل وجاء ہ شیخ ومعہ عکازۃ فسلم وجلس فقال من منکم احمد بن حنبل فقال احمد انا ماحاجتك فقال ضربت اليك من اربع ماۃ فرسخ اريت الخضر فی المنام فقال لی مبر الی احمد بن حنبل وسل عنہ وقل لہ ان ساکن العرش والملائکۃ راضون بما صبرت نفسك للہ عزوجل' 'ہم امام احمد بن حنبل کے پاس تھے، ایک بوڑھا شخص آیا جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اس نے سلام کیا اور بیٹھ گیا پھر پوچھا تم میں احمد بن حنبل کون ہیں؟ امام احمد نے فرمایا، میں ہوں، پوچھا تمہاری ضرورت کیا ہے؟ اس نے کہا، میں آپ کے پاس چار سو فرسخ کا سفر طے کر کے آرہا ہوں، میں نے خواب میں خضر کو دیکھا اور انہوں نے مجھ سے کہا تم احمد بن حنبل کے پاس جاؤ اور ان کے بارے میں پوچھو اور ان سے کہو بے شک ساکن عرش اور فرشتے راضی ہیں اس بات سے جو آپ نے اللہ عزوجل کی راہ میں صبر کیا۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۱۰ ص ۳۵۷)

تصویر کا دوسرا رخ

رئیس المعتزلہ قاضی احمد بن ابی دواد جس نے اپنی روشن خیالی، تجدد پسندی اور عقلیت پرستی کے جادو سے مامون اور معتصم کو مسحور کر لیا تھا اور ایوان اقتدار و سطوت میں ہر طرف اسی کے جلوے تھے، علمائے حق کا عرصہ حیات اس نے تنگ کر رکھا تھا، مگر اس کی طلسماتی شخصیت کا زوال اس انداز سے ہوا، کہ دنیا والوں کے لیے درس عبرت و نصیحت بن گیا۔

ایسی نمائشی شخصیتیں جن کے اندر ایمان، ضمیر اور کردار کی اصل قوت موجود نہیں ہوتی، بلکہ محض دماغی یا فنی صلاحیتوں کی بنا پر وہ ابھر آتی ہیں، ان کو اندر ہی اندر زوال کا کیڑا کھاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ ان کی عظمت کا منارہ اچانک ٹوٹ گرتا ہے، ایک طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو خاک و خون میں لوٹ کر بھی عظیم رہتے ہیں، اور دوسری طرف ایسے بھی ہوتے ہیں، جو زریں مسندوں پر بیٹھ کر بھی پست و ادنی رہتے ہیں، بعض کوڑے کھا کر بھی معزز تر ہو جاتے ہیں، بعض اختیارات و اعزازات سے آراستہ ہو کر بھی ذلیل رہتے ہیں، کسی کے لیے تختہ دار پر بھی عزت ہی عزت ہوتی ہے اور کسی کے لیے تخت پر بھی دنائت ہی مقدر رہتی ہے، ابن ابی دواد کی ساری عظمت بھی ایسا ہی ایک فریب نظر تھی، امام کو کوڑے لگواتے ہی یہ عظمت متزلزل ہو گئی۔

یوں تو معتصم کا رنگ بھی قدرے بدل گیا تھا، اور آگے چل کر متوکل کا تو خاصا جھکاؤ امام کی طرف تھا، مگر واثق ہی کے دور میں چوں کہ معتزلہ کے نظریات کی ساکھ بالکل ختم ہو چکی تھی، اس لیے واثق کی نگاہوں میں ابن ابی دواد کی قدر و منزلت بالکل ختم ہو گئی۔

رائے عامہ کا رنگ بھی اس کے متعلق اس حد تک بدلا کہ اس کے پیچھے نفرت کی وجہ سے نماز پڑھنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، ایک موقع پر تو جمہور کا وفد واثق کے سامنے یہ شکایت لے کر گیا، کہ ابن ابی دواد مسلمانوں کو جبراً مجبور کرتا ہے، کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن کے بارے میں ایسا ایسا عقیدہ رکھنے کی تعلیم دیں، پھر انہوں نے اس کی معزولی کا مطالبہ کیا اور صاف صاف کہا کہ اس کا عہدہ قضا پر ہونا ہمیں پسند نہیں ہے، امام احمد بن حنبل کی مظلومی نے لوگوں کو ابن ابی دواد کے مقابلے میں اب اتنا جری کر دیا تھا۔

اس فضا میں جب متوکل کا دور آیا تو وہ ابن ابی دواد اور اس کے بیٹے کے طرز عمل سے ناخوش ہوا اور ان کو قضا کے محکمے سے معزول کر دیا، پھر ان کے تمام اموال واملاک کی ضبطی کا فرمان جاری کیا، اس کے بیٹے کو اور اس کے دوسرے بھائیوں کو قید کر دیا اور ان کے اموال بھی ان سے چھین لیے۔ ابن خلکان کی روایت کے مطابق اس کی اولاد اور خاندان سے امام کی تکلیف دہی کے جرم میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار اشرفیاں بہ طور تاوان وصول کی گئیں۔

قابل ذکر واقعہ یہ ہے، کہ خلیفہ متوکل نے خود امام احمد بن حنبل سے ابن ابی دواد کی جائداد ضبط کرنے کا فتویٰ پوچھا، یہ موقع تھا، کہ امام کے اندر کوئی انتقامی جذبہ حرکت میں آ جائے، مگر انہوں نے کوئی فتویٰ نہیں دیا، خاموش رہے کجا وہ کردار کہ امام کے لیے سزائے موت اور سزائے تازیانہ کے فتوے دیتا ہے اور کجا یہ کردار کہ خلیفہ خود موقع دے رہا ہے اور امام کا کوئی مطالبہ نہیں۔

* * *

مرض الموت اور وفات

حضرت امام احمد بن حنبل سامرہ ہی میں ضعف ونقاہت کا شکار ہو گئے تھے، بغداد آئے، تو روز بروز صحت گرنے لگی، بالآخر ۲؍ربیع الاول ۲۴۱ھ بستر علالت پر پڑ گئے، مرض شدت اختیار کرتا رہا، لوگوں کو خبر ہوئی تو عیادت کے لیے جوق در جوق آنے لگے، لوگوں کے آنے کی کثرت ہوئی، تو حکومت نے دروازہ اور گلی پر پہرہ بٹھادیا، زائرین کی بھیڑ مسجدوں اور گلیوں میں جمع ہونے لگی، خرید وفروخت میں خلل واقع ہونے لگا، امیر بغداد محمد بن عبداللہ بن طاہر نے اپنے حاجب کے ذریعہ امام صاحب کو سلام بھیج کر پیغام دیا، کہ میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں، آپ نے جواب دیا، کہ میں اس کو پسند نہیں کرتا، امیر المومنین نے بھی مجھے اس سلسلے میں معاف کردیا ہے، بنو ہاشم کے اعیان واشراف آئے، تو ان کو اندر آنے کی اجازت دی، قاضیوں کی ایک جماعت آئی جس کو داخلہ کی اجازت نہیں ملی، اسی درمیان ایک بزرگ نے آکر کہا، کہ ابوعبداللہ! دربار خداوندی کی پیشی یاد کرو، امام صاحب یہ سن کر رونے لگے، صالح بن احمد کہتے ہیں، کہ ایک شخص آیا اور کہا، میں امام احمد کی بارگاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں، میں کوڑوں کی ضرب میں شریک تھا، میں ان سے معافی کا خواستگار ہوں، میں نے کہا، ٹھہرو! امام صاحب نے فرمایا، اسے آنے دو، وہ امام صاحب کے روبرو کھڑا ہو کر رونے لگا، اور کہا، اے ابوعبداللہ! میں آپ کو کوڑے لگانے والوں میں سے ہوں، اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، اگر آپ بدلہ لینا چاہیں تو میں اس کے لیے آمادہ ہوں، یا معاف کرنا چاہیں، تو معاف کردیں، امام صاحب نے فرمایا "انی قد جعلتك فی حل" "میں نے تم کو معاف کردیا، وہ شخص روتا ہوا باہر آیا، جو لوگ موجود تھے وہ بھی رونے لگے۔

(مناقب لابن الجوزی ص ۴۸۹)

امام صاحب کے صاحب زادے صالح کا بیان ہے، کہ جب میرے والد احمد بن حنبل بیمار ہوئے، تو میں نے غذا وغیرہ کے بارے میں پوچھا، فرمایا، باقلا (لوبیا) کے سوا اور کیا استعمال کروں گا؟

امام صاحب نے مرض الموت میں ایک وصیت نامہ تحریر کیا، جس کے الفاظ یہ تھے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ھذا ما اوصیٰ احمد بن محمد بن حنبل اوصیٰ انہ یشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریك لہ وان محمدا عبدہ ورسولہ ارسلہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون واوصیٰ من اطاعۃ من اھلہ وقرابتہ ان یعبدوا اللہ فی

العابدين وان يحمدوه فى الحامدين وان ينصحوا لجماعة المسلين واوصىٰ فى قد رضيت بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد نبيا ۔

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا، یہ احمد بن محمد بن حنبل کی وصیت ہے، کہ میں گواہی دیتا ہوں، کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جنہیں اس نے ہدایت اور دین کے ساتھ مبعوث فرمایا، تاکہ وہ تمام ادیان پر غالب آجائے، اگرچہ مشرکین پسند نہ کریں، اہل بیت اطہار کی اطاعت کی جائے، عابدین اللہ ہی کی عبادت کریں اور حمادین اسی کی حمد کریں، جماعت مسلمین کے لیے خیر خواہی کی جائے اور میں اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہوں۔

آپ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تین موئے مبارک تھے، بوقت رحلت اپنے بیٹے عبداللہ کو وصیت کی، کہ ایک بال داہنی آنکھ پر ایک بائیں آنکھ پر اور ایک زبان پر رکھ دینا۔ (صفۃ الصفوہ ج۲ ص۲۰۱)

۱۲ ربیع الاول ۲۴۱ھ بروز جمعہ بوقت صبح علم وتقویٰ عزیمت واستقامت کے امام نے دار فانی سے رحلت کی، بوقت رحلت عمر شریف ستہتر سال تھی۔

حنبل بن اسحاق کہتے ہیں:

ومات ابوعبدالله فى سنة احدى واربعين ومأتين فى يوم الجمعة فى ربيع الاول وهو ابن سبع وسبعين سنة ۔ (تاریخ بغداد ج۴ ص ۴۲۲)

انتقال کی خبر سنتے ہی پورا بغداد ماتم کدہ بن گیا، لوگ چیخیں مار مار کر رونے لگے، آہ وبکا کی آوازیں ہر طرف گونجنے لگیں، جمعہ کے بعد جنازہ اٹھا تو بغداد اور نواح بغداد کے تقریبا آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں جنازہ کے ساتھ چلے۔

ابن خلکان نے لکھا ہے:

وحضر من حضر جنازته من الرجال فكانوا ثمان مائة الف ومن النساء ستين الفا ۔

(ابن خلکان ج۱ ص۴۱)

ایک روایت یہ ہے، کہ نماز جنازہ پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد دس لاکھ اسی ہزار تھی، وہ لوگ جو دجلہ میں کشتیوں پر ہی جگہ پا سکے، وہ الگ تھے، بعض روایتوں میں چار لاکھ، ساتھ لاکھ اور پندرہ لاکھ کی تعداد بھی بیان کی گئی ہے، یہ منظر جس کے پس منظر میں اقتدار اور سچائی کی آویزش کارفرما تھی، اسے دیکھ کر بیس ہزار یہود ونصاریٰ اور مجوسی اسلام لائے۔

ابن خلکان رقم طراز ہیں:

قیل انه اسلم یوم مات عشرون الفا من النصاریٰ والیهود والمجوس۔ (ایضا)

محمد بن عبداللہ بن طاہر نے نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کے جسد مبارک کو باب حرب کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ انتقال کے ۲۳۰ / سال بعد آپ کی قبر کے پہلو میں قبر کھودی گئی، قبر کا ایک حصہ کھل گیا، دیکھا گیا، تو آپ کا کفن صحیح وسالم تھا اور جسم میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۵)

مبشرات

امام ابن جوزی نے اپنی کتاب ''اخبار بشر بن الحارث الحافی'' میں لکھا ہے:

حدث ابراهیم الحربی قال رایت بشر بن الحارث الحافی فی المنام کانه خارج من باب مسجد الرصافة وفی کمه شئ یتحرك فقلت ما فعل الله بك؟ فقال غفرلی واکرمنی فقلت ماهذاالذی فی کمك؟ قال قدم علینا البارحة روح احمدبن حنبل فنثر علیه الدر والیاقوت فهذا مما التقطت قلت ما فعل یحییٰ بن معین واحمد بن محمد؟ قال ترکتهما وقد زارا رب العالمین ووضعت لهما الموائد قلت فلم لم تاکل معهما انت؟ قال قد عرف هو ان الطعام علی فاباحنی النظر الی وجهه الکریم۔ (وفیات الاعیان ج۱ص۴۱)

ابراہیم حربی نے کہا، کہ میں نے مسجد رصافہ کے دروازے پر بشر بن حارث حافی کو خواب میں دیکھا، ان کی آستین میں کوئی چیز تھی، جو حرکت کر رہی تھی، میں نے ان سے کہا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ تو انہوں نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمائی اور مجھے نوازا، تو میں نے کہا، آپ کی آستین میں یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا، کہ گزشتہ رات ہمارے پاس احمد بن حنبل کی روح آئی، اس پر در وجواہر نچھاور کیے گئے، تو انہیں میں سے چنے ہوئے کچھ موتی ہیں، میں نے کہا، یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل کے ساتھ کیا کیا گیا؟ انہوں نے کہا، میں نے ان دونوں کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ دونوں رب العالمین کی زیارت کر رہے تھے، ان کے لیے دستر خوان بچھایا گیا، میں نے کہا، آپ نے ان دونوں کے ساتھ کھانے میں شرکت کیوں نہیں کی؟ انہوں نے کہا، اس نے کھانے کو مجھ پر ہلکا سمجھا، پس اس نے اپنے وجہ کریم کی زیارت میرے لیے مباح کر دی۔

ابوالفرح ہندبائی کہتے ہیں:

کنت ازور قبر احمد بن حنبل فترکته مدة فرایت فی المنام قائلا یقول لی لم ترکت زیارة قبر امام السنة؟ (تاریخ بغداد ج۴ص۴۱۷)

میں احمد بن حنبل کے مزار کی زیارت کیا کرتا تھا، تو میں نے کچھ دنوں کے لیے زیارت کو ترک کر دیا، میں نے خواب میں دیکھا، کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے، تم نے کیوں امام السنۃ کی قبر کی زیارت ترک کر دی؟

ابوبکر مروزی کا بیان ہے:

رایت احمد بن حنبل فی النوم کانه فی روضة وعلیه حلتان خضراوان وعلیٰ راسه تاج من النور واذا هو یمشی مشیة لم اکن اعرفها فقلت یا احمد ما هذه المشیة التی لم اکن اعرفها لك؟ فقال هذه مشیة الخدام فی دارالسلام فقلت ما هذاالتاج الذی اراه علی راسك ؟ فقال ان ربی عز وجل اوقفنی وحاسبنی حسابا یسیرا وحبانی وقربنی واباحنی النظر الیه وتوجنی بهذا التاج وقال لی یا احمد هذا تاج الوقار توجتك به کما قلت القرآن کلامی غیر مخلوق ۔ (صفة الصفوه ج ۲ ص ۵۲۷)

میں نے احمد بن حنبل کو خواب میں دیکھا، کہ آپ ایک باغ میں جلوہ افروز ہیں اور دو سبز جوڑے پہنے ہوئے ہیں اور آپ کے سر پر ایک ایسا تاج ہے، جو بقعہ نور معلوم ہوتا ہے، اور آپ نئی چال سے چل رہے ہیں، میں نے پوچھا، حضرت یہ کیسی چال ہے؟ فرمایا دارالسلام کے خدام کی چال یہی ہے، میں نے پوچھا، یہ تاج کیسا ہے؟ فرمایا میرے خدا نے مجھ سے بڑا ہی آسان حساب لے کر میری مغفرت فرمائی اور مجھے اپنے دیدار سے ممتاز کر کے فرمایا، اے احمد! یہ وقار کا تاج ہے، جس طرح تو نے صبر و استقامت سے میرے کلام کو غیر مخلوق کہا، اس کا یہ صلہ ہے۔

ابو یوسف بن لحیان کا بیان ہے:

لما مات احمد بن حنبل رای رجل فی منامه کان علی کل قبر قندیلا فقال ما هذا ؟ فقیل له اما علمت انه نور لاهل القبور قبورهم بنزول هذاالرجل بین اظهرهم قد کان فیهم یعذب فرحم ۔ (ایضا ص ۵۲۷)

جب امام احمد بن حنبل کا انتقال ہوا، ایک شخص نے خواب میں دیکھا، کہ تمام قبروں پر قندیلیں روشن ہیں، اس نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ تو اس سے کہا گیا، کیا تجھے خبر نہیں ہے، کہ امام احمد کے قبرستان میں دفن ہونے کی وجہ سے تمام مردوں کی قبریں روشن کر دی گئی ہیں اور جو لوگ قبروں میں عذاب دیے جا رہے تھے، ان پر رحم کیا گیا ہے۔

ابوعلی بن بناء کہتے ہیں:

لما ماتت ام القطیعیی دفنها فی جوار احمد بن حنبل فراها بعد لیال فقال ما فعل الله بك؟

فقالت یا بنی رضی اللہ عنك فقد دفنتنی فی جوار رجل تنزل علی قبرہ فی کل لیلة او قال فی کل لیلة جمعة رحمة تعم جمیع اهل المقبرة وانا منهم ۔ (ایضا)

جب قطیعی کی ماں کا انتقال ہوا، تو اسے احمد بن حنبل کی قبر کے جوار میں دفن کیا گیا، چند راتوں کے بعد اس نے اپنی ماں کو خواب میں دیکھا، پوچھا، اللہ نے تیرے ساتھ کیسا معاملہ کیا؟ اس نے جواب دیا، اے میرے بیٹے! اللہ تجھ سے راضی ہو، تو نے مجھے ایسے مرد صالح کے جوار میں دفن کیا، جس کی قبر پر ہر رات یا کہا، ہر شب جمعہ رحمت کا نزول ہوتا ہے اور وہ رحمت تمام قبرستان والوں کے لیے عام ہوتی ہے، انہیں میں میں بھی ہوں۔

یحیٰ الجلاء نے خواب میں دیکھا، کہ جامع مسجد میں احمد بن حنبل کا حلقہ قائم ہے، دوسرے حلقہ میں ابن ابی دواد ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں حلقوں کے درمیان کھڑے ہیں، اور آپ یہ آیت "**فَاِنْ یَّکْفُرْ بِهَا هٰؤُلَاءِ** " پڑھ رہے ہیں، اور ابن ابی دواد کے حلقہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، پھر آپ "**فَقَدْ وَکَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَیْسُوْا بِهَا بِکَافِرِیْنَ** " پڑھ کر امام احمد بن حنبل اور آپ کے اصحاب کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ (تاریخ ابن کثیر ج ١٠ واقعات ١٤٢ھ)

خراج عقیدت

مزنی کا خیال ہے، کہ دنیا میں پانچ شخص ایسے ہوئے، جنہوں نے پانچ مواقع پر بے نظیر ہمت نفس وقربانی کا ثبوت دیا، "**ابوبکر یوم الردة وعمر یوم الثقیفة وعثمان یوم الدار وعلی یوم الجمل والصفین واحمد یوم المحنة**" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اہل ردت کے مقابلے میں، حضرت عمر نے بنی ثقیفہ کے موقع پر، حضرت عثمان نے اپنی محصوری کے زمانہ میں، حضرت علی نے جمل وصفین کے موقع پر اور احمد بن حنبل نے خلق قرآن کے مسئلہ میں۔

قتیبہ فرماتے ہیں "**مات سفیان الثوری ومات الورع ومات الشافعی ومات السنن ویموت احمد بن حنبل وتظهر البدع**" سفیان ثوری نے انتقال کیا، تو تقویٰ مر گیا، شافعی نے وفات کی، تو سنت مری اور احمد بن حنبل کی موت کے بعد اصل دین کے مرنے اور بدعت کے شائع ہونے کا خدشہ ہے۔

قتیبہ نے دوسرے مقام پر کہا "**ان احمد بن حنبل قام فی الامة مقام النبوة**" احمد بن حنبل نے اس امت میں نبوت کے فرائض انجام دیے، یعنی اللہ کی راہ میں ایسا صبر کیا، جو نبیوں کا کام تھا۔

ابو عمرو بن النحاس نے ایک دن امام احمد کا ذکر کیا، تو فرمایا "**رحمه اللہ فی الدین ماکان ابصره وعن الدنیا ماکان اصبره وفی الزهد ماکان اخبره وبالصالحین ماکان الحقه وبالماضین مکانا اشبهه عرضت علیه الدنیا فاباها والبدع فنفاها**" اللہ ان پر رحم کرے، دین پر کیسے ثابت قدم رہے اور ان کے اوصاف صالحین، صحابہ وتابعین سے کتنے ملتے جلتے تھے، دنیا ان کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے اس سے انکار کیا، اسی طرح دین ایک نئی صورت میں ان کے سامنے پیش کیا گیا تو اسے بھی انہوں نے قبول نہیں کیا اور قدیم واصلی دین پر قائم رہے۔

حضرت بشر بن حارث حافی رحمۃ اللہ علیہ (مشہور ولی) نے امام احمد کے اس امتحان کے سلسلے میں فرمایا "**ادخل احمد الکیر فخرج ذھبا احمر** "احمد اپنی اس آزمائش میں کھرے نکلے، جس طرح سونا پرکھنے کے بعد کھرا کھوٹا معلوم ہوتا ہے، اسی طرح احمد آزمائش کے بعد خالص سونا ثابت ہوئے۔

علی بن مدینی نے میمون سے کہا:

یامیمون ماقام احمد فی الاسلام ماقام احمد بن حنبل فعجبت من ھذا عجبا شدیدا وذھبت الی ابی عبید القاسم بن سلام فحکیت له مقالة علی بن المدینی فقال صدق ان ابابکر وجد یوم الردة انصارا واعوانا وان احمد بن حنبل لم یکن له انصار ولا اعوان ثم اخذ ابوعبید یطری احمد ویقول لست اعلم فی الاسلام مثله ۔

اے میمون! احمد نے اسلام میں جو خدمت عظیم انجام دی، وہ کسی سے نہ ہو سکی، مجھے اس سے تعجب ہوا اور میں ابوعبید القاسم کے پاس گیا اور اس واقعہ کو بیان کیا، انہوں نے کہا، ابن المدینی نے سچ کہا، حضرت ابوبکر نے تو یوم ردت میں اعوان وانصار پائے، لیکن احمد نے تو ایک بھی مددگار نہ پایا، پھر ابوعبید نے امام احمد کی بہت توصیف کی اور کہا، میں اہل اسلام میں ان سے بڑا کسی کو نہیں سمجھتا۔

اسحاق بن راھویہ فرماتے ہیں، "**احمد حجة بین اللہ وبین عبیده فی الارض** "احمد بن حنبل اللہ اور بندوں کے درمیان حجت ہیں۔

علی بن مدینی کہتے ہیں" **اذا ابتلیت بشیء فافتانی احمد بن حنبل لم ابال اذا لقیت ربی کیف کان وقال ایضا انی اتخذت احمد حجة فیما بینی وبین اللہ عز وجل ثم قال من یقوی علی مایقوی علیه ابو عبداللہ ؟** "جب میں کسی آزمائش میں پڑ جاؤں اور امام احمد بن حنبل مجھے فتویٰ دے دیں اور جب میں اپنے رب سے ملوں گا تو مجھے کچھ پرواہ نہ ہوگی، کہ وہ کیا کرتا ہے، نیز فرمایا، میں نے اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حضرت امام احمد کو حجت بنالیا ہے، پھر فرمایا، جس بات کی قوت ابوعبداللہ رکھتے ہیں کون اس کی قوت رکھتا ہے؟

یحییٰ بن معین نے فرمایا، "**کان فی احمد بن حنبل خصال مارایتها فی عالم قط کان محدثا حافظا وکان عالما وکان ورعا وکان زاھدا وکان عاقلا وقال یحییٰ بن معین ایضا اراد الناس منا ان نکون مثل احمد بن حنبل واللہ ما نقوی ان نکون مثله ولا نطیق سلوك طریقه**' 'یحییٰ بن معین نے فرمایا ہے، حضرت امام احمد بن حنبل میں کچھ خصائل ہیں، جنہیں میں نے کبھی کسی عالم میں نہیں دیکھا، آپ محدث، حافظ، عالم، متقی، زاہد اور عاقل تھے، نیز فرمایا، لوگوں نے چاہا، کہ امام احمد بن حنبل کی مانند ہو جائیں، قسم بخدا ہم آپ کے مانند ہونے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ آپ کے طریق پر چلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

ابوبکر بن داؤد نے بیان کیا ہے ”احمد بن حنبل مقدم علی کل من یحمل بیده قلما و محبرة“ امام احمد بن حنبل اپنے زمانہ میں ہر اس شخص سے مقدم تھے، جو اپنے ہاتھ میں قلم اور دوات اٹھاتا ہے۔

ابوبکر محمد بن محمد بن رجا کہتے ہیں ”ما رایت مثل احمد بن حنبل و لا رایت من رای مثله“ میں نے امام احمد بن حنبل کا مثل نہیں دیکھا اور نہ اس شخص کو دیکھا، جس نے آپ کا مثل دیکھا ہو۔

یحیٰی بن الذہلی کہتے ہیں، کہ احمد ہمارے اور خدا کے درمیان حجت ہیں۔

ہلال بن المعلیٰ الرقی فرماتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر چار آدمی کے ذریعہ بڑا احسان کیا، ایک شافعی سے انہوں نے حدیث رسول کو صحیح طور پر سمجھا، پھر اس کے مجمل، مفسر، خاص، عام، ناسخ، منسوخ کو بتایا اور دوسرے ابوعبید جنہوں نے غریب احادیث سے آگہی بخشی اور تیسرے یحیٰی بن معین جنہون نے جھوٹی حدیثوں سے قوم کو آگاہ کیا اور چوتھے احمد بن حنبل جو امتحان شدید کے وقت ثابت قدم رہے۔

عبداللہ بن اسحاق مدائنی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں ”رایت کان الناس قد جمعوا الی مکة و کان الحجر الاسود انصدع فخرج منه لواء فقلت ماهذا؟ فقیل له احمد بن حنبل بایع الله عز و جل“ میں نے خواب میں دیکھا، کہ لوگ مکہ میں جمع ہوئے اور حجر اسود شق ہوگیا، تو اس سے ایک جھنڈا برآمد ہوا، میں نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ مجھ سے کہا گیا، کہ احمد بن حنبل نے اللہ عزوجل سے بیعت کی (تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۸)

یحیٰی بن محمد العنبری نے کہا، ابوعبداللہ السندی نے امام احمد کی توصیف میں یہ اشعار کہے۔

ان بن حنبل ان سالت امامنا

وبه الائمة فی الانام تمسکوا

خلق النبی محمد بعد الالی

خلعوا الخلائف بعده تهلکوا

حذو الشراك علی الشراك وانما

یحذوا المثال مثاله المتمسك

اگر تو ہمارے امام کے متعلق دریافت کرے، تو وہ احمد بن حنبل ہیں، اور مخلوق میں ائمہ نے آپ ہی سے تمسک کیا ہے۔ آپ ان لوگوں کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں، جنہوں نے خلفا کی جانشینی کی ہے اور فوت ہوگئے ہیں۔ وہ تسمے پر تسمے کی مانند ہیں اور مثال کی برابری ملتی جلتی مثال ہی کرتی ہے۔

صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

لاتزال طائفة من امتی علی الحق ظاهرین لا یضرهم من خذلهم و لا من خالفهم حتی یاتی

امر اللہ وھم علی ذلك . (ابن کثیر ج۱۰ ص۳۵۱)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ ہی حق پر غالب رہنے والا ہے، ان کو چھوڑنے والا اور ان کی مخالفت کرنے والا کوئی بھی ان کو نقصان نہیں پہنچائے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے اور وہ اسی حالت میں ہوں گے۔

ازواج واولاد

حضرت امام احمد بن حنبل نے پہلی شادی عباسہ بنت فضل سے کی، جن کے بطن سے صالح پیدا ہوئے، تقریباً ۳۰ رسال تک یہ نیک سیرت خاتون شرف رفاقت سے بہرہ مند رہیں، بڑی خوشگوار ازدواجی زندگی بسر ہوئی، ان کے انتقال کے بعد ریحانہ سے شادی کی، جو ایک آنکھ کی زخمی تھیں۔

چنانچہ احمد بن عتبہ فرماتے ہیں:

لما مات ام صالح قال احمد لامرأة عندھم اذھبی الی فلانة ابنة عمی فاخطبیھا لی من نفسھا قال فاتتھا فاجابتہ فلما رجعت الیہ قال کانت اختھا تسمع کلامك ؟ قال و کانت بعین واحدة ؟ قالت لہ نعم قال فاذھبی فاخطبی تلك التی بعین واحدة فاتتھا فاجابتھا وھی ام عبداللہ فاقام معھا سبعا ثم قالت لہ کیف رایت یا ابن عم انکرت شیئا ؟ قال لا الا ان نعلك ھذہ تصر .

(صفۃ الصفوۃ ج۲ ص۵۱۹)

جب ام صالح کا انتقال ہوا، تو اپنی قوم کی ایک عورت سے کہا، میرے چچا کی فلاں بیٹی کے پاس جاؤ اور اس کو میرا پیغام نکاح دو، راوی کا بیان ہے، کہ اس نے پیغام دیا، تو اس عورت نے قبول کر لیا، جب ان کے پاس واپس ہوئی، آپ نے فرمایا، کیا اس کی بہن تیری بات سن رہی تھی؟ پوچھا، کیا وہ ایک آنکھ کی ہے؟ پیغام رساں نے آپ سے کہا، ہاں! کہا، تو جا! اور ایک آنکھ والی لڑکی کو پیغام دے، وہ آئی، تو اس نے ایک آنکھ والی لڑکی کو پیغام دیا، اس نے آپ کا پیغام قبول کر لیا، اور وہ عبداللہ کی ماں ریحانہ تھیں، تو وہ سات روز تک ان کے پاس رہیں، پھر پوچھا، اے ابن عم آپ نے مجھ کو کیسا پایا؟ کیا کوئی چیز آپ کو ناگوار گزری؟ فرمایا نہیں! مگر یہ کہ تو ثابت قدم رہے۔

دوسری بیوی سے ۲۱۳ھ میں عبداللہ پیدا ہوئے، جو صالح سے ۱۰ رسال چھوٹے تھے، ریحانہ کے انتقال کے بعد امام صاحب نے ایک حسن نامی باندی خریدی جس کے بطن سے صاحب زادی ام علی تولد ہوئیں، اس کے بعد حسن وحسین دو بچے ایک ساتھ (توامین) پیدا ہوئے، جو جلد ہی انتقال کر گئے، پھر حسن، محمد اور سعید پیدا ہوئے، مرض الموت میں آپ کے دونوں چھوٹے بچے پاس لائے گئے سر پر دست شفقت پھیرا، دعا دی، اور فرمایا، بڑھاپے میں ان سے کیا فائدہ حاصل کروں گا؟ لوگوں نے کہا، یہ آپ کے بعد دعائے خیر کریں گے، فرمایا، جب تو ٹھیک ہے۔

عظمت کردار

امام احمد کی معیشت

امام احمد کی زندگی فقر وفاقہ، غربت وفلاکت سے عبارت تھی، انہوں نے کبھی بھی فراغت اور بے فکری کی زندگی بسر نہیں کی، وہ بھوکے رہنے کو ایسی مالداری پر ترجیح دیتے تھے، جس میں یہ امتیاز نہ ہو کہ یہ حلال خالص ہے یا کسی کے عطیے کا رہین منت۔

آپ کو وراثت میں ایک مکان اور کپڑے کی چھپائی کا کارخانہ ملا تھا، مکان کے سامنے زمین تھی، جس پر آپ کاشت کیا کرتے تھے، زمین کی پیداوار اور کارخانے کے کرایہ پر ہی پوری زندگی تنگ دستی میں گزار دی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:

وکانت غلته من ملك له فی كل شهر سبعة عشر درهما ينفقها على عياله ويتقنع بذلك رحمه الله صابرا محتسبا۔ (ابن حنبل ص ۵۹)

امام احمد کو اپنی جائداد کے کرایہ سے جو آمدنی ہوتی تھی، وہ سترہ درہم ماہوار تھی، جسے وہ اپنے اہل وعیال پر صرف کرتے تھے، اور اس پر قناعت کرتے ہوئے صبر وشکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔

کوئی شبہ نہیں کہ یہ آمدنی بہت کم تھی، ان کی آمدنی اتنی ہی تھی، کہ اگر ان میں محنت، مشقت کر کے روزی کمانے کا حوصلہ نہ ہوتا اور اگر ان کے پاس صبر وقناعت کی دولت نہ ہوتی تو ضروریات زندگی کا پورا ہونا بھی مشکل تھا، انہیں صرف ایک بات کی حرص تھی، کہ ان کی آمدنی کا وسیلہ غیر مشکوک اور حلال ہو اور یہ آبائی جائداد بھی جو ان کے رزق محدود کا سبب تھی، اس لیے قبول کر لی تھی، کہ اس میں غیر حلال کا کوئی شائبہ نہیں تھا، اگر کوئی مدعی سامنے آتا تو اس سے بھی دست بردار ہو جاتے۔

ابن جوزی لکھتے ہیں:

سأل رجل احمد بن حنبل عن العقار الذی كان يشغله ويسكن دارا منه كيف سبيله عنه قال له هذا شیٔ قد ورثته عن ابی فان جاء نی رجل فصح انه له خرجت عنه و دفعته اليه۔

(ابن حنبل ص ۵۹)

ایک آدمی نے امام احمد سے اس جائداد کے بارے میں جس کے کرایہ پر ان کا مدار معاش تھا اور اس مکان کے

بارے میں جہاں وہ بود و باش رکھتے تھے، دریافت کیا، انہوں نے جواب دیا، یہ وہ چیز ہے، جو مجھے اپنے والد سے ورثہ میں ملی ہے، اگر میرے پاس کوئی شخص آئے اور ثابت کر دے، کہ یہ اس کی ہے تو بے تامل میں اسے سونپ دوں۔

جب فلاکت حد سے زیادہ بڑھ جاتی تو پارچہ بافوں کے یہاں مزدوری کرتے، ادریس حداد کا بیان ہے:

کان احمد بن حنبل اذا ضاق به الامر اجر نفسه من الحاکة فسوی لهم ۔

امام احمد بن حنبل کو جب تنگ دستی ہو جاتی تو پارچہ بافوں کے یہاں مزدوری کر کے ان کے کام کرتے تھے۔

اگر سفر میں ہوتے اور فقر و فاقہ کی نوبت آتی، تو محنت و مزدوری سے کام چلاتے، ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی، کہ وہ مشکلات میں کسی کے تعاون اور عطیہ کے رہین منت ہوں، وہ اپنے جسم کو تکلیف پہنچانا گوارہ کر لیتے تھے، لیکن اپنی عزت نفس کو مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔

ایسا بھی ہوا ہے، کہ حالات نے زیادہ نازک صورت اختیار کر لی، فاقہ کشی کی حالت پیدا ہو گئی پھر بھی دوسروں کے عطیے انہوں نے رد کر دیے، کہ کسی کا ممنون کرم بننا زیادہ تکلیف دہ ہے بنسبت فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے کے، چنانچہ وہ شدت و عسرت کو قبول کر لیتے تھے اور تحائف و عطایا کے قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے، سد رمق، قوت لا یموت اور اہل و عیال کی حاجت بر آری کے لیے مندرجہ ذیل تین طریقوں میں سے ایک پر عمل کرتے تھے۔

اول: ۔کھیتی باڑی کے بعد کوڑا کرکٹ سمجھ کر جو کچھ چھوڑ دیا جاتا تھا، جو مباح کے حکم میں ہوتا ہے، اسے چن لیتے تھے اور اس سے اپنی ضروریات پوری کرتے تھے، چنانچہ بارہا ایسا ہوا ہے، کہ یہ عالم جلیل اور محدث بے بدیل رسی کاندھے پر رکھے ہوئے جا رہا ہے اور کھیت کی بچی کھچی گری پڑی چیزیں جن پر کسی کا دعوی نہیں ہوتا، چن چن کر لا رہا ہے، امام احمد اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے، کہ کسی کی زمین پر بغیر اس کی اجازت کے قدم نہ رکھیں، نہ کسی کے کھیت کو پامال اور خراب کریں چنانچہ ان سے روایت ہے:

خرجت الی الثغر علی قدمی فالتقطنا قد رایت قوما یفسدون مزارع الناس لا ینبغی لاحد ان یدخل مزرعة رجل الا باذنه ۔(مناقب لابن الجوزی ص ۲۹۰)

میں پا پیادہ ایک سرحد پر گیا، پھر ہم بچی کھچی چیزیں چننے لگے، میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا، جو دوسروں کے کھیت کھلیان خراب کر رہے تھے، کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے، کہ وہ کسی دوسرے کے کھیت میں بغیر اس کی اجازت کے قدم رکھے۔

دوم: ۔اور یہ کام بھی وہ اس وقت کرتے تھے، جب محنت مزدوری کے لیے کوئی کام نہیں ملتا تھا، اگر کوئی مشقت کا کام مل جاتا تھا، تو پھر وہ اسی کو ترجیح دیتے تھے، کہ کام کریں اور روزی پیدا کریں، یہ حلال معیشت کا دوسرا طریقہ تھا، انہیں کسی طرح کا

کام کرنے سے عار نہیں تھا، چاہے وہ کسی نوعیت اور کسی قسم کا کیوں نہ ہو؟ بشرطیکہ وہ لوگوں کے لیے نفع بخش ہو اور ان کی اپنی ضرورت پوری ہو جاتی ہو۔

محنت مزدوری کے علاوہ اجرت پر لکھنے پڑھنے کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ علی بن الجہم کہتے ہیں، ہمارا ایک پڑوسی تھا، جو ہمارے پاس ایک خط لایا اور پوچھا، کیا تم اس سواد خط کو پہچانتے ہو؟ ہم نے کہا، یہ تو احمد بن حنبل کا خط ہے، تمہیں انہوں نے کیوں لکھا تھا، کہنے لگا، ہم مکہ میں سفیان بن عیینہ کے یہاں مقیم تھے، احمد بھی ہمارے ساتھ تھے، ایک مرتبہ کئی دنوں تک وہ لاپتہ رہے، آخر ایک دن خود ہی ان کے یہاں آئے تو دروازہ بند تھا، میں نے پوچھا، کیا بات ہے، کیوں غائب رہے؟ کہنے لگے، میرے کپڑے چوری ہو گئے ہیں، میں نے کہا، میرے پاس کافی دینار ہیں، چاہے یوں ہی لے لو، خواہ قرض کے طور پر، لیکن انہوں نے نہ پونجی لینا پسند کیا، نہ قرض کے طور پر، تو میں نے کہا، اجرت پر میرے لیے کچھ لکھ دو؟ اس پر راضی ہو گئے، میں نے انہیں ایک دینار دیا، کہنے لگے، میرے لیے اس رقم کا کپڑا خرید لاؤ اور اس کے دو ٹکڑے کر دو، ایک تہہ بند ایک چادر اور ایک ورق کاغذ لاؤ میں نے تعمیل کی، تو انہوں نے یہ خط لکھ دیا۔ (مناقب لابن الجوزی ص ۲۹۵)

کسب معاش کے لیے کبھی وہ کپڑا بنتے تھے:

و کان ینسج احیانا و یبیع ماینسجه و یاکل منه ۔ (ابن حنبل ص ٦٠)

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں، کہ میں اور احمد بن حنبل یمن میں عبدالرزاق کے ساتھ ساتھ تھے، میں مکان کے بالائی حصہ میں رہتا تھا اور احمد نچلے حصہ میں، وہاں سے کوچ کیا، تو معلوم ہوا، کہ احمد کا زاد راہ ختم ہو چکا ہے، میں نے کچھ رقم پیش کی، انہوں نے اسے قبول نہیں کیا، میں نے کہا، چاہے قرض لے لیجیے، خواہ یوں ہی، لیکن انہوں نے اس سے بھی انکار کیا، پھر میں نے دیکھا، کہ وہ بیٹھے سوت کات رہے ہیں، پھر اسے جا کر بیچ آئے اور اپنا کام چلایا۔ (ایضا)

علم و فضل کا مینارہ نور کسب حلال کے لیے کسی بھی کام میں ہتک محسوس نہیں کرتا، بشرطیکہ کام کی نوعیت جائز اور حلال ہو، حیات انسانی کا یہی قانون سربلندی کا ضامن ہے، وہ نزاہت نفس کو ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے اور اس اصول پر سختی سے کاربند تھے، کہ وہ کوئی ایسا مال نہیں لیں گے، جو حلال نہ ہو، انسان کا شرف ذاتی اس کے نفس کی نزاہت پر مبنی ہوتا ہے۔

سوم:۔ کبھی شدید ضرورت کے وقت قرض بھی اس صورت میں لے لیا کرتے تھے، کہ انہیں اس بات کا یقین ہو، کہ اس کی ادائیگی جلد ممکن ہو سکے گی اور یہ بھی اعتماد ہو، کہ قرض دینے والا عطیہ نہیں، بلکہ قرض دے رہا ہے، اس لیے حالت سفر میں کبھی قرض نہیں لیتے، کیوں کہ سفر میں اس کی ادائیگی کے امکانات یقینی نہیں ہوتے۔

ایک مرتبہ امام صاحب نے اپنے ہم عصر سے دو تین سو درہم قرض لیے، جن کے مال کے بارے میں یہ بات طے تھی، کہ وہ مال حلال ہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ یہ رقم واپس دینے کے لیے اس کے پاس گئے، اس نے کہا:

یا ابا عبداللہ ما دفعتها و انا انوی ان اخذها منك فقال و انا ما اخذتها الا و انا انوی ان اردها

عليك ۔

اے ابو عبد اللہ! میں نے جب یہ رقم تمہیں دی تھی، تو یہ نیت کر لی تھی، کہ واپس نہیں لوں گا، امام احمد نے جواب دیا، میں نے جب یہ رقم لی تھی، تو نیت کر لی تھی، کہ اسے ضرور واپس کر کے رہوں گا۔

(حلیۃ الاولیاء ج۹ ص ۱۷۵ مناقب لابن الجوزی ص ۲۹۷)

روایت ہے، کہ ایک مرتبہ ایک قرض کے سلسلہ میں انہوں نے سونے کی کوئی چیز رہن رکھ دی، جب ان کے پاس روپے کا بندوبست ہو گیا، تو وہ دائن کے پاس گئے، کہ اسے رقم دے کر اپنی چیز واپس لے لیں، دائن جب رہن شدہ چیز واپس دینے لگا تو اسے کچھ شبہ پیدا ہو گیا، کیوں کہ اس کے پاس ویسی ہی ایک اور چیز بھی رہن تھی، اس نے دونوں چیزیں امام احمد کی طرف بڑھا دیں، اور کہا، ان میں سے جو آپ کی ہو لے لیجیے، لیکن امام احمد کی حد درجہ احتیاط پسندی کا یہ عالم تھا، کہ انہوں نے دونوں چیزیں واپس کر دیں اور کچھ نہیں لیا، یعنی انہوں نے اپنے ایک جائز حق سے دست بردار ہونا اور نقصان اٹھانا گوارا کر لیا لیکن مشکوک و مشتبہ چیز لینا گوارہ نہ کیا اور قرض ادا کر کے چلے آئے۔ (ابن حنبل ص ۶۱)

خلفا کے ہدایا سے انکار

امام احمد اپنی غیور طبیعت اور زاہدانہ استغنا کی وجہ سے عوام تو عوام اہل صفا بزرگوں کے ہدیوں اور اعانتوں کو قبول کرنے سے ہمیشہ محترز رہے، وہ اپنی موروثی ملکیت کی قلیل آمدنی اور بسا اوقات محنت و مزدوری سے حاصل کی ہوئی رقم پر قناعت و توکل کی سادہ و بے تکلف زندگی کو عیش و تنعم کی فراوانی پر ہمیشہ ترجیح دیتے رہے، ان کا مسلک تقویٰ یہ تھا، کہ ضروریات زندگی کی تکمیل کسب حلال سے کی جائے، حرام و ناجائز مال تو درکنار مشتبہ اور مشکوک مال کی ذرا سی آمیزش بھی ان کی شان زہد و اتقا کے منافی تھی، وہ بڑی سختی کے ساتھ اس بات کا لحاظ رکھتے، کہ کوئی ایسا مال اپنے ہاتھ میں نہ آنے دیں، جس کی حلت مشکوک ہو یا اس میں ذرا بھی خبث اور حرمت کا شائبہ ہو۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو ایسی غیرت و خودداری عطا فرمائی تھی، کہ وہ کسی بھی حال میں کسی کی داد و دہش کا احسان مند ہونا گوارہ نہ کرتے تھے، خواہ وہ اساتذہ ہوں یا شاگرد یا عوام میں سے کوئی ہو۔

صالح بن احمد کا بیان ہے، کہ بغداد کے ایک صراف کا لڑکا والد کی مجلس درس میں شریک ہوتا تھا، ایک دن آپ نے اس کو ایک درہم کاغذ خریدنے کے لیے دیا، اس نے کاغذ خرید کر اس میں پانچ سو دینار لپیٹ کر پیش کر دیے، آپ نے گھر والوں سے کاغذ کے بارے میں دریافت کیا، تو بتایا گیا، کہ کوئی بیاض آئی ہے، جب آپ نے اس کو کھولا تو دینار نظر آئے، آپ نے لڑکے کے سامنے کاغذ اور تمام دینار رکھ کر کہا، کہ ان کو لے جاؤ، جوان کہتا رہا، کہ کاغذ تو آپ کی رقم سے خریدا گیا ہے، مگر آپ نے اسے بھی لینے سے انکار کر دیا۔ (ابن عساکر ج۲ ص ۳۸/۳۹)

امام صاحب خوشحالی کی زندگی پر فقر و فاقہ کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے، اسی لیے اپنی قلیل معیشت ہی پر اکتفا کرتے،

زاہدوں کا یہی شعار اور عابدوں کا یہی کردار ہوتا ہے۔

رمادی کہتے ہیں، میں نے عبد الرزاق کو سنا، انہوں نے احمد بن حنبل کا ذکر کیا، تو آنکھیں چھلک پڑیں، فرمایا، احمد میرے یہاں آئے، مجھے معلوم ہوا، کہ ان کا توشہ ختم ہو چکا ہے، تو میں نے دس دینار لیے اور دروازے کے پیچھے ان کو کھڑا کیا، جب میرے اور ان کے علاوہ کوئی اور نہ رہا، تو میں نے کہا، میرے پاس دینار اکٹھا نہیں ہوتے، اس وقت میں نے عورتوں کے پاس یہ دینار پائے ہیں، تو انہیں آپ لے لیں، مجھے امید ہے، کہ ہمارے پاس کچھ جمع ہونے تک یہ خرچ نہ ہوگا، احمد مسکرائے اور کہا ”یا ابابکر لو قبلت شیئا من الناس قبلت منك“ اے ابو بکر! اگر میں لوگوں سے کچھ قبول کرتا تو آپ سے بھی یہ ہدیہ قبول کر لیتا اور انہوں نے قبول نہ کیا۔ (صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۵۱۹)

علما سے قبول نذر میں جب یہ احتیاط تھی، تو وہ خلفا اور امرا کی اعانتوں کو کیسے قبول کر لیتے؟ امام صاحب اگر دوسرے علما ومشائخ کی طرح سلطانی ہدیے قبول کر لیتے تو کوئی گناہ نہ تھا، کیوں کہ بیت المال کا مصرف مصالح امت ہے، حضرت امام نے اپنی پوری زندگی تحصیل واشاعت علم میں بسر کی، مصالح دینی میں علما ومشائخ کی اعانت بھی شامل ہے۔

امام صاحب کی زندگی کا ایک روشن باب یہ بھی ہے، کہ انہوں نے خلفا کا دیا ہوا کوئی منصب اور ان کا بخشا ہوا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا، بلکہ اس مسلک پر ان کی سختی کا عالم یہ تھا، کہ وہ ایسے لوگوں کا مال قبول کرنے سے بھی انکار کرتے تھے، جنہوں نے کبھی اور کسی وقت بھی سلطان وقت کے مال سے فائدہ اٹھایا ہو۔

امام احمد ان شاہی عطیوں کو بھی قبول نہیں کرتے تھے، جو ان کی ذات سے مخصوص نہیں ہوتے، بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عام ہوتے تھے۔

مامون الرشید نے اس زمانہ میں جب وہ علما ومشائخ سے بیزار نہیں ہوا تھا، ایک خطیر رقم ایک بزرگ کے پاس بھیجی کہ وہ اسے علمائے حدیث کے درمیان تقسیم کر دیں، اس طرح ان کی مدد معاش ہو جائے، چنانچہ تمام ضرورت مند علما نے حسب ضرورت روپے لے لیے، صرف امام احمد بن حنبل نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ (حلیۃ الاولیاء ج ۹ ص ۱۸۱)

مامون کے آخر دور سے عہد معتصم تک امام صاحب کو قید وبند اور کوڑوں کی مار کی شدتیں جھیلنی پڑیں، واثق باللہ کے زمانہ میں بھی تقریباً نظر بندی کی زندگی گزاری، مگر متوکل کا زمانہ آیا، تو ان کی ہر قسم کی جسمانی آزمائشوں کا دور ختم ہو گیا، متوکل آپ کا عقیدت کیش بن گیا اور اس نے انعام واکرام کی بارش کرنی چاہی، قدموں کے نیچے درہم ودینار کا ڈھیر لگانا چاہا، لیکن امام صاحب نے اصرار کے باوجود ہمیشہ انکار کیا، انہوں نے ایک آن کے لیے بھی شاہی رقوم کو اپنے ہاتھ میں لے کر حاجت مندوں میں تقسیم کرنا بھی گوارہ نہیں کیا، ان کا خیال تھا، کہ یہ عمل بھی اہل نزاہت کے لیے جائز نہیں، کبھی دراندازوں کے دفع شر کے لیے ایسی رقم رد نہیں فرمائی، تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا اور بالا ہی بالا غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرا دی۔

جب متوکل کی نظر میں امام صاحب کی عزیمت مآب شخصیت کا وقار قائم ہو گیا، تو انہوں نے خلیفہ کی طرف اہل حاجت

میں تقسیم کے لیے آنے والی رقموں کو بھی اپنی معرفت تقسیم کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ ایک مرتبہ متوکل نے ایک ہزار دینار ان کی خدمت میں بھیجے تاکہ اس رقم کو وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیں، تو انہوں نے فرمایا:

انا فی البیت منقطع عن الناس وقد اعطانی امیرالمومنین بما اکره وهذا ما اکره ۔

(ابن حنبل ص ۶۴)

میں اپنے گھر میں لوگوں سے منقطع ہو کر بیٹھ گیا ہوں اور امیر المومنین نے مجھے اجازت دے رکھی ہے، جو بات مجھے اچھی نہ لگے وہ نہ کروں اور اس رقم کو قبول کرنا میں ناپسند کرتا ہوں۔

زہد و اتقا کا پیکر جمیل اس مال میں بھی ہاتھ لگانا گوارہ نہ کرتا تھا، جس میں شاہی عطیوں کی آمیزش ہوتی، امام صاحب کے بعض فرزند اور قرابت دار سرکاری وظائف قبول کر لیا کرتے تھے، امام صاحب نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ نہ مانے امام صاحب ان سے فرمایا کرتے تھے:

لم تاخذونه والثغور معطلة غیر مشحونة والفیئ غیر مقسوم بین اهله ۔(ایضا)

تم یہ مال کیوں لیتے ہو، جب کہ سرحدیں معطل اور غیر آباد ہیں اور فے مستحق لوگوں میں تقسیم نہیں ہو پاتی۔

ان حضرات نے شاہی ہدایا اور وظائف لینے سے احتراز نہ کیا، تو امام صاحب نے ان سے راہ و رسم منقطع کر لی، حتی کہ ان کے تنور میں جو روٹی پک کر آتی تھی، اسے بھی ہاتھ نہ لگاتے تھے، ایک مرتبہ انہیں معلوم ہوا، کہ دسترخوان پر جو روٹی رکھی گئی ہے، ان کے ایک صاحبزادے کے تنور سے پک کر آئی ہے، جو شاہی ہدیہ قبول کرتے ہیں، تو انہوں نے اس کے کھانے سے انکار کر دیا۔

امام صاحب کے طرز عمل سے ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ وہ شاہی ہدایا کو حرام سمجھتے تھے، ایسی بات نہیں، بلکہ وہ اسے مشکوک سمجھتے تھے، لیکن امام صاحب کے لیے مشکوک و مشتبہ مال قبول کرنا نزاہت نفس کے منافی تھا، وہ اسی مال کو تصرف میں لانا گوارہ کرتے تھے، جس میں حرمت کا شائبہ تک نہ ہو ایک موقع پر آپ نے اپنے فرزند سے خلفا کے ہدیوں کے بارے میں فرمایا:

یا بنی لیس هو عندی بحرام ولکنی تنزهت عنه ۔(ایضا ص ۶۵)

بیٹے میں خلیفہ کے عطیہ کو حرام نہیں سمجھتا لیکن اسے قبول کرنا نزاہت نفس کے خلاف سمجھتا ہوں۔

امام احمد کسی حال میں کسی کا ممنون احسان ہونا گوارہ نہ کرتے تھے، ان کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں:

کنت اسمع ابی کثیرا یقول فی دبر الصلاة اللهم کما صنت وجهی عن السجود لغیرک صنه عن المسالة لغیرک ۔(صفة الصفوة ج ۲ ص ۵۲۳)

میں اپنے والد کو اکثر نماز کے بعد یہ دعا کرتے ہوئے سنتا، اے اللہ! جس طرح تو نے میرے چہرے کو اپنے غیر کے سجدہ کرنے سے محفوظ رکھا تو اسے غیر کے سامنے سوال کرنے سے بھی محفوظ رکھ۔

صبر وتحمل

امام احمد کی ذات میں خداوند تعالیٰ نے صبر وتحمل اور قوت برداشت کا ایسا بے نظیر ملکہ ودیعت کیا تھا، جس کی مثال صدیوں میں کبھی کبھی نظر آتی ہے، یہ وصف تھا، جو امام احمد کی زندگی اور ان کے تجدیدی کارناموں کی اساس وبنیاد تھا اور اسی کے گرد ان کے مکارم اخلاق کی گردش تھی اور یہ صفت مبنی تھی، قوت ارادی، صدق وعزیمت اور عالی ہمتی پر جس کے باعث انہوں نے اپنے جسم ناتواں کو آماجگاہ مصائب بنانے سے کبھی گریز نہیں کیا اور یہ صفت ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھی، جس نے ان کی طبیعت میں فقر، جود وسخا، عفت وعصمت، اذیتوں کے برداشت کا حوصلہ اور عفو ودرگزر کا مادہ پیدا کر دیا تھا، یہی چیز تھی، جس نے تنگ حالی کے باوجود طلب علم کی راہ میں صحرا، وادی، میدان اور نشیب وفراز کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کرنے کی قوت وہمت پیدا کر دی تھی، سواری نہ ہونے کی صورت میں پاپیادہ سفر کرتے، طلب حدیث کے سلسلے میں بعض مقامات کے سفر کئی بار کیے، راستے میں فاقوں کی نوبت آئی تو سد رمق کے لیے حمالی کا کام کیا کرتے۔

ابتلا وآزمائش کا دور آیا، تو مامون سے لے کر متوکل تک آزمائشوں کی آماجگاہ بنے رہے، طوق وسلاسل، سجن وزنداں، کوڑوں کی ضرب پوری ثبات قدمی کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور ایک مومن کی شان کے ساتھ تمام دکھوں اور تکلیفوں کا سامنا کرتے تھے، دست ظلم شل ہو گیا، لیکن صبر واستقامت کی یہ چٹان اپنی جگہ پر مستقیم رہی، انہوں نے مصائب کے طوفان جھیل لیے، مگر قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہیں کیا، ابتلا وآزمائش کی سختیاں ختم ہوئیں اور آپ کی عزیمت مآب علمی شخصیت کا اعتراف ایوان خلافت میں کیا جانے لگا، خلیفہ متوکل ماضی کے مظالم کی تلافی، انعام واکرام اور اعزاز واحترام سے کرنا چاہتا تھا، قدموں میں زر وجواہر کے ڈھیر اور عطایا وتحائف کی بارش ہونے لگی، امام احمد کی معیشت اور اولاد واحفاد کی حاجتمندی متقاضی تھی، کہ دولت دنیا سے کھل کر فائدہ حاصل کیا جائے، لیکن امام صاحب نے اپنی قوت ارادی، صدق وعزیمت کی بدولت پہلے سے بھی زیادہ کٹھن دور ابتلا کو برداشت کر لیا، اپنی نزاہت نفس کی خاطر ہر عطیہ انہوں نے نہایت سیر چشمی کے ساتھ واپس کر دیا، انہوں نے اپنے آپ کو صرف آستانہ الٰہی کا گدا بنائے رکھا اور بندگان خدا کے مال وزر سے ہرگز سروکار نہ رکھا، ان کا یہ جہاد پہلے جہاد سے کسی طرح کم نہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل پیرا رہے "الید العلیا خیر من الید السفلی"۔ (اتحاف المہرۃ ج۴ص۳۲۲)

امام صاحب کا صبر صبر جمیل تھا، یہ ایسا صبر ہے، جو شکوہ وشکایت، صدمہ وقلق، رنج والم کے اظہار سے یکسر خالی ہے، ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے، لیکن نہ انہوں نے کبھی زبان کو حرف شکایت سے آلودہ کیا، نہ انہوں نے بے قراری وبے تابی ظاہر کی، بڑی ثابت قدمی کے ساتھ ہر مصیبت جھیلی، نہ طیش وغضب، نہ التجائے رحم وکرم اور نہ ظالم کے لیے ہلاکت کی دعا۔

آزمائش کے موقع پر ان سے کہا گیا، کہ ظالم کے لیے ہلاکت کی دعا کیجیے، تو فرمایا "لیس بصابر من دعا علی ظالم" وہ شخص صابر نہیں، جو ظالم کے لیے بددعا کرے۔ (مناقب لابن الجوزی ص۴۱۴)

بغوی کہتے ہیں، ابو عبد اللہ احمد بن حنبل کو ۲۲۸ھ کے اوائل میں سنا، وہ حضرت معاویہ کی سند سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

یہ حدیث بیان کر رہے تھے، سرکار نے فرمایا ''لم یبق من الدنیا الا بلاء و فتنة فاعدوا للبلاء صبرا '' دنیا میں فتنہ و بلا کے سوا کچھ باقی نہیں رہا، تو تم بلائیں جھیلنے کے لیے تیار رہو۔

امام احمد نے حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا ''اللهم رضینا اللهم رضینا'' (مناقب لابن الجوزی ص ۴۲۹)

توکل علی اللہ

امام احمد کی قوت صبر کا راز یہ تھا، کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کرتے تھے، اس عقیدے نے انہیں تمام آلام و شدائد کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلنے کا حوصلہ عطا کیا، اللہ پر اعتماد کلی ان کے دل میں راسخ ہو چکا تھا، لہٰذا ہر چیز آسان ہو گئی، شدائد و مصائب بھی آسان ہو گئے، آفات و نوائب بھی سہل معلوم ہونے لگے، زندگی کی زینت ہیچ معلوم ہونے لگی، اس کے مفاخر نظر سے گر گئے، متاع قلیل پر راضی ہو گئے۔

بیہقی کا بیان ہے، کہ آپ سے توکل کی تعریف پوچھی گئی، تو آپ نے فرمایا، جو غیر اللہ سے ہر قسم کی توقعات کو منقطع کر دے، آپ سے پوچھا گیا، اس پر کوئی دلیل بھی ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں! حضرت ابراہیم جب منجنیق سے آگ کی طرف پھینکے گئے تو جبرئیل نے زمین و آسمان کے درمیان آپ سے پوچھا، کہ آپ کو کوئی ضرورت بھی ہے؟ آپ نے فرمایا، ہے، لیکن تم سے نہیں، جبرئیل نے کہا، تو اسی سے کہیے جس سے کہنا چاہتے ہیں، آپ نے فرمایا میرے نزدیک وہ امر پسندیدہ ہے جو خدا کو پسند ہے۔

عفو و درگزر

اللہ پر اعتماد کے عقیدے نے امام احمد کے کردار کو بہت بلند کر دیا تھا اور عفو و درگزر کی بے نظیر صفت ان میں پیدا ہو گئی تھی، وہ ہر ظلم و جور اور اہانت کو برداشت کر لیتے، لیکن انتقام تو درکنار زبان پر حرف شکایت کبھی نہ لاتے اور اپنے دشمنوں کو ہمیشہ معاف کر دیا کرتے، چنانچہ ایک آدمی نے ان کی غیبت کی، پھر ان کے پاس آ کر عرض گزار ہوا، آپ نے فرمایا، میں تمہیں معاف کرتا ہوں، لیکن اب ایسی حرکت نہ کرنا ''انت فی حل ان لم تعد'' (ابن حنبل ص ۷۰)

خلق قرآن کے مسئلہ میں امام صاحب پر ظلم و ستم جبر و استبداد کے پہاڑ توڑے گئے، ہر ظلم و ستم کو حق کی راہ میں بڑی پامردی اور صبر کے ساتھ جھیل گئے، نہ رحم کی درخواست کی اور نہ کوڑوں کی ضرب میں اف تک کی، امام صاحب کی سیرت کا یہ کتنا روشن باب ہے، کہ انہوں نے اپنے تمام مخالفین اور اذیت رسانوں کو معاف فرما دیا، وہ کہا کرتے تھے، کہ میرے مارنے والوں کو جو مر چکے ہیں، میں نے معاف کر دیا، میں نے یہ آیت پڑھی ''فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ '' اور اس کی تفسیر دیکھی، تو حسن بصری کا یہ قول ملا، کہ قیامت کے دن تمام امتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے لائی جائیں گی اور ندا ہوگی، کہ جس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، کھڑا ہو جائے، اس وقت وہی آدمی کھڑا ہوگا، جس نے دنیا میں عفو و درگزر کیا، اس لیے میں نے اپنے مارنے والوں

میں سے جو فوت ہو گئے ہیں، ان کو معاف کر دیا، پھر کہا، کہ اس میں آدمی کا کیا نقصان ہے، کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کسی کو عذاب سے محفوظ رکھے، معتصم نے جس دن بابل یا عموریہ فتح کیا، امام صاحب نے کہا، کہ اس کو میں نے معاف کر دیا۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:

وجعل من آذاه فی حل الا اهل البدعة وكان يتلو فی ذلك قوله تعالیٰ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا الآية ويقول ما ذا ينفعك ان يعذب اخوك المسلم بسببك ؟ وقد قال تعالیٰ فمن عفا واصلح فاجره علی الله انه لا يحب الظالمين وينادی المنادی يوم القيامة ليقم من اجره علی الله فلا يقوم الا من عفا ۔

وفی صحيح المسلم عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم ثلاث اقسم عليهن ما نقص مال من صدقة وما زاد الله عبدا بعفو الا عزا ومن تواضع لله رفعه الله ۔

(تاريخ ابن كثير ج ۱۰ ص ۳۴۹)

احمد بن حنبل نے بدعتیوں کے علاوہ ہر اس شخص کو معاف کر دیا، جس نے آپ کو اذیت دی تھی، اور آپ اس آیت کریمہ کی تلاوت کرتے تھے ”اور چاہیے کہ وہ معاف کریں اور درگزر کریں“ اور وہ کہتے تھے، کہ تیری وجہ سے تیرے مسلم بھائی کو عذاب ہو تو تجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”پس جو معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، یقیناً وہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا ہے“ اور قیامت کے دن منادی ندا کرے گا، جس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، وہ کھڑا ہو جائے، تو صرف معاف کرنے والا ہی کھڑا ہو گا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں، صدقہ سے کوئی مال کم نہیں ہوتا اور عفو سے اللہ تعالیٰ عزت میں اضافہ فرماتا ہے اور جو شخص اللہ کے لیے تواضع کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے بلند کرے گا۔

زہد و تقویٰ

امام احمد دنیا اور اہل دنیا سے پرہیز کرتے رہے، حرص و ہوا سے ان کا دامن ہمیشہ بے غبار رہا، ان کے صبر و استغنا نے اعتماد و یقین کی ایسی فضا پیدا کر دی تھی، جس میں دنیا سے بے پروائی کے ساتھ زندگی کے لیل و نہار بسر کرتے تھے، انہوں نے قوت لایموت کی حد تک مال دنیا سے سروکار رکھا، جاہ و حشم، کثرت مال کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا، ارباب دنیا سے بے تعلقی ان کا شعار تھا، اس وصف میں اپنے تمام اقران و معاصرین سے آگے تھے خورد و نوش، لباس اور زندگی کے ہر معاملہ میں سادگی، کفایت شعاری اور زہد و تقویٰ پیش نظر رہتا تھا۔

علی بن مدینی کہتے ہیں:

قال لی احمد بن حنبل انی لاحب ان اصحبك الی مكة وما يمنعنی من ذاك الا انی اخاف ان املك او تملنی قال فلما ودعته قلت يا ابا عبدالله توصينی بشیء قال نعم الزم ال تقویٰ قلبك والزم الآخرة امامك ۔ (صفة الصفوة ج ۲ ص ۵۱۹)۔

مجھ سے احمد بن حنبل نے کہا، میں تمہارے ساتھ سفر مکہ کی خواہش ظاہر کرتا ہوں، مجھ کو اس سے کوئی چیز روک نہیں سکتی، مگر میں اندیشہ کرتا ہوں، کہ میں آپ سے بیزار ہو جاؤں، جب میں ان سے جدا ہونے لگا، میں نے کہا، اے ابوعبداللہ! مجھے آپ کوئی وصیت کریں گے؟ انہوں نے کہا، ہاں! دل سے تقویٰ اختیار کرو اور آخرت کو اپنے آگے رکھو!

ابوداؤد سجستانی کہتے ہیں:

كانت مجالسة احمد بن حنبل مجالسة الآخرة لا يذكر فيها شیء من امر الدنيا ما رايت احمد بن حنبل ذكر الدنيا قط ۔ (ایضا)

احمد بن حنبل کی مجلسوں میں آخرت کا تذکرہ ہوتا، دنیا کے معاملات ہرگز بیان نہیں ہوتے، میں نے احمد بن حنبل کو کبھی دنیا کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا۔

امام شافعی کا ارشاد ہے:

خرجت من بغداد وما خلفت بها احدا اتقیٰ ولا اورع ولا افقه اظنه قال ولا اعلم من احمد بن حنبل ۔ (تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۹)

میں بغداد سے نکلا، تو میں نے امام احمد بن حنبل سے بڑھ کر متقی، پرہیز گار، فقیہ کسی کو نہیں چھوڑا اور کہا، امام احمد سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔

ابوحفص عمر بن سلیمان المودب امام احمد کے بارے میں کہتے ہیں، میں نے احمد بن حنبل کے ساتھ تراویح پڑھی، اور ابن عمیر نماز پڑھا رہے تھے، جب وتر پڑھی، تو اپنے ہاتھوں کو سینے تک اٹھایا، میں نے ان سے کوئی دعا نہیں سنی اور نہ مسجد والوں میں سے کسی سے، ان کے زینے پر ایک چراغ تھا، اس میں نہ قندیل تھی، نہ ان کے پاس کوئی چٹائی تھی اور نہ کوئی خوشبو۔
(مناقب لابن الجوزی ص ۳۱۰)

ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں:

احمد بن حنبل صبر علی الفقر سبعين سنة (ایضا)

امام احمد نے ستر سال تک فقر پر صبر کیا۔

صالح بن احمد بن حنبل کہتے ہیں، میں نے اپنے والد سے کہا، کہ احمد دورقی نے آپ کو ایک ہزار دیے؟ تو فرمایا، ”یا بنی!

وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى'' اے بیٹے! تیرے رب کا رزق بہتر اور دیرپا ہے۔ (ایضاً ص ۳۱۱)

نیز انہیں سے روایت ہے، میرے والد نے مجھ سے فرمایا، تیری ماں تنگ دستی میں باریک دھاگے کاتتی اور اسے کم و بیش دو درہم میں فروخت کرتی، تو اس پر ہماری گزر اوقات ہوتی۔ (ایضاً)

ابو عبداللہ کہتے ہیں، میں نے اپنی باندی سے تکیہ اور مسند لیا، دروازے پر بچھا دیا، تو امام احمد باہر تشریف لائے، ان کے ساتھ کتابیں اور دوات تھی، انہوں نے چٹائی اور مسند کی طرف دیکھا، فرمایا، یہ کیا ہے؟ میں نے کہا، یہ آپ کے بیٹھنے کے لیے ہے، تو فرمایا، ''ارفعه الزهد لايحسن الا بالزهد'' 'اسے تم اٹھا لو، زہد زہد ہی سے نکھرتا ہے، میں نے اسے اٹھا لیا اور امام زمین پر بیٹھ گئے۔ (ایضاً)

عہدہ قضا سے انکار

امام احمد نے شاہی تحائف و ہدایا سے ہمیشہ اجتناب کیا، ساتھ ہی انہوں نے پوری زندگی سرکاری عہدوں اور مناصب سے پرہیز کیا، امام صاحب طلب حدیث کے سلسلے میں امام عبدالرزاق بن ہمام کی خدمت میں یمن کے سفر کا ارادہ رکھتے تھے، امام شافعی جوان دنوں بغداد میں مقیم تھے، جن کی بارگاہ میں امام احمد روزانہ نیازمندی کے ساتھ حاضر ہوا کرتے تھے، امام شافعی کو آپ کی فلاکت و عسرت کا خوب اندازہ تھا، انہیں دنوں خلیفہ امین الرشید نے امام شافعی کو یمن کے لیے ایک قاضی کے انتخاب پر مامور کیا، انہوں نے محسوس کیا، کہ اگر احمد کو یمن کا قاضی بنا دیا جائے تو ان کی یہ دشواری ختم ہو جائے گی، بغیر کسی زحمت اور مصیبت سے دوچار ہوئے، وہ عبدالرزاق سے حدیث کی سماعت کر سکیں گے، یہ سوچ کر انہوں نے احمد کو اس منصب کی پیش کش کی، لیکن انہوں نے انکار کر دیا، دوبارہ پھر اصرار کے ساتھ یہ پیش کش دہرائی، اس کے جواب میں امام صاحب نے امام شافعی سے کہا:

> **یا ابا عبدالله ان سمعت منك هذا ثانيا لم ترنی عندك** ۔(مناقب لابن الجوزی ص ۲۷۱)
>
> اے ابو عبداللہ! اگر میں نے یہ پیش کش آپ سے پھر دوبارہ سنی تو آپ مجھے کبھی بھی اپنے حضور میں حاضر ہوتے نہیں دیکھیں گے۔

امام احمد نے اپنے استاذ کی یہ معزز اور مایہ افتخار پیش کش مسترد کر دی، اس لیے کہ وہ اس عزم پر سختی کے ساتھ قائم تھے، کہ اپنے آپ کو صرف علم کے لیے وقف رکھیں، دوسری چیزوں میں اپنا دامن نہ الجھائیں، نیز یہ کہ اپنے پاس کسی ایسے مال کو نہ پھٹکنے دیں جس میں حرمت کا ذرا سا بھی شائبہ ہو، وہ علم کی راہ میں اذیت و مشقت کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کے قائل تھے، امام اعظم کی طرح منصب قضا قبول کرنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

ذوق عبادت

امام احمد علم و فضل کے ساتھ عبادت و ریاضت میں بھی کامل انہماک رکھتے تھے، ذوق عبادت کے لیے وہ بچپن ہی سے

مشہور تھے، ورع وتقویٰ، عبادت وریاضت ان کا شعار حیات تھا، نوافل کی کثرت، قرآن حکیم کی تلاوت انتہائی سوز واخلاص کے ساتھ کرتے، صاحبزادے عبداللہ بن احمد ارشاد فرماتے ہیں:

> **كان ابى اصبر الناس على الوحدة لم يره احد الا فى مسجد او حضور جنازة او عيادة مريض و كان يكره المشى فى الاسواق .**
>
> **وعنه قال كان ابى يصلى فى كل يوم وليلة ثلاث مائة ركعة فلما مرض من تلك الاسواط اضعفته فكان يصلى فى كل يوم وليلة مائة وخمسين ركعة وقد كان قرب من الثمانين وكان يقرأ فى كل يوم سبعا يختم سبعة ايام وكانت له ختمة فى كل سبع ليال سوى صلاة النهار وكان ساعة يصلى عشاء الآخرة ينام نومة خفيفة ثم يقوم الى الصباح يصلى ويدعو وحج ابى خمس حجات ثلاث حجج ماشيا واثنتين راكبا وانفق فى بعض حجاته عشرين درهما .** (صفة الصفوة ج ۲ ص ۵۲۳)

میرے والد لوگوں میں سب سے زیادہ صبر کا مادہ رکھتے تھے، آپ کو کوئی شخص مسجد یا جنازے میں شرکت یا مریض کی عیادت کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھ سکتا تھا، اور آپ بازاروں میں چلنا پھرنا ناپسند کرتے تھے۔

عبداللہ ہی کا بیان ہے، میرے باپ روزانہ رات دن میں تین سو رکعت نفل نماز پڑھتے تھے، درہ زنی کے بعد بیمار ہوگئے رات دن میں ڈیڑھ سو رکعت پڑھتے تھے، اس وقت ان کی عمر اسی سال کے قریب تھی، روزانہ ساتواں حصہ قرآن پڑھتے تھے، عشا کے بعد کچھ دیر سو کر صبح تک نماز میں مشغول رہتے تھے میرے باپ نے پانچ حج کیے، تین حج پیدل اور دو حج سواری پر ایک مرتبہ حج میں صرف بیس درہم خرچ کیے۔

ابوبکر مروزی کہتے ہیں، ایک بار احمد بن حنبل نے کہا، کہ بعض لوگوں نے سفر حج میں مکہ سے بغداد تک صرف چودہ درہم خرچ کیے، پوچھا گیا، وہ کون تھا؟ کہا، میں تھا۔

امام احمد کا ذوق عبادت اتنا بڑھا ہوا تھا، کہ آپ صوم وصال رکھا کرتے تھے، امام شعرانی لکھتے ہیں، امام احمد بن حنبل ہر تین دن کے بعد کھجور اور ستو سے روزہ افطار کرتے۔ (طبقات شعرانی ص ۱۴۳)

عشق رسول

امام احمد کے مکارم اخلاق کا سرچشمہ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ عشق ومحبت کا پاکیزہ رویہ تھا، عقیدت وارادت کے اسی داعیہ نے انہیں پوری زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وسنن کی جمع وترتیب اور اس کی اشاعت میں مصروف رکھا، انہوں نے سنت رسول کے سانچے میں اپنی زندگی ڈھال لی تھی، انہیں رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلقات سے بھی حددرجہ والہانہ شیفتگی تھی، آپ کے پاس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے موے مبارک تھے، انہیں بڑی

حفاظت سے رکھتے۔

صاحبزادے عبداللہ بیان کرتے ہیں، میں نے والد کو دیکھا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موے مبارک منہ سے لگاتے بوسہ دیتے اور دونوں آنکھوں پر رکھتے اور اس کو پانی میں ڈبو کر پیتے اور شفا حاصل کرتے تھے۔

جب معتصم کے دربار میں درہ زنی کے لیے آپ کی قمیص اتاری گئی، اس وقت ان کی آستین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موے مبارک تھے، تو اسحاق بن ابراہیم ادھر متوجہ ہوا، اے قیدی! تیری قمیص کی آستین میں کیا ہے؟ جواب دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موے مبارک، بعض لوگ میری طرف بڑھے اور قمیص کو چاک کرنا چاہا تو معتصم نے ان سے کہا، قمیص نہ پھاڑو، قمیص اتاری گئی، امام صاحب کہتے ہیں، مجھے ڈر تھا، کہ کہیں قمیص پھاڑ دی جائے اور موئے مبارک کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔ (تاریخ ذہبی ج ا ص ۱۰۷)

غذا، لباس اور حلیہ

امام احمد نے غذا قوت لایموت ہی کی مقدار استعمال کی، اس میں بھی حد درجہ سادگی پسند فرماتے تھے، ان کے دسترخوان پر خورد و نوش کی نفیس اشیا ہرگز نہ ہوتی تھیں، عام طور پر روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو کر استعمال کیا کرتے تھے، صاحبزادے صالح کا بیان ہے:

> ربما رايت ابى ياخذ الكسر فينفض الغبار عنها ثم يصيرها فى قصعة ثم يصب عليها ماء حتى تبتل ثم ياكلها بالملح وما رايته قط اشترى رمانا و لا سفرجلا ولا شيئا من الفاكهة الا ان يكون يشترى بطيخة فياكلها بخبز او عنبا او تمرا فاما غير ذلك فما رايته قط اشتراه وربما خبز له فيجعل في فخارة عدسا وشحما وتمرات شهريز فيخص الصبيان بقصعة فيصوت ببعضهم فيدفعه اليهم فيضحكون ولا ياكلون وكان كثيرا ما ياتدم بالخل كان يشترى له شحم بدرهم فكان ياكل منه شهرا فلما قدم من عندالمتوكل ادمن الصوم وجعل لا ياكل الدسم فتوهمت انه كان جعل على نفسه ان سلم ان يفعل ذلك ۔

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۵۲۱)

میں والد صاحب کو بسا اوقات دیکھتا تھا، کہ روٹی کے ٹکڑے لے کر غبار صاف کرتے اور پیالے میں رکھ کر پانی سے تر کرتے اور اس کے بعد نمک سے کھاتے تھے، میں نے ان کو کبھی انار، بہی اور کسی قسم کا کوئی پھل خریدتے ہوئے نہیں دیکھا، البتہ تربوز، انگور اور کھجور خرید کر روٹی سے کھایا کرتے تھے، اور اس کے علاوہ میں نے ان کو کبھی دوسری چیز خریدتے ہوئے نہیں دیکھا، بسا اوقات آپ کے لیے روٹی بنائی جاتی اور ہانڈی میں دال، چربی، کھجور رکھ لیتے، پس ایک پیالا بچوں کے لیے خاص کر دیتے، بعض بچوں کو آواز دیتے اور انہیں پیالا دے

دیتے، تو بچے ہنتے اور نہیں کھاتے، آپ اکثر سرکہ کا شوربا بناتے، آپ کے لیے ایک درہم کی چربی خریدی جاتی، آپ اسے ایک مہینہ کھاتے، جب آپ متوکل کے پاس سے آئے، تو مستقل روزہ رکھنے لگے اور روغن کھانا چھوڑ دیا، مجھے گمان ہوا، کہ انہوں نے اپنے اوپر یہ لازم کرلیا ہے، کہ وہ اگر زندہ رہے تو ایسا ہی کرتے رہیں گے۔

ابوبکر مروزی کہتے ہیں:

سمعت ابا عبداللہ یقول انما ھو طعام دون طعام و لباس دون لباس و انھا ایام قلائل وقال سمعت ابا عبداللہ یقول اسر ایامی الی یوم اصبح و لیس عندی شئ۔ (ایضا)

میں نے ابوعبداللہ کو سنا، وہ کہتے ہیں، کہ ان کا کھانا اور کپڑا معمولی ہوتا تھا، بے شک زندگی کے ایام مختصر ہیں، اور کہا، میں نے ابوعبداللہ کو سنا، وہ کہتے ہیں، میرے نزدیک سب سے خوش حالی کا وہ دن ہے، جس صبح میرے پاس کچھ بھی نہ ہو۔

امام احمد سادہ لباس استعمال کرتے، ایسے لباس سے پرہیز کرتے، جس سے کبر اور تصنع ظاہر ہو اور جس سے دینی اور علمی وقار مجروح ہو۔

محمد بن عباس بن ولید نحوی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، کہ میں نے امام احمد بن حنبل کو دیکھا ہے، نہایت خوبصورت، میانہ قد تھے، حنا کا خضاب استعمال کرتے تھے، جو بہت زیادہ سرخ نہیں ہوتا تھا، ان کی ڈاڑھی میں چند بال کالے تھے، میں نے ان کے کپڑے دیکھے ہیں جو موٹے اور سفید تھے، عمامہ بھی باندھتے تھے، جسم پر چادر بھی ہوا کرتی تھی۔

(تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱)

آپ کے کپڑے عام طور پر سفید روئی کے ہوتے تھے نہ بہت زیادہ موٹے، نہ بہت زیادہ باریک، البتہ آخری دور میں جب اپنے لڑکوں کے خرچ سے بے نیاز ہو گئے تو اپنی آمدنی سے اچھے لباس استعمال کرنے لگے۔

احمد بن محمد تستری کہتے ہیں:

ذکروا لی ان احمد بن حنبل اتی علیه ثلاثة ایام ما کان طعم فیھا فبعث الی صدیق له فاستقرض شیئا من الدقیق فعرفوا فی البیت شدة حاجته الی الطعام فخبزوه عاجلا فلما وضع بین یدیه قال کیف خبزتم ھذا بسرعة؟ قیل له کان التنور فی دار صالح ابنه مسجورا فخبزنا عاجلا فقال ارفعوا و لم یاکل و امر بسد بابه الی دار صالح۔

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۵۲۲)

لوگوں نے مجھ سے بیان کیا، کہ ایک دفعہ آپ نے تین دن تک کھانے کی کوئی چیز نہ پائی، حتی کہ آپ نے اپنے

> ایک ساتھی کے پاس پیغام بھیجا اور آٹا قرض لیا، تو اس کے اہل کو معلوم ہوا، کہ آپ کو کھانے کی حاجت ہے، پس انہوں نے جلدی سے آٹا گوندھا اور سرعت کے ساتھ آپ کے لیے روٹی پکائی، آپ نے پوچھا، یہ عجلت کیسی ہے؟ تم نے روٹی کیسے پکائی؟ انہوں نے کہا، ہم نے صالح کے گھر کے تنور کو گرم پایا تو اس میں ہم نے آپ کے لیے روٹی پکائی، آپ نے فرمایا، روٹی اٹھالو اور آپ نے اسے نہ کھایا، اور صالح کے گھر کی طرف آپ کا جو دروازہ کھلتا تھا، اسے بند کرنے کا حکم دے دیا آپ نے صاحبزادے صالح کے تنور میں پکی ہوئی روٹی اس لیے نہیں کھائی، کہ انہوں نے متوکل کا عطیہ قبول کر لیا تھا۔

خلیفہ متوکل نے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے پاس بلایا، سولہ دن تک خلیفہ کے یہاں مہمان رہے، صبح و شام انواع واقسام کے لذیذ کھانے اور ہر قسم کے عمدہ پھل خلیفہ کی طرف سے بھیجے جاتے، لیکن آپ نے انہیں کبھی ہاتھ نہ لگایا، بیشتر روزے رکھتے اور جب افطار کرنا ہوتا، ستو گھول کر پی لیتے، صاحبزادے عبداللہ کا بیان ہے، میرے والد فوج کے ساتھ خلیفہ کے پاس سولہ دن ٹھہرے اور ان دنوں میں آپ نے صرف ایک چوتھائی مد ستو کھائے، آپ ہر تین راتوں کے بعد مٹھی بھر ستو پھانک لیتے تھے، حتیٰ کہ آپ اپنے گھر واپس آ گئے، اور چھ ماہ بعد آپ کی صحت واپس آئی، میں نے دیکھا، کہ آپ کے آنکھیں دھنس گئی ہیں۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۱۰ واقعات ۲۴۱ھ)

خیر خواہی

امام احمد کے مکارم اخلاق کا ایک درخشاں باب امت اسلام کی خیر خواہی تھا، انہوں نے اپنے علم کے ذریعہ پوری زندگی ملت کی خیر خواہی کی، طالبان علوم نبوی کو حدیث وفقہ کے زیور سے آراستہ کیا، عام لوگوں کو علم وتقویٰ کی شاہراہ پر چلایا، لوگوں کو بدعت وضلالت سے باز رکھنے کی کوشش کی، ان کا دل ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے بھی بے چین رہتا، جو صراط مستقیم سے بھٹک گئے تھے، وہ ان کے لیے دعائیں فرمایا کرتے تھے۔

ابوالفضل تمیمی نے کہا، امام احمد سجدوں میں یہ دعا کرتے تھے، اے اللہ! اس امت کا جو شخص حق پر نہیں، اور وہ اپنے آپ کو حق پر خیال کرتا ہے، اسے حق کی طرف واپس لاتا کہ وہ اہل حق میں سے ہو جائے، اے اللہ! اگر تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی طرف سے فدیہ قبول کرے تو مجھے ان کا فدیہ بنا دے۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۱۰)

عبدالرحمن بن زاذان کا بیان ہے:

> عن ابی عیسیٰ عبدالرحمن بن زاذان قال صلینا و ابو عبداللہ احمد بن حنبل حاضر فسمعته یقول اللهم من کان علی هوی او علی رای وهو یظن انه علی الحق ولیس هو الحق فرده الی الحق حتی لا یضل من هذه الامة احد اللهم لا تشغل قلوبنا بما تکفلت لنا به ولا تجعلنا فی رزقك خوفا لغیرك ولا تمنعنا خیر ما عندك بشر ما عندنا ولا ترنا حیث

نهيتنا ولا تفقدنا من حيث امرتنا اعزنا ولا تذلنا اعزنا بالطاعة ولا تذلنا بالمعصية ۔

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۵۲۳)

ابوعیسیٰ عبدالرحمٰن بن زاذان سے روایت ہے، انہوں نے کہا، ہم نے نماز پڑھی اور ابوعبداللہ احمد بن حنبل بھی موجود تھے، میں نے سنا، وہ یہ دعا کر رہے تھے، اے اللہ! اس امت کا جو شخص حق پر نہیں ہے اور وہ اپنے آپ کو حق پر خیال کرتا ہے، اسے حق کی طرف واپس لاتا کہ وہ اہل حق میں سے ہو جائے امت مسلمہ کا کوئی شخص گمراہی پر نہ رہے، اے اللہ! تو ہمارے دلوں کو اس میں مشغول نہ کر جس کا تو ہمارے لیے کفیل ہوا، تو رزق میں مجھے اپنے غیر کا محتاج نہ بنا، ہمارے شر کی وجہ سے اپنے خیر کو نہ روک، نواہی سے بچنے اور اوامر کی تعمیل کی توفیق عطا فرما، ہمیں عزت بخش، ذلیل نہ کر، طاعت کے ذریعہ ہمیں عزت عطا فرما اور معصیت کے ذریعہ ہمیں ذلیل نہ فرما۔

قبولیتِ دعا

اللہ تبارک وتعالیٰ نے امام احمد کی زبان میں ایسی تاثیر عطا کی تھی، کہ جو دعا فرماتے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا، وہ عالم نبیل اور مستجاب الدعوات ولی تھے۔ علی بن ابی حرارہ کا بیان ہے:

كانت امي مقعدة نحو عشرين سنة فقالت لي يوما اذهب لي احمد بن حنبل فسله ان يدعو الله لي فمضيت فدققت عليه الباب فقال من هذا؟ فقلت رجل من اهل ذلك الجانب سالتني امي وهي زمنة مقعدة ان اسالك ان تدعوا الله لها فسمعت كلامه كلام رجل مغضب وقال نحن احوج ان تدعو الله لنا فوليت منصرفا فخرجت عجوز من داره فقالت انت الذى كلمت ابا عبدالله ؟ قلت نعم قالت قد تركته يدعوا الله لها قال فجئت من فورى الى البيت فدققت الباب فخرجت على رجليها تمشي حتى فتحت لي الباب وقالت قد وهب الله لي العافية ۔

(صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۵۲۳)

میری ماں بیس سال سے لنجی ہو کر بیٹھ گئی تھی، تو اس نے ایک دن مجھ سے کہا، تم احمد بن حنبل کے پاس جاؤ، ان سے درخواست کرو، کہ وہ میرے لیے دعا کریں، میں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا پوچھا کون؟ میں نے کہا اسی طرف کا ایک آدمی ہوں، میری ماں ایک زمانے سے لنجی ہے، اس نے مجھ سے کہا، ہے کہ میں آپ سے اس کے لیے دعا کی درخواست کروں، تو انہوں نے بے نیاز ہو کر فرمایا، ہم اس بات کے زیادہ محتاج ہیں، کہ وہ ہمارے لیے دعا کرے تو میں پلٹا پھر ایک بڑھیا گھر سے باہر آئی، تو اس نے کہا، ابوعبداللہ سے گفتگو کرنے والے تمہیں ہو؟

میں نے کہا، ہاں! اس نے کہا، میں نے ان کو اس حال میں چھوڑا ہے، کہ وہ اللہ سے دعا کر رہے ہیں، اس نے کہا، میں فوراً گھر آیا میں نے دروازے پر دستک دی، تو میری ماں اپنے پیروں پر چل کر آئی، دروازہ کھولا اور اس نے کہا، اللہ نے مجھے صحت وعافیت عطا کی۔

جب معتصم کے روبرو آپ کے جسم مبارک پر کوڑے برس رہے تھے، اس وقت آپ کا ازار بند ٹوٹ گیا اور پاجامہ نیچے سرکنے لگا، قریب تھا، کہ بے ستری ہو جاتی اس وقت امام احمد نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور ہونٹوں کو حرکت دی فوراً ہی ازار کا نیچے آنا رک گیا۔

وكانت تكة احمد حاشية ثوب فانقطعت فنزل السراويل الى عانته فرمى احمد طرفه الى السماء وحرك شفتيه فما كان باسرع ان بقي السراويل لم ينزل ۔ (ایضاً ص ۵۲۴)

◆ ◆ ◆

علم وفضل

علم وفضل کی طلب کا راستہ بہت پر خار اور پر پیچ ہوتا ہے، اس راہ پر چل کر منزل مقصود وہی پا سکتا ہے، جس کے اندر صبر واستقامت، قوت برداشت نقطہ عروج کو پہنچی ہوئی ہو، امام صاحب عزیمت واستقامت کا عظیم پیکر تھے، اس لیے انہوں نے اپنے جسم کو ابتلا وآزمائش اور سخت کوشی سے کبھی دور نہ رکھا، نہ آلام ومصائب کی شدت میں حرف شکایت زبان پر آیا، صبر وتحمل کی صفت ان کی عادت ثانیہ بن گئی تھیں، جس کے سبب ان میں فقر وجوع، عفت وعزت نفس، اذیتوں کی قوت برداشت کا ملکہ پیدا ہوگیا تھا، یہی چیز تھی، جس نے ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا کیا، کہ بغیر ضعف اور تھکن محسوس کیے ہوئے طلب علم کی راہ میں انہوں نے صحرا، وادی، میدان اور نشیب وفراز کی نہ جانے کتنی دشوار گزار منزلیں طے کرلیں، کبھی سواری پر اور کبھی پاپیادہ ایک شہر سے دوسرے شہر کی خاک چھانی، ضرورت ہوئی تو سختی کے وقت مزدوری کی، صنعت وحرفت کے جوہر دکھائے، یہ سب کچھ انہوں نے انبیا وصالحین کی اقتدا میں کیا، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا تو درکنار خوشی سے دینے والوں کے عطیے بھی قبول نہ کیے اور حدیث نبوی ''الید العلیا خیر من الیدالسفلی'' پر پوری زندگی عامل رہے۔

ان صفات عالیہ کے ساتھ فضل وکمال کی جس بلند منزل تک پہنچے، وہ اپنے معاصرین میں ممتاز ہی نہیں رہے، بلکہ اسلام کی علمی تاریخ کے بہت اہم علمی ستون بن گئے، جس منارہ نور سے آج تک روشنی حاصل کی جارہی ہے، امام احمد قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، عقائد وکلام، عربیت میں یدطولیٰ رکھتے تھے، وہ فارسی زبان سے بھی آشنا تھے، ان کی علمی شوکت اور فنی جلالت کا اعتراف بڑے بڑے علما ومحدثین نے کیا ہے۔

☆ **محمد بن ابراہیم بوشنجی:** ۔''مارایت اجمع فی کل شیٔ من احمد ولا اعقل وھو عندی افضل وافقه من الثوری'' میں نے احمد کے سوا کسی کو سارے علوم جمع کرنے والا نہیں دیکھا، اور نہ ان سے بڑا اعقل مند وہ میرے نزدیک شفیان ثوری سے افضل اور افقہ ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۱)

☆ **ابن حبان:** ۔''کان حافظا متقنا فقیھا ملازما للورع الخفی مواظبا علی العبادة الدائمة اغاث اللہ به امة محمد صلی اللہ علیه وسلم وذالك انه ثبت فی المحنة وبذل نفسه للہ حتی ضرب بالبساط للقتل فعصمه اللہ تعالیٰ عن الکفر وجعله علما یقتدی به وملجا یلجا

الیہ" حافظ متقن، فقیہ، ورع کو لازم پکڑنے والے عبادت پر ہمیشہ مواظبت کرنے والے تھے، ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کی مدد فرمائی، اس لیے کہ وہ مشکلات میں ثابت قدم اور اللہ کے لیے اپنی ذات کو قربان کرنے والے تھے، حتیٰ کہ ان کو کوڑوں سے مارا گیا تو اللہ نے انہیں اس آزمائش میں بھی کفر سے محفوظ رکھا اور انہیں ایسا علم (فقہ) عطا کیا، جس کی پیروی کی جاتی ہے اور وہ ایسے ملجا ہیں، جس کی پناہ حاصل کی جاتی ہے۔

(ایضا)

☆**ابراہیم حربی:۔** "رایت احمد کان اللہ قد جمع لہ علم الاولین والآخرین" میں نے امام احمد کو دیکھا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے اگلے پچھلے سب لوگوں کا علم ان کے سینہ میں جمع کر دیا ہے۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۱۷)

☆**ابوعبید:۔** "انتھی العلم الی اربعة افقھھم احمد" سب لوگوں کا علم چار آدمیوں کے پاس جمع ہو گیا اور ان میں سب سے بڑے فقیہ احمد ہیں۔ (ایضا ص ۱۸)

☆**ابوہمام سکونی:۔** "مارای احمد بن حنبل مثل نفسه" احمد بن حنبل نے اپنے جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔

(ایضا)

☆**ابن مدینی:۔** "لیس فی اصحابنا افضل منه" ہمارے اصحاب میں ان سے بڑا حافظ حدیث کوئی نہیں۔

(تہذیب ج ۱ ص ۶۴)

☆**امام عبدالرزاق:۔** "مارایت افقه من احمد بن حنبل ولا اورع..... ماقدم علینا یشبه احمد بن حنبل ...... ان یعیش ھذاالرجل یکن خلفا من العلماء یعنی اباعبداللہ" میں نے احمد بن حنبل سے بڑا فقیہ اور صاحب ورع انسان نہیں دیکھا ہے...... ہمارے پاس احمد بن حنبل جیسا کوئی شخص نہ آیا...... یہ شخص یعنی ابوعبداللہ اگر زندہ رہا تو علما اس کے پیچھے چلیں گے۔ (مناقب ابن جوزی ص ۹۶)

☆**وکیع بن جراح:۔** "ماقدم بالکوفة مثل ذالك الفتی" اس جوان کے مانند کوئی شخص کوفہ میں نہیں آیا۔

(ایضا ص ۹۹)

☆**عبدالرحمٰن بن مہدی:۔** "کاد ھذا الغلام ان یکون امام فی بطن امه یعنی احمد بن حنبل" یہ لڑکا ماں کے پیٹ ہی سے امام ہے۔

☆**یحییٰ بن سعید القطان:۔** "ماقدم علی مثل احمد بن حنبل" میرے پاس احمد بن حنبل جیسا کوئی نہیں آیا۔

(ایضا ص ۱۰۳)

☆**ابن معین:۔** "مارایت خیرا من احمدما افتخر علینا بالعربیة قط" میں نے احمد بن حنبل سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا اور انہوں نے عربیت پر کبھی فخر نہیں کیا۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۳)

☆**وکیع بن الجراح وحفص بن غیاث:۔** "ماقدم الکوفة مثل ذالك الفتی یعنی احمد" کوفہ میں اس جوان

یعنی احمد بن حنبل جیسا کوئی شخص نہیں آیا۔ (ایضا)

☆**سعید القطان:۔** ”ماقدم علی مثل احمد ۔حبر من احبار هذه الامة“ میرے پاس احمد جیسا کوئی بڑا عالم نہیں آیا، وہ اس امت کے حبر (بڑے عالم) تھے۔ (ایضا ص ۶۴)

☆**ابو عبید:۔** ”لست اعلم فی الاسلام مثله“ میں اسلام میں ان کے مانند کسی کو نہیں جانتا۔ (ایضا)

☆**عجلی:۔** ”ثقة ثبت فی الحدیث نزه النفس فقیه فی الحدیث متبع الآثار صاحب سنة وخبر“ حدیث میں وہ ثقہ اور ثبت ہیں، پاکیزہ نفس، فقیہ الحدیث، آثار کی پیروی کرنے والے، صاحب سنت وخبر ہیں۔

(ایضا)

☆**حجاج بن الشاعر:۔** ”مارات عینای روحا فی جسد افضل من احمد بن حنبل“ میری آنکھوں نے احمد بن حنبل سے افضل کسی کی روح کو جسم میں نہیں دیکھا۔ (ایضا)

☆**ابو ثور:۔** ”احمد شیخنا و امامنا“ احمد ہمارے شیخ اور ہمارے امام ہیں۔ (ایضا)

☆**ابو حاتم:۔** ”هو امام و هو حجة“ وہ امام اور حجت ہیں۔ (ایضا)

☆**ابن ماکولا:۔** ”کان اعلم الناس بمذاهب الصحابة و التابعین“ لوگوں میں صحابہ اور تابعین کے مذاہب کے سب سے بڑے عالم تھے۔ (ایضا)

قوت حفظ وضبط اور شعور

امام احمد بن حنبل اکابر محدثین ومجتہدین کے حلقہ درس سے وابستہ رہے اور ان گنت شیوخ سے کسب فیض کیا، ان کی ذات علوم وعرفان کا پیکر بن گئی، اس سلسلے میں ان کی وہ ذاتی صفات جن کی بدولت علم کا عظیم ذخیرہ ان کے دامن میں جمع ہو گیا تھا، ان کا قدرتی حافظہ اور فہم وفراست کی فطری دولت ہے، یہ موہبات الٰہیہ ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتے، ہزاروں میں بعض ہی ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں، جن کو ذوق علم کے ساتھ قوت حفظ وضبط کا الٰہی عطیہ حاصل ہوتا ہے، قوت حفظ وضبط محدثین کا خاصہ ہوتا ہے، مگر قدرت نے جس فیاضی کے ساتھ اس صفت سے انہیں نوازا تھا، وہ اپنی مثال آپ ہے، یہ حافظہ ہر علم وفضل کی اساس ہے اور اللہ تعالیٰ نے امام احمد کو یہ صفت بڑی فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی تھی، اس سلسلے میں امام احمد کی ایک روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

> کنت ذاکر و کیعا بحدیث الثوری فکان اذا صلی العشاء خرج من المسجد الی منزله فکنت اذاکره فربما ذکر تسعة احادیث او العشرة فاحفظها فا ذا دخل قال لی اصحاب الحدیث امل علینا فاملینا علیهم فیکتبونها ۔ (ابن حنبل ص ۲۶۷)

میں وکیع سے ثوری کی حدیثیں یاد کیا کرتا تھا، جب وہ عشا کی نماز پڑھ کر مسجد سے گھر کی طرف جانے لگتے تھے،

تو میں ان سے نو یا دس سے زیادہ حدیثیں سن کر یاد کر لیتا تھا، جب وہ گھر میں داخل ہو جاتے تھے تو طالبان حدیث فرمائش کرتے تھے ہمیں وہ حدیثیں املا کرادیں، چنانچہ میں املا کرادیتا تھا اور وہ انہیں لکھ لیتے تھے۔

امام صاحب کے ہم عصر حضرت ابوزرعہ سے پوچھا گیا:

من رایت من المشایخ المحدثین احفظ قال احمد بن حنبل ؟(ایضا)

مشایخ محدثین میں سب سے زیادہ قوی الحافظہ آپ نے کسے پایا؟ فرمایا، احمد بن حنبل کو۔

امام احمد نادر قوت حفظ وضبط کے ساتھ فہم وفراست اور شعور وفکر کی قوت سے بھی مالا مال تھے، وہ احادیث کے ساتھ صحابہ وتابعین کے فتاوی اور آثار پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، اسی فہم کے لحاظ سے آپ اپنے دور کے محدثین پر فوقیت رکھتے تھے، کیوں کہ ان کے معاصر محدثین فقہ ودرایت سے الگ رہ کر صرف روایت حدیث میں مشغول ومنہمک رہتے تھے، لیکن امام احمد ذخیرہ احادیث کے ساتھ ساتھ فقہ واجتہاد کی قوت بلیغ سے بھی مالا مال تھے۔ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے:

کنت اجالس بالعراق احمد بن حنبل ویحییٰ بن معین واصحابنا فکنا نتذاکر الحدیث من طریق وطریقین وثلاثة فاقول مامراده؟ ما تفسیره ؟ مافقهه؟ فیقفون کلهم الا احمد بن حنبل وقد کان علمه بالحدیث والسنة وفتاوی التابعین واستنباطه الاحکام منها سببها فی ان کان امام فی الحدیث واماما فی الفقه حتی لقد قال فی ذلك ابراهیم الحربی ادرکت ثلاثة لم یر مثلهم ویعجز النساء ان یلدن مثلهم رایت ابا عبیدا لقاسم بن سلام ما امثله الا بجبل نافع فیه روح ورایت بشر بن الحارث فما شبهته الا برجل عجز من قرنه ای قدمه عقلا ورایت احمد بن حنبل فرایت کان الله جمع له علم الاولین والآخرین من کل صنف یقول ماشاء و یمسك ماشاء وجمعه لعلم الاولین والآخرین هو بحفظه للاحادیث وآثار السلف وفهم فقهها ۔ (ابن حنبل ص ۶۸)

میں عراق میں احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور دوسرے علماے حدیث کی مجالس میں بیٹھا کرتا تھا، تو ہم لوگ حدیث کو ایک طریقہ یا دو تین طریقوں سے زیر بحث لایا کرتے تھے، پھر جب میں کسی حدیث کے بارے میں سوال کرتا تھا، کہ اس کی تفسیر کیا ہے؟ اس میں فقہ کا کون سا مسئلہ نکلتا ہے؟ تو سوائے احمد بن حنبل کے سب خاموش ہو جاتے تھے، حدیث وسنت اور فتاوی تابعین اور استنباط احکام کے سلسلے میں احمد کا علم بہت کامل تھا، اس لیے کہ وہ فن حدیث کے امام تھے، اور فقہ کا جہاں تک تعلق تھا، ان کے شاگرد ابراہیم حربی کہتے ہیں، میں نے تین آدمی ایسے دیکھے ہیں کہ ان کا مثل میری نظر سے نہیں گزرا، میں نے ابوعبید قاسم بن سلام کو دیکھا، وہ علم

کا پہاڑ تھے، جس میں روح پھونک دی گئی تھی، میں نے بشر بن حارث کو دیکھا، میں انہیں ایسے شخص سے تشبیہ دے سکتا ہوں، جو سر سے قدم تک عقل ہی عقل تھے، میں نے احمد بن حنبل کو دیکھا تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ گویا خدا نے ان میں اگلوں اور پچھلوں کا علم جمع کر دیا ہے۔ اور یہ جو اگلوں اور پچھلوں کا علم ان میں جمع ہو گیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حدیث اور آثار سلف کے حافظ تھے اور اس دور کی فقہ پر مہارت رکھتے تھے۔

علم حدیث

امام احمد بن حنبل اپنے زمانہ کے عظیم القدر محدث تھے، انہوں نے اس مقدس علم کی تحصیل سولہ سال کی عمر سے شروع کی اور عمر کا ایک طویل حصہ اس کے لیے وقف کر دیا، انہوں نے صرف اپنے شہر بغداد اور اس کے اطراف میں مقیم شیوخ حدیث ہی سے کسب علم نہیں کیا بلکہ حدیث وسنت کی جستجو اور طلب میں اسلامی شہروں اور قصبوں کا چپہ چپہ چھان مارا اور ثقہ متدین علماے حدیث سے سماع کیا، راہ طلب کا یہ مسافر اپنی دھن کا پکا اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کی مضبوط چٹان بن کر، اخلاص وایثار کے جذبات سے سرشار تھا، اس نے جہاں بھی حدیث وسنت کی خوشبو محسوس کی، اسے حاصل کرنے کے لیے چل پڑا، سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، رنج وتعب جھیلے، مگر پائے ثبات میں نہ کبھی لغزش آئی اور نہ پیشانی پر ناگواری کی لکیر ابھری، اس طرح انہوں نے اسلامی دنیا کے بیشتر ثقہ محدثین کی مرویات سے اپنے دامن فضل وکمال کو مالا مال کر لیا تھا، جب مسند درس پر جلوہ افروز ہوئے تو طالبان علم نبوت کو خوب خوب سیراب کیا، آپ کے حلقہ درس میں دنیاے اسلام کے بڑے بڑے محدثین شامل تھے، بڑے بڑے ائمہ حدیث نے آپ کی ثقاہت وعدالت، حفظ وضبط اور کثرت روایت کا اعتراف کیا۔

☆ **ابن خلکان:۔** ”کان امام المحدثین صنف کتابه المسند وجمع فیه من الحدیث مالم یتفق لغیره“ امام احمد محدثین کے امام تھے، انہوں نے کتاب المسند لکھی اور اس میں انہوں نے اتنی حدیثیں جمع کیں، جس کی توفیق دوسروں کو نہ ہوئی۔ (وفیات الاعیان ج۲ ص۴۰)

☆ **ابن سعد:۔** ”ثقة ثبت صدوق کثیر الحدیث“ ثقہ، صدوق اور کثیر الحدیث تھے۔

(تہذیب التہذیب ج۱ ص۶۵)

☆ **حافظ ذہبی:۔** ”شیخ الاسلام وسید المسلمین فی عصرہ الحافظ الحجۃ“ امام احمد بن حنبل اپنے زمانہ کے شیخ الاسلام، سید المسلمین، بلند پایہ حافظ حدیث اور حجت ہیں۔ (تذکرہ ج۲ ص۱۷)

☆ **ابوزرعہ رازی:۔** ”امام صاحب کو ایک لاکھ احادیث زبانی یاد تھیں۔ (طبقات الشافعیہ الکبری ج۲ ص۲۷)

مسند امام احمد بن حنبل

امام احمد بن حنبل کے طلب حدیث کا یہ اسلوب تھا، کہ وہ شیوخ حدیث کی بیان کردہ مرویات کو حافظے میں محفوظ بھی کرتے اور صفحہ قرطاس پر تحریر بھی کر لیتے، وہ کتابت حدیث کو ضروری خیال کرتے تھے ان کا اور یحییٰ بن معین کا قول ہے، "کل من لم یکتب العلم لایومن علیہ الغلط" ہر وہ شخص جو علم (حدیث) کو نہیں لکھتا ہے، غلطی کے اندیشے سے مامون نہیں ہوتا ہے۔

طلب علم کے ساتھ ضبط تحریر میں لانے کا ذوق اتنا بڑھا، کہ انہوں نے پوری زندگی میں جمع کی ہوئی حدیثوں کو چھان پھٹک کر کتابی صورت میں جمع کرنے کا اہتمام فرمایا۔

حدیث میں امام احمد کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی کتاب "المسند" ہے، جسے انہوں نے خود جمع کیا، یہ ایسی کتاب ہے، جس کی ان کی طرف نسبت ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے، ثقات نے اسے روایت کیا اور اس کی کتابت خود امام احمد نے کی ہے اور اپنے شاگردوں اور ساتھیوں کو اس کا املا کرایا ہے اس کی تحریر و کتابت پر وہ بہت زیادہ حریص تھے تاکہ یہ لوگوں کے لیے راہ نما ثابت ہو۔

اس کتاب کی ترتیب کے لیے انہوں نے اسلامی دنیا کا سفر کیا اور شیوخ حدیث سے حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ اکٹھا کیا، یہ مسند اسی ذخیرے سے انتخاب ہے، جسے آپ نے مسند کی طرز تالیف پر تحریر کیا، اس میں عام کتب مسانید کی طرح صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہیں، مسند احمد تقریباً ۲۷۱ اجزا پر مشتمل اور سات سو صحابہ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے، حدیثوں کی تعداد عام طور سے تیس ہزار اور چالیس ہزار بتائی جاتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی لکھتے ہیں:

مشہور ہے، کہ مسند میں اصل سے تیس ہزار حدیثیں ہیں اور جب ان کے بیٹے عبداللہ کی زیادات کو ملا لیا جائے تو چالیس ہزار حدیثیں ہوتی ہیں، لیکن بعض محدثین نے اپنے شیوخ اور بعض ثقات سے یہ نقل کیا ہے، کہ کل تیس ہزار حدیثیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ (بستان المحدثین ص ۵۳)

امام احمد نے اس کتاب کی ترتیب وتدوین کا کام تحصیل علم کے ساتھ ساتھ شروع کر دیا تھا، علمائے سنت اس بات کے معترف ہیں، کہ انہوں نے مسند کی جمع وتدوین کا کام ۱۸۰ھ میں شروع کر دیا تھا، اور وہ پوری عمر اس میں ترمیم و تنقیح کرتے رہے۔

امام احمد حدیث کے علاوہ دوسری چیزوں کو لکھنا پسند نہیں کرتے تھے، انہوں نے مسند کی جمع و ترتیب کا کام اپنے مطلع حیات میں شروع کر دیا تھا، جس کے مقصد کی طرف انہوں نے خود ہی اشارہ کیا، آپ کے صاحبزادے عبداللہ فرماتے ہیں:

قلت لابی لم کرهت وضع الکتب وقد عملت المسند فقال له عملت هذاالکتاب اماما

اذا اختلف الناس فی سنة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم رجع الیه . (ابن حنبل ص ۱۲۷)

میں نے اپنے والد (احمد بن حنبل) سے دریافت کیا، کہ آپ کتابیں مرتب کرنے سے کیوں منع کرتے ہیں؟ حالاں کہ آپ نے خود بھی مسند لکھی ہے؟ جواب میں آپ نے فرمایا، یہ کتاب میں نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے لکھی ہے، جب سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں لوگوں کے مابین کوئی اختلاف رونما ہوگا، وہ اس کی طرف رجوع کریں گے۔

امام احمد مسند کی جمع وتدوین میں زندگی کے آخری لمحوں تک مصروف رہے، لیکن اس کام کو آخری اور حتمی شکل دینے نہیں پائے تھے، کہ پیام اجل آ گیا، انہیں جب قرب اجل کا احساس ہوگیا تو اپنے صاحبزادوں اور مخصوص شاگردوں کو جمع کیا، اور جو کچھ لکھا تھا، انہیں بتمامہ املا کرادیا، اگر چہ اس سے قبل اپنے حلقہ درس میں تلامذہ کو بھی اسی مجموعے سے حدیثیں نقل کرائی تھیں، لیکن ضرورت کے مطابق جگہ جگہ سے املا کرایا تھا۔

حافظ شمس الدین رقم طراز ہیں:

ان الامام احمد شرع فی جمع المسند فکتبه فی اوراق منفردة وفرقه فی اجزاء منفردة علی نحو ماتکون المسودة ثم جاء حلول المنية قبل حصول الامنية فبادر باسماعه لاولاده واهل بيته ومات قبل تنقيحه وتهذيبه فبقی علی حاله ثم ان ابنه عبدالله الحق به مايشاكله وضم اليه من سموعاته مايشابههٖ ويماثله . (ابن حنبل ص ۱۲۸)

امام احمد نے مسند کی جمع وتدوین کا کام شروع کیا، اسے الگ الگ ورقوں میں لکھا، پھر اسے جدا جدا اجزا میں تقسیم کیا، یہاں تک کہ اس نے ایک مسودہ کی صورت اختیار کرلی، پھر قبل اس کے کہ آرزو پوری ہو، پیام اجل آ پہنچا، تو انہوں نے اپنی اولاد اور اہل بیت کو اسے پہلی فرصت میں سنا ڈالا اور قبل اس کے کہ اس کی تنقیح وتہذیب اتمام تک پہنچے، وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور مسودہ جوں کا توں قائم رہا، پھر ان کے صاحبزادے عبداللہ نے ان روایات کے مشابہ مماثل روایات اس میں شامل کردیں۔

امام احمد بن حنبل کے بھتیجے حنبل بن اسحاق بیان کرتے ہیں، کہ عم محترم نے مجھے اور دونوں صاحبزادگان صالح اور عبداللہ کو جمع کرکے ہمارے سامنے مسند کی قرات کی، ہمارے سوا کسی دوسرے نے آپ سے اس کتاب کو بتمامہ نہیں سنا ہے، پھر ہم سے فرمایا، کہ میں نے اسے ساڑھے سات لاکھ سے زائد احادیث سے منتخب کیا ہے، پس حضور اقدس کی جس حدیث میں مسلمانوں کا اختلاف ہو تو اس کتاب کی طرف رجوع کرو اگر وہ روایت اس میں موجود ہو فبہا ورنہ حجت نہیں۔

(طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۲ ص ۲۰۲)

امام احمد نے مسند کو مختلف اجزا میں جمع کیا تھا، آپ کے بعد اس میں اضافے بھی کیے جاتے رہے، شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں ''مسند احمد بن حنبل اگرچہ خود امام عالی مقام کی تصنیف ہے، لیکن اس میں بہت سے زیادات ان کے بیٹے عبداللہ کے ہیں اور بعض زیادات ابوبکر قطیعی کے بھی ہیں، یہ کتاب مستطاب ۱۸ر مسندوں پر مشتمل ہے، مسند عشر مبشرہ، مسند اہل بیت نبوی، مسند ابن مسعود مسند عبداللہ بن عمر، مسند عباس و صاحبزادگان، مسند عبداللہ بن عباس، مسند ابی ہریرہ، مسند انس بن مالک، مسند ابوسعید خدری، مسند جابر بن عبداللہ، مسند مدنیاں، مسند مکیاں، مسند کوفیاں، مسند بصریاں، مسند شامیاں، مسند انصار، مسند عائشہ مع مسند النساء۔ (بستان المحدثین ص ۵۲)

امام عبداللہ

امام احمد کی وفات کے بعد ان کے لائق صاحبزادے امام عبداللہ نے مسند کی ترتیب و تہذیب کا اہم کام انجام دیا اور ان میں امام احمد کے اصول اخذ روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اضافے بھی کیے، مسند کا جو نسخہ عالم اسلام میں شائع ہے، اس کے راوی اور مرتب عبداللہ بن احمد ہی ہیں، بلاشبہ عظیم محدث اور اپنے پدر بزرگوار کے معتمد علیہ تھے، امام صاحب صاحبزادے کے شغف بالحدیث کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے ''**ابنی عبداللہ محظوظ من علم الحدیث**'' میرا بیٹا عبداللہ علم حدیث میں حظ وافر رکھتا ہے۔ (ابن حنبل ص ۱۲۹)

عبداللہ نے حدیث کا علم اپنے والد اور اپنے عہد کے ان شیوخ حدیث سے حاصل کیا تھا، جن کی جلالت شان کے معترف خود امام احمد بھی تھے، یہی وجہ تھی، کہ خود امام احمد اپنے بیٹے عبداللہ کی مرویات کو قبول کرلیا کرتے تھے، اس طرح عبداللہ اپنے والد کے زمانے ہی میں مرتبہ کمال کو پہنچ گئے تھے:

> **قبل عبداللہ بابیہ ولہ فی نفسہ محل من العلم احیأ علم ابیہ بمسند الذی قرأہ علیہ خصوصا ولم یکتب عن احد الا من امر ابوہ ان یکتب عنہ ۔**
>
> ابن عدی کہتے ہیں، عبداللہ اپنے والد کے سامنے ہی مرتبہ کمال کو پہنچ گئے تھے، امام احمد کے دل میں بیٹے کی فضیلت و منزلت کا احساس تھا، عبداللہ نے مسند کے ذریعہ اپنے والد کے علم کو حیات دوام بخشا، جس کی باپ نے بیٹے کے سامنے خصوصی طور پر قرات کی تھی، عبداللہ نے کسی سے کوئی حدیث اگر لکھی ہے، تو اپنے والد کی اجازت سے۔ (ابن حنبل ص ۱۲۹)

امام عبداللہ نے اکثر و بیشتر روایتیں اپنے والد ہی سے کی ہیں، ابن ابی یعلی طبقات میں رقم طراز ہیں، صالح نے اپنے والد (امام احمد) سے بہت کم لکھا ہے، لیکن عبداللہ نے اپنے والد سے اتنی زیادہ روایت کی ہے، کہ دنیا میں کوئی ان کا حریف نہیں بن سکتا، انہوں نے مسند، تفسیر، ناسخ و منسوخ، تاریخ حدیث آیات کتاب اللہ کی تقدیم و تاخیر جو آیات قرآن اور مناسک کبیر و صغیر کا علم حاصل کیا، اس کے علاوہ دوسرے مصنفات اور حدیث شیوخ کا مطالعہ کیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، کہ ہمارے

اکابر شیوخ عبداللہ کی معرفت رجال اور معرفت فن علل احادیث کے قائل چلے آرہے ہیں، امام عبداللہ طلب حدیث میں ہمیشہ سرگرم رہے، اسے بھی سب مانتے ہیں، غرض سلف سے خلف تک عبداللہ کے علم وفضل اور جلالت شان کا اقرار واعتراف چلا آرہا ہے۔ (ابن حنبل ص ۱۲۹)

امام عبداللہ نے اپنے والد سے مسند کی روایت کی اور ان کا علم لوگوں میں پھیلایا، پھر ان کے بعد وقت کے ثقات وحفاظ سے روایت کا ایک تسلسل قائم ہوگیا، یہاں تک کہ نسلا بعد نسل اس کا اعادہ ہوتا رہا اور اس میں ایک ایسا دینی اور علمی ذخیرہ رچ گیا جسے وقت کے علما نے حفظ کیا اور سند قبول عطا کی۔

چھ ضخیم جلدوں میں سات سو صحابہ کرام کی مرفوع احادیث کا یہ مجموعہ مسند ہونے کے ساتھ ساتھ یک گونہ معجم بھی ہے، کیوں کہ اس میں صحابہ کی ترتیب کے مطابق حدیثیں درج ہیں، مولف کتاب نے یہ بھی التزام کیا ہے، کہ ہر صحابی کی مرویات کو جتنے شیوخ سے سنا ہے، یک جا کردیا ہے، ابتدا عشرہ مبشرہ کی احادیث سے کی گئی ہے، پھر اس کے بعد جو ان سے قریب تر ہوں یہاں تک کہ یہ سلسلہ تابعین تک پہنچ جاتا ہے، پھر ان کی بھی یہی ترتیب قرار پائی، اس کتاب کی جامعیت کا یہ عالم ہے، کہ چند احادیث کے علاوہ تمام متون ومجامع حدیث کی حدیثیں اس میں ہیں۔

مشہور ہے، کہ امام احمد نے ساڑھے سات لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے مسند کی تالیف کی ہے اور کسی ایسے استاذ سے سنی ہوئی حدیث اس میں درج نہیں کی، جس کے صدق ودیانت پر انہیں یقین واطمینان نہ تھا۔

حضرت امام احمد بن حنبل ثقہ راویوں کی مرویات کو قید تحریر میں لاتے، انہوں نے اپنے علم میں کسی ضعیف شخص سے روایت نہیں کی، اگر روایت کرنے کے بعد معلوم ہوتا کہ یہ راوی ثقہ نہیں، تو وہ اس کی حدیث ساقط کردیتے، یہی وجہ ہے، کہ مسند میں برابر حذف وتغیر کا سلسلہ جاری رہا، اپنی اولاد اور مخصوص لوگوں کو پوری مسند املا کرانے کے بعد بھی حذف وتغیر کرتے رہے، مسند کے مقدمہ میں کتاب ''خصائص المسند'' (مصنفہ حافظ ابوموسیٰ مدینی) میں ذکر کیا گیا ہے، کہ:

> ومن الدلیل لی ان ماودعہ الامام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ مسندہ قد احتاط فیہ اسنادا ومتنا ولم یورد فیہ الا ماصح عندہ ماخبرنا انہ روی بالسند المتصل الی ابی ہریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یہلك امتی ہذاالحی من قریش قالوا فما تامرنا یارسول اللہ قال لو ان الناس اعتزلوہم قال عبداللہ قال ابی فی مرضہ الذی مات فیہ اضرب علی ہذاالحدیث فانہ خلاف الاحادیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔

(ابن حنبل ص ۱۳۱)

امام احمد نے مسند میں بہت محتاط طریقہ اختیار کیا ہے، اسناد میں بھی اور متن میں بھی، وہ صرف وہی روایت اور

> سند قبول کرتے تھے، جو ان کے نزدیک بالکل صحیح ہو، انہوں نے سند متصل کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے ایک روایت بیان کی، بے شک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میری امت اس قبیلہ قریش کی وجہ سے ہلاک ہو جائے گی، لوگوں نے عرض کی، اے اللہ کے رسول! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا، کاش لوگ ان سے جدا ہو جاتے، عبداللہ نے فرمایا، کہ میرے والد نے اپنے مرض الموت میں فرمایا، اس حدیث کو (کتاب) سے کاٹ دو، کیوں کہ یہ حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے۔

اس سے معلوم ہوا، کہ امام احمد نے مسند کی حدیثوں کی تنقیح کا سلسلہ آخری عمر تک قائم رکھا، وہ ہر ایسی حدیث کو حذف کر دیتے تھے، جس کے بارے میں انہیں یقین ہو جاتا، کہ مشہور صحیح حدیثوں سے اس کا تعارض ہے، امام احمد متن حدیث اور مسند پر نقد کیا کرتے تھے۔

* * *

فقہ واجتہاد

امام احمد بن حنبل کی جلالت فی العلم اوران کا زہد وورع، صلاح وتقویٰ سب کے نزدیک مسلم ہے، بلا ریب وہ حدیث کے امام اور فقیہ ومجتہد تھے، لیکن بعض اصحاب علم نے آپ کو فقیہ ومجتہد تسلیم نہیں کیا ہے، ابن جریر طبری نے اپنی کتاب ’’اختلاف الفقہاء‘‘ میں امام احمد کے مسلک کا ذکر نہیں کیا ہے، وہ آپ کے بارے میں کہتے ہیں:

انه رجل حدیث لا رجل فقه وامتحن لذالك .

وہ محدث تھے، فقیہ نہیں تھے، اس لیے انہیں آزمائش میں ڈالا گیا۔

بعض وہ فقہا جو خلافیات کے مسائل میں بحث کرتے ہیں، ان کا ذکر نہیں کرتے، مثلاً طحاوی، دبوسی، نسفی، اصیلی، مالکی اور غزالی وغیرہ نے اختلافی مسائل میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے، اسی طرح ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ’’المعارف‘‘ میں فقہا میں ان کا شمار نہیں کیا ہے، مقدسی نے اپنی کتاب ’’احسن التقاسیم‘‘ میں انہیں اصحاب حدیث میں شمار کیا ہے، قاضی عیاض اپنی کتاب ’’مدارک‘‘ میں کہتے ہیں:

انه دون الامامة فی الفقه وجودة النظر فی ماخذه .

امام احمد، امام فقہ نہ تھے، نہ فقہی ماخذوں پر جودت نظر کے حامل تھے۔ (ابن حنبل ص ۸)

امام احمد کی اجتہادی شان اور ملکہ فقہ کا انکار کرنے والوں کے سامنے صرف حدیث میں ان کی عظمت ورفعت کا اعتراف ہے، بلاشبہ امام کی محدثانہ عبقریت ان کی فقہ پر غالب ہے، وہ ایسے فقیہ تھے، کہ ان کا صلاح وتقویٰ تفقہ پر بھاری تھا، ان کی فقہ دانی پر حدیث غالب تھی، وہ سنت رسول اور آثار صحابہ کا اتباع کرتے تھے، جس کی بنیاد پر لوگوں کو یہ وہم ہوا کہ وہ صرف محدث تھے، فقیہ نہ تھے، اور وہ دلیل کے طور پر یہ بات کہتے ہیں، کہ فقہ میں امام احمد کی کوئی مستقل تصنیف نہیں، جب کہ اس دور میں تدوین فقہ کا کام بڑی حد تک پایہ تکمیل تک پہنچ چکا تھا، امام محمد بن حسن شیبانی نے فقہ عراق کو جمع کر لیا تھا، قاضی ابو یوسف نے فقہ میں متعدد کتابیں لکھی تھیں، امام شافعی اپنے مسلک اور کتابوں کا املا کرا چکے تھے، جب کہ امام احمد کے یہاں فقہ پر کوئی کتاب نہیں ملتی، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ محدث تھے فقیہ نہ تھے۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، کیوں کہ ایسے محدثین جو صاحب رائے وفقہ بھی تھے، جیسے امام بخاری اور امام مسلم، انہیں زمرہ

محدثین سے خارج کر کے فقہا کی جماعت میں شامل نہیں کیا گیا، اس لیے کہ اعتبار غلبہ منہاج کا کیا جاتا ہے، جس پر تحدیث غالب ہے، اس میں مخصوص مانا جاتا ہے، اور محدث قرار دیا جاتا ہے، جس کے فتوے زیادہ ہوں اور تفقہ کا غلبہ ہو، وہ فقیہ مانا جاتا ہے، جب کہ وہ حدیث میں بھی ملکہ رکھتا ہو، جس شخصیت میں فقہ وحدیث متوازن طور پر جمع ہیں، وہ امام مالک کی ذات ہے، چوں کہ امام احمد کے یہاں فقہ واجتہاد کی قوت کے باوجود تحدیث کا پلہ غالب تھا، اس لیے باعتبار غلبہ انہیں بعض لوگوں نے صرف محدث ہی تسلیم کیا، فقیہ نہیں مانا، لیکن سچی بات یہ ہے، کہ امام احمد محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ ومجتہد بھی تھے۔

انہوں نے فقہ میں اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑا، جب کہ حدیث میں اپنی عظیم کتاب ''المسند'' یادگار چھوڑی بات یہ ہے، کہ انہوں نے فقہی اقوال وآرا اور فتووں کی جمع وتدوین اپنے لائق شاگردوں پر چھوڑ دی تھی، جو ان کے اقوال وفتاویٰ اور افکار وآرا کی جمع وتدوین کیا کرتے تھے، اس طرح وہ فقہی مجموعہ تیار ہو گیا، جو ان کی طرف منسوب ہے اور علماے ملت نے ان کو مجتہد فی الفقہ تسلیم کیا ہے، حافظ ابن قیم اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' میں لکھتے ہیں:

وعلل ترك احمد تدوين كتاب فی الفقه بانه كان شديد الكراهية لتصنيف الكتب فی غير الحديث ولكن الله علم حسن نيته فجعل تلاميذه يعنون بتدوين كلامه وفتاويه

(اعلام الموقعین ج۱ص۲۲)

امام احمد نے فقہ میں کوئی کتاب اس لیے مدون نہیں کی، کہ حدیث کے علاوہ کسی اور موضوع پر وہ تصنیف کتاب کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے، چوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی حسن نیت سے آگاہ تھا، لہٰذا ان کے تلامذہ نے ان کے کلام اور فتویٰ کی تدوین کی طرف پوری پوری توجہ کی۔

حافظ ابن قیم اس مسئلہ پر مزید لکھتے ہیں:

جمع الخلال نصوصه فی الجامع الكبير فبلغ نحو عشرين سفرا او اكثر ورويت فتاواه ومسائله وحدث الناس بها قرنا بعد قرن فصارت اماما وقدوة لاهل السنة علی اختلاف طبقاتهم حتی ان المخالفين لمذهب بالاجتهاد والمقلدين لغيره ليعظمون نصوصه وفتاواه ويعرفون حقها وقربها من النصوص وفتاوی الصحابة ومن تامل فتاواه وفتاوی الصحابة رای مطابقة كل منهما علی الاخری رای الجميع كانها تخرج من مشكاة واحدة ۔ (اعلام الموقعين ج ۱ ص ۲۲)

امام احمد کے نصوص جامع کبیر میں خلال نے بیس جلدوں میں جمع کیے ہیں، ان کے فتوے اور مسائل لوگوں میں ہر زمانے میں تسلیم کیے جاتے رہے، چنانچہ وہ اہل سنت کے امام ورہنما بن گئے، یہاں تک کہ ان کے مسلک کے مخالف مجتہد اور مقلدین مذاہب بھی ان کے اجتہاد کے آگے سر جھکانے لگے، اور ان کے نصوص وفتاویٰ کی

عظمت کے اعتراف پر مجبور ہوگئے، اور یہ ماننے لگے، کہ ان کے افکار و آرا کتاب و سنت اور صحابہ کے فتووں سے بہت قریب تھے، جو شخص امام احمد کے فتووں اور صحابہ کے فتاوی پر نظر ڈالے گا وہ دونوں کو ایک دوسرے کے مطابق پائے گا اور ان کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوگا، کہ یہ سب ایک ہی چراغ کی مختلف کرنیں ہیں۔

امام صاحب کے فقہی مسائل ان کے اصحاب کی روایت سے مدون ہوئے، انہوں نے نصوص و فتاوی کی بڑی تعداد مبسوط و ضخیم کتابوں میں نقل کیا، امت نے ان پر اعتماد کیا، اسی طرح فقہ حنبلی کی روایت و اشاعت عالم اسلام میں ہوئی۔ اسلامی دنیا میں جو چار فقہی دبستان مشہور ہیں اور جن ائمہ مجتہدین کے فقہی آرا پر امت مسلمہ عمل کر رہی ہے، ان میں ایک امام احمد اور ان کا مکتب فقہ بھی ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

وقد صار اهل الاسلام اليوم على تقليد هؤلاء الائمة الاربعة ۔(مقدمہ ابن خلدون ص ۴۹۱)

اب مسلمان انہیں چار اماموں کی تقلید کرتے ہیں۔

صاحب مفتاح السعادہ کہتے ہیں، کہ امام احمد ان مجتہدین میں سے ہیں، جن کے اقوال و آرا پر عمل کیا جاتا ہے اور جن کا مذہب اکثر شہروں میں مروج ہے۔ (مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۸)

صاحب کشف الظنون تحریر فرماتے ہیں، کہ مشہور مذاہب جن کی صحت مسلم ہے، چار ہیں اور وہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کی جانب منسوب ہیں۔ (کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۲)

امام احمد کی فقہی عظمت اور اجتہادی قوت کا اعتراف ملت اسلامیہ کی مقتدر و معتمد علمی ہستیوں نے کیا ہے:

☆**عبدالرزاق:۔** ”**مارايت افقه منه ولا اورع**“ میں نے امام احمد سے بڑھ کر فقیہ اور صاحب ورع نہیں دیکھا۔

(تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۴)

☆**ابوعاصم:۔** ”**ماجاء نا من ثمة احد غيره يحسن الفقه**“ ہمارے یہاں امام احمد کے سوا کوئی شیخ نہیں آیا، جو عمدہ فقہ جانتا ہو۔ (ایضا)

☆**امام شافعی:۔** ”**خرجت من بغداد وماخلفت بها افقه ولا ازهد ولا اورع ولا اعلم من احمد بن حنبل**“ میں بغداد سے نکلا اور میں نے اپنے پیچھے امام احمد سے بڑھ کر فقیہ، زاہد، متقی اور ان سے بڑا عالم کسی کو نہیں چھوڑا۔

(ایضا)

☆**احمد بن سعید الرازی:۔** ”**مارايت اسود الراس احفظ لحديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا اعلم بفقهه ومعانيه من ابى عبدالله احمد بن حنبل**“ میں نے کسی نوجوان کو نہیں دیکھا، جو ابو عبداللہ احمد بن حنبل سے

بڑا حافظ حدیث وفقہ اور اس کے معانی کا جاننے والا ہو۔ (مناقب امام احمد بن حنبل ص ٩٠)

☆ **ابو الوفاء علی بن عقیل:۔** ”**ومن عجيب ما تسمعه عن هؤلاء الاحداث الجهال انهم يقولون احمد ليس بفقيه لكنه محدث وهذا غاية الجهل لانه قد خرج عنه اختيارات بناها على الاحاديث بناء لا يعفه اكثرهم وخرج عنه من دقيق الفقه ما لاحد منهم**“ (مناقب امام احمد بن حنبل ص ٩١)

ان نوخیز جاہلوں سے تم کیسی عجیب وغریب باتیں سنتے ہو، وہ کہتے ہیں، امام احمد فقیہ نہیں ہیں، بلکہ وہ محدث ہیں اور یہ قول انتہائی جہالت پر مبنی ہے، اس لیے امام احمد سے کچھ ایسے مختار مسائل صادر ہوئے جن کی بنیاد احادیث پر ہے اور اسے اکثر لوگ نہیں جانتے اور ان سے ایسے باریک فقہی مسائل صادر ہوئے جنہیں ہم ان میں سے کسی کے یہاں نہیں پاتے ہیں۔

شغف بالحدیث کے ساتھ ساتھ امام احمد کو فقہ وفتاوی سے بھی گہری دلچسپی تھی، وہ امام شافعی کے خرمن علم کے خوشہ چیں تھے اور ان کی قوت اجتہاد واستنباط سے خوب فیض اٹھایا تھا، وہ امام شافعی کو مجدد اور مجتہد وقت تسلیم کرتے تھے، چنانچہ حدیث وسنت کے انہماک غالب کے ساتھ فقہ وفتاویٰ سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی، وہ حدیث کو عام محدثین کی طرح محض حفظ وضبط پر اکتفانہ کرتے، بلکہ حدیث کو مفہوم ومقصد، غایت ومرام، معنی اور مطلب کے ساتھ حاصل کرتے تھے، وہ صحابہ اور تابعین کے فتووں کی جستجو میں رہتے تھے، مسند اگرچہ حدیثون کا مجموعہ ہے، مگر اس کے اندر فقہاے صحابہ اور تابعین کے فتاوی کا ایک بڑا ذخیرہ نظر آئے گا، جس کی وجہ یہ ہے، کہ امام احمد بیک وقت محدث اور فقیہ دونوں تھے۔

امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں:

مثل من يطلب الحديث ولايتفقه مثل الصيد لانه يجمع الادوية ولايعرف لاى داء هى حتى يجئ الطبيب هكذا طالب الحديث لايعرف وجه حديثه حتى يجئ الفقيه ۔

(ابن حنبل ص ٢٨)

جو حدیث سیکھتا ہے، اور فقہ نہیں جانتا، اس کی مثال اس دوافروش کی سی ہے، جو دوائیں جمع کرتا رہتا ہے، لیکن یہ نہیں جانتا کہ دوا کس مرض میں کام آئے گی، یہاں تک کہ طبیب آتا ہے اور وہ بتاتا ہے اسی طرح طالب حدیث ہے جو حدیثیں تو یاد کرلیتا ہے، لیکن ان کی ماہیت اور حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے، یہاں تک کہ فقیہ آتا ہے اور صحیح بات بتاتا ہے۔

امام احمد محض محدث (عطار) ہی نہ تھے، بلکہ طبیب حاذق (فقیہ ومجتہد) بھی تھے، انہوں نے اپنے ذخیرہ احادیث کی روشنی میں مسائل فقہیہ کا استنباط واجتہاد پوری علمی ودینی دیانت اور رسوخ فی العلم کے ساتھ کیا۔

مارايت مثل احمد بن حنبل فقالوا له اى شئ بان لك من فضله فقال رجل سئل عن ستين الف مسألة فاجاب فيها حدثنا اخبرنا ۔

میں نے امام احمد بن حنبل کا مثیل کسی کو نہیں دیکھا، لوگوں نے پوچھا، کہ وہ کون سی چیز ہے، جس کی بنا پر آپ امام احمد کے فضل کا یوں اعتراف کرتے ہیں، جواب دیا، کہ وہ ایسا شخص ہے، جن سے ساٹھ ہزار مسائل پوچھے گئے تو انہوں نے جوابات حدثنا اور اخبرنا کہہ کر دیا یعنی احادیث واخبار کی روشنی میں دیا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے، کہ امام احمد سے بکثرت فقہی استفسارات کیے گئے جن کے جوابات انہوں نے حدیث واثر کی روشنی میں دیے۔

خراسان، ماوراء النہر، عراق فارس اور ان مقامات کے متصل علاقوں کے لوگ احکام شرعیہ میں امام احمد کے سوا کسی دوسرے پر زیادہ اعتماد نہیں کرتے تھے، جس کی وجہ یہ تھی، کہ آپ کے علم وفضل، ورع وتقویٰ، استقامت فی الدین کی داستان گھر گھر پہنچ چکی تھی، جس نے آپ کی ذات کو ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کا مرکز استفتا بنا دیا تھا اور امام صاحب مسائل کے جواب دیا کرتے تھے۔

اس طرح ان کے فقہی مجتہدات عام ہوئے اور دنیا نے ان کو احترام وعقیدت کے ساتھ محفوظ رکھا اور آنے والی نسلوں تک یہ فقہی میراث منتقل ہوتی رہی۔

فقہ حنبلی کا شیوع

یہ حقیقت ہے، کہ امام احمد نے فقہ میں کوئی مستقل کتاب تحریر نہیں فرمائی، فقہ میں ان کی کتاب مناسک کبیر، مناسک صغیر، نیز نماز پر ایک چھوٹا سا رسالہ یادگار ہیں امام احمد کے یہ رسالے موضوع فقہ سے متعلق ایسے ابواب ہیں، جن میں خبر واثر کی فراوانی ہے، ان میں رائے، قیاس اور استنباط فقہیہ نظر نہیں آتے، بلکہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا اتباع ہے۔

امام احمد اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے، کہ ان کے اقوال وآرا ضبط تحریر میں لائے جائیں، چنانچہ احمد بن الحسین بن حسان کا بیان ہے، کہ ایک آدمی نے امام احمد سے عرض کیا، میں آپ کے مسائل فقہیہ کو لکھنا چاہتا ہوں، میں بشر ہوں بھول چوک ہو ہی سکتی ہے، امام نے جواب دیا "**لاتکتب فانی اکرہ ان اکتب رائی واحس مرۃ بانسان یکتب ومعہ الواح فی کمہ فقال لاتکتب رایا لعلی اقول الساعۃ بمسألۃ ثم ارجع غداعنھا**" ہرگز نہ لکھو، میں اسے پسند نہیں کرتا کہ فقہی مسائل پر میری رائے قلم بند کی جائے، میں اس وقت ایک مسئلہ پر کچھ کہتا ہوں، ہو سکتا ہے، کل اس رائے سے رجوع کرلوں۔ (طبقات الحنابلۃ المختصرۃ لابن ابی یعلی ص ۳۷، بحوالہ ابن حنبل ۱۳۵)

امام احمد کا یہ قول ان کی اجتہادی قوت وبصیرت کو ظاہر کرتا ہے، وہ کسی مسئلہ میں اپنے اجتہاد سے بیان کردہ حکم کو آخری حکم اس بنیاد پر تسلیم نہ کرتے تھے، کہ مبادا دوسرے نصوص کی روشنی میں اس حکم کو تبدیل کرنا پڑے، کیوں کہ عمر کے آخری حصے تک اپنے فقہی مسائل وآرا کو مصادر شرعیہ کی کسوٹی پر پرکھنا ہے اور یہی ایک مجتہد کی شان اجتہاد وتفقہ ہے۔

امام احمد کا ورع وتقویٰ اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا، کہ وہ خود اپنی فقہی آرا جمع کریں، یا دوسرے انہیں نقل کریں،

لیکن دور ابتلا و آزمائش کے بعد آپ کی شخصیت مرجع انام بن گئی، جوق در جوق لوگ آپ کی زیارت کے لیے آتے اور فقہی استفسارات پیش کرتے، جن کے جواب میں امام صاحب قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ دیتے، جہاں یہ نصوص نہیں ملتے، اپنی رائے سے بھی فتوے دیا کرتے، اس طرح ہزاروں کی تعداد میں ارادت مندوں نے امام صاحب کے فقہی اقوال و آرا کو ذہن نشیں کیا، انہیں دوسروں تک پہنچایا اور اہل علم نے ان کو کتابوں میں تحریر کیا، اسی طرح امام احمد کی فقہ کا دفتر مدون ہو گیا، امام احمد کی طرف اس فقہی مجموعہ کی نسبت اہل علم کی ایک بڑی جماعت پشتہا پشت سے قبول کرتی چلی آ رہی ہے، اور جب تک بطلان نسبت پر کوئی قوی اور محکم دلیل نہ ہو، ہم اس نسبت کو قبول کرنے سے کیوں کر انکار کر سکتے ہیں، اس لیے کہ ہر دور میں علما کی جماعتوں کا اسے امام احمد کی طرف منسوب مانتے چلے آنا بجائے خود ایک بڑی دلیل ہے، نہ صرف بڑی دلیل بلکہ قوی اور محکم بھی۔

اگر علما میں کچھ ایسے لوگ ہیں، جو آپ کو فقیہ نہیں مانتے، بلکہ محدث شمار کرتے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے، کہ امام صاحب کے فتاوی اور مسائل کی بنیاد تفریع فقہی اور تخریج فقہی کے مقابلہ میں روایت حدیث سے زیادہ قریب ہوتی تھی۔

امام احمد کے تلامذہ کی بہت بڑی تعداد ہے، ان میں کچھ ایسے ہیں، جنہوں نے صرف حدیث کی نقل و روایت آپ سے کی، بعض ایسے ہیں، جنہوں نے حدیث وفقہ دونوں کی روایت کی، اور ایک بہت بڑی تعداد ایسے اصحاب کی بھی ہے، جنہوں نے امام کی فقہی آرا اور فتووں کی جمع ونقل کا کام کیا، جن میں مشہور ترین ابراہیم الحربی، ابراہیم بن ہانی، اور ان کے بیٹے اسحاق، ابو طالب المشکانی، ابوبکر المروزی ابوبکر الاثرم، ابو الحارث احمد، اسحاب بن منصور الکوسج، اسماعیل الشالنجی، احمد بن محمد الکمالک، ابو المظفر اسماعیل، بشر بن موسیٰ، بکر بن محمد، حرب الکرسانی، حسن ثواب، الحسن بن زیاد، ابوداؤد السجستانی، عبداللہ، صالح، عبداللہ فوران، عبدالملک یمونی، الفضل بن زیادہ ابوبکر بن محمد بن الحکم، الفرج بن الصباح، محمد بن ابراہیم، مثنی بن جامع، مہنی بن یحیی، ہارون الجمال، یعقوب بن بختان، ابو الصقر یحییٰ ہیں۔ (ابن حنبل ص ۱۳۹)

تصانیف

امام احمد کی درج ذیل مصنفات مشہور ہیں:

(۱) کتاب المسند (۲) کتاب التفسیر (۳) کتاب الناسخ والمنسوخ (۴) کتاب التاریخ (۵) کتاب حدیث شفتیه (۶) کتاب المقدم والمؤخر فی القرآن (۷) کتاب جوابات القرآن (۸) کتاب المناسك الكبير (۹) کتاب المناسك الصغیر اور دوسرے مختصر رسائل بھی تصنیف فرمائے۔

ابن ندیم نے امام صاحب کی تصانیف میں مندرجہ ذیل کتابوں کا نام لکھا ہے:

(۱) کتاب العلل (۲) کتاب التفسیر (۳) کتاب الناسخ والمنسوخ (۴) کتاب الزهد (۵) کتاب المسائل (۶) کتاب الفضائل (۷) کتاب الفرائض (۸) کتاب المناسك (۹) کتاب الایمان (۱۰) کتاب

الاشربہ (۱۱) کتاب طاعۃ الرسول (۱۲) کتاب الرد علی الجہمیہ (۱۳) کتاب المسند جو چالیس ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل ہے۔

مسند امام احمد بن حنبل کے بارے میں امام صاحب نے اپنے صاحب زادے عبداللہ سے فرمایا تھا، کہ تم مسند کو محفوظ رکھو، یہ کتاب مسلمانوں کے لیے امام و مقتدا ہوگی۔ اس میں کل چالیس ہزار احادیث ہیں، جن میں دس ہزار مکررات ہیں ان کو نکال دیا جائے، تو تیس ہزار بچیں گی، تین سو سے زائد ثلاثیات ہیں، یعنی وہ احادیث جن کے سلسلہ سند میں صرف تین راوی ہیں۔

* * *

فقہ حنبلی کے اصول استنباط

صاحب اعلام الموقعین لکھتے ہیں: امام احمد نے اپنی فقہ کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی تھی۔

(۱) نصوص

پہلی چیز جس پر امام احمد انحصار کرتے ہیں، وہ نص ہے، جب آپ کو نص مل جاتی ہے، تو اس کے مطابق فتویٰ دیتے ہیں اور کسی دوسری چیز کی طرف دھیان نہیں دیتے، نص کو صحابہ کرام کے فتاویٰ پر بھی مقدم رکھتے ہیں۔

(۲) فتاوائے صحابہ

فقہ احمد کی دوسری اصل صحابہ کے فتاوے ہیں، اگر انہیں کسی صحابی کا فتویٰ مل جاتا تھا اور اس فتوے کے خلاف کوئی دوسرا فتویٰ ان کے علم میں نہیں ہوتا تھا، تو اسی پر اکتفا کرتے تھے، ایسے فتوے کو وہ اجماع نہیں قرار دیتے تھے، لیکن چوں کہ ان کی عادت تعبیر میں احتیاط کرنے کی تھی، لہٰذا ایسے موقع پر وہ فرمایا کرتے تھے، کہ میرے علم میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، جو اسے دفع کرتی ہو۔

(۳) اختلاف صحابہ کا فیصلہ

حافظ ابن القیم نے امام احمد کے جن اصول خمسہ کا ذکر کیا ہے، ان کی ایک اصل یہ بھی ہے، کہ اگر کسی مسئلے میں صحابہ مختلف الرائے ہوتے تھے، تو ان میں سے وہ قول قبول کر لیتے تھے، جو کتاب وسنت سے قریب تر ہو، اگر یہ صورت نہ ہو سکتی، تو ان کا اختلاف ذکر کر دیتے، لیکن کسی صورت میں بھی صحابہ کے اقوال سے خروج نہ فرماتے۔

(۴) حدیث مرسل اور حدیث ضعیف

فقہ احمد کی چوتھی اصل یہ ہے، کہ وہ حدیث مرسل اور حدیث ضعیف کو قبول کر لیتے تھے، اگر مسئلہ زیر بحث میں کوئی دلیل اس کے خلاف نہ ہو تو ایسی صورت میں مرسل اور ضعیف حدیث کو وہ قیاس پر ترجیح دیتے، یاد رہے، کہ یہاں حدیث ضعیف سے مراد باطل اور منکر حدیث نہیں ہے، جس کی سند میں کوئی متہم راوی ہو جو قابل حجت نہ ہو سکتا ہو۔

(۵) قیاس

پانچویں اصل قیاس ہے یعنی اگر کسی مسئلے میں امام احمد کو نص نہ ملتی، نہ کسی صحابی کا قول دستیاب ہوتا اور نہ کوئی مرسل یا ضعیف حدیث ہاتھ آتی، تو قیاس سے کام لیتے تھے، لیکن قیاس کا استعمال وہ شدید اور خاص ضرورت ہی کی صورت میں کرتے تھے۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۶)

یہ ہیں، وہ اصول خمسہ جن کا ذکر حافظ ابن القیم نے اپنی کتاب اعلام الموقعین کے شروع میں کیا ہے، لیکن اگر حنابلہ کی کتب اصول کا نظر غائر سے مطالعہ کیا جائے اور حافظ ابن القیم کی متفرق اور مختلف کتابوں کو پیش نظر رکھا جائے، تو ان اصول میں حک و اضافہ ہوسکتا ہے، مثلاً پہلی اصل یہ ہے، کہ نص سے مراد صرف کتاب نہیں بلکہ کتاب و سنت دونوں ہیں، امام احمد بھی امام شافعی کی طرح نص بول کر دونوں کو مراد لیتے ہیں، اس لیے کہ سنت کتاب کی شارح اور اس کے اجمال کی تفصیل کرتی ہے، لہٰذا کتاب و سنت کا قطعاً ایک ہی مرتبہ ہے، اسی طرح دوسرے اصل میں تیسرے کا اور پہلے اصل میں چوتھے کا تداخل ممکن ہے، اگرچہ حافظ ابن القیم کے بیان کردہ طریقے میں بعض مصلحتیں ضرور ہیں لیکن وہ اصل کو مانع نہیں، حافظ ابن القیم کے بیان کردہ اصول اب چار ہی رہ جاتے ہیں، جو یہ ہیں۔

(۱) کتاب (۲) سنت (۳) فتاوائے صحابہ (۴) قیاس

اضافہ شدہ اصول

ان اصولوں پر جو مزید اضافہ ہوسکتا ہے، وہ یہ ہے:

(۱) استصحاب (۲) مصالح مرسلہ (۳) سد ذرائع

کتب حنابلہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے، کہ امام احمد اجماع کو حجت مانتے تھے، بشرطیکہ وہ واقع ہو چکا ہو اور کسی ایسے معین مسئلے میں ہو، جس کے بارے میں اب تک اجماع نہ ہوا ہو، امام شافعی، ابو یوسف اور خود امام احمد کا مسلک اس بارے میں یہی ہے۔

ذیل میں ان اصولوں سے متعلق تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔

الکتاب

قرآن کریم شریعت اسلامیہ کا ستون، سرچشمہ اول اور اصل و اساس ہے، اس میں وہ قواعد اور احکام ہیں، جو زمان و مکان کے تغیر کے ساتھ تغیر پذیر نہیں ہوتے، یہ وہ احکام و قواعد ہیں، جو دنیائے انسانیت کے لیے عمومی اور یکساں طور پر مفید اور نفع بخش ہیں، ان میں کسی فریق کو کسی دوسرے فریق پر کوئی خصوصیت اور امتیاز حاصل نہیں، قرآن کے اندر کلی احکام کا بیان ہے، اسلام کے صحیح عقیدوں کا ذکر ہے، اس میں وہ دلیل محکم ہے، جو اس دین متین کی حجت پر دال ہے۔

قرآن چوں کہ شریعت اسلامیہ کا سر چشمہ اول ہے، لہٰذا شروع ہی سے علما اس کی تعلیم اور دراست پر توجہ کرتے چلے آئے ہیں، انہوں نے اس کی عبارات، اشارات، ظاہر اور نص سے احکام کا استخراج کیا ہے، متشابہہ کی تاویل اور مجمل کی تفصیل میں اجتہاد سے کام لیا ہے، وضاحت طلب چیزوں کو کھول کر بیان کیا ہے، قرآن کے عام اور خاص، ناسخ، منسوخ اور طریق نسخ، کیفیت وقوع نسخ کو وضاحت سے بیان کیا ہے، علما کا ہر گروہ اور طبقہ اس بات پر متفق ہے، کہ اسلام کے شرائع اور قواعد کا مصدر اول قرآن کریم ہی ہے۔

اس جگہ ایک بات میں ہم تھوڑی سی وضاحت چاہتے ہیں، کہ اس میں امام احمد کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اور یہ اس لیے کہ یہ مسئلہ فقہ حنبلی کی گویا روح ہے، اور اس بارے میں امام احمد سے بحث بھی مروی ہے۔

حدیث کا مرتبہ

وہ مسئلہ یہ ہے، کہ استنباط احکام کے سلسلہ میں سنت قرآن سے متاخر ہے یا مساوی؟ لیکن تاخر وتساوی کا سوال نفس مرتبہ میں نہیں، اس لیے کہ کسی اہل علم کے نزدیک مرتبے میں سنت قرآن کے مساوی نہیں کیوں کہ اس پر سب کا اتفاق ہے، کہ وہ قرآن سے بلحاظ مرتبہ متاخر ہے، وجہ اس کی یہ ہے، کہ قرآن اسلام کی سب سے پہلی حجت و برہان ہے، وہی اسلام کا اولین سرچشمہ ہے، اور اس لیے بھی کہ سنت اپنی حجیت کے ثبوت میں قرآن مجید کی مرہون منت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۔ (الاحزاب)

اللہ اور رسول جب کسی امر کا فیصلہ فرما دیں، تو کسی مرد مومن اور کسی مومنہ عورت کے لیے اس میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے؛

مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ (الحشر)

رسول جو کچھ فرمائیں مان لو جس بات سے منع کریں رک جاؤ۔

خدائے بزرگ وبرتر فرماتا ہے؛

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (انساء)

جس نے رسول کریم کی اطاعت کی، اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی۔

اس طرح کی متعدد آیتیں قرآن کریم میں موجود ہیں، جو سنت کی حجیت پر دلالت کرتی ہیں اور جب سنت کی حجیت قرآن سے ثابت ہے تو ماننا پڑے گا، کہ اس کا مقام قرآن کے بعد ہے، اس کے برابر اس سے پہلے نہیں کیوں کہ اگر قرآن نہ ہوتا تو سنت کی حجیت کی دلیل کہاں سے ملتی؟

پس اعتباری اور استدلالی طور پر قرآن سے سنت کا متاخر ہونا ایسی بات ہے، جس پر نہ کسی طرح کا شک وشبہ وارد کیا جاسکتا ہے، نہ اہل نظر اس باب میں مختلف الآرا ہیں، بلکہ یہاں موضوع بحث یہ ہے، کہ قرآن سے استخراج احکام کے سلسلہ میں سنت کا وجود لازمی ہے، اس لیے کہ سنت درحقیقت قرآن کا بیان اور اس کی توضیح ہے، چنانچہ خدائے تعالیٰ خود فرماتا ہے:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ ۔ (النحل)

یہاں ذکر سے مراد سنت ہی ہے۔

شافعیہ سنت کو قرآن کا بیان اور توضیح مانتے ہیں، چنانچہ اگر ظاہر قرآن سنت کے خلاف ہو تو وہ سنت کو رد نہیں کرتے، بلکہ ظاہر قرآن کے عام کو سنت سے خاص کر دیتے ہیں، وہ قرآن کو سنت سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے کہ سنت قرآن کا بیان اور اس کی تفسیر ہے۔

کتاب اور سنت میں تعارض ممکن نہیں

امام احمد اس مسلک پر بڑی سختی کے ساتھ قائم ہیں، کہ سنت نبویہ قرآن کی مفسر ہے، وہ اسے بھی فرض نہیں کرتے، کہ ظاہر قرآن اور سنت میں تعارض واقع ہوسکتا ہے، اس لیے کہ ظاہر قرآن اسی چیز پر محمول کیا جائے گا جس جانب سنت رہنمائی کر رہی ہے، کیوں کہ سنت قرآن کا بیان ہے اور قرآن کے احکام وفقہ کی مفسر ہے، امام احمد نے ایک کتاب ان لوگوں کے رد میں لکھی ہے، جو ظاہر قرآن کو لے لیتے ہیں اور سنت کو ترک کر دیتے ہیں، اپنی مذکورہ کتاب کے مقدمہ میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

> خدائے بزرگ وبرتر نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی کتاب نازل فرمائی جو اس کی پیروی کرنے والوں کے لیے ہدایت اور نور ہے، خدا نے اپنے رسول کو قرآن کے ظاہر اور باطن، خاص وعام اور ناسخ ومنسوخ کا رہنما بنایا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب الٰہی کی تعبیر اور اس کے مفہوم ومعنی کی وضاحت کرنے والے تھے، اس بات کو ان صحابہ نے دیکھا، جنہیں خدا نے اپنے نبی کی رفاقت کے لیے چنا تھا، اور انہوں نے رسول کی تعبیریں نقل کیں، پس وہ لوگ اپنے مشاہدہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ اس حقیقت کے آشنا تھے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی قرآن وسنت کی تعبیر کرنے والے رہ گئے ہیں۔

پھر امام احمد نے بہت سی آیات کریمہ نقل کی ہیں، جو اطاعت رسول پر دال ہیں اور ان لوگوں کی تردید کرتی ہیں، جو ظاہر قرآن کو سنت پر مقدم رکھتے ہیں۔

امور سہ گانہ

اس سے تین امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) اول یہ کہ قرآن کا ظاہر سنت پر مقدم نہیں کیا جائے گا، یہ امام احمد کا بہت صاف اور واضح قول ہے۔

(۲) دوم یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرآن کے مفسر تھے، آپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا، کہ وہ آیات قرآنی کی تاویل یا تفسیر کرے، اس لیے صرف سنت ہی قرآن کا بیان ہے، اور یہ بیان سنت کے علاوہ کسی دوسرے طریقے

سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔

(۳) سوم یہ کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اثر مروی نہ ہو تو صرف صحابہ ہی تفسیر قرآن کا حق رکھتے ہیں، اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن کی آنکھوں کے سامنے قرآن اترا، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیات قرآن کی تاویل سنی اور جو سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت اچھی طرح واقف ہیں، لہٰذا ان کی تفسیر سنت ہی قرار دی جائے گی۔

امام احمد نے اس بات کی تصریح کی ہے، کہ قرآن کی تفسیر صرف اثر سے ہی کی جا سکتی ہے۔

امام احمد اور حنابلہ کی ان نقول سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، کہ ظاہر قرآن کے محتملات میں سے ایک احتمال کی تعیین سنت ہی سے ہو سکتی ہے، اور اگر کسی جگہ سنت موجود نہ ہو تو قرآن کریم اپنے ظاہر پر رہے گا، مثلاً ایسے الفاظ جو عموم پر دلالت کرتے ہیں، حنابلہ کے نزدیک ان کی ظاہری دلالت عموم پر ہو گی، اور اسی اصول پر کلام کی تفسیر کی جائے گی، البتہ سنت میں کوئی ایسی چیز پائی جائے جو خصوص پر دلالت کرتی ہو تو قرآن کا عام اسی پر محمول کیا جائے گا، بنابریں سنت خواہ احادیث مستفیضہ پر مشتمل ہو یا متواترہ یا آحاد پر، بہر حال سنت قرآن کے عام کو خاص، اس کے مطلق کو مقید اور اس کے مجمل کی تفسیر کرے گی، کیوں کہ سنت قرآن کا بیان ہے، لہٰذا قرآن اور سنت کے مابین تعارض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس نقطہ نظر کے مطابق امام احمد سنت کو قرآن پر اس لیے بالا سمجھتے ہیں، کہ وہ اس کی تفسیر کرتی ہے اور اس کے احکام کی وضاحت کرتی ہے۔

شاطبی اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

علما کے نزدیک سنت، کتاب کے مفہوم و معنی کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے، اس کے برعکس کتاب، سنت کے مفہوم و معنی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرتی، اس لیے کہ کتاب یعنی قرآن میں جو مسئلہ بیان کیا گیا ہے، وہ دو یا دو سے زیادہ امور کا محتمل ہو سکتا ہے، وہ سنت ہی ہے، جو ان امور میں سے ایک کی تعیین کرتی ہے، ایسی صورت میں سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا، اور قرآن کا ظاہری مقتضا ترک کر دیا جائے گا، مثلاً قرآن نے چور کے لیے قطع ید کا حکم صادر فرمایا ہے، لیکن سنت اس عام حکم کو یوں خاص کرتی اور بتاتی ہے، کہ اتنی مقدار میں چوری کرنے والے کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، اس سے کم پر نہیں، زکوۃ کے بارے میں قرآن کا جو حکم ہے، اس کے ظاہر الفاظ سے یہ مفہوم نکلتا ہے، کہ زکوۃ ہر مال پر لی جائے گی، سنت اس عام حکم کو اس طرح خاص کر دیتی ہے، اس قسم کے مال پر زکوۃ لی جائے گی ہر مال پر نہیں، اسی طرح قرآن میں یہ بتانے کے بعد کہ فلاں فلاں عورتوں سے نکاح نہیں کیا جا سکتا فرمایا ہے، ان کے علاوہ جس سے چاہو نکاح کر لو، لیکن سنت یہ بتاتی ہے، کہ کوئی عورت اپنی پھوپھی یا خالہ کی سوت نہیں بن سکتی۔ (موافقات شاطبی ج ۲ ص ۲۹)

سنت

امام احمد کے اصولوں کے مطابق سنت دوسری اصل ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ یہ اصل ثانی اصل اول کا ایک

حصہ ہے، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، کہ حافظ ابن قیم نے نصوص صحیحہ مسندہ کے بارے میں بتایا ہے، کہ امام احمد انہیں ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں، چنانچہ کتاب اور سنت صحیحہ کو اصل واحد قرار دیا ہے، اس لیے کہ سنت بیان قرآن ہے، اس کی متمم ہے، ان دونوں کے مابین تعارض پیدا ہی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ سنت کی حیثیت تفسیر کی ہے، اگر بظاہر تعارض معلوم ہو تو سنت کی تاویل کر لی جائے گی۔

لیکن سنت کی حیثیت قرآن کے اصل اول ہونے کے منافی نہیں ہے، کیوں کہ قرآن ہی سے حدیث کی حجیت ثابت ہوتی ہے، باقی رہا قرآن کا اعتباری تقدم تو وہ دونوں کے مابین تلاقی سے منافات نہیں رکھتا۔

علامہ شاطبی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں، اعتباری طور پر قرآن کے مقابلہ میں سنت کا موخر ہونا ثابت ہے، دلیل یہ ہے:

(۱) قرآن مجید اجمالاً وتفصیلاً قطعی ہے اور سنت اگرچہ اجمالاً قطعی ہے، لیکن تفصیلات میں مظنون، ظاہر ہے کہ مقطوع، مظنون پر مقدم ہوتا ہے، لہٰذا ثابت ہوا، کہ سنت پر کتاب تقدم رکھتی ہے۔

(۲) اخبار و آثار سے بھی یہ ثابت ہے، کہ کتاب، سنت پر مقدم ہے، جیسا کہ حدیث معاذ سے واضح ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ کو یمن بھیجتے وقت دریافت فرمایا، وہاں تم کس طرح امور کا فیصلہ کرو گے؟ معاذ نے کہا، کتاب اللہ سے، آپ نے دریافت فرمایا اگر اس میں وہ بات نہ ملی تو؟ معاذ نے جواب دیا، پھر میں سنت رسول اللہ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ آپ نے پھر پوچھا، اور اگر سنت میں بھی نہ پایا پھر؟ معاذ نے عرض کیا، پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔

قرآن وحدیث کا فرق

تقدم قرآن اور تاخر سنت کے سلسلہ میں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے، کہ قرآن ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہے، وہ اس طرح ثابت ہے، کہ پھر کوئی مجال شک باقی نہیں رہتی، لیکن سنت اس وقت قبول کی جا سکتی ہے، جب وہ بالکل موثق ہو، اور مصادر مختلفہ سے ثابت ہو کر مرتبہ تواتر یا شہرت واستفاضہ پر پہنچ چکی ہو، یا خبر واحد ہو تو اس کا صدق وضبط ونقل ہر اعتبار سے پایہ تصدیق کو پہنچ چکا ہو۔

امام احمد اور حدیث مرسل

امام احمد مرسلات کو حجت مانتے ہیں، لیکن صحابی کے فتوے سے اسے موخر رکھتے ہیں، اور اسے احادیث ضعیفہ کے ذیل میں شمار کرتے ہیں، بوقت ضرورت وہ احادیث مرسلہ کو قبول کر لیتے ہیں، اس لیے وہ قیاس ورائے کے مقابلے میں احادیث ضعیفہ کی بنیاد پر فتویٰ دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ امام احمد احادیث مرسلہ کو اخبار ضعیفہ میں شمار کرتے تھے، جس کی اصل رد اور عدم قبول ہے، یہی وجہ تھی، کہ وہ صحابی کے فتوے کو اس پر مقدم رکھتے تھے، لیکن حدیث صحیح پر مقدم نہیں رکھتے تھے، یہ تقدیم اس بات کی دلیل ہے، کہ وہ اسے ضعیف سمجھتے تھے، نہ صحیح اس طرح وہ ان محدثین کی طرف میلان رکھتے تھے، جو مرسل حدیث کو ضعیف حدیث کی مانند مانتے ہیں، اور ضرورت شدید ہی کی صورت میں اس کی بنیاد پر فتویٰ دیتے تھے، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں، کہ امام احمد مرسلات کے قبول کرنے میں مسامحت سے کام نہیں لیتے تھے، اس لیے کہ اسے ضعیف خیال کرتے تھے اور اگر اس کی بنیاد پر فتویٰ دیتے تھے تو ضرورتاً۔

فتاوائے صحابہ کی حدیث ضعیف پر ترجیح

امام احمد بھی حدیث ضعیف کو صحیح کے مرتبہ میں نہیں رکھتے، بلکہ صحابی کے فتوے کو اس پر ترجیح دیتے ہیں، اپنے بیٹے عبداللہ کی ایک روایت میں انہوں نے اپنے مسلک کی تصریح کی ہے، میرے نزدیک رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث زیادہ قابل قبول ہے۔ عبداللہ کہتے ہیں:

میں نے اپنے والد (احمد بن حنبل) سے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا، جو ایک شہر میں رہتا ہے، جہاں ایک محدث ہے، جو صحیح حدیث کو سقیم سے پرکھنے کی استعداد نہیں رکھتا اور ایک (فقیہ) صاحب رائے ہے، اب اگر وہ شخص دین کے معاملہ میں کچھ پوچھنا چاہے تو کس سے پوچھے؟ امام احمد نے جواب دیا، اسے اہل حدیث سے پوچھنا چاہیے، صاحب رائے سے نہ دریافت کرنا چاہیے۔

صحابہ کے فتاویٰ اور مسلک ائمہ اربعہ

ہر امام کی فقہ کی بنیاد صحابہ و تابعین کے فتاوی کے کسی نہ کسی حصے پر ہے، جن سے ان کا فقہی ملکہ پختہ ہوا اور ان ہی کے طریق استنباط پر ہر امام نے اپنے اجتہاد کی گاڑی چلائی، مثلاً امام ابوحنیفہ ہیں، آپ کی عراقی فقہ حضرت ابن مسعود کی طرف منسوب ہے، جس میں انہوں نے بواسطہ حماد، ابراہیم نخعی کے طریقے پر خاص مہارت پیدا کی۔

اسی طرح امام مالک کا فقہی انداز فقہائے سبعہ سے ماخوذ ہے، جسے انہوں نے زہری وغیرہ کے ذریعہ حاصل کیا اور اسی پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی۔

ان دونوں کے بعد امام شافعی آئے، انہوں نے حدیث کی تحصیل پختہ طور پر امام ابن عیینہ سے کی، بعدہ امام مالک کی فقہ میں ماہر ہوئے اور امام محمد سے مل کر فقہ مدنی اور فقہ عراقی کا تقابلی مطالعہ کیا اور اپنی فطانت و ذہانت سے اس موازنہ کو منقح فرما کر لوگوں کے سامنے اجتہاد و استنباط کے قواعد منضبط طور پر پیش کیے اور یہی وہ علم اصول فقہ ہے، جس کی ضبط و تدوین کا سہرا امام شافعی کے سر ہے، رہے امام احمد تو احادیث مرفوعہ، عہد صحابہ کے فیصلے، تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین کے فتاویٰ آپ کے مکتب فکر کا مواد ہے، آپ کی فقہ نے انہی سے غذا پائی، مذکورہ بالا مختلف تخریجات فقہیہ کو بھی آپ نے حاصل کیا، امام شافعی کے طریق

استنباط کو خصوصی طور سے اپنایا اور زیادہ تر ان ہی پر اپنے طریق اجتہاد کی بنیاد رکھی۔

دین کی اصل

امام احمد کے سامنے صحابہ کا یہ فقہی مجموعہ برابر رہا کرتا تھا، وہ اس کو حجت مانتے تھے، اگر چہ فتاوائے صحابہ کو حدیث صحیح مرفوع سے دوسرے درجے میں رکھتے تھے اور یہ قطعی ہے، کہ کسی بھی صحابی کے فتوے کی موجودگی میں خود اجتہاد کبھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن آپ کے ہاں فتاوائے صحابہ کے دو درجے تھے (۱) کسی صحابی کا ایسا فتویٰ جس کی مخالفت کسی دوسرے صحابی سے منقول نہ ہو (۲) کسی مسئلہ میں صحابہ کے دو یا تین قول ہوں۔

اول الذکر صورت میں حضرت امام مانتے اسی فتوے کو تھے، لیکن اپنے استاذ امام شافعی کی موافقت کرتے ہوئے اسے صحابہ کا اجماعی مسئلہ نہیں قرار دیتے تھے، جیسا کہ حنفیہ کہتے ہیں، اور دوسری صورت کے بارے میں آپ سے مختلف اقوال منقول ہیں، بعض کہتے ہیں، سب ہی کو درست سمجھتے تھے، اندریں صورت وہ متعدد اقوال امام صاحب کے بھی متعدد اقوال سمجھے گئے ہیں، وجہ یہ کہ آپ اس امر کو مناسب نہیں سمجھتے تھے، کہ اپنی رائے سے کسی صحابی کے قول کو مرجوح قرار دیں، کیوں کہ صحابہ تو سب ہی نور نبوت سے مستنیر ہیں۔

اسحاق بن ابراہیم بن ہانی مسائل امام احمد میں کہتے ہیں:

ابو عبداللہ (احمد بن حنبل) سے کہا گیا، کہ ایک شخص ہے، جس سے کسی مختلف فیہ مسئلہ کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے، اسے کیا کرنا چاہیے، امام احمد نے جواب دیا، اسے وہ کہنا چاہیے جو کتاب وسنت کے موافق ہو اور جو کتاب وسنت کے موافق نہ ہو اس سے رک جانا چاہیے۔

اس روایت کی بنیاد ظاہر اور واضح ہے، اس لیے کہ کتاب وسنت ہی اسلام کی اصل ہیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے، کہ نصوص سے متعلق تمام اقوال ایک ہی درجہ کے ہوں یا فتوے کے موضوع سے پوری مطابقت رکھتے ہوں، پس ضروری ہے، کہ ان میں سے وہ قول اختیار کر لیا جائے جو مسئلہ زیر بحث کے لیے زیادہ مناسب اور نصوص سے زیادہ قریب ہو۔

اقوال صحابہ میں ترجیح کا اصول

اس سلسلے میں امام احمد سے ایک اور روایت بھی مروی ہے، وہ یہ کہ جب اقوال صحابہ میں اختلاف دیکھتے تھے، تو یہ نہیں کرتے تھے، کہ جس قول کو نصوص سے قریب پائیں، اسے اختیار کر لیں، بلکہ سب سے پہلے اقوال خلفائے راشدین کی جستجو کرتے تھے اور انہی کو قول فیصل کی حیثیت سے مان لیتے تھے۔

ایک ادعا اور اس کی تردید

بعض علما نے یہ دعویٰ کیا ہے، کہ امام احمد کو جب کسی صحابی کا فتویٰ مل جاتا، پھر وہ نصوص کی طرف ملتفت اور متوجہ نہیں

ہوتے تھے، کیوں کہ صحابی کا فتویٰ انہیں استنباط سے بے نیاز کر دیتا تھا، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ فتوائے صحابہ کی موجودگی میں وہ اجتہاد کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے، لیکن اس زعم باطل کی حافظ ابن قیم نے تردید کی ہے، وہ یہ ثابت کرتے ہیں، کہ امام احمد نص کو صحابی کے فتویٰ پر مقدم رکھتے تھے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

امام احمد کو جب نص مل جاتی تھی، تو وہ اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور کسی دوسری مخالف چیز کی طرف ملتفت نہیں ہوتے تھے، خواہ وہ قول مخالف کسی کا بھی ہو، جیسا کہ انہوں نے مسلک عمر کے برخلاف مبتوتہ کے بارے میں فاطمہ بنت قیس کی حدیث مان لی ہے، اسی طرح عمار بن یاسر کی حدیث ہے، جو جنبی کے تیمم کے سلسلہ میں مروی ہے، اور حضرت عمر کا فتویٰ جس کے خلاف ہے، اسی طرح انہوں نے ابن عباس اور ایک روایت کے مطابق حضرت علی کا وہ فتویٰ ترک کر دیا، جس میں ایسی حاملہ عورت کی عدت کے بارے میں جس کا شوہر دوران حمل وفات پا گیا ہو، دونوں مدتوں میں سے زیادہ بعید مدت کا اعتبار کیا گیا ہے اور حضرت سبیعۃ الاسلمیہ کی حدیث قبول کر لی، کیوں کہ یہ ان کے نزدیک صحیح تھی۔

اس طرح کی کافی مثالیں تلاش سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

ان تصریحات سے معلوم ہو گیا، کہ امام احمد حدیث مرفوع کی موجودگی میں فتوائے صحابی کو رد کر دیتے تھے۔

کبار تابعین کا فتویٰ قابل قبول ہے

اس اختلاف اور امام احمد کی جانب منسوب روایات کی روشنی میں مشہور قول علمائے حنابلہ کا یہی ہے، کہ امام احمد اکثر مواقع پر اپنی رائے سے تقویٰ اور تورع کی بنا پر گریز کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی ضعیف سا اثر بھی نہ ملتا، تو پھر وہ علمائے حدیث کے فتوے پر عمل کرتے تھے، جیسے امام مالک، امام ثوری، امام سفیان بن عیینہ اور امام اوزاعی وغیرہم۔

بہر حال یہ ثابت ہے، کہ امام احمد کبار تابعین کے فتوے قبول کر لیتے تھے، مثلاً سعید بن مسیب اور مدینہ کے فقہائے سبعہ جن تک حضرت عمر، ابن عمر اور زید بن ثابت کی فقہ پہنچی، لیکن ان اقوال کو وہ اصل فقہی کی حیثیت سے قبول نہیں کرتے تھے، بلکہ از راہ احتیاط قبول کرتے تھے، خبر ضعیف میں بھی ان کا مسلک یہی تھا، کہ اسے صحیح النسبت نہ جانتے ہوئے بھی قبول کر لیتے تھے، وہ اس کے صدق پر حکم نہیں لگاتے تھے، بلکہ اس لیے مان لیتے تھے، کہ تقاضائے احتیاط یہ ہے، کہ قیاس کے مقابلہ میں اسے ترجیح دی جائے۔

اجماع

حافظ ابن قیم نے فقہ حنبلی کے اصولوں میں اجماع کو شمار کیا، بلکہ وہ امام احمد سے یہاں تک روایت کرتے ہیں، کہ جو کسی مسئلہ میں اجماع کا ادعا کرتا ہے، وہ جھوٹا ہے، وہ یہ بھی کہتے ہیں، کہ اجماع کا وجود ثابت بھی ہو جائے، تو اس کا علم بڑا مشکل امر ہے، ہم سمجھتے ہیں، کہ مسئلہ اجماع کی تفصیلات سے بچتے ہوئے، امام احمد کے نظریات کی حد تک اس کے وجود، حجیت، مرتبہ حجیت

وغیرہ امور پر کچھ گفتگو کریں۔

بحث شروع کرنے سے قبل معلوم ہونا چاہیے، کہ اصول فقہ کے مسائل (جن میں اجماع کا مسئلہ بھی داخل ہے) کے بیان کرنے کے لیے سب سے پہلے جس شخص نے قلم اٹھایا ہے، وہ امام احمد کے استاذ حضرت امام شافعی تھے، انہوں نے اپنی کتاب ''ابطال الاستحسان'' میں اجماع کی حقیقت یہ بیان کی ہے، کہ جس مسئلہ کو ہم اجماعی کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے، کہ جن اہل علم سے ہم ملے وہ یوں ہی کہتے تھے اور اپنے سے سابق لوگوں سے بھی اس طرح نقل کرتے تھے، اسی قسم کے اجماع کا امام احمد کو انکار ہے، حنابلہ بھی اجماع کی تعریف قریباً ایسی ہی کرتے ہیں۔

امام احمد وجود اجماع کی مطلق نفی نہیں کرتے

امام احمد اور ان کے استاذ امام شافعی دونوں ایک ہی راستے پر گامزن ہیں، وہ یہ ہے، کہ اجماع حجت ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کا دعوی کرتا ہوا، اس کے بل پر نصوص صریحہ کو چھوڑ دے تو اس کا یہ دعوی قبول نہیں کیا جائے گا، یہ دونوں بزرگ اس بات پر متفق ہیں، کہ جن مسائل کا کوئی اختلافی پہلو سامنے نہ ہو، ان کے بارے میں (اجماع کا دعوی کرنے کے بجائے) یہ کہہ دینا کافی ہے، کہ اس مسلک کے خلاف کوئی بات ہمارے علم میں نہیں ہے، ہاں اگر کسی صاحب علم کے سامنے ایسے مسائل سے سابقہ پڑے جو قرون اولیٰ سے لے کر اس کے زمانے تک مسلمہ چلے آرہے ہیں اور کوئی اختلافی قول منقول نہیں، اور اس کے مخالف کوئی حدیث بھی موجود نہیں، تو ایسی حالت میں وہی قابل قبول ہے، سب کے خلاف کوئی انوکھا فتویٰ نہیں دینا چاہیے، مگر اس کے مخالف کوئی حدیث مل جانے کی صورت میں اس کو فوراً ترک کر دینا ضروری ہے۔

اب اس معاملہ میں ہم دو امور کا اور ذکر کریں گے:

(۱) یہ کہ امام احمد تمام علمی مسائل میں وجود اجماع کی مطلق نفی نہیں کرتے، بلکہ ان دعاوی کی نفی کرتے ہیں، جو ہم عصر علما ایک دوسرے کے خلاف کرتے ہیں، جیسے امام ابو یوسف نے امام اوزاعی کے دعوے کی نفی کی، یا امام شافعی نے اپنے مناظر کے دعوے کی تردید کی جو اجماع کا نام لے کر حدیث صحیح کا رد کر دینا چاہتا تھا۔

(۲) امام احمد یہ بات مانتے تھے، کہ بہت سے ایسے مسائل ہیں، جن کے بارے میں کسی اختلاف کا علم نہیں اور یہ کہ ایسے مسائل قبول کر لیے جائیں گے اگر کوئی حدیث ان کے بجائے نہ پائی جائے، لیکن ان کے بارے میں اجماع کامل کا دعوی نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہی کہا جا سکتا ہے، کہ کسی مخالف قول کا علم نہیں ہے، اور یہ بات بھی تقاضائے ورع وتقویٰ کے علاوہ حق اور امر واقعی بھی ہے۔

مسئلہ پر امر واقع کی حیثیت سے غور

جب یہ بات ہے، کہ امام احمد اجماع کے وجود کے سرے سے مخالف نہیں تھے، وہ مسائل جزئیہ میں دعوائے اجماع کی اس وقت نفی کرتے تھے، جب وہ دلیل کے مقابلہ میں استعمال ہوتا تھا، لہٰذا یہ انکار عقلی طور پر اس کے وجود

سے انکار نہیں تھا، جیسا کہ نظام معتزلی اور بعض شیعہ کا خیال ہے، یعنی امام احمد کو انکار اجماع کے وجود سے نہ تھا، البتہ اس کے علم سے انکار ضرور تھا، یہ وجہ تھی، کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ ’’مجھے اس کے خلاف کوئی بات معلوم نہیں‘‘۔

اور یہ لفظ جس طرح وجود مخالف کی نفی نہیں کرتا، اسی طرح وجود مخالف کو ثابت بھی نہیں کرتا، جھگڑا جو کچھ تھا، وہ اس کے علم ووقوع کا تھا، نہ کہ وجود کا، امام شافعی نے اس پر فلسفہ اجتماعی کی حیثیت سے غور کیا ہے اور امام احمد اس پر نفس واقعہ کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں، اپنے فتاوی میں وہ فلسفیانہ نظر سے کام نہیں لیتے، امر واقعہ کی حیثیت سے غور کرتے ہیں، اسی لیے وہ اس پر اکتفا کر لیتے ہیں، کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں کوئی مخالف بات میرے علم میں نہیں ہے اور اس مدعی کو جھوٹا قرار دیتے ہیں، جو مخالفت کے عدم علم کی وجہ سے اجماع کا دعوی کرنے لگتا ہے، چنانچہ فقہ حنبلی کی کتاب ’’المدخل‘‘ میں بیان کیا گیا ہے۔

کسی شخص کو یہ گمان نہیں کرنا چاہیے، کہ امام احمد عقلی طور پر اجماع کے منکر تھے، وہ ایسے اجماع کے علم سے انکار کرتے تھے، جو ایسے خاص واقعہ پر ہوا ہو، جس سے جملہ اقطار اسلامیہ واقف ہو گئے ہیں، ہر مجتہد کو اس کا پتہ چل گیا ہو اور پھر سب نے قول واحد پر اتفاق کر لیا ہو یہ مرحلے طے ہونے کے بعد مدعی اجماع کو اس کا علم بھی ہو گیا ہو، ہر انصاف پسند سمجھ سکتا ہے، کہ ایسا ہونا عادتاً مشکل ہے، ہاں! ایسے اجماع کا علم صرف عہد صحابہ کے متعلق ممکن ہے، کیوں کہ ان دنوں مجتہد کم ہونے کے علاوہ ان کے فتاوی کو محدثین کرام نے خوب نقل و روایت کیا ہے، بنابریں کسی صاحب عقل کے لیے مناسب نہیں ہے، کہ حضرت امام پر اجماع کے مطلقاً انکار کی تہمت رکھ کر افترا کا ارتکاب کرے۔

بہتر ہوگا، کہ ذیل میں ہم چند ایسے مسائل کا ذکر کر دیں، جنہیں امام احمد نے اس اعتبار سے مانا، کہ ان کی مخالفت میں کوئی قول موجود نہیں تھا، یا اگر تھا، تو وہ شاذ تھا، جس کی کوئی اہمیت نہیں، حافظ ابن قیم نے کچھ ایسے مسائل بیان کیے ہیں، جن کے استنباط کی اساس قیاس ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

مجمع علیہ قیاس کی ایک مثال کتے کے سوا دوسرے شکاری جانوروں کا استعمال ہے، جو کلاب پر قیاس کر لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ ۔ (المائدۃ)

اسی طرح اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ۔ (النور)

از روئے قیاس محصنات (پاک دامن عورتوں) میں محصنون (پاک دامن مردوں) کو بھی شامل کر لیا گیا۔

اسی طرح لونڈیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ۔ (النساء)

اسی ذیل میں غلاموں کو بھی قیاس کر کے شامل کر لیا گیا۔

شاذ اختلاف سے قطع نظر یہ سارے مسائل جمہور علما کے اجماع پر مبنی ہیں۔

ان اجماعات کا امام احمد نے دوسرے فقہا سمیت برابر احترام کیا ہے، اور ان کے خلاف کچھ سوچا ہی نہیں۔

قیاس

اسلامی فقہ میں ایک غیر منصوص حکم کے ساتھ وصف و حکم میں اشتراک کے باعث الحاق کا نام قیاس ہے۔

قیاس ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے، جو منصب افتا اختیار کرتا ہے، اس سے کوئی فقیہ بے نیاز نہیں ہوسکتا اور یہ تقاضاے فطرت کے بھی مطابق ہے، کیوں کہ فطرت انسانی چاہتی ہے، کہ جن چیزوں کے اوصاف کے باہم مربوط اور متماثل ہونے پر کافی اسباب موجود ہوں وہ احکام میں بھی مساوی ہوں، منطقی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو یہ ثابت شدہ حقیقت ہے، کہ تماثل (صفات) حکم میں تساوی کا موجب ہے۔

حافظ ابن قیم قیاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قیاس کے استدلال کا مدار اس چیز پر ہے، کہ متماثل چیزوں پر ایک جیسا حکم لگایا جائے اور علتوں میں اختلاف کی صورت میں دونوں کو حکم مین الگ الگ رکھا جائے، اگر متماثل چیزوں پر دو الگ الگ حکم لگائے جائیں، تو استدلال کی بنیاد شکست ہوجائے گی اور قیاس کا دروازہ بند ہوجائے گا۔

یہ ہے، قیاس کی حقیقت اور جب یہ بات ہے، کہ لوگوں کے حوادث اور مرویات و حالات کبھی ختم ہونے والے نہیں، تو پھر فقہ اسلامی میں قلت یا کثرت کے ساتھ حسب موقع قیاس سے کام لینا بھی ضروری ہے، اور قیاس کی طرف خود قرآن اور حدیث نبوی نے رہنمائی کی ہے، جب کہ ذکر احکام کے ساتھ ان کے اسباب و علل کی طرف بھی اشارے کیے گئے ہیں، جیسے قرآن کریم میں حیض کو ''اذی'' اور حدیث شریف میں گدھوں کے گوشت کو ''رجس'' فرمایا ہے، اسی طرح اور بھی حدیثیں وارد ہیں۔

لیکن ان امور مقررہ ثابتہ کے باوجود ہم علما کے ایک گروہ کو دیکھتے ہیں، جو قیاس کا انکار اور اس کی نفی کرتا ہے اور ایک دوسرا گروہ ہے جو قیاس کے بارے میں ضرورت سے زیادہ غلو سے کام لیتا ہے۔

امام احمد کا مسلک قیاس کے بارے میں

امام احمد بیک وقت محدث بھی تھے اور فقیہ بھی، انہوں نے جو موقف اس سلسلہ میں اختیار کیا ہے، وہ اعتدال پر مبنی ہے، وہ قیاس کی مطلق نفی نہیں کرتے، جیسا کہ ظاہریہ کرتے ہیں، ظاہریہ صرف نصوص سے استدلال کرتے ہیں اور نص کے علاوہ کسی طرف ملتفت نہیں ہوتے، اس طرح ظاہریہ نے بہت آسان راہ پسند کرلی، کیوں کہ اس طرح لوگوں کے فتویٰ پوچھنے کی مصیبت سے بچ گئے، لوگ مسائل پوچھنے کے لیے ان کی طرف اس طرح دوڑ دوڑ کر نہیں جاسکتے، جس طرح امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں، امام احمد نے راہ وسط اختیار کی، وہ قیاس صحیح کے قائل ہوگئے، چنانچہ ابن قدامہ

حنبلی نے ''روضہ'' میں ان کا قول نقل کیا ہے:

> کوئی شخص بھی قیاس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

یہ بالکل صحیح اور درست بات ہے، اس لیے کہ قیاس سے کام لیے بغیر کوئی فقیہ افتا کا کام کر ہی نہیں سکتا، وہ قیاس سے کام لینے پر مجبور ہے، اس لیے کہ لوگ ایسے حوادث سے دوچار ہوتے رہتے ہیں، جن کا جواب منصوص کو پیش نظر رکھ کر اور اس پر قیاس کر کے ہی دیا جا سکتا ہے اور فقیہ کے لیے یہ کسی صورت سے بھی ممکن نہیں ہے، کہ ہر حادثہ اور واقعہ کے لیے اس کو کتاب یا سنت یا فتوائے صحابہ سے نص اور صراحت مل سکے، پھر جب اسے نص نہیں ملے گی، تو یا تو وہ فتویٰ ہی نہ دے، ایسی صورت میں لوگ بہت بڑی مصیبت سے دوچار ہوں گے اور اپنے اعمال کے سلسلہ میں احکام دین نہیں معلوم کر سکیں گے، اور یا پھر لوگوں کی تکلیف کم کرنے کے خیال سے وہ قیاس سے کام لے۔

امام احمد کے بارے میں بعض علما کا ایک ادعا یہ بھی ہے، کہ وہ قیاس کی نفی کرتے تھے، چنانچہ ان سے روایت بیان کی جاتی ہے، کہ انہوں نے فرمایا:

> فقہ مجمل اور قیاس کے بارے میں گفتگو کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

لیکن قاضی ابو یعلیٰ حنبلی امام صاحب کی اس روایت کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ اگر قیاس کو نص کے مقابلہ میں لایا جائے تو وہ غیر معتبر ہے، بلکہ قیاس فاسد ہے۔

علاوہ ازیں سب ہی حنابلہ اس پر متفق ہیں، کہ امام احمد قیاس سے کام لیتے تھے، یہ لوگ اپنے اس قول کی تائید میں امام احمد کی عبارت، اقوال اور فروع منقولہ پیش کرتے ہیں، ان چیزوں سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے، کہ وہ قیاس کی نفی نہیں کرتے تھے، بلکہ اسے مانتے اور اس کے قائل تھے۔

صحابہ کرام اور قیاس

امام احمد کا یہ مسلک کوئی نیا نہیں تھا، بلکہ اتباع پر مبنی تھا، خود صحابہ کرام نے جن پر امام احمد اپنی فقہ کا مدار رکھتے ہیں، قیاس سے کام لیا ہے، ان کے اور امام احمد کے زمانہ میں اگرچہ کافی فاصلہ ہے، لیکن انہوں نے جہاں جہاں قیاس سے کام لیا ہے، وہ منقول ہیں، ان کے بہت سے احکام مستنبطہ قیاس ہی پر مبنی ہیں۔

چنانچہ صاحب اعلام الموقعین لکھتے ہیں:

> اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش آنے والے حوادث میں اجتہاد سے کام لیا کرتے تھے اور بعض احکام کو بعض احکام پر قیاس کیا کرتے تھے، وہ ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کیا کرتے تھے۔

اسی طرح امام شافعی کے شاگرد مزنی مسئلہ قیاس پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک دینی معاملات و مسائل کے احکام میں فقہا برابر قیاس سے کام لیتے

رہے ہیں، ان کا اس امر پر اجماع ہے، کہ حق کی نظیر حق ہے اور باطل کی نظیر باطل ہے، لہٰذا قیاس کا انکار جائز نہیں کیوں کہ وہ مماثل اشیا پر مماثل احکام کا نام ہے۔

بہر حال حضرات حنابلہ کی طرح ہم اس بات کو تو مانتے ہیں، کہ امام احمد قیاس سے کام لیتے تھے، البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے، کہ اس باب میں وہ توسع کے قائل نہ تھے، شدید ضرورت اور ناگزیر حالت میں وہ اس کا استعمال کرتے تھے، اس معاملہ میں وہ بالکل امام شافعی کے نقش قدم پر چلتے تھے، جیسا کہ خلال کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے، ان کی کتاب میں امام احمد سے منقول ہے، کہ میں نے امام شافعی سے قیاس کے بارے میں استفسار کیا انہوں نے فرمایا، ضرورت کے وقت اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔

استصحاب

استصحاب کا شمار بھی اصول فقہ میں ہوتا ہے، ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین استصحاب کے اصول پر متفق ہیں، اختلاف جو کچھ ہے، وہ اس بارے میں ہے، کہ کس حد تک اس اصول پر عمل کیا جاسکتا ہے، اس اصول پر جو فقہا سب سے کم عمل کرتے ہیں، وہ حنفیہ ہیں اور سب سے زیادہ جو گروہ اس پر عامل ہے، وہ حنابلہ کا ہے، حنابلہ کے بعد شافعیہ اور ان دونوں کے بین بین مالکیہ۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اس پر عمل درآمد کی بنیاد ادلہ شرعیہ میں وسعت پیدا کرنے یا نہ کرنے پر ہے، جو لوگ قیاس اور استحسان کے مفہوموں میں وسعت پیدا کر لیتے اور عرف کو اس وقت بھی دلیل شرعی مان لیتے ہیں، جب نص موجود نہ ہو، ان کے ہاں ایسے مسائل کی مقدار کم ہے، جن کی بنیاد استصحاب پر ہے، مثلاً حنفیہ اور دوسرے درجے پر مالکیہ، کیوں کہ یہ (مالکی) حضرات مصالح مرسلہ سے استنباط کے قائل ہیں، لہٰذا بہت کم مسائل میں انہوں نے استصحاب کو استعمال کیا ہے۔

لیکن حنابلہ اور شافعیہ چوں کہ قیاس کا اعتبار صرف ضرورت شدیدہ کے موقع پر کرتے ہیں، لہٰذا انہوں نے استنباطِ مسائل میں اس اصل سے زیادہ کام لیا ہے۔

استصحاب کی حقیقت

استصحاب کے معنی یہ ہیں، کہ جس بات پر زمانہ ماضی سے عمل درآمد ہوتا چلا آرہا ہے، وہ زمانہ حال اور مستقبل میں بھی اپنی اصل پر قائم رہے گی، بشرطیکہ اسے تغیر پذیر کرنے والا کوئی حکم موجود نہ، دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا، کہ جو بات زمانہ ماضی سے ہوتی چلی آرہی ہے، اور اس کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے، تو وہ اپنی جگہ پر باقی رہے گی۔

حافظ ابن قیم نے اس کی تعریف یوں کی ہے، کہ جو بات پہلے ثابت ہو، وہ اب بھی ثابت رہے، اور جو پہلے نہ ہو اب بھی نہ ہو، یعنی نفیاً اور اثباتاً کوئی امر پہلی حالت پر قائم رکھا جائے، یہاں تک کہ کوئی ایسی دلیل مل جائے جو اس میں تغیر کردے، یعنی یہ استدامت کسی ایجابی دلیل کی محتاج نہیں ہے، بلکہ تغیر پیدا کرنے والی دلیل کی موجودگی بھی اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے، اس کی مثال یہ ہے، کہ اگر کسی چیز کی خریداری پر دلیل قائم ہونے کی وجہ سے اس پر کسی شخص کی ملکیت موجود ہو، تو ایسی دلیل کی بنا

پر یہ ملکیت اس وقت تک قائم رہے گی، جب تک کسی دوسرے شخص کی طرف نقل ملکیت کی دلیل نہ ثابت ہو جائے، یہ دلیل صرف احتمال بیع سے زائل نہیں ہو سکتی، اصل چیز دلیل ہے، نہ کہ احتمال، اسی طرح شخص مفقود الخبر کا معاملہ ہے، حکم اس کی زندگی پر لگایا جائے گا، جب تک اس کی وفات کا ثبوت نہ مل جائے، یا ایسے آثار نہ پائے جائیں، جو اس کی وفات کو ظن غالب کی بنا پر یقینی بناتے ہوں، ایسی صورت میں بھی اس کی وفات پر حکم لگا دیا جائے گا۔

جب یہ بات ہے، کہ غلبہ ظن استمرار حال کی بنا پر استمرار حکم کا موجب ہوتا ہے، تو اس قسم کا غلبہ ظن استنباط کے لیے کوئی قوی دلیل نہیں سمجھا گیا، یہی وجہ ہے، کہ اگر کوئی ضعیف ترین دلیل استنباط بھی اس کے مقابلہ میں پائی جائے، تو وہ مقدم قرار دی جائے گی۔ چنانچہ خوارزمی کہتے ہیں:

استصحاب افتا میں بالکل آخری درجہ کی چیز ہے، مفتی سے اگر کسی مسئلہ کے بارے میں استفسار کیا جائے، تو سب سے پہلے وہ اس کا حکم کتاب اللہ ہی میں تلاش کرے گا، پھر سنت نبوی میں، پھر اجماع میں، پھر قیاس میں، اگر ان میں سے کسی میں بھی کوئی حکم نہ ملا، تو وہ نفی اور اثبات ہر صورت میں استصحاب کے مطابق حکم لگائے گا، یعنی مفتی کسی ایسی بات کی نفی کے بارے میں جو زمانہ ماضی سے چلی آ رہی ہے، متردد ہے، کوئی رائے نہیں قائم کر پاتا تو وہ اپنی حالت پر باقی رہے گی اور اگر اس (استصحاب) کے ثبوت کے بارے میں مذبذب ہے، پھر اصل عدم بقا ہے، یعنی وہ چیز اپنی حالت پر قائم نہیں رکھی جائے گی۔

گویا یوں سمجھیے، کہ اگر کسی چیز میں اصل اباحت ہے، تو وہ مباح ہی سمجھی جائے گی، جب تک اس کے حرام ہونے کی دلیل نہ پائی جائے اور اگر کسی چیز میں اصل عدم جواز ہو تو وہ اس وقت تک جائز نہیں قرار دی جائے گی، جب تک اس کی اباحت پر دلیل نہ مل جائے، اسی طرح اگر کسی امر میں اصل وجوب ہو، تو وجوب کا استمرار جاری رہے گا، یہاں تک کہ عدم وجوب پر کوئی دلیل ثابت ہو، اس بنا پر عقود و شروط میں اصل جو ہے، وہ وجوب وفا ہے اور یہ وجوب ان نصوص کے عموم کے مطابق ہے، جن میں ان کے ایفا کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا ہر عقد و شرط میں یہ ضروری و لازمی ہے، خواہ وہ کسی نوعیت کے کیوں نہ ہوں، جب تک ان میں سے کسی کے عدم وجوب وفا پر کوئی دلیل نہ ہو، اسی طرح منافع اور مصالح کی اصل اباحت ہے، لہٰذا ہر وہ امر جو منفعت پر مشتمل ہو جائز ہے، سوائے اس صورت کے کہ کوئی دلیل اس کے خلاف موجود ہو، اور چوں کہ یہ مذہب اثری ہے، یعنی نقل پر اس کا مدار ہے، اور اتباع سلف پر وہ زیادہ اعتماد کرتا ہے، اور اس پر زیادہ سختی سے عامل ہے، لہٰذا حدیث و خبر سے موافقت رکھنے والی دلیل مثبت پر جہاں یہ زور دیتا ہے، وہاں استصحاب کے باطل کرنے والی مغیر احوال دلیل کے قبول کرنے میں بھی اتنی ہی سختی روا رکھتا ہے، یہی وجہ ہے، کہ فقہ حنبلی میں ایسے احکام بہت زیادہ ہیں، جو استصحاب پر مبنی ہیں، کیوں کہ ان کے اصول کے مطابق استصحاب کو بدلنے کے لیے کسی نص کا ہونا ضروری ہے، اس زریں اصول کا نتیجہ یہ ہے، کہ اس مسلک میں قیود کی کمی اور اطلاقات میں وسعت ہے۔

استصحاب کی چند مثالیں

جو مصادر اسلامیہ سلف صالح سے ثابت ہیں، ان سے استصحاب کا ثبوت ملتا ہے، انہوں نے اسے قبول کیا ہے اور اسے اصل مانا ہے، اب ہم ذیل میں مذہب حنبلی کی مسلمہ چند مثالیں بھی بسلسلہ استصحاب پیش کرتے ہیں:

ذبائح کی اصل تحریم ہے

کوئی شکار قبل اس کے کہ اس پر قابو پایا جائے، پانی میں ڈوب گیا، حنابلہ کا مسلک یہ ہے، کہ اسے نہیں کھایا جا سکتا، اگرچہ اس کے بدن پر تیر کے نشانات کیوں نہ موجود ہوں، اس لیے کہ نہیں معلوم اس کی موت ڈوب کر ہوئی ہے، یا تیر سے؟ ڈوب کر ہوئی ہے تو پھر وہ حلال نہیں، تیر سے ہوئی ہے تو حلال ہے، اور ذبائح میں چوں کہ اصل تحریم ہے، لہٰذا جب تک شکار باقاعدہ ذبح نہ کیا جائے، یا یقینی طور پر تیر سے نہ ہلاک ہوا ہو، حلال نہیں قرار دیا جا سکتا اور یہاں چوں کہ حلال ہونے کا ثبوت موجود نہیں ہے، لہٰذا اصل تحریم قائم رہے گی۔

پانی طاہر اور مطہر ہے

حنابلہ کے نزدیک پانی کی اصل طاہر اور مطہر ہے، لہٰذا جب تک وہ ایسی صورت میں نہ منتقل ہو جائے، کہ حکم بدل جائے، یہ اصل قائم رہے گی، اس کا طاہر اور مطہر ہونا اس وقت تک زائل نہ ہوگا، جب تک رنگ اور بو کا تغیر اس کی نجاست کی دلیل نہ بن جائے، یا کوئی نجس چیز اس میں نہ دیکھ لی جائے۔

مصالح

ان اصولوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں، جو حافظ ابن قیم کے بیان کے مطابق امام احمد کے نزدیک استنباط کی بنیاد ہیں، لیکن ابن قیم نے ان اصولوں میں مصالح کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن یہ عدم ذکر اس بات کی دلیل نہیں، کہ ان کے ہاں وہ معتبر نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے، کہ فقہائے حنابلہ مصالح کو بھی اصول استنباط سے مانتے ہیں، اور اس مسلک کی نسبت اپنے امام (احمد) کی طرف کرتے ہیں اور خود حافظ ابن قیم بھی مصالح کو اصول استنباط میں شامل کرتے ہیں، بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں، کہ کوئی امر بھی ایسا نہیں ہے، جسے شارع نے مشروع کیا ہو اور وہ مصالح عباد سے موافقت نہ رکھتا ہو، کیوں کہ امور شرعیہ لوگوں کے معاملات سے متعلق ہیں، اور ان کی بنیاد اثبات مصلحت اور منع فساد و مضرت ہی ہے۔

مصالح مرسلہ کی مثالیں

مصالح مرسلہ کو قبول کرنا اور انہیں اصل فقہی قرار دینا یہی اصول ہے، جس سے نص کی عدم موجودگی میں استنباط کیا جاتا ہے، امام احمد اور ان کے اتباع کا اس پر اتفاق ہے، کہ یہ طریقہ سلف صالحین سے منقول ہے، اس لیے کہ صحابہ کرام نے بھی اس اصول کو برتا ہے، اور اپنے فتاوے میں مصالح مرسلہ کو بنیاد و اساس قرار دیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

قرآن کا مصحف کی صورت میں جمع کرنا

قرآن کریم مصحف کی صورت میں جمع کرنے کا کام صحابہ ہی نے کیا، حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور گرامی میں یہ کام انجام نہیں پایا تھا، بعد میں چوں کہ مصلحت اس کی متقاضی ہوئی، لہٰذا اسے انجام دیا گیا، کیوں کہ حفاظ قرآن کی موت نے یہ اندیشہ پیدا کر دیا، کہ کہیں قرآن کریم فراموش ہی نہ ہو جائے، جنگ ردت میں حفاظ قرآن کافی تعداد میں کام آئے، حضرت عمر کو اندیشہ ہوا، کہ اس طرح کہیں حفاظ کی موت قرآن کو فراموش نہ کرا دے، انہوں نے حضرت ابوبکر کو رائے دی، کہ اسے مصحف کی صورت میں جمع کر لیا جائے، اس رائے پر تمام صحابہ نے اتفاق کر لیا۔ (ظاہر ہے، یہ اقدام مصلحت پر ہی مبنی تھا)

شرابی کی حد

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ نے اس امر پر اتفاق کر لیا، کہ شرابی کی حد اسی کوڑے قرار دی جائے، یہ فیصلہ بھی مصلحت ہی کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا، کیوں کہ انہوں نے دیکھا، کہ شراب پینا ذریعہ بن جاتا ہے، افترا اور پاک دامن عورتوں پر قذف (تہمت طرازی) کا، اس لیے کہ شرابی بکواس کرنے لگ جاتا ہے (اور قرآن کریم میں حد قذف چالیس کوڑے مقرر کی گئی ہے)

کاریگر سے تاوان وصول کرنا مصلحت عامہ کا تابع ہے

خلفائے راشدین اس بات پر بھی متفق تھے، کہ کاریگر سے کسی کی چیز ضائع ہو جائے تو اس کا تاوان دینا پڑے گا، اس کی اصل یہ تھی، کہ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو لوگوں کے مال و منال کی حفاظت میں وہ لوگ کوتاہی کریں گے، لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہ تھا، کہ ایسا قدم اٹھایا جائے تاکہ صناع (کاریگر) لوگوں کے مال کو حفاظت سے رکھیں، چنانچہ اس بارے میں حضرت علی فرماتے ہیں، اس کے بغیر اصلاح احوال نہیں ہو سکتی۔

ذرائع

ذرائع کا شمار بھی فقہی اصول میں ہوتا ہے، جس پر اپنے امام کی متابعت میں حنابلہ بھی کافی اعتماد کرتے ہیں کیوں کہ امام احمد کے نزدیک فتوے کے اصولوں میں سے ایک اصل یہ بھی ہے۔

ذرائع کی حقیقت یہ ہے، کہ شارع اگر کسی بات پر لوگوں کو مکلف قرار دیتا ہے، تو حصول مقصد کا ہر وسیلہ مطلوب مانا جائے گا، اسی طرح اگر شارع لوگوں کو کسی کام سے روکتا ہے، تو ہر وہ ذریعہ جو اس کے وقوع میں مدد و معاون ہو، حرام مانا جائے گا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں، شارع نے جس چیز سے منع فرمایا ہے، تو ان تمام چیزوں کی بھی نہی فرما دی ہے، جو اس تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہوں، اسی طرح جس چیز کا امر فرمایا ہے، تو ان تمام چیزوں کا بھی امر فرمایا ہے، جو اس تک رسائی میں مددگار ثابت ہوں، مثلاً نماز جمعہ کا حکم دیا، تو اس مقصد کے حصول کی سعی کا بھی حکم دیا، اس وقت خرید و فروخت چھوڑ دینے کا حکم

فرمایا، اس لیے کہ نماز جمعہ کے وقت بیع کا بند کر دینا، جمعہ کی طرف جانے کا ذریعہ ہے، اسی طرح شارع نے حکم دیا، کہ لوگ آپس میں مل جل کر رفق ومحبت کی زندگی بسر کریں، ساتھ ہی ساتھ بغض وتفرقہ باہمی سے بھی منع فرمایا، اور ایسی تمام چیزیں ممنوع قرار دیں، جو اس راستہ میں حائل ہوں، مثلاً اس کی بھی ممانعت فرمادی، کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کی منسوبہ کے لیے پیام شادی دے، یا اس کی لگائی قیمت پر بڑھ چڑھ کے دام لگائے، یا اس کی خریدی ہوئی چیز کا سودا چکانے کی کوشش کرے، یہ ساری ممانعتیں اس لیے ہیں، کہ یہ وداد باہمی کے راستہ میں حائل ہیں، اور بغض وتفرقہ باہمی کا ذریعہ ہیں، ایسے ہی شریعت نے تقسیم میراث کے احکام مرحمت فرمائے، اور ہر اس اقدام سے روک دیا، جو اس تقسیم شرعی میں تغیر اور تبدل کرنے والا ہو چنانچہ وارث کے لیے (جس کا حصہ شریعت مقرر کر چکی ہے) وصیت کی ممانعت فرمائی، ساتھ ہی ساتھ اس سے بھی منع فرمایا، کہ کسی وارث کو اس کے شرعی حصہ سے محروم کیا جائے، چنانچہ اس اصول پر مہاجرین وانصار کے سابقین اولین نے یہ فتویٰ دیا، کہ مرض الموت میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق بائن دے، تو بھی وہ اس کی وارث قرار دی جائے گی، کیوں کہ اس موقع پر طلاق دینے کا مقصد یہی ہوسکتا ہے، کہ بیوی کو اس کے شرعی حصہ سے محروم کر دیا جائے، گو حقیقتاً یہ مقصد نہ ہو، لیکن مانا یہی جائے گا، کیوں کہ مرض الموت میں طلاق دینے کا نتیجہ حرمان ہی ہوسکتا ہے، سوا اس صورت کے کہ اس کے خلاف کوئی وزنی دلیل موجود ہو، مثلاً یہ کہ طلاق خود عورت نے طلب کی ہو، ایسی صورت میں یہ دلیل وزنی مانی جائے گی، کہ طلاق کا مقصد حرمان نہیں تھا۔

ذرائع کی چند مثالیں

مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ فقہ حنبلی سے ذرائع کی چند مثالیں پیش کر دی جائیں، تا کہ اس مسئلے میں امام احمد کے مسلک کی وضاحت ہوسکے۔

☆ امام احمد اس تاجر سے خریدنا مکروہ (حرام) سمجھتے تھے، جو اپنے پڑوسی تاجر کو نقصان پہنچانے کے لیے قیمت گھٹا کر بیچے، یہ فتویٰ سد ذریعہ پر مبنی ہے، کیوں کہ ایسے شخص سے خریداری کا امتناع، ذریعہ ہے ایک دوسرے مسلمان کو ضرر سے بچانے کا۔

☆ فتنہ وفسا کے زمانہ میں اسلحہ جنگ کا بیچنا بھی امام احمد کے نزدیک حرام ہے، اس لیے کہ ایسے موقع پر ان کا فروخت کرنا شر کی توسیع کا ذریعہ ہے اور ایک طرح کی اعانت علی المعصیت ہے، اس اصول پر امام احمد کے نزدیک ہر وہ اجارہ یا معاوضہ یا بیع حرام ہے، جو کسی گناہ میں مدد ومعاون ہو، جیسے ان لوگوں کے ہاتھ اسلحہ جنگ فروخت کرنا جو مسلمانوں سے لڑ رہے ہوں، یا باغیوں کے ہاتھ ساز وسامان جنگ کی فروخت یا قزاقوں اور رہزنوں سے ہتھیاروں کا سودا کرنا، اسی طرح سرائے اور گھر کا ان لوگوں کو کرائے پر دینا، جو کسی فعل معصیت کے لیے اقامت گزیں ہوں، مثلاً رقص وسرود یا حرام قسم کے کھیل۔ (ماخوذ از ابن حنبل حیاتہ وعصرہ ص ۱۶۲ تا ۲۵۲)

فقہ احمد کے ناقلین

امام احمد بن حنبل کی روایات ومسائل کی سماعت کثیر اصحاب علم وفضل نے کی، چند ایسے اصحاب کا ذکر کیا جاتا ہے، جنہوں نے امام احمد کے علم وفقہ کی روایت کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور ناقلین فقہ حنبلی میں سرفہرست ہیں۔

صالح بن احمد بن حنبل

امام احمد کے سب سے بڑے صاحب زادے ہیں، جن کی تعلیم وتربیت پر امام صاحب نے بڑی توجہ کی تھی، ان کی خواہش تھی، کہ صالح بھی انہیں کی طرح علم وفضل کے ساتھ زہد وورع میں ممتاز مقام حاصل کرلیں، اسی نہج پر ان کی تعلیم وتربیت کی گئی، امام احمد جب کسی متقی کی زیارت کرتے تو اپنے بیٹے صالح کو بھی ان کی زیارت سے بہرہ مند کراتے، صالح کا بیان ہے:

> **کان ابی یبعث خلفی اذا جاءہ رجل زاھد اورجل صالح لانظر الیہ یحب ان اکون مثلھم اویرانی مثلھم** ۔(طبقات ابن ابی یعلی ص ۱۲۶)
>
> جب کوئی زاہد اور صالح شخص میرے والد کے پاس آتا تھا، تو وہ مجھے ضرور بلاتے تھے، کہ میں اس کی زیارت کروں، انہیں اس کی بڑی تمنا رہتی تھی، کہ میں بھی ایسے نیک اور زاہد لوگوں کی طرح بن جاؤں اور وہ مجھے انہیں کی طرح دیکھیں۔

صالح بڑے عالم اور فقیہ تھے، وہ اپنے والد کی روش پر گامزن رہ کر زندگی گزارنا چاہتے تھے، لیکن کثرت اولاد اور بھاری قرض کے بوجھ کی وجہ سے طرسوس میں منصب قضا قبول کرلیا، اس منصب پر فائز ہوئے تو رونے لگے، کیوں کہ انہوں نے اپنے والد کے نہج کے برخلاف راستہ اختیار کرلیا تھا، جس پر انہیں سخت ملال تھا، وہ کہتے:

> **اللہ یعلم مادخلت ھذاالامر الا لدین قد غلبنی و کثرۃ عیال احمد اللہ تعالٰی** ۔(ابن حنبل ص ۱۴۰)
>
> خدا بہتر جانتا ہے، کہ میں یہ منصب ہرگز قبول نہیں کرتا، لیکن قرض اور کثرت عیال نے مجھے مجبور کردیا، بہر حال خدا کا شکر ہے۔

صالح نے فقہ وحدیث کا علم اپنے والد سے حاصل کیا اور دوسرے ارباب علم وفضل سے بھی اکتساب فیض کیا، انہوں نے

اپنے والد کے فتوؤں کو بہت سارے لوگوں تک پہنچایا، ابوبکر الخلال فرماتے ہیں:

سمع من ابیه مسائل کثیرة وکان الناس یکتبون الیه من خراسان یسال لهم عن المسائل ای انهم کانوا یکتبون الیه لیسال اباه عن المسائل ویرسل الیهم بالاجوبة التی یتلقاها وبهذا کان طریقا لنشر فقه ابیه فی حیاته ومن بعده ۔ (ایضاص ۱۴۰، ۱۴۱)

صالح نے اپنے والد سے بہت سے مسائل حاصل کیے، خراسان سے لوگ لکھ لکھ کر صالح سے مسائل پوچھا کرتے تھے، یعنی وہ لوگ لکھ لکھ کر صالح سے اس لیے مسئلہ پوچھا کرتے تھے، کہ وہ اپنے والد سے ان مسائل کے بارے میں دریافت کریں اور جو کچھ ان سے سیکھیں، انہیں لکھ بھیجیں یہ تھا، وہ طریقہ جو صالح نے اپنے والد کی فقہ پھیلانے میں ان کے حین حیات اور ان کی وفات کے بعد اختیار کیا۔

منصب قضا کی بدولت بھی فقہ حنبلی کی اشاعت کا موقع صالح کو میسر آیا، انہیں مسند قضا پر بیٹھ کر اپنے والد کی فقہ کو عملی صورت میں برتنے کا موقع ہاتھ آیا، جب تک صالح نے یہ منصب قبول نہیں کیا تھا، یہ مذہب نظری حیثیت رکھتا تھا، تجربہ کی کسوٹی پر نہیں چڑھا تھا، صالح کی وفات ۲۶۶ھ میں ہوئی۔

عبداللہ بن حنبل

ان کی ولادت ۲۱۲ھ میں ہوئی، امام احمد نے ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ مبذول کی، ان کی نگاہ التفات نے عبداللہ کے ذہن و دماغ میں حدیث نبوی کا بے کراں ذوق پیدا کر دیا تھا، وہ اپنے والد کی روایات کے سب سے بڑے ناقل اور مسند احمد بن حنبل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والے بلکہ اس میں اضافہ کرنے والے ہوئے، امام احمد نے آپ کی حدیث دانی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

ابنی عبداللہ محظوظ من علم الحدیث لایکاد یذاکرنی الا بما لا احفظ ۔ (ایضا)

میرے بیٹے عبداللہ کو اللہ نے علم حدیث میں ایسا حصہ دیا ہے، کہ جو بات مجھے یاد نہیں ہوتی، وہ مجھے یاد دلا دیتا ہے۔

حدیث کے ساتھ والد کے فقہی آرا بھی امام عبداللہ نے دوسروں تک پہنچائے، ۲۹۰ھ میں وفات پائی۔

ابوبکر احمد بن محمد ہانی الاثرم

امام احمد کے مشہور اصحاب میں شمار کیے جاتے ہیں، علم فقہ میں پختگی کے بعد امام احمد کے حلقہ درس سے وابستہ ہوئے، اس سے قبل وہ فقہ، تخریج مسائل اور فقہی اختلافات میں مشغول تھے، جب امام صاحب کی بارگاہ میں پہنچے تو حدیث کی سماعت اور نقل و روایت میں مصروف ہو گئے، خود فرماتے ہیں:

وکنت احفظ الفقه والاختلاف فلما صحبت احمد بن حنبل ترکت کل ذلك ۔

(النہج الاحمد قلمی بحوالہ ابن حنبل ص ۱۴۱)

پہلے میں فقہ اور خلافیات کے حفظ میں مصروف رہتا تھا، مگر جب امام احمد کی صحبت حاصل ہوئی تو ان سب چیزوں سے جی ہٹ گیا، ابوبکر احمد کے اندر اپنے شیخ ہی جیسا زہد وورع اور ذوق عبادت وریاضت تھا، آپ نے امام احمد کی مرویات اور ان کی فقہ کو روایت کیا، باختلاف روایت ۲۶۰ھ، ۲۶۱ھ، ۲۷۳ھ میں وفات پائی۔

عبدالملک بن عبدالحمید مہرانی المیمونی

آپ نے امام احمد اور دوسرے شیوخ سے حدیث نبوی کا سماع کیا، آپ ۲۰۵ھ سے ۲۲۷ھ تک امام احمد کی خدمت میں رہے، امام کی مرویات کے ساتھ ان کے فتوے بھی لکھ لیا کرتے تھے، یہ بات امام صاحب کے علم میں تھی، مگر آپ نے انہیں منع نہیں کیا، میمون اس امر کو مستحسن خیال کرتے تھے، کہ امام صاحب کے فتاویٰ لکھ لیے جائیں، اس لیے کہ یہ سنت سے ماخوذ ہیں، اس کے معارض نہیں، عبدالملک اصحاب احمد میں آپ کے فقہی مسائل کو سب سے زیادہ ضبط تحریر میں لانے والے ہیں، اس لیے ان کا شمار ان اکابر میں ہوتا ہے، جن کی روایت اعتبار واعتماد کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

ابوبکر خلال امام سے ان کی نقل کو بہت پسند کرتے اور ان کی نقل کردہ چیزوں یعنی مسائل وروایات پر بہت زیادہ اعتماد کرتے، آپ کی وفات ۲۷۴ھ میں ہوئی۔

احمد بن محمد بن الحجاج ابوبکر المروزی

آپ امام احمد کے مخصوص ومقرب اصحاب میں تھے، امام صاحب کی وفات کے بعد آپ ہی نے غسل دیا، امام صاحب کے نزدیک بڑا اعتبار ووقار حاصل تھا، آپ نے امام صاحب سے ”کتاب الورع“ کی روایت کی، بعض حضرات نے آپ پر جرح کی ہے، جو بربنائے حسد تھی، عبدالوہاب وراق نے اس طعن کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے:

ابوبکر ثقه صدوق لاشك فی هذا انما یحملهم علی هذاالحسد ۔ (تاریخ بغداد ج۴ ص۴۲۴)

ابوبکر ثقہ ہیں، صدوق ہیں اور اس میں ذرا شبہ نہیں، کہ یہ بات (جرح ونقد) ان کے لیے از راہ حسد کہی گئی ہے۔

ابوبکر مروزی امام احمد کے معتمد علیہ تھے، وہ ان کی نقل پر اتنا ہی بھروسہ کرتے تھے، جتنا ان کی عقل سلیم اور زہد پر، حتی کہ بقول خلال امام احمد فرمایا کرتے تھے:

كل ماقلت علی لسانی فانا قلته ۔ (ابن حنبل ص۱۴۳)

ابوبکر مروزی کی طرف سے مخاطب ہو کر جو بات میری طرف منسوب کر کے کہو گے وہ میں نے کہی ہے۔

ابوبکر مروزی نے امام احمد سے بہت بڑی تعداد میں مسائل روایت کیے ہیں، انہوں نے فقہ کی روایت زیادہ کی ہے، حدیث کی کم، ۲۷۵ھ میں وفات پائی۔

حرب بن اسماعیل الحنظلی الکرمانی

ابتدا میں آپ پر تصوف کا غلبہ تھا، پھر حدیث وفقہ کی تحصیل اپنا شعار بنایا، ابوبکر خلال نے آپ سے بہت سے مسائل کی

سماعت کی، ابوبکر خلال کہتے ہیں، کہ حرب نے امام صاحب کی بارگاہ میں آنے سے پہلے ہی چار ہزار مسائل امام احمد اور اسحاق بن راہویہ سے حفظ کر لیے تھے، ملاقات سے پہلے کا جب یہ حال تھا، تو ملاقات کے بعد کتنے مسائل ازبر کیے ہوں گے؟ مروزی امام احمد سے تقرب کے باوجود آپ سے مسائل نقل کرتے ہیں، ابوبکر خلال آپ کی مرویات پر بہت اعتماد کرتے تھے، آپ کی وفات ۲۸۰ھ میں ہوئی۔

ابراہیم بن اسحاق الحربی

تقریباً بیس سال تک امام صاحب کے دامن فضل وکمال سے وابستہ رہے، حدیث وفقہ اور زہد وورع میں خاص مقام حاصل کیا، یہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے، کہ جب میں تم سے یہ کہتا ہوں، کہ یہ اصحاب حدیث کا قول ہے، تو میری مراد یہ ہوتی ہے، کہ یہ احمد بن حنبل کا قول ہے، جنہوں نے ہمارے دلوں میں حدیث رسول اقوال صحابہ کا اتباع اور تابعین کی اقتدا کا جذبہ راسخ کر دیا تھا۔

یہ امام احمد کے اصحاب میں سب سے زیادہ مسلک امام احمد سے مشابہت رکھتے تھے، فقہ وحدیث میں کمال مہارت کے علاوہ فن لغت میں بھی ان کا پایہ بہت اونچا تھا، چنانچہ فن لغت کا امام ثعلب کہتا ہے:

مافقدت ابراهيم الحربي من مجلس لغة ۔ (ابن حنبل ص۱۴۴)

لغت کے متعلق کسی مجلس سے ابراہیم الحربی کو میں نے غیر حاضر نہیں پایا۔

ابن ابی یعلیٰ لکھتے ہیں:

كان اماما في العلم راسا في الزهد عارفا بالفقه بصيرا بالاحكام حافظا للحديث ۔ (ایضا)

یہ علم کے امام، زہد کے سردار، فقہ کے رمز آشنا، احکام فقہی کے واقف کار، حدیث نبوی کے حافظ تھے۔

آپ کی یہ خاص مصنفات مشہور ہیں:

(۱) غریب الحدیث (۲) دلائل النبوۃ (۳) کتاب الحمام (۴) سجود القرآن (۵) ذم الغیبۃ (۶) النہی عن الکذب (۷) المناسک وغیرہ

آپ کی وفات ۲۸۵ھ میں ہوئی۔

احمد بن محمد بن ہارون ابوبکر الخلال

ابوبکر خلال نے امام احمد کے فقہی اقوال وآرا ان کے فتاوے اور مجتہدات کو اپنی کتاب ''الجامع الکبیر'' کی بیس جلدوں میں جمع کر دیا، جس کی نقل وروایت عالم اسلامی میں عہد بہ عہد ہوتی رہی، خلال، ابوبکر المروزی سے ان کے دم واپسیں تک وابستہ رہے، جنہوں نے خلال کے دل میں فقہ حنبلی کی جمع وتدوین کا جذبہ پیدا کیا، انہوں نے فقہ احمد کی روایت کو اپنا مقصد اولیں بنالیا، اس کے حصول کے لیے انہوں نے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا، آپ نے امام احمد کا علم ان کی اولاد اور ان کے چچا سے حاصل کیا،

اور امام احمد کے مخصوص اصحاب، حرب، کرمانی، میمونی اور دوسرے بہت سے لوگوں سے حاصل کیا، خلال نے نہ صرف فقہ احمد کا بڑا حصہ روایت کیا، بلکہ حکمت و معرفت کی ان باتوں کو بھی حاصل کیا، جو امام احمد تک ان کے پیش رو لوگوں سے پہنچی تھیں، فقہ احمد کے مسائل اور روایات جمع کرنے کے بعد بغداد کی جامع الہدی میں خلال شاگردوں کی ایک جماعت لے کر بیٹھ گئے اور ان کو جمع شدہ ذخیرہ پڑھانا شروع کر دیا، چنانچہ لوگوں نے بیس جلدوں کے اس فقہی مجموعہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اس کی نقلیں حاصل کر لیں، واقعہ یہ ہے، کہ مذہب حنبل کی نشر و اشاعت باضابطہ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

ابن جوزی فرماتے ہیں:

> **صرف عنايته الى جمع علوم احمد بن حنبل وسافر لاجلها وكتبها عالية ونازلة وصنفها كتبا ومعنى انه كتبها عالية ونازلة انه روى بعضهاعن اصحاب احمد وبعضها عمن روى عنهم** ۔ (ابن حنبل ص ١٣٥)
>
> خلال نے امام احمد بن حنبل کے علوم جمع کرنے کی طرف توجہ کی، اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے سفر کی سختیاں جھیلیں، اور جو کچھ حاصل کیا، اسے قلم بند کر لیا، انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کر ڈالیں، جو اصحاب احمد کی روایات اور اصحاب احمد سے روایت کرنے والوں کی مرویات پر مشتمل تھیں۔

خلال نے امام احمد کے متفرق و منتشر فقہی اقوال اور اجتہادی آرا کو پوری سعی و کوشش سے یکجا کر دیا، خلال کی حدیثی روایات کی طرح ان کی فقہی نقل و روایت پر بھی علمائے اسلام نے اعتماد کیا ہے، ان کے معاصرین ہوں یا بعد میں آنے والے اہل علم کسی نے ان پر جرح وطعن نہیں کی، جس سے ثابت ہے، کہ وہ نقل فقہ میں بھی مقبول تھے، ان کے معاصرین کا ان کی مرویات فقہ کو قبول کر لینا اس بات کا واضح ثبوت ہے، کہ صدق و احتیاط میں اعلیٰ مقام پر فائز تھے، ان کے معاصرین نے خلال کی تصدیق و توثیق پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان سے نقل و روایت بھی کیا، ابوبکر محمد بن الحسن کہتے ہیں:

> **كلنا تبع للخلال لانه لم يسبقه الى جمعه وعلم احد** ۔ (تاریخ بغداد ج ۵ ص ١١٣)
>
> ہم سب خلال کے تابع ہیں، اس لیے کہ جمع روایات اور علم و فضل میں کوئی بھی ان سے بازی نہیں لے جا سکا۔

فقہ حنبلی کے جامع و ناقل خلال کے اس عمل کی پیروی بعد میں آنے والے فقہا نے بھی کی، خلال کی کتاب کی شرحیں لکھیں، مختصرات تیار کیے، اور انہی کی بنا پر امام احمد کے اقوال و فتاویٰ کا موازنہ دوسرے اصحاب مذاہب کی فقہ سے کیا جاتا رہا۔

خلال نے ٣١١ھ میں وفات پائی۔

عمر بن الحسین الخرقی

ابوبکر خلال کے بعد ان کی تحریروں کی تلخیص بہت سے لوگوں نے کی، لیکن ان میں دو شخصیتیں نہایت اہم ہیں، حسن خرقی، عبدالعزیز بن جعفر، عمر بن حسین خرقی کے بارے میں علیمی لکھتے ہیں:

عمر بن الحسين الخرقي المتوفى سنة ۳۳۴ھ وقد قال فيه العليمي احد ائمة المذهب كان عالما بارعا في مذهب ابي عبدالله وكان ذادين واخاورع رحمه الله قرأ العلم على من قرأ على ابي بكر المروزي وحرب الكرماني وصالح وعبدالله ابني امامنا احمد له المصنفات الكثيرة ۔ (ابن حنبل ص ۱۴۸)

مذہب حنبلی کے ائمہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، ابوعبداللہ امام احمد کے مذہب پر انہیں غیر معمولی دسترس تھی، دین کے متوالے اور زہد وورع کے پیکر تھے، انہوں نے ابوبکر مروزی، حرب الکرمانی، صالح اور عبداللہ احمد بن حنبل کے فرزندان ارجمند کے شاگردوں سے علم حاصل کیا اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں، مسائل فقہ کی تخریج میں بھی یہ نمایاں مقام کے حامل ہیں، لیکن افسوس ہے، ان کی تصانیف سے صرف ”مختصر“ ہی شہرت پا سکی۔ ۳۳۴ھ میں وفات پائی۔

امام خرقی نے خلال سے اپنا علم لیا اور اس کی وساطت سے مروزی، صالح اور عبداللہ سے مروی مسائل حاصل کیے اور انہیں اپنی کتاب میں درج کیا۔

خرقی کی ”مختصر“ فقہ حنبلی کی مشہور ترین کتابوں میں ہے، علما نے اس پر بکثرت حاشیے لکھے اور اس کی شرحیں کیں، شرحوں کی تعداد تین سو سے زائد ہیں، خلال کے جمع کردہ مسائل اور فتاوی کا خلاصہ بھی اس میں موجود ہے، بعض علما کے نزدیک اس کے مسائل کی تعداد ایک ہزار تین سو کے قریب ہے۔

”المختصر للخرقی“ کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں ان میں سب سے مشہور موفق الدین المقدسی کی شرح ”المغنی“ ہے، جو بارہ ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس شرح میں صرف المختصر کی عبارت کی شرح اور مدلول ومفہوم کے بیان پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ فقہ حنبلی کے اختلاف مذاہب کا بھی ذکر ہے، ادلہ فقہیہ اور آثار صحیحہ ثابتہ کا معتد بہ حصہ بھی اس کے اندر موجود ہے، جن کی صحت وضعف کی طرف اکثر اشارے بھی کیے ہیں اور قوت وضعف کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجیح کا پہلو بھی پیش کرتے ہیں، یہ کتاب فقہ اسلامی کے مراجع میں شمار کی جاتی ہے، جس کے مطالعہ سے صرف تقلید ہی نہیں بلکہ اجتہاد وموازنہ کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

ابن مفلح حنبلی لکھتے ہیں:

اشتغل الموفق بتاليف احد كتب الاسلام فلبغ الامل في انهائه وهو كتاب بليغ في المذهب تعب فيه واجاد وجمل به المذهب وقرأه عليه جماعة ۔ (ابن حنبل ص ۱۴۹)

موفق نے مغنی تالیف کرنے کی طرف توجہ کی، اپنی آرزو کو پہنچے، مذہب حنبلی کے بارے میں بڑی خوبی سے اس کے مباحث پر روشنی ڈالی اور مذہب کو نکھار کر پیش کیا۔

عزالدین بن عبدالسلام الشافعی لکھتے ہیں:

مارایت فی کتب الاسلام مثل المحلی و المجلیٰ لا بن حزم و کتاب لمغنی للشیخ موفق الدین فی جودتھاوتحقیق مافیھا (ایضا ص ۱۴۹)

اسلام کی کتابوں میں ابن حزم کی ''محلی'' اور ''مجلی'' اور شیخ موفق الدین کی ''المغنی'' سے بڑھ کر کوئی کتاب جودت فکر اور تحقیق مطالب کے اعتبار سے میری نظر سے نہیں گزری۔

عبدالعزیز بن جعفر غلام الخلال

خلال سے انہوں نے علم کا بڑا حصہ لکھا اور ان کی پیروی میں عمر صرف کر دی، مزید براں ان لوگوں سے بھی علم حاصل کیا، جنہوں نے امام احمد کے اصحاب سے کسب فیض کیا تھا، آپ کی جودت فکر اور تبحر علمی کا تذکرہ ابن ابی یعلیٰ کرتے ہیں:

انہ کان حاد الفھم موثوقابہ فی العلم متسع الروایۃ مشھورا بالدرایۃ موصوفا بالامانۃ مذکورا بالعبادۃ ولہ المصنفات فی العلوم المختلفۃ . (ابن حنبل ۱۴۹)

وہ سریع الفہم، علم میں پختہ، روایت میں وسیع اور درایت میں مشہور تھے اور خصوصیت کے ساتھ امانت کی صفت سے متصف تھے، اور عبادت و ریاضت ان کا بہترین مشغلہ تھا، علوم مختلفہ میں ان کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔

خلال کے شاگردوں میں یہ ان کے اتباع میں بہت زیادہ حریص تھے، روایت و درایت کی ترجیح میں حریت فکر سے کام لیتے تھے، یہی وجہ ہے، کہ یہ امام احمد سے مروی روایات اور اقوال کی ترجیح کے سلسلے میں بعض اوقات اپنے استاذ خلال سے بعض مقامات پر اختلاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ تخریج مسائل پر بھی قادر تھے، محض مقلد نہیں تھے۔

مذہب حنبلی کے اکابر علما نے اپنے مذہب کی گراں قدر خدمات انجام دیں اور فقہ حنبلی کی اشاعت کے ساتھ افہام و تفہیم کے سلسلہ مین قابل تشکر کام کیا ہے، انہوں نے امام احمد کے مرویات جمع کیے اور اس پر بہت زیادہ توجہ کی، روایت مختلفہ کے مابین ترجیح کا کام اور ان پر تخریج کا سلسلہ قائم کیا اقوال مختلفہ کے مابین قوت و صحت کے اعتبار سے ترتیب قائم کی، پھر انہوں نے ضوابط عامہ وضع کیے، جن سے متفرق فروع کی طرف رہنمائی ہوتی ہے، پھر ان جلیل القدر حنبلی علما نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انہوں نے علم اصول پر بھی غور و خوض کیا اور وہ اصول منضبط کئے جن پر فقہ حنبلی کی بنیاد و اساس قائم ہے۔

امام احمد کے مذہب سے متعلق ایسے احکام جن کے بارے میں امام موصوف کی کوئی نص موجود نہیں ہے، ان کے لیے علما نے ''وجہ'' کی اصطلاح وضع کی ہے، یہ علمائے مذہب امام احمد کے ایسے فتاویٰ اور اقوال کو تین قسموں پر منقسم کرتے ہیں۔

(۱) روایات (۲) تنبیہات (۳) اوجہ۔

مذہب حنبلی میں مخرجین کے اقوال یعنی ''اوجہ'' اگر چہ امام احمد کے اقوال نہیں ہیں، لیکن تخریجا وہ حنبلی مذہب کے مسائل سمجھے جاتے ہیں، علمائے حنابلہ نے امام صاحب کے مسائل پر قیاس کو درست مانا ہے، اگر چہ یہ قیاس کسی منصوص علیہ حکم پر کیوں نہ ہو اور نتیجہ خلاف منصوص ہی ہو گویا یہ علما قیاس و استخراج کو احکام منصوص علیہ کے سلسلہ میں بھی جائز اور درست سمجھتے ہیں۔

حنبلیوں کی قلت تعداد کے اسباب

اسلامی بلاد وامصار میں فقہ حنبلی کی پیروی کرنے والے ہر دور میں کم رہے ہیں، یہاں تک کہ عہد ماضی میں کوئی دور ایسا نہیں آیا، جب ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہو، اگر چہ اس مذہب میں بڑے بڑے علما بکثرت پیدا ہوتے رہے اور وہ قوت استنباط واستدلال میں کمال رکھتے تھے، ان اوصاف وخصائص کے باوجود یہ مذہب عوام میں قبول عام حاصل نہ کر سکا، چنانچہ کوئی بھی ایسا اسلامی ملک نہیں، جس میں سواد اعظم کا تعامل فقہ حنبلی پر رہا ہو، اس قلت تعداد کا سبب کیا ہے، اصحاب فکر ونظر نے مختلف جہتوں سے جواب دیا ہے، فلسفہ تاریخ کے ماہر علامہ ابن خلدون رقم طراز ہیں:

> **واما احمد بن حنبل فمقلده قليل لبعد مذهبه عن الاجتهاد واصالته فى معاضدة الرواية والاخبار بعضها للبعض واكثرهم بالشام والعراق من بغداد ونواحيها وهم اكثر الناس حفظا للسنة ورواية للحديث .** (مقدمہ ابن خلدون ص۲۲۴)
>
> امام احمد بن حنبل کے مقلد تعداد میں بہت کم ہیں، اس لیے کہ مذہب حنبلی اجتہاد سے بعد رکھتا ہے، ان کے مذہب کی اصل خبر وروایت کی معاضدت میں ہے، ان کی کافی تعداد شام وعراق اور نواحی بغداد میں موجود ہے، روایت حدیث اور حفظ سنت میں یہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ ممتاز اور نمایاں ہیں۔

ابن خلدون نے قلت تعداد کی جو وجہ بتائی ہے، اس سے اختلاف ممکن ہے، لیکن قلت تعداد سے انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ بات بھی سچ ہے، کہ حنبلی علما نے حدیث روایت کی نشر واشاعت میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان کی فقہ کا زیادہ مدار حدیث واثر پر رہا، انہوں نے صرف درپیش مسائل ہی میں اجتہاد کیا، آئندہ پیش آنے والے مسائل کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ پہلے سے اس کے لیے تیار رہے، اس لیے اقوام عالم کے باہمی ربط واتصال اور تہذیب وتمدن کے پھیلاؤ نے ہزاروں نئے مسائل پیدا کر دیے، جن کے فی الفور جواب سے فقہ حنبلی کا دامن خالی رہا، عوام کی ضروریات کے معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے اس مذہب کی اشاعت محدود دائرے میں سمٹ کر رہ گئی۔

ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے، کہ مذاہب اربعہ میں فقہ حنبلی چوتھے درجے پر ہے، جس زمانے میں فقہ حنبلی تدوین وترتیب کے مرحلے سے گزر رہی تھی، عالم اسلامی میں ائمہ ثلاثہ کا مذہب پھیل چکا تھا، اور ان کے ماننے والوں کے وسیع ومضبوط حلقے قائم

ہو چکے تھے، جب فقہ حنبلی کی تدوین ہو چکی تو اس وقت اسلامی بلاد و امصار کی اکثریت نے ائمہ ثلاثہ کی فقہ کو پورے طور پر اختیار کر لیا تھا۔

ائمہ ثلاثہ کے فقہائے قضاۃ نے اسلامی شہروں کے منصب قضا کو اختیار کیا، تاکہ مسلمانوں کی صحیح دینی رہنمائی ہو سکے اور وہ اسلامی قانون کے دائرے میں رہ کر عبادات و معاملات انجام دے سکیں، ان فقہا اور مجتہدین کے اثرات عوام پر پڑے اور انہوں نے ان کے اجتہادی مسلک کو اختیار کر لیا اس کے برخلاف حنبلی فقہا اور علما سرکاری عہدوں اور مناصب قضا سے دور بھاگتے رہے، جس کی بنا پر وہ عوام سے ربط و ضبط قائم نہ کر سکے، اس طرح ان کی دوری صرف خلفا و امرا سے ہی نہیں بلکہ عوام الناس سے بھی قائم رہی، علما و فقہا کا تقشف اور ان کی کم آمیزی مسلک حنبلی کے فروغ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔

ابن عقیل حنبلی لکھتے ہیں:

> **هذا المذهب انما ظلمه اصحابه لان اصحاب ابي حنيفة والشافعي اذا برع احدمنهم في العلم تولى القضاء وغيره من الولايات فكانت الولاية سببا لتدريسه واشتغاله بالعلم فاما اصحاب احمد فانه قل منهم من تعلق بطرف من العلم الا يخرجه ذلك الى التبعد والزهد لغلبة الخير على القوم فينقطعون عن التشاغل .**
>
> اس مذہب حنبلی سے خود ان کے حاملین نے انصاف نہیں کیا، جب کہ اصحاب ابوحنیفہ اور شافعی میں سے جن لوگوں نے علم و فضل میں کمال حاصل کیا، منصب قضا وغیرہ کی ذمہ داری سنبھال لی، ان کے یہ عہدے درس و تدریس اور اشاعت علم کے لیے موثر سبب بن گئے، لیکن امام احمد کے اصحاب میں جس نے بھی علم میں کمال حاصل کیا زہد و ورع کو اختیار کرتے ہوئے علمی مشاغل ترک کر کے گوشہ نشیں ہو گیا۔

شیخ الاسلام ابوالوفاء علی بن عقیل بغدادی متوفی ۵۱۳ھ سے حنابلہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ دوسرے فقہی مذاہب والوں کے مقابلہ میں حنبلی علما اپنے مسلک کی ترویج و اشاعت میں کیوں پیچھے رہے؟ انہوں نے جواب میں لکھا، کہ حنابلہ سخت ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا میل جول دوسروں سے کم ہوتا ہے، وہ بڑوں کے یہاں آنے جانے سے پرہیز کرتے ہیں، حقیقت پسندی ان پر غالب ہے، آرا کے مقابلے میں روایات لیتے ہیں، تاویل سے بچنے کے لیے ظاہری معنی پر عمل کرتے ہیں، ان پر اعمال صالحہ کا غلبہ ہے، اس لیے عقلی علوم سے اجتناب کرتے ہیں، فروعات میں ظاہر کو لیتے ہیں، ظاہری آیات و احادیث کو بغیر تاویل کے قبول کرتے ہیں، اس لیے ان پر شبیہ کا الزام لگایا گیا ہے۔ (طبقات الحنابلہ ابن ابی یعلی ص ۱۲۶)

عوام میں مذہب حنبلی کی قلت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے، کہ امام احمد اور ان کے اصحاب ارباب اقتدار کے مظالم کا نشانہ بنے، ابتلا و آزمائش کی سختیاں انہیں جھیلنی پڑیں، جس کی وجہ سے متبعین امام احمد کے اندر تشدد اور تعصب کا رنگ غالب آ گیا اور عام طور پر حنبلیوں سے تعصب و تشدد کے مظاہرے ہوئے بغداد اور عراق میں حنبلیوں کے اس تعصب نے بڑی نازک صورت

پیدا کردی تھی، مناقشہ اور بے کار کا موضوع خلق قرآن کا مسئلہ تھا، حنبلی عوام نے اس موضوع پر واقفیت کے بغیر جھگڑنا شروع کیا، نوبت یہاں تک پہنچ گئی، کہ جو شخص قرآن کے مخلوق نہ ہونے کا قائل ہو اس کی بات قابل قبول اور اگر کوئی شخص اس مسئلہ پر تردد کا اظہار کرے، گو تحقیق کی غرض سے کیوں نہ ہو، تو اس کی بات رد اور نا قابل قبول ہوگی، حنبلیوں کے مزاج میں ایسی حدت اور شدت پیدا ہوئی، کہ وہ مسئلہ خلق قرآن اور صفات باری میں ایسی روش پر گامزن ہو گئے، جو دلیل اور برہان سے خالی تھی، اپنے مسلک سے تجاوز کرنے والوں کو کافر اور بدعتی گرداننے لگے، اصول تو اصول فروع فقہی میں بھی حنابلہ کے تشدد نے نازک صورت پیدا کردی، متعدد مواقع پر ان کے تشدد نے فتنہ وفساد کی صورت اختیار کرلی، چنانچہ ۳۲۳ھ میں رونما ہونے والا فتنہ حنابلہ کے تشدد ہی کا شاخسانہ تھا، جس کی تفصیل ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں اس طرح درج کی ہے:

۳۲۳ھ میں حنابلہ کی قوت بڑھ گئی ان کا اثر واقتدار عوام وخواص پر قائم ہو گیا، ان کی حالت یہ تھی، کہ جس کے پاس نبیذ دیکھتے تھے، اسے چھین کر بہادیتے تھے، اور اگر کوئی مغنیہ نظر آجاتی، تو اسے مارنے لگتے، اور نغمہ وموسیقی کے آلات توڑ پھوڑ دیتے تھے، بیع وشرا کے معاملات میں بھی الجھتے تھے، لوگوں کو اگر عورتوں یا لڑکوں کے ساتھ آتے جاتے دیکھتے تھے، تو معترض ہوتے تھے، اور وہیں روک کر سوال کرنے لگتے تھے، کہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ اگر وہ ٹھیک ٹھیک بتادیتا تو خیر ورنہ اس کی شامت آجاتی، اور وہ بھی پٹتا اور پیٹ پاٹ کر اسے پولیس کی چوکی میں پہنچا دیتے، اور اس پر کار فحش کی گواہی گزار دیتے اور اسے سزا دلواتے آخر حالات یہاں تک پہنچے، کہ بغداد ان کی فتنہ سامانیوں کا مرکز بن گیا، چنانچہ بدر الخرشنی جو پولیس کا سب سے بڑا افسر تھا، ۱۰ ر جمادی الاخری کو گھوڑے پر سوار ہو کر بغداد کے دونوں کونوں پر پہنچا اور اس نے حنابلہ کو حکم دیا، کہ دو سے زیادہ آدمی جمع نہ ہوں، مناظرہ نہ کریں، امامت وہی شخص کرے، جو نماز فجر اور مغرب اور عشا میں بسم اللہ باآواز بلند پڑھے، لیکن اس کے باوجود فتنہ وفساد میں کمی نہیں آئی، ان کا شر اور فتنہ بڑھتا ہی رہا، جو اندھے مسجدوں میں پناہ گزیں تھے، حنابلہ نے ان کو تیار کیا، اور جب کوئی شافع ادھر سے گزرتا، یہ اندھے حسب ہدایت اپنے ڈنڈے لے کر اس پر ٹوٹ پڑتے اور خوب پیٹتے، یہاں تک کہ وہ لب مرگ ہو جاتا، پھر الراضی کا فرمان صادر ہوا، جس میں حنابلہ کے افعال کی مذمت کی گئی تھی اور ان کے اعتقاد تشبیہ وغیرہ پر لے دے کی گئی تھی، اس فرمان میں کہا گیا تھا، کہ امیر المومنین الراضی خدا کی قسم کھا کر اور اس قسم کی پابندی کا عہد کر کے کہتے ہیں، کہ اگر تم اپنے اس مذموم مذہب سے دست بردار نہ ہوئے اور گمراہی کی ان باتوں سے کنارہ کش نہ ہوئے، تو پھر تمہارے لئے ضرب شدید اور قتل وغارت اور ہلاکت اور ایذارسانی کے دروازے کھول دیے جائیں گے، تلواریں تمہاری گردنوں پر چمکیں گی، اور آگ تمہارے گھروں اور قیام گاہوں میں بھڑکا دی جائے گی۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے، کہ عامہ حنابلہ کس قدر تشدد اور سختی پر اتر آئے تھے، یہاں تک کہ حکومت کو سختی کرنا پڑی اور شوافع ان کی مخالفت میں صف آرا ہو گئے جب کہ انہیں کو ان دنوں حکومت کے یہاں قدر ومنزلت حاصل تھی ان حالات نے حنابلہ کے بہت سے دشمن پیدا کردیے اور ان دشمنوں نے انہیں نیچا دکھانے ذلیل کرنے اور ان کی تعداد کم کرنے کی جدوجہد شروع

کردی، عوام بھی ان کے مخالف ہوگئے اور وہ فقہا بھی جو جدل ومناظرہ کے میدان میں سرگرم کار تھے، یعنی شوافع علماے کلام بھی ان کے پیچھے پڑگئے خود بعض اہل سنت کو بھی جب حنابلہ میں حشوی انکار نے جگہ پالی ان سے بیر ہوگیا اور سب سے آخر میں حکومت وقت بھی اپنی پوری قوت اور طاقت سے ان کا استیصال کرنے پر تل گئی، اس طرح سے مذہب حنبلی کی اشاعت میں غیر معمولی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔

حنبلیوں کے تشدد وتعصب کے ردعمل میں عامۃ المسلمین بھی ان سے گریز کرنے لگے اور یہ خلیج پٹنے کے بجائے وسیع ہوتی چلی گئی، جس کے نتیجے میں عوام حنبلی مسلک سے دور رہے اور حنبلیوں کی تعداد اسلامی ملکوں میں دوسرے ائمہ کے ماننے والوں کی بہ نسبت سمٹتی چلی گئی۔

امام احمد بن حنبل اور عقائد اہل سنت کی وضاحت

امام احمد کے دور میں جو فرقے محدثین وفقہا اور مسلک سواد اعظم کے علی الرغم وجود میں آ چکے تھے اور جنہوں نے اسلامی معاشرے میں اپنی جڑیں پھیلا دی تھیں، اپنے باطل عقیدہ و مسلک کی اشاعت میں مصروف تھے، ان میں شیعہ، خوارج، قدریہ، جہمیہ، مرجیہ پانچ اہم فرقے ہیں۔

ان باطل فرقوں کی وجہ سے امام احمد کا زمانہ اسلام میں مختلف باطل فرقوں کے شیوع اور کلامی بحث ونظر کی باہمی آمیزش اور جدل ومناظرہ کا دور تھا، نزاع وخصومت کے اکھاڑے جگہ جگہ قائم تھے، اسلامی افکار وعقائد کے سلسلے میں عقلی موشگافیوں کا بازار گرم تھا، اور تمام باطل فرقے سلف صالحین کی روش سے ہٹ کر پیچیدہ راستہ اختیار کر رہے تھے، سیدھے سادے عقائد کو فلسفیانہ توجیہات نے الجھا کر رکھ دیا تھا، جدل وپے کار کا ہنگامہ اسلامی معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا، جدل وپے کار کے نتیجے میں حقائق تک رسائی ناممکن ہو رہی تھی، امام احمد بن حنبل جدل وپے کار اور نزاع وخصومت کی ڈگر سے ہٹ کر کتاب وسنت کی روشنی میں سلف صالحین کے قائم کردہ نہج پر گامزن تھے، ان کا خیال تھا، کہ جس نے علوم دینیہ میں جدل وپے کار کو دخل دیا، تو گویا اس نے اپنے دین کو خصومات کا ہدف اور طعن واعتراض کا نشانہ بنالیا، امام احمد نے صرف دراسات نبوی کو اپنا شعار بنایا تھا، امام احمد اپنے دور کے تمام نزاعی افکار وخیالات سے الگ رہے، وہ جانتے تھے، کہ ان باتوں میں الجھنے سے فائدہ کم ہے، نقصان زیادہ، شر کا پہلو غالب ہے اور خیر کا پہلو اگر ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر، لیکن زمانہ کے ڈھنگ بھی نرالے ہیں، ماہ وسال کی گردش نے حالات ایسے پیدا کر دیے، کہ امام احمد اپنی سرگرمیاں صرف علم دین تک محدود نہ رکھ سکے، انہیں اضطراب فکر، اختلاف خیال اور حرب عقائد کی معرکہ آرائیوں میں بادل ناخواستہ حصہ لینا پڑا اس سلسلے میں مسئلہ خلق قرآن کے رد میں امام صاحب کی مساعی جمیلہ اور ابتلا وآزمائش کی تفصیل گزر چکی ہے، انہوں نے قرآن کے سلسلے میں سلف کے عقیدے کو نزاع وپے کار کے بغیر بیان کر دیا ہے اور انہوں نے یہ اعلان کر کے ہر مصیبت جھیلی، کہ خلق قرآن کا عقیدہ بدعت ہے اور اس کا انکار ورد ضرور ہے، انہوں نے اپنے عہد کے اقتدار اعلیٰ کے روبرو سچا عقیدہ بیان فرما دیا:

> بان القرآن کلام اللہ وکلام اللہ غیر خلق اللہ بان القرآن امر والامر غیر الخلق وبان القرآن من علم اللہ سبحانہ وتعالیٰ وعلم اللہ غیر خلقہ وقد آخذ ھذا کلہ من نصوص

الکتاب ومن احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم واخبار الصحابۃ والتابعین ۔ (ابن حنبل ص ١١١)

قرآن خدا کا کلام ہے اور خدا کا کلام غیر مخلوق ہے، قرآن امر ہے اور امر غیر مخلوق ہے، قرآن خدائے سبحانہ تعالیٰ کا علم ہے اور علم الٰہی غیر مخلوق ہے، یہ تمام باتیں انہوں نے کتاب الٰہی، احادیث نبوی، اخبار صحابہ، آثار تابعین کے نصوص سے اخذ کی تھیں۔

امام احمد کا خط مسدد بن مسرہد کے نام

جب اعتقادی فرقوں کا شور و ہنگامہ زیادہ بڑھا اور ان کے زعمانے سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان وعقیدے میں فساد پیدا کرنا شروع کیا، خوارج، روافض، قدریہ، جبریہ، معتزلہ، مرجئہ کی ریشہ دوانیاں بڑھیں اور انہوں نے اسلامی عقائد وافکار میں موشگافیوں کا بازار گرم کیا، اور صراط مستقیم سے بھٹک گئے، تو اس دور میں امام ابوالحسن مسدد بن مسرہد بن مسربل اسدی بصری متوفی ٢٢٨ھ نے امام احمد بن حنبل کے پاس لکھا، کہ آپ ان اختلافات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت لکھ کر روانہ کریں، جس وقت امام صاحب کے پاس یہ خط پہنچا، آپ نے روکر فرمایا، انا للہ وانا الیہ راجعون اس بصری عالم نے طلب علم میں مال ودولت خرچ کیا ہے، لیکن اس کے علم کا یہ حال کہ ان مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی حاصل نہ کرسکا پھر یہ خط جواباً تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ الذی جعل فی کل زمان بقایا من اھل العلم یدعون من ضل الی الھدی وینھون عن الردی یحیون بکتاب اللہ الموتی وبسنۃ النبی اھل الجھالۃ والردی فکم من قتیل لابلیس قد احیوہ وکم من ضال تائہ قد ھدوہ فما احسن اثرھم علی الناس ینفون عن دین اللہ تحریف الغالین وانتحال المبطلین الذین عقدوا الویۃ البدع واطلقوا اعنۃ الفتنۃ مختلفین فی الکتاب یقولون علی اللہ وفی اللہ تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا وفی کتابہ بغیر علم فنعوذ باللہ من کل فتنۃ مضلۃ وصلی اللہ علی محمد النبی والہ وسلم تسلیما اما بعدا وفقنا اللہ وایاکم لکل مافیہ رضاہ وجنبنا وایاکم کل مافیہ سخطہ واستعملنا و ایاکم عمل الخاشعین لہ العارفین بہ فانہ المسئول ذلک واوصیکم ونفسی بتقوی اللہ العظیم ولزوم السنۃ والجماعۃ فقد علمتم ماحل بمن خالفھا وماجاء فیمن اتبعھا فانہ بلغنا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ”ان اللہ لیدخل العبد الجنۃ بالسنۃ یتمسک بھا“ وامرکم ان لا تؤثروا علی القرآن شیأ فانہ کلام اللہ وماتکلم اللہ بہ فلیس مخلوق وما اخبربہ عن القرون الماضیۃ فغیر مخلوق وما فی اللوح المحفوظ فغیر مخلوق ومن قال مخلوق فھو کافر باللہ ومن لم یکفرھم فھو کافر ثم من بعد کتاب اللہ سنۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم والحدیث عنہ وعن المھدیین من صحابۃ

النبى والتابعين من بعدهم والتصديق بما جاء ت به الرسل واتباع السنة نجاة وهى التى نقلها اهل العلم كابرا عن كابر واحذروا راى جهم فانه صاحب راى وخصومات .

واما الجهمية فقد اجمع من ادركنا من اهل العلم انهم قالوا افترقت الجهمية على ثلاث فرق فقال بعضهم القرآن كلام الله وهو مخلوق وقال بعضهم القرآن كلام الله وسكت وهم الواقفة وقال بعضهم الفاظنا بالقرآن مخلوقة فهؤلاء كلهم جهمية واجمعوا على ان من كان هذا قوله فحكمه ان لم يتب من تحل ذبيحته ولاتجوز قضاياه والايمان قول وعمل يزيد وينقص زيادته اذا احسنت ونقصانه اذا اسأت ويخرج الرجل من الايمان الى الاسلام فان تاب رجع الى الايمان ولا يخرج من الاسلام الا الشرك بالله العظيم او يرد فريضة من فرائض الله جاحدا لها فان تركها تهاونا بها وكسلا كان فى مشيئة الله ان شاء عذبه وان شاء عفا عنه .

واما المعتزلة فقد اجمع من ادركنا من اهل العلم انهم يكفرون بالذنب فمن كان منهم كذلك فقد زعم ان آدم كافر وان اخوة يوسف حين كذبوا اباهم كفار .

واجمعت المعتزلة ان من سرق حبة (فهو) فى النار تبين منه امراته ويستانف الحج ان كان حج .

فهؤلاء الذين يقولون هذه المقالة كفار وحكمهم ان لايكلموا ولاتوكل ذبائحهم حتى يتوبوا .

واما الرافضة فقد اجمع من ادركنا من اهل العلم انهم قالوا ان عليا افضل من ابى بكر (وان اسلام على اقدم من اسلام ابى بكر فمن زعم ان عليا افضل من ابى) فقد رده الكتاب والسنة لقوله عز وجل (محمد رسول الله والذين معه) فقدم ابابكر بعد النبى ولم يقدم عليا وقال لو كنت متخذاً خليلاً لا تخذت ابا بكر خليلاً ولكن الله قد اتخذ صاحبكم خليلا يعنى نفسه ومن زعم ان اسلام على كان اقدم من اسلام ابى بكر فقد اخطأ لانه اسلم ابوبكر وهو يومئذ ابن خمس وثلاثين سنة وعلى يومئذ ابن سبع سنين لم تجر عليه الاحكام والحدود والفرائض .

ويؤمن بالقضاء والقدر خيره وشره وحلوه ومره من الله وان الله خلق الجنة قبل خلق الخلق وخلق للجنة اهلا ونعيمها دائم فمن زعم انه يبيد من الجنة (شئ) فهو كافر وخلق

النار وخلق للنار اهلا وعذابها دائم و(ان الله) يخرج قوما من النار بشفاعة رسول الله وان اهل الجنة يرون ربهم بابصارهم لامحالة وان الله كلم موسىٰ تكليما واتخذ ابراهيم خليلا والميزان حق والصراط حق والانبياء حق وعيسىٰ بن مريم عبدالله ورسوله والايمان بالحوض والشفاعة والايمان بالعرش والكرسى والايمان بملك الموت انه يقبض الارواح ثم ترد الارواح الى الاجساد ويسألون عن الايمان والتوحيد والرسل والايمان بالنفخ فى الصور والصور قرن ينفخ فيه اسرافيل وان القبر الذى هو بالمدينة قبر النبى محمد صلى الله عليه وسلم معه ابوبكر وعمر وقلوب العباد بين اصبعين من اصابع الله والدجال خارج فى هذه الامة لامحالة وينزل عيسىٰ بن مريم الى الارض فيقتله بباب لد ۔

ومـاانكرته العلماء من اهل السنه فهو منكر واحذروا البدع كلها ولا عين تطرف بعد النبى افضل من ابى بكر ولا بعد ابى بكر عين تطرف افضل من عمر ولا بعد عمر عين تطرف افضل من عثمان ۔

قال احمد كنا نقول ابوبكر و عمر وعثمان ونسكت عن على حين صح لنا حديث ابن عمر بالتفضيل قال احمد هم والله لخلفاء الراشدون المهديون ۔

وان نشهد للعشرة انهم فى الجنة ابوبكر وعمر وعثمان وعلى وطلحة والزبير وسعد وسعيد وعبدالرحمن بن عوف وابوعبيدة بن الجراح فمن شهد له النبى صلى الله عليه وسلم شهدنا له بالجنة ورفع الدين فى الصلاة زيادة فى الحسنات والجهر بآمين عند قول الامام ولاالضالين والدعاء لائمة المسلمين بالصلاح ولايخرج عليهم بالسيف ولايقاتل فى الفتنة ولايتالىّ على احد من المسلمين ان يقول فلان فى الجنة وفلان فى النار الا العشرة الذين شهد لهم النبى صلى الله عليه وسلم بالجنة وصفوا الله بما وصف به نفسه وانفوا عن الله مانفاه عن نفسه واحذروا الجدال مع اصحاب الاهواء والكف عن مساوئ اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم والتحدث بفضائلهم والامساك عما شجر بينهم ولاتشاور اهل البدع فى دينك (ولاترافقهم) فى سفرك ولانكاح الا بولى وخاطب وشاهدى عدل والمتعة حرام الى يوم القيامة والصلوة خلف كل بر فاجر صلاة الجمعة وصلاة العيدين والصلاة على من مات من اهل القبلة وحسابهم على الله والخروج مع كل

امام خرج فى غزوة او حجة والتكبير للجنازة اربع فان كبر الامام خمسا فكبر معه كفعل على ابن ابى طالب قال عبدالله بن مسعود كبر ما كبر امامك قال احمد خالفنى الشافعى فقال ان زاد على اربع تكبيرات تعاد الصلاة واحتج على بحديث رسول الله صلى الله عليه وسلم انه صلى على جنازة فكبر اربعا والمسح على الخفين للمسافر ثلاثة ايام ولياليهن وللمقيم يوما وليلة وصلاة الليل والنهار مثنى مثنى ولاصلاة قبل العيد واذا دخلت المسجد فلاتجلس حتى تصلى ركعتين تحية المسجد والوتر ركعة والاقامة فردا ۔

احب اهل السنة على ما كان منهم اماتنا الله واياكم على الاسلام والسنة ورزقنا واياكم العلم ووفقنا واياكم لما يحب ويرضىٰ ۔ (مناقب لابن الجوزی ص ٢١٦ تا ٢٢٢)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم! سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جس نے ہر زمانہ میں بقایا اہل علم کو باقی رکھا، جو گمراہوں کو ہدایت کی دعوت دیتے ہیں، ہلاکت سے روکتے ہیں، کتاب اللہ کے ذریعے مردوں کو زندہ کرتے ہیں، نبی کی سنت کے ذریعے ان کو بچاتے ہیں، انہوں نے کتنے ہی مقتولان ابلیس کو زندگی بخشی، کتنے ہی گمراہوں کی ہدایت کی اور ان کی جد و جہد کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں بہت ہی اچھا نکلا، ان لوگوں نے اللہ کے دین سے تحریف غالین اور انتحال مبطلین کو دفع کیا، جو بدعات میں مبتلا تھے، اور فتنوں کو عام کر دیا تھا، کتاب اللہ کے بارے میں گروہ در گروہ ہو گئے تھے، اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا اور اس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پیدا کیے، کتاب اللہ میں بغیر علم کے کلام کیا، ہم گمراہ کن فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے نبی و رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام و رحمت نازل فرمائے۔

امابعد! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا کی توفیق دے اور اپنے غضب سے محفوظ رکھے، اور ہم سب کو اپنے ڈرنے والوں کی راہ پر چلائے جو اس کی معرفت رکھتے ہیں، میں آپ کو اور خود اپنے کو تقوی، سنت رسول، اور جماعت مسلمین سے لزوم کی وصیت کرتا ہوں، آپ کو ان کی مخالفت کرنے والوں کا بد انجام اور ان کے مطابق عمل کرنے والوں کا نیک انجام معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہم تک پہنچا ہے۔

اللہ اپنے بندے کو ایک سنت پر سختی سے عمل کرنے پر جنت میں داخل کرتا ہے، میں آپ لوگوں کو حکم دیتا ہوں، کہ قرآن پر کسی کو ترجیح نہ دیں، قرآن کلام اللہ ہے، جس چیز کے ذریعہ اللہ نے کلام کیا ہے، وہ مخلوق نہیں ہے، جن الفاظ کے ذریعہ قرون ماضیہ کی خبر دی ہے، وہ بھی غیر مخلوق ہیں، لوح محفوظ میں جو کچھ ہے، وہ بھی غیر مخلوق ہے، جو شخص اسے مخلوق کہے کافر ہے، اور جو ایسے لوگوں کی تکفیر نہ کرے وہ بھی کافر ہے۔

کتاب اللہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، احادیث نبویہ، صحابہ و تابعین کے اقوال و آرا کا درجہ ہے، انبیا و رسل کے بیانات کی تصدیق اور اتباع سنت میں سراسر نجات ہے، یہ باتیں اہل علم کے اونچے طبقہ سے نقل ہوتی چلی آئی ہیں۔

جہم بن صفوان کے خیالات سے بچتے رہو، کیوں کہ وہ دین میں رخنہ انداز ہیں، فرقہ جہمیہ ہمارے علما کے بیان کے مطابق تین گروہ پر مشتمل ہے، ایک گروہ کہتا ہے، کہ قرآن کریم کلام اللہ ہے اور مخلوق ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے، کہ قرآن کلام اللہ ہے اور مخلوق غیر مخلوق ہونے کے بارے میں خاموش ہے، یہ واقفیہ ہے، اور تیسرا گروہ کہتا ہے، کہ قرآن پڑھنے میں جو ہمارے الفاظ ہیں، وہ مخلوق ہیں، یہ تمام کے تمام جہمیہ ہیں اور علما کا اتفاق ہے، کہ جس کا یہ قول ہے، اگر وہ اپنے اس قول سے توبہ نہ کرے تو اس کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال نہیں ہے اور نہ اس کے فیصلے قابل قبول ہیں۔

ایمان قول وعمل کا مجموعہ ہے، اس میں کمی زیادتی ہوتی ہے، تم نیک کام کروگے تو ایمان میں زیادتی ہوگی اور برے کام کروگے تو کمی ہوگی، یہ ہوسکتا ہے، کہ آدمی ایمان سے خارج ہوکر اسلام میں داخل ہوجائے، اگر توبہ کرلے گا تو پھر ایمان میں داخل ہوجائے گا اور اسلام سے سوائے شرک کے کوئی چیز نکال نہیں سکتی، یا فرائض خداوندی میں سے کسی فریضہ کا منکر ہو تو وہ کافر ہوگا اور اگر کوئی شخص فریضہ سستی اور کاہلی سے ترک کرتا ہے، تو اس کا معاملہ مشیت خداوندی کے حوالہ ہے، اگر وہ چاہے تو عذاب دے اور اگر چاہے تو معاف کردے۔

معتزلہ کے بارے میں ہمارے علما متفق ہیں، کہ وہ گناہ سے تکفیر کے قائل ہیں، پس معتزلہ میں سے جو اس اعتقاد پر ہوگا اس کو گمان ہوگا، کہ حضرت آدم نے گناہ کا ارتکاب کرکے کفر کیا اور حضرت یوسف کے بھائیوں نے جب اپنے باپ کے سامنے جھوٹ کہا، تو انہوں نے کفر کیا، معتزلہ اس عقیدہ پر متفق ہیں، کہ جو شخص ایک حبہ بھی چوری کرے گا، وہ جہنمی ہوگا، اس کی بیوی اس سے جدا ہوجائے گی، اور اگر اس نے پہلے حج کیا ہے، تو اس کو دہرائے گا، اس قسم کی باتیں کہنے والے مرتکب کفر ہیں، ان کے بارے میں حکم ہے، کہ نہ ان سے سلام وکلام کیا جائے نہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھایا جائے یہاں تک کہ وہ اپنے عقائد سے توبہ کرلیں۔

روافض کے متعلق ہمارے علما متفق ہیں، کہ ان کا عقیدہ ہے، کہ حضرت علی، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سے افضل ہیں، اور حضرت علی کا اسلام حضرت ابوبکر کے اسلام سے پہلے تھا، جو شخص اس کا قائل ہے، وہ کتاب وسنت کا کھلے طور پر رد کررہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر کو مقدم کیا ہے، نہ کہ حضرت علی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اللہ نے مجھے اپنا دوست بنالیا۔

جو شخص سمجھتا ہے، کہ حضرت علی کا اسلام حضرت ابوبکر سے پہلے تھا، وہ غلطی پر ہے، چوں کہ حضرت ابوبکر کے اسلام لانے کے وقت ان کی عمر پینتیس سال تھی اور حضرت علی اس وقت سات سال کے بچے تھے، ان پر اسلامی احکام شرعی حدود اور دینی فرائض جاری نہیں ہوئے تھے۔

مسلمان کے لیے ضروری ہے، کہ قضاوقدر کے خیر وشر پر ایمان لائے اور اعتقاد رکھے، کہ قضاوقدر کی ہر گوارو ناگوار

بات اللہ کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی پیدائش سے پہلے جنت کو پیدا کیا، اور اس کے مستحقین کی بھی تخلیق کی، اس کی نعمتیں دائمی ہیں، جس کا خیال ہے، کہ جنت کا کچھ حصہ ضائع ہو جائے گا وہ کافر ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جہنم اور اس کے مستحقین کو پیدا کیا، اس کا عذاب بھی دائمی ہے، لوگ جہنم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ذریعہ نکلیں گے اعتقاد رکھنا چاہیے، کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا اور حضرت ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا۔

میزان برحق ہے، صراط برحق ہے، انبیا برحق ہیں، حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، حوض، شفاعت، عرش، کرسی پر ایمان رکھنا چاہیے، اور اس بات پر ایمان کہ ملک الموت ارواح کو قبض کرتا ہے، پھر ان کو جسموں کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے، اور ان سے ایمان، توحید اور رسول کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے، نفخ صور پر ایمان رکھے، جسے حضرت اسرافیل پھونکیں گے اور اس پر بھی ایمان رکھے، کہ مدینہ منورہ میں جو قبر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر ہے، اور آپ کے ساتھ ابوبکر اور عمر ہیں، اعتقاد رکھے، کہ بندوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، دجال کا خروج امت محمدیہ میں ہوگا، اور حضرت عیسیٰ آکر باب لد پر اس کو قتل کریں گے، علمائے اہل سنت نے جس بات کا انکار کیا ہے، وہ منکر ہے، تمام بدعات سے پرہیز کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر سے افضل امت میں کوئی نہیں ہے، اس کے بعد حضرت عمر سے افضل کوئی نہیں ہے، اور حضرت عمر کے بعد حضرت عثمان سے افضل کوئی نہیں ہے، خلفائے ثلاثہ کے بارے میں ہمارا یہی قول ہے، اور حضرت علی کے بارے میں ہم خاموش ہیں، تفضیل کے بارے میں ہمارے نزدیک عبداللہ بن عمر کی حدیث صحیح ہے، یہ چاروں خلفائے راشدین مہدیین ہیں، عشرہ مبشرہ کے بارے میں ہم شہادت دیتے ہیں، کہ وہ جنتی ہیں، ان کے نام یہ ہیں، ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوعبیدہ بن جراح۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ جن جن لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے، ہم ان کے جنتی ہونے کے قائل ہیں۔

ہمارے نزدیک نماز میں رفع یدین کرنا اور آمین کہنا حسنات میں زیادتی کا باعث ہے، مسلمان امرا و قائدین کے لیے خیر وصلاح کی دعا کی جائے ان پر تلوار سے حملہ نہ کیا جائے باہمی فتنہ اور نزاع میں ان سے جنگ نہ کی جائے، کسی مسلمان کو اس بات کے کہنے پر مجبور نہ کیا جائے کہ فلاں فلاں شخص جنتی ہیں، البتہ عشرہ مبشرہ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے، جن کے جنتی ہونے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وہی اوصاف بیان کرو، جن کو اس نے اپنے لیے بیان فرمایا ہے، اور جن باتوں کی اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں نفی کی ہے، تم بھی ان باتوں کی نفی کرو، اہل ہوا اور گمراہوں کے ساتھ بحث و تکرار سے بچتے رہو، صحابہ کرام کے معائب بیان کرنے سے رکو اور ان کے فضائل بیان کرو، ان کے باہمی مشاجرات میں خاموش رہو، اہل بدعت سے دینی امور میں مشورہ نہ لو، اور نہ ان کے ساتھ سفر کرو، نکاح کے لیے ولی، خطبہ خواں اور دو عادل گواہ کی ضرورت ہے، متعہ قیامت تک کے لیے حرام ہے، ہر

نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھ لو خواہ نماز جمعہ ہو یا نماز عیدین، اہل قبلہ میں سے جو شخص مر جائے، اس کی نماز جنازہ پڑھ دو، اس کا معاملہ اللہ پر ہے، ہر امام وامیر کی اطاعت میں اس کے ساتھ، جہاد اور حج کے لیے نکلنا چاہیے، تکبیرات جنازہ چار ہیں، اگر امام پانچ تکبیر کہے تو تم بھی علی بن ابی طالب کی طرح پانچ تکبیر کہو، حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے، کہ نماز جنازہ میں امام جتنی تکبیر کہے، تم بھی کہو، لیکن شافعی نے اس مسئلہ میں مجھ سے اختلاف کیا ہے اور کہتے ہیں کہ چار تکبیر سے زائد ہو تو نماز کا اعادہ کرے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بطور سند میرے سامنے پیش کی، جس میں ہے، کہ آپ نے نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہی ہیں۔

خفین کا مسح مسافر کے لیے تین دن تین رات ہے، اور مقیم کے لیے ایک دن ایک رات ہے، اور رات دن کی نفل نماز میں دو دو رکعت ہے نماز عید سے پہلے کوئی نماز نہیں ہے، جب مسجد میں داخل ہو، تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ لو، وتر ایک رکعت ہے، اقامت کہنا ضروری ہے، میں اہل ہوا کے مقابلہ میں بہر حال اہل سنت کو اچھا سمجھتا ہوں چاہے ان میں کوئی عیب ہو اللہ تعالیٰ ہم کو آپ کو اسلام اور سنت پر موت دے، اور ہم کو اور تم کو علم عطا فرمائے اور اپنی مرضی پر چلنے کی توفیق دے۔

شیخ الاسلام ہروی کو جب ارباب بدعت وتعطیل نے جلاوطن کیا تو تمام کتابیں گھر پر چھوڑ دیں، صرف اس مکتوب کو توشہ سعادت سمجھ کر اپنے ساتھ لے لیا، حافظ ابن مندہ کا قول ہے، کہ جس شخص نے اس وصیت کو پڑھا اور عمل کیا وہ ان عبادی لیس لك علیهم سلطان کا ٹھیک ٹھیک مصداق ٹھہرا۔

رضی اللہ عنہم

* * *